

آشنگارش
اہلِ تسلیم کی ایک جماعت

زیرِ نظر
استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

www.sirat-e-mustaqeem.net

سیرتِ مہربانہ

جلد ۱۳

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی حیدر آبادی

زیرِ سرپرستی
حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا نستانانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ



پیشکش: حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب _____ تفسیر نمونہ

جلد _____ ۱۳

زیر نظر _____ آیت اللہ العظمی ناصر مکارم شیرازی

مترجم _____ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی

ناشر _____ مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ارگنکارام ملدنگ

شاہراہ قائد اعظم، لاہور

مطبع _____ معراج دین پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت _____ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

ہدیہ _____ 200/=

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴، الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۴۱۲۲۲۲۳-۴۳۱۴۳۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

عَرَضِ نَاشِر

قارئین محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔
الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔ کلام حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر۔ تفسیر نمونہ۔ کو فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونت کی فراخ دلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکر اللہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایا تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقیوی اعلیٰ اللہ مقامہ کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید السلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی ”پیام قرآن“ از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور ”قرآن کا دائمی منشور“ از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل ایک جلدی قرآن پاک عہدِ حاضر کے مقبول اردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جدید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ ”الوزار القرآن“ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ یقین رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقیہ حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر ریختہ ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۲ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۲۲ میں سے صفحہ ۳۴۹ تا ۴۷۸، جلد ۲۳ مکمل اور جلد ۲۴ میں سے صفحہ ۲۷ تا ۱۹۲ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ طور، سورہ نجم، سورہ قمر، سورہ رحمن، سورہ واقعہ، سورہ حدید، سورہ مجادلہ، سورہ شہر، سورہ ممتحنہ، سورہ صفت، سورہ جمعہ، سورہ منافقون اور سورہ تغابن کی تفسیر کا مجموعہ ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مرد مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومین ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِہْدَاء

”مرکز مطالعات اسلامی و نجات نسل جوان“

جو
تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش
تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے
اس نفیس تالیف کو
ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے
جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم



یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

◎ حجة الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی

◎ حجة الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی

◎ حجة الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی

◎ حجة الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی

◎ حجة الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی

◎ حجة الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی

◎ حجة الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

◎

حَسَنَاتِ سِرِّ

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے:

مشہور مفسر علامہ طبرسی	تصنیف	تفسیر مجمع البیان	①
دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی	تصنیف	تفسیر تبیان	②
علامہ طباطبائی	تصنیف	تفسیر المیزان	③
علامہ محسن فیض کاشانی	تصنیف	تفسیر صافی	④
مرحوم عبد علی بن جعفر الحویزی	تصنیف	تفسیر نور الثقلین	⑤
مرحوم سید ہاشم بحرینی	تصنیف	تفسیر برہان	⑥
علامہ شہاب الدین محمود آلوسی	تصنیف	تفسیر روح المعانی	⑦
مجدد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبد	تصنیف	تفسیر المنار	⑧
سید قطب مصری	تصنیف	تفسیر فی ظلال القرآن	⑨
محمد بن احمد انصاری قرطبی	تصنیف	تفسیر قرطبی	⑩
واحدی (الواحسن علی بن متوہ نیشاپوری)	تصنیف	اسباب النزول	⑪
احمد مصطفیٰ مراغی	تصنیف	تفسیر مراغی	⑫
فخر رازی	تصنیف	تفسیر مفاتیح الغیب	⑬
ابوالفتح رازی	تصنیف	تفسیر روح الجنان	⑭

گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسن ملت حضرت علامہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوند کریم مولانا مرحوم کو جوار معصومین میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مد نظر اہداف

پوری دنیا جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک ”ایران کا اسلامی انقلاب“ اور ”دنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں“ ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بظنون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمہ علم سے محروم نہیں ہو سکتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علما میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققین اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گہری کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسر....؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغاز اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابل قدر کوششیں کی ہیں اور زحماتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پڑ تو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعيہم)۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے دسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریات زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناف تا بل ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حال سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شامل حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی دس جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی گیارہویں ہے) بار بار چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بار بار یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی بلکہ

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلا وطنی کے مقام پر، حتیٰ کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

لے بعد میں یہ اندازہ کم ثابت ہوا اور کل جلدوں کی تعداد تائیس تک جا پہنچی (مترجم)
 ۴۔ سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورت حال کو نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گونا گوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوند!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کار ساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔

خداوند!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنان اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امت اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگالیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بار الہ!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یحیٰ و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم۔ ایران

ذوالحجہ ۱۴۱۱ ہجری قمری

تفسیر نمونہ جلد ۱۳

فہرست

۵۴	شانِ نزول	۲۷	<u>سُورۃ طُور</u>
۵۴	اگر سچ کہتے ہیں تو اس کے مانند کلام لے آئیں۔	۲۸	سُورہ طور کے مطالب
۶۰	آیت ۳۵ تا ۴۳	۲۸	اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت
۶۱	سچ سچ بتاؤ تمہاری صحیح بات کون سی ہے؟	۳۰	آیت ۱ تا ۸
۶۸	آیت ۴۵ تا ۴۹	۳۱	بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم
۶۹	تو ہماری مکمل حفاظت میں ہے	۳۵	آیت ۹ تا ۱۶
	<u>سُورۃ النجم</u>	۳۶	تمہاری جزا صرف تمہارے اعمال ہیں
۷۴	سُورہ النجم کے مطالب و مضامین		چند نکات
۷۵	اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت	۳۸	۱۔ مجرموں کو دوزخ میں کس طرح لے جائیں گے۔
۷۶	آیت ۱ تا ۴	۳۹	۲۔ وہ لوگ جو باطل باتوں میں غوطہ زن ہیں
۷۸	تفسیر	۴۰	آیت ۵ تا ۲۱
۸۳	آیت ۵ تا ۱۲		ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروہی ہے۔
۸۴	دوست کا پہلا دیدار	۴۱	آیت ۲۲ تا ۲۸
۹۱	آیت ۱۳ تا ۱۸	۴۷	ہم اس دن خوف زدہ تھے اور آج انتہائی امن میں ہیں۔
۹۲	دوسرا دیدار	۴۸	چند قابلِ توجہ نکات
	چند نکات	۵۱	آیت ۲۹ تا ۳۲
		۵۲	

چند نکات	۹۵	۱۔ معراج ایک مسلمہ حقیقت ہے
۱۲۴	۹۶	۲۔ معراج کا مقصد
۱۲۴	۹۶	۳۔ معراج اور بہشت
۱۲۵	۹۶	۴۔ معراج اسلامی روایات میں
۱۲۸	۹۹	۵۔ معراج کی رات خدا کی پیغمبر سے باتوں کا ایک گوشہ
۱۲۹	۱۰۴	آیت ۱۹ تا ۲۳
۱۳۰	۱۰۵	تفسیر
چند نکات	چند نکات	
۱۳۳	۱۰۶	۱۔ عربوں کے تین مشہور بُت
۱۳۴	۱۰۸	۲۔ اسمہای بے مسمیٰ
۱۳۴	۱۰۹	۳۔ بُت پرستی کا نفسیاتی اور فکری سرچشمہ
۱۳۵	۱۰۹	۴۔ پھر بھی "غرائق" کا افسانہ
۱۳۵	۱۱۱	آیت ۲۲ تا ۲۶
۱۳۶	۱۱۱	شفاعت بھی اسی کے اذن سے ہوگی
چند نکات	چند نکات	
۱۳۷	۱۱۳	۱۔ آرزوؤں کے دامن کا پھیلاؤ
۱۳۸	۱۱۴	۲۔ شفاعت کے بارے میں گفتگو
چند نکات	۱۱۵	آیت ۲۷ تا ۳۰
۱۳۸	۱۱۶	ظن و گمان ہرگز کسی کو حق تک نہیں پہنچاتے
۱۳۹	۱۱۹	ایک نکتہ
۱۴۰	۱۲۰	دنیا پرستوں کا سرمایہ
۱۴۱	۱۲۱	آیت ۳۱، ۳۲
۱۴۲	۱۲۱	خود ستائی نہ کرو، وہ تمہیں پہچانتا ہے
۱۴۳		
۱۴۴		
۱۴۵		
۱۴۶		
۱۴۷		
۱۴۸		
۱۴۹		

سب اس کے لیے سجدہ کرو

سُورہ قمر

سُورہ قمر کے مضامین

فضیلت سُورہ قمر

آیت ۱ تا ۳

چاند نش ہو گیا

چند نکات

۱۔ شق القمر، پیغمبر اسلام کا ایک

عظیم معجزہ۔

۲۔ "شق القمر" موجودہ زمانے کے

علوم کے لحاظ سے۔

(الف) نظام شمسی کی تخلیق

(ب) بڑے شہاب

(ج) آسمانی گروں کے انشقاق کا ایک

دوسرا نمونہ۔

(د) آسمانی گروں کے پھٹنے کا ایک اور نمونہ

۳۔ "شق القمر" تاریخی اعتبار سے

اس عظیم معجزہ کے وقوع کی تاریخ

آیت ۲ تا ۸

وہ دن کہ جب سب قبروں سے باہر

نکلیں گے۔

ایک نکتہ

قیامت کا دن کیوں بہت سخت ہے

آیت ۹ تا ۱۷

قوم نوح کا ماجرہ درس عبرت تھا

آیت ۱۸ تا ۲۲

اور اسی طرح قوم عاد کی سرگزشت

ایک نکتہ

نیک اور بد دن

آیت ۲۳ تا ۳۲

قوم ثمود کا دردناک انجام

آیت ۳۳ تا ۴۰

قوم لوط زیادہ منحوس صورت حال

سے دوچار ہوئی۔

آیت ۴۱ تا ۴۶

کیا تم گذشتہ اقوام سے افضل و

برتر ہو۔

ایک نکتہ

ایک واضح اور معجزہ کی کیفیت رکھنے

والی پیش گوئی

آیت ۴۷ تا ۵۵

مقام صدق میں خداوند مقتدر کے پاس

چند ایک نکات

۱۔ اس جہان کی تمام چیزیں حساب و

کتاب کی تابع ہیں

۲۔ تقدیر الہی اور اس کے ارادہ کی

آزادی۔

- ۲- گلف سٹریم، بڑے بڑے سمندری
[۲۳۴ دریا اور نہریں]
- ۳- بطون آیات میں سے ایک تفسیر
[۲۳۵ آیت ۲۶ تا ۳۰]
- ہم سب فانی ہیں اور بقاء صرف تیرے
[۲۳۶ لیے ہے۔]
- چند نکات
- ۱- فنا کی کیا حقیقت ہے؟
[۲۳۹]
- ۲- وہ ہر روز ایک نئی چیز کی تخلیق
[۲۴۰ کرتا ہے۔]
- ۳- حرکت جویری
[۲۴۱]
- آیت ۳۱ تا ۳۶
[۲۴۳]
- اگر قدرت رکھتے ہو تو آسمانوں کی سرحدوں
[۲۴۴ سے آگے نکل جاؤ]
- آیت ۳۷ تا ۴۵
[۲۴۸]
- گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے
[۲۴۹]
- آیت ۴۶ تا ۵۵
[۲۵۳]
- یہ دونوں جنتیں غائفین کے انتظار میں ہیں
[۲۵۴]
- آیت ۵۶ تا ۶۱
[۲۵۹]
- ایک نکتہ
- نیکی، نیکی کی جزا ہے
[۲۶۲]
- آیت ۶۲ تا ۶۹
[۲۶۳]
- دو اور جنتیں اپنے حیران کن اوصاف
[۲۶۴ کے ساتھ۔]

- ۳- خدا کا فرمان صرف ایک ہی کلمہ ہے
[۲۰۶]
- ۴- سورہ قمر کا آغاز و اختتام
[۲۰۶]

سورہ رحمن

- ۲۰۸ سورہ رحمن کا مضمون
- ۲۰۹ سورہ رحمن کی تلاوت کی فضیلت
- ۲۱۱ آیت ۶ تا ۶
- ۲۱۲ خدا کی نعمتوں کا آغاز
- ۲۱۳ ایک نکتہ
- ۲۱۴ چند روایات پر ایک نظر
- ۲۱۸ آیت ۷ تا ۱۳
- آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز کے لیے میزان
[۲۱۹ قرار دی۔]
- چند نکات
- ۱- نعمتوں کی شناخت خدا کی معرفت
[۲۲۳ کا زینہ ہے۔]
- ۲- زندگی میں نظم و حساب کا مسئلہ
[۲۲۳]
- آیت ۱۴ تا ۱۸
[۲۲۵]
- انسان کی خلقت ٹھیکری جیسی خاک سے
[۲۲۵ ہوئی ہے۔]
- آیت ۱۹ تا ۲۵
[۲۲۹]
- سمندر اپنے گراں بہا ذخائر کے ساتھ
[۲۳۰]
- چند نکات
- ۱- سمندر خدا کی نعمتوں کا مرکز
[۲۳۳]

۳۰۶	عقیدہ معاد پر سات دلیلیں	ایک نکتہ	۲۶۶	پھلوں کی قدر و قیمت
۳۱۰	آیت ۶۳ تا ۶۷	ایک نکتہ	۲۶۸	آیت ۷۰ تا ۷۸
۳۱۰	دانوں کو آگ آنے والا خدا ہے یا تم ہو۔		۲۶۹	جنت کی بیویوں کا دوسری مرتبہ تذکرہ
۳۱۲	آیت ۶۸ تا ۷۴			چند نکات
۳۱۴	یہ پانی اور آگ کس کی طرف سے ہیں			<u>سُورہ واقعہ</u>
	ایک نکتہ	۲۷۴		
۳۱۹	آیت ۷۵ تا ۸۲	۲۷۵		سُورہ واقعہ کے مضامین
	صرف پاکیزہ افراد حرم قرآن تک رسائی	۲۷۶		اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت
۳۲۰	حاصل کر سکتے ہیں۔	۲۷۸		آیت ۱ تا ۱۲
۳۲۳	چند نکات	۲۷۹		آیت ۱۳، ۱۴
۳۲۵	آیت ۸۳ تا ۸۷	۲۸۰		عظیم واقعہ
۳۲۷	جس وقت کہ جان گلے تک پہنچ جائیگی	۲۸۵		آیت ۱۵ تا ۲۶
	چند نکات	۲۸۶		جنت کی وہ نعمتیں جو مقررین کی منتظر ہیں
۳۲۸	۱۔ جبارین کی ناتوانی کا لمحہ	۲۹۱		آیت ۲۷ تا ۳۹
۳۲۹	کیا جانکنی تدریجی امر ہے؟	۲۹۲		آیت ۴۰
۳۳۰	آیت ۸۸ تا ۹۵	۲۹۳		وہ نعمتیں جو اصحابِ یمن کو حاصل ہوں گی
۳۳۱	نیک کاروں اور بدکاروں کا انجام	۲۹۷		آیت ۴۱ تا ۵۰
	ایک نکتہ			اصحابِ الشمال کو ملنے والی سزائیں اور ان پر
۳۳۲	عالمِ برزخ	۲۹۸		نازل ہونے والے دردناک عذاب۔
	<u>سُورہ حدید</u>	۳۰۲		آیت ۵۱ تا ۵۶
۳۳۶	سُورہ حدید کے مشمولات			ان گمراہ مجرموں پر نازل ہونے والے عذاب
۳۳۷	سُورہ حدید کی تلاوت کی فضیلت	۳۰۳		کا ایک اور حصہ۔
۳۳۸		۳۰۵		آیت ۵۷ تا ۶۲

۳۳۹	آیت ۳ تا ۴	۳۴۲	وہ گنہگار افراد جنہوں نے یہ آیت سن کر توبہ کی۔
۳۴۰	گہری فکر رکھنے والوں کی علامات	۳۴۵	آیت ۲۰، ۱۹
	ایک نکتہ		۱۔ دُنیا متاع غرور کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔
۳۴۲	خدا کی صفات میں اعضاء کا جمع ہونا	۳۴۶	چند نکات
۳۴۵	آیت ۴ تا ۶		دنیاوی زندگی ان اسباب و علل کا مجموعہ ہے۔
۳۴۶	وہ ہمیشہ قدرت پر جلوہ گر ہے	۳۸۰	آیت ۲۱ تا ۲۲
	ایک نکتہ	۳۸۱	ایک عظیم معنوی مقابلہ
۳۵۰	خدا کے اسم اعظم کی نشانیاں	۳۸۳	آیت ۲۵
۳۵۱	آیت ۷ تا ۱۰	۳۸۹	بعثت انبیاء کا مقصد اعلیٰ
۳۵۲	آیت ۱۱		چند نکات
	ایمان و انفاق نجات و خوش بختی کے لیے	۳۹۲	۱۔ منطق اور زبردستی کی قلمرو
۳۵۳	دو عظیم سرمائے ہیں		۲۔ زندگی کی عمدہ ضرورتیں لوہے سے تعلق رکھتی ہیں
	چند نکات	۳۹۳	آیت ۲۶، ۲۷
۳۵۴	۱۔ انفاق کے اسباب	۳۹۵	ہم نے یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے
۳۵۴	۲۔ راہِ نجات میں انفاق کے شرائط	۳۹۶	چند نکات
	۳۔ ایمان، جہاد اور انفاق میں پیش قدمی کرنے والے۔	۳۹۹	۱۔ اسلام اور ربانیت
۳۵۹	آیت ۱۲ تا ۱۵	۴۰۰	۲۔ ربانیت کا تاریخی سرچشمہ
۳۶۱	ہمیں اپنے نور سے استفادہ کرنے دو		۳۔ ربانیت سے پیدا ہونے والے اجتماعی اور اخلاقی مقاصد
۳۶۳	ایک نکتہ	۴۰۱	۴۔ انجیل یا اناجیل
۳۶۶	قیامت میں مجرموں کا بے مقصد مدد کرنا		
۳۶۸	آیت ۱۶ تا ۱۸		
۳۶۹	شانِ نزول		
۳۶۹	غفلت و بے خبری کب تک		

۴۲۵	چند نکات	۴۰۴	آیت ۲۸ تا ۲۹
۴۲۷	۲۔ آدابِ مجلس	۴۰۵	شانِ نزول
۴۲۸	آیت ۱۲، ۱۳		ایک نکتہ
۴۲۹	شانِ نزول	۴۰۷	تقویٰ اور نگاہِ دور رس کا رابطہ
۴۲۹	ایک جاذبِ توجہ امتحان		<u>سُورہ مجادلہ</u>
	چند نکات	۴۰۹	
۴۴۰	آیتِ نجویٰ و صدقہ پر عمل کرنے والا تنہا شخص ۴۴۰	۴۱۰	سُورہ "مجادلہ" کے مضامین
	۱۔ نجویٰ سے پہلے صدقہ کی تشریح اور	۴۱۰	سُورہ "مجادلہ" کی تلاوت کی فضیلت
۴۴۲	پھر نسخ کا فلسفہ۔	۴۱۲	آیت ۴ تا ۵
۴۴۲	۲۔ کیا یہ فضیلت تھی	۴۱۴	شانِ نزول
۴۴۳	۳۔ مدتِ حکم اور مقدارِ صدقہ	۴۱۵	ظہار زمانہ جاہلیت کا ایک قبیح عمل
۴۴۴	آیت ۱۴ تا ۱۹	۴۱۹	بعض احکامِ ظہار
۴۴۶	حزبِ شیطان	۴۲۱	آیت ۵ تا ۷
۴۵۰	آیت ۲۰ تا ۲۲	۴۲۲	وہ جو خدا سے دشمنی کرتے ہیں
۴۵۱	حزبِ اللہ کا میاب ہے	۴۲۴	اس آیت میں چند نکات قابلِ توجہ ہیں
	چند نکات	۴۲۵	ایک نکتہ
	۱۔ حزبِ اللہ اور حزبِ شیطان کی	۴۲۷	آیت ۸ تا ۱۰
۴۵۵	اصل نشانی۔	۴۲۸	شانِ نزول
۴۵۶	۲۔ حُب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا اجر ۴۵۶		چند نکات
	<u>سُورہ حشر</u>	۴۳۱	۱۔ نجویٰ کی اقسام اور سرگوشی کی باتیں
۴۵۸		۴۳۲	۲۔ خدا کا سلام کون سا ہے ؟
۴۵۹	سُورہ حشر کے مضامین		آیت ۱۱
۴۶۰	اس سُورہ کی فضیلت	۴۳۳	شانِ نزول
۴۶۱	آیت ۵ تا ۵	۴۴۴	محاسن میں پہلے آنے والوں کا احترام

۴۶۲	شانِ نزول	شیطان کی بوسیدہ رسیوں کے ساتھ [۴۹۳
۴۶۴	یہود بنی نظیر کی مدینہ میں سازش کا خاتمہ	کنوئیں میں نہ جاؤ	
	چند نکات		
۴۶۹	۱۔ خدا کے غیر مرئی لشکر	چند نکات	۴۹۴
۴۷۰	۲۔ موجودہ زمانے میں یہودیوں کی سازشیں	۱۔ اہل نفاق کے ساتھ بے مقصد شرکت عمل	۴۹۷
۴۷۱	آیت ۷، ۶	۲۔ برصیصا عابد کی حیرت انگیز داستان	۴۹۸
۴۷۲	شانِ نزول	۳۔ جو کچھ آگے بھیجنا چاہیے	۴۹۹
	ان اموالِ غنیمت کے بارے میں حکم جو [آیت ۲۱ تا ۲۲	۵۰۱
۴۷۲	جنگ کے بغیر ہاتھ لگیں۔	اگر قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ ریزہ ریزہ	
	ایک نکتہ	ہو جاتے۔	۵۰۲
	۱۔ فی کا مصرف (وہ اموالِ غنیمت جو بغیر [چند نکات	
۴۷۶	جنگ کے حاصل ہوں، ان کا مصرف)	۱۔ قرآن کا حد سے زیادہ نفوذ	۵۰۷
۴۷۶	۲۔ ایک سوال کا جواب	۲۔ سورہ حشر کی آخری آیات	۵۰۷
۴۷۷	۳۔ فدک کی غم انگیز داستان		
۴۷۹	آیت ۸ تا ۱۰	<u>سورہ ممتحنہ</u>	۵۰۹
	تین گروہ مہاجرین، انصار اور تابعین اور	سورہ ممتحنہ کے مضامین	۵۱۰
۴۸۰	ان کے نمایاں اوصاف	سورہ ممتحنہ کی تلاوت کی فضیلت	۵۱۰
	ایک نکتہ	آیت ۳ تا ۳	۵۱۲
۴۸۵	صحابہ قرآن و تاریخ کی میزان میں	شانِ نزول	۵۱۳
۴۸۶	آیت ۱۱ تا ۱۲	خدا سے دوستی کرنے کا انجام	۵۱۵
۴۸۸	شانِ نزول	آیت ۴ تا ۶	۵۱۸
	یہودیوں کی فتنہ انگیزی اور اس میں [ابراہیمؑ تو سب کے لیے نمونہ ہیں	۵۱۹
۴۸۸	منافقین کی شمولیت	چند نکات	
۴۹۲	آیت ۱۵ تا ۲۰	۱۔ ابدی نمونے	۵۲۴
		۲۔ خدا سب سے بے نیاز ہے	۵۲۵

چند نکات

- ۵۵۲ ۱۔ صفوں میں وحدت کی ضرورت
 ۵۵۳ ۲۔ گفتار باعمل
 ۵۵۷ آیت ۶۰۵
 ۵۵۸ میں احمد کے ظہور کی بشارت لے کر آیا ہوں

چند نکات

- ۵۶۰ ۱۔ بشارت اور تکمیل دین کا ربط
 ۵۶۱ ۲۔ عہدین کی بشارتیں اور فارقلیطا کی تعبیر
 ۵۶۲ ۳۔ کیا پیغمبر اسلام کا نام احمد ہے
 ۵۶۶ آیت ۹ تا ۹
 وہ نور خدا کو اپنی پھونکوں سے خاموش کرنا چاہتے ہیں۔

- ۵۶۱ آیت ۱۰ تا ۱۳
 ۵۶۱ سود مند اور بے نظیر تجارت

چند نکات

- ۵۶۲ ۱۔ فتح قریب کون سی ہے؟
 ۵۶۲ ۲۔ مساکن طیبہ کیا ہے؟
 ۵۶۵ ۳۔ دنیا اولیاء خدا کا تجارت خانہ ہے

- ۵۶۶ آیت ۱۴

- ۵۶۶ حواریوں کی طرح ہو جاؤ

ایک نکتہ

- ۵۶۸ حواریین کون ہیں؟

سورہ جمعہ

۵۸۰

حُب فی اللہ اور بغض فی اللہ بنیادی اصل ہے ۵۲۶

آیت ۹ تا ۹ ۵۲۷

ان کفار سے دوستی جو برہم پیکار نہیں ہیں ۵۲۸

آیت ۱۱، ۱۰ ۵۳۱

شان نزول ۵۳۲

مسلمانوں اور کفار کے نقصان کی تلافی ۵۳۳

آیت ۱۱ ۵۳۴

مؤمنوں کے لیے بھی عدالت ۵۳۷

آیت ۱۲ ۵۳۸

عورتوں کی بیعت کی شرائط ۵۳۹

چند نکات

۱۔ عورتوں کی بیعت کا ان کی اسلامی

شخصیت کے ساتھ ربط ۵۴۰

۲۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ کا ماجرا ۵۴۱

۳۔ معروف میں اطاعت ۵۴۲

آیت ۱۳ ۵۴۳

اس مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو ۵۴۴

سورہ صف

۵۴۵

سورہ صف کے مضامین ۵۴۷

سورہ صف کی تلاوت کی فضیلت ۵۴۷

آیت ۱ تا ۴ ۵۴۹

شان نزول ۵۵۰

فلادی دیوار کی طرح جم کر لڑنے والے ۵۵۰

۶۱۴ سورہ منافقون کی تلاوت کی فضیلت

۶۱۶ آیت ۴ تا ۲

۶۱۷ سرچشمہ نفاق اور منافقین کی نشانیاں

۶۲۴ آیت ۸ تا ۵

۶۲۵ شان نزول

۶۲۶ منافقین کی دیگر نشانیاں

چند نکات

۶۳۱ ۱۔ منافق کی دس نشانیاں

۶۳۲ ۲۔ منافقین کا خطرہ

۶۳۳ ۳۔ منافقین بے اخلاص اور ٹوٹنے

۶۳۴ والا ہے۔

۶۳۵ ۴۔ عزت خدا اور اس کے دوستوں کیلئے

۶۳۶ مخصوص ہے

۶۳۷ آیت ۹ تا ۱۱

۶۳۸ مال اور اولاد تمہیں خدا کی راہ سے غافل

۶۳۹ نہ کر دیں۔

چند نکات

۶۳۹ ۱۔ پریشانیوں پر غلبہ کی راہ

۶۴۰ ۲۔ نفاق، اعتقادی و عملی

سورہ تغابن

۶۴۲

۶۴۳ سورہ تغابن کے مضامین و مطالب

۶۴۴ اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

۶۴۵ آیت ۱ تا ۶

۵۸۱ سورہ جمعہ کے مضامین

۵۸۱ سورہ جمعہ کی تلاوت کی فضیلت

۵۸۳ آیت ۴ تا ۲

۵۸۴ پیغمبر کی بعثت کا مقصد

ایک نکتہ

۵۸۹ فضل خدا حساب سے ہوتا ہے

۵۹۰ آیت ۸ تا ۵

۵۹۱ ایسا چوپایہ جس پر کتابیں لہری ہوں

چند نکات

۵۹۵ ۱۔ عالم بے عمل

۵۹۶ ۲۔ میں موت سے کیوں ڈروں؟

۵۹۹ آیت ۹ تا ۱۱

۶۰۰ شان نزول

۶۰۰ ہفتہ کا عظیم ترین عبادی سیاسی اجتماع

چند نکات

۶۰۴ ۱۔ اسلام میں پہلی نماز جمعہ

۶۰۵ ۲۔ نماز جمعہ کی اہمیت

۶۰۶ ۳۔ نماز عبادی سیاسی جمعہ کا فلسفہ

۶۰۷ ۴۔ نماز جمعہ کے آداب اور خطبوں کے

مطالب و مضامین۔

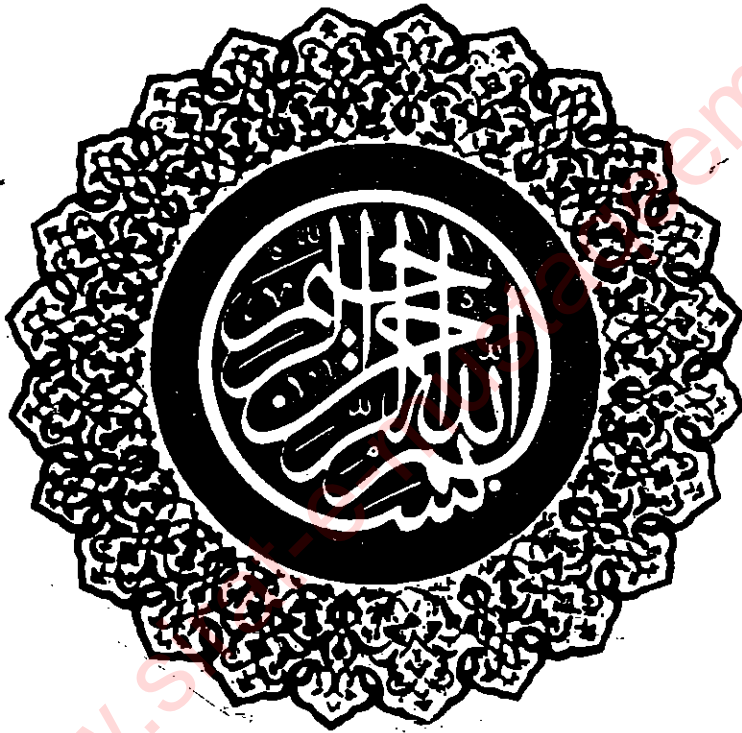
۶۱۱ نماز جمعہ کے وجوب کی شرائط

سورہ منافقون

۶۱۳

۶۱۴ سورہ منافقون کے مطالب

۶۶۱	آیت ۴ تا ۱۸	۶۴۶	وہ دلوں میں چھپے ہوئے اسرار سے آگاہ ہے۔
۶۶۲	شانِ نزول	۶۵۱	آیت ۷ تا ۱۰
۶۶۳	تمہارے اموال و اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں۔	۶۵۲	تغابن کا دن اور غبنوں کا آشکار ہونا
	ایک نکتہ	۶۵۷	آیت ۱۱ تا ۱۳
۶۶۹	ایک پُر معنی حدیث	۶۵۷	تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں
	‡ ‡ ‡		



اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ

تفسیر نمونہ جلد ۱۳

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں۔

سُورَةُ طُور: مکی سورت ہے اور اس کی ۴۹ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۷

سُورَةُ نَجْم: مکی سورت ہے اور اس کی ۶۲ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۷

سُورَةُ قَمَر: مکی سورت ہے اور اس کی ۵۵ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۷

سُورَةُ رَحْمٰن: مدنی سورت ہے اور اس کی ۷۸ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۷

سُورَةُ وَاَقْع: مکی سورت ہے اور اس کی ۹۶ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۷

سُورَةُ حٰلِیْد: مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۹ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۷

سُورَةُ مَجٰدِل: مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۲ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۸

سُورَةُ حٰشِر: مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۴ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۸



سُورَةُ مَتَّحِنَا : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۳ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۸

سُورَةُ صَف : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۴ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۸

سُورَةُ جَمْعَا : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۱ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۸

سُورَةُ مَنَافِقُونَ : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۱ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۸

سُورَةُ تَغَابِن : مدنی سُورت ہے اور اس کی ۱۸ آیات ہیں۔

پارہ — ۲۸

www.sirat-e-mustaqeem.net

سُورَةُ طُور

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۴۹ آیات ہیں

اعجاز

جمعہ ۱۰ صفر ۱۴۰۶ھ

۱۳۶۴/۸/۳

سُورَةُ طُورِ کے مطالب

یہ سورہ بھی انہی سورتوں میں سے ہے جس کے مباحث کا زیادہ زور، ایک طرف تو معاد اور نیک اور پاک لوگوں کی تقدیر کے مسئلہ پر ہے، اور دوسری طرف اس عظیم دن مجرموں اور بدی کرنے والوں سے متعلق ہے، اگرچہ کچھ دوسرے مطالب بھی اس میں مختلف اعتقادی سلسلوں میں نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر اس سورہ کے مضامین کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اس سورہ کی پہلی آیات، جو پلے درپلے قسموں سے شروع ہوتی ہیں، عذاب الہی، قیامت کی نشانیوں، جہنم کی آگ اور کفار کی سزاؤں کے بارے میں بحث کرتی ہیں، (آیت ۱ تا ۱۶)۔

۲۔ اس سورہ کا ایک دوسرا حصہ بہشت کی نعمتوں اور قیامت میں مواہب الہی جو پرہیزگاروں کے انتظار میں ہیں انہیں تفصیل سے بیان کرتا ہے، اور یکے بعد دیگرے ان کی طرف توجہ دلاتا ہے، اور حقیقت میں بہشت کی اکثر نعمتوں کا سورہ کے اسی حصہ میں اشارہ ہوا ہے، (آیت ۱۷ تا ۲۸)۔

۳۔ اس سورہ کا تیسرا حصہ پیغمبر اسلام کی نبوت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور ان اتہامات کو جو دشمنوں نے ان پر لگائے تھے بیان کرتا ہے، اور مختصر طور پر ان کا جواب دیتا ہے (آیت ۲۹ تا ۳۴)۔

۴۔ چوتھے حصہ میں توحید کے سلسلہ میں گفتگو ہے اور اس مسئلہ کو واضح استدلال کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ (آیت ۳۵ تا ۴۲)

۵۔ سورہ کے اس حصہ میں پھر مسئلہ معاد، اور روز قیامت کی کچھ مخصوص باتوں کی طرف لوٹتا ہے (آیت ۴۳ تا ۴۷)

۶۔ آخر میں، سورہ کے آخری حصہ میں، جو دو سے زیادہ آیات نہیں ہیں، پیغمبر گرامی اسلام کو صبر و استقامت اور پرہیزگار کی تبلیغ و حمد کے احکام، اور خدا کی طرف سے حمایت کے وعدے کے ساتھ، گذشتہ مباحث کو ختم کرتا ہے، اور اس طرح سے ایک منظم، جاذب، منطقی اور عاطفی مجموعہ کو تیار کرتا ہے جو سننے والوں کے دلوں کو اپنا مسخر کرتا ہے۔

ضمنی طور پر اس سورہ کا نام ”طور“ کے ساتھ، اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

اس سورت کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر نے فرمایا:

”مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الطُّورِ، كَانَ حَقًّا عَلَى اللَّهِ أَنْ يُؤْمِنَهُ مِنْ عَذَابِهِ وَأَنْ يَنْعَمَهُ فِي جَنَّتِهِ“

”جو شخص سورۃ طور کی تلاوت کرے تو خدا پر لازم ہے کہ اسے اپنے عذاب سے مامون قرار دے،
اور اسے اپنی بہشت کی نعمتوں سے بہرہ ور کرے۔“
ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے :

”من قرأ سورة الطور جمع الله له خيرا الدنيا والاخرة
”جو شخص سورۃ طور کی تلاوت کرے خدا دنیا و آخرت کی بھلائی اس کے لیے جمع کر دے گا۔“
 واضح ہے کہ یہ سب اجر اور عظیم پاداش دنیا و آخرت میں ان لوگوں کے لیے ہے، جو اس ”تلاوت کو غور و فکر کا وسیلہ اور اس
(غور و فکر) کو راہ ”عمل“ کے لیے آمادگی کا وسیلہ قرار دے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

- ۱۔ وَالطُّورِ ۝
- ۲۔ وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ ۝
- ۳۔ فِي رَقٍّ مَّنْشُورٍ ۝
- ۴۔ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ۝
- ۵۔ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ ۝
- ۶۔ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ ۝
- ۷۔ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝
- ۸۔ مَّالَهُ مِنْ دَافِعٍ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱۔ قسم ہے ”کوہ“ طور کی۔
- ۲۔ اور اس کتاب کی جو لکھی گئی ہے۔
- ۳۔ وسیع صفحہ پر۔
- ۴۔ اور بیت المعمور کی قسم۔
- ۵۔ اور بلند کی ہوئی پھٹ کی۔
- ۶۔ اور بھڑکتے ہوئے لبریز سمندر کی۔

۷۔ کہ تیرے پروردگار کا عذاب واقع ہو کر رہے گا۔
۸۔ اور کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوگی۔

تفسیر بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم

یہ سورہ ان سوروں میں سے ایک اور سورہ ہے جو قسم سے شروع ہوتے ہیں ایسی قسمیں جو ایک اہم واقعیت کو بیان کرتی ہیں یعنی مسئلہ معاد و قیامت، قبروں سے اٹھنا اور انسانوں کے اعمال کا محاسبہ۔
اس مسئلہ کی اہمیت اس قدر ہے، کہ خدا نے قرآن کی مختلف آیات میں بہت سے مقدسات کے حصوں کی قسم کھائی ہے تاکہ اس دن کی عظمت اور اس کے حقیقی طور پر واقع ہونے کو واضح کرے۔
وہ پانچ قسمیں، جو اس سورہ کے آغاز میں نظر آتی ہیں، ایسے سربستہ اور فکر انگیز معانی رکھتی ہیں کہ مفسرین نے ان کی تفسیر میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔

فرماتا ہے: ”کوئی طور کی قسم“ (والطور)۔

”اور قسم ہے اس کتاب کی جو لکھی گئی ہے“ (و کتاب مسطور)۔

”وسیع اور کشادہ صفحہ پر“ (فی رق منشور)۔

”اور بیت المعمور کی قسم“ (والبیت المعمور)۔

”اور بلند چھت کی قسم“ (و السقف المرفوع)۔

”اور بھڑکتے ہوئے لبریز سمندر کی قسم“ (و البحر المسجور)۔

”کہ تیرے پروردگار کا عذاب حقیقی طور پر واقع ہو کر رہے گا“ (ان عذاب ربك لواقع)۔

”اور کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوگی“ (ماله من دافع)۔

”طور“ لغت میں ”پہاڑ“ کے معنی میں ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ لفظ قرآن مجید کی ۱۰ آیات میں

بیان ہوا ہے، جن میں سے ۹ مواقع پر ”طور سینا“ — وہی پہاڑ جہاں موسیٰ پر وحی نازل ہوئی تھی — سے متعلق گفتگو ہے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں (خصوصاً الف و لام ہند کی طرف توجہ کرتے ہوئے) یہاں بھی اسی معنی میں ہے۔

اس بنا پر خدا نے پہلے مرحلہ میں روئے زمین کے مقدس مقامات میں سے ایک مقدس مقام کی — جس میں وحی الہی نازل ہوئی تھی — قسم کھائی ہے۔

”کتاب مسطور“ کی تفسیر میں بھی طرح طرح کے احتمال دیئے گئے ہیں۔

بعض نے اسے لوح محفوظ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور بعض نے قرآن مجید کی طرف، اور بعض نے نامہ اعمال کی طرف، اور بعض نے اس تورات کی طرف جو موسیٰ پر نازل ہوئی تھی۔ لیکن اس قسم کی مناسبت سے جو اس سے پہلے آئی ہے یہ تعبیر یا تو تورات کی طرف اشارہ ہے یا سب کتب آسمانی کی طرف۔

”رق“ کا لفظ ”رقت“ کے مادہ سے اصل میں نازک اور لطیف ہونے کے معنی میں ہے۔ اور کاغذ یا اس باریک چمڑے کو بھی کہا جاتا ہے، جس پر کوئی مطلب لکھا جائے۔ اور ”منشور“ پھیلے ہوئے کے معنی میں ہے (بعض کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ درخشندگی اور لمعان کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے)۔

اس بنا پر یہ قسم ایسی کتاب کی کھائی گئی ہے جو بہترین صفحات میں سے ایک بہترین صفحہ پر لکھی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کھلی ہوئی اور کشادہ ہے نہ کہ لپیٹی ہوئی۔

”بیت المعمور“ کے بارے میں بھی گونا گوں تفاسیر ہوئی ہیں، بعض نے تو اسے ایسے گھر کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو آسمانوں میں خانہ کعبہ کے عین اوپر ہے۔ اور فرشتوں کی عبادت کے ساتھ معمور و آباد ہے، یہ معنی ان متعدد روایات میں جو مختلف اسلامی منابع میں آئی ہیں — نظر آتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق ہر روز ستر ہزار فرشتے اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں، اور دوبارہ کبھی بھی اس کی طرف پلٹ کر نہیں آتے۔

بعض نے اس کی کعبہ اور زمین میں خانہ خدا سے تفسیر کی ہے جو زوار اور حاجیوں کے ساتھ ہمیشہ معمور و آباد رہتا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جو روئے زمین پر عبادت کے لیے بنایا گیا ہے اور آباد ہوا ہے۔

لیکن آیت کا ظاہر پہلے دو معانی میں سے کوئی ایک ہے اور مختلف تعبیروں کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو قرآن میں ”کعبہ“ کے سلسلہ میں ”بیت“ کے عنوان سے آئی ہیں، دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

باقی رہا ”سقف مرفوع“ تو اس سے مراد آسمان ہے۔ کیونکہ سورۃ انبیاء کی آیت ۳۲ میں آیا ہے کہ: وجعلنا السماء سقفا محفوظا۔ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا ہے، اور سورۃ نازعات کی آیت ۲۷ اور ۲۸ میں آیا ہے کہ: اشد خلقا ام السماء بناها: کیا تمہاری نئے سرے سے خلقت زیادہ اہم ہے یا آسمان کی خلقت کہ جسے خدا نے برپا کیا ہے۔ اس کی چھت کو بلند کیا ہے اور اسے منظم و مرتب بنایا ہے۔

”سقف“ کی تعبیر ممکن ہے اس لحاظ سے ہو، کہ ستاروں اور آسمانی کرات نے اس طرح سے سارے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے، کہ وہ چھت کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اطراف زمین کی فضا کی طرف اشارہ ہو، کہ ہوا کے پھیلے ہوئے

قشر نے ایک مضبوط چھت کی طرح اس کے اطراف کو گھیرا ہوا ہے۔ اور اس کی آسانی پتھروں کے حملوں اور نقصان دہ کیہانی شعاعوں سے اچھی طرح حفاظت کرتی ہے۔

”مسجور“ کے لیے لغت میں دو معانی ذکر ہوئے ہیں، ایک ”بھڑکنے والا“ اور دوسرا ”پُر“ راعب مفردات میں کہتا ہے کہ ”سجور“ (بروزن فجر) آگ کے شعلہ درہونے کے معنی میں ہے، اور اوپر والی آیت کو بھی اسی معنی میں سمجھتا ہے، دہ دوسرے معنی کی بات درمیان میں نہیں لایا۔ لیکن مرحوم ”طبرسی“ نے ”مجمع البیان“ میں پہلا معنی یہی ذکر کیا ہے، اور بعض کتب لغت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، قرآن کی دوسری آیات بھی پہلے معنی کی تائید کرتی ہیں، جیسا کہ سورۃ نون کی آیت ۲۷، ۲۸ میں آیا ہے کہ: یسحبون فی الحمیم شمر فی النار یسجرون: انہیں جلانے والے پانی میں کھینچیں گے، پھر وہ شعلہ درآگ میں ہوں گے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کے ارشادات میں ”حدیدہ محما“ کی داستان میں جو ان کے بھائی عقیل کے ساتھ تھے، یہ بیان ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

اتأن من حدیدۃ احماھا انسانھا للعبہ و تجر فی الی نار سجرتها
جبارھا الغضبہ

”کیا اس لوہے سے جسے ایک انسان نے مذاق کے طور پر گرم کیا ہے، تم نالہ و فریاد کر رہے ہو۔ لیکن مجھے ایسی آگ کی طرف کھینچتے ہو، جسے پروردگار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے؟“

لیکن یہ ”بحر مسجور“ اور بھڑکتا ہوا سمندر کہاں ہے؟ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد ہمارے کمرۂ زمین کے سمندر بھی مراد ہیں، جو قیامت کے قریب بھڑک اٹھیں گے اور پھر بھٹ جائیں گے، جیسا کہ سورۃ تکویر کی آیت ۶ میں آیا ہے: واذا البحار سجرت: ”جب دریا بھڑک اٹھیں گے“ اور سورۃ انفطار آیہ ۳ میں پڑھتے ہیں واذا البحار فجرت: جب دریا پھٹ جائیں گے لیکن بعض نے اس کی ان معنی مادوں کے ساتھ تفسیر کی ہے جو کمرۂ زمین کے اندر ہیں۔ ایک حدیث بھی جو تفسیر عیاشی میں امام باقرؑ سے نقل ہوئی ہے اس معنی پر شاہد ہے، اس حدیث میں آیا ہے کہ ”قارون“ کو ”بحر مسجور“ میں عذاب ہو رہا ہے حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ: ”قارون اور خزانہ زمین کی گہرائیوں میں دھنس گیا۔“ ففسفناہ و بدارة الارض“ (قصص - ۸۱)۔

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں اور ممکن ہے کہ اوپر والی آیت میں دونوں کی قسم کھائی گئی ہو کیونکہ دونوں خدا کی آیات اور اس جہان کے عظیم عجائبات میں سے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ مفسرین نے ان پانچوں قسموں کے مفہوم کی، ایک دوسرے کے ساتھ ربط کی کیفیت کے بلے

میں کوئی خاص بحث نہیں کی ہے، لیکن نظریہ آتا ہے کہ پہلی تین قسمیں تو ایک دوسرے کے ساتھ قریبی ربط رکھتی ہیں، کیونکہ وہ سب وحی اور اس کے خصوصیات کی بات کرتی ہیں ”کوہ طور“ محل نزول وحی تھا، اور ”کتاب مسطور“ بھی آسمانی کتاب کی طرف اشارہ ہے چاہے وہ تورات ہو یا قرآن، اور ”بیت المعمور“ فرشتوں اور خدا کے پیک وحی کے آنے جانے کا محل ہے۔

لیکن دوسری دو قسمیں آیات ”تکوینی“ کی بات کرتی ہیں، پہلی تین قسموں کے مقابلہ میں جو ”تشریحی آیات“ کی باتیں کرتی ہیں ان دو قسموں میں سے ایک توحید کی اہم ترین نشانی یعنی با عظمت آسمان کی طرف اشارہ ہے۔ اور دوسری معاد و قیامت کی ایک اہم نشانی ہے جو قرب قیامت میں قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے کے وقت رونما ہوگی۔

اس بنا پر ان پانچوں قسموں میں ”توحید“ ”نبوت“ اور ”معاد“ جمع ہے۔

بعض مفسرین جو ان تمام آیات کو ”موسیٰ“ اور ان کی سرگزشت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، ان آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اس طرح سے بیان کیا ہے، ”طور تو وہی پہاڑ ہے جس میں موسیٰ پر وحی نازل ہوتی تھی، اور ”کتاب مسطور“ تورات ہے۔ بیت المعمور فرشتہ وحی کی آمد و رفت کا مرکز ہے (اور احتمال ہے کہ مراد بیت المقدس ہو) اور سقف مرفوع وہی ہے جو بنی اسرائیل کی داستان میں آیا ہے، واذ نتقنا الجبل فوقہم کاندہ ظلۃ، اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پہاڑ کو سا تباں کی طرح بنی اسرائیل کے سر پر بلند کر دیا“ (اعراف - ۱۷۱)۔

اور ”بحر مسجور“ آگ کا وہ سمندر ہے جس میں قارون کو دین موسیٰ کی مخالفت کی بنا پر عذاب ہو رہا ہے۔ لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، اور ان روایات کے ساتھ بھی، جو منابع اسلامی میں آئی ہیں، سازگار نہیں ہے، اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے سقف مرفوع قرآن کی دوسری آیات اور ان روایات کی گواہی سے جو آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہیں، آسمان کی طرف اشارہ ہے۔

جو نکتہ یہاں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان قسموں کا اس موضوع کے ساتھ جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں کیا ربط ہے؟ اس سوال کا جواب ان مطالب کی طرف توجہ کر کے سے جو اوپر بیان ہوئے ہیں واضح ہو جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اوپر والی قسمیں، جو عالم ”تکوین و تشریع“ میں خدا کی قدرت کے محور پر گردش کر رہی ہیں، اس حقیقت کو بیان کر رہی ہیں کہ ایسی ذات اس بات پر اچھی طرح سے قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرے، اور قیامت برپا کرے، یہ وہی چیز ہے کہ جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں، جیسا کہ ان آیات کے آخر میں بیان ہوا ہے، ”ان عذاب ربك لواقع ماله من دافع“

- ۹۔ یَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۝
 ۱۰۔ وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝
 ۱۱۔ فَوَيْلٌ لِلْيَوْمِ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝
 ۱۲۔ الَّذِينَ هُمْ فِي خَوْضٍ يَلْعَبُونَ ۝
 ۱۳۔ يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ نَارِ جَهَنَّمَ دَعَاً ۝
 ۱۴۔ هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ۝
 ۱۵۔ أَفَسِحْرُ هَذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ ۝
 ۱۶۔ اصْلَوْهَا فَاصْبِرُوا أَوْ لَا تَصْبِرُوا سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ
 مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

۹۔ (یہ عذاب الہی) اس دن آئے گا جب آسمان شدت کے ساتھ ہل رہا ہوگا۔

۱۰۔ اور پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ کر حرکت کر رہے ہوں گے۔

۱۱۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۱۲۔ وہی لوگ جو باطل باتوں میں بہو و لعب کر رہے ہیں۔

۱۳۔ وہ دن جس میں انہیں زبردستی جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا۔

۱۴۔ (اور ان سے کہا جائے گا) یہی ہے وہ آگ جس کا تم انکار کیا کرتے تھے۔

۱۵۔ کیا یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں ہو؟

۱۶۔ اس میں داخل ہو جاؤ، اور جلتے رہو، چاہے صبر کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ تمہیں صرف تمہارے اعمال کی ہی جزا ملے گی۔

تفسیر

تمہاری جزا صرف تمہارے اعمال ہیں

گذشتہ آیات میں، قیامت میں عذاب الہی کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوا تھا، زیر بحث آیات اس معنی کی توضیح و تفسیر ہے، پہلے قیامت کی بعض خصوصیات کو بیان کرتا ہے اور پھر تکذیب کرنے اور جھٹلانے والوں کے عذاب کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ فرماتا ہے: ”یہ عذاب الہی اس دن آئے گا جب آسمان (آسمانی کرات) شدت کے ساتھ حرکت کر رہے ہوں گے، اور ہر طرف آ جا رہے ہوں گے، (یوم تمور السماء موڑا)۔“

”مور“ (مردن قول) لغت میں مختلف معانی میں آیا ہے ”راغب“ مفردات میں کہتا ہے ”مور“ تیزی کے ساتھ رواں دواں ہونے کے معنی میں ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس گردوغبار کو بھی جسے ہوا ہر طرف لے جاتی ہے ”مور“ کہتے ہیں۔ ”لسان العرب“ میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”مور“ حرکت اور گرنے جانے کے معنی میں ہے، لہٰذا تیزی کے معنی میں بھی آیا ہے، اور بعض نے ”مور“ کی دورانی حرکت سے بھی تفسیر کی ہے۔

ان تفاسیر کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ”مور“ اسی حرکت سرزح اور دورانی کو کہتے ہیں جو آمدورفت اور اضطراب و توج کے ساتھ ہوتی ہے۔

اس طرح سے کرات آسمانی پر حکمران نظام، قیامت کے قریب درہم برہم ہو جائے گا، وہ اپنے مداروں سے منحرف ہو جائیں گے، اور ہر طرف آمدورفت کریں گے، اور پھر انہیں لپیٹ کر تہ کر دیا جائے گا، اور ان کی جگہ خدا کے حکم سے ایک نیا آسمان برپا ہوگا جیسا کہ سورۃ انفیاء کی آیت ۴۸ میں کہتا ہے: یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب: وہ دن جس میں آسمان کو طواری کی طرح لپیٹ دیں گے۔

اور سورۃ ابراہیم کی آیت ۴۸ میں یہ آیا ہے: یوم تبدل الارض غیر الارض والسموات:

”وہ دن جس میں یہ زمین دوسری زمین سے، اور یہ آسمان دوسرے آسمانوں سے بدل جائیں گے۔“

قرآن کی دوسری آیات میں بھی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں، جو کرات آسمانی کے شگافہ ہونے کی خبر دیتی ہیں۔ (انفطار - ۱) اور ان کے اپنی جگہ سے اکٹھ جانے کی (تکویر - ۱۱) اور ان کے درمیان فاصلہ پڑنے کی (مرسلات - ۹) حکایت کرتی ہیں۔ ہم انشاء اللہ ان آیات کے ذیل میں بھی اس سلسلہ میں بحث کریں گے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اور وہ دن کہ جس میں پہاڑ حرکت میں آجائیں گے“ (و تسیر الجبال سیراً)۔ ہاں پہاڑ اپنی جگہ سے اکٹھ جائیں گے اور حرکت کرنے لگیں گے اور اس کے بعد قرآن کی دوسری آیات کی شہادت کی بنا پر کچھ جائیں گے ”سہمہ المنقوش“ (دھنکی ہوئی روئی) کی طرح ہو جائیں گے۔ (قارع - ۵) اور اس کی جگہ ایک صاف اور ہموار بے آب و گیاہ زمین ظاہر ہوگی، فیذرها قاعاً صافصفاً۔ (طہ - ۱۰۶)۔

یہ سب اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ یہ دنیا اور اس کی تمام پناہ گاہیں درہم برہم ہو جائیں گی، اور ایک نیا جہان نئے نظاموں کے ساتھ اس کی جگہ لے لے گا، اور انسان اپنے اعمال کے نتائج کے روبرو ہوگا۔

لہذا اس کے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”جب ایسا ہے تو پھر اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے وائے ہے!“ (فویل یومئذ للمکذبین)۔

ہاں! جب یہ عالم کی دگرگونی سے پیدا ہونے والے اضطراب اور وحشت نے سب کو گھیر رکھا ہوگا، اس وقت ایک عظیم وحشت، مکذبین کو لاحق ہوگی، جو کہ عذاب الہی ہے چونکہ ”ویل“ ایک نامطلوب حادثہ کے وقوع پر تاسف و اندوہ کا اظہار ہے۔ اس کے بعد ان مکذبین کا تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہی لوگ جو باطل باتوں کے ساتھ کھیل کودیں مشغول ہیں، الذین ہم فی خوض یلعبون)۔

یہ آیات قرآن کو ”جھوٹ“ اور پیغمبر کے معجزات کو ”جادو“ کہتے ہیں، اور ان کے لانے والے کو ”مجنون“ شمار کرتے ہیں، تمام حقائق کو کھیل تماشا قرار دیتے ہوئے ان کا مذاق اڑاتے اور ٹھٹھا کرتے ہیں۔

باطل اور بے دلیل باتوں کے ساتھ حق سے جنگ کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے کسی تہمت اور جھوٹ سے انکار نہیں کرتے۔

”خوض“ (بروزن خوض) باطل اور غلط باتوں میں وارد ہونے کے معنی میں ہے، اور اصل میں پانی میں وارد ہونے اور اسے عبور کرنے کے معنی میں ہے۔

دوبارہ اس دن کا تعارف اور ان مکذبین کی سرگذشت کے بیان کے لیے ایک دوسری وضاحت کرتے ہوئے مزید کہتا۔

۱۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۷ ص ۲۳ (سورہ طہ کی آیت ۱۰۵ کے ذیل میں) رجوع کریں۔

۲۔ ”فویل“ میں ”فا“ تفویح کا ہے، یعنی چونکہ اس دن کوئی پناہ گاہ نہیں ہے لہذا ان تکذیب کرنے والوں پر وائے

ہے۔

”وہ دن جس میں وہ خوشنوت اور سختی کے ساتھ جہنم کی آگ کی طرف ہانکے جائیں گے“ (یوم یدعون الی نار جہنم دُعًا)۔
 ”ان سے کہا جائے گا یہ وہی آگ ہے جس کا تم انکار کیا کرتے تھے (ہذہ النار الیٰ کنتم بہا تکذیون)۔
 اور ان سے یہ بھی کہا جائے گا: ”کیا یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے نہیں ہو؟“ (افسحر ہذا ام انتم لا تبصرون)۔
 تم ہمیشہ دنیا میں یہ کہا کرتے تھے، محمدؐ جو کچھ لایا ہے وہ جادو ہے، اس نے جادوگری کے ذریعہ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے تاکہ ہم حقائق کو نہ دیکھیں، ہماری عقل کو ختم کر دیا ہے، اور کچھ امور کو ”معجزہ“ کے نام سے تعارف کراتا ہے، اور کچھ باتیں ”وحی الہی“ کے عنوان سے ہمارے سامنے پڑھتا ہے، لیکن یہ سب چیزیں بے بنیاد ہیں، اور جادو کے سوا کچھ نہیں ہیں۔
 لہذا قیامت کے دن سرزلش اور توبیخ کے عنوان سے — جب کہ وہ جہنم کی آگ کو دیکھیں گے اور اس کی حرارت کو محسوس کریں گے — ان سے کہا جائے گا، ”کیا یہ جادو ہے؟“ کیا تمہاری آنکھوں پر پردہ ڈالا گیا ہے؟
 اسی طرح ان سے کہا جائے گا: ”اس آگ میں داخل ہو جاؤ، اور اس میں جلتے رہو، چاہے صبر و شکیبائی کرو یا بیتابی اور گڑگڑانا، تمہارے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا“ (اصلوہا فاصبروا ولا تصبروا سوا علیکم)۔
 ”کیونکہ تمہارے اعمال کا بدلہ صرف تمہارے اپنے ہی اعمال ہیں“ (انما تجزون ما کنتم تعملون)۔
 یہاں! یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جو تمہاری طرف پلٹے ہیں، اور تمہارے پاؤں کی زنجیریں لگے ہیں، اس بنا پر گڑگڑانا اور آہ و نالہ اور اضطراب و بے تابی کوئی اثر نہیں رکھتی۔
 یہ آیت ”تجسم اعمال“ کے مسئلہ اور ان کی انسان کی طرف بازگشت پر ایک جدید تاکید ہے، اور یہ پروردگار کی عدالت کے مسئلہ پر بھی ایک تاکید مجدد ہے۔ چونکہ جہنم کی آگ چاہے جتنی بھی جلانے والی ہو، اور اس کا عذاب چاہے جتنا دردناک ہو وہ خود انسانوں کے اعمال کے نتیجے اور ان کی تبدیل شدہ شکلوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

چند نکات

- ۱۔ مجرموں کو دوزخ میں کس طرح لے جائیں گے۔
 اس میں تو شک نہیں کہ انہیں جہنم کی طرف حقارت کے ساتھ، ذلیل کرتے ہوئے، جھڑکتے ہوئے، اور عذاب کرتے ہوئے لے جائیں گے، لیکن قرآن کی مختلف آیات میں اس سلسلہ میں گونا گوں تعبیریں نظر آتی ہیں۔
 سورہ ”حاقہ“ کی آیت ۳۰ و ۳۱ میں آیا ہے کہ: خذوہ فاعتلوہ ثم الجحیم صلّوہ: اس کو پکڑ لو، اور طوق و زنجیر میں جکڑ لو اور اس کے بعد جہنم کی آگ میں ڈال دو۔
 اور سورہ ”دخان“ کی آیت ۴۷ میں اس طرح آیا ہے کہ: خذوہ فاعتلوہ الیٰ سوا الجحیم: اس کو

لے ”دع“ (بروزن جد) شدت کے ساتھ دھکیلے اور خوشنوت و سختی کے ساتھ ہانکنے کے معنی میں ہے ”یوم“ ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے یا قبل کی آیت کے لفظ ”یومئذ“ کا بدل ہے۔

پکڑ لو، اور سختی کے ساتھ اسے جہنم میں دھکیل دو۔

متحد آیات میں ”سوق“ اور ہانکنے کی تعمیر آئی ہے مثلاً سورہ مریم کی آیت: ”ونسوق المجرمین الی جہنم و سردا“ ہم مجرموں کو (ان پیاسے اونٹوں کی طرح جنہیں پانی کی جگہ کی طرف لے جایا جاتا ہے) جہنم کی طرف ہانکیں گے۔

اس کے برعکس پرہیزگاروں اور متقیوں کو انتہائی احترام و اکرام کے ساتھ بہشت کی طرف لے جائیں گے، اور خدا کے فرشتے ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھیں گے، بہشت کے دروازوں کو ان کے لیے کھول دیا جائے گا، اور خاندان جنت انہیں سلام اور خوش آمدید کہیں گے، اور انہیں بہشت میں ہمیشہ ہمیشہ کی سکونت کی بشارت دیں گے، (زمر-۷۳)۔

اس طرح سے ”بہشت“ اور ”دوزخ“ نہ صرف خدا کی ”ہر“ اور ”قہر“ کا مرکز ہے، بلکہ ان میں سے ہر ایک میں داخلہ کے لیے پذیرائی بھی اسی مفہوم کو بیان کرنے والی ہے۔

۲۔ وہ لوگ جو باطل باتوں میں غوطہ زن ہیں

اگرچہ اوپر والی آیات میں، قرآن کا ہدف کلام زمانہ پیغمبر کے مشرکین ہیں، لیکن بلا شک یہ آیات عمومیت رکھتی ہیں۔ اور تمام کمذبین ان میں شامل ہیں، یہاں تک کہ مادی فلاسفہ (سائنس دان) جو ٹھٹھی بھر ناقص خیالات و افکار میں غوطہ زن ہیں، عالم ہستی کے حقائق کو کھیل بنائے ہوئے ہیں، اور سوائے اس چیز کے جسے وہ اپنی قاصر عقل سے دریافت کرتے ہیں، کسی چیز کو قبول نہیں کرتے، وہ اسی بات کی توقع رکھتے ہیں کہ تمام چیزوں کو اپنی آزمائش گاہ میں دوڑیں گے، ذریعہ دیکھیں، یہاں تک کہ خدا کی پاک ذات کو بھی، ورنہ اس کے وجود کو رسمی طور پر قبول نہیں کرتے۔

یہ بھی ”فی خوض یلعبون“ کے مصداق ہیں، اور باطل خیالات و نظریات کے ایک انبوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

انسانی عقل اپنے تمام تر فروغ کے باوجود نوروحی کے مقابلہ میں ایک شمع کے مانند ہے جو آفتاب عالم تاب کے سامنے روشن ہو۔ یہ شمع اس کو اجازت دیتی ہے کہ جہان مادہ کے تاریک ماحول سے نکل کر اور مادہ و طبیعت عالم کی طرف دروازہ کھولے، اور پھر آفتاب وحی کے نور میں ہر طرف پرواز کرے، اور بے کراں جہان کو دیکھے اور پہچانے۔

۱۷۔ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ ۝

۱۸۔ فَبِهِمُ مِمَّا آتَاهُمُ رَبُّهُمْ وَوَقَّاهُمْ مَسْأَلَهُمْ عَذَابِ
الْجَحِيمِ ۝

۱۹۔ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

۲۰۔ مُتَّكِئِينَ عَلَى سُرُرٍ مَصْفُوفَةٍ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ۝

۲۱۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ
ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ
بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝

ترجمہ

۱۷۔ لیکن پرہیزگار جنت کے باغوں اور فراوان نعمتوں میں ہوں گے۔

۱۸۔ اور جو کچھ ان کے پروردگار نے انہیں دیا ہے اس پر شاد و مسرور ہوں گے۔ اور ان کا پروردگار انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔

۱۹۔ (انہیں کہا جائے گا) کھاؤ اور پیو اور خوش رہو یہ سب کچھ ان اعمال کی وجہ سے ہے جنہیں تم انجام دیا کرتے تھے۔

۲۰۔ ان کی حالت یہ ہوگی کہ وہ قطاروں میں بچھائے گئے تختوں کے اوپر پہلو بہ پہلو تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، اور ہم ان کی حور العین کے ساتھ تزویج کریں گے۔

۲۱۔ اور جو لوگ ایمان لائے، اور ان کی اولاد نے ان کی پیروی میں ایمان قبول کیا، تو ہم نے انکی اولاد کو بھی جنت میں ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے، اور ان کے عمل میں سے کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے، اور ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروہی ہے۔

تفسیر ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروہی ہے

ان مباحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں مجرمین کی سزاؤں اور ان کے دردناک عذاب کے بارے میں گزرے ہیں۔ درجستہ آیات میں ان کے نقطہ مقابل یعنی فزاواں نعمتوں اور بیکراں صلوات کے لیے جو مومنین اور پروردگاروں کو عطا کئے جائیں گے اشارہ کرتا ہے تاکہ ایک واضح موازنہ میں ہر ایک کی حیثیت واضح ہو جائے۔

پہلے کتاب ہے، ”پرہیزگار جنت کے باغات میں فزاواں نعمتوں میں مقیم ہوں گے“ (ان المعتقدین فی جنات و نعییم)۔ ”مومنین“ کی بجائے ”معتقدین“ کی تعبیر اس لیے ہے کہ یہ لفظ ایمان کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اور عمل صالح کے پہلوؤں کو بھی، جیسا کہ قرآن سورہ بقرہ کی آیت ۲ میں کہتا ہے: ذلک الکتاب لاریب فیہ ہدی للمعتقدین: اس آسمانی کتاب میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اور یہ پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔

کیونکہ اگر انسان ذمہ داری قبول کرنے، احساس مسؤلیت اور روح حق جو حق طلبی کا حامل نہ ہو، جو تقویٰ کا ایک مرحلہ ہے، تو وہ کبھی بھی دین حق کی تحقیق کی کوشش نہیں کرتا، اور قرآنی ہدایت کو قبول نہیں کرتا۔ ”جنات“ اور ”نعییم“ صیغہ جمع (باغات اور نعمتیں) کی صورت میں اور وہ بھی ”نکرہ“ کی صورت میں، ان باغات اور نعمتوں کے تنوع اور عظمت کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد بہشتیوں کی روح پران عظیم نعمتوں کے اثر انداز ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کتاب ہے: ”وہ اس چیز سے جو ان کے پروردگار نے انہیں دی ہے شاد و مسرور ہیں، اور اس سلسلہ میں دلپذیر باتیں کرتے ہیں“ (فاکہین بما اتاہم ربہم)۔

لے ”فاکہین“ ”نکد“ (بروزن نظر) کے مادہ سے اور ”فکامہ“ (بروزن شباہ) مسرور اور ہنسی خوشی رہنے اور دوسروں کو شیریں باتوں اور مزاح سے مسرور کرنے کے معنی میں ہے، ”رابع“ ”مفردات“ میں کہتا ہے ”فاکہہ“ ہر قسم کے پھل کے معنی میں ہے اور ”فکاکت“ صاحبان انس کی باتوں کے معنی میں ہے، بعض نے اپروالی آیت میں یہ احتمال دیا ہے کہ ”فاکہین بما اتاہم ربہم“ کا جملہ انواع و اقسام کے پھل کھانے کی طرف اشارہ ہے، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

ہاں! وہ خوشی سے اپنے جامہ میں پھولے نہ سائیں گے ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے سے مزاح کرتے رہیں گے، اور ان کے دل ہر قسم کے غم و اندوہ سے خالی ہوں گے، اور وہ حد سے زیادہ آرام و سکون محسوس کریں گے۔

خاص طور سے یہ بات کہ: خدا نے انہیں عذاب و سزا کی طرف سے مطمئن کر دیا ہے، ”اور ان کے پروردگار نے انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیا ہے“ (وَقَاهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ)۔

اس جملہ کے دو معانی ہو سکتے ہیں، پہلا پروردگار کی دوسری نعمتوں کے مقابلہ میں کسی مستقل نعمت کا بیان، دوسرے یہ کہ یہ سابقہ کلام کا پچھلا حصہ ہو، یعنی جنتی دو چیزوں سے سرور ہوں گے، ایک ان نعمتوں کی وجہ سے جو خدا نے انہیں دی ہیں، اور دوسرے ان عذابوں کی بنا پر جنہیں ان سے دور کر دیا ہے۔

ضمنی طور پر ”ربہم“ (ان کا پروردگار) کی تعبیر دونوں جملوں میں، خدا کے انتہائی لطف و کرم کی طرف، اور عالم میں اس کی ربوبیت کے جاری و ساری ہونے کی طرف، ایک اشارہ ہے۔

اس اجمالی اور سربستہ اشارے کے بعد جنت میں پرہیزگاروں کی نعمتوں، اور سرور و شادمانی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے، ”انہیں کہا جائے گا، مزے کے ساتھ کھاؤ اور پیو“ (كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا)۔

”یہ سب چیز ان اعمال کی وجہ سے ہیں جنہیں تم انجام دیا کرتے تھے“ (بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ)۔

”ہنیئاً“ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشت کی کھانے اور پینے کی چیزوں سے کسی قسم کے نامطلوب عوارض پیدا نہیں ہوتے، اور وہ اس جہان کی نعمتوں کے مانند نہیں ہیں، جو بعض اوقات مختصر طور پر کم یا زیادہ بیماری اور تکلیف پیدا کر دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے حاصل کرنے کے لیے نہ تو کوئی مشقت کرنے کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی ان کے ختم ہونے اور تمام ہو جانے کا کوئی خوف ہے، اور اسی بنا پر یہ نعمتیں کامل طور پر گوارا اور مزہ دینے والی ہیں۔

مسئلہ طور پر بہشت کی نعمتیں اپنے طور پر گوارا پر لطف اور مزیدار ہوں گی، لیکن یہ بات کہ فرشتے جنتیوں سے یہ کہیں گے، مزے لو اور لطف اٹھاؤ، یہ خود ایک دوسرا لطف اور مزیدار بات ہے۔

دوسری نعمت یہ ہے کہ وہ ”قطاروں میں بچھے ہوئے تختوں کے اوپر ایک دوسرے کے ساتھ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے“ (مَتَكِينَ عَلَى سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ)۔

اور وہ دوسرے دوستوں اور مومنوں کے انس کی لذت سے بہت زیادہ بہرہ ور ہوں گے، کیونکہ یہ ایک منوی لذت ہے جو بہت سی لذتوں سے ماقوق ہے۔

”سرر“ جمع ہے ”سریر“ کی ”سرور“ کے مادہ سے اصل میں ان تختوں کو کہا جاتا ہے جنہیں انس و سرور کی محافل کے لیے ترتیب دیتے ہیں، اور ان پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں۔

لحہ ”راغب“ مفردات میں کہتا ہے: ”المنیء“ کل ما لا یلحق فیہ المشقة ولا یعقبہ وخامة: صفا ایسی چیز ہے جس کے پیچھے مشقت اور دشواری نہ ہو۔

”مصنوفۃ“ ”صف“ کے مادہ سے اس معنی میں ہے کہ یہ تخت ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے بچائے گئے ہیں اور ایک عظیم محفل انس برپا کرتے ہیں۔

قرآن کی متعدد آیات میں یہ آیا ہے کہ بہشتی تختوں کے اوپر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے، ”علی سرر متقابلین“ (رجز ۴۷- صافات ۴۲)۔

یہ تعبیر اس چیز سے برعکس نہیں جو زیر بحث آیت میں آئی ہے، کیونکہ مجالس انس و سرور جن میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا، وہاں کرسیاں ایک دوسری کے ساتھ ساتھ بھی رکھتے ہیں اور مجلس کے گرد اگر دہلی، ہوا ایک دوسری سے پیوستہ صفوں میں بھی ہوتی ہیں اور ایک دوسری کے آمنے سامنے بھی۔

”متکبین“ کی تعبیر ان کے انتہائی سکون و آرام کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ انسان عام طور پر آرام و سکون کی حالت میں تکبیر کی ٹیک لگاتا ہے، اور وہ لوگ جو پریشان اور بے آرام ہوں وہ عام طور پر اس طرح نہیں ہوتے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، گوری گوری، سفید رخ، خوبصورت اور موٹی موٹی آنکھوں والی عورتوں سے ہم ان کی تفریح کریں گے (ونرق جناہم بحور عین)۔

یہ سب کچھ بہشتیوں کی ”مادی“ اور ”معنوی“ نعمتوں کا ایک حصہ ہیں، لیکن خدا صرف انہیں پر اکتفا نہیں کرے گا، بلکہ معنوی اور مادی نعمتوں کے ایک اور دوسرے حصہ کا بھی اس پر اضافہ کرے گا، ”جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور ان کی اولاد نے ان کی پیروی میں ایمان اختیار کیا ہے، ہم ان کی اولاد کو بھی جنت میں ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے اور ہم ان کے عمل میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے“ (والذین آمنوا واتبعتہم ذریعتہم بایمان الحقنا بہم ذریعتہم وما التناہم من عملہم من شیء)۔

یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ انسان اپنی صاحب ایمان اولاد اور اپنے متعلقین کو جنت میں اپنے پاس دیکھے، اور ان سے انس کی بنا پر ان سے لذت حاصل کرے، اور ان کے اعمال میں سے بھی کسی چیز کی کمی نہ کی جائے۔

آیت کی تعبیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ بالغ اولاد ہے جو ماں باپ کے راستے میں قدم اٹھاتی ہے اور ایمان میں ان کی پیروی کرتی ہے اور دین و مذہب کے لحاظ سے ان سے ملتی ہوتی ہے۔

ایسے افراد اگر عمل کے لحاظ سے کچھ کوتاہی اور نقصان بھی رکھتے ہوں تو خدا ان کے صالح آباؤ اجداد کے احترام میں انہیں گاہ

لے ”حور“ جمع ”حوراء“ و ”احور“ سے کہا جاتا ہے جس کی آنکھ کی سیاہی کامل طور پر شہی اور اس کی سفیدی پورے طور پر شفاف ہو۔ یا یہ کلی طور سے کامل جمال اور خوبصورتی سے کنایہ ہے کیونکہ خوبصورتی ہر چیز سے زیادہ آنکھوں میں تجلی کرتی ہے اور ”عین“ جمع ”اعین“ اور ”عیناء“ کی موٹی آنکھ کے معنی میں ہے اور اس طرح سے لفظ ”حور“ اور ”عین“ کا مذکر و مؤنث دونوں پر اطلاق ہوتا ہے، اور اس کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ جو جنت کی تمام بیویوں کو شامل ہے، باایمان مردوں کی ازواج اور بیویاں اور مومن عورتوں کے ازواج اور شوہر۔

(غور کیجئے)

کرے گا، تو اسے کہیں گے کہ: وہ تیرے درجہ و مقام اور عمل تک نہیں پہنچے ہیں، تو وہ عرض کرے گا، پروردگار! میں نے اپنے لیے بھی اور ان کے لیے بھی عمل کیا تھا، تو اس وقت حکم دیا جائے گا کہ انہیں بھی اس کے ساتھ ملحق کر دو۔ لہٰذا

قابل توجہ بات یہ ہے کہ: آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”ہر شخص اپنے اعمال میں گروہی اور ان کے ہمراہ ہے“ (کل امرئ بما کسب رہین)۔

اس بنا پر کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ پرہیزگاروں کے اعمال اور ان کے صلوات میں سے کسی چیز کی کمی نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ اعمال ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوں گے۔ اور اگر خدا متقین کی اولاد کے بارے میں کوئی لطف اور ہر کرے گا، اور انہیں جنت میں پرہیزگاروں کے ساتھ ملحق کرے گا، تو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ان کے اعمال کے بدلے سے کسی چیز کی کمی کر لی جائے گی۔

بعض مفسرین نے یہاں ”رہین“ کو مطلق طور سے ”گروہی رکھے ہوئے افراد“ کے معنی میں لیا ہے، اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کے بدلے گروہی رکھا ہوا ہے، چاہے اچھے ہوں یا بُرے اور ان کے مطابق ہی جزا و سزا پائے گا۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ تعبیر نیک اعمال کے بارے میں جنراں مناسبت نہیں رکھتی، بعض مفسرین نے یہاں ”کل نفس“ کو صرف بدکاروں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: ہر انسان اپنے غلط اور شرک آلود اعمال کے بدلے میں ”گروہی“ ہے، اور حقیقت میں ان کا اسیر اور محبوس ہے۔

اور بعض اوقات سورۃ مدثر کی آیت ۳۸، ۳۹ سے بھی استدلال کیا ہے:

کل نفس بما کسبت رھینۃ الا اصحاب الیمین:

”ہر شخص ان اعمال کے بدلے گروہی ہے جو اس نے انجام دیئے تھے سوائے اصحاب الیمین کے“

(وہ لوگ جن کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اہل نجات ہیں)

لیکن یہ تفسیر بھی اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ قبل و بعد کی سب آیتیں متقین اور پرہیزگاروں کے بارے میں ہیں، اور ان میں شرک، مشرکین اور مجرموں کے بارے میں گفتگو موجود ہی نہیں ہے، مناسب نظر نہیں آتی۔

ان دونوں تفاسیر کے مقابلہ میں جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی جہت سے نامناسب ہے۔ ایک تیسری تفسیر بھی ہے، جو صدر آیت کے ساتھ بھی اور ماقبل و مابعد کی آیات سے بھی مکمل طور پر مطابقت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ”رھن“ کے معانی میں سے ایک معنی، لغت میں کسی چیز کی ملازمت اور اس کے ہمراہ ہونا بھی ہے، اگرچہ ”رھن“ کا مشہور معنی ”وثیقہ“ ہی ہے جو قرض کے مقابلہ میں ہوتا ہے، لیکن اصل لغت کے کلمات سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معانی میں سے ایک ہمیشگی اور خدمت

گزار می بھی ہے، لے

بلکہ ان میں سے بعض تو اس کا اصلی معنی مرحلت کے ساتھ وہی دوام و ثبوت ہی سمجھتے ہیں، اور انہوں نے ”رہن بمعنی“ وثیقہ“ کو فقہاء کی اصطلاحات میں سے شمار کیا ہے لہذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ ”نعمۃ راہنۃ“ تو اس کا معنی پائیدار اور برقرار نعمت ہے۔ لے
امیر المؤمنین علی علیہ السلام گزشتہ اقوام کے بارے میں فرماتے ہیں :
ہاھم رہائن القیور ومضامین اللحدود
”وہ قبروں کے رہین اور محدودوں میں سونے والے ہیں۔“ لے

اس طرح سے ”کل امرئ بما کسب سہین“ کے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کے اعمال اس کے ساتھ اور ہمراہ ہوں گے، اور کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوں گے، چاہے نیک عمل ہوں یا بد ؟ اور اسی بنا پر ”متقین“ جنت میں اپنے اعمال کے ساتھ ہیں، اور اگر ان کی اولاد ان کے پاس قرار پائے گی تو اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ان کے اعمال میں سے کچھ کمی کر لی جائے گی۔
سورہ ”مدثر“ کی آیت کے بارے میں جس نے ”اصحاب الیمین“ کو اس معنی سے استثنائے کیا ہے۔ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ایسے الطاف کے مشمول ہیں جو بے حساب ہے۔ اس طرح سے کہ ان کے اعمال ان الطاف الہی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ لے

بہر حال یہ جملہ اس واقعیت کی تاکید ہے کہ انسان کے اعمال کبھی بھی اس سے جدا نہیں ہوں گے، اور ہمیشہ تمام مراحل اور مواقع میں اس کے ہمراہ ہوں گے۔

لے ”نسان العرب“ مادہ ”رہن“۔

لے ”معجم البحرین“ مادہ رھن۔

لے ”نہج البلاغہ“ خط ۴۵۔

لے سورہ مدثر میں ”اصحاب الیمین“ کے استثناء کے بارے میں دوسری تفاسیر بھی موجود ہیں جو انشاء اللہ اسی آیت کے ذیل میں آئے گی۔

- ۲۲۔ وَآمَدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ○
 ۲۳۔ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ○
 ۲۴۔ وَيُطَوَّفُ عَلَيْهِمْ غُلَمَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَكْنُونٌ ○
 ۲۵۔ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ○
 ۲۶۔ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ○
 ۲۷۔ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَدْنَا عَذَابَ السَّعِيرِ ○
 ۲۸۔ إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ○

ترجمہ

- ۲۲۔ ہمیشہ انواع و اقسام کے پھل اور گوشت جن کی وہ خواہش کریں گے ہم ان کے اختیار میں دے دیں گے۔
 ۲۳۔ وہ جنت میں شراب پھور سے پر جام، جن میں نہ بیہودگی ہے اور نہ گناہ، ایک دوسرے سے لیں گے۔

۲۴۔ اور ہمیشہ ان کے گرد اگر دونوں جوان لڑکے ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے، جو ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے صدف میں مروارید ہوں۔

۲۵۔ اس وقت ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے (ماضی کے بارے میں) سوال کریں گے۔

۲۶۔ کہیں گے کہ ہم اپنے گھروالوں کے درمیان خوف و ہراس میں تھے۔

۲۷۔ لیکن خدا نے ہم پر احسان کیا اور ہلاک کرنے والے عذاب سے ہمیں محفوظ رکھا۔

۲۸۔ ہم پہلے سے خدا کو نیکو کار اور رحیم کے القاب سے پکارتے تھے (اور پہچانتے تھے)۔

تفسیر

ہم اس دن خوف زدہ تھے اور آج اتہائی امن میں ہیں

گذشتہ آیات میں جنت کی نعمتوں میں سے دوصحوں کی طرف اشارہ ہوا تھا، اور زیر بحث آیات میں ان کو جاری رکھتے ہوئے، دوسرے پانچ حصوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اس طرح ان سب کے مجموعہ سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ آرام و آسائش و لذت و سرور و شادی کے لیے جو کچھ لازم و ضروری ہے وہ سب کچھ ان کے لیے جنت میں فراہم ہوگا۔

پہلے بہشتیوں کی غذاؤں میں سے دوصحوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”ہمیشہ انواع و اقسام کے پھلوں اور گوشت میں سے جس نوع کی طرف وہ مائل ہوں گے ہم اسے ان کے اختیار میں دے دیں گے“ (وامددناھم بغاکھتہ ولحم مما یشتھون)۔

”امددناھم“ ”امداد“ کے مادہ سے اولمہ و افزائش اور عطا کرنے کے معنی میں ہے، یعنی جنت کے پھل اور کھانے اس قسم کے نہیں ہیں کہ وہ کھانے سے کم ہو جائیں، یا وہ دنیا کے پھلوں کے مانند نہیں ہیں۔ جو سال کی فصلوں میں بہت سی تبدیلیاں کھتے ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ ان میں ہمیشگی، جادو دانی اور استرا اور تسلسل ہے۔

”مما یشتھون“ (وہ جس میں سے چاہیں گے) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بہشتی ان پھلوں اور غذاؤں کی نوع مقدار اور کیفیت کے انتخاب میں کامل طور سے آزاد ہوں گے وہ جو بھی چاہیں ان کے اختیار میں ہے۔

البتہ جنت کے کھانے صرف انہیں دوہیں منحصر نہیں ہیں، لیکن یہ دو اہم غذائیں ہیں، ”ذاکھہ“ ”کو“ ”لحم“ پر مقدم رکھنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ”پھلوں“ کو ”گوشتوں“ پر برتری حاصل ہے۔

اس کے بعد بہشتیوں کے خوشگوار اور مزیدار مشروبات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ”وہ بہشت میں شراب بطور سے پر جام — جن میں نہ تو مستی ہوگی، اور نہ ہی یہودہ گوئی اور نہ کوئی گناہ — ایک دوسرے سے لیں گے“ (یتنازعون فیھا کأسًا لا لغو فیھا ولا تأثیم)۔

بلکہ وہ ایسی شراب ہے جو خوشگوار و لذت بخش ہے، نشاط آفرین اور روح پرور ہے، اور اس میں کسی قسم کا نشہ اور عقل کا فساد اور خرابی نہیں ہے، اور اس کے پینے سے کسی قسم کی یہودہ گوئی اور گناہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس میں سلسرہوش اور جسمانی و روحانی لذت ہے۔

”یتنازعون“ ”تنازع“ کے مادہ سے ایک دوسرے سے لینے کے معنی میں ہے۔ اور بعض اوقات کھینچنا تانی اور لڑائی جھگڑے کے معنی میں بھی آتا ہے، لہذا بعض مفسرین نے کہا ہے، یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشتی شوقی و مزاج اور سرور

وانبساط کی فراوانی کے باعث شراب طور کے جام ایک دوسرے کے ہاتھ سے چھین چھین کر پینے لگے۔ لیکن جیسا کہ بعض ارباب لغت نے کہا ہے کہ: ”تنازع“ جب کسی موقع پر ”کاس“ (جام) کے لیے استعمال ہوتا ہے تو ایک دوسرے سے لینے کے معنی میں ہوتا ہے، کشمکش اور کھینچا تاتی کے معنی میں نہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ”کاس“ اس جاکو کہتے ہیں جو شراب سے پر ہو، اور خالی برتن کو ”کاس“ نہیں کہتے۔ لہٰذا بہر حال چونکہ کاس کی تعبیر بعض اوقات دنیا کی نشہ دینے والی شرابوں کے معنی کی یاد دلاتی ہے، لہٰذا مزید کہتا ہے، اس شراب میں نہ تو لغو اور بے ہودہ گوئی ہے اور نہ ہی گناہ، کیونکہ وہ ہرگز انسان کی عقل و ہوش کو زائل نہیں کرے گی، اس بنا پر وہ غیر موزوں باتیں اور قبیح اعمال جو مستوں سے سرزد ہوتے ہیں، ہرگز ان سے سرزد نہیں ہوں گے۔ بلکہ اس بنا پر کہ وہ شراب پھور ہے، انہیں زیادہ خالص، زیادہ پاک اور زیادہ ہوشیار کر دے گی۔

اس کے بعد چوتھی نعمت کو — جو بہشت میں خدمت گزاروں کے ہونے کی نعمت ہے — پیش کرتے ہوئے کہتا ہے، ”بیشہ ان کے گرد اگر دو نو جوان لڑکے ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے، جو ان موتیوں کی طرح ہوں گے جو صدف میں ہوتے ہیں“ (و یطوف علیہم غلمان لہم کائنات لؤلؤ مکتون)۔

”مروارید صدف کے اندر“ اس قدر تازہ صاف شفاف اور خوبصورت ہوتے ہیں، جس کی کوئی حد نہیں ہے، اگرچہ صدف کے باہر بھی ان کی خوبصورتی حوّل کی توں باقی رہتی ہے لیکن ہوا کا گرد و غبار، اور ہاتھوں کی آلودگی، کچھ نہ کچھ اس کی صفائی میں کمی کر دیتی ہے۔ رجت کے خدمت گزار اس قدر خوبصورت، سفید چہرہ اور باصفا ہوں گے جیسا کہ صدف کے اندر مروارید ہوتے ہیں۔ ”یطوف علیہم“ (ان کے گرد طواف کریں گے) کی تعبیر خدمت کے لیے ان کی دائمی آمادگی کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ بہشت میں خدمت گار کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی اور وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے اختیار میں ہوگا، لیکن یہ خود بہشتیوں کے زیادہ سے زیادہ احترام کے لیے ہوگا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اکرمؐ سے لوگوں نے سوال کیا کہ اگر خدمت گزار صدف میں موجود مروارید کی طرح ہوں گے تو پھر مخدوم یعنی جنت کے مومنین کس طرح کے ہوں گے تو آپؐ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ فضل المخدوم علی الخادم کفضل القمر لیلۃ
البدر علی سائر الکواکب

”مخدوم کی دہاں پر خادم پر برتری ایسی ہوگی جیسی کہ چودہویں کے چاند کو باقی ستاروں پر برتری ہے۔“

لے ”راغب مفردات میں کہتا ہے: الکاس الاناء بما فیہ من الشراب، ”محج البحرین“ میں بھی یہی تفسیر کاس کے بارے میں آئی ہے اور اگر شراب سے خالی ہو تو اسے ”قدح“ کہا جاتا ہے۔

لے ”محج البیان“، ”تثاب“، ”قرطبی“، ”نور البیان“ و ”ابوالفتح رازی“۔

”ہم“ کی تعمیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مومنین میں سے ہر ایک کے لیے کچھ مخصوص خدمت گزار ہوں گے، اور چونکہ جنت غم و اندوہ کی جگہ نہیں ہے اس لیے وہ خدمت گزار بھی مومنین کی خدمت سے لذت حاصل کریں گے۔

اور اس سلسلہ کی آخری نعمت وہی مکمل سکون و آرام اور ہر قسم کے عذاب و سزا سے دلی اطمینان ہے۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”اس حالت میں جب کہ وہ ایک دوسرے کے پہلو پہ پہلو بیٹھے ہوتے ہوں گے، تو گزرے ہوئے دنوں کے حالات کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے“ اور اس کا جنت کے حالات سے موازنہ کرتے ہوئے لذت حاصل کریں گے (و اقبل بعضهم علی بعض يتساءلون)۔

”وہ کہیں گے ہم تو اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں خائف و ترساں رہتے تھے“ (قالوا اتاكتا قبل فی اہلتنا مشفقین)۔

باوجود اس کے کہ ہم اپنے گھر والوں کے درمیان رہتے تھے لہذا ہمیں تو امن و امان کا احساس کرنا چاہیئے تھا مگر پھر بھی ہم خائف ہی تھے، ہمیں اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا کہ ناگوار حوادث اور عذاب الہی کسی لمحہ بھی آن پہنچے گا، اور ہمیں پکڑے گا۔ ہم اس بات سے ڈرتے تھے کہ ہماری اولاد اور گھر والے غلط راستے پر چل پڑیں گے، اور وادی ضلالت میں گمراہ و سرگرداں پھریں گے۔

اور ہمیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ سنگدل دشمن ہمیں غفلت میں رکھ کر ہم پر عرصہ حیات تنگ کر دیں گے۔ لیکن خدا نے ہم پر احسان کیا، اور اس کی رحمت و اسعہ ہمارے شامل حال ہوئی، اور ہمیں ہلاک کرنے والے عذاب سے محفوظ رکھا“ (فمن اللہ علینا ووقانا عذاب السعوم)۔

ہاں! مہربان پروردگار نے ہمیں دنیا کے زندان سے اس کی تمام وحشتوں کے ساتھ نجات بخشی، اور اپنی نعمتوں کے مرکز یعنی جنت میں ہمیں جگہ دی۔

وہ جب اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں، اور اس کے جزئیات اپنے حافظہ میں لاتے ہیں، اور موجود حالات کے ساتھ ان کا موازنہ کرتے ہیں تو خدا کی عظیم نعمتوں اور اس کے مواہب کی قدر و قیمت کو زیادہ سے زیادہ پاتے ہیں، اور یہ بات ان کے لیے اور بھی زیادہ لذت بخش اور دلچسپ ہو جاتی ہے، کیونکہ اس موازنہ کے ذریعہ ان کی قدر و قیمت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

اہل جنت اس آخری گفتگو میں جو ان کی طرف سے یہاں نقل ہوئی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں، کہ وہ خدا کے رحیم ہونے کو، وہاں ہر زمانہ سے زیادہ محسوس کرتے ہیں، وہ کہیں گے، ”ہم پہلے سے خدا کو پکارتے تھے اور اُس کو نیک مطلوب اور رحیم کہہ کر تعریف کرتے تھے“ (اتاکتا من قبل ندعوہ انہ ہوا لیر الرحیم)۔

لیکن ہم یہاں ان صفات کی حقیقت کی تہ تک پہنچ جائیں گے، کہ اس نے ہمارے حقیر اعمال کے مقابلہ میں کتنی نیکیاں کی ہیں، اور ہماری اس قدر لغزشوں کے باوجود ہمیں اپنی رحمت کا مشمول کیا ہے۔

ہاں! قیامت کا منظر اور جنت کی نعمتیں خدا کے اسماء و صفات کی تجلی گاہ ہیں اور مومنین ان مناظر کا مشاہدہ کر کے ہر زمانہ سے زیادہ ان اسماء و صفات کی حقیقت سے آشنا ہوں گے، یہاں تک کہ دوزخ بھی اس کے صفات کو ہی بیان کرتی ہے، اور اس

کی حکمت، عدالت اور قدرت کی نشاندہی کرتی ہے۔

چند قابل توجہ نکات

۱۔ ”یتساءلون“ ”سؤال“ کے مادہ سے، ایک دوسرے سے سوال کرنے کے معنی میں ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل جنت میں سے تمام اپنے دوستوں سے سوال کریں گے، اور ان کے ماضی کے حالات ان سے دریافت کریں گے، کیونکہ ان مسائل کو یاد کرنا، اور ان تمام مصائب و آلام سے نجات پانا، اور ان تمام نعمتوں کا حصول، خود بھی ایک لذت ہے، ٹھیک اسی طرح سے کہ جب انسان کسی خطرناک سفر سے لوٹتا ہے، اور امن و امان کے ماحول میں بیٹھتا ہے، تو اپنے ساتھیوں سے ان کے گزرے ہوئے حالات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور ان کے نجات پانے سے اظہار خوشی کرتا ہے۔

۲۔ ”مشفقین“ ”اشفاق“ کے مادہ سے، جیسا کہ ”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے، ”خوف سے ملی ہوئی توجہ“ کے معنی میں ہے اور جب وہ ”حن“ کے لفظ سے متعدی ہو جائے تو ”خوف“ کا مفہوم اس میں زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔ اور جس وقت ”فی“ کے لفظ سے متعدی ہو تو ”توجہ اور عنایت“ کا مفہوم اس میں زیادہ ظاہر ہوگا۔

یہ لفظ اصل میں ”شفق“ کے مادہ سے لیا گیا ہے یہ وہی روشنی ہے جو تاریکی کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ دنیا میں کس چیز کا خوف رکھتے تھے، اور کس چیز کی طرف توجہ اور عنایت رکھتے تھے۔ یہاں تین احتمال ہیں، جن کو ہم نے آیت کی تفسیر میں جمع کر دیا ہے کیونکہ ان کے درمیان اختلاف نہیں ہے (خدا کا خوف اور اپنی نجات کی طرف توجہ، گھروالوں کے انحراف کا خوف اور ان کی تربیت کے معاملہ پر توجہ، دشمنوں کا خوف اور ان کے مقابلہ میں اپنی حفاظت کی طرف توجہ) اگرچہ بعد والی آیات کی طرف توجہ خصوصاً جملہ ”فمن الله علينا ووقانا عذاب السموم“ ”خدا نے ہم پر احسان کیا، اور مار ڈالنے والے عذاب سے ہمیں بچالیا، سے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

۳۔ ”فی اهلنا“ کی تفسیر یہاں ایک وسیع معنی رکھتی ہے۔ اور سب اولاد و ازواج اور احباب کو شامل ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اصولی طور پر اس قسم کی جمعیت کے درمیان ہر جگہ سے زیادہ امنیت کا احساس کرتا ہے۔ جب انہی کے درمیان خوف زدہ اور ہیناک ہو، تو دوسرے حالات میں تو اس کی وضع و کیفیت معلوم ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تعبیر ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو غیر مومن گھرانوں میں گرفتار تھے، یہاں تک کہ وہ خود ان سے ڈرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ڈٹے رہے۔ اور لطف الہی پر بھروسہ کرتے ہوئے استقلال دکھایا اور ان جیسے نہ بنے۔

۴۔ ”سموم“ اس حرارت کے معنی میں ہے جو ”سام“ بدن (وہ چھوٹے چھوٹے سوراخ جو جلد کی سطح پر ہوتے ہیں) میں داخل ہو جاتی ہے، اور انسان کو تکلیف پہنچاتی ہے یا اسے ہلاک کر دیتی ہے، اور بادموم بھی ایسی ہی ہوا کو کہتے ہیں، اور ”عذاب سموم“ بھی اسی قسم کا عذاب ہے، ”سم“ کے لفظ کا ہلاک کرنے والے مواد پر اطلاق بھی، تمام بدن میں ان کے نفوذ کی بنا پر ہے۔

۵۔ ”بر“ جیسا کہ ”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے اصل میں خشکی کے معنی میں ہے (سمندر اور دریا کے مقابلہ میں)

اس کے بعد ان افراد پر جن کے نیک اعمال بہت زیادہ اور وسیع ہوں اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے، اور اس پاک نام کے لیے زیادہ شائستگی اور لائق خدا کی پاک ذات ہے جس کی نیکی اور احسان نے تمام جہان والوں کو گھیر رکھا ہے۔
۴۔ ”آیات کی جمع بندی“، ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان آیات میں اور گزشتہ آیات میں حقیقت میں جنت کی نعمتوں کے چودہ حصے بیان کئے گئے ہیں۔

جنت کے باغات (جنت) — اس کی گونا گوں نعمتیں (نعیم) — سرور و شادمانی — عذاب جہنم سے امن و امان — بہشت کے ماکولات و مشروبات میں سے گوارا طور پر کھانا پینا — ایک دوسرے سے ملے ہوئے تختوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنا — حورالعین میں سے بیویاں — مومن اولاد کا ان کے ساتھ ملحق ہونا — انواع و اقسام کے لذت بخش پھل — انواع و اقسام کے گوشت — جو کچھ وہ چاہیں گے — شراب پھور سے پر جام — مردارید جیسے خدمت گزار — اور آخر میں مجلس انس برپا کر کے ماضی کو یاد کرنا اور موجودہ حالت سے لذت حاصل کرنا؛

ان نعمتوں کا ایک حصہ تو مادی پہلو رکھتا ہے، اور دوسرے حصہ میں معنوی پہلو غالب ہے، ان سب چیزوں کے باوجود پھر بھی جنت کی مادی اور معنوی نعمتیں انہیں میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ بیان ہوا ہے وہ صرف ان کا ایک گوشہ ہے۔

- ۲۹- فَذَكِّرْ فَمَا أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ۖ
- ۳۰- أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ ۚ
- ۳۱- قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَزِعِينَ ۖ
- ۳۲- أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُمْ بِهَذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ۚ
- ۳۳- أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ ۚ
- ۳۴- فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ۖ

ترجمہ

- ۲۹- اب جبکہ ایسا ہے تو تم نصیحت کرتے رہو، کیونکہ تم اپنے پروردگار کے لطف سے کاہن و مجنون نہیں ہو۔
- ۳۰- بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک شاعر ہے، جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں۔
- ۳۱- کہہ دو! کہ تم انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں (تم میری موت کا انتظار کرو اور میں اپنی کامیابی اور تمھاری نابودی کا انتظار کرتا ہوں)۔
- ۳۲- کیا ان کی عقلیں انہیں ان کاموں کا حکم دیتی ہیں؟ یا وہ سرکش قوم ہیں۔
- ۳۳- وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کا اس نے خدا پر افتراء باندھا ہے، لیکن وہی ایمان نہیں رکھتے۔
- ۳۴- اگر وہ سچ کہتے ہیں تو وہ بھی اسی قسم کا کلام لے آئیں۔

شان نزول

ایک روایت میں آیا ہے کہ قریش "دارالندہ" لے میں جمع ہوئے، تاکہ پیغمبر اسلام کی دعوت کو روکنے کے لیے — جو ان کے نامشروع منافع کے لیے ایک عظیم خطرہ سمجھی جاتی تھی — غور و فکر کریں۔

"بنی عبدالدار" کے قبیلہ کے ایک شخص نے کہا: ہمیں اس کے مرنے کا انتظار کرنا چاہیے، کیونکہ بہر حال وہ ایک شاعر ہے اور عنقریب دنیا سے چل بسے گا، جیسا کہ "زہیر"، "نابغہ" اور "اعشى" (زمانہ جاہلیت کے تین شاعر) دنیا سے چلے گئے (جن کی بساط پٹ گئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بساط بھی اس کی موت کے ساتھ ہی پٹ جائے گی) یہ کہہ کر وہ پراگندہ ہو گئے، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں، اور انہیں جواب دیا۔

تفسیر

اگر سچ کہتے ہیں تو اس کے مانند کلام لے آئیں

گزشتہ آیات میں جنت کی نعمتوں اور پرہیزگاروں کی پاداشوں کے ایک قابل توجہ حصہ کو بیان کیا گیا تھا، اور ان سے پہلے کی آیات میں بھی دوزخیوں کے دردناک عذاب کا ایک حصہ آیا تھا۔

پہلی زیر بحث آیت میں گزشتہ آیات سے نتیجہ نکالتے ہوئے فرماتا ہے، "اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو تم نصیحت کرتے رہو اور یاد دلاتے رہو" (فذاکر)۔

کیونکہ حق طلب لوگوں کے دل ان باتوں کے سننے سے زیادہ آمادہ ہوں گے، اور اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ تو ان کے لیے حق باتیں بیان کرے۔

یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے، کہ ان دونوں گروہوں کی سزاؤں اور نعمتوں کے ذکر کرنے کا اصل مقصد، نئے حقائق کو قبول کرنے کے لیے روحانی طور پر آمادہ کرتا ہے اور حقیقت میں ہر بات کرنے والے کو اپنے کلام کے نفوذ اور بات کی تاثیر کے لیے اس روش سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

۱۔ "دارالندہ" متقی بن کلابؒ عربوں کے شہر جدہ اعلیٰ کا گھر جس میں اہم امور کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے، اور مشورے کرتے تھے، یہ گھر خانہ خدا کے قریب تھا، اور اس کا دروازہ کعبہ کی جانب کھلتا تھا، اور اس کی مرکزیت مجالس مشورت کے لیے خود متقی بن کلاب کے زمانہ سے تھی (سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۲۲ و جلد اول ص ۱۲۲)۔

۲۔ تفسیر مراغی جلد ۲ ص ۳۱۔

اس کے بعد ان اتہامات اور ناروا نسبتوں کا ذکر کرتے ہوئے جو بڑے دھرم اور عناد رکھنے والے افراد پیغمبر کو دیا کرتے تھے، فرماتا ہے، ”اپنے پروردگار کے لطف و کرم اور اس کی نعمتوں کی برکت سے تو کاہن و مجنون نہیں ہے“ (فما انت بنعمة ربك بكاھن ولا مجنون)۔

”کاھن“ اس کو کہا جاتا تھا جو اسرار غیبی کی خبر دیتا تھا اور غالباً اس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ جنات کے ساتھ ارتباط رکھتا ہے، اور ان سے غیب کی خبریں حاصل کرتا ہے۔ خصوصاً زمانہ جاہلیت میں کاہن بہت تھے، منجملہ ان کے دو مشہور کاہن ”شق“ اور ”سطح“ تھے، حقیقت میں وہ ایسے ہوشیار لوگ تھے جو اپنی ہوش و خرد سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان دعویٰ کے ذریعہ لوگوں کو مہرست کھتے تھے، کہانت اسلام میں حرام و ممنوع ہے۔ اور کاہنوں کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ اسرار غیب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اس کے بعد انبیاء اور ائمہ میں سے جس کے متعلق مصلحت سمجھتا ہے وہ انہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔

بہر حال قریش لوگوں کو پیغمبر اسلام کے پاس سے بٹانے کے لیے یہ تمہیں ان پر گاتے تھے، کبھی تو انہیں کاہن اور کبھی مجنون، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ان دونوں صفات کے تضاد سے بھی واقف نہیں تھے، کیونکہ کاہن تو ہوشیار لوگ تھے، جو مجنون ہونے کے برعکس بات ہے۔ اور اوپر والی آیت میں ان دونوں افتراء کو جمع کرنا شاید ان کی اسی پرانہ گوئی کی طرف اشارہ ہو۔ اس کے بعد تفسیر سے اتہام کو پیش کرتا ہے کہ وہ بھی گوشہ صفات سے تضاد رکھتا ہے، فرماتا ہے: ”بلکہ وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک شاعر ہے جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں“ (ام یقولون شاعر نتر بصر بہ ریب المتنون)۔

جب تک وہ زندہ ہے اس وقت تک اس کے اشعار کی رونق رہے گی اور وہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا رہے گا، تھوڑی سی دیر کے لیے صبر کرو، یہاں تک کہ اس کی موت آجائے۔

اور اس کے اشعار کا دفتر اس کی عمر کے طومار کی طرح پلیٹ دیا جائے، اور طاق نسیاں کے سپرد ہو جائے، اس دن ہیں راحت و آرام نصیب ہو جائے گا۔

جیسا کہ کتب لغت و تفسیر سے معلوم ہوتا ہے، ”منون“ ”من“ کے مادہ سے اصل میں دو معنی کے لیے آیا ہے ”نقصان“ اور ”قطع و برید کرنا“ اور یہ دونوں بھی ایک دوسرے سے قریبی مفہوم رکھتے ہیں۔

اس کے بعد لفظ ”منون“ موت کے بارے میں بھی اطلاق ہونے لگا، کیونکہ وہ ”ینقص العدد و یقطع المدد“ (افراد کو کم اور امداد کو منقطع کر دیتی ہے)

بعض اوقات ”منون“ زمانہ کے گزر جانے کو بھی کہا جاتا ہے، اس مناسبت سے کہ وہ بھی موت اور مرنے کا سبب، تعلقات کے ٹوٹنے اور افراد کی کمی کا باعث ہوتا ہے، اور بعض اوقات رات اور دن کو بھی ”منون“ کہتے ہیں اور وہ بھی ظاہراً اسی مناسبت کی وجہ سے ہے۔

باقی رہا لفظ ”ریب“ اصل میں شک و تردید اور اس چیز کے توہم کے معنی میں ہے کہ جس کے اوپر سے بعد میں پردہ اٹھ جائے

کا اور حقیقت واضح و آشکار ہو جائے گی۔

یہ تعبیر جب موت کے بارے میں استعمال ہو، اور ”ریب المنون“ کہا جائے تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ اس کے آنے کا وقت معلوم نہیں ہے، نہ کہ اس کا حقیقت میں واقع ہونا یا نہ

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے ”ریب المنون“ کی، زیر بحث آیت میں ”حوادث روزگار“ کے معنی میں تفسیر کی ہے، یہاں تک کہ ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ لفظ ”ریب“ قرآن میں ہر جگہ ”شک و تردد“ کے معنی میں ہے، سوائے سوکھنے کی اس آیت کے کہ جہاں ”حوادث“ کے معنی میں ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی ”اضطراب اور پریشانی کی حالت کے معنی میں بھی تفسیر کی ہے، اس بنا پر ”ریب المنون“ وہ اضطرابی حالت ہے جو موت سے پہلے اکثر افراد کو عارض ہوتی ہے۔

ممکن ہے یہ تفسیر اوپر والے معنی کی طرف ہی لوٹے، کیونکہ عام طور پر شک و تردد دید کی حالت اضطراب و پریشانی کا سرچشمہ بنتی ہے، اسی طرح ایسے حوادث بھی جن کی پیش بینی نہ ہو ایک قسم کا اضطراب اور شک و تردد پیدا کرنے پر لگاتے ہیں، اس طرح سے یہ سب کے سب مفہام ”شک و تردد“ کی جڑ کی طرف ہی، جو اصل میں اس لفظ کا معنی ہے، منتہی ہوتے ہیں۔

اور دوسرے لفظوں میں ”ریب“ کے لیے تین معنی بیان ہوئے ہیں، شک، اضطراب، حوادث، اور یہ سب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

بہر حال وہ اس چیز سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے کہ کوئی حادثہ پیش آئے اور پیغمبر کی عمر کا دفتر ٹپٹ جلے، اور ان کے گمان کے مطابق، اس عظیم مشکل سے — جو آنحضرت کی دعوت نے ان کے سارے معاشرے میں پیدا کر دی تھی — انہیں رہائی مل جائے۔

قرآن ایک پر معنی اور تہدید آمیز جملہ سے، ان کے اندھے اور عناد رکھنے والے افراد کو جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: ”کہہ دو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں“ (قل تبصروا فانی معکم من المتر بصین)۔

تم اپنی خام خیالی کے پورا ہونے کے انتظار میں رہو، اور میں تمہارے لیے عذاب الہی کے انتظار میں ہوں۔ تم اس انتظار میں رہو کہ میری موت کی وجہ سے اسلام کی بساط پھیٹ دی جائے، اور میں بھی پروردگار کی مدد سے اس انتظار میں ہوں کہ میری زندگی ہی میں دین اسلام عالمگیر ہو جائے، اور میرے بعد بھی اپنے راستے کو جاری و ساری رکھے اور آفاقی و جاودانی ہو جائے۔

ہاں! تم تو اپنے خیالات و تصورات پر تکیہ کئے ہوئے ہو، اور میں پروردگار کے لطف خاص پر تکیہ ہوں۔ اس کے بعد انہیں شدید ترین طریقہ سے سرزنش و ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے: ”کیا ان کی عقلوں نے انہیں ان اعمال کا

حکم دیا ہے ؟ یا وہ ایک سرکش قوم ہیں ؟ (ام تأمرهم احلا مہم بهذا ام ہم قوم رطاغون)۔

سرواران قریش اپنی قوم میں ”ذوی الاحلام“ (صاحبان عقل) کے لقب سے پہچانے جاتے تھے ! قرآن کہتا ہے : یہ کون سی عقل ہے جو اس وحی آسمانی کو، جس کے تمام مضامین و مطالب سے حقانیت کی نشانیاں واضح ہیں، شعر و کہانت کا نام دیتی ہے ؟ اور اس کے لانے والے کو — جو ایک زمانہ دراز سے امانت و عقل میں شہرت کا مالک ہے — کا ہن و مجنون اور شاعر کہتی ہے ؟

اس بنا پر اس قسم کی تہمتوں اور الزامات کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ان کی عقل کا فرمان نہیں ہے، بلکہ ان سب کا سرخشاں روح عصیان و سرکشی ہے، جو ان افراد پر غالب ہے جو نہی کہ وہ اپنے نامشروع منافع کو خطرے میں دیکھتے ہیں، تو عقل کو الوداع کہہ دیتے ہیں اور حق تعالیٰ کے فرمان کے مقابلہ میں طغیان و سرکشی پر اتر آتے ہیں۔

”احلام“ جمع ”حلم“ (بروزن فہم) ”عقل“ کے معنی میں ہے لیکن ”راغب“ کے قول کے مطابق ”حلم“ حقیقت میں ”ہیجان و غضب“ کے وقت اپنے اوپر کٹر طول کرنے کے معنی میں ہے، جو عقل و درایت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی شمار ہوتا ہے، اور علم (بروزن علم) کے ساتھ ایک مشترک تعلق رکھتا ہے (یہ لفظ ”حلم“ بعض اوقات ”خواب“ درو یا کے معنی میں بھی آیا ہے اور زیر بحث آیت میں بھی اس قسم کی تفسیر لہجہ نہیں ہے یعنی ان کی باتیں پر نشان خوابوں کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

پھر ایک اور دوسری تہمت کی طرف — جو درحقیقت ان اتہامات کے سلسلہ کی چوتھی تہمت شمار ہوتی ہے۔ اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے، : ”وہ کہتے ہیں : اس نے اس قرآن کا خدا پر افترا باندھا ہے۔ لیکن وہ ایمان نہیں رکھتے“ (ام یقولون تقولہ بل لایؤمنون)۔

”تقولہ“ ”تقول“ (بروزن تکلف) کے مادہ سے، اس گفتگو کے معنی میں ہے جسے انسان اپنی طرف سے گھڑ لیتا ہے درحالیکہ اس میں کوئی حقیقت و واقعیت نہیں ہوتی۔

مشرکین اور ہٹ دھرم کافروں کا قرآن مجید اور پیغمبر کی دعوت کو تسلیم نہ کرنے کا یہ ایک اور بہانہ تھا، جس کی طرف قرآن کی آیات میں بار بار اشارہ ہوا ہے۔

لیکن قرآن مجید انہیں ایک دندان شکن جواب دیتا ہے : فرماتا ہے ”اگر وہ سچ کہتے ہیں کہ یہ بشر کا کلام ہے، اور فکر انسانی کا اختراع و پرداخت ہے۔ تو پھر وہ بھی اس قسم کی بات بنا کر لے آئیں“ (فلیأتوا بحديث مثله ان كانوا صادقين)۔

لہٰذا اس بارے میں کہ یہاں ”ام“ ”استغہامیہ“ یا ”منقطہ“ اور ”بل“ کے معنی میں مفسرین میں سے ہر ایک نے ایک جدا احتمال دیا ہے اگرچہ اکثر نے دوسرے کو ترجیح دی ہے، لیکن آیات کا سیاق پہلے معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن توجہ رکھنا چاہیے کہ ”ام“ اس قسم کے مواقع پر حتیٰ طور سے ہمزہ استغہام کے بعد ہونا چاہیئے، اسی لیے فخر رازی نے اس کے لیے ایک تقدیر بیان کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ”ع انزل علیہم ذکر ام تأمرہم احلا مہم بهذا“ رکبان پر خدا کی طرف سے کوئی بات نازل ہوئی ہے یا ان کی عقلیں اس قسم کا حکم کرتی ہیں یا جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو یا تو دلیل منقول کا تابع ہونا چاہیئے یا دلیل عقل کا۔

۲۷ ”جمع البیان“ میں آیا ہے : التقول : تکلف القول ولا یقال ذالک الا فی المکذب۔

تم بھی انسان ہو، اور خود اپنے قول کے مطابق تم مکمل ہوش، بیان کی استطاعت اور انواع و اقسام کی گفتگو سے آگاہی اور اس پر قدرت رکھتے ہو، تو تمہارے خطیب اور مفکرین اس جیسی بات بنا کر لانے کی طاقت کیوں نہیں رکھتے؟

”فلپا آتوا“ (پس آؤ) کا جملہ اصطلاح کے مطابق امر تعجیزی ہے، اور اس کا صدف اور مقصد یہ ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں ان کے عجز و ناتوانی کو مقابلہ بالمثل سے ثابت کرے، اور یہ وہی چیز ہے جسے علم کلام میں ”تحدی“ اور چیلنج سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی مخالفین کو معجزات کے مقابلہ میں معارضہ اور مقابلہ بالمثل کی دعوت۔

بہر حال یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے، جو وضاحت کے ساتھ قرآن کے اعجاز کو روشن و آشکار کرتی ہیں، اور اس کا مفہوم پیغمبر کے زمانہ کے لوگوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام ایسے لوگ جو کسی بھی قرن اور زمانہ میں یہ کہتے ہوں کہ قرآن انسان کا کلام ہے، اور خدا پر افترا باندھا گیا ہے، وہ بھی اس خطاب کے مخاطب ہیں، کہ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو اس جیسا کلام لے آئیں۔

اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں، قرآن کی یہ ندا، اس آیت میں بھی، اور اس کے مشابہ دوسری آیات میں بھی، ہمیشہ سے بلند ہے، اور چودہ صدیوں کے اندر، جو بعثت پیغمبر کے بعد سے گزر چکی ہیں، کوئی بھی اس کا مشت جواب نہیں دے سکا، حالانکہ مسلمہ طو سے دشمنان اسلام خصوصاً ارباب کلیسا (عیسائی) اور یہودی، اربلوں ڈالر سالانہ اسلام کے برخلاف پروپیگنڈے پر صرف کر رہے ہیں، ان کے لیے کوئی بات مانع نہیں تھی کہ ان کا ایک حصہ مخالف و الشتمندوں ادیبوں اور سخن دروں کے کسی گروہ کو دے دیتے تاکہ وہ قرآن کے مقابلہ میں معارضہ و مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، اور ”فلپا آتوا بحديث مثله“ کا مصداق بنیں، اور یہ عمومی عجز، اس وحی آسمانی کی اصالت کا ایک زندہ گواہ ہے۔

ایک مفسر نے یہاں ایک نکتہ پیش کیا ہے جو قابل توجہ ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ اس قرآن میں ایک مخصوص راز ہے، اور جو شخص بھی اس کی آیات کے مقابل آتا ہے، وہ اسے محسوس کر لیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ اسرار اعجاز کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

وہ اس قرآن کی عبارتوں میں ایک خاص نفوذ و غلبہ کو محسوس کرتا ہے۔ اور ان معانی کے ماوراء ایک اور چیز عقل انسانی میں منعکس ہوتی ہے، اس کی عبارتوں کے اندر ایک ایسا عنصر پوشیدہ ہے۔ جو سننے کے ساتھ ہی انسان کے وجود میں سما جاتا ہے، بعض اس کا آشکارا طور پر اور بعض پنہاں طور سے ادراک کرتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ غلبہ اور نفوذ موجود ہے، ایسا اسرار آمیز نفوذ جس کے ظہور کو اچھی طرح مشخص نہیں کیا جاسکتا۔

کیا یہ قرآن کے کلمات اور عبارتیں ہیں جو اس قسم کا انداز رکھتی ہیں؟

یا اس کے معانی کے عمق اور گہرائی میں کوئی راز چھپا ہوا ہے،

یا وہ عکس ہیں جو اس کے انوار سے چمکتے ہیں،

یا یہ سب ملے جلے امور ہیں؟

غرض وہ جو کچھ بھی ہے، ان سب کلمات و مفہیم سے۔ جو لغات کے قالب میں ڈھالے جاتے ہیں، مختلف ہے۔

یہ وہ راز ہے جو قرآن کی آیات میں چھپا ہوا ہے، اور ہر شخص پہلی ہی مرتبہ جب اس کے سامنے ہوتا ہے تو اسے محسوس کر لیتا ہے اور اس کے بعد دوسرے اسرار کی تلاش میں لگ جاتا ہے، جو غور و فکر کے ذریعہ سارے قرآن سے حاصل ہوتے ہیں۔
 اعجاز قرآن کے سلسلہ میں مختلف طریقوں سے مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد (سورۃ بقرہ کی آیت ۲۳ کے ذیل میں) کی طرف رجوع کریں، وہاں ایک تفصیلی بحث اس سلسلہ میں پیش کی گئی ہے، اسی طرح جلد ۶ (سورۃ اسراء کی آیت ۸۸ کے ذیل میں)۔

- ۳۵۔ اَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۝
 ۳۶۔ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَۚ بَلْ لَا يُوقِنُوْنَ ۝
 ۳۷۔ اَمْ عِنْدَ هُمْ خَزَاۤئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيِّطُونَ ۝
 ۳۸۔ اَمْ لَهُمْ سُلٰلَمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِۚ فَلَيَاۤتٍ مُّسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ۝
 ۳۹۔ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمْ الْبَنُوْنَ ۝
 ۴۰۔ اَمْ تَسْأَلُهُمْ اَجْرًاۤ فَاَ هُمْ مِنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝
 ۴۱۔ اَمْ عِنْدَ هُمْ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝
 ۴۲۔ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًاۙ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ۝
 ۴۳۔ اَمْ لَهُمُ الْغَيْرُ اللّٰهُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

ترجمہ

- ۳۵۔ کیا وہ کسی چیز (سبب) کے بغیر پیدا کئے گئے ہیں یا وہ خود ہی اپنے خالق ہیں ؟
 ۳۶۔ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ؟ بلکہ وہ یقین کے طلبگار ہی نہیں ہیں۔
 ۳۷۔ کیا ان کے پاس پروردگار کے خزانے ہیں ؟ یا وہ عالم کی تمام چیزوں پر غلبہ و تسلط رکھتے ہیں ؟
 ۳۸۔ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے (جس کے ذریعہ وہ آسمان کے اوپر چڑھ جاتے ہیں) اور اس کے ذریعہ اسرار وحی کو سنتے ہیں ؟ ان میں سے جو بھی کوئی یہ دعویٰ رکھتا ہو تو وہ کوئی واضح دلیل پیش

کرے !

- ۲۹۔ کیا خدا کے حصّہ میں تو لڑکیاں ہیں اور تمھارے حصّہ میں لڑکے ؟ (کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہو)۔
- ۳۰۔ کیا تو ان سے اجر اور مزدوری کا مطالبہ کرتا ہے جس کے بھاری بوجھ کے نیچے وہ دب گئے ہیں ؟
- ۳۱۔ کیا ان کے پاس غیب کے اسرار ہیں جسے وہ لکھ لیتے ہیں ؟
- ۳۲۔ کیا وہ تیرے لیے کوئی شیطانی منصوبہ بنانا چاہتے ہیں ؟ لیکن وہ جان لیں کہ ان شیطانی منصوبوں کے جال میں خود کا فرہی گرفتار ہوں گے۔
- ۳۳۔ یا وہ خدا کے علاوہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں (جس نے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے) جسے وہ خدا کا شریک بناتے ہیں خدا کی ذات اس سے پاک اور منزہ ہے۔

تفسیر

سچ سچ بتاؤ تمہاری صحیح بات کونسی ہے ؟ !

یہ آیات، قرآن، نبوت اور پروردگار کی قدرت کے منکرین کے مقابلہ میں اسی طرح سے گزشتہ استدلالی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہ ایسی آیات ہیں، جو سب کی سب "ام" کے ساتھ، جو یہاں استفہام کے لیے ہے، شروع ہوتی ہیں، اور "گیارہ پے دیپے سوالوں کی" ایک عمدہ لڑی کو (استفہام انکاری کی صورت میں) ایک استدلال کے طور پر بیان کرتی ہیں۔ اور زیادہ واضح تعبیر میں — مخالفین کے سامنے فرار کے تمام راستوں کو بند کر رہی ہیں — اور ان مختصر اور پر نفوذ عبارتوں میں گھیر کر انہیں اس طرح سے ایک تنگ جگہ میں لے آتی ہیں، کہ انسان اس کی عظمت اور انتظام کے سامنے بے اختیار سر تعظیم جھکاتے ہوئے، اقرار و اعتراف کرتا ہے۔ پہلے مسئلہ خلقت و آفرینش سے شروع کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا بغیر کسی سبب کے پیدا ہوئے ہیں، یا خود ہی اپنے خالق ہیں" (ام خلقوا من غیر شیء ام هم الخالقون)۔

لے اس آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمال بھی دیئے گئے ہیں، جنہاں ان کے ایک یہ ہے کہ آیت کا مفاد یہ ہے کہ "کیا وہ بلا مقصد (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

یہ کوتاہ اور مختصر عبارت حقیقت میں "علیت کی معروف دلیل" کی طرف اشارہ ہے جو فلسفہ و کلام میں خدا کے وجود کے اثبات کے لیے بیان کی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں بلا شک و شبہ حادث ہے کیونکہ وہ ہمیشہ تغیر و تبدیلی کی حالت میں ہے، اور جو چیز تغیر اور دیگر گونی کی حالت میں ہو وہ حادث ہوتی ہے، اور جو چیز حادث ہو اس کے لیے محال ہے کہ وہ قدیم و ازل ہو۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر عالم حادث ہے تو وہ پانچ حالتوں سے خالی نہیں ہے۔

۱۔ وہ بغیر کسی علت و سبب کے وجود میں آیا ہے۔

۲۔ وہ خود اپنے وجود کی علت ہے۔

۳۔ عالم کے معلولات اس کے وجود کی علت ہیں۔

۴۔ یہ جہان ایک ایسی علت کا معلول ہے کہ وہ بھی اپنی نوبت میں ایک دوسری علت کی معلول ہے، اور غیرتناہی سلسلہ تک معاملہ آگے جاتا ہے۔

۵۔ یہ جہان خداوند واجب الوجود کی مخلوق ہے جس کی مہمتی اور وجود خود اسی کی ذات پاک سے ہے۔

پہلے چار احتمالوں کا باطل ہونا معلوم ہے، کیونکہ:

معلول کا وجود علت کے بغیر محال ہے، ورنہ ہر چیز ہر طرح کے حالات میں وجود میں آسکتی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ دوسرا احتمال کہ کوئی چیز خود اپنے آپ کو وجود میں لے آئے، یہ بھی محال ہے، کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے وجود سے پہلے موجود ہو، اور یہ اجتماع نقیضین ہے (غور کیجئے) اسی طرح تیسرا احتمال بھی، کہ انسان کی مخلوقات و معلولات اس کی خالق و علت ہو، واضح طور پر باطل ہے (کیونکہ اس سے دور لازم آتا ہے)۔

اور چوتھا احتمال بھی، یعنی علل و اسباب کا تسلسل اور اس سلسلہ کا غیرتناہی حد تک کھینچ جانا بھی ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ غیرتناہی معلول و مخلوق آخر مخلوق ہے، اور وہ ایک خالق کی محتاج ہے، جس نے اس کو ایجاد کیا ہے، کیا غیرتناہی صفر کوئی عدد بن سکتا ہے؟ یا غیرتناہی ظلمت سے نور پھوٹ سکتا ہے؟ یا غیرتناہی فقر و نیاز سے بے نیازی وجود میں آسکتی ہے؟ اس بنا پر پانچویں احتمال یعنی واجب الوجود کے خالق ہونے کو قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، (پھر بھی غور کیجئے)۔

اور چونکہ اس برہان کا اصلی رکن، پہلے اور دوسرے احتمال کی نفی ہی ہے، لہذا قرآن نے اسی پر قناعت کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) اور ہدف کے پیدا کئے گئے ہیں، اور وہ کوئی پروگرام اور سئولیت نہیں رکھتے؟ اگرچہ اس معنی کو مفسرین کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے، لیکن دوسرے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے (امرہم الخائفون) سے واضح ہو جاتا ہے، کہ اس سے مراد وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے یعنی "کیا وہ بغیر کسی علت اور سبب کے پیدا کئے گئے یا وہ خود اپنی علت آپ ہیں۔"

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مختصر سی عبارت میں کیا استدلال چھپا ہوا ہے۔
بعد والی آیت، ایک اور سوال کو بیان کرتے ہوئے — جو پچھلے مرحلہ کے دعویٰ کے بارے میں ہے — کہتی ہے:
کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ (۱) *خلقوا السماوات والارض*۔
اگر وہ کسی علت کے بغیر وجود میں نہیں آئے، اور وہ خود اپنے وجود کی علت بھی نہیں ہیں تو کیا وہ واجب الوجود اور آسمانوں اور زمین کے خالق ہیں، اور اگر عالم ہستی کا مبداء نہیں ہیں، تو کیا خدا نے آسمان و زمین کی خلقت کا معاملہ ان کے سپرد کر رکھا ہے؟
اور اس طرح سے وہ ایک ایسی مخلوق ہیں جو خود فرمان خلقت رکھتی ہو؟
مسئلہ طور سے وہ ہرگز اس قسم کا باطل دعویٰ نہیں کر سکتے لہذا اس بات کے آخر میں مزید کہتا ہے،: ”بلکہ وہ ہٹ دھرم ہیں اور یقین و ایمان لانا ہی نہیں چاہتے“ (بل لا یوقنوں)۔
ہاں! وہ ایمان سے فرار کرنے کے لیے کسی بہانہ کی تلاش میں ہیں۔
اور اگر وہ ان امور کے مدعی نہیں ہیں، اور امر خلقت میں وہ کوئی حصہ نہیں رکھتے تو: ”کیا تیرے پروردگار کے خزانے ان کے پاس ہیں؟“ (۱) *ام عندہم خزائن ربک*۔
تاکہ وہ جسے چاہیں نبوت و علم و دانش کی نعمت یا دوسرے رزق بخشیں، اور جس سے چاہیں روک لیں۔
یا پھر یہ بات ہے کہ عالم کی تدبیر کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا ہے، اور وہ ہر چیز پر تسلط و اقتدار رکھتے ہیں؟ (۱) *ام ہم المصیطرون*۔
وہ ہرگز بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ پروردگار کے خزانہ دار ہیں، اور نہ ہی وہ اس جہاں کی تدبیر کے معاملہ میں کوئی تسلط رکھتے ہیں، چونکہ ایک حادثہ، ایک بیماری یا کسی حقیر سے موذی جانور کے مقابلہ میں ان کا ضعف و ناتوانی، اور اسی طرح زندگی کے بالکل ابتدائی وسائل کے لیے ان کی ضرورت و احتیاج، ان قدرتوں کی ان سے نفی کی بہترین دلیل ہے۔ صرف ہوائے نفس جاہ طلبی، خودخواہی، تعصب اور ہٹ دھرمی ہے جس نے انہیں حقائق سے انکار پر آمادہ کیا ہے۔
”مصیطرون“ ”ارباب انواع“ کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ لوگوں کی خرافات اور بے ہودہ باتوں کا ایک حصہ ہے۔
ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم کی انواع میں سے ہر نوع کا۔ چاہے وہ انسان ہوں یا حیوانات یا نباتات وغیرہ انواع، ایک خاص مدبر و مربی ہوتا ہے جسے وہ اس نوع کا رب النوع کہتے تھے۔ اور خدا کو ”رب الارباب“ کا خطاب دیتے تھے۔ یہ شرک آمیز عقیدہ اسلام کی نظر میں مردود ہے۔ اور قرآن کی آیات میں تمام جہاں کی تدبیر خدا ہی کے ساتھ مخصوص کی گئی ہے، اور اس کو ہم ”رب العالمین“ کہہ کر پکارتے ہیں۔

لحہ ”خزائن“ جمع ہے ”خزینہ“ کی جو کسی چیز کے منبع اور مرکز کے معنی میں ہے، جس کی حفاظت اور دوسروں کی رسائی سے بچانے کے لیے اسے وہاں جمع اور ذخیرہ کیا گیا ہو، قرآن مجید کہتا ہے، *وان من شیء الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم*، ”ہر چیز کے نزلنے ہمارے پاس میں اور ہم ایک معلوم انداز سے کے مطابق ہی اسے نازل کرتے ہیں۔“ (حجر - ۲۱)۔

یہ لفظ اصل میں ”سطر“ سے لیا گیا ہے، جو لکھنے کے وقت کلمات کی صفوں کے معنی میں ہے اور ”میدطر“ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کام پر تسلط رکھتا ہو اور اسے خط اور لائن دے، جیسا کہ لکھنے والا اپنے کام کی سطور پر تسلط رکھتا ہے، (یہ بات دھیان میں رہے کہ یہ لفظ ”صاد“ کے ساتھ بھی لکھا جاتا ہے اور ”سین“ کے ساتھ بھی) اور دونوں کا ایک ہی معنی ہے اگرچہ قرآن کا مشہور رسم الخط ”صاد“ کے ساتھ ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر کی نبوت کے منکرو اور زمانہ جاہلیت کے مشرکین اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں میں سے کوئی بھی اوپر والے پانچ امور کا مدعی نہیں تھا۔ اس لیے بعد والی آیت میں ایک دوسرے مرحلہ کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ”کیا وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، یا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس سے وہ آسمان کے اوپر چڑھ جائیں، اور وحی کے اسرار اس ذریعہ سے سن لیں؟“ (۱) **لھم سلم یستمعون فیہ**۔

اور چونکہ یہ ممکن تھا کہ وہ اسرار آسمانی سے آگاہی کا دعویٰ کر دیں، لہذا قرآن بلافاصلہ ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”جو شخص ان میں سے اس قسم کا دعویٰ رکھے اور یہ کہے کہ: میں آسمان پر چڑھ کر اسرار الہی کو سنتا ہوں تو وہ اپنے اس دعوے کے لیے کوئی واضح دلیل پیش کرے“ (فلیأت مستمعہم بسلطان مبین)۔

یقیناً اگر وہ اس قسم کا دعویٰ کرتے تو ایک بھی بات نہ کر سکتے، اور اس مطلب پر ہرگز کوئی دلیل پیش نہ کرتے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: کیا یہ ناروا نسبت جو وہ فرشتوں کی طرف دیتے ہیں کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں قابل قبول ہے؟ ”کیا خدا کے حصہ میں بیٹیاں اور تھارے حصہ میں بیٹے ہیں؟“ (۱) **لہ البنات ولکم البنون**۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے باطل عقائد و افکار میں سے ایک یہ تھا کہ وہ بیٹوں سے شدید نفرت کرتے تھے، اور اگر انہیں خبر ملتی تھی کہ ان کی بیوی نے بیٹی جنی ہے، تو ان کا بچہ غم و اندوہ اور شرم و حیا کی شدت سے سیاہ ہو جاتا تھا کیونکہ ان کے باوجود وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

اگر ان کا عالم بالا کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ اور وہ اسرار وحی سے آشنا ہیں، تو کیا ان کی وحی کا نمونہ ہی مضحکہ خیز خرافات اور ننگین و شرم آگین عقائد ہیں؟

یہ بات واضح ہے کہ بڑی اور لڑکا انسانی قدر و قیمت کے لحاظ سے آپس میں کوئی فرق نہیں رکھتے، اور اوپر والی آیت کی تعبیر حقیقت میں طرف مقابل کے باطل عقیدے کے برخلاف استدلال کے قبیل سے ہے۔

قرآن نے متعدد آیات میں اس یہودہ عقیدہ کی نفی پر تنبیہ کیا ہے، اور انہیں اس سلسلہ میں محاکمہ میں لے جا کر رسوا کرتا ہے۔

لے ”سَلَمَ“ (ربڑن خرم) سیڑھی کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات ہر قسم کے وسیلہ اور ذریعہ کے معنی میں آیا ہے، اس بارے میں کہ وہ کس چیز کے سننے کے مدعی تھے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اس کی وحی کے ساتھ تفسیر کی ہے، اور بعض نے ان نسبتوں کے لیے جو وہ پیغمبر کو دیتے تھے، جیسے شاعر و موزن، یا وہ شریک جنہیں وہ خدا کے لیے خیال کرتے تھے، اور بعض نے پیغمبر سے نبوت کی نفی کے معنی میں تفسیر کی ہے (ان معانی میں صحیح کرنا بھی بعید نہیں ہے اگرچہ پہلا معنی سب سے زیادہ واضح ہے۔

لے اس بارے میں کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں سمجھتے تھے؟ جب کہ بیٹی سے متغیر اور بیزار تھے؟ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر اس مرحلہ سے ایک منزل اور نیچے اتر رہا ہے، اور ایک دوسری بات کی طرف جو ان کی بہانہ ہوئی کا وسیلہ ہو سکتی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”کیا تو تبلیغ رسالت کے مقابلہ میں ان سے کسی اجر و صلہ کا مطالبہ کرتا ہے، جو ایک بھاری بوجھ کی طرح ان کے دوش پر رکھا ہے؟“ (۱) **تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ**۔

”مغرم“ (بروزن مکتب) ”غرم کے مادہ سے، اس نقصان کے معنی میں ہے جو بلا سبب انسان کے دانسیگر ہو جاتا ہے اور ”غرم“ طلب گار اور مقروض دونوں پر بولا جاتا ہے۔

”مثقل“ ”اثقال“ کے مادہ سے، تحصیل، مشقت، اور بھاری بوجھ کے معنی میں ہے، اس بنا پر جملہ کا معنی اس طرح ہوگا، ”کیا تو تبلیغ رسالت کے لیے ان سے تاوان کا مطالبہ کرتا ہے جس کو ادا کرنے سے وہ ناتواں ہیں اور اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے؟“ یہ معنی قرآن مجید میں — نہ صرف پیغمبر اسلام کے بارے میں بلکہ بہت سے پیغمبروں کے بارے میں — بارہا ٹکرا رہے آئے ہیں کہ انبیاء کی سب سے پہلی باتوں میں سے یہ ہوتی تھی کہ وہ یہ کہتے تھے: ”ہم تم سے دعوت الہی کی تبلیغ کے مقابلہ میں کسی قسم کے اجر و صلہ کا مطالبہ نہیں کرتے“ تاکہ ان کی بے مثالی بھی ثابت ہو اور کسی طرح و لالچ کا نہ ہونا بھی۔ اور بہانہ تلاش کرنے والوں کے لیے کوئی بہانہ بھی باقی نہ رہے۔

ان سے دوبارہ سوال کرتے ہوئے کہتا ہے، ”کیا غیب کے اسرار ان کے پاس ہیں۔ اور وہ اس سے لکھ لیتے ہیں؟“ (۱) **عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُمُونَ**۔

یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر ایک شاعر ہے، اور ہم اس کی موت اور شیرازہ زندگی کے بکھر جانے کی انتظار میں ہیں اور اس کی موت سے تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی اور اس کی دعوت نیاں کے سپرد ہو جائے گی، (جیسا کہ گزشتہ چند آیات میں مشرکین کا یہ قول بیان ہوا ہے: ”نَتْرَبُصْ بِهِ رَيْبَ الْمُنُونِ“

انہیں یہ کہاں سے پتہ چل گیا کہ وہ پیغمبر کی وفات کے بعد زندہ رہیں گے؟ یہ غیب انہیں کس نے بتایا ہے؟ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ: اگر تم اس بات کے مدعی ہو کہ تمہیں غیب کا علم ہے، اور تم احکام خداوندی کا علم رکھتے ہو، اور تم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے بے نیاز ہو، تو یہ ایک عظیم جھوٹ ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرے احتمال کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ”اگر ان امور میں سے کوئی بھی بات نہیں ہے، تو پھر انہوں نے شیطانی منصوبے بنائے ہیں، تاکہ پیغمبر کو درمیان سے ہٹا دیں یا اس کے دین سے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں“

(ایضاً حاشیہ صفحہ گزشتہ کا) اور قرآن نے جو عمدہ دلائل ان کے برخلاف قائم کئے ہیں زیادہ تر جلد ۱۱ ص ۱۱۱ سے آگے، ۱۱۲ سورہ نمل کے ذیل میں) اور جلد ۱۹ ص ۱۱۱ سے آگے سورہ صافات کی آیت ۱۴۹ کے ذیل میں بیان کئے جاپکے ہیں۔

لے مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں غیب کی ”لوح محفوظ“ کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ان دعویٰ کی طرف اشارہ ہے جو بعض مشرکین رکھتے تھے اور کہتے تھے، اگر کوئی قیامت ہوئی ہوگی تو ہمارے لیے خدا کے ہاں بلند مرتبہ ہوگا لیکن یہ تفسیر اور والدی آیات کے مفہوم اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط سے کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی۔

انہیں جان لینا چاہیے کہ کفار خدائی منصوبوں کے مقابلے میں مغلوب ہوں گے اور خدا کا منصوبہ ان کے منصوبے سے کہیں بلند ہے۔
(ام یریدون کیداً فالذین کفروا هم المکیدون)۔

اوپر والی آیت اس تفسیر کے مطابق سورہ آل عمران کی آیت ۵۴ کی مانند ہے جو کہتی ہے: ”و مکروا و مکر اللہ واللہ خیر الماکرین“

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی قبول کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ”ان کی سازشیں انجام کار انہی کے برخلاف تمام ہوں گی، جیسا کہ سورہ فاطر کی آیت ۴۴ میں آیا ہے، ولا یحییق المکر السیتی الا باہلہ: برے منصوبے صرف اپنے بنانے والوں کے ہی دامن گیر ہوتے ہیں“
دونوں تفسیریں دل کو جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ آیت گذشتہ آیت کے ساتھ ایک دوسرا تعلق رکھتی ہو، اور وہ یہ ہے کہ دشمنان اسلام کہتے تھے کہ: ہم محمدؐ کی موت کے انتظار میں ہیں، قرآن کہتا ہے کہ معاملہ دو حال سے خارج نہیں ہے، یا تو تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تم سے پہلے طبعی موت سے مر جائے گا، تو اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ تم اسرارِ غیب سے آگاہ ہو، اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ وہ تمہاری سازشوں کے ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ تو یہ جان لو کہ خدا کے منصوبے تمہارے منصوبوں سے کہیں بالا ہیں اور تمہاری سازشیں خود تمہیں دامِ نیگیر ہو جائیں گی۔

اور اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ ”دارالندوہ“ میں جمع ہو کر ادیبِ پیغمبر پر ”کہانت“، ”جنون“، ”شاعری“ جیسی تہمتیں لگانے سے، اس پر کامیاب ہونے میں قادر ہو جاؤ گے۔ تو یہ تمہارا خیال خام ہے، کیونکہ خدا کی قدرت تمام قدرتوں سے برتر ہے۔ اور اس نے اس عالمی دعوت کی تبلیغ کے لیے، اپنے پیغمبر کی سلامتی، نجات اور کامیابی کی ضمانت کر لی ہے۔
آخر میں آخری سوال میں ان سے پوچھتا ہے: کیا اُن کا خیال یہ ہے کہ وہ کوئی حامی اور مددگار رکھتے ہیں؟ ”کیا خدا کے علاوہ ان کا کوئی اور معبود ہے؟“ (ام لہم الہ غیر اللہ)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”وہ پاک اور منزہ ہے اس سے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں“ (سبحان اللہ عما یشرکون)۔

اس بنا پر کوئی شخص ان کی حمایت پر قادر نہیں ہے۔

اس طرح سے وہ ان سے گیارہ عجیب و غریب مسلسل اور پے در پے سوالات کے ذریعہ باز پرس کرتا ہے، اور انہیں مرحلہ بہ مرحلہ ان کے دعووں سے پیچھے ہٹاتا اور نیچے اتارتا چلا جاتا ہے، اور اس کے بعد فرار کے تمام راستے ان کے سامنے بند کر دیتا ہے، اور انہیں مکمل طور پر محصور کر دیتا ہے۔

”کید“ (بروزن مید) ایک قسم کی چارہ جوئی کو کہتے ہیں جو بعض اوقات اچھی چارہ جوئیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن زیادہ تر بُرے مقام پر استعمال ہوتا ہے، یہ لفظ مکر و فریب، سعی و کوشش اور جنگ کے معنی میں بھی آیا ہے۔

قرآن کے استدلالات کتنے دلنشین ہیں، اور اس کے سوالات اور طرز باز پرس کتنی عمدہ ہے، کہ اگر کسی میں حق جوئی اور حق طلبی کی روح موجود ہو، تو وہ اس کے سامنے تسلیم خم کر لے گا۔

قابل تجربات یہ ہے کہ آخری آیت میں دوسرے معبودوں کی نفی کے لیے کوئی دلیل بیان نہیں کی ہے اور صرف ”سبحان اللہ عما یشرکون“ کے جملہ پرکتفا کر لیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ ان بتوں کی الوہیت کے دعوے کا بطلان جو پیغمبر اور مکڑی سے بنائے گئے ہیں، یا کوئی بھی دوسری مخلوق، ان حاجات و ضروریات اور کمزوریوں کے ساتھ، جو ان میں پائی جاتی ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ واضح و روشن ہے کہ اس کی تشریح کی جائے اور اس پر گفتگو کی جائے۔ علاوہ ازیں دوسری آیات میں بارہا اس موضوع کے ابطال کے لیے استدلال ہوا ہے۔

- ۴۴۔ وَإِنْ يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ۝
- ۴۵۔ فَذَرُهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ۝
- ۴۶۔ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝
- ۴۷۔ وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝
- ۴۸۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝
- ۴۹۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ۝

ترجمہ

- ۴۴۔ (ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ) اگر وہ یہ دیکھ لیں کہ پتھر کا کوئی ٹکڑا آسمان سے (ان کے عذاب کے لیے) گر رہا ہے تو وہ یہ کہیں گے یہ تو ایک تہہ بہ تہہ بادل ہے۔
- ۴۵۔ یہ بات ہے تو انہیں چھوڑ دے یہاں تک کہ ان کی اپنی موت کے دن سے ملاقات ہو جائے۔
- ۴۶۔ وہ دن جس میں ان کے منصوبے ان کی حالت کے لیے کچھ بھی مفید نہیں ہوں گے، اور کوئی بھی ان کی مدد نہیں کرے گا۔
- ۴۷۔ اور ظالموں کے لیے اس سے پہلے بھی ایک عذاب ہے (جو اسی جہان میں ہوگا) لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔
- ۴۸۔ اپنے پروردگار کے حکم کی تبلیغ کے راستے میں صبر و استقامت سے کام لے کیونکہ تو مکمل طور سے

ہماری حفاظت میں ہے، اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد و ثنائیاں کر۔
۲۹۔ (اسی طرح) رات میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پشت پھیرنے اور طلوع صبح کے وقت۔

تفسیر تو ہماری مکمل حفاظت میں ہے

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں مشرکین اور ہٹ دھرم منکرین کے بارے میں آئی ہے، جو ایک ایسی بحث تھی کہ ہر حق طلب انسان کے لیے حقیقت کو واضح کرتی تھی، ان آیات میں ان کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے: ”وہ ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ اگر وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں کہ ایک ٹکڑا آسمانی پتھروں کا عذاب الہی کے طور پر نیچے گر رہا ہے تو وہ یہ کہیں گے: ”تمہیں مغالطہ ہوا ہے، یہ پتھر نہیں ہے، یہ تو تہ بہ تہ بادل ہے۔ جو زمین پر برسنے والا ہے“ (وان یروا کسفاً من السماء ساقطاً یقولوا سحاب مرکوم)۔

جو لوگ اس قدر ہٹ دھرم ہوں کہ محسوس حقائق کا بھی انکار کر دیں اور آسمانی پتھروں کو تہ بہ تہ بادل کہنے لگیں، حالانکہ تمام لوگوں نے بادل کو — جب وہ زمین کے قریب ہوتا ہے — دیکھا ہے کہ وہ بخارات کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، یہ لطیف بخارات تہ بہ تہ ہو کر پتھر میں کیسے تبدیل ہو سکتے ہیں؟

ان افراد کی حقائق منہوی کے مقابلہ میں تکلیف و ذمہ داری واضح ہے۔
ہاں! گناہ، ہوا پرستی، عناد اور ہٹ دھرمی کی تاریکی انسان کی نگاہ کے افق کو اس طرح سے تیرہ قناریک کر دیتی ہے کہ آخر کار وہ محسوسات کا بھی انکار کرنے لگ جاتا ہے، اور اس حالت میں اس کی ہدایت کی کوئی امید نہیں رہتی۔
”مرکوم“ ”مترکم“ کے معنی میں ہے اور وہ ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ پر قرار پایا ہو۔

لہذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”اب جب کہ ایسا ہے تو ان کو پھوڑ دے اور اس ہٹ دھرم گروہ کی ہدایت کے لیے زور نہ دے، تاکہ وہ اپنے مہوت کے دن کی ملاقات کرتے ہوئے خدا کے عذابوں کو — جو ان کے انتظار میں ہیں۔

لے ”کف“ (بروزن فتن) کسی بھی چیز کے ٹکڑے کے معنی میں ہے اور من السماء کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، یہاں آسمانی پتھر کا ٹکڑا مراد ہے، بعض کتب لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ کفہ کی جمع ہے (جیسا کہ کف بروزن پدر بھی جمع ہے) لیکن اکثر مفسرین نے اسے مفرد کے معنی میں لیا ہے۔ زیر بحث آیت سے ظاہر یہ ہے کہ یہ لفظ مفرد ہے کیونکہ اس کی صفت کو مفرد کی صورت میں لایا ہے۔

اپنی آنکھ سے دیکھ لیں" (فذرهم حتی یلاقوا یومہم الذی فیہ یصعقون)۔

"یصعقون" "صعق" اور "اصعاق" کے مادہ سے مار ڈالنے کے معنی میں ہے۔ اور اصل میں "صاعقہ" سے لیا گیا ہے، اور چونکہ صاعقہ لوگوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ لہذا یہ لفظ ہلاک کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے اس جملہ کی، اختتام جہاں پر انسانوں کی عمومی موت سے، جو قیامت کا مقدمہ ہے، تفسیر کی ہے، لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے، کیونکہ وہ اس زمانہ تک باقی نہیں رہیں گے، بلکہ وہی پہلا معنی ہے۔ یعنی ان کو موت کے دن تک کے لیے۔ جو آخر دی سزاؤں اور عذابوں کا سر آغاز ہے، چھوڑ دے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ "ذرہم" (انہیں چھوڑ دے) کا جملہ ایک تہدید آمیز امر ہے، اور اس سے مراد ایسے ناقابل ہدایت افراد کی تبلیغ پر اصرار کو ترک کر دینا ہے۔ اس بنا پر نہ تو پیغمبر کی طرف سے عمومی سطح پر تبلیغ کو جاری رکھنے کے ساتھ منافات رکھتا ہے اور نہ ہی فرمان جہاد کے ساتھ۔

اس بنا پر بعض کا یہ کہنا کہ: یہ آیت آیات جہاد کے ساتھ نسخ ہو گئی ہے، کسی طرح سے بھی قابل قبول نہیں ہے۔ اس کے بعد اس دن کا تعارف کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہی دن، جس میں ان کی چارہ جوئی اور منصوبے انہیں کوئی فائدہ نہیں دیں گے، اور فرار کے تمام راستے ان کے سامنے بند ہو جائیں گے، اور کسی طرف سے ان کی مدد نہ کی جائے گی" (یوم لا یغنی عنہم کیدہم شیئاً ولا ہم ینصرون)۔

ہاں جو شخص مر جاتا ہے اس کی قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے (من مات قامت قیامتہ) اور وہ جزاؤں اور سزاؤں کے لیے ابتداء ہوتی ہے، جن میں سے بعض تو برزخی پہلو رکھتی ہیں، اور بعض دوسری قیامت کبریٰ میں، یعنی انسانوں کی عمومی قیامت میں انہیں دامنگیر ہوں گی، اور ان دونوں مراحل میں نہ تو چارہ جوئیاں موثر ہوں گی اور نہ ہی ارادہ الہی کے مقابلہ میں کوئی ناصر و مددگار ہوگا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ یہ تصور نہ کر بیٹھیں کہ صرف برزخ اور قیامت کا عذاب ہی ہوگا، بلکہ ان لوگوں کے لیے جہنم نے عظم و ستم کیا ہے اور کفر و شرک اختیار کیا ہے، اس سے پہلے بھی اس دنیا میں ان کے لیے سزا و عذاب ہے، اگرچہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے" (وان للذین ظلموا عذاباً دُونَ ذَٰلِکَ وَلَٰکِن اَکْثَرُہُمْ لَا یَعْلَمُونَ)۔

ہاں! انہیں اس دنیا میں بھی ان عذابوں کے انتظار میں رہنا چاہیے، جیسا کہ گزشتہ اقوام پر ہوئے، مثلاً صاعقے، زلزلے، آسمانی پتھر، خشک سالی، قحط یا سپاہ توحید کے مجاہدین کے قتل ہونا، جیسا کہ جنگ بدر میں سرداران شرک کے ایک گروہ کے لیے اتفاق ہوا، مگر یہ کہ وہ بیدار ہو جائیں، تو بہ کر لیں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں۔

یقیناً ان میں سے ایک گروہ تو قحط اور خشک سالی میں گرفتار ہوا، اور ایک گروہ۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ جنگ بدر میں قتل کر دیا گیا، لیکن ایک عظیم گروہ نے تو بہ بھی کر لی، اور ایمان لے آئے، اور سچے مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے، اور خدا نے انہیں اپنی عفو و بخشش میں شامل قرار دیا۔

۱۔ وہ لوگ جو "فیہ یصعقون" کو روز قیامت اور ابتداء قیامت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، انہوں نے زیر بحث (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

”ولکن اکثرهم لا يعلمون“ (لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ عام طور پر اس عذاب سے جو دنیا و آخرت میں ان پر آنے والا ہے، بے خبر ہیں، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی اقلیت اس معنی سے آگاہ ہے لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے اپنی مخالفت پر اصرار کرتے ہیں۔

بعد والی آیت میں پیغمبر کو ان تمام کارکنوں، تہمتوں اور ناسزا باتوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: ”اپنے پروردگار کے حکم کی تبلیغ کی راہ میں صبر و استقامت و شکیبائی اختیار کر“ (واصبر لحکم ربک) یہ اگر وہ تجھے کاہن، مجنون اور شاعر کہتے ہیں تو تو صبر کر، اسی طرح اگر وہ آیات قرآنی کو افترا خیال کرتے ہیں جو خدا پر باندھے گئے ہیں تو تو صبر و شکیبائی اختیار کر، اور اگر وہ ان تمام منطقی دلیلوں کے مقابلہ میں پھر بھی ہٹ دھرمی اور عناد کو جاری رکھتے ہیں، تو تو استقامت اختیار کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو مالوس اور ضعیف و ناتواں ہو جائے۔

”کیونکہ تو ہمارے علم کی نگاہوں کے سامنے ہے اور ہماری مکمل حفاظت میں ہے“ (فانک باعیننا)۔

ہم ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں اور ہر چیز سے باخبر ہیں، اور ہم تجھے تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

”فانک باعیننا“ کا جملہ بہت لطیف تعبیر ہے، جو پروردگار کے علم و آگاہی کو بھی بتاتا ہے، اور اس کی کامل حمایت

اور لطف کو بھی بیان کرتا ہے۔

ہاں! انسان جب یہ احساس کر لے کہ کوئی بزرگ ہستی حاضر و ناظر ہے، اور وہ اس کی تمام کوششوں اور جدوجہد کو دیکھ رہی ہے، اور وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرتی ہے، تو اس موضوع کا ادراک اسے طاقت و توانائی بخشتا ہے، اور زیادہ سے زیادہ مسولیت کا احساس بھی۔

اور چونکہ خدا سے راز و نیاز اور اس کی عبادت و بندگی اور اس کی ذات پاک کی تسبیح و تقدیس انسان کو آرام و سکون اور قوت و طاقت بخشتی ہے۔ لہذا صبر کا حکم دینے کے بعد فرماتا ہے: ”جس وقت تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالا“ (وسبح بحمد ربک حین تقوم)۔

جس وقت تو سحر کے وقت عبادت اور نماز شب کے لیے اٹھے۔

جس وقت تو نیند سے واجب نماز کے لیے اٹھے۔

اور جب بھی تو کسی مجلس و محفل سے کھڑا ہو تو اس کی حمد و تسبیح کر۔

(یقینہ حانیہ ص ۱۰۷ گزشتہ کا) آیت میں عذاب قبر اور عذاب برزخ کے معنی میں لیا ہے، لیکن چونکہ وہ تفسیر ضعیف ہے لہذا یہ احتمال بھی ضعیف ہے۔

لے ”حکوم ربک“ سے مراد ممکن ہے وہی احکام الہی کی تبلیغ ہو کہ پیغمبر اس کی راہ میں صبر و شکیبائی کرنے پر مامور ہے، یا خدا کا عذاب ہے جس کا دشمنوں کو وعدہ دیا گیا ہے، یعنی انتظار کر یہاں تک کہ عذاب الہی انہیں پکڑ لے۔ یا اوامر الہی اور فرمان خدا کے معنی میں ہے، یعنی چونکہ خدا نے حکم دیا ہے کہ صبر و استقامت کر، اگرچہ تمہیں تفسیر کا جمع کرنا بھی ممکن ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، خصوصاً ”انک باعیننا“ کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے۔

مفسرین نے اس آیت کی گونا گوں تفسیریں کی ہیں لیکن ان سب کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے، چاہے وہ سحر کے وقت نماز تہجد کے لیے ہو، چاہے نیند کے بعد نماز فریضہ کے ادا کرنے کے لیے ہو، اور چاہے وہ ہر مجلس سے قیام کے بعد ہو۔
ہاں! اپنی روح اور جان کو خدا کی حمد و تسبیح کے ساتھ نور و صفا بخش، اور اپنی زبان کو اس کے ذکر سے معطر بنا، اس کی یاد سے مدد لے، اور دشمن کی کارکنیوں سے مبارزہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جا !

متعدد روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر جس وقت کسی مجلس سے اٹھتے تھے تو خدا کی تسبیح اور حمد بجالاتے تھے اور فرماتے تھے: ”انہ کفارة المجلس“ یہ حمد و تسبیح مجلس کا کفارہ ہے۔^۱

منجملہ ان کے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر جس وقت کسی مجلس سے اٹھتے تو فرماتے:

سبحانک اللہم وبحمدک اشہدان لا الہ الا انت، استغفرک و

اتوب الیک

بعض لوگوں نے عرض کیا: اے رسول خدا یہ کیا کلمات ہیں جو آپ نے کہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

هن کلمات علمنیہن جبرئیل، کفارات لما یکون فی المجلس

”یہ وہ کلمات ہیں جن کی جبرئیل نے (خدا کی طرف سے) مجھے تعلیم دی ہے، اور یہ اس چیز کا کفارہ ہے جو مجلس میں واقع ہوتی

ہے“^۲

اس کے بعد آخری آیت میں مزید کہتا ہے: ”اسی طرح رات میں اس کی تسبیح کر، اور ستاروں کے پشت پھرنے کے وقت اور طلوع صبح کے وقت“ (ومن اللیل فسبحہ وادبار النجوم)۔

بہت سے مفسرین نے ”ومن اللیل فسبحہ“ کے جملہ کی نماز شب کے ساتھ تفسیر کی ہے ”وادبار النجوم“ کی صبح کی دو رکعت نافلہ کے ساتھ، جو طلوع فجر کے آغاز اور نور صبح میں ستاروں کے پنہاں ہونے کے وقت پڑھی جاتی ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علیؓ سے بھی آیا ہے کہ ”ادبار النجوم“ صبح کی دو رکعت نافلہ ہے جو نماز صبح سے پہلے اور ستاروں کے غروب کے وقت بجالاتے ہیں۔

باقی رہا ”ادبار السجود“ (جو سورہ ق کی آیت ۴۰ میں آیا ہے) تو اس سے مراد وہ دو رکعت نافلہ ہیں جو نماز مغرب کے بعد پڑھی جاتی ہیں (لیکن مغرب کے نوافل چار رکعتیں ہیں جن میں سے اس حدیث میں صرف دو رکعت کی طرف اشارہ ہوا ہے تاکہ بہر حال، عبادت اور تسبیح و حمد خدا رات کے اندر اور طلوع فجر کے آغاز میں ایک اور ہی دوسرا لطف و صفا رکھتی ہیں، اور دکھاوے اور ریاکاری سے بہت دور ہوتی ہے، اور اس کے لیے روح کی آمادگی اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ دن کی زندگی میں

۱۔ ”تفسیر المیزان“ جلد ۱۹ صفحہ ۲۴۔

۲۔ ”در المنثور“ جلد ۶ صفحہ ۱۲۰۔

۳۔ ”مجمع البیان“ سورہ ق کی آیت ۴۰ کے ذیل میں (جلد ۹ صفحہ ۱۵۰)۔

مشغول رکھنے والے کاموں سے فراغت ہوتی ہے، اور رات کی استراحت نے انسان کو آرام و سکون بخشا ہوا ہوتا ہے اور قیل و قال اور شور و غوغا نہیں ہوتا۔

حقیقت میں یہ وقت وہی وقت ہے جس میں پیغمبر معراج پر گئے تھے۔ اور مقام ”قاب قوسین“ پر راز و نیاز کی خلوت گاہ میں پہنچے تھے، اور اپنے خدا کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کی تھیں۔ اسی بنا پر زیر بحث آیات میں ان دو اوقات پر تکیہ ہوا ہے۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہوا ہے :

رکعتا الفجر خیر من الدنيا وما فيها

”تیرے لیے صبح کی نافلہ دو رکعت دنیا و ما فیہا سے بہتر ہیں“

خداوند! مجھے عمر بھر سحر خیزی اور اپنی ذات سے راز و نیاز کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمارے قلب کو اپنے عشق سے مطمئن اور اپنی محبت سے نورانی، اور اپنے لطف و کرم کا امیدوار بنادے۔

بار اہل! ہمیں شیطانی قوتوں اور اپنے دشمنوں کی کار شکنیوں کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی اور استقامت و پامردی مرحمت فرما۔

تاکہ ہم تیرے پیغمبر کی پیروی کریں، ان کی سنت کے مطابق زندگی گزاریں، اور ان کی سنت پر ہی داعی اجل کو لبیک کہیں۔

امین یا رب العالمین

سورۃ طور کا اختتام

۲۲ صفر ۱۴۰۶

۱۵/۸/۱۳۶۳

اختتام ترجمہ

تیسویں شب رمضان المبارک

۹ بجے شب ۱۵/۸/۱۳۶۳ بمقام حقیر

سُورَةُ النّجْمِ

یہ سُورہ مکہ میں نازل ہوا

اور
اس کی ۶۲ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲، صفر اخیر ۱۴۰۶

۱۵ - ۸ - ۱۳۶۲

سورۃ النجم کے مطالب و مضامین

بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ سورہ وہ سب سے پہلا سورہ ہے جسے پیغمبر نے اپنی دعوت کا اعلان کرنے کے بعد آشکارا اور بلند آواز سے حرم مکہ میں تلاوت کیا۔ اور مشرکین نے اُسے غور سے سنا، اور اس دن تمام مومنین کے ساتھ مشرکین تک نے بھی سجدہ کیا۔

یہ سورہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق، بعثت کے پانچویں سال ماہ مبارک رمضان میں نازل ہوا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ پہلا سورہ ہے جس میں سجدہ واجب کی آیت نازل ہوئی۔ لیکن اس بات کے پیش نظر کہ مشہور روایت کے مطابق، سورہ ”اقراء“ اس سے پہلے نازل ہوا تھا، اور اس کے آخر میں آیت سجدہ ہے۔ یہ روایت بعید نظر آتی ہے۔

بہر حال اس سورہ میں ”مکی“ ہونے کی بنا پر اصول عقائد کے مباحث خصوصاً ”نبوت“ و ”معاد“ کے بارے میں بیان ہوئے ہیں۔ اور یہ سرکوبی کرنے والی تہدیدوں اور بار بار کے انداز اور عذاب الہی سے ڈرانے کے باعث کفار کو بیدار کرتی ہے۔ اس سورہ کے مضامین و مطالب کو سات حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ سورہ کے آغاز میں قرآن ایک پُر معنی قسم کے بعد وحی کی حقیقت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور پیغمبر کے پیک وحی ”جبرائیل“ سے براہ راست رابطہ اور تعلق کو واضح و روشن کرتا ہے۔ اور پیغمبر کی ذات اقدس کو اس بات سے کہ وہ وحی الہی کے علاوہ کوئی اور بات کرے مبرا قرار دیتا ہے۔

۲۔ اس سورہ کے دوسرے حصہ میں قرآن پیغمبر کی معراج سے متعلق گفتگو کرتا ہے، اور اس کے کچھ گوشوں کو مختصر اور پر مبنی عبارتوں کے ساتھ مجم کرتا ہے، کہ وہ بھی وحی کے ساتھ ایک مستقیم رابطہ ہے۔

۳۔ اس کے بعد بتوں کے سلسلہ میں مشرکین کے خرافات، فرشتوں کی عبادت اور دوسرے امور جو ہوا و دھوس کے سوا اور کچھ نہ تھے، پیش کرتے ہوئے ان کی سخت مذمت کرتا ہے، اور ان کی پرستش سے ڈراتا ہے۔ اور ایک قومی منطق کے ساتھ اس معنی کو ثابت کرتا ہے۔

۱۔ تفسیر روح البیان، جلد ۹ ص ۲۰۸۔

۲۔ تفسیر روح البیان، جلد ۹ ص ۲۰۸۔

۳۔ تفسیر ”مراغی“ جلد ۲ ص ۴۱۔

۴۔ ایک دوسرے حصہ میں ان مخرغین اور عام گنہگاروں پر توبہ کی راہ کھولتے ہوئے انہیں حق تعالیٰ کی ”مغفرت واسعہ“ کی نوید سناتا ہے، اور تاکید کرتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے، اور کوئی بھی شخص دوسرے کے گناہ کا بار اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا۔

۵۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اس سورہ کے ایک اور دوسرے حصہ میں ”مسئلہ معاد، کے کچھ گوشوں کو قرآن منکس کرتا ہے، اور اس دنیا کی زندگی میں جو کچھ موجود ہے اس سے اس مسئلہ کے لیے ایک واضح دلیل قائم کرتا ہے۔

۶۔ حسب دستور گزشتہ اقوام کی دردناک سرنوشت کی طرف — جو حق سے دشمنی کے طریق میں اصرار، ہر دھرمی اور عناد رکھتے تھے، (جیسے قوم عاد، ثمود، نوح اور لوط) — کچھ اشارے کرتا ہے، تاکہ بے خبر غافلوں کو اس طریقہ سے بیدار کرے۔

۷۔ اور آخر میں پروردگار کی عبادت اور سجدہ کے امر کے ساتھ سورہ کو ختم کرتا ہے۔
اس سورہ کے امتیازات میں سے آیات کا مختصر ہونا، اور ان آیات کا ایک خاص آہنگ اور طرز پر ہونا ہے، جو اس کے مفہیم کو ایک گہرا اور عمیق اثر بخشنا ہے، اور سونے ہوئے لوگوں کے دل و روح کو بیدار کرتے ہوئے اپنے ساتھ آسمان کی طرف لے جاتا ہے۔

ضمنی طور پر اس سورہ کا نام ”النجم“ کے ساتھ اس سورہ کی پہلی آیت کی بنا پر ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

روایات میں اس سورہ کی تلاوت کے بارے میں کئی ایک اہم فضائل بیان ہوئے ہیں :

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ :

من قرأ سورة النجم أعطى من الاجر عشر حسنات بعدد من صدق به محمد

(ص) ومن جحد به

”جو شخص سورہ النجم کو پڑھے گا خدا ان لوگوں کی تعداد کے مطابق جو پینتر پرایمان لائے تھے اور ان لوگوں کی تعداد کے مطابق جنہوں نے آپ کا انکار کیا دس نیکیاں اُسے عطا کرے گا۔“

ایک اور حدیث میں امام صادق جعفر بن محمد سے منقول ہے :

من كان يدا من قراءة ”والنجم“ في كل يوم، او في كل ليلة، عاش محموداً

بين الناس وكان مغفوراً له وكان محبوباً بين الناس

”جو شخص سورہ ”النجم“ کو ہر دن اور ہر رات تلاوت کرے گا، وہ لوگوں کے درمیان ایک قابل تعریف اور شائستہ شخص سمجھا جائے گا، خدا اس کو بخش دے گا۔ اور وہ لوگوں کے درمیان محبوب رہے گا۔“

مسلمہ طور سے اتنی عظیم نعمتیں انہیں لوگوں کے لیے ہوں گی جو اس سورہ کی تلاوت کو غور و فکر، اور اس کے بعد عمل کا وسیلہ اور ذریعہ بنالیں، اور اس سورہ کی مختلف تعلیمات ان کی زندگی میں سایہ فگن ہوں۔

www.sirat-e-mustaqeem.net

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

- ۱۔ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝
- ۲۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝
- ۳۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝
- ۴۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱۔ قسم ہے ستارے کی جس وقت وہ افول (غروب) کرے۔
- ۲۔ نہ تو تمھارا ساتھی (محمد) منحرف ہوا ہے اور نہ ہی اس نے مقصد کو گم کیا ہے۔
- ۳۔ اور وہ ہرگز بھی ہوائے نفس سے بات نہیں کرتا۔
- ۴۔ جو کچھ بھی وہ کہتا ہے اس وحی کے سوا کچھ نہیں ہے جو اس کی طرف وحی ہوئی ہے۔

تفسیر

قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ سورہ (سورہ طور) ”النجم“ (ستاروں) کے لفظ پر ختم ہوئی تھی اور یہ سورہ ”النجم“ (ستارہ) کے لفظ سے شروع ہو رہی ہے جس کی خدا نے قسم کھائی ہے، فرماتا ہے، ”قسم ہے ستارے کی جس وقت وہ غروب کرتا ہے“ (والنجم اذا هوى)۔

اس بارے میں کہ یہاں ”النجم“ سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے بہت سے آراء دیئے ہیں، اور ہر ایک نے ایک الگ تفسیر

پیش کی ہے۔

ایک جماعت اسے ”قرآن مجید“ کی طرف اشارہ سمجھتی ہے، چونکہ یہ بعد والی آیات کے مناسب ہے جو وحی کے بارے میں ہیں، اور ”نجم“ کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ عرب اس چیز کو جو تندرست اور مختلف وقتوں سے انجام پاتے، ”نجم“ سے تعبیر کرتے ہیں (قرضوں کی اقساط اور اس قسم کے دوسرے امور میں ”نجم“ کی تعبیر بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے) اور چونکہ قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں اور مختلف ملکوں اور حصوں میں پیغمبر اسلام پر نازل ہوا ہے، لہذا ”نجم“ کے عنوان سے اس کا ذکر ہوا ہے۔ اور ”اذا ہلوی“ سے مراد اس کا رسول خدا کے قلب پاک پر نازل ہے۔

ایک دوسری جماعت نے اسے آسمان کے ایک ستارہ مثلاً ”ثریا“ یا ”شعری“ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ یہ ستارے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ”النجم“ سے مراد وہ شہاب ہیں جن کے ذریعہ شیاطین کو آسمان کے منظر سے بھگایا جاتا ہے اور عرب ان شہابوں کو ”نجم“ کہتے ہیں۔

لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے کوئی ایک بھی واضح دلیل نہیں رکھتی، بلکہ آیت کا ظاہر جیسا کہ لفظ ”النجم“ کے اطلاق کا تقاضا ہے۔ آسمان کے تمام ستاروں کی قسم ہے، جو خدا کی عظمت کی ظاہر و آشکارا نشانیوں میں سے ہیں، اور عالم آفرینش کے عظیم اسرار میں سے ہیں، اور پروردگار کی حمد سے زیادہ عظیم مخلوقات میں سے ہیں۔

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ قرآن جہاں خلقت کے عظیم موجودات کی قسم کھا رہا ہے، دوسری آیات میں بھی سورج چاند اور اس قسم کی چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔

ان کے غروب پر تنبیہ کرنا۔ حالانکہ ان کا طلوع زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہے کہ ستاروں کا غروب ان کے حدوث کی دلیل ہے، اور ستارہ پرستوں کے عقیدہ کی نفی کی دلیل بھی ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں آیا ہے: ”فلما جن علیہ اللیل رآی کوکبا قال ہذا ربی فلما اخل قال لا احب الا فلیین“ ”جس وقت رات کی تاریکی نے اسے چھپا لیا تو اس نے ایک ستارہ دیکھا اور کہا: کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب اس نے غروب کیا تو کہا، میں غروب کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا“ (سورہ النعام - ۷۶)

یہ معنی بھی قابل توجہ ہے کہ مسئلہ ”طلوع“ ”نجم“ کے لفظ کے مادہ میں موجود ہے، کیونکہ ”مفردات“ میں راغب کے قول کے مطابق اصل ”نجم“ وہی ”طلوع کرنے والا ستارہ ہے“ اور یہی وجہ ہے کہ زمین میں گیارہ کے اُگنے، اور منہ میں دانت کے

لحہ ”ثریا“ ایک سات ستاروں کا مجموعہ ہے جن میں چھ ظاہر ہیں اور ایک بہت ہی کم نور ہے، عام طور پر لوگوں کی نظر کی طاقت جاچنے کے لیے اس کے ذریعہ آزمائش کرتے ہیں اس ستارہ کی قسم ہو سکتا ہے اس کی ہم سے زیادہ مسافت کی بنا پر ہو۔

لحہ ”شعری“ آسمان کا ایک روشن ترین ستارہ ہے، جس کے بارے میں ہم انشاء اللہ اسی سورہ کی آیہ ۴۹ کے ذیل میں مزید تشریح کریں گے اس کی قسم کھانے کی رمز ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ وہ حد سے زیادہ روشن، درخشاں اور کئی خصوصیات کا حامل ہے۔



مکھنے، اور ذہن میں کسی نظریہ کے پیدا ہونے کو ”نجم“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
 اس طرح سے خدا نے ستاروں کے طلوع ہونے کی بھی قسم کھائی ہے، اور ان کے غروب کی بھی، کیونکہ یہ ان کے حدوث اور
 قوانین خلقت کے پابند ہونے کی دلیل ہے۔
 لیکن آیت دیکھتے ہیں کہ یہ قسم کس لیے کھائی گئی ہے؟ بعد والی آیت اس طرح سے وضاحت کرتی ہے: ”ہرگز تمہارا ساتھی
 (اور دوست محمدؐ) منحرف نہیں ہوا ہے، اور اس نے اپنے مقصد کو کھویا نہیں ہے“ (ماضی ص ۱۸۱ و ماغوی)۔
 وہ ہمیشہ حق کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے، اور اس کے گفتار و کردار میں معمولی سا بھی انحراف نہیں ہے۔
 ”صاحب“ کی تعبیر جو دوست اور رفیق کے معنی میں ہے، ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جو کچھ وہ کہتا ہے تمہاری
 محبت اور بھلائی کی بنا پر ہے۔

بہت سے مفسرین نے ”ضلّ“ اور ”غوی“ کے درمیان کوئی فرق قرار نہیں دیا، اور وہ انہیں ایک دوسرے کی تاکید سمجھتے
 ہیں، لیکن بعض کا کہنا یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے، ”ضلاّت“ یہ ہے کہ انسان کبھی مقصد کی طرف کوئی راہ ہی نہ پائے۔
 لیکن ”غواہت“ یہ ہے کہ اس کی راہ مستقیم اور غلطی سے خالی نہ ہو، پہلی کفر کی مانند ہے، اور دوسری ”فسق و گناہ“ کی طرح۔
 لیکن ”راغب“ ”مفردات“ میں ”غی“ کے معنی میں کہتا ہے کہ: ”وہ ایک ایسی جہالت ہے جو اعتقادِ اسد کے
 ساتھ ہو۔“

اس بنا پر ضلالت تو مطلق جہالت، نادانی اور بے خبری ہے لیکن غواہت ایسی جہالت ہے جو باطل عقیدے کے ساتھ ہو،
 بہر حال خدا یہ چاہتا ہے کہ اس عبارت میں اپنے پیغمبر سے ہر قسم کے انحراف، جہالت، گمراہی اور غلطی کی نفی کرے، اور وہ ہمیں جو
 اس سلسلہ میں دشمنوں کی طرف سے آپ پر لگائی جاتی تھیں انہیں بے معنی قرار دے۔

اس کے بعد اس مطلب کی تاکید کے لیے، اور اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے، کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے، خدا کی طرف
 سے کہتا ہے، وہ ہرگز بھی ہوائے نفس کی بنا پر بات نہیں کرتا ”(وما ینطق جن الہوی)۔
 یہ تعبیر اسی استدلال سے مشابہ ہے جو گزشتہ آیت میں ضلالت و غواہت کی نفی کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے کیونکہ عام
 طور پر گمراہیوں کا سرچشمہ ہوائے نفس کی پیروی ہی ہے۔

سورہ کا ص کی آیت ۲۶ میں آیا ہے: ولا تتبع الہوی فیضلک عن سبیل اللہ“ ہوائے نفس کی
 پیروی نہ کرنا کیونکہ وہ تجھے خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی۔“

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی مشہور حدیث میں بھی یہ آیا ہے کہ:

اما اتباع الہوی فیصد عن الحق

۱۔ اگر بعض روایات میں ”نجم“ ذاتِ پیغمبرؐ سے تفسیر ہوا ہے، اور غوی ان کے شبِ معراج آسمان سے نازل ہے، تو وہ حقیقت میں آیت کے
 بطور میں سے ایک ہے، نہ کہ اس کا ظاہر۔

”باقی رہا ہوائے نفس کی پیردی کرنا تو وہ انسان کو راہ حق سے روک دیتی ہے“۔
 بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ”ما حصل صاحبکم“ کا جملہ پیغمبر سے جنون کی نفی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور ”وما غلوسی“ کا جملہ شاعر ہونے کی نفی کو ظاہر کرتا ہے، یا شعر کے ساتھ ہر قسم کے ارتباط سے، کیونکہ سورہ شعراء کی آیت ۲۲ میں آیا ہے کہ: **وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ** ”شعراء ہی تو ہیں جن کی گمراہ لوگ پیروی کرتے ہیں، (خیال پر دواز اور بے مقصد شعر کہنے والے) اور **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ** کا جملہ کہانت کی نسبت کی نفی ہے۔ کیونکہ کاہن حرص پرست اور ہوس باز لوگ ہوتے ہیں۔
 اس کے بعد پوری مراحات کے ساتھ کہتا ہے: ”وہ جو کچھ لے کر آیا ہے وہ صرف وحی ہے جو خدا کی جانب سے اس کی طرف بھیجی گئی ہے“ (ان ہوا لا وحی یوحی)۔

وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتا، اور قرآن اس کی فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ اور اس دعوے کی دلیل خود اسی میں چھپی ہوئی ہے، آیات قرآنی کا اچھی طرح مطالعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے، کہ کوئی بھی انسان، چاہے وہ کتنا ہی عالم و مفکر ہو — کجا وہ انسان جس نے کچھ لکھا پڑھا نہ ہو، اور اس نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی ہو، جو چہالت و خرافات سے پُر ہو — ہرگز بھی یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ ایسی مطالب سے بھرپور باتیں بیان کرے، جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی مفکرین کے دماغ کے لیے اہام بخش ہوں۔ اور وہ صالح، سالم، مومن اور پیش رفت کرنے والے معاشرے کے بنانے کی بنیاد بن سکیں۔
 ضمنی طور پر اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ یہ گفتگو صرف آیات قرآنی کے بارے میں نہیں ہے۔ بلکہ گزشتہ آیات کے قرینہ سے سنت پیغمبر بھی اس میں شامل ہے، کیونکہ وہ بھی وحی الہی کے مطابق ہے، یہ آیت مراحات کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ ہواد ہوس سے گفتگو نہیں کرتا، وہ جو کچھ بھی کہتا ہے وحی سے کہتا ہے۔
 ذیل کی جالب حدیث اس مدعا کا دوسرا شاہد ہے۔

”سیوطی“ جو اہل سنت کے مشہور علماء میں سے ہے، تفسیر ”در المنثور“ میں اس طرح نقل کرتا ہے:
 ”ایک دن رسول خدا نے حکم دیا کہ تمام دروازے جو پیغمبر کی مسجد کے اندر کھلتے تھے (علی کے گھر کے دروازے کے سوا) بند کر دیئے جائیں۔ یہ امر مسلمانوں پر گراں گزرا، یہاں تک کہ رسول کے چچا ”حمزہ“ نے اس بات کا گلہ کیا، کہ آپ نے اپنے چچا اور ابو بکر و عمرو عباس کے گھر کا دروازہ کس لیے بند کرایا اور اپنے چچا زاد بھائی کے گھر کا دروازہ کھلا کیوں رکھا، (اور اس کو دوسریں پر ترجیح کیوں دی)۔“

جب پیغمبر اس بات کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ بات ان پر گراں گزری ہے، تو آپ نے لوگوں کو مسجد میں آنے کی دعوت دی، اور خدا کی تعجید و توحید میں ایک بے نظیر خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے بعد مزید فرمایا:

ایہا الناس ما انا سددتها، ولا انا فتحتها، ولا انا اخرجتکم و

اسکنتہ ، ثم قرأ ” والنجم اذا هوى ما ضل صاحبكم وما غوى وما
ينطق عن الهوى ان هو الا وحى يوحى ،

” اے لوگوں نہ تو میں نے دروازوں کو بند کیا ہے ، اور نہ ہی کھولا ہے نہ ہی میں نے تمہیں مسجد سے
نکالا ہے اور نہ ہی میں نے اُسے (علی کو) ساکن کیا ہے (جو کچھ ہوا وہ فرمان الہی تھا) پھر آپ نے
ان آیات کی تلاوت کی والنجم اذا هوى ان هو الا وحى يوحى ” لے

یہ حدیث جو پیغمبر کے بعد امیر المومنین علیؑ کے تمام امت اسلامی کے درمیان مقام والا کو بیان کرتی ہے اس بات کی نشاندہی کرتی
ہے کہ نہ صرف پیغمبر کے ارشادات اور اقوال ہی وحی کے مطابق ہوتے ہیں بلکہ ان کے اعمال و کردار بھی اسی طرح کے ہیں۔

- ۵۔ عِلْمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى ۝
- ۶۔ ذُو مِرَّةٍ ۖ فَاسْتَوَى ۝
- ۷۔ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى ۝
- ۸۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى ۝
- ۹۔ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى ۝
- ۱۰۔ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝
- ۱۱۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝
- ۱۲۔ أَفْتُمِرُونَ ۚ عَلَىٰ مَا يُرَىٰ ۝

ترجمہ

- ۵۔ اسے اس بہتی نے تعلیم دی ہے جو عظیم قدرت رکھتی ہے۔
- ۶۔ وہی ذات جو حد سے زیادہ توانائی اور ہر چیز پر تسلط رکھتی ہے۔
- ۷۔ جبکہ وہ افق اعلیٰ میں تھا۔
- ۸۔ پھر وہ نزدیک ہوا پھر اور نزدیک ہوا۔
- ۹۔ یہاں تک کہ اس کا فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کچھ کم ہو گیا۔
- ۱۰۔ یہاں خدا نے جس چیز کی وحی کرنی تھی اپنے بندے کو وحی کی۔
- ۱۱۔ اُس کے دل نے جو کچھ دیکھا اس میں ہرگز جھوٹ نہیں بولا۔

۱۲۔ کیا تم اُس سے اس چیز کے بارے میں جو اس نے دیکھا ہے مجادلہ کرتے ہو۔

تفسیر

دوست کا پہلا دیدار

گزشتہ آیات کے بعد، جو پیغمبر اسلام پر نازل وحی کی گفتگو کر رہی تھیں، ان آیات میں معلم وحی کے بارے میں گفتگو ہے۔ لیکن پہلے یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلی نظر میں ان آیات کو ابہام کا ایک عالمہ گھیرے ہوئے ہے، لہذا ان ابہامات کو دور کرنے کے لیے پوری دقت کے ساتھ، ان پر غور و فکر اور تحقیق کرنی چاہیئے۔ پہلے ہم ان آیات کی اجمالی تفسیر پیش کرتے ہیں، پھر ان کی تفصیلی تحقیق پیش کریں گے۔ فرماتا ہے: ”اے اُس مستی نے تعلیم دی ہے، جو عظیم قدرت رکھتی ہے“ (علمہ شدید القویٰ)۔ پھر مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: ”وہی ذات جو حد سے زیادہ توانائی اور ہر چیز پر تسلط رکھتی ہے“ (ذمۃ فاستویٰ)۔ (یہ تعلیم اسے اس وقت دی) ”جب کہ وہ افق اعلیٰ میں تھا“ (وہو بالا فوق الاعلیٰ)۔ ”پھر وہ نزدیک ہوا پھر اور نزدیک ہوا“ (ثم دنی فتدلیٰ)۔ ”یہاں تک کہ اس کے اور اس کے معلم کے درمیان کا فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کچھ کم ہو گیا“ (فکان قاب قوسین او ادنیٰ)۔

”اور یہاں خدا نے جس چیز کی وحی کرنی تھی وہ اپنے بندے کو وحی کی“ (فاوحی الی عبدہ ما ووحی)۔ ”پیغمبر کے دل نے جو کچھ دیکھا وہ سچ تھا اور اس نے ہرگز جھوٹ نہیں بولا“ (ما کذب الفؤاد ما راٰی)۔ ”کیا تم اس سے اس چیز کے بارے میں جو اس نے دیکھا ہے، جھگڑتے ہو، اور یقین نہیں کرتے“ (افتمارونہ علی ما یرٰی)۔

ان آیات کی تفسیر میں دو مختلف نظریے موجود ہیں، جن میں سے ایک مشہور اور دوسرا غیر مشہور ہے، لیکن پہلے ضروری ہے کہ آیت کے مفردات اور بعض الفاظ کے معنی بیان کریں اس کے بعد ان دونوں نظریوں کو پیش کریں۔ ”مرۃ“ جیسا کہ بہت سے ارباب لغت اور مفسرین نے لکھا ہے ”پلٹے ہوئے“ کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ رسی کو جتنا بہتر طریقہ سے بٹا جائے اتنی ہی زیادہ محکم ہوتی ہے، لہذا یہ لفظ قدرت، توانائی اور مادی یا معنوی استحکام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض اسے ”مرور“ یعنی عبور سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بات اس چیز سے جو اہل لغت نے لکھی ہے چنداں سازگار نہیں ہے۔

”تدلی“ مادہ ”تدلی“ (بر وزن تجلی) سے، ”مفردات“ میں ”راغب“ کے قول کے مطابق، نزدیک ہونے کے معنی میں ہے۔ تو اس بنا پر یہ جملہ ”دنی“ کی تاکید ہے جو اس سے پہلے آیا ہے، اور دونوں کا ایک ہی معنی ہے جبکہ بعض ان دونوں کے درمیان اختلاف کے قائل ہیں، انہوں نے یہ کہا ہے کہ ”تدلی“ وابستگی، تعلق اور آویزاں ہونے کے معنی میں ہے، جس طرح پھل درخت سے وابستگی رکھتا ہے، لہذا ان پھلوں کو جو ابھی درختوں کے ساتھ آویزاں ہیں (دوالی) کہتے ہیں۔ یہ ”قاب“ اندازہ کے معنی میں ہے اور ”قوس“ کمان کے معنی میں، اس بنا پر ”قاب قوسین“ یعنی دو کمانوں کے اندازے کے مطابق، کمان قدیم زمانہ کے تیر اندازی کے ہتھیاروں میں سے ہے۔

بعض نے ”قوس“ کو ”قیاس“ کے مادہ سے ”مقیاس“ کے معنی میں سمجھا ہے۔ اور چونکہ عرب کی مقیاس ذراع کی مقدار تھا، (انگلیوں کے سر سے لے کر کہنی تک کا فاصلہ) اس بنا پر قاب قوسین دو ذراع کے معنی میں ہوگا۔ بعض لغت کی کتابوں میں ”قاب“ ایک دوسرے معنی میں ذکر ہوا ہے، اور وہ کمان کو درمیان سے پکڑنے کی جگہ سے کمان کی مڑی ہوئی نوک تک کا فاصلہ ہے (کمانیں قوسی شکل کی ہوتی تھیں جن کے دونوں آخری سرے مڑے ہوئے ہوتے تھے)۔

اس بنا پر ”قاب قوسین“ کمان کے ٹیڑھے حصوں کے مجموعہ کے معنی میں ہے، (غور کیجئے) ۱۔ اب ہم دونوں تفسیروں کے بیان کی طرف لوٹتے ہیں۔ مفسرین کا مشہور نظریہ یہ ہے کہ پیغمبر کا سلم وہی ”جبریل امین“ بیک وحی خدا تھا، جو حد سے زیادہ قدرت رکھتا تھا۔ وہی جو عام طور پر ایک خوبصورت انسان کی صورت میں پیغمبر کے سامنے ظاہر ہوا کرتا تھا، اور پیغام الہی پہنچاتا تھا، آنحضرت کی پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ اپنے اصلی قیافہ اور چہرے کے ساتھ آنحضرت کے سامنے ظاہر ہوا۔ پہلی مرتبہ تو وہی ہے جو اوپر والی آیات میں آیا ہے۔ کہ وہ افضیٰ اعلیٰ میں ظاہر ہوا۔ (اور وہ تمام مشرق و مغرب کو ڈھانپنے ہوئے تھا، اور اس قدر با عظمت تھا کہ پیغمبر حیا میں آگئے) اور وہ جبریل ہی تھا جو پیغمبر سے نزدیک ہوا تھا۔ انتہا نزدیک کہ ان کے درمیان چنداں فاصلہ باقی نہ رہا تھا، اور ”قاب قوسین“ کی تعبیر انتہائی قرب اور نزدیکی سے کنایہ ہے۔ دوسری مرتبہ پیغمبر کے معراج کے واقعہ میں ہوا تھا، جس کے بارے میں آئندہ آیات میں گفتگو ہوئی ہے۔ اور ہم انشاء اللہ اس سلسلہ میں مزید بیان کریں گے۔

بعض مفسرین جنہوں نے اس نظریہ کو انتخاب کیا ہے، تصریح کی ہے کہ پیغمبر نے جبریل کا اصلی صورت میں پہلا دیدار غار ”حرا“ کے پاس ”جبل النور“ میں کیا تھا۔ ۲۔

۱۔ ”اقتباس“ از ”روح البیان“ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ اس صورت میں کلام میں ”قلب“ (الٹ پھیر) واقع ہوا ہے اور اصل میں ”قابی قوس“ تھا۔

۳۔ اس تفسیر کو کہ ”شدید القوی“ سے مراد جبریل امین ہیں۔ ایک گروہ کثیر نے اختیار کیا ہے، منجملہ ان کے (باقی حاشیہ لگے صفحہ پر)

لیکن یہ تفسیر اپنے تمام طرفداروں کے باوجود اشکالات سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ :

۱۔ ”فاوخی الی عبدہ ما اوخی“ (جو کچھ وحی کرنا متھی اپنے بندہ کی طرف وحی کی) کی آیت میں سلمہ طور سے ضمیروں کا مرجع (خصوصاً عبدہ کی ضمیر کا مرجع) خدا ہے۔ لیکن اگر ”شدید القوی“ سے مراد جبریل ہو تو پھر تمام ضمیروں کو اس کی طرف لوٹنا چاہیے، یہ ٹھیک ہے کہ خارجی قرائن سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس آیت کا معاملہ بقیہ آیات سے جدا ہے، لیکن آیات اور ضمیروں کے مرجع کی یکسانیت کا ٹکراؤ مسلمہ طور سے ظاہر کے خلاف ہے۔

۲۔ ”شدید القوی“ ایسی ذات کے معنی میں ہے جس کی تمام قدرتیں حد سے زیادہ ہوں، اور یہ صرف پروردگار کی ذات پاک کے ساتھ ہی مناسب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سورۃ تکویر کی آیت ۲۰ میں جبریل کو ”ذی قوۃ عند ذی العرش معین“ کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، لیکن ”شدید القوی“ جو ایک عام اور وسیع مفہوم رکھتا ہے، اور ”ذی قوۃ“ کے درمیان جس میں ”قوۃ“ مفرد اور نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔ بہت زیادہ فرق ہے۔

۳۔ بعد والی آیات میں آیا ہے کہ پیغمبر نے اسے ”سدرۃ المنتہی“ کے نزدیک (آسمانوں کی بلندی پر دیکھا) اگر اس سے مراد جبریل ہو، تو وہ تو سفر معراج میں روئے زمین کے شروع سے ہی پیغمبر کے ساتھ تھا، اور اسے صرف آسمان کی بلندی پر ہی نہیں دیکھا تھا۔ سوائے اس صورت کے کہ یہ کہا جائے کہ ابتداء میں تو اسے انسانی صورت میں دیکھا تھا، اور آسمان میں اسے اس کی اصلی صورت میں، حالانکہ آیات میں اس مطلب پر کوئی قرینہ نہیں ہے۔

۴۔ ”علمہ“ یا اس کے مانند تعبیر کبھی بھی قرآن مجید میں جبریل کے لیے استعمال نہیں ہوئی۔ جبکہ یہ تعبیر خدا کے بارے میں پیغمبر اسلام اور دوسرے پیغمبروں کے لیے بہت زیادہ ہے، اور دوسرے لفظوں میں جبریل پیغمبر کا معلم نہیں تھا، بلکہ وہ وحی کا واسطہ تھا اور ان کا معلم صرف خدا ہے۔

۵۔ یہ ٹھیک ہے کہ جبریل ایک بلند مرتبہ فرشتہ ہے لیکن مسلمہ طور سے پیغمبر اسلام اس سے بھی زیادہ والا تر مقام رکھتے ہیں۔ جیسا کہ معراج کے واقعہ میں آیا ہے کہ جبریل معراج کی سیر صعودی میں پیغمبر کے حضور میں حاضر تھے، ایک مقام پر پہنچ کر وہ رک گئے اور کہا: اگر میں ایک پور کے برابر بھی آگے بڑھوں تو میرے پرد بال جل جائیں، لیکن پیغمبر نے اسی طرح سے اپنی سیر کو جاری رکھا۔ ان حالات میں جبریل کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کی کوئی ایسی اہمیت نہیں ہے جیسی کہ ان آیات میں دی گئی ہے۔ اور زیادہ سادہ لفظوں میں، پیغمبر کے لیے اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں تھی، کہ اس قسم کا دیدار انہیں حاصل ہو۔ حالانکہ یہ آیات اس دیدار کے لیے حد سے زیادہ اہمیت کی قائل ہوئی ہیں۔

۶۔ ”ما کذب الفواد ما راعی“ (پیغمبر کے دل نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اس کے برخلاف نہیں کہتا)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ کا) طبری نے ”مجمع البیان“ میں بیضادی نے ”انوار التنزیل“ میں زرخشی نے ”کناف“ میں ”قرطبی“ نے اپنی تفسیر ”روح البیان“ میں خزازی نے ”تفسیر کبیر“ میں سید قطب نے ”فی ظلال القرآن“ میں، اور مراغی نے اپنی تفسیر میں، علامہ طباطبائی کی تفسیر میں ”الیزان“ میں زیادہ تر اسی طرف مائل ہیں۔

کا جملہ بھی ایک باطنی شہود کی دلیل ہے نہ کہ آنکھ کے ساتھ جبریل کا ایک حسی مشاہدہ ۔

۷۔ ان سب سے قطع نظر متعدد روایات میں جو مناجات اہل بیت سے نقل ہوئی ہیں ان آیات کی جبریل سے تفسیر نہیں ہوتی ، بلکہ روایات دوسری تفسیر کے مطابق ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ ان آیات سے مراد خدا کی پاک ذات کا ایک خاص قسم کا باطنی شہود ہے ، جو اس منظر میں پیغمبر کو حاصل ہوا تھا ، اور معراج میں اس کا دوبارہ تکرار ہوا ، اور رسول اللہ نے اس دیدار سے ایک معنوی جذبہ کا اثر لیا ۔
مرحوم شیخ طوسی "امالی" میں ابن عباس کے واسطے سے پیغمبر اسلام سے نقل کرتے ہیں :

لما عرج بی الی السماء و دنوت من ربی عز وجل حتی کان بینی و بینہ
قاب قوسین ا و اد فی

"جب میں آسمان پر معراج کے لیے گیا ، تو اپنے پروردگار کی ساحت قدس سے اتنا قریب ہوا کہ میرے
اور اس کے درمیان دو کمانوں کا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا ۔
مرحوم "صدوق" نے "علل الشرائع" میں اسی مضمون کو ہشام بن حکم کے واسطے سے امام موسیٰ بن جعفر سے نقل کیا ہے ۔ آپ
ایک طولانی حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں :

فلما اسری بالنبی (ص) و کان من ربہ کقاب قوسین ا و اد فی رفع له حجاب
من حجبہ

"جس وقت پیغمبر کو معراج پر لے جایا گیا تو ان کا فاصلہ ان کے پروردگار کی ساحت قدس سے دو کمانوں
یا اسے بھی کم کا رہ گیا تھا تو حجابوں میں سے ایک حجاب آپ کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھا دیا گیا
تھا ۔"

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی آیا ہے :

ثم د فی یعنی رسول اللہ من ربہ عز وجل

۸۔ دماغ نے نہ میں ایک تعبیر نظر آتی ہے جو اسی معنی کے ساتھ مناسب ہے جہاں کہتا ہے :

یا بن من د فی فتدلی فکان قاب قوسین ا و اد فی دنوا و اقترابا من
العلی الاعلی

"اے اس کے فرزند جو قریب سے قریب تر ہوا ، یہاں تک کہ اس کا فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کم رہ گیا ، اور یہ
نزدیکی خداوند علی اعلیٰ سے صورت پذیر ہوئی ، اسی دماغ کے ذیل میں خدا کا ایک لقب "شہید القوی" بھی ذکر ہوا ہے
جہاں آیا ہے "وارہ سیدہ یا شہید القوی"۔

”پھر وہ قریب ہوئے یعنی رسول اللہ خداوند تعالیٰ سے“۔ لہ

یہ معنی دوسری متعدد روایات میں بھی آیا ہے، اور ان تمام روایات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ اہل سنت کی روایات میں بھی ”در المنثور“ کی ایک روایت میں یہی معنی ابن عباس سے دو طریقوں سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ تمام قرائن سبب بنتے ہیں کہ ہم دوسری تفسیر کو — جو یہ کہتی ہے کہ ”شدید القوی“ سے مراد خدا ہے، اور پیغمبر بھی اسی کی ذات پاک سے نزدیک ہوئے تھے — انتخاب کریں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جو زیادہ تر مفسرین کی اس تفسیر سے رد گردانی اور پہلی تفسیر کی طرف جانے کا سبب بنی۔ یہ ہے کہ اس تفسیر سے تحمید خدا اور اس کے لیے مکان کی بوائی ہے، حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ نہ وہ مکان رکھتا ہے اور نہ ہی جسم، لکن درکہ الابصار و هو یدرک الابصار“ آنکھیں اس کو نہیں دیکھتیں اور وہ تمام آنکھوں کو دیکھتا ہے“ (العام-۱۰۳)؛ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ“ تم جس طرف بھی منہ کرو گے وہیں پر خدا ہے“ (البقرہ-۱۱۵)؛ و هو معکم اینما کنتم“ تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے“ (حدید-۴)

اور شاید ان مسائل کا مجموعہ ہی اس بات کا سبب بنا ہے کہ بعض مفسرین ان آیات کی تفسیر سے عجز و ناتوانی کا اظہار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اسرار غیب میں سے ہے جو ہم سب سے پوشیدہ و پنهان ہیں۔

کہتے ہیں: ایک عالم سے ان آیات کی تفسیر پوچھی گئی تو اس نے کہا، وہ جگہ جہاں جبریل ناتواں ہو جائے۔ میں کون ہوں کہ اس معنی کے ادراک پر قادر ہوں۔ لہ

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے اور انسانوں کے غور و فکر اور نصیحت کے لیے نازل ہوا ہے۔ اس معنی کو قبول کرنا بھی مشکل ہے۔

لیکن اگر ہم آیات کی دوسرے معنی کے ساتھ، یعنی ایک قسم کے شہود اور ایک خاص معنوی قرب کے ساتھ، تفسیر کریں، تو یہ تمام مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: بلا شک و شبہ خدا کے لیے حسی رؤیت نہ تو دنیا میں امکان پذیر ہے اور نہ ہی آخرت میں، کیونکہ اس کا لازمہ جمائیت اور مادی ہونا ہے، اور اسی طرح اس کا لازمہ تبدیلی، اور ایک حالت سے دوسری حالت میں میں آنا اور فساد پذیر ہونا ہے، اور زمان و مکان کی نیاز و احتیاج رکھتا ہے۔ اور ذات واجب الوجود ان تمام امور سے مبرا ہے۔ لیکن خدا کا مشاہدہ دل اور عقل کی نگاہ سے کیا جاسکتا ہے، اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف امیر المؤمنین علیؑ نے ”ذعلب یائی“ کے جواب میں اشارہ فرمایا تھا:

”لا تدركه العیون بمشاهدة العیان ولكن تدركه القلوب بمحاشق

۱۔ نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۴۸۔

۲۔ در المنثور جلد ۶ ص ۱۲۳۔

۳۔ ”روح البیان“ جلد ۹ ص ۲۱۹۔

الایمان

”آنکھوں نے حسی مشاہدہ کے ذریعہ ہرگز اسے نہیں دیکھا، لیکن دلوں نے حقیقت ایمان کے ساتھ

اسے پالیا ہے“ لے

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ ”باطنی نگاہ“ دو قسم کی ہوتی ہے، ایک ”نگاہ عقلانی“ جو طریقی استدلال سے حاصل ہوتی ہے، اور دوسری ”شہود قلبی، جو ادراک عقلی سے مافوق ایک درجہ ہے اور اس کی نگاہ سے ماوراء ایک نگاہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسے مقام ”استدلال“ کا نام نہیں دینا چاہیے۔ بلکہ یہ مقام ”مشاہدہ“ ہے۔ لیکن ایک ایسا مشاہدہ جو دل کے ساتھ اور باطنی طریقے سے ہو، یہ وہ مقام ہے جو ”اولیاء اللہ“ کے لیے فرق مراتب کے ساتھ اور سلسلہ درجات سے محل ہوتا ہے، کیونکہ شہود باطنی بھی بہت سے مراتب و درجات رکھتا ہے، البتہ اس حقیقت کا ادراک ان لوگوں کے لیے جو اس تک نہیں پہنچے مشکل ہے۔

اد پر والی آیات سے ان قرآن کے ذریعہ اس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام مقام شہود پر فائز ہونے کے باوجود اپنی عمر مبارک کے دوران دومرتبہ اتنی بلند ی پر پہنچے کہ مقام ”شہود کامل“ پر سرفراز ہوئے۔ ایک احتمالاً آغاز بخت میں ہوا تھا، اور دوسرا معراج کے موقع پر، اس طرح خدا کے قریب ہوئے، اور اس کے بساط قرب پر قدم رکھا، کہ بہت سے فاصلے اور حجاب ختم کر دیتے گئے۔ ایسا مقام جہاں جبریل امین یعنی خدا کا مقرب ترین فرشتہ تک پہنچنے سے عاجز تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ ”فکان قاب قوسین او ادنیٰ“ جیسی تعبیریں، سب کی سب کنایہ کی صورت میں، اور شدت قرب کے بیان میں ہیں۔ ورنہ وہ اپنے بندوں سے مکانی فاصلہ نہیں رکھتا، تاکہ اسے ”قوس“ اور ”زراع“ کے ساتھ ناپا جائے اور ”رویت“ سے مراد بھی ان آیات میں آنکھ سے دیکھنا نہیں ہے، بلکہ وہی شہود باطنی ہے۔

گزشتہ مباحث میں ”لقاء اللہ“ (پروردگار کی ملاقات) کی تفسیر میں، جو قرآن کی مختلف آیات میں روز قیامت کے مشخصات میں سے ایک کے عنوان سے بارہا آیا ہے، ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ ملاقات بھی — اس کے برخلاف جو بعض کوتاہ فکر لوگوں نے سمجھ لیا ہے — حسی ملاقات اور مادی مشاہدہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح کا شہود باطنی ہے اگرچہ وہ کئی مرحلہ نچلے درجہ میں ہے۔ اور وہ ہرگز بھی اولیاء و انبیاء کے مشاہدہ کے مرحلہ تک نہیں پہنچتا، چہ جائیکہ معراج کی شب پیغمبر کے شہود کامل کے مرحلہ تک پہنچے۔

اس وضاحت کی طرف توجہ کرتے ہوئے وہ اعتراضات جو اس تفسیر کے بارے میں نظر آتے تھے، برطرف ہو جائیں گے اور اگر ان ماوراء مادی مسائل کی تشریح میں، ہمارے الفاظ و بیان کی صحیحی کی بنا پر، کچھ خلاف ظاہر باتیں دکھائی دیتی ہوں، تو وہ ان اشکالات کے مقابلہ میں جو پہلی تفسیر پر ہیں، حقیر اور معمولی نظر آتی ہیں۔

جو کچھ یہاں تک بیان کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیر بحث آیات پر اب نئے سرے سے ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اور آیات کے مضمون کا اس نئے زاویہ سے مطالعہ اور تحقیق کرتے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق، قرآن پیغمبر پر نزول وحی کی اس طرح تشریح کرتا ہے: پر قدرت اور شدید القویٰ خدا نے اسے تعلیم دی، درحالیکہ وہ مکمل صورت اور حد اعتدال میں آگیا، اور اُنقِ اعلیٰ میں قرار پایا۔

اس کے بعد وہ نزدیک ہوا، اور زیادہ نزدیک ہوا، اس طرح سے کہ اس کے پروردگار کے درمیان دو کمالوں سے زیادہ فاصلہ نہ رہا، اور یہ وہ منزل تھی، جہاں خدا نے جو وحی کرنی تھی وہ اپنے بند سے پر وحی کی۔

اور چونکہ یہ شہود باطنی ایک جماعت پر گراں گزرتھا۔ لہذا تاکید کرتا ہے کہ پیغمبر کے دل نے جو کچھ دیکھا ہے حقیقتاً و واقعاً دیکھا ہے، اور تمہیں اس بات کے خلاف اس سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ ان آیات کی تفسیر خدا کی نسبت پیغمبر کے شہود باطنی کے ساتھ زیادہ صحیح اور روایات اسلامی کے ساتھ زیادہ موافق، اور پیغمبر کے لیے ایک برتر فضیلت اور زیادہ لطیف مفہوم ہے۔ (واللہ اعلم بحقائق الامور)۔

ہم اس بحث کو پیغمبر کی ایک حدیث اور علی کے ایک ارشاد پر ختم کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ سے لوگوں نے پوچھا: ہل رأیت ربک؟ کیا آپ نے کبھی اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟

آپؐ نے جواب میں فرمایا: رأیتہ بفؤادی: ”میں نے اُسے دل کی آنکھ سے دیکھا ہے“۔

اور نبیؐ البلاغہ میں اسی ”ذعلب یبانی“ والے خطبہ کے درمیان آیا ہے کہ اس نے آنحضرتؐ سے سوال کیا: ہل رأیت ربک یا امیر المؤمنین؟ ”اے امیر المؤمنین کیا آپ نے کبھی اپنے خدا کو دیکھا ہے؟“

آپؐ نے جواب میں فرمایا: افا عبد مالا ارآہ؟ ”تو کیا میں اس کی عبادت کرتا ہوں جسے میں نے دیکھا نہیں؟“

اس کے بعد آپؐ نے وحی تشریح پیش کی، جسے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، کہ یہ شہود باطنی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ ”فاستوی“ کی ضمیر اور اسی طرح ”هو بالافق الا علی“ کی ضمیر ممکن ہے کہ پیغمبر کی طرف یا خدا کی ذات پاک کی طرف ہوئے۔

۲۔ یہاں اس بحث کو بھی اجمالی طور پر نظر میں رکھیں، کہ معراج کے بارے میں علماء کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ یہ پیغمبر کی زندگی میں ایک مرتبہ ہوئی ہے یا دو مرتبہ لہذا ممکن ہے کہ یہ آیات دونوں معراجوں میں دو شہود باطنی کی طرف اشارہ ہوں۔

۳۔ ”سما را لانوار“ جلد ۱۸ ص ۲۸۷ (ذیل مباحث معراج)۔

۴۔ نبیؐ البلاغہ خطبہ ۱۷۹۔

- ۱۳۔ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى ۝
 ۱۴۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى ۝
 ۱۵۔ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى ۝
 ۱۶۔ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَ مَا يَغْشَى ۝
 ۱۷۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى ۝
 ۱۸۔ لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى ۝

ترجمہ

- ۱۳۔ اور دوبارہ اس کا مشاہدہ کیا۔
 ۱۴۔ سدرة المنتہی کے نزدیک۔
 ۱۵۔ کہ جہاں جنت المآویٰ ہے
 ۱۶۔ اس وقت جب کہ ایک چیز (خیرہ کرنے والے نور) نے سدرة المنتہی کو ڈھانپ رکھا تھا۔
 ۱۷۔ نہ تو اس کی آنکھ نے انحراف کیا، اور نہ ہی سرکشی کی۔
 ۱۸۔ اس نے اپنے پروردگار کی چند عظیم آیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔

تفسیر

دوسرا دیدار

یہ آیات، وحی اور پیغمبر کے خدا سے ارتباط، اور اس کے شہود باطنی کے مسئلہ کے بارے میں، اسی طرح سے گزشتہ آیات کی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

فرماتا ہے: ”ایک مرتبہ پھر پیغمبر نے اس کا مشاہدہ کیا“ (ولقد راه نزلة اخرى)۔

”اور یہ شہود دوسرہ المنتہی کے پاس حاصل ہوا“ (عند سدرة المنتهى)۔

”وہی کہ جنت الماویٰ اور بہشت بریں اس کے پاس ہے“ (عند حاجتہ الماویٰ)۔

اس وقت جب کہ کسی چیز نے ”سدرة المنتہی“ کو گھیرا ہوا تھا اور ڈھانپ رکھا تھا“ (اذ یغشی السدرة ما یغشی)۔

”یہ وہ واقعات و حقائق تھے جن کا پیغمبر نے مشاہدہ کیا تھا،“ اور اس کی آنکھ نے ہرگز انحراف نہیں کیا تھا، اور نہ ہی سرکشی کی تھی اور باطل تصورات کو حق کے لباس میں نہیں دیکھا تھا“ (ما زاع البصر وما طغی)۔

”اس نے وہاں اپنے پروردگار کی عظیم اور بڑی آیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کیا تھا“ (لقد رای من آیات ربہ الکبریٰ)۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں وہی ایہام، جس نے شروع شروع میں گزشتہ آیات کو گھیرا ہوا تھا، اسی نے ان آیات پر بھی جو انہیں مطالب کا دوسرا حصہ ہے سایہ ڈالا ہوا ہے۔ لہذا ان آیات کے مفاد کو واضح کرنے کے لیے ہر چیز سے پہلے ہم مفردات کو بیان کریں گے، اس کے بعد اس کے مجموعہ پر نظر ڈالیں گے۔

”نزلة“ ایک مرتبہ نازل ہونے کے معنی میں ہے اس بنا پر ”نزلة اخرى“ یعنی ایک مرتبہ اور نازل ہونے میں لے

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ”نزل“ دو مرتبہ ہوا ہے، اور یہ مابراہد سے نزل سے مربوط ہے۔

”سدرة“ (بروزن حرفۃ) مفسرین اور علماء لغت کے عمومی قول کے مطابق، ایک درخت ہے جو گھنے پتوں

والا اور سایہ دار ہوتا ہے (پیری) اور ”سدرة المنتہی“ کی تعبیر اس سایہ دار اور گھنے پتوں والے درخت کی طرف اشارہ ہے جو آسمان

کی بلندی پر فرشتوں، ارواح شہداء، علوم انبیاء اور انسانوں کے اعمال کے بلند ہونے کی انتہا پر واقع ہے، وہ جگہ جس سے اوپر

لے بعض ارباب لغت اور مفسرین نے ”نزلة“ کو ”مرة“ کے معنی میں تفسیر کیا ہے، اس بنا پر اس میں نزل کا معنی نہیں ہے اور ”نزلة اخرى“

صرف دوسری مرتبہ کے معنی میں ہے، لیکن معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے ”نزلة“ کے اصلی مادہ کو کیوں چھوڑ دیا ہے جب کہ دوسروں نے لے محفوظ

رکھا ہے۔ اور ہمارے بیان کے مطابق تفسیر کی ہے (غور کیجئے)۔

پروردگار کے فرشتے نہیں جاتے۔ اور جبریل بھی سفر معراج میں جب اس جگہ پہنچے تو رک گئے۔
 سدرۃ المنتہیٰ کے بارے میں اگرچہ قرآن مجید میں کوئی وضاحت نہیں آئی ہے، لیکن اسلامی روایات و اخبار میں اس کے بارے
 میں گونا گوں توصیفات بیان کی گئی ہیں۔ اور وہ سب کی سب اس واقعیت اور حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ اس تعبیر کا انتخاب ایک قسم
 کی تشبیہ کے عنوان سے ہے اور اس قسم کے بزرگ واقعات کے بیانات ہماری لغات اور زبانوں کی کوتاہی کی بنا پر ہیں۔
 ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

رَأَيْتُ عَلَى كُلِّ وَرَقَةٍ مِنْ أَوْاقِهَا مَلَكًا قَائِمًا يُسَبِّحُ اللَّهَ تَعَالَى
 ”میں نے اس کے ہر پتے پر ایک فرشتہ کو دیکھا کہ وہ کھڑا ہوا تھا اور خدا کی تسبیح کرتا تھا۔“
 ایک دوسری حدیث میں امام صادق سے نقل ہوا ہے کہ رسول خدا نے فرمایا :

انتهيت الى سدرۃ المنتهى، واذا الورقة منها تظل امة من الامم
 ”میں سدرۃ المنتہی تک پہنچا تو دیکھا کہ اس کے ہر پتے کے سایہ میں ایک امت قرار پائی ہے۔“
 یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جیسے درخت ہم زمین پر دیکھتے ہیں ان کے مشابہ درخت ہرگز مراد نہیں ہے، بلکہ یہ
 ایک عظیم سائبان کی طرف اشارہ ہے، جو رحمت حق کے قرب و جوار میں واقع ہے جس کے پتوں پر فرشتے تسبیح کرتے ہیں، اور
 مختلف امتوں کے نیک اور پاک لوگ اس کے سایے میں قرار رکھتے ہیں۔

جنت المأویٰ ”اس بہشت کے معنی میں ہے جو جائے سکونت ہے،“ اور اس بارے میں کہ یہ کوئی بہشت ہے مفسرین
 کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اسے وہی بہشت جاودانی ”جنت الخلد“ سمجھا ہے، جو تمام اہل ایمان اور پرہیزگاروں کے
 انتظار میں ہے، اور وہ اس کی جگہ آسمان میں سمجھتے ہیں، اور سورہ سجدہ کی آیت ۱۹ کو اس پر شاہد سمجھتے ہیں، فلم جمعات المأویٰ
 نزلاً بما كانوا يعملون“ صالح عمل والے مومنین کے لیے جنت کے باغات ہیں جن میں وہ قیام کریں گے، اور یہ ان کے
 ان اعمال کے مقابلہ میں جنہیں وہ انجام دیا کرتے تھے، پذیرائی کا ایک ذریعہ ہے۔“ کیونکہ یہ آیت بعد والی آیت کے قرینہ سے
 مسلمہ طور پر بہشت جاودانی کی بات کر رہی ہے۔

لیکن چونکہ ایک دوسری جگہ یہ بھی آیا ہے کہ ”وسارحوا الى مغفرة من ربكم وجنت عرضها السماوات والارض“
 ”پروردگار کی مغفرت میں اور اس جنت کی طرف، جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، ایک دوسرے پر سبقت لے
 جاؤ (آل عمران-۱۳۳)۔ لہذا بعض نے اس معنی کو بعید شمار کیا ہے، کیونکہ زیر بحث آیات کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے

۱۔ ”مجمع البیان“ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۵۵۔

۳۔ ”مأویٰ“ اصل میں محل انعام (رہنے) کے معنی میں ہے، اور چونکہ ایک مکان میں لوگوں کی سکونت ان کے ایک دوسرے سے انعام اور ملنے
 کا سبب ہے اس لیے یہ لفظ محل سکونت پر بولا گیا ہے۔

کہ ”جنتہ الماویٰ“ آسمان میں ہے اور یہ اس بہشت جاودانی کے علاوہ ہے جس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔
لہذا کبھی اس کی بہشت کی ایک مخصوص جگہ کے ساتھ تفسیر کی ہے جو ”سدرۃ المنتہی“ کے پاس ہے اور جو خواص اور مخلصین کی جگہ ہے۔

اور بعض اوقات یہ کہا ہے کہ وہ برزخی جنت کے معنی میں ہے، جس میں شہداء اور مومنین کی ارواح وقتی طور پر جلائے گی آخری تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے، اور وہ امور جو وضاحت کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتے ہیں یہ ہے کہ معراج کی بہت سی روایات میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس جنت میں ایک گروہ کو منعم دیکھا جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ کوئی شخص قیامت کے دن سے پہلے بہشت جاوداں میں وارد نہیں ہوگا، کیونکہ قرآنی آیات بخوبی دلالت کرتی ہیں کہ پرہیزگار قیامت میں حساب کتاب کے بعد جنت میں داخل ہوں گے نہ کہ موت کے بعد بلا فاصلہ، اور ارواح شہداء بھی برزخی جنت میں ہی قرار رکھتے ہیں، کیونکہ وہ بھی قیامت سے پہلے بہشت جاوداں میں وارد نہیں ہوں گے۔

”ما زاخ البصر وما طغی“ کی آیت اس معنی کی طرف اشارہ ہے، کہ پیغمبرؐ کی آنکھ اپنے مشاہدہ میں نہ تو دائیں بائیں ہوتی، اور نہ ہی حد اور مقصد سے تجاوز کیا، اور جو کچھ دیکھا ہے وہ عین واقعیت تھی، کیونکہ ”زاخ“ ”زیغ“ کے مادہ سے دلیلاً یا بائیں انحراف کے معنی میں ہے اور ”طغی“ ”طغیان“ کے مادہ سے حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے۔

دوسرے لفظوں میں انسان کسی چیز کے مشاہدہ کے موقع پر جب خود اس چیز کی طرف توجہ نہیں کرتا، یا دائیں بائیں یا اس سے ہٹ کر دیکھنے لگتا ہے تو اس وقت وہ غلطی میں پڑ جاتا ہے۔
ہم آیات کے مفردات کی تفسیر سے فارغ ہو چکے تو اب آیات کی اجتماعی تفسیر پیش کرتے ہیں۔
یہاں پھر وہی دو نظریے، جو سابقہ آیات کی تفسیر میں تھے، بیان ہوئے ہیں۔

بہت سے مفسرین نے آیات کو، دوبارہ جبرئیل سے اس کی اصلی صورت میں، پیغمبرؐ کی ملاقات کی طرف واضح سمجھا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رسولؐ خدا نے معراج سے نزول کے وقت اسے ”سدرۃ المنتہی“ کے پاس اس کی اصل صورت میں دوبارہ دیکھا، اور آپؐ کی آنکھ اس منظر کے مشاہدہ سے کسی قسم کے اشتباہ اور غلطی میں گرفتار نہیں ہوئی، پیغمبرؐ نے حق تعالیٰ کی بعض عظیم آیات کا مشاہدہ کیا۔ جس سے مراد یا تو وہی جبرئیل کی صورت واقعی ہے، یا آسمانوں کی عظمت کی آیات اور ان کے عجائبات، یا یہ دونوں۔

لیکن وہی اشکالات و اعتراف جو اس تفسیر کے لیے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں وہ اسی طرح سے باقی ہیں۔ بلکہ کچھ اور اضافہ
کا ان پر اور اضافہ ہو گیا ہے، منجملہ۔

۱۔ تفسیر ”الیزان“ میں پہلا لفظ ”کسی چیز کے مشاہدہ کی کیفیت میں خطا کرنے“ کے معنی سے تفسیر ہوا ہے، اور دوسرا لفظ ”اصل دیکھنے میں خطا کرنے“ کے معنی میں، لیکن اس فرق کے لیے کوئی واضح دلیل بیان نہیں کی گئی، بلکہ لغت میں جو کچھ آیا ہے وہ وہی تفسیر ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔

”نزلۃ اخروی“ (ایک دوسرے نزول میں) کی تعبیر اس تفسیر کے مطابق کوئی واضح مفہوم نہیں رکھتی، لیکن دوسری تفسیر کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے ایک ”دوسرے شہود باطنی“ میں آسمانوں کے اوپر معراج کے موقع پر خدا کی ذات پاک کا مشاہدہ کیا، اور دوسرے نغظوں میں خدا نے ایک مرتبہ پھر ان کے پاک دل پر نزول فرمایا، (نزلۃ اخروی) اور شہود کامل حاصل ہو گیا، ایسے مقام پر جہاں بندوں کی طرف سے الشکر کی طرف قرب کی انتہا ہوتی ہے، سدرۃ المنتہی کے قریب، جہاں جنت المآذی واقع ہے، ایسی حالت میں کہ سدرۃ المنتہی کو نور کے حجابوں نے دھانپ رکھا تھا۔

پیغمبرؐ کے دل کی نگاہ، اس شہود میں ہرگز غیر حق پر نہیں پڑی، اور اس کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا، اور وہیں پر خدا کی عظمت کی نشانیاں آفاق و انفس میں بھی مشاہدہ کیں۔

”شہود باطنی کا مسئلہ“ — جیسا کہ ہم پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں — ایک قسم کا ایسا ادراک اور دیکھنا ہے جو نہ تو ادراک عقلی سے مشابہت رکھتا ہے، اور نہ ہی ادراکات حسی کے ساتھ، کہ جنہیں انسان جو اس ظاہر کے ذریعہ درک کرتا ہے اور اس سے کئی جہات سے انسان کے اپنے وجود اور اپنے افکار و تصورات کے علم کے مشابہ سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ، ہم اپنے وجود کا یقین رکھتے ہیں، اپنے افکار کا ادراک کرتے ہیں، اور اپنے ارادہ و خواہشات اور رجحانات سے باخبر ہیں، لیکن یہ آگاہی نہ تو طریق استدلال سے ہمیں حاصل ہوئی ہے، اور نہ ہی مشاہدہ ظاہری کے طریق سے، بلکہ یہ ہمارے لیے ایک قسم کا شہود باطنی ہے، کہ ہم اس طریق سے اپنے وجود اور اپنی نفسیات سے واقف ہیں۔

اسی علی دلیل کی بنا پر — جو شہود باطنی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے — اس میں کسی قسم کی کوئی خطا واقع نہیں ہوتی، کیونکہ وہ نہ تو استدلال کے طریقے سے ہے، کہ جس کے مقدمات میں کوئی غلطی واقع ہوئی ہو، اور نہ ہی وہ حسی طریقے سے ہے کہ جو اس کے طریقے سے اس میں کوئی خطر و نما ہو۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس شہود کی حقیقت کو، جو پیغمبرؐ نے معراج کی اس تاریخی رات میں خدا کی نسبت پیدا کی، نہیں پاسکتے لیکن ہم نے ایک مناسب راہ سے نزدیک ہونے کے لیے ایک مثال دی ہے، اور اسلامی روایات بھی ہمارے راستہ کی راہ کشائی کر رہی ہیں۔

چند نکات

۱۔ معراج ایک مسلمہ حقیقت ہے

علماء اسلام کے درمیان اصل مسئلہ معراج میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ قرآنی آیات بھی یہاں اور سورۃ اسراء کے آغاز میں اس پر گواہ ہیں، اور متواتر روایات بھی، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بعض لوگ پہلے سے کہتے ہوئے فیصلوں کی بنا پر اس بات کو قبول نہیں کر سکے کہ پیغمبرؐ نے اپنے جسم اور روح کے ساتھ پرواز کیا تھا، لہذا انہوں نے اس کی ”معراج روحانی“ اور حالت خواب سے مشابہ ایک چیز کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

حالانکہ پیغمبرؐ کی اس جسمانی پرواز میں نہ تو کوئی عقلی اشکال ہے۔ اور نہ ہی موجودہ زمانہ کے علوم کی طرف سے اس پر کوئی اعتراض

دارد ہوتا ہے، جس کی تفصیل ہم سورۃ اسراء کی تفسیر میں بسوط طریقہ پر بیان کر چکے ہیں۔
اس بنا پر استبعادات کی خاطر، ظاہر آیات اور صریح روایات کو ترک کرنے کے لیے کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے۔
اس سے قطع نظر اور والی آیات کی تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ایک گروہ اس مسئلہ کے خلاف لڑنے جھگڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا، تاریخ بھی یہی کہتی ہے کہ، مسئلہ معراج نے مخالفین کے درمیان ایک شور و غوغا کھڑا کر دیا تھا۔
اگر پیغمبر معراج روحانی اور خواب سے مشابہ کسی چیز کے مدعی ہوتے، تو اس کے استبعاد پر یہ شور و غوغا برپا نہ ہوتا۔

۲۔ معراج کا مقصد

پیغمبر کا شہود باطنی تک پہنچنا ایک طرف سے، اور آسمان کی دستوں میں اسی ظاہری آنکھ سے خدا کی عظمت کو دیکھنا دوسری طرف سے تھا، جس کی طرف یہاں بھی آخری زیر بحث آیت میں (لقد زأی من آیات ربہ الکبریٰ) اور سورۃ اسراء کی آیت ایک میں بھی (لنریہ من آیاتنا) اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے دوسرے اہم مسائل — فرشتوں، اہل جنت، دوزخیوں اور ارواح انبیاء — سے متعلق آگاہی حاصل کی، جو آپ کی عمر مبارک کے سارے عرصہ میں خلق خدا کی تعلیم و تربیت میں آپ کے لیے الہام بخش تھی۔

۳۔ معراج اور بہشت

زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر شب معراج جنت کے قریب سے گزرے یا اس میں وارد ہوئے۔
یہ بہشت چاہے بہشت جاوداں اور "جنة الخلد" ہو — جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے — یا وہ جنت برزخ ہو، جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ بہر صورت آپ نے اس بہشت میں انسانوں کے مستقبل کے بہت سے اہم مسائل مشاہدہ فرمائے ہیں، جن کی تشریح و تفصیل اسلامی روایات میں آئی ہے، اور ہم انشاء اللہ ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

۴۔ معراج اسلامی روایات میں

ان مسائل میں سے، جو روایات معراج، بلکہ اس سارے ہی مسئلہ کو بعض کی نظر میں قابل اعتراض بناتے ہیں، ان کے درمیان بعض ضعیف اور مچھل روایات کا وجود ہے، جب کہ "مجمع البیان" میں معروف مفسر مرحوم "طبری" کے قول کے مطابق، معراج کی روایات کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

الف : وہ روایات جو متواتر ہونے کی بنا پر قطعی و یقینی ہیں (مثلاً معراج کا اصل مسئلہ)

ب : وہ روایات جو معتبر منابع سے نقل ہوئی ہیں، اور ایسے مسائل پر مشتمل ہیں جن کے قبول کرنے میں کوئی عقل مانع نہیں ہے، مثلاً وہ روایات جو آسمانوں میں عظمت خدا کی بہت سی آیات کے مشاہدے کے بارے میں بات کرتی ہیں۔

ج : وہ روایات جن کا ظاہر ان اصولوں کے ساتھ جو آیات قرآنی اور مسلم اسلامی روایات سے حاصل ہوئے ہیں منافق

رکھتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ مثلاً وہ روایات جو یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر گرامیؐ نے جنتیوں کے ایک گروہ کو جنت میں اور دوزخیوں کے ایک گروہ کو دوزخ میں دیکھا۔ (تو اس کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہشت و دوزخ سے مراد برزخی بہشت و دوزخ ہیں، ان میں سے ایک میں تو مؤمنین اور شہداء کی ارواح رہتی ہیں، اور دوسری میں کفار و مجرمین کی ارواح ٹھہرتی ہیں۔)

د۔ وہ روایات جو الے باطل و بے بنیاد مطالب پر مشتمل ہیں۔ جو کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہیں، اور ان کے مطالب ہی ان کے مجہول ہونے پر گواہ ہیں، مثلاً وہ روایات جو کہتی ہیں کہ پیغمبرؐ نے خدا کو ”ظاہری آنکھ“ کے ساتھ دیکھا، یا اس سے گفتگو کی۔ اور اس کا مشاہدہ کیا، اس قسم کی روایات اور ان کی مانند قطعاً مجہول ہیں، (مگر یہ کہ شہود باطنی کے ساتھ ان کی تفسیر کی جائے) اس تقسیم بندی کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم معراج کی روایات کا ایک اجمالی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

مجموعہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ نے یہ آسانی سفر چند مرحلوں میں کیا۔

پہلا مرحلہ، مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ کے درمیانی فاصلہ کا مرحلہ تھا، جس کی طرف سورہ اسراء کی پہلی آیت میں اشارہ ہوا ہے، سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى ”منزلہ ہے وہ خدا جو ایک رات میں اپنے بندہ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا“

بعض معتبر روایات کے مطابق آپؐ نے اثناء راہ میں جبریل کی میست میں سر زمین مدینہ میں نزول فرمایا اور وہاں نماز پڑھی۔

اور مسجد اقصیٰ میں بھی ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ جیسے عظیم انبیاء کی ارواح کی موجودگی میں نماز پڑھی، اور امام جماعت پیغمبرؐ تھے۔ اس کے بعد وہاں سے پیغمبرؐ کا آسانی سفر شروع ہوا۔ اور آپؐ نے ساتوں آسمانوں تک کو یکے بعد دیگرے عبور کیا، اور ہر آسمان میں ایک نبیابی منظر دیکھا۔ بعض آسمانوں میں پیغمبروں اور فرشتوں سے۔ بعض آسمانوں میں دوزخ اور دوزخیوں سے اور بعض میں جنت اور جنتیوں سے ملاقات کی۔ اور پیغمبرؐ نے ان میں سے ہر ایک سے بہت سی تربیتی و اصلاحی قیمتی یادیں اپنی روح پاک میں ذخیرہ کیں، اور بہت سے عجائبات کا مشاہدہ کیا جن میں سے ہر ایک عالم ہستی کے اسرار میں سے ایک سر اور رمز تھا، اور واپس آنے کے بعد ان کو صراحت کے ساتھ اور بعض اوقات کنایہ اور مثال کی زبان میں امت کی آگاہی کے لیے مناسب فرصتوں میں بیان فرماتے تھے، اور تعلیم و تربیت کے لیے اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔

۱۔ قرآن کی بعض آیات میں آیا ہے کہ قیامت کے دن پرہیزگار گروہ جنت میں داخل ہوں گے، اور کفار گروہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔ (سورہ زمر آیات ۷۱ تا ۷۳) دوسری آیت بھی اس معنی پر گواہی دیتی ہیں (مثلاً آیت ۷۰۔ زخرف ۸۵ تا ۸۶ مریم ۷۷، دخان)۔

۲۔ بحار الانوار جلد ۱۸ صفحہ ۳۱۹۔

۳۔ قرآن کی بعض آیات کے مطابق مثلاً ”اَنَّا رَبُّ السَّمَاءِ الدُّنْيَا بَازِيْنَةُ الْكُوكَبِ“ ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے (صافات ۶) ہم جو کچھ عالم بالا سے دیکھتے ہیں اور تمام ستارے اور کہکشاں یہ سب پہلے آسمان کا حصہ ہیں۔ اس بنا پر چھ اور آسمان ان کے اوپر کے عوالم ہیں؟

یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس آسانی سفر کا ایک اہم مقصد ان قیمتی مشاہدات کے تربیتی و عرفانی نتائج سے استفادہ کرنا تھا، اور زیر بحث آیات میں قرآن کی یہ پُر معنی تعبیر ”لقد راحی من آیات ربہ العکبریٰ“ ان تمام امور کی طرف ایک اجمالی اور سرسختہ اشارہ ہو سکتی ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ بہشت اور دوزخ جس کو پیغمبرؐ نے سفر معراج میں مشاہدہ کیا، اور کچھ لوگوں کو وہاں عیش میں اور عذاب میں دیکھا، وہ قیامت والی جنت اور دوزخ نہیں تھیں، بلکہ وہ برزخ والی جنت و دوزخ تھیں، کیونکہ ان آیات کے مطابق جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں قرآن مجید کہتا ہے کہ قیامت والی جنت و دوزخ قیامت اور حساب و کتاب سے فراغت کے بعد نیکو کاروں اور بدکاروں کو نصیب ہوگی۔

آخر کار آپ ساتویں آسمان پر پہنچ گئے، وہاں نور کے بہت سے جہانوں کا مشاہدہ کیا، وہی جگہ جہاں پر ”سدرۃ المنتہیٰ“ اور ”جنتہ المآویٰ“ واقع تھی، اور پیغمبرؐ اس جہان سرسبز نور و روشنی میں، شہود باطنی کی ادج، اور قرب الی اللہ اور مقام ”قاب قوسین او ادنیٰ“ پر فائز ہوئے۔ اور خدا نے اس سفر میں آپ کو مخاطب کرتے ہوئے بہت سے اہم احکام دیئے اور بہت سے ارشادات فرمائے جن کا ایک مجموعہ اس وقت اسلامی روایات میں ”احادیث قدسی“ کی صورت میں ہمارے لیے یادگار رہ گیا ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ فصل میں ہم اس کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کریں گے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایات کی تشریح کے مطابق پیغمبرؐ نے اس عظیم سفر کے مختلف حصوں میں اچانک علیؑ کو اپنے پہلو میں دیکھا، اور ان روایات میں کچھ ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں، جو پیغمبرؐ اگر تم کے بعد علیؑ کے مقام کی حد سے زیادہ عظمت کی گواہ ہیں۔

معراج کی ان سب روایات کے باوجود کچھ ایسے سچیدہ اور سرآئینہ جملے ہیں جن کے مطالب کو کشف کرنا آسان نہیں ہے، اور اصطلاح کے مطابق روایات متشابہ کا حصہ ہیں۔ یعنی ایسی روایات جن کی تشریح کو خود معصومین کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

(روایات معراج کے سلسلہ میں مزید اطلاع کے لیے سجاد الاذوار کی جلد ۱۸ از ص ۲۸۲ تا ص ۴۱۰ رجوع فرمائیں)

ضمنی طور پر، معراج کی روایات اہل سنت کی کتابوں میں بھی تفصیل سے آئی ہیں، اور ان کے راویوں میں سے تقریباً ۲۰ افراد نے حدیث معراج کو نقل کیا ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے، یہ اتنا لمبا سفر طے کرنا اور یہ سب عجیب اور قسم قسم کے حادثات، اور یہ ساری لمبی چوڑی گفتگو میں، اور یہ سب کے سب مشاہدات ایک ہی رات میں یا ایک رات سے بھی کم وقت میں کس طرح سے انجام پائے گئے؟ لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے، سفر معراج ہرگز ایک عام سفر نہیں تھا، کہ اسے عام میاروں سے پرکھا جائے۔ نہ تو اصل سفر معمولی تھا اور نہ ہی آپ کی سواری معمولی اور عام تھی، نہ آپ کے مشاہدات عام اور معمولی تھے اور نہ ہی آپ کی گفتگو تین، اور نہ ہی وہ پیالے جو اس میں استعمال ہوئے ہمارے کرۂ خاکی کے محدود اور چھوٹے پیالوں

کے مانند تھے، اور نہ ہی وہ تشبیہات جو اس میں بیان ہوئی ہیں ان مناظر کی عظمت کو بیان کر سکتی ہیں جو پیغمبرؐ نے مشاہدہ کیے، تمام چیزیں غارق العادت صورت میں، اور اس مکان و زمان سے خارج کے پیالوں میں — جس سے ہم آشنا نہیں — واقع ہوئیں۔ اس بنا پر کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یہ امور ہمارے کرۂ زمین کے زمانی پیالوں کے ساتھ ایک رات یا ایک رات سے بھی کم وقت میں واقع ہوئے ہوں، (غور کیجئے)

۵۔ معراج کی رات خدا کی پیغمبر سے باتوں کا ایک گوشہ

کتب حدیث میں ایک روایت امیر المؤمنین علیؑ کے واسطے سے پیغمبر اسلامؐ سے اس سلسلہ میں آئی ہے جو بہت ہی شرح کے ساتھ ہے اور طولانی ہے، ہم اس کے کچھ گوشوں کو یہاں پیش کرتے ہیں، ایسے مطالب جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس تاریخی رات کی باتیں کس محور پر تھیں، اور انہوں نے آسمانوں کی بلندی کی طرح کس طرح سے بلندی حاصل کی۔ حدیث کے شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبرؐ نے شب معراج پر درگاہ سبحان سے اس طرح سوال کیا:

یا رب ائجی الاعمال افضل؟

”پروردگارا! کونسا عمل افضل ہے؟“

خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

لیس شیء عندی افضل من التوکل علی، والرضا بما قسمت، یا محمد! وجبت محبتی للمتحابین فی، ووجبت محبتی للمتعاطفین فی، ووجبت محبتی للمتواصلین فی، ووجبت محبتی للمتوکلین علی، ولیس لمحبتی علم ولا غایة ولا نہایة

”کوئی چیز میرے نزدیک مجھ پر توکل کرنے، اور جو کچھ میں نے تقسیم کر کے دیا ہے، اس پر راضی ہونے سے، برتر نہیں ہے۔ اے محمد! جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں، میری محبت ان کے شامل حال ہوگی، اور جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے پر مہربان ہیں اور میری خاطر دوستی کے تعلقات رکھتے ہیں، میں انہیں دوست رکھتا ہوں، علاوہ ازیں میری محبت ان لوگوں کے لیے جو مجھ پر توکل کرنے میں فرض اور لازم ہے، اور میری محبت کے لیے کوئی حد اور کنارہ اور انتہا نہیں ہے۔“

اس طرح سے محبت سے باتیں شروع ہوتی ہیں، ایسی محبت جس کی کوئی انتہا نہیں ہے، جو کشادہ اور وسیع ہے، اور اصولی طور پر عالم ہستی اسی محور محبت پر گردش کر رہا ہے۔ ایک اور دوسرے حصہ میں یہ آیا ہے۔

”اے احمد! بچوں کی طرح نہ ہونا، جو سبز و زرد اور زرق و برق کو دوست رکھتے ہیں، اور جب انہیں کوئی عمدہ اور شیریں غذا دیتے ہیں تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور ہر چیز کو

بھول جاتے ہیں“ اے

پیغمبرؐ نے اس موقع پر عرض کیا :

پروردگارا ! مجھے کسی ایسے عمل کی ہدایت فرما جو تیری بارگاہ میں قرب کا باعث ہو۔

فرمایا : ”رات کو دن اور دن کو رات قرار دے“ !

عرض کیا : کس طرح ؟ !

فرمایا : ”اس طرح کہ تیرا سونا نماز ہو، اور ہرگز اپنے شکم کو پورے طور پر سیر نہ کرنا۔“

ایک اور حصہ میں آیا ہے :

اے احمد ! میری محبت فقیروں اور محرموں کی محبت ہے۔ ان کے قریب ہو، اور ان کی مجلس کے قریب بیٹھ، تاکہ میں تیرے نزدیک ہوں، اور دنیا پرست ثروت مندوں کو اپنے سے دور رکھ اور ان کی مجالس سے بچتا رہ۔“

ایک اور حصہ میں فرماتا ہے :

”اے احمد ! دنیا کے زرق و برق اور دنیا پرستوں کو بیغوض شمار کر، اور آخرت اور اہل آخرت کو محبوب رکھ، عرض کرتے ہیں :

پروردگارا ! اہل دنیا اور اہل آخرت کون ہیں ؟“

فرمایا : اہل دنیا تو وہ لوگ ہیں، جو زیادہ کھاتے ہیں، زیادہ ہنستے ہیں، زیادہ سوتے ہیں، اور غصہ کرتے ہیں، اور تھوڑا خوش ہوتے ہیں، نہ تو برائیوں کے مقابلہ میں کسی سے عذر چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی کسی عذر چاہنے والے سے اس کا عذر قبول کرتے ہیں، اطاعت خدا میں سست ہیں اور گناہ کرنے میں دلیر ہیں، لمبی چوڑی آرزوئیں رکھتے ہیں، حالانکہ ان کی اجل قریب آگئی ہے مگر وہ ہرگز اپنے اعمال کا حساب نہیں کرتے، اُن سے لوگوں کو بہت کم نفع ہوتا ہے۔ باتیں زیادہ کرتے ہیں، احساس مسئولیت نہیں رکھتے، کھانے پینے سے ہی غرض رکھتے ہیں۔

اہل دنیا نہ تو نعمت میں خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ ہی مصائب میں صبر کرتے ہیں۔ زیادہ خدمات بھی ان کی نظر میں تھوڑی ہیں (اور خود ان کی اپنی خدمات تھوڑی ہی زیادہ ہیں) اپنی اس کام کے انجام پانے پر، جو انہوں نے انجام نہیں دیا ہے، تعریف کرتے ہیں، اور ایسی چیز کا مطالبہ

لے قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث میں ہر جگہ پیغمبر کا نام ”احمد“ کے عنوان سے ذکر ہوا ہے، سوائے آغاز حدیث کے کہ وہاں ”محمدؐ“ ہے ہاں ! ”محمدؐ“ آپ کا زمینی نام تھا، اور ”احمدؐ“ آسمانی نام، ایسا کیوں نہ ہوتا، ”احمدؐ“ چونکہ ”افضل تفضیل“ کا صیغہ ہے، لہذا یہ زیادہ حمد و تعریف کو بیان کرتا ہے، اور پیغمبرؐ کو اس تاریخی رات میں، اور قرب خدا کے اس مرحلہ میں ”محمدؐ“ سے گزر کر ”احمدؐ“ تک پہنچ جانا چاہیے خصوصاً جبکہ احمد کا احد سے فاصلہ بہت کم ہے۔

کرتے ہیں جو ان کا حق نہیں ہے۔

ہمیشہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی بات کرتے ہیں، اور لوگوں کے عیوب تو یاد دلاتے رہتے ہیں لیکن ان کی نیکیوں کو چھپاتے ہیں عرض کیا: پروردگار! کیا دنیا پرست اس کے علاوہ بھی کوئی عیب رکھتے ہیں؟

فرمایا: اے احمد! ان کا عیب یہ ہے کہ جہل اور حماقت ان میں بہت زیادہ ہے جس استاد سے انہوں نے علم سیکھا ہے وہ اس کی توضیح نہیں کرتے، اور اپنے آپ کو مائل سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ صاحبان علم کے نزدیک نادان اور احمق ہیں۔“

اس کے بعد اہل آخرت اور ہشتیوں کے اوصاف کو یوں بیان کرتا ہے :-
 ”وہ ایسے لوگ ہیں جو باحیا ہیں، ان کی جہالت کم ہے۔ ان کے منافع زیادہ ہیں۔ لوگ ان سے
 راحت و آرام میں ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے ہاتھوں تکلیف میں ہوتے ہیں، اور ان کی باتیں
 سنجیدہ ہوتی ہیں۔“

وہ ہمیشہ اپنے اعمال کا حساب کرتے رہتے ہیں، اور اسی وجہ سے وہ خود کو زحمت میں ڈالے رہتے ہیں، ان کی آنکھیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں لیکن ان کے دل بیدار ہوتے ہیں، ان کی آنکھ گھریاں ہوتی ہے اور ان کا دل ہمیشہ یادِ خدا میں مصروف رہتا ہے جس وقت لوگ غافلوں کے زمرہ میں لکھے جا رہے ہوں وہ اس وقت ذکر کرنے والوں میں لکھے جاتے ہیں۔

[illegible]

جس وقت عبادت کے لیے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو ایک فولادی بند اور بنیان مخصوص کے مانند ہوتے ہیں، اور ان کے دل میں مخلوقات کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے کہ میں انہیں ایک پاکیزہ زندگی بخشوں گا۔ اور عمر کے اختتام پر میں خود ان کی روح کو قبض کر دوں گا اور ان کی روح کی پرواز کیلئے آسمان کے دروازوں کو کھول دوں گا، تمام حجابوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دوں گا، اور حکم دوں گا کہ بہشت خود کو ان کے لیے آراستہ کرے! -----

اے احمد! عبادت کے دس حصہ ہیں جن میں سے نو حصہ طلب حلالان میں ہیں، جب تیرا کھانا اور

یہ عرشی باتیں — جو انسانی روح کو آسمانوں کی طرف بلند کرتی ہیں، اور معراج الہی کی طرف سیر کراتی ہیں، اور آستانہ عشق و شہود کی طرف کھینچتی ہیں — حدیث قدسی کا صرف ایک حصہ ہے۔
مزید براں ہمیں الطینان ہے کہ پیغمبرؐ نے اپنے ارشادات میں جو کچھ بیان فرمایا ہے ان کے علاوہ بھی، اس شب عشق و شوق اور جذبہ و وصال کی شب میں، ایسی باتیں، اسرار و رموز اور اشارے آپ کے اور آپ کے محبوب کے درمیان ہوئے ہیں جن کو نہ تو کان سننے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ ہی عام افکار میں ان کے درک کی طاقت ہے۔ اور اسی بنا پر وہ ہمیشہ پیغمبرؐ کے دل و جان کے اندر ہی مکتوم اور پوشیدہ رہے، اور آپ کے خواص کے علاوہ کوئی بھی اُن سے آگاہ نہیں ہوا۔

www.sirat-e-mustaqeem.com

۱۹- أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ۝

۲۰- وَمَنْوَةَ الثَّالِثَةَ الْآخِرَىٰ ۝

۲۱- أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثَىٰ ۝

۲۲- تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ۝

۲۳- إِنَّ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَابَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا
مِنْ سُلْطٰنٍ ۖ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأُنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ
جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَىٰ ۝

ترجمہ

۱۹- مجھے بتاؤ کیا "لات" اور "عزلی" بت -----

۲۰- اور "منات" جو ان میں سے تیسرا ہے (خدا کی بیٹیاں ہیں) ؟

۲۱- کیا تمہارا حصہ تو بیٹا ہے اور اس کا حصہ بیٹی؟ (درحالیکہ تمہارے خیال میں لڑکیاں لڑکوں کی نسبت کم قدر و قیمت رکھتی ہیں)۔

۲۲- تو اس صورت میں یہ تقسیم غیر عادلانہ ہے۔

۲۳- یہ تو فقط وہ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے ان کے رکھے ہیں، (ایسے نام جو بے معنی و

مطلب اور اسمائے بے معنی ہیں) اور خدا نے ہرگز کوئی دلیل اور حجت اس پر نازل نہیں کی ہے۔

وہ صرف بے بنیاد گمانوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف

سے ان کے لیے ہدایت اچھی ہے۔

تفسیر

”توحید“ و ”وحی“ و ”معراج“ اور آسمانوں میں خدائے یگانہ کی عظمت سے مربوط مباحث کے بیان کے بعد بتوں کے بارے میں مشرکین کے شرک اور یہودہ عقائد کے بطلان کو پیش کرتا ہے۔
فرماتا ہے:

خدا کی عظمت اور اس کی عظیم آیات اور نشانیوں کو جان لینے کے بعد مجھے بتاؤ تو سہی کیا پھر بھی ”لالت“ و ”عزلی“ بت ہی۔۔۔۔۔۔“ (افرو یتسم اللات والعزلی)۔

اور اسی طرح سے ”منات“ جو ان کا تیسرے بت ہے۔ جسے ان کے بعد ذکر کرتے ہو، کیا یہ مورتیاں خدا کی بیٹیاں ہیں، اور تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ (ومناة الثالثة الاخوی)۔
”کیا تمہارا حصہ تو بیٹے ہیں اور اس کا حصہ بیٹیاں؟“ (الکم الذکر وله الانثی)۔

حالانکہ تمہارے خیال میں بیٹیاں بیٹوں سے کم قدر قیمت ہیں، یہاں تک کہ جب تم یہ سنتے ہو کہ تمہاری بیوی نے بیٹی جنی ہے تو تم غم و اندوہ کی شدت اور غصہ سے بیاہ ہو جاتے ہو۔

اگر اسی طرح ہے تو پھر یہ تقسیم ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے جو تم نے خود اپنے اور خدا کے درمیان روا رکھی ہے“ (تلك اذا قسمة ضیعی)۔

کیونکہ خدا کے حصہ کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہو۔

اس طرح قرآن ان کے گرے ہوئے اور بے ہودہ افکار کا مذاق اڑاتا ہے کہ تم ایک طرف تو بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے ہو، انہیں ننگ و عیب سمجھتے ہو۔ اور دوسری طرف فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے ہو، تم نہ صرف خود ان کی پرستش کرتے ہو،

۱۔ ان تینوں بتوں کے بارے میں ہم انشاء اللہ نکات کی بحث میں تفصیل سے گفتگو کریں گے، جو چیز یہاں قابل توجہ ہے وہ ”ثالثۃ“ ”تیسرا“ اور ”آخری“ (متاخر) کی تعبیر ہے، جو منات بت کے بارے میں آئی ہے۔ علماء نے ان دونوں تعبیروں کے لیے بہت زیادہ تفسیریں بیان کی ہیں۔ جن میں سے اکثر بے بنیاد تکلفات ہیں، جو کچھ زیادہ مناسب نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین عرب کے نزدیک ان بتوں کی اہمیت اسی ترتیب کے ساتھ ہے جو آیت میں بتائی گئی ہے۔ تو اس بنا پر ”منات“ تیسرے مرحلہ میں قرار پاتا ہے۔ اور ”آخری“ کے ساتھ اس کی توصیف اس کے رتبہ و مقام کے تاخر کی بنا پر ہے۔

۲۔ ”ضیعی“ ناقص، ظالمانہ اور غیر معتدل کے معنی میں ہے۔

بلکہ ان کے بے روح مجسمے بھی بتوں کی صورت میں تمھاری نظر میں اتنے محترم ہیں کہ ان کے سامنے سجدہ کرتے ہو، مشکلات میں ان سے پناہ مانگتے ہو، اور اپنی حاجتیں ان سے طلب کرتے ہو۔ حقیقتاً یہ ایک مذاق اور شرم والی بات ہے۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کم از کم پتھر اور لکڑی کے بہت سے بت جن کی عرب پرستش کیا کرتے تھے، ان کے گمان میں فرشتوں کے مجسمے تھے، وہ فرشتے جنہیں وہ ”رب النوح“ اور عالم ہستی کا پیرو مدبر سمجھتے تھے، اور خدا سے ان کی نسبت بیٹی اور باپ کی نسبت خیال کرتے تھے۔

جس وقت ان خرافات کا ایک دوسری بیہودگی کے ساتھ، جو وہ بیٹیوں کے بارے میں سمجھتے تھے مقابلہ کیا جاتا ہے تو ان کا عجیب و غریب تضاد، خود ان کے عقائد و افکار کے بے بنیاد ہونے کا ایک بہترین گواہ بن جاتا ہے، اور کتنی عمدہ بات ہے کہ یہ چند مختصر سے جملوں کے ساتھ قرآن ان سب پر خط بطلان کھینچتے ہوئے ان کے مذاق اور مسخرہ پن کو آشکار کر دیتا ہے۔

اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کا ہرگز منشا یہ نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے بیٹی اور بیٹے کے درمیان فرق کے بارے میں اعتقاد کو قبول کرے، بلکہ وہ اس طریقہ سے مد مقابل کے سمات کو اس کے خلاف پیش کرنا چاہتا ہے جسے منطق کی اصطلاح میں ”جدل“ کہتے ہیں، اور نہ اسلام کی منطق میں، انسانی قدر و منزلت کے لحاظ سے، نہ تو بیٹے اور بیٹیوں میں کوئی فرق ہے، اور نہ ہی فرشتے بیٹی یا بیٹا ہیں اور نہ اصلاً وہ خدا کی اولاد ہیں، اور نہ ہی اصولاً خدا اولاد رکھتا ہے، یہ بے بنیاد مفروضہ ہیں جن کی بنیاد دوسرے بے بنیاد مفروضوں پر ہے۔ لیکن یہ ان لغویت پرستوں کے فکر و منطق کے ضعف و کمزوری کو ثابت کرنے کے لیے بہترین جواب ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں قرآن قاطعیت کے ساتھ کہتا ہے، یہ تو فقط نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے ان کے رکھے ہوئے ہیں، (ایسے نام جو بے معنی اور اسمائے بے معنی ہیں) اور خدا نے ہرگز کوئی دلیل اور حجت اس پر نازل نہیں کی ہے ”ان ہی الا اسماء سمیتموھا انتم و اباؤکم ما انزل اللہ بہا من سلطان)“

نہ تو اس پر تم کوئی عقلی دلیل رکھتے ہو، اور نہ ہی وحی کے طریق سے کوئی دلیل تمھارے پاس ہے۔ اور یہ مٹھی بھرا وہام و خرافات اور کھوکھلے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آخر میں مزید کہتا ہے: وہ تو صرف بے بنیاد گمانوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں ”اور یہ مہوم باتیں سب کی سب خیال اور ہوائے نفس کی پیداوار ہیں، (ان یتبعون الا الظن وما تھوی الا نفس)“

”حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے“ (ولقد جاءھم من ربھم الھدٰی)۔

۱۔ ”سلطان“ تسلط اور غلبہ کے معنی میں ہے اور زندہ و یقینی دلائل کو ”سلطان“ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دشمن پر غلبہ کا سبب ہوتے ہیں۔

۲۔ ”ما تھوی الا نفس“ میں ما ”موصوفہ“ ہے، یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ مصدر یہ ہو، البتہ نتیجہ کے لحاظ سے کچھ فرق نہیں ہے۔

لیکن وہ آنکھیں بند کر کے اس سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور ان ادھام کی ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

چند نکات

۱۔ عربوں کے تین مشہور بت

مشرکین عرب کے بہت سے بت تھے، لیکن بلا شک و شبہ ان میں سے تین بت ”لات“ و ”عزیٰ“ اور منات ایک خاص اہمیت اور شہرت رکھتے تھے۔

ان ناموں کے ساتھ ان تینوں کے نام رکھنے کے بارے میں، اور اسی طرح سب سے پہلے ان بتوں کے بنانے والے کے متعلق اور ان کے مقام اور پرستش کرنے والے قبیلہ کے سلسلہ میں بہت سی باتیں اور اختلافات ہیں۔ اور ہم یہاں صرف اسی بات پر — جو کتاب ”بلوغ العرب فی معرفۃ احوال العرب“ میں آیا ہے۔ اکتفا کرتے ہیں۔

”پہلا معروف بت، جسے عربوں نے انتخاب کیا، بت ”منات“ تھا، جو ”عز بن لہی“ کی طرف سے، بت پرستی کو شام سے حجاز کی طرف منتقل کرنے کے بعد، بنایا گیا تھا، یہ بت بحرہ احمر کے پاس مدینہ اور مکہ کے درمیان کے علاقہ میں رکھا گیا تھا، اور تمام عرب اس کا احترام کیا کرتے تھے، اور وہ اس کے پاس قربانی کرتے تھے، لیکن سب سے زیادہ اسے دو قبیلے، ”ادس“ اور ”خزرج“ اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ آٹھویں ہجری میں، جو فتح مکہ کا سال تھا، جس وقت پیغمبر مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہے تھے، آپ نے امیر المومنین علیؑ کو بھیج کر اسے تڑوا دیا۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں نے بت ”منات“ بنانے کے ایک مدت بعد ”لات“ کو بنایا، جو ایک چار کونوں والے پتھر کی صورت میں تھا، اور سر زمین طائف میں رکھا گیا تھا، اس جگہ پر جہاں آج مسجد طائف کی بائیں طرف کا منارہ ہے اس بت کے خادم زیادہ تر قبیلہ ثقیف میں سے تھے، جب وہ مسلمان ہو گئے، تو پیغمبرؐ نے بغیرہ کو بھیج کر اسے تڑوا دیا، اور اس نے اسے آگ میں پھینک کر جلا دیا۔

تیسرا بت جس کا زمانہ جاہلیت کے عربوں نے انتخاب کیا تھا، ”عزیٰ“ تھا جو مکہ سے عراق کے راستے میں ”ذات عرق“ کے قریب رکھا ہوا تھا، اور قریش اس کا بہت ہی زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔

وہ ان تینوں بتوں کو اتنی اہمیت دیا کرتے تھے، کہ وہ خانہ خدا کے گرد طواف کرتے وقت کہتے تھے، ”واللات والعزیٰ ومنات الشالۃ الاخریٰ، فانھن الغرائق العلیٰ، وان شفاعتھن لترتجی“؛ ”لات وعزیٰ اور منات خوبصورت اور بلند مقام پرندے ہیں کہ جن سے شفاعت کی امید کی جاتی ہے“۔

اور وہ انہیں خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے (ظاہر یہ ہے کہ وہ انہیں فرشتوں کی مورتیاں خیال کرتے تھے جنہیں وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کا نام رکھنے میں بھی غالباً انہوں نے خدا کے ناموں سے استفادہ کیا ہوا تھا، زیادہ سے زیادہ "ثانیث کی علامت کے ساتھ، تاکہ وہ اوپر والے عقیدہ کو ظاہر کرے، اس طرح سے کہ "اللّٰت" اصل میں "اللّٰہ" تھا، اس کے بعد حرف "ہ" ساقط ہو گیا، اور اللّٰت ہو گیا۔ اور "العزّی" "اعز" کی مونث ہے اور "منات" "منی اللّٰہ" الشیء، کسی چیز کے خدا کی طرف سے مقدر ہونے سے لیا گیا ہے۔

بعض اسے "نوء" کے مادہ سے جانتے ہیں جو ان ستاروں میں سے تھا جن کے بارے میں عربوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب وہ طلوع کرتے ہیں تو ان کے ساتھ ہی بارش ہوتی ہے، اور بعض اسے "منی" (بروزن سعی) کے مادہ سے خون بہانے کے معنی میں جانتے ہیں، کیونکہ وہ قربانی کے خون ان کے پاس بہایا کرتے تھے، لہٰذا بہر حال عرب ان بتوں کا اس قدر احترام کیا کرتے تھے، کہ بعض قبیلوں یا افراد کا نام "عبد العزّی" اور "عبد منات" کی طرح کے رکھا کرتے تھے۔

۲۔ اسمہای بے مسمیٰ

شرک اور دو خداؤں یا کئی خداؤں کی پرستش کے قدیم ترین سرشتوں میں سے ایک، موجودات عالم کا تنوع ہے، کیونکہ کوتاہ فکر افراد یہ باور نہیں کر سکتے تھے، کہ یہ گونا گوں اور متنوع موجودات، جو آسمان اور زمین میں ہیں، ایک ہی خدا کی مخلوق ہوں کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر قیاس کر لیا تھا جو ہمیشہ ایک آدھ کام یا چند کاموں میں ہی مہارت رکھتے تھے، لہٰذا وہ موجودات کی ہر نوع کے لیے ایک علیحدہ خدا مانتے تھے۔ جسے وہ "رب النوع" سے تعبیر کرتے تھے مثلاً رب النوع دریا، رب النوع صحرا رب النوع باران، رب النوع آفتاب، رب النوع جنگ اور رب النوع صلح۔

یہ خیالی خدا جنہیں وہ بعض اوقات فرشتوں سے یاد کیا کرتے تھے، ان کے عقیدہ کے مطابق اس جہان کے حکمران تھے اور جس حصہ میں بھی کوئی مشکل پیدا ہوتی تو وہ اسی کے رب النوع سے پناہ مانگتے تھے، اس کے بعد چونکہ یہ سارے کے سارے موجودات کے رب النوع محسوس نہیں ہوتے تھے لہٰذا ان کی مورتیاں بنا کر ان کی عبادت کرنے لگے۔

یہ یہود و عقائد یونان سے دوسرے علاقوں کی طرف اور آخر کار حجاز کے علاقے کی طرف منتقل ہوئے۔ لیکن چونکہ عرب توحید ابراہیمی کی بنا پر، جو ان کے درمیان بطور یادگار رہ گئی تھی، اللہ کے وجود کے منکر نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے ان عقائد کو آپس میں ملا دیا، اور خداوند تعالیٰ کے وجود کا عقیدہ برقرار رکھتے ہوئے، فرشتوں کا عقیدہ بھی اپنا لیا جن کا وہ خدا کے ساتھ باپ اور بیٹی کا رابطہ سمجھتے تھے، اور پتھر اور لکڑی کے بتوں کو ان کے منظر اور ان کی مورتیاں سمجھتے تھے۔

لہٰذا اس معنی کے مطابق اللات کو اللّٰہ (گول تاء) کے ساتھ لکھا جانا چاہیے، لیکن چونکہ وقفی حالت میں (ہاء) کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہے اور ممکن ہے کہ لفظ "اللّٰہ" کے ساتھ اشتباہ ہو جائے لہٰذا اسے "اللّٰت" کی صورت میں لکھتے ہیں۔

لہٰذا پہلا احتمال کشاف میں اور دوسرا بلوغ العرب میں آیا ہے۔

۳۔ بلوغ العرب جلد ۲ ص ۲۰۲ اور ۲۰۳۔

قرآن ایک مختصر، لیکن جامع عبارت کے ساتھ جو اوپر والی آیات میں بیان ہوئی ہے، کہتا ہے، ”یہ سب بے معنی نام اور اسمائے بے معنی ہیں، جنہیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے بغیر کسی دلیل و مدرک کے انتخاب کر لیا ہے!“
دو بارش کے خدا سے جس کا تم نے یہ نام رکھا ہے کوئی کام ہو سکتا ہے، اور نہ ہی سورج، دریا، جنگ اور صلح کے خیالی خداؤں سے کچھ ہو سکتا ہے۔

تمام چیزیں خدا ہی کی طرف سے ہیں، اور سب عالم ہستی اسی کا مطیع ہے۔ اور ان مختلف موجودات کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی ان کے خالق کی وحدت کی بہترین دلیل ہے، کیونکہ اگر کئی ”اللہ“ اور بہت سے خدا ہوتے تو نہ صرف یہ کہ یہ ہم آہنگی موجود نہ ہوتی، بلکہ اس کا انجام یہ ہوتا کہ سارا عالم تضاد اور فساد کا شکار ہو جاتا ہے، لو کان فیہما الہة الا اللہ لفسدتا۔

۲۔ بت پرستی کا نفسیاتی اور فکری سرچشمہ

بت پرستی کے سرچشمے تو ہمیں معلوم ہو گئے ہیں، لیکن بت پرستی کے کچھ اور نفسیاتی اور فکری سرچشمے بھی ہیں جن کی طرف اوپر والی آیات میں اشارہ ہوا ہے، اور وہ بے بنیاد گمانوں اور ہوائے نفس کی پیروی ہے۔
وہ ایک ایسا خیال اور تصور ہے جو نادان افراد میں پیدا ہو جاتا ہے، اور مقلدیں آنکھیں اور کان بند کر کے ایک دوسرے سے لے لیتے ہیں اور پھر وہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے،
البتہ بت جیسا معبود، جو اپنے بندوں پر کسی قسم کا کوئی کنٹرول نہیں رکھتا، اور نہ ہی کوئی معاد و قیامت اور حساب و کتاب رکھتا ہے، اور نہ ہی کوئی بہشت و دوزخ ہے۔ اور اس نے انہیں مکمل آزادی دے رکھی ہے، وہ صرف مشکلات میں اس کی طرف رخ کرتے ہیں اور اپنے خیال میں اس سے مدد طلب کرتے ہیں، یہ بات ان کی سرکش ہوا دھوس کے ساتھ اچھی طرح سازگار ہے۔ اور ان کی خواہشات کے لیے میدان کو کھول دیتا ہے۔

اصولی طور پر ہوائے نفس خود ایک عظیم ترین اور خطرناک ترین بت ہے۔ اور دوسرے بتوں کی پیدائش کا سرچشمہ ہے، اور بت پرستی کا بازار گرم ہونے کا سبب ہے۔

۳۔ پھر بھی ”غرائیق“ کا افسانہ

اس بحث کے دوران، جو ہم نے عربوں کے تین بتوں ”لات و عزیٰ اور منات کے بارے میں تاریخی لحاظ سے بیان کی تھی، اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا، کہ وہ ان بتوں کو بلند پایہ ”غرائیق“ سمجھتے تھے، جن سے وہ شفاعت کی امید رکھتے تھے، (غرائیق ”جمع“ ”غرنوق“ (بروزن مزدور) سفید یا سیاہ رنگ کے پانی کے ایک قسم کے پرندے کے معنی میں ہے) لہذا وہ بعض اوقات ان بتوں کے ناموں کے ذکر کے بعد ”تلك الغرائیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی“ کے جملوں کے ساتھ ان کی تعریف اور قصید خوانی کیا کرتے تھے۔

بعض کتابوں میں اس جگہ ایک بے ہودہ داستان بیان کی گئی ہے، کہ پیغمبر جب زیر بحث آیت ”افراء یمر اللات والعزیٰ“ پر پہنچے تو (معاذ اللہ) آپ نے ان دو جملوں کا خود سے اضافہ کر دیا: ”تلك الغرائیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی“ اور یہ چیز مشرکین کے خوش ہونے کا سبب بن گئی اور اس کو انہوں نے پیغمبر کی طرف سے بت پرستی کے مسئلہ

کی طرف ایک قسم کا جھکاؤ سمجھا۔ اور اس سورہ کے آخر میں جب لوگوں کو سجدہ کی دعوت دی تو مشرک بھی مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑے۔ اور یہ مشرکین کے اسلام لانے کے طور پر سب جگہ پھیل گئی، یہاں تک کہ حبشہ کے ہابز مسلمانوں کے کانوں تک پہنچ گئی اور ان میں سے بعض اتنے خوش ہوئے اور امن کا احساس کیا کہ اپنی ہجرت گاہ حبشہ سے مکہ کی طرف پلٹ آئے۔
لیکن جیسا کہ ہم نے سورہ حج کی آیت ۵۲ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ ایک ایسی ناروا نسبت اور رسوا جھوٹ ہے جس کے بطلان کو بہت سے دلائل اور قرائن واضح کرتے ہیں، جن لوگوں نے یہ جھوٹ گھڑا انھوں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ قرآن انہیں زیر بحث آیات میں صراحت کے ساتھ بت پرستی کی سرکوبی کر رہا ہے۔ اور اسے خیال خام اور ہوائے نفس کی پیروی شمار کرتا ہے۔ اور بعد والی آیات میں بھی صراحت اور پوری شدت کے ساتھ بت پرستوں کے عقائد کی مذمت کر رہا ہے، اور اسے ان کی بے ایمانی بے علمی اور عدم آگاہی کی نشانی قرار دیتا ہے، اور صراحت کے ساتھ پیغمبر کو یہ حکم دیتا ہے کہ اپنا معاملہ ان سے الگ کر لے اور ان سے منہ پھیر لے۔

اس طرح یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ دو جملے پیغمبر کی طرف سے ہوں، یا مشرکین اس قدر احمق ہوں کہ وہ یہ جملے تو سن لیں اور بعد والی آیات کو جو صراحت کے ساتھ بت پرستی کی سرکوبی کرتی ہیں نظر انداز کر دیں۔ اور آخر میں خوش ہو جائیں اور سورہ کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کے ساتھ سجدہ میں گر پڑیں؟

حقیقت یہ ہے کہ اس افسانے کو گھڑنے والوں نے بہت ہی نا تجربہ کاری، اور کسی مطالعہ کے بغیر اسے گھڑا ہے۔
یہ ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کی طرف سے اس آیت افرعیتہم اللات والعزیز کی قرأت کے وقت اچانک شیطان نے یا حاضر گردہ مشرکین میں سے کسی شیطان صفت انسان نے ان دو جملوں کا اضافہ کر دیا ہو، کیونکہ دونوں جملے ان کا شمار بن چکے تھے جن کے ذریعہ وہ ان تینوں بتوں کی تعریف کیا کرتے تھے، اور اس طرح سے ایک گروہ وقتی طور پر اشتباہ میں پڑ گیا ہو۔
لیکن اس سورہ کے آخر پر نہ تو ان کا سجدہ کرنا کوئی مفہوم رکھتا ہے، اور نہ ہی پیغمبر کا بت پرستی کے سلسلے میں جھکاؤ جیسا کہ تمام آیات قرآنی اور آپ کی تاریخ زندگی اس حقیقت اور واقعیت پر گواہ ہیں، کہ آپ نے کبھی بھی بت پرستی کے مسئلہ کے ساتھ مبارزہ کرنے میں، کسی بھی شکل و صورت میں، معمولی سے معمولی جھکاؤ نہیں دکھایا، اور اس سلسلہ میں آپ نے کسی بھی پیش نہاد کو قبول نہیں کیا، کیونکہ سارے اسلام کا خلاصہ توحید اور ”لا الہ الا اللہ“ ہے۔
لہذا پیغمبر اسلام کسی طرح بھی اسلام کے اصلی مطلب اور مفہوم پر معاملہ نہیں کر سکتے؟
ہم اس سلسلے میں مزید دلائل اور استدلالات سورہ حج کی آیت ۵۲ (جلد ۷ ص ۵۸۴) میں پیش کر چکے ہیں۔

۲۴۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمْنٰی ۝
 ۲۵۔ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُولٰٓئِ ۝
 ۲۶۔ وَكَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِّنْۢ بَعْدِ
 اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی ۝

ترجمہ

۲۴۔ کیا جو کچھ انسان آرزو رکھتا ہے وہ اسے مل جاتا ہے ؟
 ۲۵۔ حالانکہ آخرت بھی اور دنیا بھی خدا ہی کے لیے ہے۔
 ۲۶۔ اور کتنے ہی زیادہ فرشتے آسمانوں میں ایسے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی، مگر اس
 کے بعد کہ خدا جس کے لیے چاہے اس سے راضی ہو کر (شفاعت کرنے کی) اجازت
 دے دے۔

تفسیر

شفاعت بھی اسی کے اذن سے ہوگی

یہ آیات اسی طرح سے بت پرستی کی یہودگی کو بیان کرتے ہوئے اس کی مذمت کر رہی ہیں، اور گزشتہ آیات کے مضمون
 ہی کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پہلے بت پرستوں کی بے بنیاد آرزوں، اور ان توقعات کو جو وہ بتوں سے رکھتے تھے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے، ”کیا
 جو کچھ انسان آرزو رکھتا ہے وہ اسے مل جاتا ہے؟ (ام للانسان ما تمنیٰ)۔“

کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بے روح اور بے قدر و قیمت اجسام اس کی شفاعت کے لیے بارگاہِ خدا میں کھڑے ہو سکیں گے؟ یا اُسے دنیا و آخرت کی مشکلات میں پناہ دے سکیں گے؟

”حالانکہ دنیا و آخرت صرف خدا ہی کے لیے ہیں“؛ (فذلّٰہ الآخرۃ والاولیٰ)۔

عالم اسباب اس کے ارادے کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ اور ہر موجود کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس کے وجود کی برکت سے ہے شفاعت بھی اسی کی طرف سے ہے، اور مشکلات کا حل بھی اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلے آخرت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور اس کے بعد دنیا کے متعلق، کیونکہ وہ چیز جو سب سے زیادہ انسانی فکر کو اپنی طرف مشغول رکھے ہوئے ہے وہ آخرت کی نجات ہی ہے۔ اور خدا کی حاکمیت دوسرے گھر میں اس گھر سے زیادہ آشکار ہے۔

اس طرح سے قرآنِ مشرکین کو بتوں کی شفاعت، اور ان کے وسیلہ سے مشکلات کے حل سے، کلی طور پر بایوس، اور نا اُمید کر رہا ہے، اور یہ بہانہ ان سے چھین رہا ہے کہ ہم تو اس بنا پر ان کی پرستش کرتے ہیں کہ وہ بارگاہِ خدا میں ہماری شفاعت کریں؛ (و یقولون هٰؤلآء مشفعاء ؤنا عند اللہ)۔ (یونس ۱۸۰)

اوپر والی دو آیات میں ایک اور احتمال بھی ہے، اور وہ انسان کے، اپنی آرزوؤں اور خواہشات پر دسترس حاصل نہ کرنے کے طریق سے، پروردگار کے وجود کی طرف توجہ کرتا ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں ایک استفہام انکاری کی صورت میں کہتا ہے، ”کیا انسان اپنی تمام آرزوؤں کو پالیتا ہے“ اور چونکہ اس سوال کا جواب قطعاً نفی میں ہے۔ یعنی انسان ہرگز اپنی اکثر آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہوتا، اور اصطلاح کے مطابق انہیں قبر میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے، یہی چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس عالم کی تدبیر کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اور صرف اس کا ارادہ اس جہان پر حاکم ہے، اس لیے دوسری آیت میں کہتا ہے، جب یہ بات ہے تو آخرت اور دنیا خدا ہی کے لیے ہیں۔

یہ معنی اسی چیز کے مشابہ ہے جو علیؑ کی مشہور گفتگو میں آئی ہے،

عرفت اللہ سبحانه بفسخ العزائم وحل العقود و نقض الهمم

”میں نے خدا کو نچنچہ اور اداؤں کے ٹوٹنے و وعدوں کے نامتلاطم رہتے اور مہتوں کے پست ہونے سے پہچانا ہے۔“

اس تفسیر اور سابقہ تفسیر کے درمیان جمع بھی بعید نہیں ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس مسئلہ پر اور زیادہ تاکید کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے، ”آسمانوں میں کتنے ہی زیادہ فرشتے ایسے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں دے گی، مگر جس کسی کے لیے خدا چاہے اور اس سے راضی ہو کہ اس کی شفاعت کی اجازت دے دے“ (و کمر من ملک فی السماوات لا تغنی شفاعتہم شیئاً الا من بعد ان یأذن اللہ لمن یشاء و یرضی)۔

جہاں آسمان کے فرشتے اپنی ساری عظمت کے باوجود اجتماعی صورت میں بھی شفاعت پر قدرت نہیں رکھتے، جب تک کہ پُرکار کا اذن اور رضا نہ ہو، تو پھر ان بے شعور اور بے قدر و قیمت بتوں سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ جہاں تیز پرواز عقابوں کے پروبال گر جاتے ہوں وہاں ناتواں پھردوں سے کیا ہو سکتا ہے، کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ ہم توان بتوں کی اس لیے پرستش کرتے ہیں تاکہ وہ بارگاہِ خدا میں ہمارے شفیع ہوں؟

”کو“ (کتنے بہت سے) کی تعبیر یہاں عموم کے معنی میں ہے۔ یعنی کوئی فرشتہ بھی اس کے اذن و رضا کے بغیر شفاعت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تعبیر بعض اوقات لغت عرب میں ایک جمعیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورہ اسراء کی آیت ۷۰ میں لفظ کثیر عموم کے معنی میں ہے: ”وَفَضَّلْنَا هُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا“ ”ہم نے بنی آدم کو اپنی ساری مخلوقات پر فضیلت اور برتری بخشی ہے“ اس کے علاوہ سورہ شعرا کی آیت ۲۲۳ میں شیاطین کے بارے میں یہ آیا ہے کہ: ”وَكَثَرَهُمْ كَذِبُونَ“ ”ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ سب کے سب جھوٹے ہیں لہٰذا باقی رہا ”اذن“ اور ”رضا“ میں فرق تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ ”اذن“ اس مقام پر بولا جاتا ہے جہاں کوئی اپنی باطنی رضا کو ظاہر و آشکار کرے، لیکن رضا اس سے عام ہے، اور کسی چیز یا کام کو انجام دینے کے لیے ملامت طبع کے معنی میں بھی ہے۔ اور چونکہ بعض اوقات کوئی شخص اذن تو دیتا ہے جب کہ وہ دل سے راضی نہیں ہوتا لہٰذا اوپر والی آیت میں تاکید کے لیے اذن کے بعد ”رضا“ کا مسئلہ بھی آیا ہے، اگرچہ خداوند تعالیٰ کے بارے میں اذن، رضا سے جدا نہیں ہے، اور اس کے بارے میں تفسیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔

چند نکات

۱۔ آرزوؤں کے دامن کا پھیلاؤ

تمنا اور آرزو کا سرچشمہ انسان کی قدرت کا محدود ہونا اور اس کی ناتوانی ہے، کیونکہ جب کبھی اسے کسی چیز سے نگو پیدا ہوا اور وہ اسے حاصل نہ کر سکا، تو وہ آرزو اور تمنا کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور اگر ہمیشہ کسی چیز کی خواہش کرتے ہی وہ چیز حاصل ہو گئی ہوتی، اور جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ اسے فوراً مل گیا ہوتا تو پھر آرزو کوئی معنی نہ رکھتی۔

البتہ بعض اوقات انسان کی تمنائیں سچی بھی ہوتی ہیں، اور وہ اس کی بلند روح سے سرچشمہ حاصل کرتی ہیں، اور وہ اس کی حرکت و سعی اور کوشش و جہاد اور سیر تکامل کے لیے ایک عامل بن جاتی ہیں، مثلاً انسان اس بات کی آرزو کرے کہ وہ علم و دانش اور تقویٰ و شخصیت میں تمام دنیا جہاں کے لوگوں سے بڑھ جائے۔

لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی یہ آرزویں جھوٹی ہوتی ہیں، اور ٹھیک سچی آرزوؤں کے برعکس غفلت، بے خبری، اور پس ماندگی کا سبب ہوتی ہیں، مثلاً ”عمر جاوداں تک پہنچنے کی آرزو۔ اور زمین پر ہمیشہ رہنے کی تمنا، اور تمام اموال اور ثروتوں پر قبضہ جانا،

اور تمام انسانوں پر حکومت کرنا اور اسی طرح کے دوسرے موہمات -

اسی بنا پر اسلامی روایات میں اس بات کا شوق دلایا گیا ہے کہ لوگ اچھی آرزوئیں کریں، ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے منقول ہے کہ :

”من تمنى شيئاً وهو لله عز وجل رضى لم يخرج من الدنيا حتى يعطاه
”جو شخص کسی ایسی چیز کی تمنا کرے جو رضائے خدا کا موجب ہے، تو وہ دنیا سے اس وقت تک
نہیں جاتا جب تک وہ پوری نہ ہو جائے۔“ ۱

اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ دنیا میں اسے حاصل نہ ہو تو اسے اس کا اجر و ثواب ملے گا۔ ۲
۲۔ شفاعت کے بارے میں گفتگو

آخری آیت ان آیات میں سے ہے ، جو فرشتوں کے ذریعہ امکان شفاعت کی وضاحت کے ساتھ خبر دیتی ہے، جہاں وہ اذن و رضائے خدا سے شفاعت کا حق رکھتے ہیں، انبیاء اور اولیائے معصوم بطریق اولیٰ اس قسم کے حق کے حق دار ہیں۔
لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اوپر والی آیت صراحت کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ : یہ شفاعت بے قید و شرط کے نہیں ہوگی، بلکہ یہ اذن و رضائے خدا کے ساتھ مشروط ہے۔ اور چونکہ اس کا اذن و رضا حساب و کتاب کے بغیر نہیں ہے لہذا انسان اور اس کے درمیان ایسا رابطہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اس کے لیے، اپنے مقررہ درگاہ کو، شفاعت کی اجازت دے دے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں امید شفاعت، انسان کے لیے ایک تربیتی مکتب کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور خدا سے اس کے تمام رشتوں کے ٹوٹنے سے مانع ہو جاتی ہے۔ ۳

۱۔ ”بحار الانوار“ جلد ۷ ص ۲۶۱ (باب ثواب تمنی الخیرات)۔

۲۔ گذشتہ آخذ۔

۳۔ ”من یشاء“ کی تعبیر جو اوپر والی آیت میں آئی ہے ممکن ہے ایسے انسانوں کی طرف اشارہ ہو جن کی شفاعت کی خدا اجازت دیتا ہے، یا ان فرشتوں کی طرف اشارہ ہو جنہیں وہ شفاعت کی اجازت دیتا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

- ۲۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ لَيَسْمُوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةً
الْاُنْثٰى ۝
- ۲۸۔ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يَغْنٰى
مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝
- ۲۹۔ فَاَعْرَضُ عَنْ مَنْ تَوَلٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝
- ۳۰۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ
سَبِيْلِهِ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ اهْتَدٰى ۝

ترجمہ

- ۲۷۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کو (خدا) کی بیٹی کا نام دیتے ہیں۔
- ۲۸۔ انہیں ہرگز اس بات کا یقین نہیں ہے، وہ تو صرف بے بنیاد گمان کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ گمان ہرگز بھی انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا۔
- ۲۹۔ اب جبکہ ایسا ہے، تو تم بھی ان لوگوں سے، جو ہمارے ذکر سے منہ موڑتے ہیں، اور مادی دنیا کے سوا کسی چیز کو طلب نہیں کرتے، منہ موڑ لو۔
- ۳۰۔ یہ ان کی آگاہی کی آخری حد ہے، تیرا پروردگار ان لوگوں کو جو اس کی راہ سے گمراہ ہو گئے ہیں اچھی طرح پہچانتا ہے، اور ہدایت یافتہ لوگوں کو سب سے بہتر طور پر جانتا ہے۔

تفسیر

ظن و گمان ہرگز کسی کو حق تک نہیں پہنچاتے

یہ آیات مشرکین کے عقیدہ کی نفی کے سلسلہ میں اسی طرح گزشتہ آیات کے موضوع کو بیان کر رہی ہیں۔ پہلے فرماتا ہے: ”وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو (خدا کی) بیٹیاں کہتے ہیں“ (ان الذین لا يؤمنون بالآخرة ليسمون الملائكة تسمية الانثی)۔

ہاں! یہ قبیح اور بے غیرتی کی گفتگو صرف انہیں لوگوں سے سرزد ہوتی ہے جو حساب و کتاب اور جزائے اعمال کا عقیدہ نہیں رکھتے کیونکہ اگر وہ آخرت کا عقیدہ رکھتے تو اس طرح دیدہ دلیری کے ساتھ گفتگو نہ کرتے، ایسی گفتگو جس کے لیے کوئی معمولی سی دلیل بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ بلکہ عقلی دلائل اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ نہ تو خدا کے کوئی اولاد ہے اور نہ ہی فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں۔

”تسمیۃ الانثی“ کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے، جو گزشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے۔ کہ یہ باتیں بے معنی نام اور اسمائے بے معنی ہیں دوسرے لفظوں میں وہ برائے نام کی حد سے آگے کی کوئی بات نہیں یعنی ان میں کوئی واقعیت اور حقیقت نہیں ہے۔

اس کے بعد اس نام رکھنے کے بطلان کی ایک واضح دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے: ”وہ اس بات کے بارے میں علم و یقین نہیں رکھتے، بلکہ وہ بے بنیاد ظن کی پیروی کرتے ہیں، حالانکہ گمان ہرگز انسان کو حق سے بے نیاز نہیں کرتا اور کسی کو حق تک نہیں پہنچاتا“ (وما لهم به من علم ان يتبعون الا الظن وان الظن لا يغني من الحق شيئا)۔

ہدایت یافتہ اور صاحب عقیدہ انسان کوئی بات علم و آگاہی کے بغیر نہیں کہتا، اور کسی کی طرف کوئی نسبت بغیر دلیل کے نہیں دیتا، ظن و گمان اور خیال پر تکیہ کرنا شیطان یا شیطان صفت انسانوں کا کام ہے۔ اور خرافات اور موبومات کو قبول کرنا انحراف اور بے عقلی کی دلیل ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ”ظن“ (گمان) کے دو مختلف معانی ہیں۔ کبھی تو یہ بے بنیاد گمانوں کے معنی میں آتا ہے جو گزشتہ آیات کی تعبیروں کے مطابق ”ہوائے نفس اور اوبام و خرافات“ کے ہم پلہ وہم و زن ہے، زیر بحث آیات میں اس لفظ سے مراد یہی معنی ہے۔

دوسرا معنی وہ گمان ہیں جو معقول اور پسندیدہ ہیں اور اکثر اوقات واقع کے مطابق اور روزمرہ کی زندگی میں عقلاء کے کاموں کی بنیاد ہوتے ہیں، مثلاً محکمہ عدالت میں گواہوں کی گواہی، یا اہل خبرہ کا قول، یا ”ظاہری الفاظ“ اور اسی قسم کی دوسری باتیں کہ

اگر اس قسم کے گمانوں کو نوع بشر کی زندگی سے نکال لیں، اور صرف قطعی یقین پر ہی تکیہ کریں تو نظام زندگی کلی طور پر بکھر جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا ظن و گمان ان آیات میں مراد نہیں ہے۔ اور خود انہیں آیات میں اس معنی پر بہت سے شواہد موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دوسری قسم حقیقت میں ایک قسم کا عرفی علم ہے نہ کہ گمان و ظن، تو اس بنا پر جو لوگ اس آیت (ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً) سے اور اسی قسم کی دوسری آیات سے ”حجیت ظن“ کی کلی طور پر نفی کے لیے استدلال کرتے ہیں، وہ قابل قبول نہیں ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ فقہاء اور اصولیین کی اصطلاح میں ”ظن“ اعتقاد راجح کے معنی میں ہے، (وہ اعتقاد جس میں احتمال کا ایک پہلو انسان کی نظر میں ترجیح رکھتا ہو) لیکن لغت میں اس کا ایک وسیع مفہوم ہے یہاں تک کہ یہ ”دہم“ اور ضعیف احتمالات پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور بت پرستوں کا ظن اسی طرح کا تھا، کوئی سی بیہودہ بات ایک ضعیف احتمال کی صورت میں ان کے دماغ میں ظاہر ہوتی تھی، اس کے بعد ہوائے نفس اس پر عمل کرنے کے لیے کھڑی ہو جاتی تھی، اور اس کو زینت دیتی تھی، اور دوسرا احتمال جو اس کے مقابل میں ہوتا تھا وہ زیادہ قوی ہوتا تھا، اس کو بھلا دیتے تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ ایک راسخ عقیدہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا حالانکہ اس کی کچھ بھی بنیاد نہیں ہوتی تھی۔

اس کے بعد یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ گروہ اہل استدلال و منطق نہیں ہے۔ اور حب دنیا اور خدا کی یاد کو بھلا دینے نے انہیں ان موبومات اور خرافات کی گندگی کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے، مزید کہتا ہے، : جب ایسا ہے تو تم بھی ان لوگوں سے — جنہوں نے ہماری یاد سے پہلو تہی کی ہے اور وہ دنیا کی مادی زندگی کے سوا اور کسی چیز کے طالب نہیں ہیں — منہ پھیر لو اور ان کی بالکل پروا نہ کرو کیونکہ وہ گفتگو کرنے کے لائق ہی نہیں ہیں، (فاعرض عنمن تولى عن ذکرنا ولم یرد الا الحیاة الدنیا)۔

بعض مفسرین کے عقیدہ کے مطابق ”ذکر خدا“ سے مراد قرآن ہے، اور کبھی یہ احتمال دیا گیا ہے کہ اس سے مراد منطقی اور عقلی دلائل ہیں، جو انسان کو خدا تک پہنچاتے ہیں، یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اس سے مراد وہی یاد خدا ہے جو غفلت کا نقطہ مقابل ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے، جس میں خدا کی طرف ہر قسم کی توجہ شامل ہے — چاہے وہ توجہ قرآن کے ذریعہ ہو، یا دلیل عقل سے ہو، چاہے سنت کے طریق سے ہو، یا قیامت کی یاد کے ذریعہ ہو۔

ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یاد خدا سے غفلت اور مادیات اور زرق و برق دنیا کی طرف متوجہ رہنے کے درمیان ایک رابطہ ہے۔ اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے مقابل تاثیر ہے خدا کی یاد سے غفلت انسان کو دنیا پرستی کی طرف بانٹ کرے جاتی ہے، جیسا کہ دنیا پرستی انسان کو خدا کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اور یہ دونوں ہوا پرستی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور طبعی طور سے وہ خرافات جو ان کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں وہ انسان کی نظر میں جلوہ دکھاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ایک عقیدہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ اس گروہ سے منہ پھیر لینے کا حکم تبلیغ رسالت کے ساتھ جو پیغمبر کا وظیفہ اصلی ہے ہرگز اختلاف نہیں رکھتا، چونکہ انذار و تبلیغ و اِشارات ایسے موقعوں کے ساتھ مخصوص ہیں جہاں اثر کرنے کا کچھ نہ کچھ

احتمال ہو، جہاں اثر کے نہ ہونے کا یقین ہو وہاں اپنی توانائیوں کو فضول صرف نہیں کرنا چاہیے۔ اور تمام حجت کے بعد اعراض کر لینا چاہیے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ حکم پیغمبر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ یہ راہِ حق کے تمام ندادینے والوں کو شامل ہے تاکہ وہ اپنی قیمتی تبلیغی توانائیوں کو صرف ایسے مقام پر صرف کریں جہاں اثر کی امید ہو۔ لیکن مغرور و سیاہ دل دنیا پرست جن کی ہدایت کی کوئی امید نہ ہو ان کو اتمامِ حجت کے بعد ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ خدا ان کے بارے میں فیصلہ کرے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس گروہ کے فکری انحطاط کو ثابت کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: ”یہ ہے ان کی معلومات کی آخری حد“ (ذالک مبلغہم من العلم)۔

ہاں! ان کے افکار کی بلندی یہاں پر اگر ختم ہو جاتی ہے کہ ملائکہ کے بارے میں خدا کی بیٹیاں ہونے کا افسانہ گھڑیں، اور اوہام و خرافات کی تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مار تے پھریں، اور یہ ہے ان کی ہمت کا آخری نقطہ کہ خدا کو بھلا کر دنیا کی طرف رخ کر لیں۔ اور اپنے تمام انسانی شرف اور حیثیت کو درہم و دینار کے بدلے میں فروخت کر ڈالیں۔

آخر میں کہتا ہے: ”تیرا پروردگار ان لوگوں کو جو اس کے راستے سے گمراہ ہو گئے ہیں اچھی طرح سے پہچانتا ہے، اور ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا ہے“ (ان ربک هو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وهو اعلم بمن اہتدی)۔

”ذالک مبلغہم من العلم“ کا جملہ ہو سکتا ہے کہ بت پرستی اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھنے جیسی خرافات کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی اس گروہ کی آخری آگاہی اور علم ہی یہ ہوتا ہے۔

یاد دنیا پرستی اور ان کے مادیات کے چنگل میں اسیر ہونے کی طرف اشارہ ہو، یعنی ان کا انتہائی فہم اور شعور یہ ہے کہ انھوں نے خواب و خور، عیش و نوش، اور فانی و زودگذر متاع اور زرق و برق دنیا پر قناعت کر لی ہے۔

ایک مشہور دعا میں جو ماہ شعبان کے اعمال میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے یہ آیا ہے کہ:

ولا تجعل الدنيا اکبر همنا ولا مبلغ علمنا

”خداوند! دنیا کو ہمارے لیے سب سے بڑی فکری مشغولیت، اور ہمارے علم و آگاہی کی انتہا

قرار نہ دے۔“

آیت کا اختتام اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے، کہ خدا اگر اہل کو بھی اچھی طرح پہچانتا ہے اور ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی ایک کو اپنے غضب کا مشمول بناتا ہے اور دوسرے کو اپنے لطف کا مشمول قرار دیتا ہے۔ اور قیامت میں ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا دے گا۔

۱۔ یہ دعا اس اشارہ کے بغیر کہ یہ ماہ شعبان کے اعمال سے مربوط ہے۔ مجمع البیان اور بعض دوسری تفسیروں میں بھی زیر بحث آیت کے ذیل میں آئی ہے۔

ایک نکتہ

دنیا پرستوں کا سرمایہ

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات میں، دنیا پرستوں کے لیے علم و آگاہی کے قائل ہونے کے باوجود، انہیں گمراہ شمار کرتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کی نگاہ میں وہ علوم جن کا آخری اور اصلی مقصد صرف مادیات کا حصول ہو اور اس کے سوا کوئی اور بلند تر مقصد نہ ہو، وہ علم نہیں ہے، بلکہ وہ ضلالت و گمراہی ہے، اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ وہ تمام بدبختیاں جو موجودہ دنیا میں پائی جاتی ہیں — تمام جنگیں، خونریزیاں، ظلم و ستم، تجاوزات، فسادات اور آلودگیاں — انہیں ضلالت آفرین علوم سے پیدا ہوتی ہیں، ان کے علم کی انتہا وہی حیات دنیا ہے، اور ان کی نگاہ کا افق ان کی حیوانی احتیاجات و ضروریات سے آگے نہیں جاتا۔

ہاں! جب تک علم بلند تر مقاصد کے لیے آلہ نہ بنے جہالت ہے۔ اور جب تک وہ نور ایمان کے لیے ایک سرچشمہ اور اس کی راہ کا ایک ذریعہ نہ ہو، وہ ضلالت و گمراہی ہے۔

۳۱۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی ۝
 ۳۲۔ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبِيْرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشِ اِلَّا اللَّمَمَ ۚ اِنَّ رَبَّكَ وَّاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۚ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذَا اَنْشَاكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَحْيَآءٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ ۚ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ اَتَقٰی ۝

ترجمہ

۳۱۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے وہ بھی اور جو کچھ زمین میں ہے وہ خدا ہی کے لیے ہے، تاکہ بدکاروں کو ان کے بُرے اعمال کی بنا پر سزا دے، اور نیکو کاروں کو ان کے نیک اعمال کے لیے اجر و پاداش عطا کرے۔

۳۲۔ وہی لوگ جو گناہانِ کبیرہ اور بُرے اعمال سے، سوائے صغیرہ کے، دوری اختیار کرتے ہیں، تیرے پروردگار کی بخشش وسیع ہے۔ وہ تمہاری نسبت سب سے زیادہ آگاہ ہے، اس وقت سے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، اور جس وقت کہ تم جنینوں کی صورت میں اپنی ماؤں کے شکم میں تھے، پس تم خود ستائی نہ کرو کیونکہ وہ پرہیزگاروں کو بہتر طور سے جانتا ہے۔

تفسیر

خود ستائی نہ کرو وہ تمہیں اچھی طرح پہچانتا ہے،

چونکہ گزشتہ آیات میں گمراہوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کی نسبت علم خدا کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے، ”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب خدا کے لیے ہی ہے“ (و الله ما فی السماوات و ما فی الارض)۔

عالم ہستی میں مالکیت مطلقہ اسی کے لیے ہے، اور حاکمیت مطلقہ بھی اسی کے لیے ہے، اسی بنا پر عالم ہستی کی تدبیر بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور جب یہ بات ہے تو پھر اس کے علاوہ اور کوئی عبودیت و شفاعت کے لائق نہیں ہے۔

اس وسیع مخلوق کی خلقت سے اس کا سب سے بڑا مصدق اور مقصد یہ ہے کہ انسان یعنی عالم ہستی کے گل سرسبد کو کوئی مینی اور تشریحی پروگراموں اور انبیاء کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ تکامل و ارتقاء کی راہ میں آگے لے جائے۔

لہذا آیت کے آخر میں اس مالکیت کے نتیجہ کے عنوان سے فرماتا ہے: ”غرض و مقصد یہ ہے کہ بدکاروں کو ان کے بُرے اعمال کی بنا پر سزا اور عذاب دے اور نیکو کاروں کو ان کے اچھے اعمال کے لیے اجر و پاداش عطا کرے“ (لیجزی الذین اساءوا بما عملوا ویجزی الذین احسنوا بالحسنی)۔

اس کے بعد نیکو کاروں کے اس گروہ کی توصیف و تعریف کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: ”وہ وہی لوگ ہیں جو گناہانِ کبیرہ اور برے اعمال سے دوری اختیار کرتے ہیں، اور اگر ان سے کوئی گناہ ہوتا بھی ہے تو وہ صرف صغیرہ ہوتا ہے“ (الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللّٰم)۔

”کبائر“ جمع ہے کبیرہ کی اور ”اثم“ اصل میں اس عمل کو کہتے ہیں جو انسان کو خیر و ثواب سے دور کر دیتا ہے، لہذا عام طور پر گناہوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

”لام“ (بروزن قلم) ”مفردات“ میں ”راغب“ کے قول کے مطابق، گناہ سے قریب ہونے کے معنی میں ہے، اور گناہانِ صغیرہ کو بھی لم کہا جاتا ہے، اصل میں یہ لفظ ”الہام“ کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو کسی چیز کو انجام دیتے بغیر اس کے قریب ہونے کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات ”قابل اور کم اشیاء پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے، (گناہ صغیرہ پر اطلاق بھی اسی بنا پر ہے)۔

لے ”لیجزی“ میں ”لام“ ”لام غایت“ ہے، تو اس بنا پر جزا و سزا خلقت کی غایت و مقصد ہے اگرچہ بعض نے اسے گزشتہ آیت کے لفظ ”اعلم“ کے متعلق سمجھا ہے۔ اور ”لله ما فی السماوات و ما فی الارض“ کے جملہ کو جملہ مترضہ جانتے ہیں، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

مفسرین نے بھی ”لمم“ کے لیے تقریباً اسی قسم کی تفسیریں بیان کی ہیں، بعض نے اس کی ”گناہ صغیرہ“ کے ساتھ، اور بعض نے اسے معصیب کی نیت اسے انجام دیتے بغیر، اور بعض نے ”کم اہمیت معاصی“ کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے۔ بعض اوقات یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”لمم“ ہر قسم کے گناہ کو شامل ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، لیکن اس کی عادت نہ پڑ گئی ہو، اور وہ کبھی کبھار سرزد ہو جاتا ہو۔ اور انسان متذکر ہو کر اس سے توبہ کرے۔ اسلامی روایات میں بھی اس لفظ کے لیے گونا گوں تفسیریں آئی ہیں، ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہوا ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا :

هو الذنب يلعب به الرجل فيمكث ما شاء الله، ثم يلعب به بعد
 ”اس سے مراد وہ گناہ ہے جسے انسان کر بیٹھتا ہے پھر ایک مدت تک اس سے رکا رہتا ہے،
 اور پھر دوبارہ اس سے آلودہ ہو جاتا ہے، (لیکن یہ اس کا ہمیشہ کا عمل ہرگز نہیں ہے) لہ
 ایک اور دوسری حدیث میں اسی امامؑ سے یہ منقول ہوا ہے کہ :
 اللمم الرجل يلعب به الذنب فيستغفر الله منه
 ”لمم یہ ہے کہ انسان کوئی گناہ کر بیٹھے اور پھر اس سے استغفار کرے۔“
 اور دوسری روایات بھی اسی مفہوم کی نقل ہوئی ہیں۔

آیت میں موجود قرآن بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ”لمم“ ان گناہوں کے معنی میں ہے جو کبھی کبھار انسان سے سرزد ہو جاتے ہوں، پھر وہ توجہ ہو کر انہیں چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ ”کبائر“ سے ”لمم“ کا استثناء (اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے استثناء کا ظاہر، استثناء متصل ہے) اس معنی پر ایک گواہ ہے۔

علاوہ ازیں قرآن بعد والے جملہ میں کہتا ہے، ”تیرے پروردگار کی بخشش بہت وسیع ہے“ (ان ربك واسع المغفرة)۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے جس کے لیے پروردگار کے غفران کی ضرورت ہے، نہ کہ صرف قصد و نیت، اور گناہ سے اس کا ترک ہوئے بغیر قریب ہونا۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ ممکن ہے نیکو کاروں سے کوئی لغزش ہو گئی ہو، لیکن گناہ ان کی طبیعت اور عادت کے برخلاف ہے، ان کی روح اور قلب ہمیشہ پاک رہتے ہیں، اور آلودگیاں عارضی قسم کی ہوتی ہیں، لہذا گناہ کرتے ہی پشیمان ہو جاتے ہیں، اور خدا سے بخشش کی التجا کرتے ہیں، جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت ۲۰ میں آیا ہے : ان الذين اتقوا اذا مسهم طائف من الشيطان تذكروا فاذا هم مبصرون ”پرہیزگار جس وقت ان شیطانوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ جو ان کے وجود کے گرد گردش کر رہے ہیں، تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں اور مینا ہو جاتے ہیں (اور توبہ کر لیتے ہیں)۔“

اسی معنی کی نظیر سورہ آل عمران کی آیت ۱۲۵ میں بھی آئی ہے، جہاں وہ ”مؤمنین اور مؤمنین“ کی تعریف و توصیف میں فرماتا ہے :

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ: ”وہ وہی لوگ تو ہیں کہ جس وقت وہ کسی برے کام کا ارتکاب کر لیتے ہیں، یا اپنے آپ پر کوئی ظلم کر لیتے ہیں، تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں“

یہ سب باتیں اس تفسیر پر گواہ ہیں جو ”لم“ کے لیے بیان کی گئی ہیں۔

یہاں ہم امام صادقؑ کی ایک دوسری حدیث کے ساتھ اس بحث کو ختم کرتے ہیں، جو آپؑ نے زیر بحث آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمائی۔

اللمام العبد الذی یلم بالذنب بعد الذنب لیس من سلیقتہ، ای
من طبیعتہ

”لم“ کو انجام دینے والا وہ بندہ ہے جس سے کبھی کبھار گناہ سرزد ہو جاتا ہے لیکن اس کی طبیعت اور عادت ایسی نہیں ہوتی۔“

آیت کے آخر میں اجر و ثواب اور سزا و عذاب کے مسئلہ میں عدالت پروردگار کی تاکید کے لیے، اس کے علم الجلیہ پایاں کے بارے میں، جو تمام بندوں اور ان کے اعمال کو محیط ہے گفتگو کرتا ہے، اور فرماتا ہے: ”وہ تمہاری نسبت سب سے زیادہ آگاہ ہے، اسی وقت سے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، اور جس وقت کہ تم جنینوں کی صورت میں اپنی ماؤں کے شکم میں تھے (ہو) اعلم بکم اذ انشأکم من الارض واذ انتشر اجنتہ فی بطون امہاتکم“

انسان کی زمین سے خلقت یا تو اس کی پہلی خلقت کے اعتبار سے ہے، جو حضرت آدمؑ کے طریقہ سے ہوئی کہ وہ مٹی سے پیدا ہوئے تھے، یا اس اعتبار سے ہے کہ انسانی وجود کے تشکیل دینے والے تمام مادے زمین سے لئے گئے ہیں، جو تغذیہ کے طریق سے لطف کی ترکیب بندی میں، اور اس کے بعد جنین کی پرورش کے مراحل میں بھی اثر رکھتے ہیں، اور ہر حال مقصد یہ ہے کہ خدا اسی وقت سے جب تمہارے وجود کے ذرات زمین کی مٹی کے درمیان تھے، اور اسی دن سے، جب کہ تم رحم نادر میں، رحم کے تاریک ظلمانی پردوں کے اندر، ایک ناچیز لطف تھے، تمہارے وجود کے تمام جزئیات سے آگاہ تھا، تو ان حالات میں کس طرح ممکن ہے کہ وہ تمہارے اعمال سے بے خبر ہو؟

یہ تعبیر ضمنی طور سے بعد والی گفتگو کے لیے ایک مقدمہ ہے جس میں وہ فرماتا ہے: ”پس تم خود ستائی نہ کرو اور اپنے پاک اور ظاہر ہونے کے بارے میں باتیں نہ بناؤ، کیونکہ وہ پرہیزگاروں کو سب سے بہتر طور سے جانتا ہے“ (فلا تنزکوا انفسکم ہوا علم بمن اتقی)۔

نہ تو اسے تمہارے تعارف کی ضرورت ہے، اور نہ ہی تمہارے نیک اعمال کی تشریح و تفصیل کی، وہ تمہارے اعمال

سے بھی آگاہ ہے، اور تمہاری نیت کے خلوص کی میزان سے بھی، یہاں تک کہ وہ تمہیں خود تم سے بہتر طور پر پہچانتا ہے، اور تمہارے اندرونی صفات اور بیرونی اعمال سے بخوبی آگاہ ہے۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ایسے گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو نماز و روزہ کو انجام دینے کے بعد اپنی تشریف کرنے لگتے تھے اور کہا کرتے تھے، : ہمارے نماز اس طرح کی تھی، اور ہمارا روزہ ایسا تھا، تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انہیں اس کام سے منع کیا۔

چند نکات

۱۔ خدا کا علم بے پایاں

ان آیات میں علم خدا اور اس کی بے انتہا وسعت کی طرف پھر اشارہ ہوا ہے، لیکن یہ تعبیر ایک نئی تعبیر ہے، کیونکہ اس میں دو نکتوں پر تکیہ کیا گیا ہے جو انسان کے نفسی ترین اور پیچیدہ ترین حالات میں سے ہے: مٹی سے انسان کی خلقت کی حالت، جس میں ابھی تک ماہر علماء کی عقلیں حیران ہیں، کہ ایک زندہ موجود کا بے جان موجود سے وجود میں آنا کس طرح ممکن ہے؟ اس قسم کا کوئی امر گزشتہ زمانہ میں قطعی اور یقینی طور پر واقع ہوا ہے۔ خواہ انسان کے بارے میں ہوا ہو یا دوسرے جانداروں کے بارے میں، لیکن کن حالات میں ایسا ہوا یہ معلوم نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور پراسرار ہے، کہ ابھی تک اس کے اسرار نوع بشر کے علم و دانش سے پوشیدہ چلے آ رہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ جنینی دور میں وجود انسانی کی اسرار آمیز تبدیلیوں کا ہے، کہ وہ بھی انسان کی خلقت کی کیفیات میں سے پراسرار ترین حالت ہے، اگرچہ انسان کے علم و دانش کے لیے اس کا ایک ہیولہ سا کشف ہو چکا ہے، لیکن جنین کے بارے میں اسرار آمیز مسائل، اور جواب کے بغیر رہے ہوئے سوالات تاحال بھی کم نہیں ہیں۔

وہ ہستی جو انسان کے وجود کی ان دونوں حالتوں کے تمام اسرار، اور اس کی تبدیلیوں اور تغیرات سے آگاہ ہے، اور اس کی ہدایت و رہبری اور تربیت کرتی ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کے اعمال و افعال سے باخبر نہ ہو اور ہر کسی کو اتنی جزا نہ دے جو اُس کے لیے لازم ہے؟

پس یہ علم بے پایاں اس کی عدالت مطلقہ کا سہارا ہے۔

۲۔ کیا اثر الائم کیا ہے؟

گناہانِ کبیرہ کے بارے میں جن کی طرف چند آیاتِ قرآن میں اشارہ ہوا ہے، اُسے ایک طرف تو مفسرین نے اور دوسری طرف فقہاء اور محدثین نے بہت اختلاف کیا ہے۔

بعض تو سب گناہوں کو ہی کبیرہ کہتے ہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں ہر گناہ بڑا ہے۔ جب کہ بعض دوسروں نے ”کبیرہ“ اور ”صغیرہ“ کو ایک ان نسبتی گردانا ہے، اور وہ ہر گناہ کو زیادہ اہم گناہ کے مقابلہ میں صغیر سمجھتے ہیں، اور چھوٹے گناہ کی نسبت کبیرہ جانتے ہیں۔

بعض نے کبیرہ ہونے کا معیار، اس کے لیے تن فرائض میں عذاب الہی کو سمجھا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر وہ گناہ ”گناہ کبیرہ“ ہے، جس کے لیے شرعی حد جاری ہوتی ہے۔ لیکن سب سے بہتر بات یہ ہے، کہ یہ کہا جائے، کہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ ”کبیرہ“ کی تعبیر عظمت گناہ کی دلیل ہے، لہذا ہر وہ گناہ جس میں ذیل کی شرائط پائی جاتی ہوں، گناہ کبیرہ شمار ہوگا؛

الف : وہ گناہ جن پر خدا نے عذاب کی دھمکی دی ہے۔

ب : وہ گناہ جو اہل شرع کی نظریں اور روایات کی زبان میں کبیرہ کہے گئے ہیں۔

ج : وہ گناہ جو مناجات شرعی میں ان گناہوں سے بڑے شمار ہوئے ہیں جو کبائر کا حصہ ہیں۔

د : اور آخر میں وہ گناہ جن کے کبیرہ ہونے کی معتبر روایات میں تصریح ہوئی ہے۔

اسلامی روایات میں کبائر کی تعداد مختلف بیان کی گئی ہے، بعض میں ان کی تعداد سات گناہ ہیں، رقتل نفس، عقوق والدین، سود خوری، ہجرت کے بعد دار الکفر کی طرف پلٹ جانا، پاک دامن عورتوں کی طرف زنا کی نسبت دینا، یتیم کا مال کھانا، اور جہاد سے فرار کرنا۔

اور بعض دوسری روایات میں اس کی تعداد، اس فرق کے ساتھ سات گناہ شمار ہوئی ہے، کہ عقوق والدین کی جگہ ”کلما اوجب اللہ علیہ النار“ (ہر وہ گناہ جس پر خدا نے جہنم واجب کی ہے) ذکر ہوا ہے۔

بعض دوسری روایات میں اس کی تعداد دس شمار ہوئی ہے، اور بعض میں انیس، اور بعض میں بہت زیادہ تعداد نظر آتی ہے۔

کبائر کی تعداد کے شمار کرنے میں یہ فرق اس بنا پر ہے، کہ تمام گناہان کبیرہ بھی یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے بعض زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، دوسرے لفظوں میں وہ اکبر الکبائر ہیں، اس بنا پر ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔

۲۔ خود ستانی اور تنزیہ نفس

اس کام کی برائی اس حد تک ہے کہ یہ مطلب ایک ضرب الش کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ: تزکیۃ المرء بنفسہ قبیحہ ”خود ستانی قبیح اور ناپسندیدہ کام ہے“

۱۔ ”وسائل الشیعہ“ جلد ۱۱ ”البواب جہاد النفس“ باب ۴۶ حدیث ۱۔

۲۔ مزید توضیح کے لیے اوپر والے مد رک (باب ۴۶ از ابواب جہاد النفس) کی طرف رجوع کریں وہاں کبائر کے تعین کے بارے میں ۲ احادیث ذکر ہوئی ہیں۔

اس ناپسند عمل کا اصلی سرچشمہ اپنے آپ کو ناہم چنانا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنے آپ کو اچھی طرح پہچان لے، پروردگار کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے پن کو، اور اپنے ذمہ سنگین ذمہ داریوں کے مقابلہ میں اپنے اعمال کے ناچیز ہونے کو، اور ان عظیم نعمتوں کو جو خدا نے اُسے بخشی ہیں جان لے، تو پھر وہ ہرگز خود ستائی کی راہ میں قدم نہیں رکھے گا۔

غرور و غفلت، اور خود کو بڑا سمجھنا، اور زمانہ جاہلیت کے افکار بھی اس قبیح کام کے لیے دوسرے اسباب و محرکات ہیں۔ خود ستائی چونکہ اپنے کامل ہونے کے عقیدہ کو بیان کرتی ہے، لہذا پیچھے رہ جانے اور پس ماندگی کا سبب بن جاتی ہے۔ کیونکہ تکامل و ارتقاء کا رمز اپنی تقصیر و کوتاہی کا اعتراف، اور نقائص اور کمزوریوں کے وجود کو قبول کرنا ہے۔ اسی بنا پر اویسائے خدا ہمیشہ خدائی وظائف اور ذمہ داریوں کے مقابلہ میں اپنی تقصیر و کوتاہی کے معترف رہتے تھے اور لوگوں کو خود ستائی اور اپنے اعمال کو بڑا سمجھنے سے منع کیا کرتے تھے۔

ایک حدیث میں امام باقر سے زیر بحث آیت (فلا ترکوا انفسکم) کی تفسیر میں آیا ہے:

لا یفتخر احدکم بکثرة صلاته وصیامہ وزکوٰتہ ونسکہ لان اللہ عزوجل اعلم بمن اتقی؛

”تم میں سے کوئی بھی شخص اپنی نماز و روزہ و زکوٰۃ اور مناسک حج و عمرہ کے زیادہ ہونے پر فخر نہ کرے کیونکہ خدا تم میں سے پرہیزگاروں کو سب سے بہتر جانتا ہے۔“

امیر المؤمنین علیہ السلام، معاویہ کے نام اپنے ایک خط میں، جس میں بہت ہی اہم مسائل تحریر کئے تھے، فرماتے ہیں:

ولولا ما انھی اللہ عنہ من تزکیۃ المرء نفسه لذكر ذکر فضائل جمۃ، تعرفها قلوب المؤمنین، ولا تمجھا اذان السامعین

”اگر یہ بات نہ ہوتی کہ خدا نے خود ستائی سے منع کیا ہے، تو بیان کرنے والا اپنے بہت سے ایسے فضائل کو شمار کرتا جن سے آگاہ تو منین کے دل آشنا ہیں اور سننے والوں کے کانوں کو ان کے سننے سے انکار نہیں ہے۔ (بیان کرنے والے سے مراد خود امام علیہ السلام ہیں)“

اس سلسلہ کی ایک تفصیلی بحث جلد ۲ سورۃ نساء کی آیت ۴۹ کے ذیل میں بھی آچکی ہے۔

یہاں یہ بات واضح کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ بعض اوقات ضرورتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان اپنے تمام امتیازات و خصوصیات کے ساتھ جو اس میں پائی جاتی ہیں اپنا تعارف کر لے کیونکہ اس کے بغیر مقدس اہداف و مقاصد پامال ہو جاتے ہیں اس قسم کی باتوں اور خود ستائی اور تزکیہ نفس کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے۔

اس بات کا نمونہ امام سجاد کا مسجد شام (دمشق) کا وہ خطبہ ہے۔ جبکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ اپنا اور اپنے خاندان و اہل بیت

کاشام کے لوگوں سے تعارف کرائیں تاکہ شہدائے کربلا کے خارجی ہونے کے سلسلہ میں بنی امیہ کا سازشی منصوبہ ناکام، اور ان کے شیطانی منصوبے نقش بر آب ہو جائیں۔

ایک روایت میں امام صادقؑ سے بھی منقول ہوا ہے کہ جب لوگوں نے آپؑ سے خود ستائی اور اپنی تعریف آپؑ کرنے کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

”بعض اوقات کچھ ضرورتوں کی وجہ سے لازمی ہو جاتی ہے“

اور اس کے بعد آپؑ نے انبیاء کے کلام سے دو مواقع جو قرآن میں آئے ہیں، استدلال میں پیش کئے۔

پہلے یوسفؑ جنہوں نے عزیز مصر کو یہ تجویز پیش کی، کہ وہ انہیں ملک مصر کا خزانہ دار بنائے، تو انہوں نے کہا:

انہی حفیظ علیہم (یوسف - ۵۵)

”میں ایک آگاہ اور صاحب علم نگہبان ہوں“

اور دوسرا خدا کے عظیم پیغمبر ”ہود“ کے بارے میں جنہوں نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

انا لکم ناصح امین۔ (اعراف - ۶۸)

”میں تمہارے لیے امین خیر خواہ ہوں“

- ۳۳۔ اَفَرَأَيْتَ الَّذِي تَوَلَّى ۝
 ۳۴۔ وَاعْطَى قَلِيلًا وَاكْثٰدًى ۝
 ۳۵۔ اَعِنْدَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهٖو يَرِى ۝
 ۳۶۔ اَمْ لَمْ يُنَبِّاْ بِمَا فِى صُحُفِ مُوسٰى ۝
 ۳۷۔ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِى وَفٰى ۝
 ۳۸۔ اَلَا تَذَكَّرُ ۝ وَاِزْرًا وَاُخْرٰى ۝
 ۳۹۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَسٰغٰى ۝
 ۴۰۔ وَاَنْ سَعِيَةً سَوْفَ يَرِى ۝
 ۴۱۔ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَاءُ الْاَوْفٰى ۝

ترجمہ

- ۳۳۔ کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اسلام (یا النفاق) سے روگردانی کی؟
 ۳۴۔ اور تھوڑا سا دیا اور زیادہ کو روک لیا۔
 ۳۵۔ کیا اس کے پاس علم غیب ہے اور اس نے دیکھ لیا ہے (کہ دوسرے اس کے گناہوں کو اپنے کندھے پر لے سکتے ہیں)؟
 ۳۶۔ کیا وہ اس سے باخبر نہیں ہوا ہے کہ جو موسیٰ کی کتابوں میں نازل ہوا ہے؟
 ۳۷۔ اور اسی طرح ابراہیم کی کتابوں میں جس نے اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سے ادا کیا تھا۔

- ۲۸۔ کہ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں لے گا۔
 ۲۹۔ اور یہ کہ انسان کے لیے اس کی اپنی سعی و کوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے۔
 ۳۰۔ اور یہ کہ اس کی سعی و کوشش عنقریب دیکھی جائے گی (اور وہ اس کا نتیجہ پالے گا)۔
 ۴۱۔ اس کے بعد اسے پوری پوری جزا دی جائے گی۔

شان نزول

اکثر مفسرین نے اوپر والی آیات کے لیے علیحدہ علیحدہ شان نزول نقل کئے ہیں، لیکن یہ شان نزول آپس میں ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ مشہور ہیں وہ ذیل کی دو شان نزول ہیں :

۱۔ ان آیات میں عثمان کا واقعہ بیان ہوا ہے، اس کے پاس بہت زیادہ مال و دولت تھی، اور وہ اپنے مال میں سے خرچ کیا کرتا تھا، اس کے رشتہ داروں میں سے ایک "عبد اللہ بن سعد" نامی شخص نے کہا، اگر تیری یہی حالت رہی، تو ایک دن تیرے پاس کچھ بھی باقی نہ بچے گا، عثمان نے کہا، میں نے بہت گناہ کئے ہیں، لہذا میں چاہتا ہوں کہ اس ذریعہ سے خدا کی رضا اور عفو و بخشش حاصل کروں عبد اللہ نے کہا، اگر تو اپنی سواری کا ادھڑ اس کے ساز و سامان سمیت مجھے دے دے تو میں تیرے سارے گناہ اپنی گردن پر لے لیتا ہوں، عثمان نے ایسا ہی کیا، اور اس قرار واد پر گواہ لے لے، اور اس کے بعد اس نے اتفاق کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا، رتو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس کام کی شدت سے مذمت کی اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ کوئی شخص دوسرے کے بارگناہ کو اپنے کندھے پر نہیں لے سکتا، اور ہر شخص کی سعی و کوشش کا نتیجہ خود اسی کو ملے گا۔

۲۔ یہ آیت "ولید بن معینہ" کے بارے میں ہے، وہ پیغمبر کے پاس آیا، اور دین اسلام سے قربت حاصل کی تو بعض مشرکین نے اسے سرزنش کی اور کہا کہ تو نے ہمارے بزرگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور انہیں گمراہ شمار کرتا ہے، اور تو نے یہ گمان کیا کہ وہ جہنم کی آگ میں ہیں۔ اس نے کہا کہ واقعاً میں خدا کے عذاب سے ڈر گیا ہوں، تو سرزنش کرنے والے نے کہا اگر تو اپنے مال کا کچھ حصہ مجھے دے دے اور شرک کی طرف ہٹ آئے تو میں تیرا عذاب اپنی گردن پر لے لیتا ہوں ولید بن معینہ نے ایسا ہی کیا، لیکن جو مال دینا تھا اس میں سے تھوڑے سے حصہ کے سوا ادا نہ کیا، تو اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور ولید کے

۱۔ اس شان نزول کو طبرسی نے "معجم البیان" میں نقل کیا ہے، اور دوسرے مفسرین مثلاً "تفسیر" نے "کشاف" میں "نقرازی" نے "تفسیر کبیر" میں بھی نقل کیا ہے "طبرسی" نے اسے نقل کے بعد مزید کہا ہے، کہ یہ شان نزول ابن عباس، کلبی اور مفسرین کی ایک جماعت سے نقل ہوئی ہے۔

ایمان سے منہ پھیرنے پر مذمت کی آیت

تفسیر

ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

گزشتہ آیات میں اس سلسلہ میں گفتگو تھی کہ خدا بدکاروں کو ان کے برے کاموں کے بدلے میں سزا اور عذاب کرے گا اور نیکو کاروں کو اجر دے گا چونکہ ممکن ہے بعض یہ تصور کر لیں کہ کسی کو کسی دوسرے کے بدلے میں بھی سزا ہو جاتی ہے۔ یا کوئی دوسرے کے گناہ اپنی گردن پر لے لیتا ہو، تو یہ آیات اس توہم کی نفی میں آتی ہیں، اور اس اہم اسلامی اصل کی کہ ہر شخص کے اعمال کا نتیجہ صرف اسی کی طرف لوٹتا ہے تشریح کرتی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: ”کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اسلام (یا انفاق) سے منہ پھیر لیا ہے“ (افروءیت الذی تولیٰ)۔

”اور تھوڑا سا مال دیا اور انفاق (یا مزید مال دینے سے) ہاتھ روک لیا“ (اس گمان سے کہ دوسرا اس کے گناہ کے بوجھ کو اپنے کندھے پر اٹھا سکتا ہے) (واعطیٰ قلیلاً واکذیٰ)۔
”کیا وہ علم غیب رکھتا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ دوسرے اس کے گناہوں کو اپنے کندھے پر لے سکتے ہیں؟“ (اعندہ علم الغیب فهو یرئی)۔

قیامت کے دن سے پلٹ کر کون آیا ہے اور ان کے لیے یہ خبر لایا ہے کہ لوگ رشوت لے کر دوسروں کے گناہ اپنی گردن پر لے سکتے ہیں؟ یا کون شخص خدا کی طرف سے آیا ہے اور انہیں یہ خبر دی ہے کہ خدا اس معاملہ پر راضی ہے؟ کیا اس کے سوا بھی کوئی اور بات ہے کہ انہوں نے کچھ اوہام دل سے گھڑ لیے ہیں، اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کرنے کے لیے انہوں نے خود کو ان اوہام کے تانے بانے میں پھنسا دیا ہے؟

اس شدید اعتراض کے بعد، قرآن ایک اصل کلی کو جو باقی آسانی دینوں میں بھی آئی ہے پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: ”کیا وہ شخص جس نے ان خیالی وعدوں پر“ (انفاق) (یا ایمان) سے ہاتھ اٹھا لیا ہے، اور وہ یہ چاہتا ہے کہ مختصر سا مال ادا کر کے خود کو خدائی عذاب سے رہائی دلا لے؟“ ”کیا وہ اس سے جو موسیٰ کی کتابوں میں نازل ہوا ہے باخبر نہیں ہوا ہے؟“

۱۔ اس شان نزول کو بھی ”محج البیان“، ”قرطبی“، ”روح البیان“، ”روح المعانی“ اور بعض دوسری تفاسیر میں نقل کیا گیا ہے۔

۲۔ ”اکذیٰ“ اصل میں ”کذیبہ“ (دروزن جبرہ زمین کی سختی اور صلابت کے معنی میں ہے اس کے بعد مسک اور خیل لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔

(ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ)۔

اور اسی طرح جو کچھ ابراہیم کی کتاب میں نازل ہوا ہے۔ ”وہی ابراہیم جس نے اپنی ذمہ داری کو مکمل طور پر پورا کیا ہے“ (و ابراہیم الذی وفی)۔

وہی عظیم پیغمبر جس نے خدا کے تمام عہد اور بیانیوں کو پورا کیا، اس کے حق رسالت کو ادا کیا، اور اس کے دین کی تبلیغ کے سلسلہ میں کسی مشکل، تہدید اور آزار سے ہر سال نہیں ہوا، وہی شخص جو کئی امتحانات سے گزرا، یہاں تک کہ اپنے بیٹے کو خدا کے حکم سے قربانگاہ میں لے گیا اور اس کے گلے پر پھری رکھ دی۔ اور ان تمام امتحانوں سے سربلند اور سرفراز ہو کر باہر آیا، اور خدا نے اُسے مخلوق کی رہبری و امامت کا بلند مقام عطا فرمایا جیسا کہ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں آیا ہے: واذ ابلیٰ ابراہیم ربہ بکلمات فاتمهن قال انی جاعلک للناس امامًا: اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے ابراہیم کو چند احکام کے ذریعہ آزمایا، اور وہ ان تمام امتحانات سے عمدہ برآ ہوئے اور انہیں مکمل کر دیا تو خدا نے اُن سے فرمایا کہ میں نے تجھے لوگوں کا امام و پیشوا قرار دیا۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی وضاحت میں یہ کہا ہے: بذل نفسه للنیران، وقلیہ للرحمن، وولده للقریان و مالہ للانصوان، ”ابراہیم نے راہ خدا میں اپنا نفس آگ کے حوالے کر دیا اور اپنا دل خدائے رحمن کے لیے اور اپنا بیٹا قربانی کے لیے اور اپنا مال بھائیوں اور دوستوں کے لیے خرچ کیا۔“

”کیا اسے یہ خبر نہیں دی گئی کہ ان تمام کتب آسمانی میں یہ حکم نازل ہوا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے دوش پر نہیں لیتا؟“ (الآنزور وازرة وذر اخوی)۔

”وزر“ اصل میں ”وزر“ (بروزن خطر) سے لیا گیا ہے، جو پہاڑی پناہ گاہوں کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد لفظ ”وزر“ بھاری بوجھ کے لیے استعمال ہونے لگا، اس شباہت کی وجہ سے جو وہ پہاڑ کے بڑے بڑے پتھروں سے رکھتا ہے اس کے بعد گناہ پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے کیونکہ وہ ایک بھاری بوجھ انسان کے کندھے پر ڈال دیتا ہے۔

”وازرۃ“ سے مراد وہ انسان ہے جو گناہ کے بوجھ کو اٹھاتا ہے۔

اس کے بعد مزید توضیح کے لیے کہتا ہے: ”کیا اسے اس بات کی خبر نہیں ہے کہ ان آسمانی کتابوں میں یہ آیا ہے کہ انسان کے لیے اس کی سعی اور کوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے“ وان لیس للانسان الا ما سألی۔

”سألی“ اصل میں تیزی کے ساتھ راستہ چلنے کے معنی میں ہے۔ جو دوڑنے کے مرحلہ تک نہ پہنچا ہو۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ

۱۔ ”و فی“ ”توفیہ“ کے مادہ سے، بذل اور مکمل ادائیگی کے معنی میں ہے۔

۲۔ ”روح الیابان“ جلد ۹ ص ۲۴۶۔

۳۔ ”وازرۃ“ کا معنی ہونا اس بنا پر ہے کہ یہ نفس کی صفت ہے جو محذوف ہوا ہے، اور اسی طرح اخڑی کا معنی ہونا بھی۔

۴۔ ”ما سألی“ میں ”ما“ مصدر یہ ہے۔

سعی و کوشش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کیونکہ کاموں میں سعی و کوشش کہے وقت انسان تیز حرکات انجام دیتا ہے، چاہے وہ نیک کام ہو یا بُرا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ نہیں فرماتا، کہ انسان کے حصہ میں وہ کام ہے جو اس نے انجام دیا ہے، بلکہ فرماتا ہے کہ وہ سعی و کوشش جو اس نے کی ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہم چیز سعی و کوشش ہے، چاہے انسان وقتی طور سے اپنے مقصد اور مقصود تک نہ پہنچے، کیونکہ اگر اس کی نیت نیک ہے تو خدا اس کو اچھا اجر دے گا، کیونکہ وہ تو نیتوں اور ارادوں کا خریدار ہے، نہ کہ صرف انجام شدہ کاموں کا۔

”اور کیا اسے اس بات کی خبر نہیں ہے کہ اس کی سعی و کوشش عنقریب دیکھی جائے گی؟“ (رواق سغیہ سوف یرضی)۔

نہ صرف اس سعی و کوشش کے نتائج، چاہے وہ خیر کی راہ میں ہوں یا شر کی راہ میں، بلکہ خود اس کے اعمال اس دن اس کے سامنے آشکار ہوں گے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرماتا ہے، ”یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضاً،“ وہ دن جس میں ہر شخص ان نیک اعمال کو جنہیں اس نے انجام دیا ہے حاضر پائے گا۔ (آل عمران۔ ۳۰)

اور قیامت میں نیک و بد اعمال کے مشاہدہ کے بارے میں بھی سورۃ زلزال کی آیت، ”۸۰ میں آیا ہے، (فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ)“ جس شخص نے ذرہ برابر بھی خیر و نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا، اور جس نے ذرہ برابر بُرا کام کیا تو وہ اسے بھی دیکھے گا۔

”اس کے بعد اس کے عمل کے لیے اسے پوری پوری جزا دی جائے گی“ (تشریح جزاء الجزاء الاوفیٰ)۔
 ”جزاء اوفیٰ“ سے مراد وہ جزا ہے جو ٹھیک ٹھیک عمل کے عین مطابق ہو، البتہ یہ بات نیک اعمال کے سلسلہ میں تفضل الہی کے ساتھ دس گنا یا کئی سو گنا یا کئی ہزار گنا سے اختلاف نہیں رکھتی، اور یہ جو بعض مفسرین نے ”جزاء اوفیٰ“ کو حنات کے بارے میں زیادہ اجر کے معنی میں لیا ہے، صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ یہ آیت گناہوں کو بھی شامل ہے، بلکہ آیت کی اصلی گفتگو ہی وزر اور گناہ کے بارے میں ہے (غور کیجئے)

لے ”یجزی“ کا نائب فاعل ایک ضمیر ہے جو ”انسان“ کی طرف لٹتی ہے اور اس سے متصل ضمیر ”عمل“ کی طرف لٹتی ہے حرف جر کے حذف کے ساتھ اور تقدیر میں اس طرح تھا، ”تجزی الانسان بعمله راو علی عمله“ (الجزاء الاوفیٰ ”تجزی“ کثاف“ میں کہتا ہے، ممکن ہے کہ تقدیر میں حرف جر نہ ہو، کیونکہ ”یجزی العبد سعیہ“ کہا جاتا ہے (لیکن توجہ رکھنی چاہیے کہ عام طور پر ”جزاء اللہ علی عملہ“ کہا جاتا ہے ”جزاء اللہ عملہ“ صحیح نہیں ہے) اور ”الجزاء الاوفیٰ“ کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ ”تجزی“ کا ایک اور دوسرا مفعول ہو یا مفعول مطلق ہو۔

چند نکات

۱۔ تین اہم اسلامی اصول

اوپر والی آیات میں اسلام کے تین مسلم اصولوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی مسلم اصول کے عنوان سے پہچانے گئے ہیں۔

الف: ہر شخص اپنے گناہوں کا مسئول اور جوابدہ ہے۔

ب: آخرت میں ہر شخص کا حصہ اس کی سعی و کوشش ہی ہے۔

ج: خدا ہر شخص کو اس کے عمل کے مقابلہ میں پوری پوری جزا دے گا۔

اور اس طرح قرآن بہت سے اہم اور خرافات پر جو عام لوگوں میں پائے جاتے ہیں یا بعض مذاہب میں وقتی طور پر ایک عقیدہ کی صورت میں آگئے ہیں، خط بطلان کھینچ رہا ہے۔

قرآن اس طریقہ سے نہ صرف مشرکین عرب کے عقیدہ کی — جو زمانہ جاہلیت میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک انسان دوسرے کے گناہوں کو اپنے ذمہ لے سکتا ہے — نفی کر رہا ہے، بلکہ اس مشہور اعتقاد پر بھی — جو عیسائیوں کے درمیان رائج تھا اور اب بھی ہے، کہ خدا نے اپنے بیٹے مسیح کو دنیا میں اس لیے بھیجا ہے تاکہ وہ سولی پر چڑھ جائے اور آزاد و تکلیف اٹھائے اور گنہگاروں کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر لے لے — خط تینخ کھینچ رہا ہے۔

اسی طرح پادریوں کے ایک گروہ کے برے اعمال کی — جو قرون وسطیٰ میں مغفرت نامے اور استحقاق بہشت کے پروانے بیچا کرتے تھے اور موجودہ زمانہ میں بھی گناہ بخشی کے مسئلہ کو جاری رکھے ہوئے ہے — مذمت کرتا ہے۔

عقل کی منطق بھی اسی چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ ”ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اور اپنے ہی اعمال سے نفع پائے گا۔“

یہ اسلامی عقیدہ اس بات کا سبب بنتا ہے، کہ انسان خرافات کی طرف پناہ لینے، یا اپنا گناہ کسی اور کی گردن میں ڈالنے کے بجائے، اعمال خیر کے لیے سعی و کوشش اور جدوجہد کرے، اور گناہ سے پرہیز کرے، اور جب کبھی اس سے کوئی لغزش ہو جائے اور اس سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو واپس لوٹے اور توبہ کرے اور تلافی مافات کرے۔

انسانوں میں اس تربیتی عقیدہ کی تاثیر مکمل طور پر واضح اور ناقابل انکار ہے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے ان مخرب عقائد کا اثر بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ آیات آخرت کے لیے سعی و کوشش اور دوسرے گھر میں اس کا اجر و پاداش مشاہدہ کرنے کو بیان کر رہی ہیں، لیکن اس کا مدرک اور اصلی معیار دنیا کو بھی اپنے اندر لے لیتا ہے، اس معنی میں کہ اہل ایمان کو دوسروں کے انتظار میں نہیں بیٹھنا چاہیے کہ وہ ان کے لیے کام کریں، اور ان کے معاشرے کی مشکلات کو حل کریں، بلکہ خود کمر ہمت کس کر کھڑے ہو جائیں اور سعی و کوشش کریں۔

ان آیات سے مسائل جزائی و قضاوت کی ایک حقوقی اصل کا بھی استفادہ ہوتا ہے، کہ سزائیں ہمیشہ واقعی اور اصلی گنہگاروں

اور مجرموں کو ہی دی جائیں گی، اور کوئی شخص کسی دوسرے کی سزا کو اپنے ذمہ نہیں لے سکتا۔

۲۔ آیت کے مفاد سے سوء استفادہ

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، یہ آیات گزشتہ اور بعد میں آنے والی آیات کے قرینہ سے، آخرت کے لیے انسان کی سعی و کوشش کو بیان کر رہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ چیز ایک مسلم عقلی حکم کی بنیاد پر ہے، لہذا اس کے نتیجہ کو عمومیت دی جاسکتی ہے، اور دنیا کی کوششوں کو بھی اس میں شامل سمجھا جاسکتا ہے، اور اسی طرح دنیوی اجر و صلہ اور سزاؤں کو بھی۔

لیکن یہ اس معنی میں نہیں ہے، جو سوشلسٹ مکتب کے زیر اثر بعض لوگ اسے سزا کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے، کہ مالکیت صرف کام کے طریقہ سے حاصل ہوتی ہے، اور اس طرح وہ قانون میراث، مضاربہ اور اجارہ و کرایہ وغیرہ پر خط بطلان کھینچ دیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کا دم بھرتے ہیں، اور قرآنی آیات سے استدلال بھی کرتے ہیں، حالانکہ مسئلہ میراث اسلام کے قطعی اصولوں میں سے ہے۔ اور اسی طرح زکوٰۃ و خمس ہیں، حالانکہ نہ تو وارث نے ہی اپنے مورث کے مال کے لیے کوئی سعی و کوشش کی ہے، اور نہ ہی خمس و زکوٰۃ کے مستحقین نے، اور نہ ہی وصیتوں اور نذر وغیرہ کے موارد میں، حالانکہ یہ تمام امور قرآن مجید میں آئے ہیں۔

دوسرے نکتوں میں یہ ایک اصل ہے، لیکن عام طور پر ہر اصل کے مقابلہ میں ایک استثناء ہوتا ہے، مثلاً ”بیٹے“ کا ”باپ“ سے میراث لینا ایک اصل ہے۔ لیکن اگر بیٹا باپ کا قاتل ہو یا اسلام سے خارج ہو جائے تو اسے میراث نہیں ملے گی۔

اسی طرح ہر شخص کی کوشش کے نتیجہ کا اس تک پہنچنا ایک اصل ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اجارہ کی قرارداد کے مطابق جو ایک قرآنی اصول ہے۔ اسے اس چیز کے مقابلہ میں، جس پر طرفین رضامند ہیں، واکزار کر دے، یا وصیت و نذر کے طریق سے کہ یہ دونوں بھی قرآن میں ہیں دوسرے کو منتقل کر دے۔

۳۔ چند سوالات کا جواب

یہاں چند سوال سامنے آتے ہیں جن کا جواب دینا ضروری ہے :

پہلا یہ کہ اگر ہر انسان کا حصہ قیامت میں صرف اس کی سعی و کوشش کا حاصل ہے۔ تو پھر ”شفاعت“ کیا معنی رکھتی ہے ؟

دوسرا یہ کہ سورہ طور کی آیت ۲۱ میں اہل بہشت کے بارے میں آیا ہے : **الْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُم** ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملحق کر دیں گے، حالانکہ ”ذریۃ“ نے تو اس راہ میں کوئی کوشش نہیں کی۔

اس کے علاوہ اسلامی روایات میں آیا ہے کہ جس وقت کوئی شخص اعمال خیر انجام دے تو اس کا نتیجہ اس کی اولاد کو پہنچے گا۔

لے یہ اصل موسیٰ اور شعیب کی داستان میں سورہ قصص آیہ ۲۶ میں آئی ہے۔

ان سب سوالات کا جواب صرف ایک جملہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ: قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان اپنی سعی و کوشش سے زیادہ کا حق نہیں رکھتا، لیکن یہ چیز اس بات میں مانع نہیں ہوگی کہ پروردگار کے لطف اور فضل کے طریق سے لائق افراد کو نعمتیں دی جائیں۔ ”استحقاق“ ایک مفہوم ہے اور ”تفضل“ ایک الگ مفہوم ہے جیسا کہ وہ نیکیوں کی دس گنا، کبھی سو گنا، یا ہزاروں گنا جزا دیتا ہے۔

اس کے علاوہ ”شفاعت“ — جیسا کہ ہم اس کے اپنے مقام پر بیان کر چکے ہیں۔ بے حساب نہیں ہوگی، بلکہ وہ بھی ایک قسم کی سعی و کوشش اور شفاعت کرنے والے کے ساتھ معنوی رابطہ پیدا کرنے کی محتاج ہے۔ اسی طرح اہل جنت کی اولاد کے ان سے ملحق ہونے کے بارے میں بھی قرآن اسی آیت میں کہتا ہے: ”وَاتَّبِعْتَهُمْ ذُرِّيَّتَهُمْ بَايِمَانَ“ یہ اس صورت میں ہے جب کہ ان کی اولاد ایمان میں ان کی پیروی کرے۔

۴۔ صحف ابراہیم و موسیٰ

”صحف“ جمع ہے ”صحفہ“ کی جو اصل میں ہر وسیع چیز کے معنی میں ہے، اس لیے صورت کو ”صحفۃ الوجہ“ کہتے ہیں اس کے بعد کتاب کے صفحات پر بھی اطلاق ہوا ہے۔ ”صحف موسیٰ“ سے مراد اوپر والی آیت میں وہی تورات ہے، اور ”صحف ابراہیم“ بھی ان کی آسمانی کتاب کی طرف اشارہ ہے۔

مرحوم طبرسی نے ”مجمع البیان“ میں سورۃ اعلیٰ کی تفسیر میں ایک حدیث پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل کی ہے، جس کا خلاصہ اس طرح ہے:

ابوذر سوال کرتے ہیں: خدا کے پیغمبر کتنے ہوئے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار

پھر سوال کیا: ان میں سے رسول کتنے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: تین سو تیرہ ہیں اور باقی نبی ہیں (رسول وہ ہوتا ہے جو ابلاغ و انداز پر مامور ہو جب کہ نبی کا مفہوم عام ہے)

پھر سوال کیا: کیا آدمؑ پیغمبر تھے؟

آپؐ نے فرمایا: ہاں! خدا نے ان سے کلام کیا اور انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا کیا۔

پھر پوچھا: خدا نے کتنی کتابیں نازل کیں؟

آپؐ نے فرمایا: ایک سو چار کتابیں: دس صحیفہ آدمؑ پر، پچاس صحیفہ شیثؑ پر، تیس صحیفہ ادریسؑ پر، دس صحیفہ ابراہیمؑ پر

(جو مجموعی طور پر ایک سو صحیفے بنتے ہیں) اور تورات و انجیل و زبور و قرآنؐ لے

۵۔ گزشتہ کتب میں اعمال کے مقابلہ میں اصل مسئولیت

قابل توجہ بات یہ ہے کہ موجودہ تورات میں کتاب ”حزقیل“ میں بھی زیر بحث آیت کا کچھ مضمون آیا ہے، کیونکہ وہ اس طرح ہے:

”وہی جان جو گناہ کرے گی، وہی مرے گی، بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور باپ بیٹے کے گناہ کا بار نہیں اٹھائے گا“^۱

یہی مفہوم خصوصیت کے ساتھ قتل کے بارے میں ”تورات“ کے سفر تثنیہ میں بھی آیا ہے: ”باپ اولاد کے بدلے میں قتل نہیں کئے جائیں گے، اور اولاد بھی باپوں کے بدلے میں قتل نہیں کی جائیں گی، ہر شخص اپنے گناہ کے سبب ہلاک ہوگا۔“^۲

البتہ گزشتہ انبیاء کی کتابیں مکمل طور پر اس وقت ہمارے پاس نہیں ہیں، ورنہ اس اصل کے بارے میں بہت سی باتیں بھی مل جاتیں۔

^۱ کتاب ”حزقیل“ فصل ۱۸ ص ۲۰

^۲ ”تورات“ سفر ”تثنیہ“ باب ۲۴ شمارہ ۱۶۔

- ۴۲- وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ ۝
 ۴۳- وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَىٰ ۝
 ۴۴- وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتَ وَأَحْيَا ۝
 ۴۵- وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝
 ۴۶- مِن نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ۝
 ۴۷- وَأَنَّ عَلَيْهِ النَّشْأَةَ الْآخِرَىٰ ۝
 ۴۸- وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ وَأَقْنَىٰ ۝
 ۴۹- وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشَّعْرَىٰ ۝

ترجمہ

۴۲- (اور کیا گزشتہ انبیاء کی کتابوں سے اسے پتہ نہیں چلا) کہ تمام امور تیرے پروردگار کی طرف لوٹتے ہیں۔

۴۳- اور وہی ہے جو ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی۔

۴۴- اور وہی ہے جو مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔

۴۵- اور وہی ہے جو دو دو جوڑے مذکر اور مؤنث کے پیدا کرتا ہے۔

۴۶- اس نطفہ سے جو نکلتا ہے (اور رحم میں گرتا ہے)۔

۴۷- اور یہ کہ خدا ہی پر ہے دوسرے عالم کا ایجاد کرنا (تاکہ عدالت کا اجرا ہو)۔

- ۴۸۔ اور یہ کہ وہی ہے جو بے نیاز کرتا ہے، اور باقی رہنے والا سرمایہ عطا کرتا ہے۔
۴۹۔ اور یہ کہ وہی ہے ”ستارہ شعری“ کا پروردگار۔

تفسیر

تمام خطوط اسی تک پہنچتے ہیں

یہ آیات خدا کی ان صفات کی تجلی گاہ ہیں جو مسئلہ توحید کو بھی واضح کرتی ہیں اور مسئلہ معاد کو بھی۔
ان آیات میں گزشتہ مباحث کو جاری رکھتے ہوئے جڑائے اعمال کے سلسلہ میں فرماتا ہے: ”کیا انسان کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ صحف موسیٰ و ابراہیم میں یہ آیا ہے کہ تمام امور تیرے پروردگار پر منتھی ہوتے ہیں“ (و ان الی ربك المنتھی)۔

نہ صرف حساب و کتاب، ثواب و عقاب اور جزا و سزا آخرت میں اس کے درست قدرت میں ہے، بلکہ اس جہان میں بھی اسباب و علل کا سلسلہ اس کی پاک ذات تک جا کر منتھی ہوتا ہے، اس جہان کی تمام تدبیریں اس کی تدبیر سے پیدا ہوتی ہیں اور بالآخر عالم ہستی کی تکمیل گاہ اور اس کی ابتدا و انتہا خدا ہی کی پاک ذات ہے۔

بعض روایات میں اس آیت کی تفسیر میں امام صادقؑ سے اس طرح آیا ہے:
اذا انتھی الکلام الی اللہ فامسکوا^۱

”جس وقت گفتگو خدا کی ذات تک پہنچ جائے تو چپ ہو جاؤ۔“

یعنی اس کی ذات کے بارے میں گفتگو نہ کرو، کیونکہ عقلیں اس میں حیران ہیں۔ اور کہیں پہنچ نہیں پاتیں، اور ایک غیر محدود ذات کے بارے میں سوچ بچار کرنا محدود عقول کے لیے ناممکن ہے۔ کیونکہ جو کچھ تمہاری فکر میں آئے گا وہ بھی محدود ہی ہوگا، اور خدا کے لیے محال ہے کہ وہ محدود ہو جائے۔

البتہ یہ تفسیر اس آیت کے لیے ایک دوسرا بیان ہے جو اس بات سے جو ہم نے بیان کی ہے اختلاف نہیں رکھتی، اور دونوں آیت کے معنی جمع ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد امر بربوبیت میں اس کی حاکمیت، اور اس جہان کے تمام امور کے اس کی ذات پاک تک منتھی ہونے کو واضح کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: وہی ہے کہ جو ہنساتا بھی ہے اور لاتا بھی“ (وانہ هو اضعفک و ابکی)۔^۲

۱۔ تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۷۰۔

۲۔ یہ افعال اگرچہ ماضی کی صورت میں ہیں لیکن مستقبل کا معنی دیتے ہیں۔

”اور وہی ہے جو مارتا بھی ہے اور زندہ بھی کرتا ہے“ (وانہ هو امات واحیا)۔
 ”اور وہی ہے جو دودو جوڑے مذکر اور مونث کے پیدا کرتا ہے“ (وانہ خلق الزوجین الذکر والانثی)۔
 ”اس نطفہ سے جو خارج ہوتا ہے اور قرار گاہ رحم میں گرتا ہے“ (من نطفۃ اذا تمثی)۔
 یہ چند آیات، تمام امور کے پروردگار کی ربوبیت اور تدبیر کی طرف منتفی ہونے والے مسئلہ کے لیے، حقیقتاً ایک جامع بیان اور عمدہ وضاحت ہیں، کیونکہ کہتا ہے: تمہاری موت اور زندگی اسی کے ہاتھ میں ہے، زوجین کی خلقت کے طریقہ سے نسل کا جاری رہنا بھی اسی کی تدبیر سے ہے، اسی طرح وہ تمام حوادث جو انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں، اس کی طرف سے ہیں۔ وہی رلاتا اور ہنساتا ہے، وہی مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ اور اس طرح سے سررشتہ زندگی آغاز سے لے کر انجام تک اس کی پاک ذات پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔
 ایک حدیث میں اس آیت کے ہنسنے اور رونے کے مفہوم کو وسعت دی گئی ہے، اور اس کی تفسیر میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ایکی السماء بالمطر، واضحک الارض بالنبات
 ”خدا آسمان کو بارش کے ساتھ رلاتا ہے اور زمین کو نباتات کے ساتھ ہنساتا ہے“ لہ
 بعض شعرا نے اس مضمون کو اپنے شعر میں بیان کیا ہے،

ان فصل الربیع فصل جمیل
 تضحک الارض من بکاء السماء

”فصل بہار ایک خوبصورت فصل ہے“ ”کیونکہ زمین آسمان کے رونے سے ہنسنے لگتی ہے“
 قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال میں سے ہنسنے اور رونے کے مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے، کیونکہ یہ دونوں اوصاف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اور دوسرے جانداروں میں اصلاً اس کا وجود نہیں ہے۔ یا بہت ہی شاذ و نادر ہے۔
 انسانی جسم میں ہنسنے یا رونے کے وقت جو فعل و انفعال اور درگرونی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور ان کا روحانی تغیرات کے ساتھ ارتباط بہت ہی پیچیدہ اور تعجب نیز ہے۔ اور مجموعی طور سے یہ حق تعالیٰ کی مدبریت کی ایک واضح نشانی ہو سکتی ہے، یہ بات اس مناسبت کے علاوہ ہے جو یہ دونوں افعال (ہنسنے اور رونا) موت و حیات کے مسئلہ کے ساتھ رکھتے ہیں۔
 بہر حال خدا کی تدبیر اور ربوبیت پر تمام امور کی انتہا، انسان کے اختیار اور آزادی ارادہ کے ساتھ کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتی، کیونکہ اختیار و آزادی بھی اسی کی طرف سے ہے اور اس تک ہی منتفی ہوتی ہے۔

ان امور کے ذکر کے بعد، جو پروردگار کی ربوبیت اور تدبیر سے مربوط ہیں، امر معا و قیامت کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے،
 ”کیا انسان کو یہ خبر نہیں ہے کہ گزشتہ کتب میں یہ آیا ہے کہ دوسرے عالم کو ایجاد کرنا خدا پر لازم ہے“ (وان علیہ

النشأة الاخری)۔

”نشأة“ آفرینش اور کسی چیز کی تربیت کے معنی میں ہے، ”نشأة اخری“ قیامت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، ”علیہ“ خدا پر لازم ہے، کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ جب خدائے حکیم نے انسانوں کو پیدا کیا، اور ان کے کندھے پر کچھ ذمہ داریاں ڈال دیں، اور سب کو آزادی دے دی، اس عرصہ میں مطیع و غیر مطیع اور ظالم و مظلوم افراد وجود میں آئے، اور کوئی بھی اس جہان میں اپنی اصلی پاداش اور ہزا کو نہیں پہنچا، لہذا اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ ایک ”نشأة ثانیہ“ ہو تاکہ عدالت کی جاسکے۔

علاوہ ازیں ایک حکیم ذات اس وسیع و عریض جہان کو، ان تمام ناملائم اور نامناسب امور کے ساتھ، چند روزہ زندگی کے لیے خلق نہیں کر سکتا، لہذا حتمی اور یقینی طور سے یہ ایک وسیع زندگی کے لیے ہے۔ جو اس وسیع پروگرام کی قیمت ہے۔ ایک مقدمہ ہوگی، یا دوسرے لفظوں میں اگر دوسری زندگی نہ ہو تو اس جہان کی خلقت اپنے اصلی ہدف اور مقصد تک نہیں پہنچ سکتی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ خدانے یہ وعدہ اپنے بندوں کو ایک حتمی وعدہ کے عنوان سے دیا ہے۔ اور اس کے کلام کی صداقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے وعدے پورے ہوں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اور وہی تو ہے جو بندوں کو بے نیاز بھی کرتا ہے اور باقی رہنے والے سرمائے ان کے اختیار میں دیتا ہے“ (وانہ ہوا غنی واقعی)۔

خدائے نہ صرف مادی پہلوؤں میں انسان کی ضروریات اور حاجتوں کو اپنے لطف و کرم سے برطرف کیا ہے، بلکہ ہمیشہ رہنے والے سرمائے بھی اسے عطا کرتے ہیں، کیونکہ معنوی زندگی میں بھی انسانوں کی احتیاجات — تعلیم و تربیت اور تکامل و ارتقاء کے سلسلہ میں — انبیاء و رسل کے بھیجنے اور آسمانی کتب کے نازل کرنے اور معنوی مواہب و نعمات عطا کرنے کے ذریعہ برطرف کی ہیں۔

”اغنی“ ”غنی“ کے مادہ سے بے نیازی کے معنی میں ہے، اور ”اقتنی“ ”قنیہ“ کے مادہ سے (جزیرہ کے وزن پر) ان سرمایوں اور اموال کے معنی میں ہے جنہیں انسان ذخیرہ کرتا ہے، لہ

اس بنا پر ”اغنی“ تو موجودہ حاجات و ضروریات کو پورا کرتا ہے، اور ”اقتنی“ ذخیرہ نعمتوں کی عطائیگی ہے، جو مادی امور میں تو باغ و مالک وغیرہ کے مانند ہے اور معنوی امور میں خدا کی رضا و خوشنودی جیسی باتیں ہیں، جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا عظیم ترین سرمایہ شمار ہوتا ہے۔

یہاں ایک اور تفسیر بھی ہے جو ”اغنی“ کو ”اقتنی“ کے تدریجی مقابل قرار دیتی ہے، یعنی غنی و فقیر اسی کے درست قدرت میں ہیں، اس کی نظیر سورۃ رعد کی آیت ۲۶ میں آئی ہے: اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر: خدا جس

کے لیے چاہتا ہے روزی کو وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے محدود و تنگ کر دیتا ہے۔
لیکن یہ تفسیر اس چیز کے ساتھ جو منابع لغت میں آئی ہے سازگار نہیں ہے اور اوپر والی آیت اس معنی کی شاہد نہیں بن سکتی۔

آخر میں آخری زیر بحث آیت میں فرماتا ہے: ”کیا انسان یہ نہیں جانتا کہ گزشتہ کتب میں یہ آچکا ہے کہ ستارہ شعری کا پروردگار وہی ہے؟“ (وانہ هورب الشعری)۔

”ستارہ شعری“ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر — اس کے علاوہ، کہ یہ ستارہ آسمان کے ستاروں میں سب سے زیادہ چمکنے والا ہے۔ جو عام طور پر سحر کے وقت صورت فلکی ”جوزا“ کے پاس آسمان میں ظاہر ہوتا ہے، توجہ کو مکمل طور سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس سبب سے ہے کہ مشرکین عرب کا ایک گروہ اس کی پرستش کرتا تھا، قرآن کہتا ہے: ہم شعری کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ اس کے پیدا کرنے والے پروردگار کی پرستش کرو۔

ضمنی طور پر توجہ رکھنی چاہیے کہ آسمان میں دو ستارے ہیں جو شعری کے نام سے موسوم ہیں، جن میں سے ایک تو ”جنوب“ کی سمت میں ظاہر ہوتا ہے، اور اسی بنا پر اس کو ”شعرا ییمانی“ کہتے ہیں (کیونکہ یمن جزیرہ عربستان کے جنوب میں ہے) اور دوسرا ”شعرا ی شامی“ جو شمال کی طرف نکلتا ہے، لیکن مشہور وہی ”شعرا ی یانی“ ہے۔
اس ستارہ کی عمدہ خصوصیات کے بارے میں دوسرے مباحث بھی ہیں جو نکات کی بحث میں آئیں گے۔

چند نکات

۱۔ یہ سب سروصدا اسی کی طرف سے ہے
ان آیات کے مباحث حقیقت میں اس معنی کی طرف ایک اشارہ ہیں کہ اس عالم میں ہر قسم کی تدبیر اسی کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہے۔ موت و حیات کے مسئلہ سے لے کر، بے مقدار لطف سے انسان کی پیچیدہ خلقت تک اور اسی طرح سے وہ گونا گوں حادثات جو انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں، جو اُسے کسی نہ کسی طرح سے رلاتے ہیں یا ہنساتے ہیں، یہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہیں۔

آسمان میں درخشندہ ترین ستارے اسی کے فرمان اور اسی کی ربوبیت کے ماتحت ہیں، اور زمین میں انسانوں کی غنا اور بے نیازی بھی اسی کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہے، اور طبعاً ”نشاۃ آخرت“ بھی اسی کے فرمان سے ہے، کیونکہ وہ بھی اس جہان کی زندگی کو جاری رکھنے کے سلسلہ میں ایک جدید زندگی ہے۔

یہ بیان ایک طرف تو خط توحید کو واضح کرتا ہے اور دوسری طرف سے خط معاد و قیامت کو، کیونکہ رحم کے اندر ایک بے مقدار لطف سے انسان کو خلق کرنے والا، اس کو نئے سرے سے زندگی عطا کرنے پر بھی قادر ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ سب چیزیں خدا کی، ”توحید افعالی“ اور ”توحید ربوبیت“ کو بیان کرتی ہیں، ہاں! یہ سب سروصدا اور آواز سے اسی کی طرف سے ہیں۔

۲۔ ستارہ شعری کے عجائبات

یہ ستارہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے آسمان کے ستاروں میں سب سے زیادہ چمکنے والا ستارہ ہے۔ اور ”شعرا می یانی“ کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ یہ جنوب کی سمت ظاہر ہوتا ہے۔ اور مین جزیرہ عرب کے جنوب میں واقع ہے لہذا انہوں نے اس کو یہ نام دیا ہے۔

عربوں کا ایک گروہ جیسے قبیلہ ”خزاعہ“ اس کو مقدس جانتا تھا اور اس کی پرستش کیا کرتا تھا، اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ روئے زمین کے سارے موجودات کا مبداء ہے، اس مسئلہ پر قرآن کی تاکید کہ خدا شعری کا پروردگار ہے اس گروہ اور ان جیسے لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے ہے، کہ انہوں نے مخلوق پر خالق ہونے کا اشتباہ کیا اور مرلوب کو رب کی جگہ قرار دے لیا ہے۔

یہ عجیب الخلق ستارہ جو اپنی حد سے زیادہ درخشندگی کی وجہ سے ستاروں کا بادشاہ کہلاتا تھا، بہت سی عجائبات کا حامل ہے۔ جن میں سے بعض کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس زمانہ میں ستارہ شعری کے بارے میں یہ حقائق دریافت نہیں ہوئے تھے، قرآن کا اس موضوع کو سامنے لانا پُر مہنی ہے۔ الف۔ ان تحقیقات کے مطابق، جو دنیا کے مشہور رصد گاہوں میں عمل میں آئی ہیں، وہ عظیم حرارت جو شعری کی سطح پر پائی جاتی ہے، ۱۲۰ ہزار درجہ سینٹی گراڈ تک معلوم کی گئی ہے۔

جب کہ ہمارے سورج کے کڑھ کی سطح کی حرارت کو صرف ۶۵۰۰ درجہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ چیز ستارہ شعری کی سورج کی نسبت عظیم گرمی کے فرق کا پتہ دیتی ہے۔

ب۔ اس ستارہ کا مخصوص جرم پانی سے تقریباً ۵۰ ہزار گنا زیادہ وزنی ہے۔ یعنی وہاں کے ایک لیٹر پانی کا وزن کڑھ زمین کے ۵۰ ٹن کے برابر ہوگا۔ حالانکہ ہمارے نظام شمسی کے سیاروں میں سے، جو سب سے زیادہ وزنی ہے، اس کا مخصوص وزن پانی کے وزن سے ۶ گنا سے زیادہ نہیں ہے۔

اس تعریف کے باوجود دیکھنا چاہیے کہ یہ عجیب و غریب ستارہ کس عنصر سے بنا ہے جو اس قدر وزنی ہے؟

ج۔ ستارہ شعری جو ہمارے زمانہ میں سردیوں میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن مصر کے قدیم منجمین کے زمانہ میں اس ستارہ کا ظہور گرمیوں کے آغاز کے قریب ہوا کرتا تھا، یہ ایک بہت ہی عظیم کڑھ ہے جس کا حجم کڑھ آفتاب سے ۲۰ گنا ہے، اور اس کا ہم سے فاصلہ زمین سے سورج کے فاصلے کی نسبت انتہائی حد تک زیادہ ہے۔ اس طرح سے کہ اس فاصلہ کو سورج کے فاصلہ سے دس لاکھ گنا حساب کیا گیا۔

ہم جانتے ہیں کہ نور اور روشنی کی رفتار ایک سیکنڈ میں ۳۰۰ ہزار کلومیٹر ہے، اور سورج کی روشنی ۸ منٹ اور ۱۳ سیکنڈ میں ہم تک پہنچتی ہے جب کہ اس کا چاند سے فاصلہ ۱۵ ملین کلومیٹر ہے۔ لیکن اگر آپ تعجب نہ کریں تو کڑھ شعری کی پہلی شعاع ہم تک تقریباً دس (۱۰) سال بعد پہنچتی ہے، تو اب آپ خود حساب کر لیں کہ اس کا فاصلہ کتنا ہے۔

د۔ شعرا می یانی کے ساتھ ایک اور ستارہ ہے، جو آسمان کے موزوں پر اسرار ستاروں میں سے ہے، سب سے

پہلے ”بلبل“ نامی ماہر دانش مند نے اسے دریافت کیا، اور یہ ۱۸۴۴ عیسوی کی بات ہے، لیکن ۱۸۶۲ میں دوربین کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس ستارہ کی گردش کا دور اصلی ستارے کے گرد ۵۰ سال ہے۔
یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن کی تعبیریں کس حد تک پُر معنی ہیں۔ اور اس کی چھوٹی سی چھوٹی باتوں میں کیسے کیسے حقائق چھپے ہوئے ہیں۔ جو اگر اس کے نزدیک کے دن پورے طور پر مشخص نہیں تھے تو زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ واضح ہو گئے ہیں۔

۳۔ پیغمبرؐ کی ایک پُر معنی حدیث

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ایک گروہ کے قریب سے گزرے جو ہنسنے میں مشغول تھا: آپؐ نے فرمایا:
لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا وَلَضَحَكْتُمْ قَلِيلًا
”اگر تم اس چیز کو جانتے جسے میں جانتا ہوں تو تم روتے زیادہ اور ہنستے کم۔“
جس وقت پیغمبرؐ وہاں سے گذر گئے تو جبریلؑ ان پر نازل ہوئے اور عرض کیا۔
إِنَّ اللَّهَ هُوَ ضَحِكٌ وَابْكِي

”ہنسنا اور رونا دونوں خدا ہی کی طرف سے ہیں۔“

پیغمبرؐ ان کے پاس پلٹ آئے اور فرمایا کہ میں چالیس قدم نہیں چلتا تھا کہ جبریلؑ میرے پاس آئے اور کہا: تم ان کے پاس لوٹ کر جاؤ اور ان سے یہ کہو: إِنَّ اللَّهَ ضَحِكٌ وَابْكِي
یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک صاحب ایمان شخص ہمیشہ روتا ہی رہے۔ خوفِ خدا سے اور گناہوں کے ڈر سے رونا بھی اپنی جگہ ضروری ہے اور نشاط اور خوشی کے وقت ہنسنا بھی۔ کیونکہ یہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے۔

بہر حال یہ تعبیرات انسان کے اصل اختیار اور آزادی ارادہ کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتیں، کیونکہ اس بیان کا مقصد علتِ العلل اور ان غرائز و احساسات کے خالق کا بیان ہے۔

اور اگر دوسری جگہ (سورۃ توبہ کی آیت ۸۲ میں) یہ فرمایا ہے کہ: فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ: انہیں چاہیے کہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روتیں ان کاموں کی سزا کی بنا پر جو وہ انجام دیا کرتے تھے ”تو یہ منافقین کے ساتھ مربوط ہے، جیسا کہ اس کے قبل اور بعد کی آیات گواہی دے رہی ہیں۔“

لے دائرۃ المعارف الاسلامیہ“ مادہ شعری اور ”فرہنگ نامہ“ مادہ ستارہ اور ”دائرۃ المعارف فارسی مصاحب“ مادہ شعری۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سورہ کی ابتداء میں تو ستارہ کی قسم کھا رہا ہے اس وقت کہ جب وہ غروب کرتا ہے ،
والنجم اذا ہوا سی اور یہاں شعری کے پروردگار کی قسم ہے جس وقت ہم ان دونوں آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ
رکھ کر دیکھتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ شعری کیوں مبعود نہیں ہو سکتا ، کیونکہ وہ بھی افول و غروب رکھتا ہے اور قوانین خلقت کے
پہنچ میں اسیر ہے ۔

www.sirat-e-mustaqeem.net

- ۵۰۔ وَأَنۢتَ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ ۖ
 ۵۱۔ وَثَمُودَ أَفۢمَآ أَبۢقَىٰ ۖ
 ۵۲۔ وَقَوْمَ نُوحٍ مِّنۢ قَبۢلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمۡ أَظۡلَمَ وَاظۡغَىٰ ۖ
 ۵۳۔ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهۡوَىٰ ۖ
 ۵۴۔ فَغَشَّيۡهَا مَا غَشَّيَ ۖ
 ۵۵۔ فَبِآئِيَ آلِٔكَ تَتَمَارَىٰ ۖ

ترجمہ

- ۵۰۔ (اور کیا انسان کو یہ پتہ نہیں چلا کہ گزشتہ انبیاء کی کتب میں آیا ہے) کہ خدا نے ”پہلی قوم عاد کو ہلاک کر دیا؟“
 ۵۱۔ اور اسی طرح ”قوم ثمود“ کو اور ان میں سے کسی کو باقی نہیں چھوڑا۔
 ۵۲۔ اور ان سے پہلے قوم نوح کو بھی، کیونکہ وہ سب سے زیادہ ظالم اور سب سے زیادہ طوفان اٹھانے والے تھے۔

- ۵۳۔ اور (قوم لوط) کے زیرِ دُورِ بردہ شہروں کو زمین پر دے مارا۔
 ۵۴۔ اس کے بعد انہیں سنگین عذاب کے ساتھ ڈھانپ لیا۔
 ۵۵۔ (کہہ دے) تو اپنے پروردگار کی کوئی نعمت میں شک رکھتا ہے۔

تفسیر

کیا یہ سب درس عبرت کافی نہیں ہیں؟

یہ آیات اسی طرح انہیں مطالب کو جاری رکھے ہوئے ہیں، جو گزشتہ کتب، صحف ابراہیم و موسیٰ سے نقل ہوئی ہیں، گزشتہ آیات میں دس مطالب، دو حصوں میں بیان کیے گئے ہیں، پہلا حصہ ہر شخص کے اپنے اعمال کے لیے مسئولیت اور ذمہ داری کے بارے میں ہے، اور دوسرا حصہ تمام خطوط کے پروردگار تک پہنچی ہونے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اور زیر بحث آیات میں، جو صرف ایک ہی مطلب کو بیان کر رہی ہے وہ گزشتہ چار اقوام میں سے چار قوموں کے عذاب اور دردناک ہلاکت کی بات کرتی ہے، وہ ان لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہے جو گزشتہ احکام سے روگردانی کرتے ہیں اور مبدع و معاد پر ایمان نہیں رکھتے لیکن پہلے فرماتا ہے، ”کیا انسان کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ گزشتہ کتب میں یہ آیا ہے، کہ خدا نے پہلی قوم عاد کو ہلاک کر دیا؟“ (وانہ اهلك عاد الاولیٰ)۔

قوم ”عاد“ کی توصیف ”الاولیٰ“ (پہلی) کے ساتھ یا تو اس قوم کی قدامت کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ عربوں کے درمیان معمول ہے کہ ہر قدیم چیز کو ”عادی“ کہتے ہیں۔ اور یا اس بنا پر ہے کہ تاریخ میں ”عاد“ نامی دو قومیں ہوئی ہیں، اور مشہور قوم جن کے پیغمبر ”ہود“ تھے وہی پہلی عاد ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اسی طرح خدا نے قوم ثمود کو ان کی سرکشی کی بنا پر ہلاک کیا اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا“ (و ثمود فما ابقی)۔

اس کے بعد قوم نوح کے بارے میں فرماتا ہے: اور ان سے پہلے قوم نوح کو بھی ہم نے ہلاک کیا“ (ونوح من قبل)۔

”کیونکہ وہ سب سے زیادہ ظالم، اور سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے تھے“ (انہم كانوا هم اظلم واطغی)۔ کیونکہ ان کے پیغمبر نوح نے تمام انبیاء کی نسبت، بہت طویل مدت تک انہیں تبلیغ کی تھی، لیکن اس کے باوجود تھوڑی سی تعداد کے سوا ان کی دعوت کو کسی نے قبول نہ کیا، اور شرک و بت پرستی اور نوح کی مکنذیب اور آزار پہنچانے میں حد سے زیادہ سختی کی، جیسا کہ اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۃ نوح کی تفسیر میں آئے گی۔

۱۔ اس بات پر توجہ رکھیے کہ یہ گیارہ مطالب سب کے سب ”ان“ کے ساتھ شروع ہوتے ہیں جن میں سے پہلا آیت ۲۸ ”الانذار وازرہ وزر

اخرویٰ“ اور آخری ”وانہ اهلك عاد الاولیٰ“ ہے۔

۲۔ ”مجمع البیان“ ”نوح المعانی“ و ”تفسیر فخر رازی“۔

قوم لوط چوتھی قوم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ”خدا نے قوم لوط کے زیرِ وزبر شدہ شہروں کو زمین پر دے مارا“ (والمؤتفکة اھوی)۔

ظاہر میں ایک شدید زلزلہ نے ان آبادیوں کو آسمان کی طرف پھینک دیا اور پھر سرنگوں کر کے زمین پر بٹخ دیا۔ اور روایات کے مطابق جبریل نے انہیں عدا و اذقوت کے ساتھ زمین سے اکھاڑ کر اوندھے منہ زمین پر دے مارا۔

”اس کے بعد انہیں ایک سنگین عذاب کے ساتھ ڈھانپ لیا“ (فغشسھا ما غشی)۔
ہاں! آسمانی پتھروں کی ایک بارش ان پر برسی اور ان سارے ڈولتے ہوئے شہروں کو پتھروں کے ایک ڈھیر کے نیچے دفن کر دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس آیت اور اس سے قبل کی آیات میں قوم لوط کے نام کی تصریح نہیں ہوئی، لیکن عام طور پر مفسرین نے یہاں بھی اور سورۃ توبہ کی آیت ۷۰ اور سورۃ حاقہ کی آیت ۹ میں بھی جہاں ”مؤتفکات“ کی تعبیر ہوئی ہے، یہی معنی سمجھے ہیں۔ اگرچہ بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ تمام بلا دیدہ اور مصیبت زدہ درہم برہم شہروں کو اپنے اندر لے لیتی ہے، لیکن قرآن کی دوسری آیات اس چیز کی جو مشہور مفسرین سمجھے ہیں تائید کرتی ہیں۔

سورۃ ہود کی آیت ۸۲ میں آیا ہے : فلما جاء امرنا جعلنا علیہا سافلہا وامطرنا علیہا حجارة من سجيل منضود : جس وقت ہمارا فرمان آپہنچا تو اس شہر و دیار کو زیرِ وزبر کر دیا، اور پتھروں اور پتھر ملی مٹی کی — جو تہ بہ تہ جمی ہوئی تھی ان پر بارش کر دی۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں آیا ہے کہ ”مؤتفکہ“ ”زیرِ وزبر شدہ شہر“ (بصرہ کا شہر ہے، کیونکہ ایک روایت میں آیا ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، :

یا اھل البصرة و یا اھل المؤتفکة و یا جند المرأة و اتباع البھیمۃ :

”اے اہل بصرہ، اے زیرِ وزبر شدہ زمین کے رہنے والو! اے عورت کے لشکر، اے اونٹ

کی پیروی کرنے والو! (جنگ جمل کی طرف اشارہ ہے جس کی کمانداری بی عاتشہ تھیں اور بصرہ

کے لوگ ان کے اونٹ کے پیچھے چل پڑے تھے)۔

لیکن یہ بات معلوم ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ کے کلام میں یہ تعبیر ایک قسم کی تطبیق کے عنوان سے ہے نہ کہ تفسیر کے طور پر، شاید اس زمانے میں اس شہر کے لوگ اخلاق یا خدائی عذاب کے لحاظ سے قوم لوط کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔

لے ”ما غشی“ میں ”ما“ ممکن ہے مفعول ہو یا فاعل جیسے والسماء و ما بناھا، لیکن پہلا احتمال آیت کے ظاہر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے پہلی صورت میں اس جملہ کا معنی وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا اور دوسری صورت میں معنی اس طرح ہے ”وہ خدا جس نے عذاب کا پردہ ان پر بھیجا جس نے انہیں ڈھانپ لیا بہر حال یہ تعبیر کسی چیز کی عظمت و شدت کے بیان کے سلسلہ میں ذکر ہوتی ہے۔
لے ”تفسیر صافی“ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

شتہ
کے
ت
بات
قتلہ
ل

ہے
”ہود“

”ا“

رہ

سی
تی،

—

وزر

اس بحث کے آخر میں ان نعمتوں کے بارے میں جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئی تھیں اشارہ کرتے ہوئے ایک استفہام انکاری کی صورت میں فرماتا ہے: ”تجھے اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کوئی نعمت میں شک ہے“ (فبای الاءاء ربك متماثری)۔

کیا نعمت حیات میں، یا اصل نعمت خلقت میں، یا اس نعمت میں کہ خدا کسی کو دوسرے کے جرم کی سزا نہیں دیتا، خلاصہ یہ کہ جو کچھ گزشتہ صحیفوں میں آیا ہے، اور قرآن میں بھی اس پر تاکید ہوئی ہے ان میں سے کسی میں تجھے شک ہے؟ کیا تم اس نعمت میں، کہ خدا نے تمہیں گزشتہ اقوام کے عذابوں سے بچائے رکھا ہے، اور اپنی عفو و درگزر اور رحمت کو تمہارے شامل حال کیا ہے، شک کرتے ہو؟ یا نزول قرآن کی نعمت اور رسالت و ایمان اور ہدایت کے مسئلہ میں تمہیں شک ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس آیت میں مخاطب پیغمبر کی ذات ہے لیکن اس کا مفہوم سب کو شامل ہے، بلکہ ہدف اصلی زیادہ تر دوسرے افراد ہی ہیں۔

”تمماثری“ ”تماری“ کے مادہ سے (مجاہد جو شک و تردید سے تو اُم ہو) کے معنی میں ہے اے ”الاءاء جمع“ ”ألا“ یا اِلی (بروزن فعل) نعمت کے معنی میں ہے۔ اگرچہ بعض ایسے مطالب، جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں — جیسے کہ دوسری قوموں کے عذاب اور ہلاکت — نعمت کے مصداق نہیں ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ خدا نے مسلمانوں کو، بلکہ پیغمبر کے زمانے کے کفار تک کو بھی، ان امور سے محفوظ رکھا ہے، ایک عظیم نعمت ہوگی۔

اے اگرچہ باب ”تفاعل“ عام طور پر ایسے موقعوں میں استعمال ہوتا ہے جب کوئی فعل دو افراد سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں صادر ہو لیکن یہاں صرف ایک ہی شخص کے فعل کی صورت میں ذکر ہوا ہے جو یا تو تاکید کی بنا پر ہے یا نعمتوں کے موارد کے تعدد کی بنا پر (غور کیجئے)۔

۵۶۔ هَذَا نَذِيرٌ مِّنَ النَّذْرِ الْأُولَىٰ ۝

۵۷۔ آزِفَتِ الْأَرْفَةُ ۝

۵۸۔ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ۝

۵۹۔ أَفَمِنْ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ۝

۶۰۔ وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ ۝

۶۱۔ وَأَنْتُمْ سَمِدُونَ ۝

۶۲۔ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ۝

ترجمہ

۵۶۔ یہ (پیغمبر) پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے۔

۵۷۔ جسے نزدیک ہونا چاہیے وہ نزدیک ہو گئی ہے، (اور قیامت آنے ہی والی ہے)

۵۸۔ اور خدا کے سوا کوئی شخص اس کے شدائد کو برطرف نہیں کر سکتا۔

۵۹۔ کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو؟

۶۰۔ اور ہنستے ہو اور روتے نہیں؟

۶۱۔ اور تم ہمیشہ غفلت اور ہوس رانی میں زندگی بسر کرتے ہو؟

۶۲۔ اب جب کہ ایسا ہے تو تم سب اللہ کے لیے سجدہ کرو اور عبادت کرو۔

تفسیر

سب اس کے لیے سجدہ کرو

گزشتہ آیات کے بعد — جو گزشتہ اقوام کی تمکرنی اور طغیان کی وجہ سے ان کی ہلاکت کی بات کرنی تھی — زیر بحث آیات اپنا روئے سخن مشرکین، کفار اور پیغمبر کی دعوت کے منکرین کی طرف کرتے ہوئے کہتی ہیں: ”یہ پیغمبر (یا یہ قرآن) گزشتہ ڈرانے والوں کی طرح ہی ایک ڈرانے والا ہے“ (ہذا نذیر من النذر الاولیٰ)۔

یہ جو کہتا ہے کہ: پیغمبر (یا قرآن) پہلے انذار کرنے والوں اور ڈرانے والوں کی نوع میں سے ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ محمدؐ کی رسالت، اور ان کی آسمانی کتاب قرآن کوئی نیا موضوع نہیں ہے، گزشتہ زمانہ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں پس یہ تمہارے لیے باعث تعجب کیوں ہے؟

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ”ہذا“ ان اخبار کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ آیات میں پہلی اقوام کی سرگزشت کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں، کیونکہ یہ بھی اپنی نوعیت پر ڈرانے والی ہیں، لیکن پہلے والی دونوں تفاسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہیں۔

اس غرض سے، کہ مشرکین اور کفار اس خطرے پر، جو انہیں درپیش ہے، زیادہ توجہ دیں، مزید کہتا ہے ”جسے نزدیک ہونا چاہیے وہ نزدیک ہوگئی ہے“ (اذقت الاذفة)۔

ہاں! قیامت نزدیک ہے، اپنے آپ کو سوال و حساب اور جزا کے لیے تیار کرو۔

”اذفة“ کی تعبیر قیامت کے متعلق اس کے نزدیک ہونے اور وقت کی تنگی کی بنا پر ہے۔ کیونکہ یہ لفظ کلمہ ”اذف“ (بروزن نجف) سے ”تنگی، وقت کے معنی میں“ لیا گیا ہے۔ اور طبعاً نزدیک ہونے کے معنی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اس نام کے ساتھ قیامت کا نام، زیر بحث آیت کے علاوہ سورہ نمون کی آیت ۸ میں بھی آیا ہے، اور یہ ایک گویا اور بیدار کرنے والی تعبیر ہے۔ یہی مفہوم ایک دوسری صورت میں سورہ قمر کی آیت میں بھی بیان ہوا ہے: ”اقترب الساعة: قیامت نزدیک ہوگئی ہے“ بہر حال دنیا کی عمر کی کوتاہی کی طرف توجہ کرتے ہوئے قیامت کی نزدیکی قابل ادراک ہے۔ خصوصاً اس چیز کو دیکھتے ہوئے کہ جو شخص مرتا ہے اس کی تو قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اہم بات یہ ہے کہ“ اس دن خدا کے علاوہ کوئی شخص ان کی فریاد کو نہیں پہنچ سکتا“ اور نہ ہی اس کے شدائد کو برطرف کر سکتا ہے۔ (لیس لہا من دون اللہ کاشفة)۔

”کاشفۃ“ یہاں شدائد کو برطرف کرنے والے کے معنی میں ہے۔
لیکن بعض نے کاشفۃ کو تاخیر قیامت کے عامل کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔ اور بعض نے ”وقوع قیامت کی تاریخ کو کشف کرنے“ کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مناسب ہے۔
بہر حال حاکم و مالک اور صاحب قدرت اس دن بھی اور (ہمیشہ) خدا ہی ہے، اگر نجات چاہتے ہو تو اس کے لطف کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھاؤ اور اگر آرام و سکون کے طالب ہو تو اس پر ایمان لے آؤ۔
بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو“ (افمن هذا الحدیث تعجبون)۔
یہ جملہ ممکن ہے کہ قیامت اور قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے کی طرف اشارہ ہو، جو گذشتہ آیات میں آیا ہے، یا قرآن کی طرف اشارہ ہو۔ (کیونکہ دوسری آیات میں اس کی ”حدیث“ کے لفظ سے تعبیر ہوئی ہے لے، یا وہ باتیں جو گذشتہ اقوام کی ہلاکت کے بارے میں کہی گئی ہیں، یا ان سب کی طرف۔
اس کے بعد مزید کہتا ہے، ”اور تم ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو“ (وتضحکون ولا تبکون)۔
”اور ہمیشہ غفلت، بے خبری، لہو و لعب اور گناہ آلود سرگرمیوں میں زندگی بسر کرتے ہو“ (وانتم ساهدون)۔
حالانکہ یہاں نہ تو ہنسنے کی جگہ ہے اور نہ ہی غفلت اور بے خبر رہنے کی جگہ ہے۔ بلکہ یہ تو ہاتھ سے نکلی ہوئی فرصتوں، ترک شدہ الامعات، اور ان گناہوں پر جو تم سے سرزد ہوئے ہیں، رونے کی جگہ ہے۔ بیداری اور ان امور کی تلافی کی جگہ ہے جو ہاتھ سے نکل گئے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ تو بہر کی اور لطف خدا کے سائے کی طرف پٹنے کی جگہ ہے۔
”سامدون“ ”سمود“ کے مادہ سے (بروزن جمود) لہو و لعب، جوش اور کبر و غرور سے سر اوجھانچا کرنے کے معنی میں ہے۔ اور اصل میں اونٹ جب چل رہا ہو اور اپنا سر بے اعتنائی سے فضا میں بلند کرے تو اس فعل کو سمود کہا جاتا ہے۔
یہ مغرور تکبر کرنے والے جانوروں کی طرح خواب و خور میں مشغول ہیں، اور عیش و نوش میں غرق ہیں، اور دردناک حوادث اور ان شدید عذابوں سے۔ جو انہیں درپیش ہیں اور ان سے دامیگر ہونے ہی والے ہیں — بے خبر ہیں۔

اس سورہ کی آخری آیت میں، ان بہت سے مباحث کے بعد جو اثبات توحید اور نفی شرک کے سلسلہ میں بیان ہوئے ہیں، کہتا ہے: ”اب جب کہ ایسا ہے تو خدا کے لیے سجدہ کرو اور اس کی پرستش کرو“ (فاسجدوا لله واعبدوا)۔
اگر تم یہ چاہتے ہو کہ حق کی صراط مستقیم پر چلو تو صرف اسی کی ذات کو سجدہ کرو، جس کی پاک ذات تک تمام عالم ہستی کے خطوط متغی ہوتے ہیں، اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ گزشتہ اقوام کی دردناک سرنوشت میں — جو شرک و کفر و ظلم و ستم کی بنا پر عذاب الہی کے چنگل میں گرفتار ہوئی ہیں — گرفتار نہ ہوں، تو صرف اسی کی عبادت کرو۔

(البقیہ جانشین صفحہ گزشتہ کا) ”نفس“ کی جو مخدوف ہے، بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ”کاشفۃ“ کی ”تا“ مبالغہ کے لیے ہے ”علامۃ“ کی طرح۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایات میں یہ نقل ہوا ہے کہ جس وقت پیغمبرؐ اس سورہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے تو تمام مومنین و کفار جو اسے سن رہے تھے سجدہ میں گر پڑے، ایک روایت کے مطابق جس نے سجدہ نہیں کیا وہ صرف ”ولید بن مغیرہ“ تھا (جو شاید سجدہ کرنے کے لیے جھک نہیں سکتا تھا) اس نے مٹی بھر مٹی اٹھائی اور اس پر پیشانی رکھ دی اور اس طرح سے سجدہ کیا۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ بت پرست تک بھی سجدے میں گر پڑے کیونکہ اس سورہ کے لب و لہجہ کی اثر پذیری ایک طرف ہے، اور اس سورہ کا ہیجان انگیز مضمون دوسری طرف سے، اور مشرکین کے لیے وحشتناک تہدیدیں تیسری طرف سے، اور پیغمبرؐ گرامی اسلام کے منہ سے نزول وحی کے پہلے مرحلہ میں ان مبارک آیات کا نکلنا چوتھی طرف سے، اس قدر گہرائی کے ہوں مؤثر اور پُر نفوذ تھا کہ جس نے ہر دل پہلے اختیار اثر کیا، اور عناد، ہٹ دھرمی، تعصب اور خودخواہی کے پردوں کو — چاہے وقتی طور پر ہی — آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیا، اور تو توحید کا دلوں پر سایہ ڈال دیا۔

اگر ہم بھی اس سورہ کو وقت و تامل اور حضور قلب و توجہ سے تلاوت کریں، اور خود کو پیغمبرؐ گرامی اسلام کے سامنے نزول قرآن کی فضائیں رکھیں تو ہم دیکھیں گے کہ — اسلام کے مخصوص عقائد سے قطع نظر — ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ جس وقت آخری آیت پر پہنچیں تو سجدہ میں گر پڑیں۔ اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سر تعظیم جھکا دیں۔

یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ قرآن نے منکرین کے دلوں میں بھی اثر ڈالا، اور انہیں بے اختیار اپنی طرف جذب کر لیا جیسا کہ ”ولید بن مغیرہ“ کی داستان میں آیا ہے کہ جس وقت اس نے سورۃ نجم (فصلت) کی آیات کو سنا اور جب پیغمبرؐ نے اس آیت کی تلاوت کی فان اعرضوا فقل انذرکم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود — تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور رونے لگا۔ اور بال اس کے بدن پر سیدھے کھڑے ہو گئے گھر میں آیا تو اس حالت میں کہ مشرکین نے خیال کیا کہ وہ پورے طور پر مجھڑ کے دین میں جذب ہو گیا ہے۔

اس بنا پر یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چونکہ بعض شیطانوں، یا شیطان صفیات انسانوں نے افراتیم اللات والعزى۔۔۔۔۔ کی تلاوت کے وقت — جو عربوں کے مشہور بتوں کی بات کرتی ہے — ان بتوں کی تعریف و توصیف میں زبان کھولی تھی۔ اور ”تلك الغرانیق العلیٰ“ کہہ دیا تھا، اس وجہ سے مشرکین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ لہذا وہ بھی اس بنا پر سجدہ میں گر پڑے۔

کیونکہ — جیسا کہ ہم نے ان آیات کی تفسیر میں پہلے بیان کیا ہے — ان آیات میں جو ان بتوں کے نام لینے کے بعد آئی ہیں ان میں ان کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ اور اس نے کسی قسم کے شک اور تردید اور غلط اشتباہ کی گنجائش کسی کے لیے بھی باقی نہیں چھوڑی (مزید وضاحت کے لیے اسی سورہ کی آیت ۱۹ و ۲۰ کی طرف رجوع کریں)

یہ نکتہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ ”اوپر والی آیت“ ان آیات میں سے ہے جس کی تلاوت کے وقت سب پر سجدہ واجب ہے، آیت کا لب و لہجہ بھی جو اس کے صیغہ امر سے ظاہر ہے، اور امر وجوب کی دلیل ہے، اس معنی کی گواہی دیتا ہے، اور اس طرح سے سورہ ”الم سجدہ“ اور ”حم سجدہ“ کے بعد یہ تیسرا سورہ ہے، جس میں سجدہ واجب آیا ہے۔ اگرچہ

بعض روایات کے مطابق، تاریخ نزول کے لحاظ سے وہ پہلا سورہ، جس میں سجدہ واجب کی آیت نازل ہوئی ہے، یہی سورہ ہے۔



خداوند! ہمیشہ معرفت کے انوار کو ہمارے دلوں پر سایہ فگن کر، تاکہ ہم تیرے غیر کی پرستش نہ کریں اور تیرے غیر کے سامنے سجدہ نہ کریں۔
بارالہ! تمام خیرات کی کلید تیرے ہی دست قدرت میں ہے، ہمیں اپنے بہترین مواہب و عطایا سے یعنی اپنی خوشنودی اور رضا سے بہرہ مند کر دے۔
پروردگارا! ہمیں عبرت بین نگاہ عطا فرما، تاکہ ہم گزشتہ ظالم و شمر اقوام کے حالات سے عبرت سیکھیں اور ان کے راستے پر قدم رکھنے سے بچے رہیں۔

امین یا رب العالمین

اختتام سورہ نجم اور تفسیر نمونہ کی جلد ۲۲ کا اختتام

۱۵ / ربیع الاول ۱۴۰۶

۳ / ۹ / ۱۳۶۲

اختتام ترجمہ

بتاریخ ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۸۷ء بروز جمعرات بوقت
پونے آٹھ بجے صبح بر مکان حقیر قم المقدسہ جمہوری اسلامی ایران، محل سلطان محمد شریف
کوی جمشیدی بلاک انجیابان القلاب — الحمد لله اولاً و آخراً و صلی الله
علی محمد و آلہ ابداداً دائماً۔

احقر صفدر حسین عفی عنہ

سُورَةُ قَمَرٍ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا ۔
اس میں ۵۵ آیتیں ہیں ۔

تاریخ آغاز: ۴/۹/۳۶۴ھ ش، ۱۵ ربیع الاول ۴۰۶ھ ق

سُورۂ قمر کے مضامین

یہ سُورہ اپنے اندر مکی سُورتوں کی خصوصیتیں یعنی مبدا و معاد کے عظیم مباحث کی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ یہ سُورہ گزشتہ اقوام سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ کی بدکاری کو بیان کرتا ہے جو ہٹ دھرمی، عناد، کُفر، ظلم اور فساد کے راستے پر چلنے کی وجہ سے خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے سرکوبی کرنے والے پے پے عذاب میں گرفتار ہو کر ہلاک ہوئے۔ ان افراد کے متعلق بیان ہونے والی ہر سرگزشت کے بعد یہ سُورہ (وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ) "ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے والوں کی نصیحت کے لیے آسان کیا ہے تو کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے" کی تکرار کرتا ہے تاکہ مسلمانوں اور کافروں دونوں کے لیے درس عبرت ثابت ہو۔

اس سُورہ کے مضامین کو مجموعی طور پر چند حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- ۱۔ سُورہ کے آغاز میں قُرب قیامت، شق القمر اور مخالفین کی طرف سے آیاتِ الہی کے انکار پر گفتگو کی گئی ہے۔
- ۲۔ دوسرے حصہ میں سب سے پہلی سرکش، متمرّد اور ہٹ دھرم قوم یعنی قوم نوح اور طوفانِ نوح کے بارے میں مختصر بحث ہے۔
- ۳۔ تیسرا حصہ قوم عاد کی داستان بیان کرتا ہے اور ان پر آنے والے دردناک عذاب کی کیفیت پیش کرتا ہے۔
- ۴۔ چوتھے حصہ میں قوم ثمود اور ان کی مخالفت کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام سے روارکھی۔ ناقہ صالح کے بھڑکے کا بھی ذکر ہے۔ آخر میں اس عذابِ الہی کا بیان ہے جو اس گروہ پر آیا۔
- ۵۔ اس کے بعد قوم لوط کا ذکر ہے اور ان کے کُفر کی جانب اور اخلاق سے انحراف کی طرف ضمنی طور پر مختصر سا اشارہ ہے اور ان پر نازل ہونے والے دردناک عذاب کا بیان ہے۔

- ۶۔ ایک اور حصہ میں آل فرعون اور ان پر عذاب و سزا کے بارے میں مختصر سی گفتگو ہے۔
- ۷۔ آخری حصہ میں گزشتہ اقوام، مُشرکین مکہ اور مخالفین پیغمبر اسلام کا موازنہ ہے اور مُشرکین مکہ کے اُس بھیانک مستقبل کا تذکرہ ہے جو وہ اپنی روش کی وجہ سے اپنے لیے متعین کر چکے تھے۔
- یہ سُورہ مجرموں کی سزا، ان پر نازل ہونے والے عذاب اور پرہیزگاروں کو ملنے والے اجر و ثواب کے بیان پر ختم ہوتا ہے۔
- اس سُورہ کی آیتیں عام طور پر مختصر اور دل ہلا دینے والی ہیں۔
- اس سُورہ کا نام پہلی آیت کی مناسبت سے ”قر“ رکھا گیا ہے۔ پہلی آیت شق القمر کو موضوع بحث بناتی ہے۔

فضیلت تلاوتِ سُورہ قمر

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں: ”من قرأ سورة اقتربت الساعة في كل غيب يوم القيامة و وجهه على صورة القمر ليلة البدر و من قرأها كل ليلة كان افضل و جاء يوم القيامة و وجهه مسفر على وجوه الخلائق“۔ ”جو شخص سُورہ اقتربت کو ایک دن چھوڑ کر پڑھے گا وہ قیامت کے دن اس حالت میں اُٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی مانند چمکتا ہو گا اور جو اسے ہر شب میں پڑھے تو یہ اس سے بھی افضل ہے۔ قیامت میں ایسے شخص کے چہرے کی روشنی تمام مخلوق پر برتری رکھتی ہوگی۔“

میدانِ قیامت میں چہرے کی یہ چمک یقیناً مضبوط اور سچے ایمان کی علامت ہوگی۔ یہ چمک اس سُورہ کی تلاوت، اس میں غور و فکر اور اس کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوگی صرف تلاوت سے نہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

- ۱۔ اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَالشَّيْءُ الْقَمَرُ ۝
- ۲۔ وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝
- ۳۔ وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أُمَّةٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝

ترجمہ

- ۱۔ شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے
- ۱۔ قیامت قریب ہوئی اور چاند شق ہو گیا۔
- ۲۔ جس وقت نشانی اور مُعْجَزہ کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ سحر مستمر ہے۔
- ۳۔ انہوں نے (خدا کی آیتوں کی) تکذیب کی، اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور ہر امر کے لیے ایک قرار گاہ ہے۔

تفسیر

چاند شق ہو گیا

پہلی آیت میں دو اہم باتوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ ایک تو قیامت کا آنا کہ جس کا درود اس عالم فانی کے لیے اپنے ہمراہ ایک عظیم انقلاب لیے ہوئے ہے۔ دوسرا عنوان ہے ”نئی زندگی کی ابتداء“۔ وہ ایسی دُنیا ہے کہ جس کی عظمت و وسعت اس دُنیا کے دلی میں مقید رہنے والوں کے لیے ناقابل فہم و ناقابل توصیف ہے۔

دوسرا واقعہ ”مُعْجَزہ شق القمر“ کا ہے جو خدائے بزرگ و برتر کی ہر شے پر قدرت رکھنے کی دلیل بھی ہے اور اس کے پیغمبر گرامیؐ

کی صداقت کی نشانی بھی۔ قیامت قریب ہوئی اور چاند شق ہو گیا۔ (اقتربت الساعة والنشق القمر)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ سورہ ”سورہ نجم“ قریب قیامت کو بیان کرنے والے مجملوں پر ختم ہوا۔ ”ازفت الازفة“ یہ سورہ بھی اسی معنی و مفہوم سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تاکید ہے اس بات کی کہ قیامت قریب ہے خواہ یہ قریب دُنیا کے پیمانے کے اعتبار سے ہزاروں سال ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس دُنیا کی مجموعی عمر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس دُنیا کی تمام عمر قیامت کے مقابلے میں ایسے ایک لمحہ سے زیادہ نہیں جو جلدی سے گزر جائے، اس سے مقصود یہ ہے کہ اس تعبیر کا مفہوم واضح ہو جائے۔

مفسرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق ان دونوں حادثوں کا اکٹھا ذکر اس وجہ سے ہے کہ پیغمبر اسلامؐ جو کہ خدا کے آخری پیغمبر ہیں ان کا نکلنا اصولی طور پر خود قریب قیامت کی ایک نشانی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث ہے، آپؐ نے فرمایا: ”لن یأتی بعدی نبی“ میرا مبعوث ہونا اور قیامت مثل ان دو کے ہے۔“ یہ آپؐ کی دو انگلیوں کی طرف اشارہ ہے جو اُس وقت ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔

دوسری طرف چاند کا دو ٹکڑے ہونا ستاروں کے نظام کے درہم برہم ہونے کے امکان پر خود ایک دلیل ہے اور ایک پھوٹا سا نمونہ ہے۔ ان عظیم حادثات کا جو قریب قیامت میں ظہور پذیر ہوں گے کیونکہ تمام ستارے مع زمین ٹوٹ پھوٹ جائیں گے اور ان کی جگہ ایک نئی دُنیا معرض وجود میں آجائے گی۔ ایسی مشہور روایات کے مطابق کہ جن کے بارے میں بعض راویوں نے متواتر ہونے کا دعویٰ ہی کیا ہے مُشرکین پیغمبرؐ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپؐ سچ کہتے ہیں اور خدا کے پیغمبر ہیں تو ہم کو چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں یہ کام کر کے دکھا دوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ وہ چودھویں کی رات تھی۔ پیغمبرؐ نے بارگاہِ ایزدی میں دعا کی کہ جو کچھ یہ چاہتے ہیں وہ تو کر دے۔ چاند اچانک دو ٹکڑے ہو گیا۔ رسول اللہؐ ایک ایک شخص کو آواز دیتے تھے اور فرماتے تھے ”یہ تمہارے دیکھ لو۔“

اس سلسلہ میں چند سوالات ہیں مثلاً یہ کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک آسمانی گزہ شق ہو کر دو ٹکڑے ہو جائے نیز اس قسم کا حادثہ گزہ زمین اور نظام شمسی کے لیے اپنے اندر کیا تاثیر رکھتا ہے۔ شکافہ ہو جانے کے بعد چاند کے دونوں ٹکڑوں کے ملنے کی کیفیت اور یہ کہ اس قسم کے حادثہ کا ہونا کس طرح ممکن ہے۔ پھر یہ بھی کہ تواریخ عالم نے اس کا ذکر بھی نہ کیا ہو۔ اس ضمن میں کچھ یہ اور کچھ ایسے ہی دوسرے سوالات ہیں۔ انشاء اللہ نکات کے ذیل میں ہم یہ سب تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

وہ نکتہ کہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ بعض ایسے مفسرین، کہ جن کی شہرت ابھی نہیں ہے اور جو ہر قسم کے اس عمل کے جو خارق عادت ہو ”سوائے قرآن کے“ پیغمبر اسلامؐ کے ذریعے انجام پانے کے مُنکر ہیں، باوجود اس کے کہ مذکور بالا آیت واضح ہے اور اس عنوان پر علمائے اسلام کی کتابوں میں روایات کثرت سے موجود ہیں، وہ اُلجھن میں گرفتار ہیں کہ اس خارق عادت عمل کی کس طرح توجیہ کریں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس موضوع کو اس طرح زیر بحث لائیں کہ اس واقعہ کے معجزانہ پہلو کی نفی ہو جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے

شق القمر کا واقعہ بطور اعجاز ظہور پذیر ہوا ہے اور بعد میں آنے والی آیتیں اس امر پر اپنے اندر واضح شواہد لیے ہوئے ہیں۔ اگر کچھ آیات قرآنی معجزہ کی نفی کرتی ہیں تو وہ ایسے معجزات کی طرف اشارہ ہے کہ بہانے بنانے والے افراد جن کا مطالبہ کرتے تھے۔ وہ نہ تو حق کو قبول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور نہ اس کے انجام پا جانے کے بعد حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔ وہ معجزات کہ جن کی تحقیق کے لیے مطالبہ ہوتا تھا پیغمبر کی طرف سے انجام پاتے تھے۔ اس امر پر بہت سے شواہد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ زندگی میں موجود ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے ”ہٹ دھرم اور کج بخنی کرنے والے مخالفین جب تیری تبلیغ کی صداقت کے بارے میں کوئی معجزہ یا نشانی دیکھتے ہیں تو اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ واقعی مستقل جادو ہے“ (وان یروا آیتہ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر)۔ مستمر کا لفظ اس لیے کہا کہ انہوں نے پیغمبر اسلام کی طرف سے پلے در پلے معجزات دیکھے تھے اور ”شق القمر“ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ وہ ان سب باتوں کو مستقل جادو قرار دیتے تھے اگرچہ یہ تہمت حق کو تسلیم نہ کرنے کا محض ایک بہانہ تھی۔ کچھ مفسرین نے ”مستمر“ کے معنی طاقتور قرار دیے ہیں۔ جیسا کہ (جبل مرید) کہا جاتا ہے جس کے معنی مضبوط رستی کے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی ناپائیدار کے لیے ہیں لیکن صحیح پہلی تفسیر ہی ہے۔

بعد والی آیت میں ان کے مخالفانہ نکتے اور اس مخالفت کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی نحوست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے تکذیب کی اور اپنی ہوائے نفس کی پیروی کی اور ہر چیز کی ایک قرار گاہ ہے۔ (وکنذلوا واتبعوا اھواءھم وکل امر مستقر)۔

پیغمبر اسلام کی مخالفت یا آپ کے دلائل اور معجزات کی تکذیب اور قیامت کے انکار کا سبب ان کی ہوائے نفس کی پیروی تھی۔ تعصب، ہٹ دھرمی اور نفس پرستی انہیں حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنے دیتی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بلا کسی قید کے مفادات کا حاصل کرنا اور ہر قسم کے گناہ میں آلودہ ہونا اس راہ میں حائل تھا کہ وہ دعوت حق کو قبول کریں کیونکہ دعوت حق کا قبول کرنا ذمہ داری عائد کرتا تھا۔ جی ہاں ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا کیونکہ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مفاد پرستی ہی ہوتی ہے۔

(وکل امر مستقر) ”ہر چیز کی ایک قرار گاہ ہے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کیے کی سزا پائے گا۔ نیکی کرنے والوں کی نیکی کی قرار گاہ اور بُرائی کرنے والوں کی بُرائی کی قرار گاہ۔ اس تفسیر سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس جہان میں کوئی چیز ختم نہیں ہوتی اور ہر نیکی اور بُرائی باقی رہتی ہے۔ یہاں تک انسان اس کی جزا یا سزا پائے۔

مندرجہ بالا تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ جھوٹے الزامات حق کے چہرے کو ہمیشہ نہیں چھپا سکتے۔ ہر چیز اپنی قرار گاہ کی طرف جاتی ہے اور زیادہ دیر نہیں لگتی کہ حق کا خوبصورت اور باطل کا قبیح چہرہ آشکار ہو جاتا ہے۔ یہ اس دُنیا کی ایک مستقل روایت ہے۔ یہ تفسیریں ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کی سب آیت کے مفہوم میں داخل ہوں۔

چند ایک نکات

۱۔ شق القمر، پیغمبر اسلام کا ایک عظیم معجزہ: اگرچہ بعض کوتاہ نظر مفسرین کا اس بات پر اصرار ہے کہ اس معجزہ کی اس طرح توجیہ کریں کہ اس کی غارق العادت حیثیت باقی نہ رہے، ان کا کہنا ہے کہ مندرجہ بالا آیت آئندہ اور مستقبل کے بارے میں خبر دیتی ہے، قیامت کی شرائط سے متعلق ہے اور اس سے پہلے کے حوادث میں سے ہے۔ لیکن ایسی متعدد قرآنی آیات موجود ہیں جو اس کے معجزہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس معجزہ کا بیان ماضی کے صیفے میں کیا گیا ہے جو بتاتا ہے کہ شق القمر واقع ہو چکا ہے جیسا کہ آخری پیغمبر کے مبعوث ہونے کی وجہ سے قرب قیامت کی تصدیق ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں اگر گفتگو معجزے کے بارے میں نہ ہو تو پیغمبر کی طرف سحر کی نسبت جو بعد والی آیت میں آئی ہے کوئی مناسبت نہیں رکھتی اور اس طرح (و کذبوا و اتبعوا اھواءھم) کا جملہ جو ان کی تکذیب کی خبر دیتا ہے، وہ بھی کوئی مناسبت کلام نہیں رکھتا۔

قطع نظر اس سے کتب اسلامی میں اس معجزے کے وقوع کے بارے میں بہت سی روایات بھی موجود ہیں جو حد تو اترو شہرت تک پہنچی ہوئی ہیں اور اس وجہ سے قابل انکار نہیں ہیں۔ ہم فخر الدین رازی اور طبرسی اہل سنت اور اہل تشیع کے دو معروف مفسرین کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہیں۔ فخر الدین رازی کا کہنا ہے کہ زیادہ تر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور صحیح روایتیں بھی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کا وقوع ایسا نہیں کہ اس کے ماننے میں کسی قسم کے شک یا تردید کو دخل ہو۔ پھر پیغمبر اسلامؐ نے اس کی خبر دی ہے۔ اس بنا پر اسے قبول کرنا چاہیے۔ باقی رہی عدم فرق والتیام کی داستان (مطابق عقیدۃ ابطال شدہ بطلیموس) تو وہ بے بنیاد ہے اور اس کا علم سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ دلائل غلطیہ سے ثابت ہے کہ افلاک میں سے کسی چیز کا ٹوٹنا اور پھر جڑ جانا ممکن ہے۔ مروج طبرسی مجمع البیان میں رقم طراز ہیں کہ مفسرین اس آیت کو زمانہ پیغمبر اسلامؐ میں رونما ہونے والے معجزہ شق القمر سے متعلق سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد ان چند مخالفین کے بے اعتنائی کے ساتھ نام لیتے ہیں۔ وہ نام یہ ہیں عطا، حسن اور بلخی۔

بعض افراد نے نقل کیا ہے کہ حذیفہ یمانی جو مشہور صحابی تھے انہوں نے شق القمر کا واقعہ مسجد مائن میں ایک کثیر جماعت کے سامنے بیان کیا۔ وہاں ان پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے حاضرین ایسے تھے جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کا زمانہ دیکھا تھا (اس حدیث کو درمنثور اور قرطبی نے اس آیت کے عنوان کے ماتحت پیش کیا ہے)

آیت میں جس مفہوم کے قرآن موجود ہیں جو روایات اس سلسلہ میں ہیں اور جو مفسرین کے اقوال ہیں، ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی شق القمر کا واقعہ قابل انکار نہیں ہے۔ یہاں چند سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں جن کے جواب ہم پیش کرتے ہیں۔

۲۔ ”شق القمر“ موجودہ زمانے کے علوم کے لحاظ سے: وہ اہم سوالات جو اس بحث میں سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اجرام سماوی میں شگاف کا پیدا ہونا اصولی طور پر ممکن ہے یا نہیں اور علم اس کی تائید کرتا ہے یا تردید۔ ماہرین فلکیات کے انکشافات کے مطالعہ سے اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔ ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات نہ صرف یہ کہ محال نہیں ہیں بلکہ ایسے امور کا مشاہدہ ہوا ہے اگرچہ ہر مشاہدہ میں مخصوص عوامل کارفرما تھے۔ نظام شمسی کے تعلقات اور

دوسرے آسمانی کڑوں میں سے کسی آسمانی کڑہ کا اس طرح شق ہونا اور پھر مل جانا ایک ممکن امر ہے۔ نمونے کے طور پر چند باتیں درج ذیل ہیں (الف) نظام شمسی کی تخلیق : اس نظریے کے تمام ماہرین نے تصدیق کی ہے کہ نظام شمسی سے تعلق رکھنے والے تمام کڑے ابتداء میں سورج کے اجزاء تھے کسی وقت اس سے الگ ہوئے اور اپنے مدار میں گردش کرنے لگے۔ یہ بات ضرور ہے کہ الگ ہونے کے اس عمل کے اسباب و عوامل میں اختلاف ہے۔ "لابلاس" کا نظریہ یہ ہے کہ کسی چیز کے الگ ہونے کے اس عمل کا سبب مرکز سے گزرنے کی وہ قوت ہے جو سورج کے منطقہ استوائی میں پائی جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جس وقت سورج ایک جھلانے والی گیس کے ٹکڑے کی شکل میں تھا (اور اب بھی ایسا ہی ہے) اور اپنے گرد گردش کرتا تھا تو اس گردش کی سرعت منطقہ استوائی میں اس بات کا سبب بنی کہ سورج کے کچھ ٹکڑے اس سے الگ ہو جائیں اور فضا میں پکھر جائیں اور مرکز اصلی یعنی خود سورج کے گرد گردش کرنے لگیں لیکن "لابلاس" کے بعد بعض دوسرے ماہرین کی تحقیقات ایک دوسرے مفروضہ پر منتہی ہوئیں۔ وہ اس علیحدگی کا سبب اس شدید مد و جزر کو قرار دیتے ہیں جو سورج کی سطح پر سے ایک بہت بڑے ستارے کے عبور کرنے کی وجہ سے ہوا۔ اس مفروضہ سے اتفاق کرنے والے اس وقت کی سورج کی حرکت و صفی کو سورج کے ٹکڑوں کے علیحدہ ہونے کی توجیہ کو کافی نہیں سمجھتے۔ وہ اس مفروضہ کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ مد و جزر نے سورج کی سطح پر بہت بڑی بڑی لہریں اس طرح پیدا کیں جیسے پتھر کا کوئی بہت بڑا ٹکڑا سمندر میں گرے اور اس سے لہریں پیدا ہوں اس طرح سورج کے ٹکڑے یکے بعد دیگرے باہر نکل کر گر پڑے اور خود سورج کے گرد گردش کرنے لگے۔ بہر حال اس علیحدگی کا عامل کچھ بھی ہو اس پر سب متفق ہیں کہ نظام شمسی کی تخلیق انشقاق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی۔

(ب) بڑے شہاب : یہ بڑے بڑے آسمانی پتھر ہیں جو نظام شمسی کے گرد گردش کر رہے ہیں اور جو کبھی کبھی ٹکڑے ٹکڑے کرات اور تاروں سے مشابہت رکھنے والے قرار دیے جاتے ہیں۔ بڑے اس وجہ سے کہ ان کا قطر ۲۵ کلومیٹر تک ہوتا ہے لیکن وہ عموماً اس سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ماہرین کا نظریہ یہ ہے کہ "استروئیدھا" ایک عظیم ستارے کے بقیہ جات ہیں کہ جو مشتری اور مریخ کے درمیان مدار میں حرکت کر رہا تھا اور اس کے بعد نامعلوم عوامل کی بنا پر وہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اب تک پانچ ہزار سے زیادہ اس طرح کے ٹکڑے شہاب معلوم کیے جا چکے ہیں اور ان میں سے جو بڑے ہیں ان کے نام بھی رکھے جا چکے ہیں بلکہ ان کا حجم، مقدار اور سورج کے گرد ان کی گردش کا حساب بھی لگایا جا چکا ہے۔ بعض ماہرین فضا ان استروئیدوں کی خاص اہمیت کے قائل ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ فضا کے دور دراز حصوں کی جانب سفر کرنے کے لیے اولین قدم کے عنوان سے ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

آسمانی کڑوں کے انشقاق کا ایک دوسرا نمونہ

(ج) شہاب ثاقب چھوٹے چھوٹے آسمانی پتھر ہیں جو کبھی کبھی چھوٹی انگلی کے برابر بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال وہ سورج کے گرد ایک خاص مدار میں بڑی تیزی کے ساتھ گردش کر رہے ہیں اور جب کبھی ان کی سمت سفر کڑہ زمین کے مدار کو کاٹ کر گزرتی ہے تو وہ زمین کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے پتھر، اس ہوا سے شدت کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے، کہ جو زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور تھر تھراہٹ پیدا کرنے والی اس تیزی کی وجہ سے کہ جو ان کے اندر ہے زیادہ گرم ہو کر اس طرح بھڑک اٹھتے ہیں کہ ان میں سے شعلے

نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ہم انہیں ایک پُر نور، خوبصورت مکبر کی شکل میں فضا کے آسمانی میں دیکھتے ہیں اور انہیں "شہاب کے تیر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور کبھی یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دور دراز کا ستارہ ہے جو گر رہا ہے حالانکہ وہ چھوٹا شہاب ہے کہ جو بہت ہی قریبی فاصلہ پر بھڑک کر خاک ہو جاتا ہے۔

شہابوں کی گردش کا مدار زمین کے مدار سے دو نقطوں پر ملتا ہے۔ اسی بنا پر مرداد (ایرانی مہینے کا نام ہے) اور آبانہ (یہ بھی ایرانی مہینے کا نام ہے) میں جو دو مداروں کے نقطہ تقاطع ہیں، شہاب ثاقب زیادہ نظر آتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دو مدار ستارے کے بقیہ حصے ہیں جو نامعلوم حوادث کی بنا پر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔

آسمانی گروں کے پھٹنے کا ایک اور نمونہ

بہر حال آسمانی گروں کا انفجار و انشلاق یعنی پھٹنا اور پھٹ کر بکھرنے کوئی بے بنیاد بات نہیں ہے اور جدید علوم کی نظر میں یہ کوئی فعل محال بھی نہیں کہ یہ کہا جائے کہ معجزہ کا تعلق امر محال کے ساتھ نہیں ہوا کرتا۔ یہ سب انشلاق یعنی پھٹنے کے سلسلہ کی باتیں ہیں۔ دو ٹکڑوں میں جو قوت جاذبہ ہوتی ہے اس بنا پر اس انشلاق کی بازگشت ناممکن نہیں ہے۔

اگرچہ ہیئت قدیم میں بطلیوس کے نظریہ کے مطابق نو آسمان بیاز کے تہ بہ تہ چھکوں کی طرح ہیں اور گھومتے رہتے ہیں اور یوں یہ نو آسمان ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں جن کا ٹوٹنا اور جڑنا ایک جماعت کی نظر میں امر محال تھا۔ اس لیے اس نظریہ کے حامل افراد معراج آسمانی کے بھی منکر تھے اور "شق القمر" کے بھی لیکن اب جب کہ ہیئت بطلیوس کا مفروضہ خیالی افسانوں اور کہانیوں کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور نو آسمانوں کا نام و نشان بیک باقی نہیں رہا تو اب ان باتوں کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔ یہ نہ کہ کسی یاد دہانی کا محتاج نہیں کہ "شق القمر" ایک عام طبعی عامل کے زیر اثر رونما نہیں ہوا بلکہ اعجازِ نباتی کا نتیجہ تھا لیکن چونکہ اعجازِ محال عقلی سے تعلق نہیں رکھتا لہذا یہاں مطلوب اس مقصد کے امکان کو بیان کرنا تھا، خود فرمائیں۔

۳۔ "شق القمر" تاریخی اعتبار سے

ایک اور اعتراض جو بعض بے خبر افراد "شق القمر" پر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ شق القمر کا اپنی اس اہمیت کے ساتھ کہ جو وہ رکھتا ہے حقیقت پر مبنی ہوتا تو دنیا کی تاریخوں میں اس کا ذکر ملتا جب کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہ واضح کرنے کے لیے کہ اس اعتراض کی حقیقت کیا ہے اس مسئلہ کا تجزیہ اور اس کی تحلیل کی جاتی ہے۔

(الف) یہ بات قابل توجہ ہے کہ چاند ہمیشہ صرف آدھے کُرّہ ارض سے نظر آتا ہے اور سارے کُرّہ ارض سے بیک وقت نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے زمین کے آدھے حصہ کے لوگ تو اس حساب سے خارج ہیں یعنی ان کے اس واقعہ کے دیکھنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

(ب) اس نیم کُرّہ کے جو آدھے لوگ ہیں ان میں اکثریت کا سویا ہوا ہونا ممکن ہے، چونکہ معاملہ آدھی رات کے بعد کا ہے۔ اس لیے ساری دنیا کے چوتھائی افراد اس واقعہ سے باخبر ہو سکتے ہیں۔

(ج) قابل رویت حصہ میں بھی عین ممکن ہے کہ آسمان کا کوئی خاص حصہ ابر آلود ہو اور چاند کا چہرہ بادلوں میں پوشیدہ ہو۔
 (د) آسمانی حوادث افراد کی توجہ صرف اس صورت میں اپنی طرف مبذول کرتے ہیں جب بجلیوں کی سی شدید کڑک اپنے اندر رکھتے ہوں یا مکمل گرجن کی صورت میں کہ جب چاند بالکل ہی غائب ہو جائے اور وہ بھی ایک طویل وقفہ کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر منجمن کی طرف سے اعلان نہ ہو تو چھوٹے موٹے گھن کی بہت کم لوگوں کو خبر ہوتی ہے۔ بہت سے افراد تو مکمل چاند گرجن سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ صرف وہ لوگ کہ جو اجرام فلکی یعنی چاند وغیرہ کا رصد گاہوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں یا وہ لوگ کہ اتفاق سے جن کی نگاہ آسمان پر پڑ جائے تو ان کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے واقعہ سے باخبر ہوں اور کچھ اور لوگوں کو بھی باخبر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ چاند کا مختصر وقت کے لیے رُونا ہونے والا واقعہ جیسا کہ ابتدا میں سمجھا جاتا تھا، پوری دنیا کے لوگوں کی توجہ تو جذب کرنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ علی الخصوص اس زمانے کے لوگ کہ جو اجرام سماوی کی اہمیت کے اصولی طور پر بہت کم قائل تھے۔

(ه) علاوہ ازیں تاریخ میں مندرج مطالب اور ان کی نشر و اشاعت کے وسائل اس زمانے میں محدود تھے، یہاں تک کہ لکھے پڑھے افراد بہت کم تھے اور کتابیں صرف ہاتھ سے لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس وقت موجودہ دور کی کیفیت نہیں تھی کہ اہم واقعات بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے تمام دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ ان پہلوؤں کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس واقعہ کے غیر اسلامی تاریخین میں مندرج نہ ہونے پر تعجب نہیں کرنا چاہیے اور اس صورت حال کو اس واقعہ کی نفی پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ اس عظیم معجزہ کے وقوع کی تاریخ

روایان حدیث اور مفسرین میں اس بات پر قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے کہ شق القمر کا معجزہ پیغمبر اسلام کی ہجرت سے پہلے قیام مکہ کے زمانے میں رُونا ہوا۔ لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ابتدائے بعثت پیغمبر میں ہوا ہے جب کہ بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ قیام مکہ کے آخری دور میں ہجرت کے قریب ہوا اور وہ بھی کچھ حقیقت کے متلاشی افراد کے تقاضے پر۔ وہ مدینہ میں پیغمبر کی خدمت میں آئے اور انہوں نے عقبہ میں آپ کی بیعت کی تھی۔ بعض روایات سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی طرف سے شق القمر کا اعجاز دکھانے کی علت یہ تھی کہ جادو اور سحر کے اثرات زمینی امور سے متعلق ہوتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بات کا اطمینان حاصل کر لیں کہ محمدؐ کے معجزات جادو نہیں ہیں بلکہ

متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں کی ایک جماعت نے اس معجزہ کو دیکھ کر کہا کہ ہم اسے قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ شام اور یمن کے قافلے آن پہنچیں اور ہم ان سے سوال کریں کہ کیا انہوں نے یہ واقعہ دیکھا ہے لیکن جب آنے والے مسافروں نے اس واقعہ

۱۔ "بحار الانوار" جلد ۱ ص ۲۵۴ (حدیث ۸)

۲۔ " " " " " " " " (حدیث ۱)

۳۔ " " " " " " " " (حدیث ۱۰)

کی تصدیق کی تب بھی وہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے۔
 آخری نکتہ کہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے اور بہت سے معجزات کی طرح یہ معجزہ بھی تاریخ اور ضعیف روایتوں کے خلافات میں آمیزش کا شکار ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا چہرہ غور و فکر کرنے والوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ مثلاً یہ کہ چاند کے ایک ٹکڑے کا زمین پر آنا وغیرہ مناسب یہ ہے کہ ایسی خرافات کو اس واقعہ سے جدا رکھنا چاہیے تاکہ معجزہ کی اصل حقیقت اس میں ملوث نہ ہو۔

- ۴۔ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ۝
- ۵۔ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝
- ۶۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَى شَيْءٍ تُكْرَهُ ۝
- ۷۔ خُشْعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُنْتَشِرٌ ۝
- ۸۔ مُهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝

ترجمہ

- ۴۔ بُرائیوں سے عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی خبریں ان تک پہنچی ہیں۔
- ۵۔ یہ آیتیں خدا کی حکمت بالغہ ہیں لیکن ڈرانے والی چیزیں (ہٹ دھرم لوگوں کے لیے) مفید نہیں ہیں۔
- ۶۔ اس بنا پر ان سے مُنہ پھیر لے اور اس دن کو یاد کر جب خدا کی طرف بلانے والا لوگوں کو اعمال کے حساب کے لیے بلائے گا۔
- ۷۔ وہ قبروں سے نکلیں گے اس صورت میں کہ ان کی آنکھیں وحشت کی وجہ سے جھکی ہوئی ہوں گی اور وہ منتشر ہڈی دل کی طرح بلا مقصد ہر طرف دوڑ رہے ہوں گے۔

۸۔ در آنحالیکہ (وحشت و اضطراب کے زیر اثر) اس بلانے والے کی طرف سر اٹھا کر دیکھیں گے اور کافر کہیں گے کہ آج سخت اور دردناک دن ہے۔

تفسیر

وہ دن کہ جب سب قبروں سے باہر نکلیں گے

اس بحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیتوں میں کفار کی ایک ایسی جماعت کے بارے میں کہ جس نے پیغمبر اسلام کی تکذیب کی تھی اور کسی بھی معجزے کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا تھا یہ آیتیں آئیں۔ ان میں اس قسم کے افراد کے بارے میں مزید تفصیل ہے اور یہ کہ قیامت میں دردناک عذاب کی وجہ سے ان کا کیا حال ہوگا۔

پروردگار عالم پہلے ارشاد فرماتا ہے کہ اس طرح نہیں ہے کہ یہ لوگ بے خبر ہوں بلکہ وہ خبریں کہ جو ان کے لیے بُرائیوں سے اور قبیح چیزوں سے دامن بچانے کا موجب بن سکتی ہیں کافی مقدار میں ان کے پاس آتی ہیں (ولقد جاءهم من الانباء ما فيه مزدجر)۔ خدا کی طرف بلانے والوں کی تبلیغ میں کوئی کمی نہیں تھی بلکہ یہ ان کا بے غیرت پن ہے یہ نہ تو سننے والے کان رکھتے ہیں اور نہ ان میں سچی طلبی کی روح ہے۔ ان میں اس حد تک تقویٰ بھی موجود نہیں کہ جو انہیں آیات الہی میں تحقیق و تدبر کی دعوت "انباء" (خبریں) سے مراد گزشتہ آیتوں اور قوموں کی خبریں ہیں جو مختلف النوع سزاؤں اور عذاب سے ہلاک ہوئیں۔ اس میں قیامت کی خبریں ہیں اور ظالموں اور کافروں کی ان سزاؤں کے بارے میں بیان ہے جس کا ذکر وضاحت سے قرآن میں موجود ہے۔ اس کے بعد مزید ارشاد فرماتا ہے کہ یہ آیتیں حکمت بالغہ الہی ہیں اور اپنے اندر گہرائی رکھنے والی نصیحتیں ہیں لیکن یہ ڈرانے والی چیزیں ان ہٹ و دھرم افراد کے لیے مفید نہیں ہیں۔ (حکمة بالغۃ فما تغن النذر)۔

خلاصہ یہ ہے کہ فاعل کی فاعلیت میں کوئی نقص نہیں ہے جو نقص ہے وہ قابل کی قابلیت میں ہے ورنہ گزشتہ انبیاء کے پاس ان کی آیتوں کے بارے میں جو خبریں آئی ہیں اور وہ خبریں جو قیامت کے بارے میں ان تک پہنچی ہیں، ان میں سے ہر ایک حکمت بالغہ ہے اور اتنی پُر تاثیر کہ ان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو سکتی ہے بشرطیکہ ان میں تھوڑی سی روحانی توجہ موجود ہو۔

بعد والی آیت میں فرماتا ہے "اب جبکہ یہ حق سے بیگانہ افراد قبول کرنے کی طرف قطعاً آمادہ نہیں ہیں تو ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دے اور ان سے منہ پھیر لے اور ان کی آنکھوں کو لٹکائیں"۔

(فتول عنہم)

۱۔ "حکمة بالغۃ" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر کلام میں هذه حکمة بالغۃ ہے۔
 ۲۔ "نذر" جمع ہے نذیر کی یعنی ڈرانے والی چیزیں عام اس سے کہ وہ آیات الہی ہوں یا گزشتہ انبیاء اور آیتوں کی خبریں کہ جن کی صدا لوگوں کے کانوں تک پہنچی ہے بعض نے یہ احتمال بھی تسلیم کیا ہے کہ "نذر" مصدر ہے انذار کے معنوں میں، لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ ضمناً "ما" "ما تغن النذر" میں نافیہ ہے نہ کہ استفہامیہ۔

اور اس دن کو یاد کر کہ جس دن خدا کی طرف بلانے والے ایک وحشت ناک امر کی جانب لوگوں کو بلارہے ہوں گے یعنی حساب کتاب اور نامہ اعمال کی جانچ پڑتال کی جانب (یوم یدع الداع الی شیء نکر)۔

اس بنا پر (یوم یدع الداع) ایک مستقل جملہ ہے کہ جو (فتول عنہو) کے جملے سے الگ ہے اگرچہ بعض مفسرین نے اسے گزشتہ جملہ کا آخری حصہ سمجھا ہے۔ ان کے خیال میں مراد یہ ہے کہ جب قیامت میں خدا کی طرف بلانے والے بلائیں گے اور وہ لوگ تیرا واسن شفاعت تھا ہیں گے تو تو ان سے منہ پھیر لیجو لیکن یہ تفسیر بعید از عقل ہے۔

خدا کی طرف یہ بلانے والا یا خود خدا ہے یا اس کے فرشتے یا اسرافیل کہ جو صور پھونک کر لوگوں کو قیامت میں بلائے گا، یا یہ سب ہیں۔ مفسرین نے مختلف احتمالات تجویز کیے ہیں۔ سورہ "اسرا" کی آیت ۵۲ جس میں خدا فرماتا ہے کہ :

"یوم یدعو کو فتستجیبون بحمدہ"

"یاد کرو اس دن کہ جب خدا تمہیں تمہاری قبروں سے بلائے گا اور تم بھی اس کی پکار پر لبیک کہو گے اس حالت میں کہ اس کی حمد و ثنا کر رہے ہو گے۔" اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں اگرچہ بعد والی آیتیں ان معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہیں اور اس سے مراد فرشتے، حساب کتاب اور جزا و سزا کے مامورین ہوں (شیء نکر) نہ پہچانے ہوئے سے مراد یا تو خدا کی طرف سے باریک بینی کے ساتھ حساب کتاب ہے جو قیامت سے پہلے تک ان کے لیے غیر معروف تھا یا اجنبی قسم کے عذاب ہیں کہ جنہیں وہ کبھی تسلیم نہیں کرتے تھے یا یہ سب امور ہیں کیونکہ قیامت کے تمام معیار انسانوں کے لیے اجنبی اور غیر مانوس ہوں گے۔

بعد والی آیت میں اس سلسلہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے :

"وہ قبروں سے نکلیں گے اس حالت میں کہ ان کی آنکھیں وحشت کی شدت کے باعث جھکی ہوئی ہوں گی اور وہ بلا مقصد ٹڈی دل کے مانند ادھر ادھر دوڑ رہے ہوں گے" (خشعاً البصائر و یخربون من الابدات کأنھو جراد منتشر)۔

آنکھوں سے "خشوع" کی نسبت اس وجہ سے دی ہے کہ منظر اس قدر ہولناک ہو گا کہ آنکھیں اُسے دیکھنے کی تاب نہ رکھتیں ہوں گی۔ لہذا نگاہیں نیچی ہوں گی اور "پراگندہ ٹڈی دل" کی تشبیہ اس مشابہت کی وجہ سے ہے کہ دوسرے پرندوں کے برعکس کجڑاٹے وقت اپنے اندر ایک طرح کا نظم اور ترتیب رکھتے ہیں، ٹڈی دل اپنے اندر کسی قسم کی ترتیب نہیں رکھتا۔ ٹڈیاں درہم و بزم رہتی ہیں اور بغیر کسی مقصد ہر طرف پھیل پڑتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اس دن ٹڈی دل کی طرح کمزور اور ناقواں ہوں گے۔ جی ہاں یہ دل کے اندھے اور بے خبر لوگ اس طرح وحشت زدہ ہوں گے کہ بدست افراد کی طرح ہر طرف رُخ کریں گے اور ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے گویا وہ اپنے وجود سے بے خبر ہوں گے جیسا کہ سورہ حج کی آیت ۲ میں ہمیں ملتا ہے (وقری الناس سکاراً و ماہو بسکاراً)

"اُس دن تو لوگوں کو مست دیکھے گا حالانکہ وہ مست نہیں ہوں گے۔ حقیقت میں یہ تشبیہ اس مفہوم کو لیے ہوئے ہے جو سورہ قارعہ کی آیت ۴ میں آیا ہے: "یوم یكون الناس كالفرش المبثوث"

”یاد کر اس دن کو کہ جب لوگ پر لگندہ بھنگوں کے مانند ہوں گے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے کہ ”جس وقت یہ لوگ اس پیکار کے بعد قبروں سے نکلیں گے تو شدت وحشت کی وجہ سے پیکار نے والے فرشتوں کی طرف گردنیں اٹھا کر دیکھ رہے ہوں گے۔“ (مہطعین الی الداع)۔ ”مہطعین“ کا مادہ ”اھطاع“ ہے۔ اس کے معنی گردن اٹھا کر دیکھنے کے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی کسی چیز کی طرف تیزی سے دوڑنے یا نگاہ خیرہ سے دیکھنے کے لیے ہیں۔ مذکورہ معانی میں سے اس تفسیر میں ہر ایک کا احتمال ہے، اگرچہ پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں، کیونکہ جب انسان کسی وحشت ناک صدا کو سنتا ہے تو فوراً گردن اوجھ کر کے اس طرف دیکھتا ہے جل سے آواز آرہی ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام امور آیت میں اکٹھے موجود ہوں یعنی وہ خدا کی طرف بلانے والے کی آواز سننے کے بعد گردنیں اٹھا کر خیرہ نگاہی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور پھر تیزی کے ساتھ اس کی طرف دوڑ پڑیں گے اور بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوں گے۔ یہ وہ دن ہے کہ اس دن برپا ہونے والے سخت حوادث کی وحشت ان کے وجود کو گھیر لے گی اس لیے اس آیت کے آخر میں ہے ”کافر کہیں گے کہ آج سخت اور دردناک دن ہے“ (یقول الکافرون ہذا یوم عس) وہ دن واقعی سخت ہو گا کیونکہ خدا ان معنوں کی تصدیق کرتا ہے اور سورۃ فرقان کی آیت ۲۶ میں فرماتا ہے :

”وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا“

”وہ کافروں کے لیے سخت دن ہے“ اس تعبیر سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ دن مومنین کے لیے سخت نہیں ہو گا۔

ایک نکتہ

قیامت کا دن کیوں بہت سخت ہے ؟

وہ دن سخت کیوں نہ ہو جب کہ خوف و دہشت کے تمام عوامل مجرموں کا احاطہ کیے ہوئے ہوں گے۔ جب نامہ اعمال ان کے ہاتھوں میں دیے جائیں گے تو ان کی فریاد بلند ہوگی :

”یا ویلتنا ما لہذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا“

”اے ہو ہم پر یہ کیسا نامہ اعمال ہے کہ چھوٹا یا بڑا کوئی کام ایسا نہیں جو اس میں مندرج نہ ہو“ (کھف ۴۹)

پھر یہ کہ کوئی اچھا یا بُرا چھوٹا یا بڑا کام جو انہوں نے کیا ہو گا اس سب کا حساب انتہائی باریک بینی کے ساتھ کیا گیا ہو گا۔

”ان تلك مثقال حبة من خردل فتكن فصحرة اوفى السماوات اوفى الارض يأت بها“

اللہ ان اللہ لطیف خبیر

”اگر خردل کے دانہ کے برابر اچھا یا بُرا عمل کسی پتھر کے اندر یا آسمانوں کے کسی گوشہ میں یا ذہن کے اندر چھپا

ہو گا تو خدا اس کو حساب کے لیے حاضر کرے گا کیونکہ خدا باریک بین اور آگاہ ہے۔“ (لقمان ۱۶)

تیسری بات یہ ہے کہ وہاں کسی قسم کی تلافی کا امکان نہیں ہو گا اور کوئی عذر بھی نہیں سنا جائے گا نیز واپسی کی راہ بھی مسدود ہوگی جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے۔

”واقفوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منها شفاعۃ ولا یؤخذ منها عدل ولا هم ینصرون“

”اس دن سے ڈرو کہ جس میں کوئی شخص سزا و جزا میں دوسرے کی جگہ نہیں لے گا نہ اس کے بارے میں شفاعت قبول ہوگی اور نہ تاوان یا بدل ہی قابل قبول ہوگا اور نہ کوئی شخص اس کی مدد کے لیے کھڑا ہو سکے گا۔“ (بقرہ ۴۸)

پھر ہم یہ بھی پڑھتے ہیں :

”ولوتزی اذ وقفوا علی النار فقالوا یا لیتنا نرد ولا نکذب بأیات ربنا ونکون من المؤمنین“

”اگر تو ان کی حالت دیکھے جس وقت وہ جہنم کی آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اے کاش ہم دنیا کی طرف دوبارہ پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کرتے اور مؤمنین میں سے ہوتے“ (لیکن یہ باتیں ان سے قبول نہیں کی جائیں گی) (انعام ۲۷)

چوتھا امر یہ ہے کہ خدا کا عذاب اس قدر شدید ہے کہ مائیں اپنی اولاد کو بھول جائیں گی ، حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے اور لوگ مبہوت اور مست نظر آئیں گے حالانکہ وہ مست نہیں ہوں گے لیکن خدا کا عذاب شدید ہے۔

”یوم ترونها تذہل کل مرضعة عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملها وتزی

الناس سکاری وما هو بسکاری ولكن عذاب الله شدید“ (ج ۲)

”اس بنا پر گنہگار اضطراب و وحشت میں اس قدر گرفتار ہوں گے کہ وہ پسند کریں گے کہ جو کچھ اس جہان میں ان کے پاس ہے اسے دے دیں اور عذاب الہی سے نجات حاصل کر لیں۔“

”یود المجرم لو یفتدی من عذاب یومئذ ببنیہ وصاحبته و اخیه وفصیلته التي توبیه ومن فی الارض جمیعاً شو ینجیہ کلاً انھا لظی“

”مجرم خواہشمند ہوگا کہ اس دن کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنا بیٹا، بیوی اور رشتہ دار جو شکلات میں اس کے مددگار تھے، حتیٰ کہ تمام لوگ جو روئے زمین پر ہیں فدا کر دے

لیکن کوئی چیز کچھ فائدہ نہ دے گی۔ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ اس کے انتظار میں ہے۔“ (سجرات ۱۵ تا ۱۷)

کیا ان چیزوں کے ہوتے ہوئے اور دوسری ان دل ہلا دینے والی باتوں کی موجودگی میں کہ جو قرآن میں مذکور ہیں یہ ممکن ہے کہ وہ دن سخت دردناک اور تکلیف دہ نہ ہو (خدا ہم سب کو اس دن اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھے)

۹۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ
وَازْدُجِرَ ۝

۱۰۔ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرُ ۝

۱۱۔ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ ۝

۱۲۔ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قُدْرٍ ۝

۱۳۔ وَحَمَلْنَاهُ عَلَى ذَاتِ الْأَوَاجِ وَدُسِرَ ۝

۱۴۔ تَجَرَّى بِأَعْيُنِنَا جَزَاءَ لِمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝

۱۵۔ وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ مُدْكِرٍ ۝

۱۶۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرٍ ۝

۱۷۔ وَلَقَدْ لَيَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدْكِرٍ ۝

ترجمہ

۹۔ اس سے پہلے قوم نوح نے تکذیب کی (جی ہاں) ہمارے بندے (نوح) کی اور کہا وہ

دیوانہ ہے۔ اور انہیں جھڑکیاں دیں۔

۱۰۔ اُس نے بارگاہ پروردگار میں عرض کیا میں اس سرکش قوم سے مغلوب ہوں ان سے میرا

انتقام لے۔

۱۱۔ اس وقت ہم نے آسمانوں کے دروازے کھول دیے اور بہت زیادہ اور مسلسل پانی برسنے لگا۔

۱۲۔ اور زمین کو ہم نے شکافتہ کیا اور بہت سے چشمے نکالے اور یہ دونوں قسم کے پانی جس مقدار میں بھی تھے آپس میں مل گئے۔

۱۳۔ اور ہم نے نوحؑ کو ایک سواری (کشتی) پر کہ جو تختوں اور میخوں سے بنائی گئی تھی سوار کیا۔

۱۴۔ ایسی سواری کہ جو ہماری نگرانی میں چلتی تھی یہ عذاب تھا اس گروہ کے لیے کہ جو اس کا منکر تھا۔

۱۵۔ ہم نے یہ واقعہ نشانی کے عنوان سے امتوں کے درمیان باقی رکھا۔ تو کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

۱۶۔ اب دیکھو کہ میرا عذاب اور تخویف دونوں کیسے تھے۔

۱۷۔ ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان قرار دیا۔ تو کیا کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے۔

تفسیر

قوم نوحؑ کا ماجرا درس عبرت تھا

قرآن کی سنت یہ ہے کہ کفار و مجرمین کو خوف دلانے کے بعد گزشتہ قوموں کی سرگزشت اور ان کی عبرتناک عاقبت کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ انہیں سمجھائے کہ اگر تم اپنے غلط راستے پر چلتے رہے تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔ اس سورہ میں بھی ان مباحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیتوں میں مذکور ہوئے مختصر اور پُر معنی اشارے گزشتہ اقوام میں سے پانچ قوموں کے متعلق موجود ہیں کہ ان میں سے پہلی قوم، قوم نوحؑ تھی۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: ”ان سے پہلے قوم نوحؑ نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی“ (کذبت قبلہم قوم نوح)۔ جی ہاں! انہوں نے ہمارے بندے نوحؑ کی تکذیب کی اور کہا کہ یہ شخص دیوانہ ہے اور اس کے بعد طرح طرح کی ایذا رسانیوں کے ذریعے اسے اپنی پیغام رسانی جاری رکھنے سے منع کیا۔ (فكذبوا عبدنا وقالوا مجنون وازدجر)۔

”کبھی اس سے کہتے کہ اگر تو اپنے کام سے باز نہ آیا تو ہم تجھے سنگسار کر دیں گے۔“

”قَالُوا لَنْ لَمُوتُنْهُ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ“ (شرا - ۱۱۶)

اور کبھی اس کا گلا اس طرح دباتے کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتا لیکن جب ہوش میں آتا تو کہتا:

”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمُ لَا يَعْلَمُونَ“

”خداوند! میری قوم کو بخش دے یہ نہیں جانتے“

خلاصہ یہ کہ جس طرح ان سے ہوسکا انہوں نے اسے ایذا پہنچائی لیکن وہ تبلیغ سے دستبردار نہ ہوا۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ اس آیت میں تکذیب کا ذکر دو مرتبہ ہوا ہے۔ بظاہر اس بنا پر کہ پہلی مرتبہ اجمالی شکل میں ہے اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ۔ ”عبدنا“ ہمارا بندہ۔ ”سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مغرور و سرکش قوم فوج کی نہیں بلکہ ہماری مد مقابل تھی۔ (وازدجر) کا جملہ اصل میں زجر سے ہے اس کے معنی دُور کرنے کے ہیں اور بلند آواز سے کسی کو دھتکارنے کے ہیں لیکن یہ لفظ ہر ایسے عمل کے لیے بولا جاتا ہے جس کا روکنا مقصود ہو۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ زیر بحث آیت میں ”قَالُوا“ فعل معلوم کی شکل میں آیا ہے اور (ازدجر) فعل مجہول کی شکل میں، شاید اس وجہ سے کہ ان کے اعمال نوحؑ کے زجر و توبیخ کے مقابلے میں اتنے زیادہ نامناسب تھے کہ پروردگار عالم ان میں سے کسی گروہ کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتا۔

اس کے بعد فرماتا ہے: ”جس وقت نوحؑ ان کی ہدایت سے ملتی طور پر مایوس ہو گئے تو انہوں نے بارگاہِ الہی میں عرض کی پروردگار! یہ غی اور مجرم گروہ مجھ پر غالب آگیا ہے۔ پروردگار! ان سے میرا انتقام لے“ (فدعاریہ انی مغلوب فانتصر)۔ انہوں نے دلیلِ حجت اور بُرہان کے ذریعہ مجھ پر غلبہ حاصل نہیں کیا بلکہ ظلم، تکذیب، انکار اور مختلف قسم کے دباؤ کے ذریعہ مجھ پر غلبہ حاصل کیا ہے تو اب یہ قوم باقی رہنے کے قابل نہیں ہے۔ لہذا ان سے میرا انتقام لے اور مجھے ان کے مقابلے میں کامیابی عطا فرما۔ جی ہاں! یہ عظیم پیغمبر جب تک ان کے ہدایت پانے کی امید رکھتا تھا اس وقت تک خدا سے دعا کرتا رہا کہ انہیں بخش دے لیکن جب بالکل مایوس ہو گیا تو پھر اس نے ان پر نفرین کی اور ان کے حق میں بددعا کی۔

اس کے بعد ان کے عذاب کی کیفیت کی طرف صاف اور دل ہلا دینے والا اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ ”ہم نے نوحؑ کی اس درخواست کے بعد آسمان کے دروازے کھول دیے۔ پھر شدید اور مسلسل بارش ہونے لگی“ (ففتحنا البواب السماء بماء منهمر) آسمان کے دروازوں کو کھول دینے کے الفاظ بہت ہی خوبصورت ہیں کہ جو شدید بارش کے وقت استعمال کیے جاتے ہیں جیسا کہ ہم اردو میں بھی کہتے ہیں ”گویا آسمان کے دروازے کھل گئے اور جتنا پانی تھا سب برس گیا“۔ منہمرا مادہ ”ہمر“ بروزن ”صبر“ ہے اس کے معنی شدت سے آنسوؤں کا بہنا یا پانی کا برسنا ہے۔ یہ لفظ جانور کے تھن کو دودھ کے آخری قطرہ تک دھنسنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تعجب اس امر پر ہے کہ مفسرین کے بعض اقوال میں آیا ہے کہ وہ برسوں سے خشک سالی کا شکار تھے اور بارش کے انتظار میں تھے

۱۔ ”تفسیر کشاف“ ”ابوالفتح رازی“ در ذیل آیات زیر بحث۔

۲۔ ”انتصر“ کے معنی مدد طلب کرنے کے ہیں جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۴۱ میں آیا ہے لیکن یہاں انتقام کے معنی میں ہیں۔

۳۔ ایسا انتقام جو عدل و حکمت پر مبنی ہو۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ تقدیر عبارت میں ”انتصرنی“ تھا۔

یہاں تک کہ اچانک بارش ہونے لگی مگر زندہ کرنے والی بارش نہیں بلکہ جان سے مار دینے والی۔ نہ صرف یہ کہ آسمان سے زیادہ پانی برسے لگا بلکہ زمین سے بھی اُبلنے لگا جیسا کہ آیت میں آیا ہے: "اور ہم نے زمین کو شکافتہ کیا اور اس سے زیادہ چشمتے نکالے" (وفجرنا الارض عیسوئا)۔

اور یہ دونوں پانی اتنی مقدار میں کہ جس قدر مطلوب تھے آپس میں مل گئے اور اس نے ساری زمین کو گھیر لیا۔ فالق الماء علی امر قد قدر۔ بعض مفسرین نے "قد قدر" کے لفظ کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ یہ دونوں پانی پورے طور پر ایک دوسرے کی مقدار کے برابر تھے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ساری زمین سے پانی اُبلنے لگا، چشمتے نکل آئے، آسمان سے پانی برسے لگا، یہ دونوں آپس میں مل گئے اور انہوں نے ایک عظیم سمندر اور طوفان تشکیل دیا۔ یہاں قرآن نے طوفان کے مسئلہ کو چھوڑ دیا، کیونکہ جو کچھ کہنا تھا وہ گزشتہ جملوں میں کہا جا چکا تھا۔ اب نوح کی کشتی و نجات کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے نوح کو ایک سواری پر کہ جو تختوں اور میخوں سے بنائی گئی تھی سوار کیا" (وحملناہ علی ذات الواح وودسر)۔ "دسر" جمع ہے "دسار" کی کتاب کے وزن پر جیسا کہ راغب مفردات میں کتاب ہے کہ "دسر" کے معنی کسی کو غصہ سے دھتکارنے کے ہیں اور چونکہ میخ ان شدید چوڑوں کی وجہ سے کہ جو اس پر پڑتی ہیں، لکڑی وغیرہ میں گھس جاتی ہے اس لیے اسے دسار کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس لفظ کے معنی طناب یعنی رسی کے لیے ہیں۔ وہ اس سے کشتی کے بادبان کی رسیوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن پہلے معنی علی الانصوص الواح کی مناسبت سے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال یہاں قرآن کی تعبیر جاذب توجہ اور پر معنی پروردگار عالم فرماتا ہے کہ اس عظیم مجسم طوفان کے درمیان کہ جو ہر چیز کو نکل گیا تھا، ہم نے حضرت نوح اور ان کے اصحاب کی نجات کا فرمان مٹھی بھر میخوں اور لکڑی کے تختوں کے سپرد کر دیا اور انہوں نے یہ ذمہ داری عمدہ طریقہ سے پوری کی اور یہ قدرت کا عظیم مظاہرہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ قرآنی تعبیر اس زمانے کی ترقی یافتہ صورت رکھنے والی کشتیوں کے مقابلے میں اُس زمانے کی ان سادہ کشتیوں کی طرف اشارہ کے طور پر ہوجن میں خصوصی طور پر بیٹھنے کی جگہیں تھیں اور نہ ان کی خاص صورتیں تھیں۔

پھر بھی حضرت نوح کی کشتی کافی بڑی تھی اور تاریخ کے بیان کے مطابق اس کی تعبیر کے سلسلے میں نوح نے برسوں محنت اور مشقت کی تھی تاکہ مختلف جانوروں کا ایک ایک جوڑا اس میں سما سکے۔ اس کے بعد خدا اپنی خاص عنایت کے ساتھ نوح کی کشتی و نجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ "یہ کشتی ہمارے (علم) کی نظروں کے سامنے موجوں کے سینے کو چیرتی ہوئی ہمارے مشاہدہ اور حفاظت کے ماتحت اپنے سفر کو جاری رکھے رہی" (تجسوی باعیننا)۔ "باعیننا" کی تعبیر (ہماری آنکھوں کے سامنے) ایک لطیف اشارہ ہے کسی چیز کی طرف خصوصی توجہ اور اس کی مکمل نگرانی کی طرف۔ ایسا ہی سورہ ہود کی آیت ۳۷ میں بھی اسی موضوع کے ایک اور حصہ میں پاتے ہیں۔ "واصنع الفلک باعیننا ووجینا"۔ "ہم نے اس پر وحی کی کہ ہماری نظروں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا" بعض مفسرین نے اس کا یہ مفہوم لیا ہے کہ یہ ان انسانوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو کشتی پر سوار تھے۔

۱۔ "روح المعانی" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ "عیون" ہو سکتا ہے کہ الارض کے لیے تیسرے مولد و تقدیر عبارت میں (فجرنا عیون الارض) ہو۔ اس کے بعد عیون جو کہ مفعول ہے جدا ہوا ہے

اور تیسری شکل میں آیا ہے تاکہ مبالغہ اور اہمیت کو بتائے یعنی ساری زمین چشمتے میں بدل گئی تھی۔

۳۔ "اعین" جمع ہے "عین" کی جن کے ایک معنی آنکھ اور دوسرے معنی انسان کے ہیں اس کے علاوہ اور بھی معنی ہیں۔

اس وجہ سے "تجری باعیننا" کے جملے کے معنی ہیں کہ وہ کشتی ہمارے مخلص بندوں کو ساتھ لیے ہوئے ہے لیکن قرآن کی دوسری آیتوں میں اس تعبیر کے دوسرے موارد پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی تفسیر صحیح نظر آتی ہے۔ ایک یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ "باعیننا" ان فرشتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو کشتی نوح کے سلسلہ میں ہدایات آئی تھیں ان میں داخل رکھتے تھے لیکن یہ تفسیر بھی اس دلیل کی بنا پر کہ جو ہم نے اوپر بیان کی ضعیف ہے۔ اس کے بعد پروردگار عالم فرماتا ہے: "یہ تمام سزا تھی ان لوگوں کے لیے کہ جنہوں نے نوح کی تکذیب کی اور کافر ہوئے۔" (جزاء لمن کان کفراً)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت نوحؑ بھی دوسرے انبیاء کی طرح خدا کی بڑی مہربانیوں اور نعمتوں میں سے ایک تھے جن کی بے خبری اور جاہل افراد نے تکذیب کی اور کافر ٹھہرے۔ اس کے بعد اس عظیم واقعہ سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے اس واقعہ کو درس عبرت اور امتوں کے درمیان نشانی کے طور پر باقی رکھا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔" (ولقد ترکناھا آیۃ فہل من مدک)۔

حقیقت حال یہ ہے کہ وہ تمام باتیں جو اہم تھیں اس واقعہ کے ذیل میں بیان کر دی گئی ہیں اور ایک بیدار مغز انسان کو جو کچھ سمجھنا چاہیے وہ اس واقعہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق کہ جو قبل و بعد کی آیتوں سے مطابقت رکھتی ہے "ترکناھا" کی ضمیر واقعہ طوفان، سرگزشت نوح اور ان کی مخالفت سے تعلق رکھتی ہے لیکن بعض مفسرین اسے کشتی نوح کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ کشتی ایک مدت تک عام لوگوں کے درمیان باقی رہی تھی اور جس شخص کی نظر اس پر پڑتی تھی اس کی نظروں کے سامنے طوفان نوحؑ کا تمام واقعہ مجسم ہو جاتا تھا اگر ہم اس روایت کو تسلیم کر لیں کہ اس کشتی کے بچے ہوئے تھے پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ تک باقی تھے اور اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ بعض افراد کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کے زمانے میں اس کشتی کے بقیہ حصے کوہ قفاز وارات میں دیکھے گئے ہیں تو پھر یہ احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ ایک اشارہ دونوں جانب ہو یعنی واقعہ نوح بھی ایک نشانی تھا اور لوگوں کے درمیان رہنے والی کشتی بھی ایک نشانی تھی۔

پروردگار عالم بعد والی آیت میں ایک تہدید آمیز اور پُر معنی سوال کے عنوان کے ماتحت ان کافروں کے متعلق کہ جو زمانہ نوح کے کافروں والے راستے پر چل رہے ہیں فرماتا ہے: "اب بتاؤ کہ میرا عذاب اور تحویف دلانے والے امور کس طرح کے تھے؟" (فکیف کان عذابی ونذری)۔ کیا وہ حقیقت تھے یا محض ایک افسانہ؟

اس بحث سے متعلق آخری آیت میں اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ: "ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان کیا ہے کیا کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے؟" (ولقد یسرنا القرآن للذکر فہل من مدکر)۔

۱۔ توجہ کرنی چاہیے کہ یہاں "کفر" فعل مجہول کی شکل میں ہے جو کہ حضرت نوحؑ کی طرف اشارہ ہے جن کی نسبت وہ لوگ کافر ہوئے تھے ان کے فعل معلوم ہے اور کفار کی طرف اشارہ ہے۔ لہذا اگر آیت میں کسی چیز کا متقدم مانا جائے تو کفر کا نائب فاعل حضرت نوحؑ کی ذات ہوگی کہ جو وہ نعمت تھے کہ جس کا کفر ان کا ۱۔ اگر کہیں تفسیر میں کفر یہ تھا تو حضرت نوحؑ اور ان کی تعلیمات پر عدم اطمینان کی طرف اشارہ ہوگا۔ ۲۔ قوم نوح کے بارے میں ہم تفصیلی مباحث سورہ صود کی آیت ۲۵ تا ۴۹ (جلد ۵ تفسیر نمونہ) میں تحریر کر چکے ہیں۔

بلاشبک وشبہ اس قرآن میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہے۔ تاثیر کی تمام شرائط اس میں جمع ہیں۔ اس کے الفاظ شیریں اور پرکشش ہیں۔ اس کی تعبیریں زندہ اور پُر معنی ہیں۔ اس کے خوف اور بشارتیں واضح اور صریح ہیں۔ اس کی داستانیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کے دلائل مضبوط و مستحکم ہیں۔ اس کی منطق فصیح و بلیغ و متین ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ کسی کلام کو پُر تاثیر بنانے کے لیے ضروری ہے وہ اس میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی آمادگی رکھنے والا دلائل اس کی طرف بھٹکے گا تو وہ اس میں کشش محسوس کرے گا۔

اسلام کی طویل تاریخ میں قرآن کی اس عمیق تاثیر کے بارے میں کہ جو توجہ رکھنے والے دلوں میں موجود تھی اور اس امر (تاثیر) کی واضح شاہد تھی، عجیب و غریب شواہد ملتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اگر کسی تخم کا جوہر حیات ہی مُردہ ہو چکا ہو تو اسے اگر بہترین زمین میں بھی بویں اور بہترین باغبانوں کی زیر نگرانی اس کی آب کوثر سے آبیاری کریں تب بھی وہ نشوونما نہیں پائے گا اور اس سے پھول اور سبزہ پیدا نہیں ہوگا۔

- ۱۸۔ کَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرٌ
 ۱۹۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمٍ نَّحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ
 ۲۰۔ تَنْزِعُ النَّاسُ كَانْتَهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ
 ۲۱۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرٌ
 ۲۲۔ وَلَقَدْ لَيَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَكِّرٍ

ترجمہ

- ۱۸۔ قوم عاد نے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی تو اب دیکھو کہ میرا عذاب اور تخویف کیسے تھے۔
 ۱۹۔ ایک منحوس اور طویل دن ہم نے ان کی طرف سر و تیز اور وحشت ناک آندھی بھیجی۔
 ۲۰۔ کہ جس نے لوگوں کو کھجور کے گھن کھائے ہوئے تنوں کی طرح اپنی جگہ سے اُکھاڑ دیا۔
 ۲۱۔ (اب دیکھو) کہ میرا عذاب اور تخویف کس طرح کے تھے۔
 ۲۲۔ ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے آسان کیا ہے۔ کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

تفسیر

اور اسی طرح قوم عاد کی سرگزشت

دوسری قوم کہ جس کی سرگزشت اس سورہ میں حضرت نوح کی سرگزشت کے بعد آئی ہے، قوم عاد ہے۔ قرآن کافروں اور مجرموں کو خبردار اور متنبہ کرنے کے لیے زیر بحث آیات میں مختصر طور پر اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”قوم عاد“ نے بھی اپنے پیغمبر کی تکذیب کی (کذبت عاد)۔

ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام تبلیغ پر جتنا زیادہ زور دیتے اور مختلف طریقوں سے انہیں خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کرتے ان کی کج فہمی اور ہٹ دھرمی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا۔ اپنی دولت و ثروت کے غرور اور خواہشات میں مستغرق رہنے کی وجہ سے جو اُن میں غفلت آگئی تھی اس کے باعث وہ سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ سے محروم ہو چکے تھے۔

آخر کار خدا نے انہیں دردناک عذاب کی سزا دی۔ اس لیے اس آیت کے آخر میں پروردگار عالم اجمالی طور پر فرماتا ہے کہ ”دیکھو میرا عذاب اور تحریف کس طرح کے تھے؟“ (فکیف کان عذابی و نذری)۔

اس کے بعد والی آیت میں اس اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ :

”ہم نے وحشت ناک، سرد اور تیز آندھی، ایک ایسے منحوس دن کہ جو بہت طویل تھا، ان کی طرف بھیجی“ (اِنَّا ارسلنا علیہم رجحا صرّا فی یوم نحسّ مستمر)۔ ”صر صر“ کا مادہ ”صر“ بردزن شرب ہے۔ اس کے معنی باندھنے اور محکم کرنے کے ہیں۔ صر صر کے لفظ میں اس کی تکرار تاکید کے لیے ہے اور چونکہ یہ ہوا سرد، شدید، پُرسوز اور گونج سے بھری تھی، اس وجہ سے یہ لفظ اس کے لیے استعمال ہوا ہے۔ نحس اصل میں اس شدید سُرخ کی معنوں میں ہے جو کبھی کبھی اُفق پر نمودار ہوتی ہے اور اس طرح وہ شعلہ ہے جس میں دھواں نہ ہو۔ عرب اسے ”نحاس“ کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر اس منحوس کے لیے استعمال ہوا ہے جو نیک کے مقابل ہو۔ ”مستمر“ ”یوم“ کی یا ”نحس“ کی صفت ہے۔ پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن کے حوادث اسی طرح طولانی تھے جس طرح کہ سورہ حاقہ کی آیت میں مذکور ہیں ”سات رات اور آٹھ دن یہ عذاب الہی ان پر مسلط رہا۔ یہاں تک کہ اس نے سب کو تلیٹ کر کے رکھ دیا اور کسی کو زندہ نہ چھوڑا“

دوسری صورت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دن کی صورت برقرار رہی یہاں تک کہ سب کو ہلاک کر دیا۔

بعض مفسرین نے نحس کے معنی گرد و غبار سے لبریز کے لیے ہیں اس لیے کہ یہ آندھی اس قدر غبار آلود تھی کہ وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب یہ آندھی دُور سے ظاہر ہوئی تو وہ یہ سمجھے کہ گھنگھور گھٹا ان کی طرف آرہی ہے لیکن بہت جلد وہ سمجھ گئے کہ تیز آندھی ہے جو ان پر عذاب کی صورت میں ہلاک کرنے کے لیے وارد ہوئی ہے۔ سورہ احقاف کی آیت ۲۴ میں آیا ہے۔ ”فلما رآوہ عاصفاً مستقبل اودیتہم قالوا ہذا عارض ممطرنا بل هو ما استعجلتہو بہ ریح فیہا عذاب الیم“

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آیت کے معنوں میں دونوں مفہوم موجود ہوں۔ اس کے بعد اس تیز آندھی کی کیفیت کے بارے میں پروردگار عالم فرماتا ہے کہ ”لوگوں کو گھٹن کھائے ہوئے کھجور کے تنوں کی طرح اکھاڑ دیا اور وہ ان کو ہر طرف پھینکتی تھی۔ (تنزع الناس کانہم اعماج نخل منقعر)۔ ”منقعر“ کا مادہ ”قعر“ ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا سب سے نیچے کا نقطہ۔ اس لیے یہ لفظ جڑ سے اکھاڑنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ مفہوم یا تو اس بنا پر ہے کہ قوم عاد کے لوگ قوی الجشہ تھے اور سخت جسم رکھتے تھے یا یہ کہ انہوں نے تیز آندھی سے بچنے کے لیے زمین میں گڑھے کھود رکھے تھے اور زمین پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں لیکن اس روز آنے والی آندھی اتنی زور دار اور طاقتور تھی کہ ان کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالتی تھی اور ادھر ادھر پھینکتی تھی۔ وہ ان کو اس زور سے زمین پر پینچتی تھی کہ ان کے سر تن سے جدا ہو جاتے تھے۔ ”اعجاز“ جمع ”عجز“ ”رجل کے وزن پر“۔ عجز کے معنی ہیں کسی چیز کا بچلا یا بچھلا حصہ۔ ان لوگوں کو کھجوروں کے تنوں کے نچلے حصہ سے تشبیہ اس لیے دی ہے کہ وہ ہوا پہلے ان کے سر اور ہاتھوں

کو جدا کر کے اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتی تھی اور اس کے بعد بدن کے باقی حصہ کو بے شاخ و برگ کھجور کے تنے کی طرح چاہے جس طرف پھینک دیتی تھی۔ یا اس وجہ سے کہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ہوا اس قدر تیز تھی کہ وہ ان کو سر کے بل زمین پر گرانی تھی اور ان کی گردنوں کو توڑ کر سروں کو الگ کر دیتی تھی۔

اس کے بعد قرآن تنبیہ کے طور پر کہتا ہے: ”اب دیکھو کہ میرا عذاب اور میری تحریف کس طرح کی تھی“ (فکیف کان عذابی ونذر)۔ ہم نے دوسری ایسی قوموں کے ساتھ کہ جنہوں نے تکذیب، کبر و غرور اور گناہ و عصیان کا راستہ اختیار کیا تھا، اس طرح کا سلوک کیا ہے تو تم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہو کیونکہ تم بھی تو انہی کے راستے پر چل رہے ہو۔ پھر اس واقعہ کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی ہے کہ جو پسند و نصیحت حاصل کرے۔ کیا تم خدا کی طرف سے آنے والی تنبیہ و تحریف کے لیے کوئی دیکھنے والی آنکھ رکھتے ہو؟“ (ولقد یسرنا القرآن للذکر فہل من مذکر)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ: فکیف کان عذابی ونذر کے جملے کی قوم عاد کے بارے میں تکرار ہوئی ہے یعنی وہ دوسرے استعمال ہوا ہے ایک تو اس سرگزشت کے بیان کے آغاز میں اور ایک مرتبہ اس کے آخر میں۔ یہ بات غالباً اس لیے ہے کہ اس گروہ پر آنے والا عذاب دوسری قوموں پر آنے والے عذاب کی نسبت زیادہ شدید اور وحشت ناک تھا۔ اگرچہ سارے عذاب شدید ہی ہوتے تھے۔

ایک نکتہ

نیک اور بد دن

یہ بات لوگوں کے معمولات میں سے ہے کہ وہ بعض ایام کو نیک اور بعض کو نحس قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اس نیک یا منحوس ہونے کے تعین کے بارے میں اختلافات بھی بہت ہیں۔ یہاں گفتگو یہ ہے کہ آیا یہ عقیدہ اسلام کے نقطہ نظر سے قابل قبول ہے یا نہیں یا پھر کیا یہ نظریہ اسلام سے اخذ کیا گیا ہے؟۔ بہر کیف یہ نظریہ عقلی طور پر محال نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے زمانے کے اجزاء ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں اور ان میں فرق موجود ہو۔ بعض اجزاء میں نحوست کے اثرات ہوں اور بعض میں اس کی ضد کے اثرات ہوں۔ اگرچہ کسی دن کو منحوس اور کسی کو نیک ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس عقلی دلیلیں نہیں ہیں۔ پس اس قدر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”یہ ممکن ہے“ لیکن عقلی لحاظ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ اگر شریعت محمدیہ کی طرف سے، اس وحی الہی کے ذریعہ کہ جو نہایت وسیع آفاق کو ظاہر کرتی ہے، ہمارے پاس دلیلیں ہوں تو ان کے قبول کرنے میں ہمارے لیے کوئی امر مانع نہیں ہے بلکہ اس کا ماننا ہمارے لیے ضروری ہے۔

آیات قرآنی میں صرف دو مواقع ایسے ہیں جن میں ”دنوں کی نحوست“ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک تو زیر بحث آیات میں اور دوسرے سورہ لحم سجدہ کی آیت ۱۶ میں کہ جہاں اسی قوم عاد کے بارے میں گفتگو ہے۔ وہاں ہمیں یہ ملتا ہے کہ (فارسنا علیہم سورجاً ماحصر صراً فی ایام نحسات) ”ہم نے سخت تیز اور سرد آندھی منحوس دنوں میں ان پر مسلط کی“۔

۱۔ توجہ کرنی چاہیے کہ ”نحسات“ اس آیت میں ”ایام“ کی صفت ہے یعنی ایام مزبور کی نحوست کے ساتھ توصیف ہوئی ہے جبکہ زیر بحث آیات میں (فی یوم نحس مستم) ”یوم“ کی ”نحس“ کی طرف اضافت ہوئی ہے۔ اور وہ وصفی معنی نہیں رکھتا البتہ اوپر والی آیت کے قرین سے ہمیں کہنا چاہیے کہ یہاں ہوصف کی صفت کی طرف اضافت کی جگہ ہے۔

اس کے برعکس لفظ "مبارک" کی تعبیر بھی بعض آیات قرآنی میں ہمیں نظر آتی ہے۔ چنانچہ شیب قدر کے بارے میں پروردگار عالم فرماتا ہے: **اَنَا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْمُبَارَكَةِ** "ہم نے قرآن کو بابرکت رات میں نازل کیا۔" (دخان-۳) نحس اصل میں جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے عرض کیا ہے اُن کی شدید مرنجی کے معنی میں ہے کہ جو اُسے "نحس" یعنی آگ کے اُس شدید شعلے کی شکل میں پیش کرتا ہے جو دھڑپوں سے خالی ہو۔ پھر اسی مناسبت سے "شوم و منحوس" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح قرآن اس مسئلہ کے بارے میں اجمالی اشارہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کہتا لیکن اسلامی روایات میں "ایام نحس و سعد" سے متعلق بہت سی روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سی روایات و احادیث ضعیف ہیں اور باریہ اعتبار سے ساقط ہیں پھر بھی ان روایات میں ایسی چیزیں موجود ہیں جو قابل وثوق ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا آیتوں کی تفسیر میں مفسرین نے اس کی تائید کی ہے۔ محدث اعظم علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے بھی اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں بحار الانوار میں نقل کی ہیں۔

یہاں مختصراً جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے:

(الف) بہت سی روایتوں میں نیک اور منحوس دن ان حادثات سے متعلق ہونے کی وجہ سے کہ جو ان دنوں میں واقع ہوئے ہیں تفسیر کے ذیل میں مذکور ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کی زبانی ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بدھ کی جو بدگونیاں مشہور ہیں، ان کے بارے میں سوال کیا اور پوچھا کہ یہ کونسا بدھ کا دن ہے تو آپ نے فرمایا:

اُخْرَاءُ عَادَ فِي الشَّهْرِ وَهُوَ الْحَاقُ وَفِيهِ قَتْلُ قَابِيلَ هَابِيلَ اخاه ... - ویوم الاربعة ارسل الله عز وجل الريح علی قوم عاد مینے کا آفری بدھ کہ جو حاق میں واقع ہو۔ اس دن قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا اور خدا نے اسی بدھ کو تیز آندھی قوم عاد کی طرف بھیجی تھی۔

اس لیے بہت سے مفسرین متعدد روایات کی پیروی کرتے ہوئے مینے کے آفری بدھ کو منحوس سمجھتے ہیں اور اسے (اربعة لا تدور) وہ بدھ ملتے ہیں کہ جو پلٹ کر نہیں آتا۔ بعض دوسری روایتوں میں ہمیں ملتا ہے کہ مینے کی پہلی تاریخ نیک ہوتی ہے کیونکہ حضرت آدمؑ اسی تاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح ۲۶ ویں تاریخ کیونکہ خدا نے دریائے نیل کو حضرت موسیٰ کے لیے اسی تاریخ کو شگافتہ کیا تھا۔

یاد رہے کہ مینے کی تیسری تاریخ نحس ہے کیونکہ اس تاریخ کو حضرت آدمؑ و حواؑ جنت سے نکالے گئے تھے اور جنت کا لباس ان کے بدن سے اتار دیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ مینے کی ساتویں تاریخ مبارک ہے کیونکہ اس تاریخ کو حضرت نوحؑ اپنی کشتی پر سوار ہوئے (اور انہوں نے غرق ہونے سے نجات پائی)۔

۱۔ بحار الانوار جلد ۵۹ کتاب السماء و العالم ص ۹۱ اور کچھ اس کے بعد۔

۲۔ تفسیر نورا ثقلین جلد ۵ ص ۱۸۳ (حدیث ۲۵)

۳۔ گوشہ مدرک ص ۱۰۵

۴۔ تفسیر نورا ثقلین جلد ۵ ص ۵۸

۵۔ تفسیر نورا ثقلین ج ۵ ص ۶۱

یا پھر یہ کہ نوروز کے سلسلہ میں امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ہماری نظر سے گزرتی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ وہ دن ہے کہ "کشتی نوحؑ کوہِ جودی پر آکر ٹھہری اور جبریلؑ پیغمبرِ اسلام پر نازل ہوئے اور یہی وہ دن بھی ہے کہ حضرت علیؑ نے دوشِ پیغمبرؐ پر سوار ہو کر بتوں کو توڑا اور واقعہ غدیر بھی نوروز ہی کو واقع ہوا۔

روایتوں میں اس قسم کی اطلاعات عام ہیں کہ جو دنوں کی نحوست اور نیک کو اچھے واقعات اور ناپسندیدہ حوادث وابستہ کرتی ہیں خصوصاً روزِ عاشورہ کہ جسے بنو امیہ اہلبیت کے مقابلہ میں کامیاب ہونے کی وجہ سے نیک دن ٹھاکرتے ہیں ہماری روایتوں میں اس دن کو بابرکت قرار دینے کی شدت سے مخالفت کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اس دن کو آذوقہ مال کے ذخیرہ وغیرہ کا دن قرار نہ دیا جائے بلکہ اس روز اپنے کاروبار کی تعطیل کی جائے اور عملی طور پر بنو امیہ سے اپنا نظام الاوقات مختلف قرار دیں۔ ان روایات کے مجموعہ کی وجہ سے بعض لوگوں نے نیک اور بد ایام کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ اسلام کا مقصد مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ عملی طور پر خود کو ان تاریخی واقعات کے ساتھ مربوط رکھیں اور ناپسندیدہ حوادث اور ان کی بنیاد رکھنے والے لوگوں سے احتراز کریں۔ یہ تفسیر ممکن ہے کہ، ان روایتوں کے ایک حصہ کے بارے میں ٹھیک ہو لیکن سب کے بارے میں یقیناً ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ان میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پوشیدہ تاثیر بعض دنوں سے تعلق رکھتی ہے جس سے ہم آگاہ نہیں ہیں۔

(ب) یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ بعض لوگ نیک و بد ایام کے بارے میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ جس کام کو وہ کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے وہ ایام کے نیک و بد کی تلاش میں لگ جاتے ہیں اور عملی طور پر بہت سے ضروری کاموں سے غافل ہو جاتے ہیں اور کئی سہرے مواقع ہاتھ سے کھو دیتے ہیں یا پھر یہ کہ بجائے اس کے کہ اپنی اور دوسروں کی شکست و کامیابی کے اسباب و عوامل کی تحقیق کریں اور زندگی کے گراں بہا تجربات سے فائدہ اٹھائیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اپنی تمام ناکامیوں کا ذمہ دار اور کامیابیوں کا سبب ایام کی نحوست اور ان کے سعد ہونے کو سمجھتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا حقیقت سے فرار ہے اور افراط کا شکار ہونا ہے نیز حوادثِ زندگی کی نامعقول توجیہ ہے۔ اس قسم کے طرزِ عمل سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنا چاہیے اور عامۃ الناس میں جو چیزیں مشہور ہیں ان کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ نجومیوں اور فال نکالنے والوں کی پیشین گوئیوں کو بھی نظر انداز کرنا چاہیے۔

صرف معتبر حدیث ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی زد سے اگر کوئی حقیقت ثابت ہو تو اسے صدقِ دل سے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ دوسرے جتنے عوامل ہیں ان کو نظر انداز کر کے زندگی کے کام کرنے چاہئیں اور کاوشِ بہیم سے کام لے کر زندگی کی راہ میں قدم آگے بڑھانا چاہیے، خدا پر توکل رکھنا اور اس کے لطف و کرم سے مدد طلب کرنا سب سے مقدم ہے۔

(ج) دنوں کے نیک و بد کی طرف توجہ کرنا نہ صرف یہ کہ انسان کے دل و دماغ کو تاریخی حوادث سے روشناس کرنا ہے بلکہ پروردگارِ عالم کی ذات والا صفات کے ساتھ توشل کرنے کی توفیق بھی بخشا ہے نیز اس سے امدادِ طلبی کا درس دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایسی متعدد روایات پڑھتے ہیں کہ وہ ایام جن کو نحس قرار دیا گیا ہے ان میں ہمیں صدقہ دینے، دعا مانگنے اور پروردگارِ عالم سے مدد طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہم قرآنِ پاک کی تلاوت کریں، ذاتِ خدا پر توکل رکھیں۔ صرف اسی صورت میں ہم اپنی جدوجہد میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ منجملہ دیگر باتوں کے ہم حدیث میں ایک ایسے واقعہ سے باخبر ہوتے ہیں کہ امام حسن عسکری علیہ السلام

کے ایک محبت منگل کو خدمت امام میں وارد ہوئے تو امامؑ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں کل نہیں دیکھا۔ وہ عرض کرنے لگا کہ میں پیر کو کہیں آنا جانا مناسب نہیں سمجھتا، اس کے جواب میں آپؑ نے فرمایا، (من احب ان یقیہ اللہ شریوم الاثنین فلیقرأ فی اول رکعة من صلاة الغداة هل ائی علی الانسان ثوقراً بالوالحسن فوقه والذی شرذک الیوم ولشهو فضرة وسرواً) جو شخص پسند کرتا ہے کہ پیر کے شر سے محفوظ رہے تو وہ نماز فجر کی پہلی رکعت میں سورہ "هل ائی علی الانسان" تلاوت کرے۔ پھر امامؑ نے سورہ هل ائی کی اس آیت کی کہ جو دفع شر کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے، تلاوت فرمائی فوقاهم اللہ شرذک الیوم... خدا نیک لوگوں کو قیامت کے دن کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ وہ انہیں ظاہری ستر میں اور باطنی خوشحالی عطا کرے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ چھٹے امام کے اصحاب میں سے ایک شخص نے آپؑ سے پوچھا کیا کسی صورت میں بڑھ جیسے مکروہ او ناپسندیدہ دن میں سفر کرنا مناسب ہے؟ امامؑ نے فرمایا کہ اپنے سفر کا آغاز صدقہ سے کرو اور روانگی کے وقت آیت الکرسی کی تلاوت کرلو۔ (اور پھر جہاں کہیں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ)۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ دسویں امام علی نقیؑ کا ایک صحابی کہتا ہے کہ میں امامؑ کی خدمت میں پہنچا، اس حالت میں کہ رستے میں میری انگلی زخمی ہو گئی تھی اور اثنائے راہ میں ایک سوار نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے میرے کانڈھے پر ضرب بھی لگائی تھی اور میں ایک ہجوم میں پھنس کر رہ گیا تھا جنہوں نے میرے کپڑے پھاڑ دیے تھے تو میں نے اس دن کو مخاطب کر کے کہا کہ خدا مجھے تیرے شر سے محفوظ رکھے تو کیسا منحوس دن ہے۔ یہ سن کر امامؑ نے فرمایا کہ تو ہم سے عقیدت بھی رکھتا ہے اور پھر ایسی نامناسب بات زبان پر لاتا ہے۔ وہ دن کہ جس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے تو اسے ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ وہ شخص بیان کرتا ہے کہ امامؑ کی بات سن کر میں سنبھلا اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے غلطی کی ہے۔ میں نے عرض کیا مولا میں خدا سے اپنی غلطی کے سلسلہ میں استغفار کرتا ہوں اور اس سے اپنی بخشش طلب کرتا ہوں۔ پھر امامؑ نے مزید فرمایا: ما ذنب الایام حتیٰ صرفتہ تشائمون بها اذا جوزیتہ باعمالکم فیہا "دنوں کا کیا قصور ہے کہ تم انہیں منحوس قرار دیتے ہو حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ تمہاری اپنی پستی کر دار تمہیں گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ فرزند رسولؐ! میں ہمیشہ کے لیے خدا سے استغفار کرتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں۔ تو امامؑ نے فرمایا: (ما یمنعکم ولكن الله یعاقبکم بذمالمعالی الذم علیہا فیہ اما علمت ان الله هو الثیب والمعاقب والمجازی بالاعمال عاجلاً و آجلاً؟ قلت: بلی یا مولائی قال لا تعد ولا تجعل للایام صنعا فی حکم الله)۔ یہ چیز تمہارے لیے فائدہ نہیں رکھتی، خدا تمہیں اس چیز کی مذمت کرنے کی سزا دیتا ہے کہ جو قابل مذمت نہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہی جزا و سزا دیتا ہے؟ وہ بندوں کو اعمال کی جزا و سزا اس دنیا میں بھی دیتا ہے اور اس جہاں میں بھی دے گا پھر فرمایا ایسی بات آئندہ زبان پر نہ لانا اور دنوں کے بارے میں حکم خدا کے برخلاف اثرات قرآنیہ یہ پُر معنی حدیث اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ دنوں کی اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ حکم خدا کے مطابق ہے لہذا ان کے لیے مستقل تاثیر کا کبھی قائل نہیں ہونا چاہیے اور اپنے آپ کو پروردگار عالم کے کُلف و کُرہ سے بے نیاز نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ حوادث کہ جو عام طور پر انسان کے غلط افعال و اعمال کا کفارہ ہوتے ہیں انہیں دنوں کی تاثیر سے منسوب نہیں کرنا چاہیے اور اس طرح خود کو بری الذمہ قرار نہیں دینا چاہیے۔ لیکن ہے کہ امام کا یہ بیان اس باب کی مختلف احادیث کے جمع کرنے کی بہترین راہ ہو۔

- ٢٣- كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ۝
- ٢٤- فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ ۖ إِنَّا إِذًا لَّفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ۝
- ٢٥- أَلْقَى الذِّكْرَ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ ۝
- ٢٦- سَيَعْلَمُونَ غَدًا مِّنَ الْكَذَّابِ الْأَشِرِّ ۝
- ٢٧- إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَهُمْ فَارْتَبِعْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝
- ٢٨- وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُحْتَضَرٌ ۝
- ٢٩- فَنَادُوا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ۝
- ٣٠- فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرٍ ۝
- ٣١- إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمٍ الْمُحْتَظِرِ ۝
- ٣٢- وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَكِّرٍ ۝

ترجمہ

- ۲۳۔ قوم ثمود نے بھی تخویفِ خدا کی تردید کی۔
- ۲۴۔ اور کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے ہی ایک بشر کی پیروی کریں، اور اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم جنون اور گمراہی کا شکار ہوں گے۔
- ۲۵۔ کیا ہمارے درمیان صرف اس شخص پر وحی نازل ہوئی ہے؟ نہیں وہ بہت ہی جھوٹا ہے اور ہوس کا شکار ہے۔
- ۲۶۔ لیکن کل انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا اور خواہش کا پرستار ہے۔
- ۲۷۔ ہم ناقہ کو ان کی آزمائش کے لیے بھیجیں گے۔ تو ان کے انجام کے انتظار میں رہ اور صبر کر۔
- ۲۸۔ اور انہیں بتا دے کہ بستی کا پانی ان کے درمیان تقسیم ہونا چاہیے (ایک دن ناقہ کے لیے اور دوسرا دن ان کے لیے) اور ہر ایک کو اپنے مقررہ وقت پر حاضر ہونا چاہیے۔
- ۲۹۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو پکارا وہ اس کام کے لیے آیا اور (ناقہ) کی کونچیں کاٹ دیں۔
- ۳۰۔ اب دیکھو کہ میرا عذاب اور تخویف کیسے تھے۔
- ۳۱۔ ہم نے ان کی طرف صرف ایک چیخ بھیجی جس کے بعد وہ سب ایسی خشک گھاس میں تبدیل ہو گئے کہ جسے چوپاؤں کے مالک اپنے باڑہ میں جمع کرتے ہیں۔
- ۳۲۔ ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے آسان کیا ہے پس کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

تفسیر

قوم ثمود کا دردناک انجام

وہ تیسری قوم کہ جس کی زندگی کی داستان، مختصر طور پر، درس عبرت کے عنوان سے گزشتہ مباحث کے بعد اس سورہ میں پیش ہوئی، قوم ثمود ہے کہ جو سرزمین ”بحر“ میں، کہ جو حجاز کے شمال میں واقع ہے، رہائش پذیر تھے۔ ان کے پیغمبر حضرت صالحؑ نے انتہائی گوشش کی کہ وہ ہدایت پالیں لیکن ان کی تمام محنت رائیگاں گئی۔

پروردگار عالم اس سلسلے میں پہلے فرماتا ہے کہ ”قوم ثمود نے بھی خدائی تنبیہ کی تکذیب کی اور اس کی طرف سے دیے جانے والے خوف کی کوئی پرواہ نہیں کی“ (حکذبت ثمود بالنذر) اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں ”نذر“ کو ڈرانے والے پیغمبروں کے معنی میں لیا ہے اور قوم ثمود کے حضرت صالحؑ کی تکذیب کرنے کو تمام پیغمبروں کی تکذیب قرار دیا ہے۔ وہ اس لیے کہ تمام پیغمبروں کی دعوت تبلیغ ہم آہنگ ہوتی ہے لیکن ظاہر آیت یہ ہے ”نذر“ یہاں ”انذار“ کی جمع کے طور پر آیا ہے اور اس سے مراد تحریف یعنی ڈرانا اور یہ قدرتی طور پر ہر پیغمبر کے کلام میں موجود ہے۔ اس کے بعد پروردگار عالم، ان لوگوں کی طرف سے جو تکذیب کی گئی اس کی علت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”انہوں نے کہا کیا ہم اپنی نوع کے ایک انسان کی پیروی کریں؟ اگر ایسا کریں تو گمراہی اور جنون میں مبتلا ہوں گے“ (فقالوا ابشرا منا واحدا نتبعه انا اذا لفي ضلال وسعر)۔

جی ہاں بکبر و غرور، خود بینی و خود پسندی، ان کے لیے انبیاء کی دعوت فکر کے مقابلہ میں ایک عظیم حجاب تھے۔ انہوں نے کہا صالحؑ ہم جیسا ہی ایک شخص ہے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی پیروی کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو جنون اور گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔ وہ ہمارے مقابلہ میں کونسا امتیاز رکھتا ہے جو رہبر بنے اور ہم اس کی پیروی کریں۔ یہ وہی اعتراض ہے کہ جو گمراہ اُمتیں زیادہ تر اپنے پیغمبروں پر کیا کرتی تھیں کہ وہ ہماری ہی طرح کے افراد ہیں لہذا خدا کے پیغمبر کس طرح ہو سکتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے ”واحدا“ کی تعبیر سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ صالحؑ کے دشمنوں کی مراد یہ تھی کہ وہ ایک عام شخص ہے۔ زیادہ مال و دولت نہیں رکھتا۔ اس کا کوئی عظیم نام و نسب بھی نہیں ہے۔ بعض نے اس کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ وہ فرد واحد ہے۔ اس کا اپنا کوئی گروہ نہیں ہے۔ حالانکہ رہبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایسے گروہ کا مالک ہو جس پر اسے اختیار حاصل ہو۔ وہ اس امتیاز کے ذریعے دوسروں کو اپنی طرف بلائے۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی ہے، وہ یہ کہ وہ لوگ ”واحد دوی“ پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا اعتقاد ”واحد ذوی“ پر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہماری ہی جنس و نوع کا فرد ہے اور نوع بشر رسالت الہی کا عمدہ نہیں سمجھا سکتی۔ پیغمبر کو فرشتوں کی نوع میں سے ہونا چاہیے تھا۔ تینوں تفسیروں کو ایک جگہ جمع کرنا ممکن ہے لیکن بہر حال ان کا دعویٰ بے بنیاد تھا۔ ”سعر“ بردزن ”شتر“ ہے جمع اس کی سعیر ہے۔ منہوم اس کا بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ اسی لیے باگل اُدثنی کو ”ناقرہ مسعورہ“ کہتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ قوم ثمود نے یہ تعبیر اپنے پیغمبر صالحؑ سے لی ہو کہ جو ان سے کہتے تھے کہ اگر تم بُت پرستی سے باز نہ آئے اور میری دعوت حق کی پیروی نہ کی تو ”ضلال وسعر“ (گمراہی اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ) میں ہو گے۔ تو وہ جواب میں کہتے: ”اگر ہم اپنے جیسے

بشر کی پیروی کریں تو "ضلال و سحر" میں ہوں گے۔ بہر حال "سحر" کا ذکر جمع کی شکل میں حقیقتاً دوام اور تاکید کے لیے ہے خواہ جنوں کے معنی میں ہو یا بھڑکتی ہوئی آگ کے معنوں میں۔ اس کے بعد وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر بغرض محال دجی الہی کسی انسان ہی پر نازل ہوتی ہے تو کیا ہمارے درمیان میں اسی کم حیثیت پر دجی نازل ہوئی ہے؟ حالانکہ زیادہ جانے پہچانے مشہور اور دولت مند افراد ہل سکتے تھے (عراقی الذکر علیہ من بیننا)۔

حقیقت یہ تھی کہ قوم ثمود کی باتیں مشرکین مکہ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی تھیں جو کبھی یہ اعتراض کرتے تھے کہ مال ہذا الرسول یا کل الطعام ویشی فی الاسواق لولا انزل الیہ ملک فی کون معہ نذیراً "یہ پیغمبر کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔ فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوا جو اس کے ساتھ مل کر تحویل کا فرض انجام دیتا۔ (فرقان۔ ۷) کبھی وہ کہتے: لولا نزل ہذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم "یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے اور دولت مند شخص پر کیوں نہیں نازل ہوا" (زخرف۔ ۳۱)۔ اب بنیاد کلام یہ ہے کہ خدا کا رسول کوئی بشر ہی ہو تو پھر کوئی تہی دست بے کس اور بے کار بشر ہی کیوں ہو۔ یہ دل کے اندھے کہ جو گویا پورے دور تاریخ میں ایک ہی طرح کی باتیں کرتے تھے یعنی اگر کوئی شخص صاحب مال و دولت ہو کسی اونچے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو، مقام و منصب کے اعتبار سے بلند ہو اور شہرت بھی رکھتا ہو تو وہ تو خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ معمولی شخص کس طرح رسول ہو سکتا؟ حالانکہ جو لوگ ظالم و جابر ہوتے تھے وہ زیادہ تر ایسے ہی دولت مند نام نہاد طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

اس تفسیر میں بعض مفسرین نے اس نقطہ نظر کو بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ کیا دجی صرف اس شخص پر نازل ہوتی ہے ہم سب پر نازل کیوں نہیں ہوتی۔ ہمارے اور ان کے درمیان کیا فرق ہے جیسا کہ سورہ مدثر کی آیت نمبر ۵۲ میں آیا ہے: بل یرید کل امرئ منہم ان یؤتی صحفاً منشرۃ "بلکہ ان میں سے ہر شخص توقع رکھتا ہے کہ اس پر آسمان سے کتابیں نازل ہوں۔" اس کے بعد پروردگار عالم آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "انہوں نے اس موضوع کو اپنے پیغمبر صالحؑ کے کذب کی دلیل قرار دیا اور کہا کہ وہ بہت جھوٹا، نفس پرست اور تکبر نشین شخص ہے۔" (بل ہو کذاب اشتر)۔ وہ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم پر حکومت کرے اور ہر چیز اپنے قبضہ میں رکھے اور اپنی خوشی کے مطابق کام کرے۔ لفظ "اشتر" کا مادہ "اشتر" بر وزن قر ہے جس کے معنی ہیں ایسی خوشحالی جس میں نفس پرستی شامل ہو۔ لیکن قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے "کل ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ کونسا شخص جھوٹا اور نفس پرست ہے۔" (سیلعمون غداً من الکذاب الا مشر)۔ وہ وقت کہ جب عذاب الہی نازل ہو گا اور ان کی سرکوبی کرے گا اور ان کو ایک مُشتِ خاک میں تبدیل کر دے گا اور "موت کے بعد کا عذاب" اس پر مستزاد ہو گا تو یہ سمجھ لیں گے کہ ان باتوں کا تعلق کس قسم کے افراد کے ساتھ ہو سکتا ہے اور یہ پوچھا کہ کس کے جسم سے مناسبت رکھتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ "غداً" کل سے مراد مستقبل قریب ہے اور یہ مفہوم پرکشش بھی ہے اور لطیف بھی۔ ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئی ہوں تو وہ اپنے عذاب کو واقعی دیکھ چکے ہوں۔ لہذا اب اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ کہا جائے کہ کل وہ سمجھ لیں گے کہ جھوٹا اور نفس پرست کون ہے۔ اس سوال کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ حقیقت میں یہ بات خدا نے اپنے پیغمبر صالحؑ سے کہی تھی اور بعد والے دن کے ساتھ مشروط کر کے کہی گئی تھی اور یہ واضح حقیقت ہے کہ جس دن یہ بات کہی گئی اس دن تک عذاب نازل نہیں ہوا تھا۔

دوسرے پہ کہ کل سے مراد روز قیامت ہو کہ جس روز ہر چیز نہایت واضح طور پر سامنے آئے گی۔ (پہلی تفسیر زیادہ مناسب اور بعد والی آیتوں کے ساتھ زیادہ سازگار ہے)۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکین قوم ثمود نے نزول عذاب سے پہلے ہی صالح کی حقانیت کو سمجھ لیا تھا اور ان کے ناقابل تردید معجزہ کو دیکھ چکے تھے تو پھر ان سے کیوں کہا جاتا ہے کہ یہ کل سمجھ لیں گے۔ اس سوال کا جواب بھی ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کے جاننے کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ممکن ہوتا ہے کہ متقابل اس کا انکار کر دے لیکن بعض اوقات وہ ایسے مرحلے میں پہنچ جاتا ہے کہ پھر اس کے لیے گنجائش انکار باقی نہیں رہتی اور ہر چیز بالکل واضح انداز میں نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ علم یعنی جاننے سے یہاں سمجھ لینے کی ہی انتہا مراد ہے۔ اس کے بعد پروردگار عالم صالح کے ناقہ کی جو ایک معجزہ تھا اور ان کی صداقت کی سند کے طور پر بھیجا گیا تھا، داستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”صالح کی طرف ہم نے وحی کی کہ ہم ناقہ کو ان کی آزمائش اور امتحان کے لیے بھیجیں گے لہذا آپ ان کے انجام کار کا انتظار کریں اور صبر سے کام لیں“ (انا مرسلوا الناقة فتنة لہم فاسبقہم واصطوب)۔ ”ناقہ“ وہی اُونٹنی کہ جو حضرت صالحؑ کے معجزہ کی حیثیت سے بھیجی گئی تھی، کوئی عام اُونٹنی نہیں تھی بلکہ معجزہ نما کیفیتوں کی حامل تھی۔ مشہور روایتوں کی رو سے یہ اُونٹنی پہاڑ کے ایک پتھر سے برآمد ہوئی تھی تاکہ وہ کج فہم اور ہٹ دھرم منکرین کے لیے ایک منہ بولنا معجزہ ثابت ہو۔ ”فتنہ“ جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، سونے کی کٹھالی میں ڈال کر راگ پر پگھلا کر اس کے کھرے ہونے کو ثابت کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ ہر طرح کے امتحان اور آزمائش کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ قوم ثمود اب ایک عظیم آزمائش میں ڈالی جانے والی تھی۔ اس لیے بعد والی آیت میں پروردگار عالم فرماتا ہے: ”ہم نے صالح سے کہا کہ انہیں بتا دے کہ بستی کا پانی ان کے درمیان تقسیم ہونا چاہیے۔ (ایک دن ناقہ کے لیے اور ایک دن بستی والوں کے لیے) اس طرح ایک فریق کو اپنے مقررہ دن پانی استعمال کرنا چاہیے اور دوسرے کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ (ونبہم ان الماء قسمة بینہم کل شرب محتض)۔

اگرچہ قرآن نے اس سلسلہ میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں کی لیکن بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ صالحؑ کی اُونٹنی کے پانی پینے کا جو دن ہوتا تھا، اس دن وہ سارا پانی پی جاتی تھی لیکن بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس کی ہیئت کدائی ایسی تھی کہ جس وقت وہ پانی کے قریب آتی تو دوسرے جانور بھاگ جاتے تھے اور اس کے پاس نہیں پہنچتے تھے لہذا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ گا نہیں تھا کہ ایک دن پانی پینے کا حق اس اُونٹنی کو دیا جائے اور دوسرے دن ان لوگوں کے اختیار میں ہو۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ، جیسا کہ کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ، ان کی آبادی میں پانی بہت کم تھا۔ اگرچہ یہ معنی آیت ۱۴۶ تا ۱۴۸ سے مناسبت نہیں رکھتے، کیونکہ ان آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ایسی سرزمین میں زندگی بسر کرتی تھی جو باغوں اور چشموں سے پُر تھی۔ بہر کیف اس سرکش، ہٹ دھرم اور مفاد پرست قوم نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ ناقہ صالحؑ کو ختم کر دیں حالانکہ صالحؑ انہیں خبردار کر چکے تھے کہ اگر انہوں نے ناقہ کو کوئی اذیت پہنچائی تو جلد ہی ان پر عذاب الہی نازل ہو جائے گا لیکن انہوں نے اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کی اور ”اپنے ایک ساتھی کو آواز دی وہ اس کام کے لیے آیا اور اس نے ناقہ کی کوئی گٹھلی کاٹ دیں“ (فنادوا صاحبہم فتعاطی ففقد)۔ ”صاحب“ سے

لہ ”محتضر“ کا مادہ حضور ہے۔ یہ اسم مفعول ہے اور ”شرب“ پانی کے حصہ یا مقررہ وقت کے معنوں میں ہے۔ اس بنا پر ”کل شرب محتض“ کے معنی یہ ہیں کہ ہر مقررہ وقت پر جس کو اجازت ہے وہ پانی پئے گا اور دوسرا اس روز نہیں آئے گا اور اُسے مزاحمت کا حق نہیں ہوگا۔

یہاں مراد ممکن ہے کہ قوم عاد کا کوئی سردار ہو۔ ان لوگوں میں کا ایک بہت ہی شریر شخص "قدارہ بن سالف" تھا، جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ تعاطی کسی چیز کو پکڑنے یا کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرنے کے معنی میں ہے۔ نیز ہم اور خطرناک کاموں کے انجام دینے کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس کام میں زحمت بہت ہو یا اس کی کوئی مزدوری مقرر کی گئی ہو، اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ یہ تمام مخاہیم زیر بحث آیت میں موجود ہیں اور وہ اس لیے کہ مذکورہ ناقہ کو قتل کرنے کے لیے اچھی خاصی جرات اور جبارت کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے شفقت بھی درکار تھی اور حسب قاعدہ انہوں نے اس کام کے لیے اُجرت بھی مقرر کی تھی۔

"عقر" کا مادہ "عقر" ہے جو ظلم کے وزن پر ہے اور بنیاد اور جڑ کے معنوں میں ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن یہاں ناقہ کے قتل کو ایک فرد کی طرف منسوب کرتا ہے جب کہ سورہ والشمس میں پوری قوم کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرماتا ہے "فعقروها"۔ قوم ثمود نے ناقہ کو مار ڈالا۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ناقہ کو مار ڈالنے والے ایک شخص نے پوری قوم کی رضامندی سے ان سب کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ کام کیا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ جو شخص کسی دوسرے کے کام سے خوش ہو وہ اس میں شریک ہوتا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ قدرہ نے پہلے شراب پی پھر نشہ کی حالت میں اس نے اس امر قبیح کو سرانجام دیا۔ ناقہ کے قتل اور اس کی کیفیت کے بیان بھی مختلف قسم کے ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ تلوار سے اس کی کونچیں کاٹیں۔ بعض کا قول ہے کہ پہلے وہ اس کی گھات میں بیٹھا پھر اس کے تیر مارا آخر میں اس پر تلوار سے حملہ آور ہوا۔ بعد والی آیت اس سرکش قوم پر آنے والے وحشت ناک عذاب کے ذکر کے لیے ایک تہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: "اب دیکھو کہ میرا عذاب اور میری تحریف کس طرح کی تھی" (فکیف کان عذابی ونذر)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "ہم نے ان کی طرف ایک چیخ بھیجی جس کے نتیجے میں وہ ایسی خشک اور روندی ہوئی گھاس کی طرح ہو گئے کہ جس کو گڈر یا اپنے جانوروں کے لیے باڑہ میں جمع کرتا ہے" (انا ارسلنا علیہم صیحة واحدة فکانوا کھشیم المحتظر)۔ "صیحة" سے یہاں مراد ایک عظیم آواز ہے کہ جو آسمان سے اُٹھتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک وحشت ناک چیخ کی طرف اشارہ ہو کہ جو ان کے شہر میں سنائی دی جیسا کہ سورہ جم سجدہ کی آیت ۱۳ میں آیا ہے: فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود "اگر وہ رُود گردانی کریں تو ان سے کہہ دے کہ میں تمہیں قوم ثمود و عاد کے صاعقے سے مشابہ صاعقہ سے ڈراتا ہوں"۔

"ھشیم" کا مادہ "ھشم" "بروزن" "خشم" ہے۔ یہ کمزور چیزوں کے توڑنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ اس کتری ہوئی گھاس کے لیے بولا جاتا ہے جو گوسفندوں کے مالک گوسفندوں کے لیے کاٹ کر رکھتے ہیں۔ کبھی اس خشک گھاس کو بھی کہا جاتا ہے جو جانوروں کے قدموں کے نیچے باڑہ میں روندی جاتی ہے۔ "مخظر" کا مادہ "خظر" "بروزن" "مغز" ہے۔ اس کے معنی منع کرنے کے ہیں۔ اسی لیے اس باڑہ کو جو میٹر بکریوں وغیرہ کے لیے بنایا جاتا ہے اور جو انہیں باہر نکلنے سے روکتا ہے اور وحشی جانوروں کے حملے سے بچاتا ہے، خطیرہ کہتے ہیں اور "مخظر" بروزن "مختب" وہ شخص ہے جو باڑہ کا مالک ہو۔ وہ مفہوم کہ جو اس آیت میں قوم ثمود پر نازل ہونے والے عذاب کو لیے ہوئے ہے بہت ہی عجیب اور پُر معنی ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے اس سرکش قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے زمین یا آسمان سے لشکر ہی ہرگز روانہ

۱ "قدارہ" بروزن "منارہ" ایک قبیح صورت بدسیرت اور شوم ترین فرد تھا۔

۲ اس مطلب کی تشریح ہم نے "پیوند مکتبی" کے عنوان کے ماتحت جلد ۵ سورہ ہود کی آیت ۶۵ کے ذیل میں بیان کی ہے۔

نہیں کیے۔ صرف ایک آسمانی پیچ سے، ایک ایسی آواز سے کہ جو کانوں کے پردے پھاڑ دے، ایک پھاڑ دینے والی عظیم موج سے کہ جس نے اپنے راستے کی ہر چیز کو ایک وسیع و عریض چمک کی لپیٹ میں لے لیا ہو، انہیں کوٹ پیس کر رکھ دیا اور ختم کر ڈالا۔ ان کے آباد محل اور مکانات گوسفندوں کے باڑوں کی طرح ہو گئے اور ان کے بے جان لاشے اس کٹی ہوئی خشک گھاس کی طرح ہو گئے کہ جو بھیڑ بکریوں کے قدموں کے نیچے روندی جاتی ہے۔

مذکورہ صورت حال گزشتہ لوگوں کے لیے ممکن ہے کہ مشکل ہو لیکن اس زمانے کے لوگوں کے لیے جو کسی چیز کے پھٹنے اور دھماکے سے پیدا ہونے والی ان موجوں کے اثرات سے باخبر ہیں، جو اپنے دائرہ اثر میں آنے والی ہر چیز کو پیس کر رکھ دیتی ہیں، نہایت آسانی سے قابل فہم ہے۔ ہاں البتہ عذاب الہی کی گڑ گڑاہٹ کا انسانوں کے بنائے ہوئے بموں کی گڑ گڑاہٹ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ان لوگوں پر اس صاعقہ سے نازل ہونے والی مصیبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا بحث کو پیش کرنے والی آیتوں میں سب سے آخری آیت میں اس دردناک اور عبرت انگیز سرگزشت کے خاتمہ پر پڑ دگاہ عالم دوبارہ فرماتا ہے کہ :

”ہم نے قرآن کو نصیحت اور انسانوں کے بیدار کرنے کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟“
(ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر)۔

قرآن کے مفہیم زندہ اور واضح ہیں، اس کے واقعات اور داستانیں زبان حال سے گویا ہیں اور اس کی تحلیف و تہدید دل ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی ہے۔

- ۳۳۔ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذْرِ ۝
- ۳۴۔ اِنَّا ارْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّا اَل لُّوطِۙ بُجِّيۡنَهُمْ بِسَحَرٍ ۝
- ۳۵۔ نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِيۢ مَنْ شَكَرَ ۝
- ۳۶۔ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْۤ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا۟ بِالنُّذْرِ ۝
- ۳۷۔ وَلَقَدْ رَاوْدُوۡهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَا۟ اَعْيُنَهُۥمْ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِيۡ وَنُذِرَ ۝
- ۳۸۔ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمۡ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ۝
- ۳۹۔ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِيۡ وَنُذِرَ ۝
- ۴۰۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَكِّرٍ ۝

ترجمہ

- ۳۳۔ قوم لوط نے اپنے پیغمبر کی طرف سے کی گئی تحویل کی پے در پے تکذیب کی ۔
- ۳۴۔ ہم نے ان پر ایسی آندھی بھیجی کہ جو سنگریزوں کو اڑاتی تھی (اور ہم نے سب کو ہلاک کر دیا)
- سوائے لوط کے گھر والوں کے کہ سحر کے وقت ہم نے ان کو نجات دی ۔
- ۳۵۔ یہ نعمت تھی ہماری طرف سے ہم اس طرح شکر گزار کو جزا دیتے ہیں ۔

۳۶۔ اس نے انہیں ہماری سزاؤں سے ڈرایا لیکن وہ ایک توشک سے کام لیتے تھے ،
دوسرے جھگڑا کرتے تھے۔

۳۷۔ انہوں نے لوطؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے مہمانوں کو ان کے قبضہ میں دے دیں لیکن
ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں اور انہیں نیست و نابود کر دیا (اور کہا کہ) ہمارے عذاب
اور تحویف کا مزہ چکھو۔

۳۸۔ آخر کار صبح کے وقت دن کے پہلے حصہ میں پائیدار اور واقعی عذاب ان پر آ پہنچا۔

۳۹۔ (اور ہم نے کہا) اب ہمارے عذاب اور تحویف کا مزہ چکھو۔

۴۰۔ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے ؟

تفسیر

قوم لوط زیادہ منحوس صورت حال سے دوچار ہوئی

ان آیتوں میں واقعہ قوم لوطؑ اور اس گمراہ اور بے شرم گروہ پر نازل ہونے والے وحشت ناک عذاب کے بارے میں مختصر
اور دل ہلا دینے والے اشارے پائے جاتے ہیں۔

اس سورہ میں گزشتہ اقوام کی سرگزشت کا یہ چوتھا حصہ ہے۔

پروردگار عالم پہلے فرماتا ہے : ”قوم لوط نے اپنے پیغمبر کی پے درپے تحویف کی تردید کی۔“ (کذبت قوم لوط بالندم)

”نذر“ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے ”انذار“ کی جمع ہے جس کے معنی خوف دلانے اور متنبہہ کرنے کے ہیں۔ اس
تحویف کا ذکر جمع کے صیغوں کے ساتھ بہت ممکن ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی پے درپے تنبیہوں کی طرف اشارہ ہو کہ اس کج فہم قوم نے
ان تمام ڈرانے والی باتوں کو جھٹلایا۔ یا پھر یہ اشارہ ہے حضرت لوطؑ اور ان سے پہلے آنے والے پیغمبروں کی طرف سے کی جانے
والی تنبیہوں کی طرف کیونکہ تمام پیغمبروں کی دعوت حق ایک ہی حقیقت کو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک مختصر سے جملے میں ان
کے عذاب کے ایک گوشہ اور حضرت لوطؑ کے گھر والوں کی نجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : ”ہم نے ان پر وہ تیز آندھی کہ
جو سنگریزوں کو اڑاتی تھی، بھیجی۔“ (انا اسرسلنا علیہم حاصبا) اور ان سب کو سنگریزوں کی اس بارش میں دفن کر دیا۔ ”سوائے لوط کے

خاندان کے کہ ہم نے ان کو سحر کے وقت اس سرزمین بلا سے نجات دی" (الآل لوط نبینا هو بسحر)۔
 "حاصب" اس نیز آندھی کے معنوں میں ہے کہ جو "حصاب" ریت اور سنگریزوں کو اڑائے۔

قرآن کی دوسری آیتوں میں جہاں قوم لوط پر نازل ہونے والے عذاب کا ذکر ہوتا ہے، اس زلزلے کے علاوہ کہ جس نے ان کے شہروں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا، پتھروں کی بارش کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ ہود کی آیت ۸۲ میں ہمیں ملتا ہے۔ فلما جاء امرنا جعلنا علیہا سافلها وامطرنا علیہا حجارة من مسجل منضود۔ "جس وقت ہمارا فرمان آگیا تو ہم نے اس شہر کو زیر و زبر کر دیا اور اس پر سخت اور پتھریلی مٹی کے پتھروں کی بارش کی"۔

کیا یہ دو قسم کے عذاب تھے؟ ایک تو تیز آندھی کہ جو اپنے ساتھ سنگریزوں اور ریگ بیاباں کو اڑاتی تھی اور ان کی سرکوبی کرتی تھی، دوسرے آسمانی پتھروں کی بارش یا یہ کہ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔

بعض اوقات بڑی بڑی آندھیاں بیابان کے گرد و غبار، سنگریزوں اور خاک کے تودوں کو اٹھا کر آسمان کی طرف لے جاتی ہیں اور جس وقت طوفان کا دباؤ کم ہوتا ہے تو ایک ہی مرتبہ ان چیزوں کو کسی دوسری جگہ پھینک دیتی ہیں۔ لہذا عین ممکن ہے کہ یہاں حکم خدا سے گرد آلود آندھی اس بات پر مامور ہو کہ بیابان کے سنگریزوں اور خاک کے تودوں کو فضا نے آسمانی کی طرف اٹھا کر لے جائے اور تباہ و دیران کر دینے والے زلزلے کے بعد انہیں قوم لوط کے شہروں پر پھینک دے اور اس کے کچ بینوں کو ان کے نیچے دفن کر دے اس حد تک کہ ان کے شہروں کے ویرانے بھی صفرِ زمین سے مٹ جائیں تاکہ یہ صورتِ حال ہمیشہ کے لیے دوسرے لوگوں کے واسطے درسِ عبرت بن جائے۔

اوپر والی آیت ضمناً یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت لوطؑ کے خاندان کی نجات صبح کے وقت ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس ستم شعار قوم پر نازل ہونے والے عذاب کا وعدہ بھی صبح کے وقت کا تھا۔ اس لیے یہ خانواده، جو صاحبِ ایمان تھا، آخر شبیں (سوائے لوط کی بیوی کے کہ جس نے اپنا راستہ لوطؑ سے علیحدہ اختیار کیا تھا) شہر سے باہر چلا گیا۔ ان کے جلنے کے بعد تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ پہلے زلزلہ آیا، اس کے بعد پتھروں کی بارش شروع ہوئی جیسا کہ سورہ ہود کی آیت ۸۱ میں آیا ہے۔ فاسر باہلک بقطع من اللیل ولا یلتفت منکم احد الا امرأتک انہ مصیبا ما اصابہم ان موعدهم الصبح الیس الصبح بقریب۔ "رات کے ایک حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر روانہ ہو جاؤ اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ بھی اسی بلا میں گرفتار ہوگی جس میں سب مبتلا ہوں گے۔ ان کی وعدہ گاہ صبح ہے۔ کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟" یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض مفسرین نے اربابِ لغت کی پیروی کرتے ہوئے سحر کے معنی بین الطلوعین کے لیے ہیں یہ معنی اوپر والی آیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔

بعد والی آیت میں تاکید کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ "خاندانِ لوط کی نجات ہماری طرف سے ایک نعمت تھی۔ جی ہاں! اسی طرح

۱۔ اس سلسلہ میں دوسرے مباحث جلد ۹ تفسیر نمونہ سورہ ہود کی آیت ۸۲ کے ذیل میں بیان ہو چکے ہیں۔

۲۔ راغب مفردات میں کہتا ہے: (السحر اختلاط ظلام آخر اللیل بضیاء النہار) آخر شب کی تاریکی کا دن کی روشنی کے ساتھ مل جانا سحر کہلاتا ہے۔

اس شخص کو کہ جو شکر گزار ہی کرے ہم اجر دیتے ہیں۔ (نعمۃ من عندنا کذا لک نجزی من شکر)۔
بعد والی آیت میں یہ حقیقت پیش کی گئی ہے کہ لوطؑ نے پہلے سے ان پر اتمامِ نوحۃ کر دیا تھا اور انہیں عذاب الہی سے آگاہ کیا تھا لیکن انہوں نے خدا کی طرف سے کی جانے والی تنبیہ میں شک کیا اور وہ لڑنے جھگڑنے پر آمادہ رہے۔ (ولقد انذرہو بطشتنا فتماروا بالتندر)۔ "بطش" بروزن "فرش" کسی چیز کو طاقت کے ساتھ پکڑنے کے معنی ہیں اور چونکہ سزا دیتے وقت پہلے مجرم کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں لہذا یہ لفظ سزا کے معنی میں بھی آتا ہے۔ "تماروا" کا مادہ "تماری" ہے۔ اس کے معنی شک کرنے کے اور حق کے مقابلے میں جھگڑنے والی گفتگو کے ہیں۔

انہوں نے درحقیقت ایک دوسرے کی مدد کی تھی اور مختلف طریقوں سے عام لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا کیے تھے تاکہ اس عظیم پیغمبر کی طرف سے جو تنبیہ کی جا رہی تھی اس کے اثرات کو زائل کر دیں۔ انہوں نے لوگوں کے دلوں میں اعتقادات سے متعلق شبہات پیدا کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بدکاری و بے شرمی میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ جس وقت عذاب پر مامور فرشتے خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں مہمانوں کی حیثیت سے حضرت لوطؑ کے گھر میں داخل ہوئے تو بے شرم گروہ ان کے پاس آیا اور جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے: "انہوں نے لوطؑ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے مہمان اُن کی تحویل میں دے دیں" (ولقد راودوه عن ضیفہ)۔ حضرت لوطؑ اس بات پر بے حد پریشان ہوئے اور ان لوگوں سے اصرار کیا کہ وہ ان کی اتنی بے عزتی نہ کریں یہاں تک کہ سورہ حجر کی آیت ۱۷ کے مطابق ان سے وعدہ کیا کہ (ان بداعمالیوں سے توبہ کی صورت میں) اپنی لڑکیوں کی شادی ان سے کر دیں گے۔ یہ چیز اس مظلوم پیغمبر کی انتہائی مظلومیت کو ظاہر کرتی ہے کہ جو اس بے شرم اور بے ایمان قوم کی طرف سے ان کے لیے روا رکھی گئی۔ مقوڑی ہی دیر میں اس حملہ کرنے والے گروہ نے اپنی پہلی سزا پالی جیسا کہ خدا اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "ہم نے ان کی آنکھوں کو اندھا ہی نہیں کیا بلکہ غائب کر دیا اور ان سے کہا کہ میرے عذاب اور میری تحویل کا مزہ چکھو" (فطمنا اعینہم و فذوقوا عذابی و نذر)۔

جی ہاں! یہ وہ مقام تھا کہ قادرِ مطلق نے اپنی عدالت کا کرشمہ دکھایا اور بعض مفسرین کے بقول جبریل کو حکم دیا کہ اپنے شہپر ان سرکشوں کی آنکھوں پر ماریں جس کے نتیجے میں وہ فوراً نابینا ہو گئے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں بالکل غائب ہو گئیں۔ اگرچہ آیت میں گفتگو اس مفہوم کو واضح نہیں کرتی کہ وہ کون لوگ تھے کہ جو فرشتوں کے پیچھے پیچھے آئے تھے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ پوری قوم لوطؑ نہیں آئی تھی۔ وہ ایسے ادا باش لوگ تھے جو بدکاری میں سب سے آگے تھے۔ انہوں نے اس کام میں پیش قدمی کی اور اس طرح ان کی سرگزشت دوسرے لوگوں کے لیے درس عبرت بنی کیونکہ وہ اسی حالتِ زار میں اپنے گروہ کے پاس لوٹ کر آئے لیکن ان میں کوئی ایسا فرد موجود نہیں تھا کہ جو اس ابتدائی عذاب سے عبرت حاصل کرنے کے لیے آمادہ ہوتا۔

یہ جو کہتے ہیں کہ خدا نے ان پر نازل ہونے والے عذاب کو صبح تک روک رکھا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حادثہ ایک روز پہلے واقع ہوا اور اس طرح انہیں ہمت دی گئی کہ وہ ایک رات اور اپنے حالات کے بارے میں غور و فکر کر لیں اور ان بد بخت اندھے ہونے والے افراد کی شکلوں پر عذاب الہی کا نمونہ دیکھیں۔ ممکن ہے کہ انہیں ہوش آجائے اور وہ توبہ کر لیں لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔

۱۔ نعمۃ ایک فعل مقدر کا کہ جو اس کی جنس سے ہے "مفعول بہ" ہے یا "نجینا" کے فعل کا کہ جو پہلے والی آیت میں آیا ہے مفعول لہ ہے۔

ایک روایت کے مطابق خود ان نابیناؤں نے بھی کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ وہ جس وقت دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف لوٹے تو انہوں نے قسم کھائی کہ کل صبح وہ خاندان لوطؑ کا ایک فرد بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔
آخر کار انتہائی عذاب ان پر نازل ہو گیا۔ ایک ایسا تباہ کن زلزلہ آیا کہ جس نے سورج کی پہلی شعاع کے ظاہر ہونے کے ساتھ ہی ان کی زمین کو متزلزل کر کے رکھ دیا جس کے نتیجے میں ان کے شہر منہدم ہو کر رہ گئے، جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور وہ مٹی کے نیچے دب گئے۔ ان کے سروں پر پتھروں کی شدید بارش ہوئی یہاں تک کہ ان کے ویرانوں کے نشانات بھی باقی نہ رہے۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں بڑے اختصار کے ساتھ اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے: ”آخر کار صبح کے وقت پائیدار اور واقعی عذاب ان پر نازل ہوا“ (ولقد صبحھم بکرة عذاب مستقر)۔ جی ہاں مختصر سے لمحات میں یہ سب چیزیں ختم ہو گئیں اور ان کا نام و نشان ہم باقی نہ رہا۔ ”بکرة“ (دن کا آغاز) کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ ”صبحھم“ بہت وسیع معانی رکھتا ہے۔ یہ صبح کے تمام معانی کا احاطہ کرتا ہے جب کہ مفہوم کلام صبح کی بالکل ابتداء سے متعلق تھا۔ یہ واقعہ طلوع فجر کی بالکل ابتداء میں ہوا تھا یا طلوع آفتاب کے آغاز میں صبح طور پر معلوم نہیں ہے لیکن ”بکرة“ کا مفہوم طلوع آفتاب کے آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔ لفظ ”مستقر“ ثابت و برقرار کے معنی میں ہے اور یہاں ہو سکتا ہے کہ اس طرف اشارہ ہو کہ یہ عذاب ستر ستر کھینچنے والا، قومی اور طاقتور تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

بعض مفسرین نے ان معانی کی نشان دہی بھی کی ہے کہ چونکہ دنیاوی عذاب برزخ کے عذاب سے متصل ہو چکا تھا لہذا ”مستقر“ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد پروردگار عالم فرماتا ہے اور یہ دوبارہ ان سے کہا گیا ہے: ”اب میرے عذاب اور میری تحریف کا مزہ چکھو“ (فذوقوا عذابی ونذری) تاکہ پھر کبھی پیغمبروں کی طرف کی ہوئی تنبیہ کو شک کی نظر سے نہ دیکھو۔ یہ جملہ اس واقعہ میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ بات معلوم ہے کہ پہلا جملہ اس ابتدائی عذاب کی طرف اشارہ ہے جس کے نتیجے میں وہ لوگ نابینا ہو گئے تھے جنہوں نے لوطؑ کے گھر پر هجوم کیا تھا۔ دوسرا جملہ عذاب واقعی و اصلی یعنی ویران کرنے والے زلزلے اور پتھروں کی بارش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آخر میں زیر بحث آیات میں سے سب سے آخری آیت میں درج ذیل پر معنی اور ہوش میں لانے والے جملے کی چوتھی مرتبہ تکرار ہوئی ہے ”ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے“ (ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر)۔ قوم لوطؑ نے کوئی نصیحت حاصل نہیں کی نہ تنبیہ سے نہ ابتدائی عذاب سے۔ کیا ایسے دوسرے لوگ کہ جو اس قسم کے گناہوں کے مرکب ہوئے ہیں ان آیات قرآنی کی سماعت کے بعد اپنے ہوش میں آئیں گے اور گناہوں سے توبہ کریں گے؟

۴۱۔ وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النَّذْرُ ۚ

۴۲۔ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخَذَ عَزِيزٌ

مُقْتَدِرٌ ۝

۴۳۔ أَكْفَارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكَ أَمْ لَكُمْ بَرَاءَةٌ ۙ

فِي الزُّبُرِ ۚ

۴۴۔ أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرُونَ ۝

۴۵۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝

۴۶۔ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَذْهَىٰ وَأَمَرٌ ۝

ترجمہ

۴۱۔ تنخویف اور تنبیہ آل فرعون کے لیے آئیں۔

۴۲۔ لیکن ان سب نے ہماری آیات کی تکذیب کی، ہم نے ان کی گرفت کی اور ان پر عذاب نازل کیا۔

۴۳۔ کیا تمہارے کفار ان سے بہتر ہیں؟ یا تمہارے لیے کتب آسمانی میں امان نامہ نازل ہوا؟

۴۴۔ یا یہ کہ وہ کہتے ہیں ہم ایک ایسی جماعت ہیں جو متحد قوی اور کامیاب ہے۔

۴۵۔ لیکن وہ جان لیں کہ ان کی جماعت عنقریب شکست کھا جائے گی اور وہ فرار کی راہ اختیار کر لیں گے۔

۴۶۔ (اس کے علاوہ) قیامت ان کی وعدہ گاہ ہے اور قیامت کا عذاب زیادہ ہولناک اور

تلخ ہے۔

تفسیر کیا تم گزشتہ اقوام سے افضل و برتر ہو؟

اس سلسلہ کلام میں پانچویں اور آخری جن قوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے وہ قوم فرعون ہے لیکن چونکہ اس قوم کی سرگزشت قرآن کی مختلف سورتوں میں تفصیلی طور پر آئی ہے لہذا یہاں صرف ایک مختصر لیکن چچا مثلاً اشارہ ان کی عبرت انگیز داستان کی طرف ہوا ہے۔ بزرگ عالم ارشاد فرماتا ہے: "ہماری تنبیہیں یکے بعد دیگرے آل فرعون کی طرف آئیں۔" (ولقد جاء آل فرعون النذر)۔ آل فرعون سے مراد صرف فرعون کا خاندان اور اس سے وابستہ افراد نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ ان کے تمام پیروکاروں پر حاوی ہے۔ لفظ "آل" عموماً اہل بیت اور خاندان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعض اوقات، جیسا کہ ہم نے کہا ہے، ایک وسیع معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرینہ کلام بتاتا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے "نذر" (بروزن کتب) "نذیر" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ڈرانے والا۔ یہ ڈرانے والا خواہ کوئی انسان ہو یا حادثہ کہ جو انسانوں کو خبردار کرے، انہیں ان کے انجام کار سے ڈرائے اور بچنے کی تلقین کرے۔ پہلی صورت میں ممکن ہے کہ اُدپر والی آیت کا اشارہ مُوسٰی اور ہارون کی طرف ہو۔ دوسری صورت میں ممکن ہے کہ حضرت مُوسٰی کے نو معجزوں کی طرف اشارہ ہو۔ بعد والی آیت بتاتی ہے کہ یہاں دوسرے معنی مناسب ہیں۔ لہ

خدا کے ان دو عظیم پیغمبروں کے مقابلے میں اور ان کی تہدید و تنبیہ کے مقابلے میں آل فرعون کا جو ردِ عمل ہے، اس پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے بعد والی آیت میں پروردگار عالم فرماتا ہے:

"انہوں نے ہماری سب آیات کی تکذیب کی۔" (کذبوا بآیاتنا کلہا)۔ جی ہاں ان خود پسند مغرور اور ظالم و جابر لوگوں نے بلا استثناء خدا کی تمام آیتوں کی تکذیب کی۔ ان کو جھوٹ، سحر یا اتفاقی حوادث بتایا۔ لفظ "آیات" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ معجزات پر بھی حاوی ہے لیکن سورہ اسرا کی آیت ۱۰۱ کے قرینہ سے، "ولقد اتینا موسیٰ تسع آیات بیّنات"۔ "ہم نے مُوسٰی کو نو واضح معجزات عطا کیے"، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انہی نو معجزات کی طرف اشارہ ہے۔

لہ توجہ کرنی چاہیے کہ "نذر" "نذیر" کی جمع بھی ہے اور مصدر یا اسم مصدر کے معنی بھی رکھتا ہے اور چونکہ مصدر کا صفت کی حیثیت سے بھی

اطلاق ہوتا ہے لہذا دونوں ایک ہی مفہوم کی طرف پلٹ سکتے ہیں۔

لہ "موسٰی کے نو معجزات" قرآن کی مختلف آیتوں پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتے ہیں۔ (باقی جلد شیعہ آئندہ صفحہ پر)

اگر انسان حقیقت کا متلاشی ہو تو ان معجزوں میں سے کسی ایک کا پہلے سے خوف محسوس کرتے ہوئے دیکھنا اور اس کے بعد خدا کے پیغمبر کی دعا کے وسیلے سے مصیبت کا برطرف ہو جانا اس کے لیے کافی ہے لیکن جس وقت انسان بالکل ہی ہٹ دھرم بن جائے تو پھر آسمان و زمین سر سے پائیک آیت خدا بن جائیں تو بھی موثر نہیں ہو سکتے۔ صرف عذاب الہی کو اگر ایسے پُر غرور دماغوں کو کچلنا چاہیے۔ چنانچہ زیر بحث آیت کے ذیل میں ہمیں ملتا ہے کہ "ہم نے ان کی گرفت کی اور انہیں سزا دی۔ گرفت اس کی کہ جو کبھی مغلوب نہیں ہوتا اور مقتدر و توانا ہے" (فاخذناہمواخذ عزیز مقتدر)۔ "اخذ" پکڑنے اور گرفت کرنے کے معنی میں ہے۔ چونکہ مجرم کو سزا دینے کے لیے پہلے اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں لہذا یہ لفظ سزا و عذاب کے کنائے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جو مفہوم اس واقعہ کے ذیل میں آیا ہے وہ تمام سرگزشتوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ وہ اس وجہ سے کہ فرعون اپنی طاقت اور قوت پر سب سے زیادہ فخر و مباہات کرتے تھے اور ان کی اس قوت و طاقت کی ہر جگہ شہرت تھی۔ پروردگار عالم فرماتا ہے کہ ہم نے ان کی گرفت کی، اور گرفت بھی خوب مضبوط، تاکہ سب پر واضح ہو جائے کہ یہ عارضی اور مختصر سی طاقت خدا کی عزت و قدرت کے مقابلہ میں بالکل کھوکھلی ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ باعث تعجب یہ ہے کہ وہی دنیا کے نیل جو ان کی طاقت ثروت اور آبادی و تہذیب کا سرچشمہ تھا ان کی بربادی پر مامور ہوا۔ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ نہایت معمولی موجودات مڈمی دل، جوئیں اور مینڈک ان پر مسلط ہوئے اور انہوں نے انہیں اتنا تنگ کیا کہ لاچار کر کے رکھ دیا۔ گزشتہ قوموں کے واقعات اور سرکش و مجرم امتوں پر نازل ہونے والے عذاب کو بیان کرنے کے بعد اس سے اگلی آیت میں پروردگار عالم فرماتا ہے: "کیا تمہارے کفار گزشتہ کافروں سے بہتر ہیں یا تمہارے لیے آسمانی کتابوں میں امان نامہ نازل ہو چکا ہے" (اکفارکم و خیر من اولئکم ام لکم براۃ فی الزبور)۔

قوم فرعون و لوح و ثمود اور تمہارے درمیان فرق کیا ہے۔ اگر وہ کفر، سرکشی، ظلم اور گناہ کی وجہ سے طوفانوں، زلزلوں اور صاعقتوں میں گرفتار ہوئے تو پھر کونسی دلیل ہے جس کی بنا پر تم ایسے مصائب کا شکار نہیں ہو سکتے۔ کیا تم ان سے بہتر ہو؟ یا پھر یہ کہ تمہارا طغیان اور عناد و کفر ان کے طغیان و عناد اور کفر سے کمتر ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے تو پھر کس طرح خود کو عذاب الہی سے محفوظ سمجھتے ہو مگر اس صورت میں کہ امان نامہ تمہارے لیے آسمانی کتب میں نازل ہوا ہو۔ یقیناً یہ دعویٰ جھوٹا ہے اور اس پر تم کسی قسم کی دلیل نہیں رکھتے۔ یا یہ کہ وہ کہتے ہیں: "کہ ہم متحد، متفق اور طاقتور جماعت ہیں اور ہم اپنے مخالفوں سے انتقام لیں گے اور ان پر کامیابی حاصل کریں گے" (ام یقولون نحن جمیع منتصر)۔

(۱) عصا کا عظیم اثر دے میں تبدیل ہونا۔ (ظ - ۲۰) (۲) "ید بیضی" حضرت موسیٰ کے ہاتھ کا مصدر نور کی طرح چمکنا۔ (ظ - ۲۲) (۳) سرکشی کرنے والا طوفان۔ (اعراف - ۱۳۳) (۴، ۵، ۶، ۷) مڈمی دل جو زراعتوں پر مسلط ہوئے اور جوئیں (ایک قسم کی نباتی مصیبت) میٹھک جنہوں نے دریائے نیل سے نیکل کر گزشتہ سن منت میں ان کی سطح زندگی کو ڈھانک لیا اور خون دریا سے نیل نے خون کا رنگ اختیار کیا۔ (اعراف - ۱۳۳) ۸۸ خشک مالی اور پھلوں کی کمی (اعراف - ۱۳۰) جن میں سے ہر

(۱) ایک کی تفصیل متعلقہ آیات کے ذیل میں دی گئی ہے۔

۲ "اکفارکم" میں ضمیر ظاہر (ام لکم براۃ فی الزبور) کے قرینے سے کفار عرب کی طرف لوٹتی ہے۔

۳ باوجودیکہ نحن جمع کی ضمیر ہے اس کی خبر "جمیع" مفرد کی شکل میں آئی ہے اور اسی طرح "منتصر" جو کہ خبر کے بعد خبر یا جمع کی صفت ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ جمیع اگرچہ لفظاً مفرد ہے لیکن معنی کے لحاظ سے جمع ہے۔

”جمع“ ”مجموع“ کے معنوں میں ہے۔ یہاں اس سے مراد ایسی جماعت ہے کہ جن کا کوئی مطلوبہ مقصد ہو اور وہ عمل کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ”منتصی“ کا مفہوم انہی معانی کی تاکید کے لیے ہے کیونکہ اس کا مادہ ”انتصار“ ہے جس کے معنی انتقام لینے کے اور کامیاب ہونے کے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت خطاب کی شکل میں تھی لیکن زیر بحث آیت اور آگے آنے والی آیات غائب کی صورت میں کفار سے گفتگو کرتی ہیں اور یہ ان کی ایک قسم کی تحقیر ہے یعنی وہ اس قابل نہیں ہیں کہ اس سے زیادہ خطاب الہی کے مستحق ہوں۔ بہر حال اگر وہ اس قسم کی قدرت کا دعویٰ کریں تو وہ بھی بے بنیاد ہے۔ وہ اس لیے کہ اہل فرعون اور قوم عاد و ثمود اور انہی جیسے اور گروہ، جو ان سے زیادہ قوی تھے، عذاب الہی کے عظیم طوفان کے مقابلے میں پرکاش کی طرح کمترین متادمست بھی اپنی طرف سے نہیں دکھاسکے چہ جائیکہ یہ چھوٹا سا گروہ کہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں۔

اس کے بعد ایک قاطع اور دو ٹوک پیشین گوئی کے عنوان سے ان کی باتوں کو رد کرتے ہوئے پروردگار عالم مزید فرماتا ہے:

”وہ جان لیں کہ عنقریب ان کی جماعت شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوگی۔“ (سیہزم الجمع ویولون الدبر) ۱

جاذب توجہ یہ امر ہے کہ ”سیہزم“ کا مادہ ”هزم“ ”بروزن“ ”جزم“ ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی خشک جسم کو اتنا دبانا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ یہاں اسی مناسبت سے لشکر کے تتر پتر اور درہم و برہم ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ تعبیر ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ وہ بظاہر متحد و مربوط ہیں لیکن چونکہ ایسے موجودات کی طرح نہیں جو خشک ہوتے ہیں، لہذا وہ قوی دباؤ کے مقابلے میں درہم و برہم ہو جائیں گے۔ برخلاف مومنین کے کہ وہ اپنے اندر ایسی قوت رکھتے ہیں کہ جس میں مرکزیت بھی ہو۔ ”دبر“ کے معنی پشت کے ہیں یہ ”قبل“ کی ضد ہے جس کے معنی اگلے حصہ کے ہیں۔ یہ لفظ یہاں مکمل طور پر میدان جنگ میں پشت دکھانے کے مفہوم میں ہے۔ یہ پیشین گوئی میدان بدر میں اور دوسری جنگوں میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور کفار کا مضبوط اور طاقتور گروہ میدان جنگ سے ہزیمت خوردہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ زیر بحث موضوع کے متعلق آخری آیت میں پروردگار عالم فرماتا ہے: ”صرف دنیا ہی میں شکست و ناکامی ان کا حصہ نہیں ہے بلکہ قیامت ان کی وعدہ گاہ ہے اور روزِ محشر کی سزائیں زیادہ سخت اور ہولناک ہیں۔“ (بل الساعة موعدهم والساعة ادهی وامر)۔ اس اعتبار سے انہیں اس دنیا میں بھی شکست کی تلخی کا مزہ چکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیے اور آخرت میں ان کے لیے زیادہ تلخ اور وحشت ناک شکست ہے۔ ”ادھی“ کا مادہ ”دهو“ اور ”دهاء“ ہے اس کے معنی ایسی بڑی مصیبت اور عظیم حادثہ کے ہیں کہ جس سے چھٹکارہ ممکن نہ ہو۔ یہ لفظ کبھی انتہائی ہشیاری کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن زیر بحث آیت میں اس کے پہلے معنی ہیں۔ جی ہاں وہ قیامت میں ایسی صورت حال سے دوچار ہوں گے کہ ان کے لیے کوئی راہ فرار نہیں ہوگی۔

۱ اگرچہ مناسب ہے کہ ”یولون الادبار“ کہا جائے۔ اس کی جگہ ”یولون الدبر“ کہا گیا ہے کیونکہ یہ لفظ جنس کے معنی رکھتا ہے کہ جو جمع کے حکم میں ہے۔

ایک نکتہ

ایک واضح اور معجزہ کی کیفیت رکھنے والی پیشین گوئی

اس میں شک نہیں کہ مکہ میں جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں تو مسلمان بالکل اقلیت میں تھے اور دشمن انتہائی طاقتور تھا۔ مسلمانوں کی ان کے مقابلے میں جلدی کامیابی کی پیشین گوئی ہرگز قابل اعتبار نہ تھی لیکن تھوڑی سی مدت کے بعد مسلمانوں نے ہجرت کی اور اتنی طاقت جمع کر لی کہ میدان بدر میں دشمن کے ساتھ اپنے پہلے ٹکراؤ میں ایک خوفناک ضرب لگائی۔ اس صورت حال کی کفار کو قطعاً توقع نہیں تھی۔ پھر جنگ بدر کے واقعہ کو چند سال بھی نہیں گزرے تھے کہ نہ صرف کفار مکہ بلکہ تمام جزیرۃ العرب مسلمانوں کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا تھا۔ تو کیا مستقبل کے بارے میں غیب سے تعلق رکھنے والی خبر بالکل واضح طور پر ایک معجزہ نہیں ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ اعجاز قرآن کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی خبریں غیبت پر مشتمل ہوتی ہیں جس کا ایک نمونہ زیر بحث آیت میں ہے۔

- ۴۷۔ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعْرٍ ۝
- ۴۸۔ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝
- ۴۹۔ اِنَّا كُلُّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۝
- ۵۰۔ وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ۝
- ۵۱۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدْكِرٍ ۝
- ۵۲۔ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِيْ زُبُرٍ ۝
- ۵۳۔ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝
- ۵۴۔ اِنَّ الْهٰتِفَيْنِ فِيْ جَنَّتٍ وَّ نَهْرٍ ۝
- ۵۵۔ فِيْ مَقْعَدٍ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكَ مُّقْتَدِرٍ ۝

ترجمہ

- ۴۷۔ مجرمین گمراہی اور آگ کے شعلوں میں ہیں۔
- ۴۸۔ جس دن وہ جہنم کی آگ میں منہ کے بل گرائے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا) جہنم کی آگ کا مزہ چکھو۔

- ۴۹۔ ہم نے ہر چیز کو ایک مقدار میں پیدا کیا ہے۔
- ۵۰۔ اور ہمارا فرمان ایک امر سے زیادہ نہیں ہے، ایک چشم زدن کی مانند۔
- ۵۱۔ ہم نے ان لوگوں کو جو تمہارے مانند تھے ہلاک کیا۔ کیا کوئی ہے جو نصیحت پکڑے؟
- ۵۲۔ اور جو کام انہوں نے کیا ان کے نامہ اعمال میں تحریر ہے۔
- ۵۳۔ اور ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جاتا ہے۔
- ۵۴۔ پرہیزگار جنت کے باغات اور نہروں کے پاس جگہ رکھتے ہیں
- ۵۵۔ صدق کی جگہ خداوند مالک و مقتدر کے پاس۔

تفسیر

مقام صدق میں خداوند مقتدر کے پاس

ان آیتوں میں قیامت کے دن مُشرکین اور مجرموں کی جو کیفیت ہوگی اور جس کی بحث گزشتہ آیتوں میں تھی اسی کے بیان کو جاری رکھا گیا ہے۔ گزشتہ آیتوں میں سے آخری آیت نے اس حقیقت کو پیش کیا تھا کہ قیامت کا دن ان کی وعدہ گاہ ہے اور وہ دن مصیبت کا دن ہے اور تلخی لیے ہوئے ہے، ایسی تلخی کہ جو دنیا کی مصیبتوں اور شکستوں سے زیادہ تلخ ہوگی۔ زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت میں اس امر کی علت کو پیش کرتے ہوئے خدا فرماتا ہے :

”مُجرمین گمراہی اور آگ کے شعلوں میں ہیں۔“ (ان المجرمین فی ضلال وسعر)۔

”قیامت کے دن وہ جہنم کی آگ میں اپنے منہ کے بل کھینچے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کی آگ کا مزہ چکھو۔ وہ دوزخ جس کا تم ہمیشہ انکار کرتے تھے اور اسے محض جھوٹ تصور کرتے تھے۔“ (لیوم یسجون فی النار علی وجوہہم ذوقوا مس سقر)۔ ”سقر“ برفزن ”سفر“ جسم کے رنگ کے متغیر ہونے اور دھوپ کی شدت سے یا ایسی ہی کسی دوسری

۱۔ ”سعر، جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی آیت ۲۴ میں اشارہ کیا ہے دو معنی رکھتا ہے پہلا یہ کہ یہ جمع ہے ”سعیر“ کی جس کے معنی جلتی ہوئی آگ کے ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ جنون و ہرجا اور اشتغال کے معنوں میں ہے کہ جو فکری اعتدال کے فقدان کے وقت ہوتا ہے۔ زیر بحث آیت میں ممکن ہے پہلے معنی میں ہو یا پھر دوسرے معنوں میں۔ اگر دوسرے معنوں میں ہو تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ہم اپنے جیسے انسان کی پیروی کریں تو ہم گمراہ ہیں اور دیوانے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قیامت کے دن سمجھ لیں گے کہ وہ انکار اور جنون کی وجہ سے گمراہی میں تھے۔

چیز سے تکلیف اٹھانے کے معنی میں ہے۔ چونکہ جہنم تکلیف و آزار کا ایک ایسا ہی شدید تنوع رکھتا ہے، اس لیے اس کا نام سقر ہے۔ اور ”مس“ سے مراد چھوٹا ہے۔ اسی بنا پر دوزخیوں سے کہا جائے گا اس جلائے والی آج کا مزہ چکھو جو جہنم کی آگ کے پھونکنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے چکھو اور یہ نہ کہو کہ یہ چیزیں جھوٹ، خرافات اور افسانے ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ”سقر“ تمام دوزخ کا نام نہیں ہے بلکہ دوزخ کا ایک خاص حصہ ہے جس میں حد سے زیادہ تپش ہے چنانچہ ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ ”سقر“ ایک درہ ہے اور یہ متکبر لوگوں کے لیے ہے۔ یہ درہ جس وقت سانس لیتا ہے تو جہنم کو جلا دیتا ہے۔

چونکہ یہ ہو سکتا تھا کہ یہ خیال ہو کہ یہ عذاب ان گناہوں سے متناسب نہیں ہے، اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے کہ ”ہم نے ہر چیز کو مقدار اور انداز کے ساتھ پیدا کیا ہے۔“ (اَنَا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ)۔ جی ہاں ان کے اس دنیا کے دردناک عذاب کا بھی حساب کتاب ہے اور ان کو آخرت میں پہنچنے والی سزائیں ہی نہیں بلکہ ہر چیز کو خدا نے حساب کتاب کے ماتحت پیدا کیا ہے۔ زمین و آسمان، زندہ و بے جان وجود، انسانی جسم کے اعضا اور زندگی کے وسائل ہر ایک چیز حساب کتاب کے ماتحت اور ضروری مقدار کے مطابق ہے۔ اس عالم کی کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے اس لیے کہ خالق حکیم کی پیدا کردہ ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے: ”نہ صرف ہمارے اعمال حکمت کی رُو سے ہیں بلکہ انتہائی قدرت و قاطعیت کے ساتھ بھی ہیں کیونکہ ہمارا فرمان ایک امر سے زیادہ نہیں ہے اور وہ اتنی تیزی کے ساتھ تکمیل پاتا ہے جیسے پک کا ایک مرتبہ بھیکنا“ (وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ)۔ جی ہاں جس چیز کے بارے میں ہم ارادہ کریں تو ہم کہتے ہیں ”کن“ ہو جا تو وہ بلا تاخیر ہو جاتی ہے۔ (حتیٰ کہ کلمہ کن کی اصطلاح بھی محض انعام کے لیے ہے ورنہ خدا کا ارادہ، مشیت اور اس کی مراد کا تحقق یہ سب ایک ہی چیز ہیں) اس بنا پر جس دن ہم قیامت کے برپا ہونے کا فرمان صادر کریں گے تو چشم زدن میں ہر چیز قیامت کی گرفت میں ہوگی اور جسموں کے ڈھانچوں میں نئی زندگی پھونک دی جائے گی۔ اس طرح جس روز ہم ارادہ کریں کہ بحر میں کو آسمانی بجلی کی چمچ یا زمین کے زلزلوں، طوفانوں اور تیز آندھیوں سے معذب کریں یا ان پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ رکھیں گے تو اس کے لیے ایک حکم سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب چیزیں گنہگاروں کے لیے تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ وہ جان لیں کہ خدا حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ قطعی اور دو ٹوک فیصلے کرتا ہے اور وہ قاطعیت کے ساتھ حکیم بھی ہے۔ لہذا اس کے فرمان کی مخالفت سے پرہیز کریں۔ بعد والی آیت میں دوبارہ کفار و مجرمین کو مخاطب کرتے ہوئے اور گزشتہ اقوام کے حالات کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے: ”ہم نے گزشتہ زمانے میں کچھ افراد کو جو تمہارے ہی جیسے تھے، ہلاک کیا۔ کیا کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے؟ (وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا شِعَابًا مِّنْ مَّدَكِرٍ)۔ ”اشعیاء“ جمع ہے شیعہ کی، ایسے لوگوں کے معنوں میں کہ جو کسی فرد کی طرف سے چار جانب جائیں اور اس فرد سے متعلق امور کی نشر و اشاعت کریں اور اس کو تقویت پہنچائیں۔ اگر شیعہ پیرو کار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔ یقیناً گزشتہ اقوام، مشرکین مکہ کی پیرو کار نہیں تھیں بلکہ معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا لیکن چونکہ کسی فرد کے طرفدار اس کے شیعہ ہوتے ہیں، اس لیے یہ لفظ مانند اور مثل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ چیز بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ کفار مکہ کا یہ گروہ گزشتہ لوگوں کے طرز عمل سے بھی قوت حاصل کرتا تھا اور ان

کے نظریات سے استفادہ کرتا تھا۔ اسی بنا پر گزشتہ اقوام پر ”اشیاع“ کا اطلاق ہوا ہے۔

بہر حال یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کی تاکید کرتی ہے کہ جب تمہارے اعمال، رفتار و گفتار اور عقائد ان کے عقائد وغیرہ مشترک ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام ان کے انجام سے مختلف ہو۔ بیدار ہو جاؤ اور نصیحت حاصل کرو۔ اس کے بعد اس بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ گزشتہ اقوام کی موت کے ساتھ ان کے اعمال کا عدم نہیں ہو گئے بلکہ ”جو کام انہوں نے انجام دیے ہیں وہ ان کے لیے نامہ اعمال میں مندرج ہیں“ (وکل شیء فعلوه فی الذبیر)۔ اسی طرح تمہارے اعمال بھی مندرج و منضبط ہیں اور روز حساب کے لیے محفوظ ہیں ”ذہر“ جمع ہے ”زبور“ کی جو کتاب کے معنی میں ہے۔ یہاں انسانوں کے نامہ اعمال کے معنوں میں ہے۔ بعض نے اس احتمال کی تائید بھی کی ہے کہ اس سے مراد ”لوح محفوظ“ ہے۔ لیکن یہ معنی جمع کے معنی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد تاکید مزید کے لیے خدا فرماتا ہے: ”اور ہر چھوٹا بڑا کام بلا استثنا لکھا جائے گا۔“ (وکل صغیر وکبیر مستطر)۔ اس بنا پر اس روز جو اعمال کا حساب و کتاب ہوگا، وہ ایک جامع اور مکمل حساب ہوگا چنانچہ جس وقت مجرموں کا نامہ اعمال ان کے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ فریاد کریں گے کہ ”وائے ہو ہم پر یہ کیسی کتاب ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں جو اس میں درج نہ ہو“۔ ویقولون یا ویلنا مال ہذا الکتاب لا یغادر صغیرہ ولا کبیرہ الا احصاھا۔ (سورہ کف - آیت ۴۹)۔ ”مستطر“ کا مادہ سطر ہے اس کے معنی صف کے ہیں۔ وہ خواہ انسان ہوں کہ ایک صف میں کھڑے ہوں یا درخت ہوں جو ایک صف میں ایستادہ ہوں یا الفاظ ہوں کہ جو صفحہ کاغذ پر ایک ہی صف میں تحریر ہوں۔ چونکہ یہ زیادہ تر آخری معنوں میں استعمال ہوتا ہے لہذا یہی مفہوم عام طور پر اس سے ذہن میں رکھنا چاہیے۔ بہر حال یہ ایک دوسری تنبیہ ہے گنہگار، غافل اور بے خبر لوگوں کے لیے۔

قرآن مجید کی سنت یہ ہے کہ اس کے بیانات میں اچھے بُرے اور نیک و بد افراد ایک دوسرے کے موازنہ اور تقابل سے متعارف ہوتے ہیں اور موازنہ و تقابل کی صورت میں دونوں کا فرق بھی واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ یہاں بھی کافر مجرموں کے احوال کے تذکرے کے بعد پرہیزگاروں کے سرت بخش اور روح پرور احوال کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے: ”پرہیزگار جنت کے باغوں میں نہروں کے قریب وسیع فضا اور خدا کے واضح فیض (کے مقام پر) جگہ رکھتے ہیں“ (ان المتقین فی جنتات ونہر)۔ نہر بر وزن ”قمر“ اور ”نہر“ بر وزن ”قہر“ دونوں بہت سے پانی کے بہنے کے معنی میں ہے۔ اور اسی مناسبت سے کبھی وسیع فضا، فیض عظیم یا پھیلی ہوئی روشنی کے لیے ”نہر“ بر وزن ”قمر“ کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ زیر بحث آیت میں (آئندہ آٹھ والی حدیث سے قطع نظر) ممکن ہے اسی اصلی معنی کے مطابق پانی کی نہر یا دریا ہو۔ اس کا مفرد ہونا کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا کیونکہ وہ جس جمع کے معنی رکھتا ہے۔ اسی لیے ”جنتات“ جو ”جنت“ کی جمع ہے، اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فیض الہی کی وسعت جنت کی وسیع روشنی اور اس کی وسیع فضا کی طرف اشارہ ہو یا دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو لیکن اس حدیث میں جو درجہ منثور میں پیغمبر اسلام ﷺ سے منقول ہے ہم دیکھتے ہیں کہ (النہر الفضاء واسعة لیس بنہر جار) ”نہر“ کے معنی وسیع فضا کے ہیں، جاری نہر کے نہیں زیر بحث آیات کی آخری آیت نے کہ جو سورہ قمر کی بھی آخری آیت ہے متقین کی رہائش گاہ کی مزید وضاحت کی ہے پروردگار عالم فرماتا ہے: ”وہ جائے صدق و حق اور راستی میں مالک و قادر خدا کے ہاں قرار و مقام رکھتے ہیں“ (فی مقعد صدق عند ملک

مقتدر)۔ اس آیت میں پرہیزگاروں کی رہائش گاہ کی کیسی پرکشش اور جاذب توجہ توصیف ہے۔ اس میں دو خصوصیتیں ہیں جن میں تمام امتیازات جمع ہیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ صدق کی جگہ ہے۔ وہاں کسی قسم کی بے ہودگی یا باطل کا کوئی گزر نہیں ہے۔ وہ سراسر حق ہے بہشت کے بارے میں خدا کے سارے وعدے حقیقت کا روپ دھار لیں گے اور ان کی سچائی بالکل واضح اور آشکار ہوگی۔ دوسری خصوصیت یہ کہ وہ خدا کے قُرب و جوار میں ہے۔ وہی چیز کہ جو ”عند“ سے ظاہر ہوئی ہے۔ یہ قُرب معنوی کی انتہا کی طرف اشارہ ہے۔ قُرب جسمانی کی طرف نہیں۔ اور پھر خدا کی نسبت کہ جو مالک بھی ہے اور قادر بھی ہر قسم کی نعمت و موصبت اس کے قبضہ میں ہے اور اس کی حکومت و ملکیت کے زیر فرمان ہے۔ اس بنا پر وہ ان دھماکان گرامی کی پُربرائی میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے ان کے لیے کیا کیا نعمتیں فراہم کی ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان دو آیتوں میں کہ جہاں جنت کی نعمتوں اور جزاؤں کے بارے میں گفتگو ہے ان میں پہلے تذکرہ وسیع باغات اور جاری نمود کا ہے۔ یہ مادی نعمتیں ہیں۔ پھر ان کے عظیم معنوی اجر کا ذکر ہے یعنی خدائے مالک و قادر کی بارگاہ میں حضوری کا تذکرہ۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ انسان کو حقائق کی طرف رفتہ رفتہ مائل کرے، اس کی رُوح کو پرواز کرائے اور عشق و نشاط میں مستغرق کرے۔ ”ملیک مقتدر“ اور ”مقعد صدق“ ایسے الفاظ ہیں کہ جو اللہ کے حضور اور اس کے قُرب معنوی کے دوام و بقا پر دلالت کرتے ہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ اس جہان کی تمام چیزیں حساب و کتاب کی تابع ہیں

(اِنَّ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ) کا جملہ اختصار کے باوجود عالم تخلیق کی ایک اہم حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ ایسی حقیقت کہ جو پورے عالم امکان پر حکمران ہے اور وہ ساری کائنات میں ہر چیز کی مقدار کا نہایت باریک بینی کے ساتھ تعین ہے۔ انسان کا علم جس قدر ترقی کر رہا ہے، وہ باریک بینی پر مبنی اس دقیق تعین مقدار سے زیادہ طور پر باخبر ہوتا جا رہا ہے۔ تعین مقدار کے سلسلہ میں یہ دقت نظر نہ صرف زمینی موجودات میں کار فرما ہے بلکہ آسمان کے عظیم کُڑوں میں بھی جاری و ساری ہے۔ مثال کے طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ ایک ٹرائکی دماغ کی مدد سے سینکڑوں مخصوص ماہرین فن نہایت دقیق علمی حساب لگا کر اس امر پر قادر ہوئے ہیں کہ کُڑہ قر کے اس علاقہ میں اُتریں کہ جہاں وہ چاہتے ہیں۔ حالانکہ جن چند دنوں میں خلائی جہاز زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں مصروف ہوتا ہے تمام صورت حال الٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔ چاند اپنے گرد بھی گھوم رہا ہے اور زمین کے گرد بھی گردش کر رہا ہے اس طرح اس کی جگہ مکمل طور پر بدل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ خلائی جہاز کے ایک مصروف لمحے ہی کے دوران زمین اپنے گرد بھی گردش کرتی ہوتی ہے اور سورج کے گرد بھی گردش میں مصروف ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ مختلف قسم کی گردشیں ایسے حساب کے مطابق ہیں کہ جو بہت باریک بینی پر مبنی ہے اور ان میں ذرہ برابر فرق واقع نہیں ہوتا۔ اب فضا نورد اس قابل ہو چکے ہیں کہ نہایت پیچیدہ حساب کے باوجود وہ اپنے پسندیدہ خطے میں رہا کریں۔ علم نجوم کے ماہر اس قابل ہو گئے ہیں کہ دسیوں سال پہلے مکمل یا نامکمل چاند گہن اور سورج گہن کے متعلق زمین کے مختلف

حصوں کے حوالہ سے صحیح طور پر پیشین گوئی کر سکیں۔ یہ تمام باتیں اس وسیع دنیا میں حساب کی انتہائی باریک بینی پر دلالت کرتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جانداروں میں، مثال کے طور پر نفی سنی جیوٹھیوں میں، ان کے مختلف قسم کے جسموں، رگوں اور پٹھوں کے بارے میں یہ حساب انسان کو حیران کر دینے کے قابل ہے۔ جس وقت ہم زیادہ چھوٹے موجودات مثلاً مائیکروب، وائرس اور ایمینا تک پہنچتے ہیں تو حساب کی عمدگی اور صحت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ملی میٹر کا ہزارواں حصہ بلکہ اس سے چھوٹا حصہ بھی مکمل طور پر حساب کے ماتحت ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم ایٹم کے دائرہ میں داخل ہوں تو پھر ان تمام اندازہ لگانے والے پیمانوں کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ اب حساب کے موضوعات اتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ کسی انسان کے دائرہ فکر میں نہیں آتے۔ یہ تخمینے صرف مقداروں کے بارے میں نہیں ہیں، ترکیبی کیفیتیں بھی اندازہ لگانے کے ان پیمانوں کی گرفت میں آ جاتی ہیں۔ وہ نظام، کہ جو ذہن انسانی کے تقاضوں اور رجحانات و میلانات پر حاکم ہے، اس کا بھی حساب لگایا جاسکتا ہے حتیٰ کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی خواہشات کا وہ سلسلہ کہ جس میں ذرا سی بھی برہمی واقع ہو جائے تو اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی درہم و برہم ہو جائے اس کو ناپنے کے بھی دقیق پیمانے موجود ہیں۔ عالم طبعی میں ایسی موجودات ہیں کہ جو ایک دوسرے کے لیے مصیبت کا باعث بھی ہیں اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں بھی ڈٹی ہوئی ہیں۔

شکاری پرندے چھوٹے پرندوں کے گوشت سے غذا حاصل کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہیں کرتے کہ تمام موجود ذخیروں کو خالی نقصان دہ ثابت ہوں۔ نتیجتاً ان کی عمر طویل ہوتی ہے۔ یہ شکاری پرندے بہت کم انڈے دیتے ہیں۔ ان کے بچوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے۔ یہ صرف خاص حالات میں تنہا زندگی گزارتے ہیں۔ اگر اس طویل عمر کے ساتھ ان کے بچے بھی زیادہ ہوتے تو دنیا سے تمام چھوٹے پرندوں کی نسلیں ختم ہو کر رہ جاتیں۔ عالم حیوانات و نباتات میں اس موضوع کا دامن بہت وسیع ہے جس کا مطالعہ انسان کو (اناکل مشیٰ خلقہنا بقدر) کی گہرائی اور اس کے عمق سے زیادہ روشناس کرنا ہے۔

۲۔ تقدیر الہی اور اس کے ارادہ کی آزادی

ہو سکتا ہے کہ زیر بحث آیت اور اس سے مشابہت رکھنے والی آیتوں سے یہ غلط تاثر پیدا ہو جائے کہ اگر ہر چیز کو خدا نے اندازے، مقدار اور حساب کے ساتھ پیدا کیا ہے تو پھر ہمارے افعال و اعمال بھی اس کی مخلوق ہیں، لہذا ہم کسی طرح کا کوئی اختیار نہیں رکھتے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ اگرچہ ہمارے افعال و اعمال مشیت و تقدیر الہی کے مطابق ہیں اور اس کی قدرت اور ارادہ کے احاطہ سے ہرگز خارج نہیں ہیں لیکن اس نے یہ بات مقدر کر دی ہے کہ اپنے اعمال میں ہم مختار ہیں اور اسی بنا پر وہ ہمارے بارے میں ذمہ داری و جوابدہی کا قائل ہے۔ اگر ہم اپنے افعال میں بالکل بے اختیار ہوتے تو تکلیف شرعی اور ذمہ دارانہ جوابدہی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہتا۔ ہمارا اپنے اعمال کے سلسلہ میں کوئی اختیار نہ رکھنا تقدیر الہی کے خلاف ہے۔

جبر لوں کی افراط کے مقابلہ میں، اس کے برعکس، ایک گروہ تقریباً اور تیز روی کا شکار ہے۔ وہ "قدری" یا "مفوضہ کلمات" وہ بالکل وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے اختیار میں ہیں اور خدا کو ہمارے کاموں میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس طرح انہوں نے الہی حاکمیت کی حدود کو محدود کر دیا ہے، خود کو مستقل سمجھا ہے اور شرک کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید و عدل کی دونوں اصولوں کے درمیان جو نقطہ ہے اس کو سمجھنے کے لیے خاصی بصیرت درکار ہے۔ اگر ہم توحید کا مفہوم یہ لیں کہ ہر ایک شے حتیٰ کہ ہمارے اعمال کا خالق بھی خدا ہے اور ہمیں اپنے اعمال کے سلسلہ میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے تو اس طرح ہم عدل الہی کے منکر ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایسی صورت میں خدا نے گنہگاروں کو بے اختیار رکھ کر مجبور محض کر دیا ہے پھر اس پر طرہ یہ کہ انہیں سزا بھی دے گا۔ اس کے برعکس اگر ہم عدل کے معنی یہ سمجھیں کہ خدا ہمارے اعمال میں بالکل مداخلت نہیں کرتا تو ہم نے اس کو اس کی حکومت سے خارج کر دیا اور اس طرح ہم شرک کے گڑھے میں جا گرے۔

”امربین الامرین“ ایک درسیاتی خطا ہے اور وہ صراطِ مستقیم بھی ہے اور عقیدہ صحیح بھی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ ہم صاحب اختیار ہیں لیکن ہمارا یہ صاحب اختیار ہونا بھی خدا کے ارادے سے ہے۔ جس وقت چاہے وہ ہمارے اختیار کو سلب کر سکتا ہے۔ یہ مکتب فکرِ اہل بیت علیہم السلام ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ زیر بحث آیات کے ذیل میں متعدد روایات مذکورہ بالا دونوں فرقوں کے بارے میں بصورتِ مذمت کتبِ اہل سنت و شیعہ میں وارد ہوئی ہیں۔ منجملہ ان حدیثوں کے ایک حدیث یہ بھی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

(صنفان من امتی لیس لہم فی الاسلام نصیب المرجئة والقدریۃ انزلت فیہم
ایۃ فی کتاب اللہ ان المجرمین فی ضلال و سمر۔)

”میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں کہ جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ ”جبری“ اور ”قدری“
اور ان کے بارے میں (ان المجرمین فی ضلال و سمر) ”گنہگار اور مجرم گمراہی جنوں اور
آگ کے شعلوں میں ہیں۔“ نازل ہوئی ہے۔

”مرجعہ“ کا مادہ ”ارجاء“ ہے اس کے معنی تاخیر میں ڈالنے کے ہیں۔ یہ ایک اصطلاح ہے جو جبریلوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ وہ اوامر الہی کی پرواہ نہیں کرتے اور معصیت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ اس گمان میں ہیں کہ وہ مجبور ہیں یا یہ کہ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گناہانِ کبیرہ کے مرتکب افراد کے انجام کا معاملہ واضح نہیں ہے۔ وہ اسے قیامت پر چھوڑتے ہیں۔
امام باقرؑ کی ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ (نزلت ہذہ فی القدریۃ ذوقوا مسقراتنا کل شیء خلقناہ بقدر)
یہ آیات قدریوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ قیامت میں ان سے کہا جائے گا ”جہنم کی آگ کا مزہ چکھو“ ہم نے ہر چیز کو حساب اور اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

(یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اندازہ اور حساب سے مراد یہ ہے کہ ہر گناہ کے لیے ہم نے معین سزا قرار دی ہے۔ یہ آیت کی ایک اور تفسیر ہے یا یہ کہ تم جو تقدیر الہی کے منکر تھے اور ہر چیز پر خود کو قادر سمجھتے تھے اور خدا کو اپنے اعمال کی قلمرو سے خارج سمجھتے تھے تو اب تم

۱۔ تفسیر روح المعانی میں یہ حدیث بخاری، ترمذی، ابن ماجہ، ابن عدی اور ابن مردودہ سے ابن عباس سے نقل ہوئی ہے ج ۲۷ ص ۸۱۔ اس کی نظیر حدیث

قرطبی نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔ ج ۹ ص ۶۳۱۸

۲۔ ”مجمع البحرین“ مادہ ”رجا“

۳۔ ”نور المشتدین“ ج ۵ ص ۱۸۶

خدا کی قدرت کو دیکھو اور اپنے انحراف کے عذاب کا مزہ چکھو۔

۳۔ خدا کا فرمان صرف ایک ہی کلمہ ہے

ہم جانتے ہیں کہ "علت تامہ" اور "معلول" کے درمیان کسی قسم کا زمانی فاصلہ نہیں ہے۔ اس لیے فلاسفہ کی اصطلاح میں علت معلول تقدم کو "تقدم رتبی" سمجھتے ہیں اور خدا کے ارادے کے بارے میں ایجاد و خلقت کے امر کی نسبت کہ جو علت تامہ کا واضح مصداق ہے، یا "علت تامہ منحصر بہ فرد" کا مصداق ہے، یہ معنی زیادہ واضح ہیں۔ اس لیے اگر آیہ (وما امرنا الا واحدة) ہمارا امر ایک کلمہ سے زیادہ نہیں ہے، کی لفظ "کن" سے تفسیر کی ہے تو یہ تنگی بیان کی وجہ سے ہے کیونکہ لفظ "کن" بھی مرکب کاف و نون کا، اور وہ ایک زمانہ کا محتاج ہے۔ یہاں تک کہ "فیكون" میں "فا" جو عام طور پر ایک قسم کے زمانے کو بیان کرتا ہے، وہ بھی بیان کی تنگی کی بنا پر ہے۔ پھر (کلمح بالبصر) (چشم زدن) کی تشبیہ، سورہ نحل کی آیت ۷۷ میں پروردگار عالم جس وقت امر الہی کی قیامت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اس کو لمح بصر کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے تو مزید کہتا ہے کہ (او هو اقرب) "چشم زدن سے بھی زیادہ قریب ہے"۔ بہر حال زمانہ کے بارے میں یہ گفتگو ہماری روزمرہ کی تعبیر کے مطابق ہے اور اس وجہ سے ہے کہ قرآن ہم سے ہماری زبان میں بات کرتا ہے ورنہ خدا اور اس کے ادا فرمانانہ سے مافوق ہیں۔ ضمنی طور پر "واحدة" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ ایک ہی فرمان کافی ہے اور اس میں تکرار کی ضرورت نہیں ہے، یا پھر اس طرف اشارہ کہ اس کا فرمان چھوٹے بڑے، صغیر و کبیر حتیٰ کہ تمام پھیلے ہوئے آسمانوں کی خلقت تک میں ذرہ برابر فرق نہیں کرتا۔ بنیادی طور پر چھوٹا بڑا اور مشکل و آسان ہماری محدود فکر اور ناچیز قوت کے بیانیوں میں سے ہے۔ جہاں قدرت لامتناہی کے بارے میں گفتگو ہو یہ مفہیم مکمل طور پر ختم ہو جاتے ہیں اور سب ایک ہی رنگ اور ایک ہی شکل کے نظر آتے ہیں۔ غور کیجئے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر اوپر والے جملے کا مضمون یہ ہے کہ تمام چیزیں آنا فنا وجود میں آتی ہیں تو یہ امر عادی عالم کے تدریجی ہونے کے مشاہدہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا فرمان ہر جگہ ایک ہی کلمہ ہے جو چشم زدن سے بھی زیادہ سریع ہے۔ لیکن فرمان کے مضمون اور موضوع میں فرق ہوتا ہے۔ اگر جنین (وہ بچہ جو شکم مادر میں ہوتا ہے) کو اس نے حکم دیا ہے کہ نو ماہ کے اندر اپنے دودھ کی تکمیل کرے تو ایک لمحہ زیادہ یا کم نہیں ہوگا۔ اس کا فوراً ہونا اس طرح ہے کہ ٹھیک اس مدت میں اس کی تکمیل ہو اور اگر گزرتا زمین کو حکم دیا ہے کہ چوبیس گھنٹے کے درمیان ایک مرتبہ اپنے گرد گردش کرے تو بھی اس کا فرمان مختلف ناپذیر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کے فرمان کے اثر انداز ہونے کے لیے کسی قسم کے زمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ فرمان کا مضمون و موضوع ہے کہ جو عالم مادی کے تدریجی ہونے کی وجہ سے اور خاصیت طبعیت و حرکت کی سنت کی طرف توجہ کرتے ہوئے اپنے لیے زمانہ کو قبول کرتا ہے۔

۴۔ سورہ قمر کا آغاز و اختتام

قابل توجہ امر یہ ہے کہ سورہ قمر وحشت و اضطراب اور قرب قیامت کی تنبیہ کے ساتھ شروع ہوا ہے اور وہ سکون و آرام میں

کہ جو سچے مومنین کے لیے ملے ہوئے مقتدر کے پاس مقام صدق میں ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ تربیت کا عمل ہی ایسا ہوتا ہے کہ جو وحشت و اضطراب سے شروع ہوتا ہے اور مکمل آرام و سکون پر ختم ہوتا ہے۔ وہ افکار پریشاں کو جمع کرنے کے بعد سرکش خواہشات کو رام کرتا ہے۔ انسان کے اندرونی خوف و اضطراب سے گمراہی و فنا کے عوامل کو دور کرتا ہے اور اسے پروردگار عالم کے جوارِ ابدیت اور اس کی بارگاہِ رحمت و قرب کے سکون و اطمینان سے ہم آغوشی کا شرف بخشا ہے۔

حقیقی طور پر اس طرف توجہ کرنے سے کہ پروردگار عالم ہستی میں غیر متنازع فیہ مالک اور مختارِ کل حاکم ہے اور اس پر توجہ کرنے سے کہ وہ صاحبِ اقتدار ہے اور اس کی قدرت ہر چیز میں نافع ہے، انسان کو بے مثل و بے نظیر سکون و اطمینان قلب میسر آتا ہے۔

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ دو مقدس نام "ملیک و مقتدر" اجابت دعا کے سلسلہ میں بہت گہری اور شدید تاثیر رکھتے ہیں اس موضوع سے متعلق ایک راوی نقل کرتا ہے کہ میں اس گمان کے ساتھ مسجد میں وارد ہوا کہ صبح ہو گئی ہے لیکن درحقیقت ابھی رات کا ایک حصہ باقی تھا۔ میرے علاوہ مسجد میں کوئی اور نہیں تھا۔ میں بالکل تنہا تھا۔ اچانک میں نے اپنے پیچھے ایک حرکت محسوس کی جس سے میں ڈر گیا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی اجنبی پکار رہا ہے۔ اے وہ شخص کہ جس کا دل خوف سے لرز رہا ہے تو ڈر مت اور کہہ : اللہ و انک ملیک مقتدر ما تشاء من امر یكون اس کے بعد توجہ چاہتا ہے اس کے لیے دعا کر۔ وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے یہ مختصر سی دعا پڑھی پھر کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کا خدا سے میں نے سوال کیا ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔

خداوند! تو ملیک و مقتدر ہے ہمیں اس طرح کی توفیق عطا فرما کہ ہم ایمان و عمل اور تقویٰ کے سائے میں مقام صدق میں تیرے جوارِ رحمت کے زیر سایہ قیام پذیر ہوں۔

پروردگار! ہم ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت کا دن گنہگاروں کے لیے وحشت ناک تلخ اور ناگوار ہے۔ اس دن ہماری امید صرف تیرے لطف و کرم سے وابستہ ہے۔

بارِ الہا! ہمیں بیدار روح اور ہوشیار عقل مرحمت فرما تاکہ ہم گزشتہ لوگوں کے حالات سے درس عبرت حاصل کریں اور اس راستے پر چلیں جس پر چل کر وہ ہلاک ہوئے۔

سورۃ قمر کا اختتام، ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ ق

ش ۱۳۶۴/۹/۲۹

اختتام ترجمہ

۳ شوال ۱۴۰۶ھ

قم بر مکان حقیر

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ

❖ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔

❖ اس کی ۷۸ آیتیں ہیں۔

مربع ثانی ۱۴۰۶ھ
۲۹ / ۹ / ۱۳۶۴ ش

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ کا مضمون

یہ سُورہ کئی طور پر خدا کی ان مختلف مادی و معنوی نعمتوں کو بیان کرتا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے ارزانی فرمائی ہیں اور انہیں ان میں محصور کیا ہے۔ ان نعمتوں کا بیان اس انداز میں ہے کہ اس سُورہ کا نام "سُورہ رحمت" یا "سُورہ نعمت" رکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سُورہ "الرحمن" سے شروع ہوا کہ جو خدا کا اسم مبارک ہے اور اس کی رحمت واسعہ کو بیان کرتا ہے اور ختم ہوا خُدا کے ذوالجلال کے اجلال و اکرام پر۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ كَذِبَانِ کا جملہ جس کے ذریعے خدا نے اپنی نعمتوں کا اپنے بندوں سے اقرار لیا ہے اکتیس مرتبہ اس سُورہ میں آیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ سارا سُورہ خداوند متان کی مختلف نعمتوں کا باہم پیوستہ ایک ہی حصہ ہے لیکن دوسرے لحاظ سے اس کے مضامین کو چند حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا حصہ : جو سُورہ کا مقدمہ اور آغاز ہے۔ یہ خدا کی عظیم نعمتوں، خلقت، تعلیم و تربیت، حساب و میزان، انسان کے رفاهی وسائل و ذرائع اور اس کی جسمانی و روحانی غذاؤں کی گفتگو کرتا ہے۔

دوسرا حصہ : جن و انس کی خلقت کی کیفیت کے مسئلہ کی ایک وضاحت ہے۔

تیسرا حصہ : زمین و آسمان میں جو خُدا کی آیات اور نشانیاں ہیں ان کو بیان کرتا ہے۔

چوتھا حصہ : یہاں دُنیاوی نعمتوں سے آگے بڑھ کر دوسرے جہان کی نعمتوں کے بارے میں گفتگو ہے۔ اس میں دقت نظر اور شیرینی گفتار کے ساتھ جنت کی نعمتوں کی تمام جزئیات، عام اس سے کہ وہ باغات ہوں یا چشمے، پھل ہوں یا خوبصورت و باوفا ازواج یا انواع و اقسام کے لباس، ان سب کی وضاحت کی ہے۔

اس سُورہ کے پانچویں اور آخری حصہ میں بحرین کے انجام کی طرف ایک مختصر اشارہ ہے اور ان کی دردناک سزا کا ذکر ہے چونکہ اس سُورہ کی اساس و بُنیاد رحمت الہی کا بیان ہے اس لیے اس آخری حصہ کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جنت کی نعمتوں کی تفصیل و تشریح اتنی وسعت کے ساتھ ہے کہ اس نے مومنین کے دلوں کو سرور و مسرت سے ہمکنار کر دیا ہے اور غم و اندوہ کے غبار کو انکے دلوں سے دھو ڈالا ہے اور شہ دل میں نہال شوق کی لہر ریزی کی ہے (فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ كَذِبَانِ) کی تکرار نے جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے ہے اس سُورہ کو جاذب نظر اور خوبصورت آہنگ بخشا ہے۔ جب اس آہنگ کو اس کے خوبصورت مضامین کے ساتھ ملا دیا جائے تو حیران کن کشش محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کوئی تعجب محسوس نہیں ہوتا جب پیغمبر اسلام سے منقول ایک حدیث نظر کے سامنے آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا

(لِكُلِّ شَيْءٍ عَرُوسٌ وَعَرُوسُ الْقُرْآنِ سُورَةُ الرَّحْمٰنِ جَلَّ ذِكْرُهُ)

”ہر ایک کے لیے عروس ہے اور عروس القرآن سورہ الرحمن ہے۔“^۱

قابل توجہ یہ بات ہے کہ لفظ عروس اگرچہ فارسی زبان میں صرف عورت کے لیے ہی بولا جاتا ہے لیکن لغت عرب میں عورت مرد دونوں کے لیے، جب تک وہ مراسم عروسی میں رہیں، ان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔^۲
اور چونکہ عورت و مرد اس قسم کے مراسم میں بہترین حالات اور کامل ترین احترامات کے عالم میں ہوتے ہیں اس لیے یہ لفظ بہت ہی خوبصورت، محترم اور گرامی قدر موجودات کے لیے بولا جاتا ہے۔
اس سورہ کے لیے ”الرحمن“ کا نام اس قدر موزوں اور مناسب ہے کہ جس کی لفظوں کے ذریعے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔

^۱ ”مجمع البیان“ آغاز ”سورہ رحمن“ یہ حدیث ”دُر المنثور“ ج ۶ ص ۱۴۰ پر مندرج ہے۔

^۲ ”لسان العرب“ (مجمع البحرین و صحاح اللغات و۔۔۔۔۔)

سُورَةُ الرَّحْمَنِ کی تلاوت کی فضیلت

چونکہ یہ سُورہ نعمتوں کی شکر گزاری کے احساس کو انسانوں میں نہایت عمدہ انداز میں بیدار کرتا ہے اور دنیا و آخرت کے مادی و معنوی مواہب کے بیان سے انسان کے شوقِ بندگی و اطاعت میں اضافہ کرتا ہے اس لیے اس کی تلاوت کی فضیلتیں بھی بہت زیادہ بیان ہوئی ہیں۔ تلاوت وہ کہ جو انسانی رُوح کی گمراہیوں میں نفوذ کرے اور احساسِ حقانیت کے لیے تحریک کی باعث ہو نہ کہ صرف زبان تک محدود رہے۔

رسولِ خداؐ کی ایک حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ : (من قرأ سورة الرحمن رَحِمَ اللَّهُ ضَعْفَهُ وَادَى شَكَرَ مَا أَعَدَّ اللَّهُ عَلَيْهِ) ” جو شخص سُورہ رحمن کو پڑھے تو خدا نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے سلسلہ میں اس کی کمزوری پر رحم کرے گا اور نعمتوں کی شکر گزاری کا حق، کہ جو اسے عطا کی گئی ہیں، خود ادا کرے گا۔“ ۱

ایک اور حدیث میں جو ثوابِ الاعمال کے بارے میں ہے امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ : ” سُورہ الرحمن کی تلاوت اور اس کے ساتھ قیام کو ہرگز نہ چھوڑنا کیونکہ یہ سُورہ منافقین کے دل میں ہرگز استقرار نہیں پاتا اور خدا اس سُورہ کو قیامت کے دن ایک انسان کی شکل عطا کرے گا جو بہت ہی خوبصورت ہوگا اور جس میں سے بہت ہی عمدہ خوشبو آتی ہوگی۔ پھر وہ ایسی جگہ قیام کرے گا کہ جو خداوند متعال سے بہ اعتبار معنی بہت زیادہ قریب ہوگی تو خدا اس سُورہ سے پوچھے گا کہ دنیاوی زندگی میں کونسا شخص تیرے مضامین کے ساتھ قیام پذیر ہوتا تھا اور ہمیشہ تیری تلاوت کرتا تھا۔ وہ سُورہ جواب میں کہے گا کہ پروردگار وہ فلاں فلاں اشخاص ہیں۔ اس وقت ان افراد کے چہرے چمکنے لگیں گے۔ اب خدا ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہے گا کہ تم جس جس کے لیے چاہتے ہو بخشش کی سفارش کرو۔ وہ جتنی آرزو اپنے دل میں رکھتے ہوں گے اپنے لوگوں کی بخشش کی سفارش کریں گے اور ہر وہ شخص جس کی بخشش کی وہ سفارش کریں گے اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جا اور جہاں چاہتا ہے سکونت اختیار کر لے۔“

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے : (من قرأ سورة الرحمن فقال عند كل "فباي الأبرياء تكذبان" لا بشيء من الأئمة كذب فان قرأها ليلاً ثم مات مات شهيداً وان قرأها نهاراً فمات مات شهيداً) جو شخص سُورہ الرحمن کی تلاوت کرے جب وہ آیت فباي الأبرياء تكذبان پڑھے تو کہے لا بشيء من الأئمة كذب یعنی خداوند! میں تیری کسی نعمت کا انکار نہیں کرتا۔ اگر وہ رات کو تلاوت کرے اور اسی شب انتقال کر جائے تو وہ شہید قرار پائے گا اسی طرح اگر دن کو تلاوت کی ہو اور وہ اسی دن انتقال کر جائے تو بھی شہید قرار پائے گا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

- ۱۔ اَلرَّحْمٰنُ ۙ
 - ۲۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۙ
 - ۳۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ
 - ۴۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۙ
 - ۵۔ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۙ
 - ۶۔ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدْنَ ۙ
- ترجمہ :

- ۱۔ شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے
- ۲۔ خداوند رحمن نے
- ۳۔ قرآن کی تعلیم دی
- ۴۔ انسان کو خلق کیا
- ۵۔ اور اُسے بیان کی تعلیم دی
- ۶۔ سورج اور چاند منظم حساب کے تحت گردش کرتے ہیں۔

۶۔ اور ستارے اور درخت اسے سجدہ کرتے ہیں۔

تفسیر

خدا کی نعمتوں کا آغاز

چونکہ یہ سورہ خدائے عظیم کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو بیان کرتا ہے اس لیے الرحمن کے اس مقدس نام سے شروع ہوتا ہے کہ جو اس کی رحمت واسعہ کی رمز ہے۔ اگر اس میں رحمانیت کی صفت نہ ہوتی تو بلا امتیاز دوست و دشمن وہ اس قسم کا خوانِ نعمت نہ بچھاتا۔ اسی لیے فرماتا ہے: "خداوندِ رحمن نے" (الرحمن)۔ "قرآن کی تعلیم دی" (علّم القرآن)۔

پروردگارِ عالم اس طرح سب سے پہلے اپنی اہم ترین نعمت یعنی تعلیم قرآن کو بیان کرتا ہے۔ یہ بہت ہی پرکشش اور پرمعنی تعبیر ہے۔ اگر ہم صحیح فکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ قرآن عظیم تمام نعمتوں کا سرچشمہ بھی ہے اور ہر نعمت تک پہنچنے کا ذریعہ بھی۔ ہم اس کے ذریعہ مادی اور معنوی نعمتوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ وہ چیز جو بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے، یہ ہے کہ پروردگارِ عالم تعلیم قرآن کی نعمت کے بیان کو "خلقت انسان" اور "تعلیم بیان" ان دونوں سے پہلے بیان فرماتا ہے۔ حالانکہ ترتیبِ طبعی کے لحاظ سے پہلے "خلقت انسان" کا پھر تعلیم بیان کا اور پھر "تعلیم قرآن" کی نعمت کا ذکر ہونا چاہیے تھا لیکن عظمتِ قرآن کا یہ تقاضا تھا کہ ترتیبِ طبعی کے برخلاف سب سے پہلے تعلیم قرآن کو موضوعِ گفتگو بنائے۔ یہ آیت مشرکینِ عرب کے جواب کے طور پر ہے۔ جب پیغمبر اسلام نے مشرکین سے کہا کہ خدائے رحمن کو سجدہ کریں تو انہوں نے یہ بہانہ بنایا کہ: (وما الرحمن) "رحمن کیا ہے" (ذوقان - ۶۰)۔ قرآن کہتا ہے: "خداوندِ رحمن وہ ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا اور پھر اُسے بیان کی تعلیم دی"۔ ہر کیف الرحمن کا نام پروردگارِ عالم کے تمام ناموں کے مقابلہ میں "الند" کے بعد سب سے زیادہ مفہوم کا حامل ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ خدا دو قسم کی رحمتوں کا مالک ہے۔ ایک "رحمتِ عام" دوسری "رحمتِ خاص"۔ الرحمن کا نام اُس کی اُس رحمت عام کی طرف اشارہ ہے کہ جو اہل ایمان و اطاعت کے حال پر ہے اور صرف ان کے لیے مخصوص ہے۔ اس وجہ سے الرحمن کے نام کا اطلاق کبھی غیر خدا پر نہیں ہوتا سوائے اس صورت کے کہ وہ لفظِ عبد کے ساتھ ہو۔ لیکن رحیم کی صفت دوسروں کے لیے بھی بولی جاتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی بھی رحمتِ عامہ کا مالک نہیں ہے۔ جہاں ہمک رحمتِ خاص کا تعلق ہے تو وہ کمزور شکل ہی میں سہی لیکن انسانوں اور دوسرے موجودات میں پائی جاتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ہے کہ (الرحمن اسم خاص بصفة عامة والرحیم اسم عام بصفة خاصة) "رحمن ایک خاص اسم ہے جو صفتِ عمومیت رکھتا ہے یعنی ایسا نام ہے کہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن اس کی رحمت سب کے شامل حال ہے۔"

۱۔ "الرحمن" مبتدا ہے اور "علّم القرآن" اس کی خبر ہے اور "خلق الانسان" خبر کے بعد خبر ہے۔ اس جملے کی ترکیب میں اور محالات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے لیکن چونکہ قابلِ توجہ نہیں تھے لہذا ان کے ذکر سے پہلو تہی کی گئی ہے۔

”رحیم“ ایک عام اسم ہے لیکن خاص صفت کے ساتھ۔ یہ ایک ایسی صفت ہے کہ جو خدا اور غیر خدا دونوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید نے پیغمبر اسلام کو ”رؤف رحیم“ کہا ہے۔ (سورہ توبہ - ۱۲۸) لیکن یہ رحمت مخصوص و معین ہے۔ یہ سوال کہ خدا نے قرآن کی تعلیم کیے دی، مفسرین نے اس کی مختلف قسم کی تفسیریں کی ہیں۔ کبھی جبرئیل اور دوسرے فرشتوں کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے کبھی پیغمبر اسلام کی ذات والاضغات کو کبھی تمام انسانوں کو حتیٰ کہ جنات کو بھی چونکہ یہ سورہ جن و انس پر ہونے والی خدا کی نعمتوں کو بیان کرتا ہے اس لیے اکتیس مرتبہ ان نعمتوں کے مباحث پیش کرنے کے بعد جن و انس سے سوال کرتا ہے کہ: ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے“ سب سے مناسب یہی تفسیر ہے کہ خدا نے اپنے عظیم پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے جن و انس کو قرآن کی تعلیم دی۔

قرآن کی بے مثال نعمت کے تذکرے کے بعد اہم ترین نعمت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”انسان کو پیدا کیا“ (خلق الانسان)۔ یہاں انسان سے مراد نوری انسان ہے نہ کہ حضرت آدمؑ کیونکہ چند آیتوں کے بعد ان کے بارے میں علیحدہ گفتگو کرتا ہے۔ اس سے مراد پیغمبر اسلام بھی نہیں ہیں اگرچہ آنحضرتؐ اس کے بہترین اور عمدہ ترین مصداق ہیں۔ دوسری نعمت جو نعمت بیان ہے اور جس کا تذکرہ اس کے بعد ہے وہ بھی اس امر کی شاہد ہے کہ ”الانسان“ سے مراد عالم نوری انسان ہے۔ باقی دوسری تفسیریں صحیح نظر نہیں آتیں۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ انسان ایک عجیب مجموعہ عالم ہستی بھی ہے اور خلاصہ موجودات بھی۔ ایسا عالم اصغر کہ جس میں عالم اکبر موجود ہے اس کی خلقت ایک بے نظیر و بے مثل نعمت ہے۔ اس لیے کہ اس کے وجود کا ہر جز بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اگرچہ اپنے وجود کے آغاز میں وہ ایک بے قیمت نطفہ ہے یا زیادہ صحیح لفظوں میں ایک حقیر سا وجود ہے کہ جو اس لفظ میں تیرتا ہے لیکن پروردگار عالم کی ربوبیت کے سائے میں وہ اپنی تکمیل کے مراحل اس طرح طے کرتا ہے کہ عالم خلقت کے شریف ترین مقام پر ارتقا پذیر ہو جاتا ہے۔ ”قرآن“ کے بعد ”انسان“ کے نام کا ذکر بھی قابل غور ہے کیونکہ قرآن تدوینی صورت میں اسرار ہستی کا مجموعہ ہے اور انسان تکوینی صورت میں ان اسرار کا خلاصہ ہے اور ان میں سے ہر ایک اس وسیع و عظیم عالم کا ایک نسخہ ”کتاب“ ہے۔ بعد والی آیت خلقت انسان کی نعمت کے بعد ایک اہم ترین نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: ”خدا نے اسے بیان کی تعلیم دی“ (علمہ البیان)۔ بیان لغوی مفہوم کے اعتبار سے ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور یہ ہر اس چیز کے لیے بولا جاسکتا ہے جو دوسری چیز کی مبتنی اور واضح و آشکارا کرنے والی ہو۔ اس بنا پر نہ صرف نطق اور سخن کے معنوں میں ہے بلکہ اس سے مراد کتابت، تحریر اور انواع و اقسام کے عقلی و منطقی استدلال بھی ہیں جو پیچیدہ مسائل کے واضح کرنے والے ہیں وہ سب کے سب بیان کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اگرچہ معانی کے اس مجموعہ کی طرف اشارہ کرنے والی چیز وہی بات کرنا ہے۔ ہم کو عادت ہے کہ ہم بات کرنے کو ایک سادہ سی بات سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات کرنا انسانی اعمال میں سے ایک پیچیدہ ترین اور خوب ترین عمل ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی کام بھی ایسی پیچیدگی اور ذہانت پر مبنی نہیں ہے جتنا کہ بات کرنا۔ اور وہ اس لیے کہ ایک طرف مختلف قسم کی آوازیں نکالنے کے لیے آواز سے تعلق رکھنے والے یہ کہ علم کا پہلا مفعول محذوف ہے یا دوسرا مفعول مفسرین کے درمیان اس اہم ترین اختلاف ہے۔ مناسب یہی ہے کہ پہلا مفعول حذف ہوا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (علم الانسان والجن) القرآن بعض مفسرین نے جو یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ علم کا ایک سے زیادہ مفعول نہیں ہے اور علامت قرار دینے کے معنی میں ہے، یہ مفہوم بہت بعید ہے۔

والے کل پُرزے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ پھیپھڑے ہوا کو اپنے اندر جمع کر کے اس کو بتدریج نرخرہ سے باہر بھیجتے ہیں اور آواز سے تعلق رکھنے والے تاروں میں آواز پیدا کر دیتے ہیں حالانکہ آوازیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں سے کوئی رضا مندی کی نشانی ہوتی ہے تو کوئی غیظ و غضب کی، کوئی عام گفتگو کی، کوئی مدد طلب کرنے کی کوئی محبت کی علامت ہوتی ہے کوئی عدالت کی۔ پھیپھڑے ان آوازوں کو وجود میں لاتے ہیں۔ اس کے بعد آواز، زبان، ہونٹ، دانتوں اور فضا کے ذہن کی مدد سے حروف و الفاظ کو نہایت تیزی کے ساتھ وجود میں لاتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ طویل اور ایک طرح کی آواز جو نرخرہ سے باہر آتی ہے اس کی مختلف طرحوں سے قطع و برید ہوتی ہے جس سے حروف تشکیل پاتے ہیں۔

دوسری طرف لغتوں کی تشکیل کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ انسان فکری ترقی کے زیر اثر اپنی مادی و معنوی ضرورتوں کے ماتحت مختلف قسم کی زبانیں بناتا ہے۔ اس کی اس زبان سازی کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ دنیا میں موجود زبانوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ صحیح طور پر ان کو شمار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی نئی زبانیں اور لغتیں بتدریج تشکیل پاتی رہتی ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک دنیا میں رائج زبانوں کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے اور بعض کے نزدیک زبانوں کی یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کا مقصد یہ تھا کہ وہ صرف بنیادی اور اصولی زبانوں کو شمار کریں ورنہ اگر مقامی بولیوں پر بھی نظر کی جائے تو زبانوں کی تعداد کہیں زیادہ نظر آتی ہے۔ بعض اوقات قریب قریب واقع دو دیہات کے باشندے دو مختلف مقامی بولیوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔

سوم عقل و فکر کے مطابق احساسات کے بیان اور استدلال و جملہ سازی کی تنظیم کا وہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ جو بیان اور لفظ کی روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گفتگو انسان سے وابستہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مختلف قسم کے جانور اپنی ضرورتوں کو سمجھانے کے لیے مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں لیکن ان آوازوں کی تعداد بہت ہی کم اور غیر واضح ہے۔ جب کہ غیر محدود اور وسیع شکل کا جو بیان ہے وہ انسان ہی کے اختیار میں ہے۔ کیونکہ خدا نے گفتگو کرنے کی قدرت زیادہ تر اسی کو بخشی ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اگر ہم بیان کے نقوش اور اس کے اثرات، انسانی زندگی کے بتدریج ارتقاء اور تمدنوں کی تخلیق کو پیش نظر رکھیں تو ہم اس بات کا یقین حاصل کر لیں گے کہ اگر بیان کی نعمت نہ ہوتی تو انسان اپنے علوم و تجربات کو آسانی کے ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل نہ کر سکتا اور وہ علم و دانش، تمدن اور اخلاق کی ترقی کا باعث نہ بنتا۔ اگر کبھی یہ نعمت انسان سے سلب کر لی جائے تو انسانی معاشرہ بڑی تیزی کے ساتھ تنزل کا شکار ہو جائے۔ اگر بیان کو اس کے وسیع معانی میں لیا جائے کہ جو تحریر و کتابت، انواع و اقسام کے ہنر اور فنون پر حاوی ہے تو انسانی زندگی میں اس کے اثرات نہایت اہم انداز میں واضح ہوں گے۔ یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ سورہ الرحمن میں جو پروردگار عالم کی نعمتوں کے حوالوں کا مجموعہ ہے، نعمت خلقت انسان کے بعد تعلیم بیان کی گفتگو کیوں ہوئی ہے۔

اس کے بعد پروردگار عالم نے اپنی نعمتوں میں سے چوتھی نعمت کو موضوع گفتگو بنا کر فرمایا ہے: "چاند اور سورج ایک منظم حساب کے ماتحت گردش کرتے ہیں" (الشمس والقمر بحسبان)۔

۱۔ "دائرة المعارف" فرید وجدی جلد ۸ ص ۳۶۴ مادہ "نفت"

۲۔ "حسبان" بروزن "غفران" مصدر ہے جو حساب اور نظم و ترتیب کے معنی میں ہے اور آیت میں کچھ محذوف ہے اور تقریر میں اس طرح ہے (الشمس والقمر بحسبان) سورج اور چاند کا سفر حساب کے ساتھ جاری ہے۔

خود سورج کا وجود انسان کے لیے عظیم ترین نعمت ہے اور وہ اس لیے کہ اس سے حرارت اور نور حاصل کیے بغیر نظام شمسی میں زندہ رہنا غیر ممکن ہے۔ اس سے قبل ہم عرض کر چکے ہیں کہ کڑھ خاکی میں جو بھی جنبش و حرکت صورت پذیر ہے اس کا اصل سرچشمہ سورج کی حرارت اور اس کی روشنی ہے۔ گھاس کا اگنا، بڑھنا، غذائی ذخیرے، بارشیں، ہواؤں کا چلنا یہ سب اسی نعمت کی برکت کی وجہ سے ہے۔ چاند بھی حیات انسانی کے سلسلہ میں اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ چاند انسان کی تاریک راتوں کا چراغ ہے وہ قوتِ جاذبہ کہ جو سمندروں کے متوجہ جزر کا سرچشمہ ہے سمندر سے متعلق زندگی کے باقی رہنے کا ایک بڑا سبب ہے اور بہت سے ساحلوں کو سیراب کرنے کا باعث ہے کہ دریا جن کی مجاورت میں سمندر میں گر جاتے ہیں۔

اس سبب پر مستزاد یہ کہ یہ طے شدہ ہے کہ چاند اور سورج کی حرکت کا نظام (بالفاظ دیگر چاند کی گردش زمین کے گرد اور زمین کی گردش سورج کے گرد) رات اور دن، مہینے اور سال اور مختلف موسموں کی مرتب و منظم تخلیق کا باعث ہے اور انسانوں کی زندگی، ان کے صنعتی، زرعی اور تجارتی امور کے لیے پروگرام بنانے کے نظم و ضبط کا سبب ہے۔ اگر یہ منظم سفر نہ ہوتا تو انسانی زندگی کا نظام ہرگز تشکیل نہ پاتا۔

نہ صرف یہ کہ ان آسمانی گروں کی حرکت بہت دقیق نظام رکھتی ہے بلکہ ان کے اجسام اور قوتِ جاذبہ، زمین سے ان کا فاصلہ اور آپس میں ایک دوسرے سے فاصلہ یہ سب اندرونی حساب ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ چیزیں ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں تو نظام شمسی میں عظیم انقلابات برپا ہو جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی بھی درہم برہم ہو جائے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس وقت اس نظام کے اجزاء کڑھ خورشید سے جدا ہوئے تو بہت ہی بکھرے ہوئے اور غیر مرتب نظر آتے تھے۔ آخر کار ان کی موجودہ ترتیب صورت پذیر ہوئی۔ اس سلسلہ میں امور طبعی کے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ: ہمارا نظام شمسی بظاہر ایک ایسے مخلوط درہم برہم موائے وجود میں آیا ہے کہ جو سورج سے بارہ ہزار درجہ کی حرارت لیے ہوئے جدا ہوا اور ناقابلِ تصور تیزی کے ساتھ فضا سے لامحدود میں بکھر گیا۔ لیکن اس ظاہری بے ترتیبی اور فضائی انقلاب سے اس قسم کی دقیق ترتیبِ عالم وجود میں آئی ہے کہ ہم آج آئندہ حادثات کے منٹ اور سیکنڈ کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ اس نظام و ترتیب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اوضاعِ فلکی ہزار ملین سال گزر جانے کے باوجود اسی حالت پر باقی ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ سورج اگرچہ نظام شمسی کے وسط میں بظاہر بغیر کسی حرکت کے قائم ہے لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ بھی اپنے تمام چاند ستاروں کے ہمراہ اسی کمکشال کے اندر جس سے وہ تعلق رکھتا ہے معین نقطہ کی طرف حرکت کر رہا ہے اور اس کی حرکت بھی ایک معین تیزی و تنظیم رکھتی ہے۔

پانچویں عظیم نعمت کے سلسلہ میں پروردگارِ عالم آسمان سے زمین کی طرف رخ کر کے فرماتا ہے: ”گھاس اور درخت اس کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔“ (والنحو والشجر يسجدان)۔ نجم کہی تو ستارہ کے معنی میں آتا ہے اور کہی ایسی گھاس کے معنی میں آتا ہے جس کا کوئی تنانہ ہو اور یہاں شجر کے قرینہ سے دوسرے معنی ہی مراد ہیں یعنی وہ گھاس جو تنے کے بغیر ہو۔

اصولی طور پر یہ لفظ طلوع کے معنی میں ہے اور گھاس کو اگر ”نجم“ کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ زمین سے سر نکالتی ہے اور ستارے کو نجم کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی بنا پر کہ وہ طلوع ہوتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ انسانوں کا تمام مواد غذائی اس امتیاز کے ساتھ نباتات سے لیا گیا ہے کہ بعض کو تو انسان براہ راست اپنے مصرف میں لاتا ہے اور بعض نباتات ایسے جانوروں کی غذا بنتے ہیں جو انسانوں کے غذائی مواد کا جز ہیں۔ یہ معنی دریائی جانوروں کے سلسلہ میں بھی صحیح طور پر منطبق ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھی بہت سے ایسے چھوٹے نباتات سے غذا حاصل کرتے ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں سمندر کے گوشہ و کنار میں سورج کی روشنی کے پرتوں میں اگتے ہیں اور سمندروں کی موجوں کے درمیان چلتے پھرتے ہیں۔ اس طرح نجم مختلف قسم کے چھوٹے اور بگنے والے نباتات وغیرہ (مثلاً کدو اور کھیرے کے بوٹے) کو کہتے ہیں اور شجر مختلف قسم کے تنہ دار نباتات کو کہتے ہیں جیسے غلے اور میوہ دار درخت وغیرہ۔

اور (یوجدان) ”یہ دونوں سجدہ کرتے ہیں“ کا مفہوم قوانین آفرینش کے مقابلہ میں انسانوں کی منفعت کے لیے ان دونوں کا بغیر کسی قید و شرط کے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے کہ جو خدا نے ان کے لیے مقرر کیا ہے اور یہ اس پر بلا چون و چرا مصروف سفر ہیں ضمنی طور پر یہ ان کے سر و صحت کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ اس طرح کہ نبات کے ہر پتے اور ہر دانہ پر پروردگار عالم کی عظمت اور اس کے علم کی عجیب و غریب نشانیاں موجود ہیں اور ہر ذرہ معرفت پروردگار کا دفتر بے پایاں ہے۔
مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اوپر والی آیت میں ”النجم“ سے مراد آسمان کے ستارے ہیں لیکن جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے آیت میں موجود قرآن کی بنا پر زیادہ مناسب ہے۔

ایک نکتہ

چند روایات پر ایک نظر

مذکورہ بالا آیات کے ذیل میں اسلامی سرچشموں میں ایسی روایات موجود ہیں جو تفسیر طبری کی حیثیت سے روشن ہونے کے مصداق ہیں اور ہر ایک تفسیر آیات کے ایک حصہ کو واضح کرتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ہے کہ آپ نے (علمہ البیان) کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا: (البیان الاسواء العظمیٰ به علو کل شیء) ”بیان وہی اسم اعظم ہے کہ جس کے ذریعے تمام چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔“

اسم اعظم اور اس کی تفسیر کے بارے میں جلد ۴ پر (سورہ اعراف کی آیت ۱۸۰ کے ذیل میں) ہم نے بحث کی ہے۔ ایک اور حدیث میں امام علی ابن موسیٰ رضاؑ سے مروی ہے کہ: (الرحمن علو القرآن) سے مراد یہ ہے کہ خدا نے بنیمہ کو قرآن کی تعلیم دی اور خالق الانسان سے مراد امیر المؤمنینؑ کی تخلیق ہے اور (علمہ البیان) ان تمام امور کا بیان ہے کہ جن کے لوگ محتاج ہیں۔ یہ امر واضح ہے کہ مذکورہ روایتیں ان آیتوں کے مفہوم کی عمومیت کو محدود نہیں کرتیں بلکہ ان کے واضح مفہوم کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

۱۔ عالم ہستی کے مختلف جہات کے بعد کے بارے میں ہم تفصیل کے ساتھ جلد ۶ (سورہ حج کی آیت ۱۸ کے ذیل میں) بحث کر چکے ہیں۔ اس طرح جلد ۶ (سورہ اسراء کی آیت ۴۴ کے ذیل میں) ہم تفصیل بحث کر چکے ہیں۔
۲۔ تفسیر ”مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۱۹۷

- ۷۔ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝
- ۸۔ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝
- ۹۔ وَاقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝
- ۱۰۔ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ۝
- ۱۱۔ فِيهَا فَاكِهَةٌ ۝ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ۝
- ۱۲۔ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۝
- ۱۳۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝

ترجمہ

- ۷۔ اور آسمان کو بلند کیا اور (اس میں) میزان و قانون رکھا۔
- ۸۔ تاکہ تم میزان میں زیادتی نہ کرو۔
- ۹۔ وزن کو عدل کی بنیاد پر قائم کرو اور میزان کو کم نہ رکھو۔
- ۱۰۔ اور زمین کو اس کے لوگوں کے لیے پیدا کیا
- ۱۱۔ جس میں پھل اور شگوفوں سے پُر درخت ہیں۔
- ۱۲۔ اور ایسے دانے کہ جن میں تنے اور پتے ہیں جو کاہ اور خوشبودار گھاس کی شکل میں نکلتے ہیں۔

۱۳۔ اے گروہ جن و انس ! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز کے لیے میزان قرار دی

یہ آیتیں گزشتہ بیان شدہ آیتوں کے ذکر کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں ان آیتوں میں پروردگار عالم پانچ ایسی عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اہم ترین ہیں۔ یہاں پہلی آیت میں بھٹی نعمت کی طرف، کہ جو خلقت آسمان ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”خدا نے آسمان کو بلند کیا (والسما رفعها)۔ آسمان سے اس آیت میں مراد چاہے اس کی اوپر والی جہت ہو چاہے ستارے یا زمین کی فضا (وہ عظیم فضائی کھال کہ جس نے اس گزہ زمین کے اطراف کو گھیر رکھا ہے اور عالمی شعاؤں اور آسمانی پتھروں کے مقابلے میں سپر کی طرح اس کی حفاظت کرتی ہے۔ نیز سورج کی گرمی اور سمندر سے اٹھنے والی رطوبت کو بادلوں کی تشکیل اور بارش کے نزول کے لیے اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے) کچھ بھی ہو وہ اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے لیے زندگی گزارنا یا ناقص ہے یا محال ہے جی ہاں نور و روشنی جو گرمی، ہدایت، حیات اور حرکت کا سبب ہیں آسمان کی طرف سے آئے ہیں۔ بارش آسمان کی طرف سے آئی ہے۔ نزول دجی بھی آسمان کی طرف سے ہے (اس صورت میں آسمان مادی اور معنوی اعتبار سے ایک مہنوم رکھتا ہے)۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر بلند شدہ آسمان اپنے تمام معانی و مفاہیم کے ساتھ خدا کی ایک عظیم نشانی ہے اور اس کی معرفت کے راستے میں انسان کی بہترین مدد کرتی ہے۔ جس وقت ارباب دانش اس میں غور کرتے ہیں تو بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں: ”ربنا ما خلقت لهذا باطلاً۔“ ”پروردگار تو نے اس عظیم کارخانہ کو بیکار پیدا نہیں کیا۔“ (آل عمران - ۱۹۱)

اس کے بعد پروردگار عالم ساتویں نعمت کا حوالہ دے کر فرماتا ہے: ”خدا نے میزان قرار دی“ (ووضع المیزان)۔ میزان ہر قسم کی ناپ تول کے پیمانے کو کہتے ہیں۔ باطل سے حق کا تقابل، ظلم و ستم سے عدالت کا تقابل، قیمتوں کا تعین اور مختلف اجتماعی مرحلوں میں حقوق انسانی کا تعین، یہ سب چیزیں میزان ہیں۔ میزان قانون تکوینی اور دستور تشریعی کے معنی بھی رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب وسیلہ تقابل و توازن ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ لغت کے اعتبار سے میزان ترازو کو کہتے ہیں جو اجسام کے وزن کو معلوم کرنے کا ذریعہ ہے، لیکن یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جس میزان کی طرف اس آیت میں خلقت آسمان کے ذکر کے بعد اشارہ ہوا ہے وہ ایک وسیع مہنوم رکھتی ہے کہ جو ناپ تول کے ہر ذریعہ اور تمام تشریعی و تکوینی قوانین کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس سے نہ صرف اجناس کے وزن کو معین کرنے والا پیمانہ مراد ہے بلکہ اصولی طور پر آسمان کا بلند ہونا اور وہ دقیق نظم و ضبط کہ جو کروڑوں آسمانی گروں پر حاکم ہے وہ سب کچھ مراد ہے۔ اس لیے کہ یہ سب طے شدہ میزان و قوانین کے بغیر وجود میں آہی نہیں سکتا۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ بعض عبارتوں میں میزان، قرآن، عدل، شریعت، یا ترازو کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو حقیقت میں ان میں سے ہر ایک اس مکمل اور وسیع مہنوم کا ایک صحیح مصداق ہے۔

پروردگار عالم بعد دلی آیت میں اس موضوع سے ایک پرکشش اور عمدہ نتیجہ نکالتے ہوئے فرماتا ہے: (الأتطفوا فی المیزان)۔

عالم ہستی میں میزان کے قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ تم بھی میزان کی رعایت کرو اور اس میں سرکشی نہ کرو۔ تم بھی اس عظیم عالم کا ایک حصہ ہو اور اس وسیع جہان میں تم ایک بے جوڑ ٹکڑے کی طرح ہرگز زندگی نہیں گزار سکتے۔ تمام عالم کا ایک میزان و حساب ہے۔ تمہارا بھی ایک میزان و حساب ہونا چاہیئے۔

اگر اس عالم عظیم سے میزان و قانون کو ختم کر دیا جائے تو یہ تمام کا تمام فنا ہو جائے اور اگر تم بھی نظم و میزان سے بے بہرہ ہو جاؤ تو تم بھی منزل فنا کے راہی بن جاؤ گے۔ کتنی پرکشش اور عمدہ تعبیر ہے جو کل عالم ہستی سے انسان کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور عالم کبیر پر حکم چلانے والے قانون کو عالم صغیر یعنی انسانی زندگی پر جو حاکم ہیں ان قوانین سے ہم آہنگ کر رہی ہے۔ یہ ہے حقیقت توحید کہ تمام عالم پر حکومت کرنے والے اصول ایک ہی جیسے ہیں۔ دوبارہ مسئلہ عدالت اور وزن پر زور دیتے ہوئے فرماتا ہے: ”تم وزن کو عدالت کی بنیاد پر قائم کرو اور میزان میں کسی قسم کی کمی نہ رکھو“ (واقیموا الوزن بالقسط ولا تحسروا المیزان)۔ قابل توجہ یہ ہے کہ ان تین آیتوں میں تین مرتبہ میزان کا ذکر ہوا ہے۔ حالانکہ دوسرے اور تیسرے مرحلہ میں ضمیر سے کام چلایا جاسکتا تھا۔ اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ میزان ان تین آیتوں میں الگ الگ معنی لیے ہوئے ہے۔ محض ضمیر کے حوالے سے صحیح معنی واضح نہیں ہو سکتے تھے نیز آیتوں کا تناسب بھی اسی امر کو قبول کرتا ہے، کیونکہ پہلے مرحلہ میں گفتگو ایسی میزان اور ایسے معیار و قوانین سے ہے جو خدا نے سارے عالم ہستی میں قرار دیے ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں گفتگو انسانوں کے انفرادی و اجتماعی تمام موازنہ حیات میں طغیان و سرکشی نہ کرنے کی ہے جو فطرۃً زیادہ محدود دائرہ رکھتے ہیں۔ تیسرے مرحلہ میں وزن کے خاص معنی پر زور دیتے ہوئے حکم نافذ کرتا ہے کہ چیزوں کی ناپ تول اور وزن کرتے وقت کسی قسم کی کمی نہ کرو اور کوئی کسر باقی نہ چھوڑو۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ محدود ہے۔ اس طرح تینوں آیتوں میں میزان اور ناپ تول کے مسئلہ میں ایک نہایت پرکشش اور خوبصورت سلسلہ مراتب استعمال ہوا ہے کہ جو بڑے دائرہ سے چھوٹے دائرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

انسانی زندگی میں میزان کی اہمیت اپنے تمام معانی کے اعتبار سے اس طرح ہے کہ محدود ترین مصداق یعنی ترازو چیزوں کے تبادلے کے سلسلہ میں اگر ایک دن کے لیے درمیان سے ہٹا دیں تو ہم جھگڑوں اور قضیوں کے کتنے درد سر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس اعتبار سے اس لفظ میزان کے جو لامحدود معانی ہیں، اگر وہ اپنی جگہ باقی نہ رہیں تو ہمیں لامحدود پریشانیاں لاحق ہو جائیں۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض روایات میں میزان سے مراد وجود امام لیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام کا وجود مبارک حق و باطل کے تقابل و تعین اور تشخیص حقائق کا معیار ہے اور ہدایت کے لیے ایک مؤثر عامل ہے۔

اسی طرح میزان سے مراد اگر قرآن لیا جائے تو وہ بھی انہی معانی کی طرف اشارہ ہے۔ بہر حال اس طرف توجہ دیتے ہوئے کہ یہ تمام آیتیں اللہ کی نعمتوں کے ذکر سے متعلق ہیں، یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ میزان کا وجود، خواہ سارے نظام عالم میں ہو، خواہ انسانی معاشرہ کے اجتماعی رابطہ میں اور خواہ وہ معاملات تجارت میں ہو، یہ سب خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔

اس کے بعد پروردگار عالم آسمان سے ہٹ کر زمین کو موضوع بناتا ہے اور فرماتا ہے: ”خدا نے زمین کو انسانی زندگی کے لیے پیدا کیا ہے“ (فخر رازی) اپنی تفسیر میں لکھتا ہے کہ میزان پہلی آیت میں اسم آکر ہے۔ (ناپ تول کے بیانات کے معنی ہیں) اور دوسری آیت میں مصدری معنی رکھتا ہے (وزن کرنا) اور تیسری آیت میں مفعولی معنی رکھتا ہے اور جنس موزوں کے معنی میں ہے۔

یہ حدیث تفسیر علی بن ابیہیم میں امام علی بن موسیٰ رضا سے مروی ہے اور یہ حدیث منقول ہے ہم نے اس کے صرف ایک حصہ کے مضمون کو نقل کیا ہے تفسیر علی بن ابیہیم جلد ۱۲ ص ۱۲۱

(والارض وضعها للانام)۔ "انام" کی بعض مفسرین نے انسانوں کے معنی میں اور بعض نے جن و انس کے معنی میں اور بعض نے ہر ذی روح کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ البتہ ارباب لغت اور مفسرین کی ایک جماعت اسے خلق مطلق کے معنی میں لیتی ہے لیکن سورہ میں موجود قرآن اور جن و انس سے مخاطبت دونوں یہ بتاتے ہیں کہ اس سے یہاں مراد جن و انس ہی ہیں

جی ہاں یہ کثرہ خاکی کہ جسے اس آیت میں ایک عظیم نعمت الہی قرار دیا گیا ہے اور دوسری آیتوں میں اسے "مہداد" یعنی گولے کے طور پر یاد کیا گیا ہے وہ ایک اطمینان بخش اور آرام دہ مقام ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ عام حالات میں اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کر سکتے لیکن جب ایک چھوٹا سا زلزلہ زمین کی ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیتا ہے یا ایک آتش فشاں کسی شہر کو عذاب کے مواد، دھوئیں اور آگ کے نیچے دفن کر دیتا ہے تو پھر ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ ساکن و آرام دہ زمین اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ خصوصاً جب ہم اس چیز پر غور کریں کہ جو ماہرین نے زمین کی اپنے گرد چکر لگانے والی حرکت کی تیزی کے طور پر تجویز کی ہے اور سورج کے گرد اس کی حرکت بتاتی ہے تو نہ صرف اس سرچ اور لرزہ براندام کرنے والی حرکت بلکہ انواع و اقسام کی حرکتوں کے باوجود اس کے سکون و آرام کی اہمیت ہم پر زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

زمین کے بارے میں "وضع" کا لفظ ہے اور آسمان کے بارے میں "رفع" استعمال ہوا ہے۔ اس تقابل میں جو لطافت اس کے علاوہ اس میں ایک معنی خیز اشارہ ہے اور وہ زمین اور اس کے ان ذرائع کی طرف ہے کہ جو انسان کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں جیسا کہ سورہ "ملک" کی آیت ۱۵ میں ہمیں ملتا ہے۔ هو الذی جعل لکوالارض ذلولاً فامشوا فی مناكبھا وکلوا من رزقہ "وہ وہی ہے کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے اس کے مختلف راستوں پر چلو پھرو اور جو رزق الہی کے طور پر اس میں پیدا ہوا ہے اُس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس طرح پروردگار اس سلسلہ کی آٹھویں نعمت کو معین فرماتا ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں نویں اور دسویں ان نعمتوں کی طرف جو انسان کے مواد غذائی کے ایک حصہ کو تشکیل دیتی ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "زمین میں پھل اور شگوفوں سے پُر نخلستان ہیں" (فیہا فاکھۃ والنخل ذات الاکمام)۔ "فاکھۃ" ہر قسم کے پھل کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ "غلبہ" نے "مفردات" میں کہا ہے، اور یہ جو بعض نے اسے فرما اور رطب کے علاوہ تمام پھلوں کے معنی میں لیا ہے اس کی سولے اس کے کوئی دلیل نہیں ہے کہ "نخل" علیحدہ شکل میں آیت میں موجود ہے جب کہ ممکن ہے کہ یہ تکرار ہو اور اس اہمیت کی بنا پر ہو کہ جو کچھ حاصل ہے۔ "سورہ نخل" کی آیت ۱۱ اور سورہ مریم کی آیت ۲۵ کے ذیل میں ہم نے ایک تفصیلی بحث خرما کے مواد غذائی کے حیات بخش فوائد کے بارے میں کی ہے۔

"اکمام" جمع "کمر" (بروزن جن) کی ہے۔ یہ اس غلاف کو کہتے ہیں جو پھل کو چھپاتا ہے اور "کمر" (بروزن قم) اس آستین کے معنی میں ہے جو ہاتھ کو چھپاتی ہے اور "کمر" (بروزن قبر) شب کلاہ ہے (رات کو پہننے والی ٹوپی) جو سر کو ڈھانپتی ہے۔
 ۱۔ ماہرین نے زمین کی سرعت حرکت سورج کے گرد (حرکت انتہائی) ایک منٹ میں ۳۵ کلومیٹر بیان کی ہے اور اس کی اپنے محور کے گرد تیزی رفتار ایک گھنٹہ میں ۱۶۰۰ کلومیٹر (استوائی منطوق میں) بتلائی ہے۔

۲۔ تفسیر نمونہ کی جلد ۷ ص ۲۵۴ سے آگے اور اسی طرح جلد ۶ ص ۲۵۲ سے آگے رجوع فرمائیں
 ۳۔ اس سلسلہ میں جلد ۲۰ میں ہم نے تفصیل بیان کی ہے (سورہ نجم سجدہ کی آیت ۴۷ کے ذیل میں)۔

کھجور کے درخت کے بارے میں اس صفت کا انتخاب کہ شروع میں وہ غلاف میں پنهال ہوتا ہے، اس کے بعد غلاف کو چیر کر خوشہ نخل کو ایک پرکشش انداز میں باہر نکالتا ہے، ممکن ہے کہ اس کی حیران کر دینے والی خوبصورتی کی بنا پر ہو یا ان منفعتوں کے باعث ہو کہ جو اس غلاف میں پوشیدہ ہیں اور جو اس مخصوص مادہ کے پھوڑ کا حامل ہے۔ یہ غذا کے طور پر بھی کام آتا ہے اور دوا کے طور پر بھی۔ ان سب سے قطع نظر یہ غلاف شکم مادر کی طرح ہے جو کھجور کے بچوں کو ایک مدت تک اپنے اندر پرورش کرتا ہے۔ اور آفات سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور جس وقت وہ ہوا اور روشنی کے مقابلہ کے قابل ہو جاتے ہیں تو پھر غلاف ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اس درخت کی ایک خاص وضع اور کیفیت ہے کہ پہلے یہ غلاف میں ہوتا ہے پھر خوشہ کی شکل میں باہر آتا ہے۔ یہ کیفیت اس پھل کے توڑنے اور چھنے کو آسان کر دیتی ہے اور اگر اس طرح ہوتا کہ کھجور کے درخت کے طویل القامت ہونے کے باوجود اس کے پھل سیب کے درخت کے پھلوں کی طرح مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے ہوتے تو ان کا توڑنا اور چھنا بہت مشکل ہو جاتا۔

آخر میں اپنی گیارہویں اور بارہویں نعمت کے بارے میں یوں گفتگو فرماتا ہے: ”اور زمین میں دلنے میں، ڈنھل اور پتوں کے ہلے جو کادہ کی شکل میں نکلتے ہیں اور اسی طرح خوشبودار گیاه و نباتات“۔ (والحب ذوالعصف والريحان)۔ غذائی دانے انسانوں کی خوراک ہیں اور ان کے خشک وتر پتے ان حیوانوں کی خوراک ہیں کہ جو انسان کی خدمت پر مامور ہیں۔ جن کے دودھ، گوشت، کھال اور اڈن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ تو اس طرح کوئی چیز بھی بیکار اور پھینک دینے کے قابل نہیں ہے۔ دوسری طرف خوشبو، گیاه اور پھولوں کو بھی زمین سے پیدا کیا ہے کہ جو مشام جاں کو مضطر کرتے ہیں اور رُوح کو سکون و نشاط و آرام و سرخوشی عطا کرتے ہیں اور اس طرح اس نے انسان پر اپنی نعمتیں تمام کی ہیں۔ ”حب“ ہر قسم کے دانہ کو کہتے ہیں اور ”عصف“ (بروزن اسپ) پتوں اور گھاس کے ان اجزاء کے معنی میں ہے کہ جو گھاس سے الگ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ہواؤں کی وجہ سے ہر طرف بکھر جاتے ہیں۔ ”حب“ کٹی ہوئی گھاس کو بھی کہتے ہیں ”ریحان“ کے بہت سے معنی ہیں۔ اس کے ایک معنی خوشبودار گھاس اور نباتات کے بھی ہیں۔ ہر قسم کی روزی کو بھی ریحان کہتے ہیں لیکن اس جگہ پہلے معنی ہی مناسب ہیں۔ ان مادی اور معنوی مختلف قسم کی نعمتوں کے ذکر کے بعد آخری آیت میں جن و انس کو مخاطب کرتے ہوئے کتابچہ ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟“ (قبای الاء ربکما تکذبان)۔ وہ نعمتیں جن میں سے ہر ایک دوسری سے گرانہما اور قیمتی ہے اور وہ نعمتیں کہ جنہوں نے تمہاری ساری زندگی کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک تمہارے پروردگار کی قدرت و لطف و کرم اور مہربانی کی نشانی ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ تم اس کی تکذیب کرو۔ یہ استغنام، استغنام تقریری ہے جسے اقرار لینے کے وقت زبان پر لاتے ہیں۔ ایک روایت جسے سورہ کی ابتدا میں ہم نے پیش کیا ہے، اس میں حکم دیا گیا ہے کہ اس جملہ کے بعد ہم عرض کریں ”پروردگار ہم تیری نعمتوں میں سے کسی کی تکذیب نہیں کرتے“۔ (لا ایشی من الائم رب اکذب)

گزشتہ آیتوں میں گفتگو اگرچہ انسانوں کے بارے میں ہوئی تھی اور گروہ جن کے بارے میں بالکل نہیں تھی لیکن بعد والی آیت بتاتی ہے کہ ”کما“ کی ضمیر میں یہ دونوں گروہ مخاطب ہیں۔ بہر حال خدا اس جملے کے ساتھ جن و انس دونوں گروہوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان مسائل کے بارے میں غور کریں اور اس کے بعد بغیر اس کے کہ کسی دوسرے کی تعلیم کی ضرورت ہو اپنی عقل سے یہ سوال کریں کہ کیا خدا کی ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت قابل انکار ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو پھر اپنے ولی نعمت کو وہ کیوں نہ پہچانیں اور شکر منعم حقیقی کو کیوں نہ اس کی معرفت کا وسیلہ قرار دیں اور اس کے آستان اقدس پر سر تسلیم کیوں نہ خم کریں۔

”اے“ کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ان نعمتوں میں سے ہر ایک پروردگار کے مقام ربوبیت کی اور اس کے لطف و کرم کی دلیل ہے۔
چہ جائیکہ ان کا مجموعہ۔

چند نکات

۱۔ نعمتوں کی شناخت خدا کی معرفت کا زینہ ہے

مذکورہ بالا نعمتوں (قرآن، خلقت انسان، تعلیم بیان، زمانہ کا منظم حساب، مختلف درخت اور گھاس کی پیدائش، آسمان کی تخلیق، قوانین کی حاکمیت، زمین کی خلقت اس کی خصوصیات کے ساتھ، پھلوں کی تخلیق، کھجور کی خلقت، حیوانات کی خلقت، خوشبودار گھاس اور پھولوں کی تخلیق) کے بارے میں تھوڑا سا غور و خوض، ان جزئیات، خصوصیات اور اسرار کے ساتھ کہ جو ان میں سے ہر ایک میں پچھے ہوئے ہیں، اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ انسان میں احساس شکرگزاری پیدا کرے اور انہیں نعمتوں کے سرچشمے کی معرفت کر لے۔
اس بنا پر خداوند متعال اپنے بندوں سے ان نعمتوں کے بیان کے بعد، ایک ایک لطف و کرم کا اقرار لیتا ہے اور اس جملے کی آنے والی آیتوں میں بھی دوسری نعمتوں کے ذکر کے بعد تکرار کرتا ہے۔ اس جملے کو اس نے ۳۱ بار دہرایا ہے۔ یہ تکرار فصاحت کو مجروح نہیں کرتی بلکہ خود فصاحت کا ایک انداز ہے۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسے کوئی باپ اپنے فرائض سے غافل بیٹے کو مخاطب کر کے کہے: ”کیا تو بھول گیا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا کمزور بچہ تھا۔ تیری پرورش کے لیے میں نے کیسے کیسے خون جگر پیئے ہیں۔ کیا تو بھول گیا ہے کہ جب تو بیمار تھا تو میں نے بہترین ڈاکٹر اور حکیم تیرے علاج کے لیے مہیا کیے اور تیرے علاج کے لیے میں نے کونسی رحمتیں نہیں اٹھائیں۔ کیا تو بھول گیا ہے کہ جب تُو نے منزلِ شباب میں قدم رکھا اور تجھے بیوی کی ضرورت ہوئی تو تیرے لیے میں نے پاک و پاکیزہ بیوی منتخب کی۔ کیا تو بھول گیا ہے کہ جب تو مکان، زندگی اور سائل زندگی کی احتیاج رکھتا تھا تو میں نے یہ تمام چیزیں تیرے لیے فراہم کیں۔ تو پھر یہ سرکشی و نافرمانی، بے مروتی و بے وفائی کس لیے ہے۔“
خداوند منان بھی اپنی انواع و اقسام کی نعمتیں اپنے ان غفلت شعار بندوں کو یاد دلاتا ہے اور ان نعمتوں کے ہر حصہ کے ذکر کے بعد ان سے سوال کرتا ہے کہ ”ان میں سے کن کن نعمتوں کا تم انکار کرتے ہو؟ پس یہ نافرمانی اور سرکشی کس بنا پر ہے جب کہ میری اطاعت بھی خود تمہارے تدریجی ارتقا اور ترقی کی ضمانت ہے اور تمہارے پروردگار کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

۲۔ زندگی میں نظم و حساب کا مسئلہ

ہمارے جسم میں بیس سے زیادہ دھاتیں اور دھاتوں سے مشابہت رکھنے والی چیزیں استعمال ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک معین کیفیت و مقدار میں ہے اور جس وقت ان کی معین و مقررہ مقدار و کیفیت میں تھوڑی سی بھی تبدیلی واقع ہو تو ہماری سلامتی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ مثلاً گرمی کے موسم میں جب انسان کو زیادہ پسینہ آتا ہے تو وہ گرمی کی شدت کا شکار ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے کہ کوئی اور بیماری اسے لاحق ہو یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اس کی موت واقع ہو جائے۔ حالانکہ اس بیماری کا سبب اور اس کی علت ایک بہت ہی آسان اور سادہ مسئلہ ہے یعنی پانی اور خون کے نمک کی کمی۔ اور اس کا علاج زیادہ پانی پینے اور نمک کھانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسے ہمارے بدن کی عمارت میں

نظم و حساب کا ایک سادہ سا نمونہ سمجھیے۔ بعض اوقات مخلوقات کے ڈھانچے کے بارے میں جو نتائج اخذ کیے جاتے ہیں وہ بہت ہی عجیب و پُر لطف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیل یا ایٹم جو اس قدر مختصر ہیں کہ ان کا ہزارواں حصہ اور کبھی ایک ملین ملی میٹر یا مائیکرو گرام ہی اس کا سب کچھ ہوتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ماہرین مجبور ہیں کہ ان کے دقیق اور باریک حسابات کے سلسلہ میں الیکٹران کی دماغوں سے استفادہ کریں۔ یہ تو نظام تکوین میں ہے۔ اجتماعی حالات میں بھی قانون عدالت سے انحراف بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ پوری قوم کو ہلاکت کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے ان مفاہیم کے حوالے سے جو مندرجہ بالا آیات میں ہم تک پہنچے ہیں، اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے اور (والتسماء رفعها ووضع المیزان ألا تطفغوا فی المیزان) کے جملوں میں اس نے کہنے کی تمام باتیں کہہ ڈالی ہیں اور شرعی قوانین کی نافرمانی اور ان سے انحراف و رُود گردانی کو احکام تکوینی سے سرکشی کے برابر قرار دیا ہے کہ جو آسمانوں پر حاکم ہیں قرآن ان آیتوں میں جہان ہستی اور عالم انسانیت کی ایک قابل توجہ اور عمدہ تصویر پیش کرتا ہے وہاں یہ بھی بتاتا ہے کہ یہی جہان نہیں دوسرا جہان بھی یوم الحساب ہے اور موازن کے نصب ہونے کا دن ہے بلکہ وہاں کا حساب اور اس کی میزان تو یہاں کے حساب اور میزان سے کہیں زیادہ باریک ہے۔ اسی بنا پر اسلامی روایات میں ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس سے قبل کہ ہم سے حساب لیا جائے ہم خود اپنا حساب کریں اور اس سے پہلے کہ ہمارا وزن کیا جائے ہم اپنا وزن کر لیں۔ (حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا ووزنوا قبل ان توزنوا)۔

- ۱۴۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝
 ۱۵۔ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝
 ۱۶۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝
 ۱۷۔ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝
 ۱۸۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝

ترجمہ

- ۱۴۔ انسانوں کو ٹھیکری جیسے خشک شدہ گارے سے پیدا کیا۔
 ۱۵۔ اور جنوں کو آگ کے بلے جُلے متحرک شعلے سے پیدا کیا۔
 ۱۶۔ تو تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟
 ۱۷۔ وہ دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا پروردگار ہے۔
 ۱۸۔ تو تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

انسان کی خلقت ٹھیکری جیسی خاک سے ہوئی ہے

خدا نے گزشتہ نعمتوں کے ذکر کے بعد جن میں انسان کی خلقت بھی تھی اور جسے سربستہ شکل میں پیش کیا گیا تھا، زیر بحث آیات میں پہلے انسان اور جن کی خلقت کے بارے میں تشریح کی ہے۔ تشریح بھی ایسی کہ جو اس کی قدرتِ کاملہ کی نشان دہی بھی ہے اور سب کے لیے درسِ عبرت بھی۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: (انسان کو ٹھیکری جیسے خشک شدہ گارے سے پیدا کیا)

(خلق الانسان من صلصال كالفخار)۔

• صلصال "اصل میں (خشک جسم میں آواز کے آنے جانے) کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس خشک ہو جانے والی مٹی کی طرف اگر اشارہ کریں اور وہ آواز دے تو اُسے صلصال کہا جاتا ہے۔ برتن میں بچے ہوئے پانی کو بھی "صلصلہ" کہتے ہیں کیونکہ وہ ادھر ادھر حرکت دینے سے صدا دیتا ہے۔ بعض مفسرین کا یہ قول ہے کہ "صلصال" کے معنی بدبو دار کچڑ (لجن) کے ہیں لیکن پہلے معنی زیادہ مشہور ہیں۔ "فخار" کا مادہ "فخر" ہے اس کے معنی اس شخص کے ہیں جو بہت زیادہ فخر کرتا ہو اور چونکہ اس قسم کے افراد اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور بائیں زیادہ بناتے ہیں اس لیے یہ لفظ کوزہ اور ہر اس قسم کی ٹھیکری کے لیے کہ جس میں سے زیادہ آواز نکلتی ہے، بولا جاتا ہے۔

قرآن میں درج مختلف آیتوں اور ان مفہیم سے جو انسان کی ابتداء کے آفرینش کے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ انسان شروع میں خاک تھا (سورہ حج - ۵) پھر اس کی پانی کے ساتھ آمیزش ہوئی اور یہ کچڑ کی شکل اختیار کر گیا۔ (انعام - ۲) اور پھر "لجن" بدبو دار کچڑ ہو گیا۔ (حجر - ۲۸) اس کے بعد چپک جانے کی صورت اختیار کی (صافات - ۱۱) پھر منجمد شے کی شکل اختیار کی اور "صلصال کالفخار" بن گیا (آیہ زیر بحث)۔ ان مرحلوں نے بعد ملنے کے تقاضوں کے مطابق کس قدر طول کھینچا اور انسان نے ہر مرحلہ میں کس قدر توقف کیا اور یہ منتقل ہونے والے حالات کن اسباب و عوامل کے نتیجے میں وجود میں آئے یہ ایسے مطالب ہیں کہ جو ہمارے علم و دانش سے پوشیدہ ہیں اس کو صرف خدا ہی جانتا ہے اور بس۔ جو کچھ مسلم ہے وہ یہ ہے کہ یہ مذکورہ مفہیم ایک ایسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں جو انسان کے تربیتی مسائل کے ساتھ نہایت اہم تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ کہ انسان کا اولین مادہ بہت ہی بے قیمت و کم مقدار تھا اور یہ زمین کی حقیر ترین شے سے تھا لیکن خدا نے اس قسم کے بے قیمت مادہ سے ایسی بیش بہا مخلوق پیدا کی کہ جو گلستانِ آفرینش کا گلِ سرسبد بن گیا۔

اپنی تعبیرات و مفہیم سے ضمنی طور پر اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کی حقیقی قدر و قیمت کو وہی "روح الہی" اور "نغمہ ربانی" کہ جو قرآن کی دوسری آیتوں مثلاً سورہ حجر کی آیہ (۲۵) میں آیا ہے، تشکیل دیتا ہے تاکہ انسان اس حقیقت کو پہچاننے کے بعد اپنی راہ ارتقا کو اچھی طرح پالے اور یہ سمجھ لے کہ کس راستے پر چل کر اسے سفر حیات طے کرنا ہے تاکہ وہ بزمِ ہستی میں اپنی حقیقی قدر و قیمت کو حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس کے بعد پروردگار عالم جنات کی خلقت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور جنوں کو آگ کے غلوٹ اور متحرک شعلوں سے پیدا کیا" (وخلق الجنان من مارج من نار)۔ "مارج" اصل میں "مرج" (بروزن مرض) سے بنا ہے جس کے معنی اختلاط آمیزش کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد آگ کے مختلف شعلوں کا اختلاط و امتزاج ہے۔ آگ جس وقت شعلہ فشاں ہوتی ہے تو کبھی سُرخ ہوتی ہے کبھی زرد اور کبھی آبی کبھی سفید۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس "مرج" میں متحرک کے معنی بھی ہیں (امرجت الدابة) "میں نے جانور کو چرگاہ میں چھوڑ دیا" کیونکہ "مرج" کے ایک معنی چرگاہ کے بھی ہیں۔ پھر ہمارے لیے یہ بات واضح نہیں ہے کہ "جن" کی خلقت اس رنگ برنگی آگ سے کس طرح ہوئی جب کہ اس کی دوسری خصوصیتیں "صبح صادق" یعنی قرآن مجید اور وحی الہی کے حوالے سے ہم پر ثابت ہوئیں۔ بحوالہ کے مقابلے میں ہماری معلومات کا محدود ہونا ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ان حقائق کا، اس کے بعد کہ وہ وحی الہی سے ثابت ہو جائیں، انکار کریں یا انہیں نظر انداز کریں۔ خواہ ہمارا علم ان یک رسائی حاصل کرے یا نہ کرے (انشاء اللہ جن کی خلقت اور اس کی

خصوصیتوں کے بارے میں مزید تشریح سورہ جن کی تفسیر میں درج کی جائے گی۔ بہر حال زیادہ تر مخلوق جس سے ہمارا سروکار ہے وہ پانی، مٹی، ہوا اور آگ ہے۔ ہم انہیں چاہے قدماء کی طرح عنصر اور بسیط سمجھیں یا موجودہ ماہرین کے نقطہ نظر کے اعتبار سے مختلف الاجسام اجزا سے مرکب خیال کریں لیکن ہر صورت میں انسان کی خلقت کا مبداء مٹی اور پانی ہے جب کہ ”جن“ کا مبداء خلقت ہوا اور آگ ہے مبداء آفرینش کی یہ دو رنگی ان دونوں مخلوقوں کے درمیان بہت سے اختلافات کا سرچشمہ ہے۔

پھر ان نعمتوں کے بعد کہ جو خلقت انسان کی ابتدا میں تھیں اس جملہ کی تکرار ہے کہ: ”بس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرتے ہو؟“ (فبای الاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد والی آیت میں ایک اور نعمت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ دو مشرقوں اور دو مغربوں کا پروردگار ہے۔“ (رب المشرقین ورب المغربین)۔ یہ درست ہے کہ سورج سال کے ہر روز ایک نقطہ سے طلوع ہو کر دوسرے نقطہ پر غروب ہوتا ہے اور اس ترتیب کے اعتبار سے ایک مشرق اور ایک مغرب ہی بنتی ہے لیکن سورج کے حوالے سے زمین کے شمالی جھکاؤ اور جنوبی جھکاؤ کی حد اکثر کی طرف توجہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ فی الحقیقت دو مشرق ہیں اور دو مغرب اور باقی ان دونوں کے درمیان کا حصہ ہے۔

یہ نظام کہ جو حقیقت میں چار قسم کے بہت بابرکت موسموں کی خلقت کا سرچشمہ ہے، حقیقت میں ان آیتوں کی تکمیل دیتا ہے کہ جو پہلے آچکی ہیں۔ اس مقام پر کہ جہاں چاند اور سورج کی گردش کے متعلق گفتگو ہے اسی طرح آسمانوں کی خلقت میں میزان کے وجود کی بات مجموعی اعتبار سے وہ آیتیں زمین، چاند اور سورج کی خلقت اور حرکت کے دقیق نظاموں کے بیان پر مشتمل ہیں۔ ان میں ان نعمتوں اور برکتوں کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو ان وسائل سے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ بعض مفسرین نے یہاں دو مشرق اور دو مغربوں کی تفسیر سورج کے طلوع و غروب اور چاند کے طلوع و غروب کے اعتبار سے کی ہے اور اسے گزشتہ آیت (الشمس والقمر بحسبان) کے مطابق سمجھے ہیں لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بعض اسلامی روایات میں بھی ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ دیگر حدیثوں کے امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی ایک حدیث ہماری نظر کے سامنے آتی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

”ان مشرق الشتاء علی حده و مشرق الصيف علی حده اما تعرف

ذالک من قرب الشمس و بعدھا“

سردیوں کے آغاز کا مشرق اور ہے اور گرمیوں کے آغاز کا مشرق اور ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو کہ سورج ان دو موسموں میں قریب و دور ہوتا ہے اگر میوں کے موسم میں آسمان پر سورج کے اوپر آنے اور سردیوں کے موسم میں اس کے نیچے چلے جانے کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ چونکہ زمین کا محور اس کی سطح مدار کی نسبت جھکا ہوا ہے اور تقریباً ۲۳ درجہ کا زاویہ بنا رہا ہے اور زمین اس حالت میں

سورج کے گرد گردش کرتی ہے لہذا سورج کا طلوع و غروب ہمیشہ تغیر نظر آتا ہے اور ۲۳ درجہ شم آٹم اعظم شمالی سے درمیوں کے شروع میں

۲۳ درجہ شم اعظم جنوبی (سردیوں کے شروع میں) تک متغیر رہتا ہے کہ جس کے پہلے مدار کو مدار راس السرطان اور دوسرے مدار کو مدار

راس الجدی کہتے ہیں۔ یہ ہیں سورج کے دو مشرق اور دو مغرب۔ باقی جتنے مدار ہیں وہ ان دونوں مداروں کے درمیان ہیں۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ نکتہ اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ بعض آیات قرآنی ہیں یہ کیوں آیا ہے۔ ”خلا اُقسم
 برب المشارق والمغارب“ مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم (معارج - ۴۰) کیونکہ اس میں پورے سال کے تمام مشرقوں اور
 مغربوں کی طرف اشارہ ہے، جب کہ زیر بحث آیت میں صرف اس کی انتہائی قوس صعودی و نزولی کی طرف اشارہ ہے۔ بہر حال اس نعمت
 کے ذکر کے بعد پھر اس نے جن و انس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کر دگے“
 (قبای الاء ربکما تکذبان)۔

www.sirat-e-mustaqeem.net

- ۱۹۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيْنَ ۝
 ۲۰۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيْنَ ۝
 ۲۱۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝
 ۲۲۔ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝
 ۲۳۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝
 ۲۴۔ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۝
 ۲۵۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝

ترجمہ

- ۱۹۔ دو مختلف دریاؤں کو ایک دوسرے کے قریب قرار دیا در آنحالیکہ وہ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔
 ۲۰۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر غلبہ نہیں کرتے۔
 ۲۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟
 ۲۲۔ ان دونوں میں سے لؤلؤ اور مرجان نکلتے ہیں۔
 ۲۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟
 ۲۴۔ اور اس کے لیے بنی ہر کشتیاں ہیں کہ جو پہاڑ کی طرح سمندر میں چلتی ہیں۔

۲۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے ؟

تفسیر

سمندر اپنے گراں بہا ذخائر کے ساتھ

پروردگار عالم اپنی نعمتوں کے تذکرے کی تشریح کو جاری رکھتے ہوئے سمندروں کی بات کرتا ہے لیکن سب سمندروں کی نہیں بلکہ چند سمندروں کی ایک کیفیت خاص کی بات کہ جو ایک عجیب سی چیز ہے اور خدا کی لامحدود قدرت کی نشانی بھی ہے اور بعض مفید انسانیت چیزوں کے ظاہر ہونے کا وسیلہ بھی فرماتا ہے : ” دو مختلف سمندروں کو ایک دوسرے کے پاس قرار دیا کہ جو ایک دوسرے سے مل رہے ہیں “ (مرج البحرين يلتقيان)۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ایک دیوار ہے کہ جو ایک دوسرے پر غلبہ کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ (بینہما برزخ لا یبغیان)۔ ” مرج “ (بروزن فلج) کا مادہ خلط ملط کرنے یا بھیجنے اور چھوڑنے کے معنی میں ہے اور یہاں ” بینہما برزخ لا یبغیان “ کے مجملے کے قرینے سے بھیجنے اور ایک دوسرے کے ساتھ قرار دینے کے معنی میں ہے۔ ان دو سمندروں سے مراد، سورۃ فرقان کی آیت ۵۳ کی گواہی کے مطابق، میٹھے اور کھاری پانی والے دو سمندر ہیں، جہاں پروردگار عالم فرماتا ہے : ” وهو الذی مرج البحرین ہذا عذب فرات و ہذا ملح اجاج وجعل بینہما برزخاً وحجراً محجوراً “ وہ وہی ہے کہ جس نے دو سمندر ایک دوسرے کے پاس قرار دیئے جن میں سے ایک کا پانی میٹھا ہے اور دوسرے کا کھاری۔ اُس نے ان دونوں کے درمیان ایک برزخ قرار دیا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے مل نہ جائیں۔ باقی رہا یہ کہ یہ دو سمندر میٹھے اور کھاری کہاں ہیں جو ایک دوسرے پر غلبہ نہیں کرتے اور یہ برزخ جو ان دونوں کے درمیان قرار پایا ہے وہ کیا ہے اس کے بارے میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں۔ بعض افراد ایسے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں سمندروں کی کیفیت سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ مجملہ اس کے ان مفسرین نے کہا ہے کہ ان دو سمندروں سے مراد بحر فارس و بحر روم ہیں۔ حالانکہ اب اس زمانے میں ہم خوب جانتے ہیں کہ ان دونوں سمندروں کا پانی کھاری ہے اور پھر ان کے درمیان کوئی برزخ بھی نہیں ہے۔ یا پھر انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد آسمان کا سمندر اور زمین کا سمندر ہے جس میں سے پہلا شیریں اور دوسرا تلخ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آسمان میں کوئی سمندر نہیں ہے۔ سوائے ان بادلوں اور بخارات کے جو زمین کے سمندروں سے اُٹھتے ہیں یا پھر انہوں نے کہا ہے کہ شیریں سمندر سے مراد وہ پانی ہے جو زیر زمین ہے اور وہ سمندر کے پانی سے مل جاتا ہے اور ان دونوں کے درمیان جو خزانوں کی دیواریں ہیں وہ ان کا برزخ ہے۔ حالانکہ اب ہر کوئی جانتا ہے کہ زیر زمین سمندر کی شکل میں کوئی چیز بہت ہی کم پائی جاتی ہے البتہ پانی کے قطرات، مطلوب مٹی اور ریت کے ذروں کے درمیان ضرور پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جس وقت کسی جگہ کنواں کھودتے ہیں تو یہ طریقہ رفتہ رفتہ جمع ہو جاتی ہیں اور اس طرح پانی نکل آتا ہے۔ علاوہ ازیں لولہ و مرجان کہ جن کی طرف بعد کی آیات میں اشارہ ہوا ہے، زیر زمین پائیا جاتا ہے حاصل نہیں ہوتے۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو دریاؤں سے کیا مراد ہے ؟

پہلے ہم سورہ فرقان میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ آب شیریں کے بڑے دریا اور نہریں جس وقت سمندر میں گرتے ہیں تو عام طور پر ساحل کے قریب آب شیریں کا سمندر تشکیل پاتا ہے اور وہ آب تلخ کو پرے دھکیل دیتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ دو میٹھے اور کھاری سمندر پتلے گاڑھے ہونے کی بنا پر ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ہوائی جہاز کے سفر کے دوران ایسے علاقوں میں کہ جہاں یہ دریا سمندر میں گرتے ہیں ایسے میٹھے اور کھاری سمندروں کا منظر، جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں اور اس کے باوجود ایک دوسرے سے جدا ہیں، بلندی سے صاف طور پر نظر آتا ہے۔ جس وقت ان پانیوں کے کنارے ایک دوسرے سے مخلوط ہوتے ہیں تو تازہ میٹھا پانی ان کی جگہ لے لیتا ہے اور اس طرح ان دو انگ رہنے والے سمندروں کو ہمیشہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ سمندر میں مدو جزر کے موقع پر جب کہ سمندر کا نیچے کا پانی اُپر آجاتا ہے تو میٹھا پانی دھکیل دیا جاتا ہے بغیر اس کے کہ کھاری پانی اس میں مخلوط ہو (مگر خشک سالی اور پانی کی کمی کے موقع پر) اور وہ خشکی کے کافی حصہ کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اس لیے ساحل کے قریب رہنے والے لوگ ان علاقوں میں میٹھے پانی کو کنٹرول میں رکھ کر ساحلی علاقوں میں بہت سی نہریں بنا لیتے ہیں جن کے ذریعے بہت سی زمینوں کو سیراب کرتے ہیں۔ یہ نہریں کہ جو ساحلی مدو جزر کی برکت اور ان نہروں کے پانی پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں، چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ میٹھے پانی سے خالی ہو کر لبریز ہوتی ہیں اور ان علاقوں کی سیرابی کا بہت ہی موثر ذریعہ ہیں۔

ان دو سمندروں کے بارے میں بعض علما کی طرف سے ایک بہت ہی پرکشش تفسیر بیان کی گئی ہے۔ ان کے نزدیک اس بات کا احتمال ہے کہ اس سے مراد ”گلف سٹریم“ کا بہاؤ ہو۔ ہم اس کی تفصیل انشاء اللہ انہی آیتوں کے ذیل میں بیان ہونے والے نکات کی بحث میں پیش کریں گے۔

پروردگار عالم ایک مرتبہ پھر اپنے بندوں کو مخاطب کر کے ان نعمتوں کے حوالے سے ان سے سوال کرتا ہے اور فرماتا ہے :

”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“ (فبای الاء ربکم تکذبان)۔ پھر اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے : ”ان دونوں سمندروں سے لوتو و مرجان نکلتے ہیں“۔ (یخرج منهما اللؤلؤ والمرجان)۔ ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“ (فبای الاء ربکم تکذبان)۔ لوتو و مرجان پرکشش زینت کے دو وسیلے ہیں۔ از روئے طبت ان دونوں سے بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ضمنی طور پر یہ بھی ایک بات ہے کہ وہ اچھے اسباب زندگی اور مال تجارت ہیں جن سے بہت سا منافع حاصل ہوتا ہے۔ انہی اسباب کی بنا پر گزشتہ آیتوں میں دو نعمتوں کی حیثیت سے ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ رہا لؤلؤ کہ جسے فارسی میں مروارید کہتے ہیں، وہ صاف و شفاف قیمتی موتی ہوتا ہے کہ جو دریا کی تہ اور سمندروں کی گہرائی میں بطن صدف میں پرورش پاتا ہے۔ وہ جتنا موٹا ہو اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ طبت میں اسے مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ قدیم اطباء اس سے اعصاب کی تقویت، خفقان، خوف و وحشت، جگر کی قوت، منہ کی بدبو، گردہ مثانہ کی پتھری اور یرقان کے لیے دوا میں تیار کرتے تھے حتیٰ کہ آنکھ کی بیماریوں میں بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

”مرجان“ کی تفسیر بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے لوتو ہوتے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ ”مرجان“ درخت کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں کی مانند ایک زندہ وجود ہوتا ہے جو سمندروں کی گہرائی میں درخت کی طرح اُگتا ہے۔ ماہرین ایک عرصہ تک اسے ایک قسم

کی گھاس سمجھتے رہے لیکن بعد میں واضح ہوا کہ وہ ایک قسم کا جانور ہے۔ اگرچہ وہ سمندروں کے جھاگ کے پتھروں سے چپک جاتا ہے اور بعض اوقات وسیع جگہ کو گھیر لیتا ہے، بتدریج بڑھتا رہتا ہے اور جزیروں کی تشکیل کا باعث بنتا ہے جو جزائر مرجان کہلاتے ہیں۔ "مرجان" عام طور پر ٹھہرے ہوئے پانی میں نشوونما پاتا ہے۔ جو اس کے شکاری ہیں وہ اسے دریائے احمر کے ساحلوں اور میڈیٹیرینیئن اور بعض دوسرے علاقوں میں اس کا شکار کرتے ہیں۔ وہ مرجان جو زیب و زینت کے کام آتا ہے، سُرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ وہ جتنا زیادہ سُرخ ہو اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ شاعر جو اس کو تشبیہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں وہ اس کی سُرخ ہی کی بنا پر ہے۔ اس کی سب سے خراب قسم مرجان سفید ہے۔ یہ بہت زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک مرجان سیاہ بھی ہوتا ہے۔ مرجان زیب و زینت کے علاوہ دوا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ طبیبوں نے اس کے بہت سے خواص بیان کیے ہیں۔ منجملہ ان کے اس سے دوائیں تیار کی جاتی ہیں جو دل کو تقویت دینے، سانپ کے زہر کی تاثیر کو دور کرنے، اعصاب کو قوت بخشنے، ہمال کو ٹھیک کرنے اور رحم سے بہنے والے خُون کو بند کرنے میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرگی کی بیماری کے لیے بھی مفید ہوتا ہے۔

اس نکتہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ لؤلؤ و مرجان صرف کھاری پانی میں پرورش پاتے ہیں لہذا وہ آیہ (يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ) کی تفسیر نہیں، کہ ان دونوں میں سے لؤلؤ و مرجان نکلتے ہیں، اُلجھ گئے ہیں۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ان دو میں سے مراد صرف ایک ہے (سورہ زخرف کی آیت - ۳۱) لیکن ہمارے پاس ان معانی کے ثبوت کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ لؤلؤ و مرجان میٹھے اور کھاری دونوں پانیوں میں پائے جاتے ہیں۔

نعمتوں کی بحث کے اس حصہ کو جاری رکھتے ہوئے کشتیوں کی طرف، کہ جو گزشتہ زمانے میں بھی اور زمانہ حال میں بھی انسانوں کے لیے حمل و نقل کے وسائل میں سب سے اہم ذریعہ ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور خدا ہی کے لیے ہیں وہ کشتیاں جو سمندریں چلتی ہیں اور پہاڑ معلوم ہوتی ہیں" (وله الجوار المنشئات في البحر كاعلام)۔ "جوار" جمع ہے "جاریہ" کی، وہ صفت ہے "سفن" کی جس کے معنی ہیں: کشتیاں۔ اختصار کی وجہ سے اس لفظ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ جو چیز زیادہ قابلِ توجہ ہے وہ کشتیاں نہیں بلکہ ان کا پانی میں چلنا ہے۔ اس وجہ سے صرف اس صفت پر انحصار کیا گیا ہے (غور فرمائیے)۔ کنیز کو "جاریہ" کہتے ہیں وہ بھی اس کے چلنے پھرنے اور خدمات بجالانے کے لیے جدوجہد کی بنا پر ہے اور اگر جوان لڑکی کو جاریہ کہا جاتا ہے تو وہ اس کے وجود میں نشاطِ جوانی کے تحریک کی بنا پر ہے۔ "منشآت" جمع ہے "منشا" کی جو اسمِ مفعول ہے اس کے معنی "ایجاد" کے ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ عین اس وقت کہ جب منشآت کی تعبیر کے سلسلہ میں انسان کے ہاتھ سے کشتی بنائے جانے کی بات کر رہے ہیں تو فرماتا ہے: (وله) "خدا کے لیے ہے" یہ اس طرف اشارہ ہے کہ کشتی کے ایجاد کرنے والے اور بنانے والے خدا کی عطا کی ہوئی ان مختلف خصوصیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو کشتی سے استفادہ کے لیے ضروری ہیں۔ اس طرح وہ دریاؤں اور سمندروں کے سیال ہونے کی خاصیت سے اور ہواؤں کے چلنے کی قوت سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ خدا ہی ہے جس نے ان چیزوں میں سمندر میں اور ہوا میں یہ خواص و آثار دو بیعت کیے ہیں۔ اسی لیے ایک دوسرے مقام پر قرآن میں لفظ "تخیر" آیا ہے: (وسخر لکم

الفلك لتجسری فی البحر بامرہ) "خدا نے کشتی کو تمہارا فرماں بردار بنایا کہ جو اس کے حکم سے دریا میں چلتی ہے (ابراہیم ۲۲)۔ بعض مفسرین نے "منشأ" کو "انشاء" کے مادہ سے بلند کرنے کے معنی میں تفسیر کی ہے اور وہ اس سے باور بانی کشتی مراد لیتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ بادبانوں کے بلند کرنے سے اور انہیں ہوا کے راستے میں نصب کرنے سے لوگ کشتیوں کے چلانے کا کام لیتے تھے۔ "اعلام" جمع "علم" (بروزن قلم) کے معنی پہاڑ ہیں۔ اگرچہ اصل میں اس کے معنی علامت کے ہیں جو کسی چیز کی نشان دہی کرتی ہے۔ چونکہ پہاڑ دور سے نمایاں ہوتے ہیں، لہذا انہیں علم سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح جھنڈے کو بھی علم کہتے ہیں۔ اس طرح قرآن نے بڑی بڑی کشتیوں پر کہ جو سمندروں وغیرہ میں چلتی ہیں، انحصار کیا ہے۔ بعض لوگ ایسا خیال کرتے ہیں لیکن بڑی کشتیاں اور اسٹیمر وغیرہ زمانہ حال کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں۔ یونانیوں کی جنگ کی داستانوں میں ہمیں ملتا ہے کہ وہ نہایت عظیم اور بڑی کشتیوں سے کام لیتے تھے۔ دوبارہ اسی پُر معنی سوال کی تکرار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو بھٹلاؤ گے؟" (غباری الا ربکما تکذبان)۔

چند نکات

۱۔ سمندر خدا کی نعمتوں کے مرکز :

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے آیتوں کے اس حصہ میں سمندر اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت پر گفتگو ہوئی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سمندر زمین کے تین چوتھائی حصہ کا احاطہ کیے ہوئے اور وہ اسباب غذا، دواؤں اور سامان زینت کے لیے منبع عظیم ہے۔ انسانوں اور ان کے مال و متاع کے لیے حمل و نقل کے سلسلہ میں اہم وسیلہ ہے۔ اور سب سے زیادہ اہم بارش کا برسا، ہواؤں کا اعتدال، یہاں تک کہ ہواؤں کا چلنا یہ سب سمندروں کی برکتوں میں سے ہے۔ اگر سمندروں کی سطح جیسی آب ہے اس سے کچھ کم یا زیادہ ہوتی یا کڑھنیں خشکی کی طرف مائل ہوتا یا زیادہ مرطوب ہوتا تو زندگی کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس لیے قرآن بارہ مختلف تعبیروں کے ذریعے انسانوں کی اس طرف توجہ مبذول کرتا ہے اور انہیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی کہتا ہے: "خدا نے سمندر کو تمہارے لیے مسخر کیا" (سخر لکم البحر) (جاثیہ ۱۲) کبھی کہتا ہے: کشتیوں کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے: " (سخر لکم الفلک) (یونس) کبھی کہتا ہے: "جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لیے مسخر کیا ہے" (سخر لکم ما فی الارض) (حج ۶۵) ان سب سے قطع نظر سمندر عجائبات عالم میں سے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی خوردبین سے نظر آنے والی گھاس اور دنیا کے بہت بڑے بڑے درخت سمندروں میں اُگتے ہیں۔ اسی طرح پھوٹے سے پھوٹا جانور اور عظیم ترین، دیو قامت حیوانات سمندروں میں زندگی بسر کرتے ہیں سمندروں کی گہرائی میں زندگی گزارنا جہاں نہ روشنی ہے نہ غذا اس قدر تعجب خیز و حیرت انگیز ہے کہ انسان اس کے مطالعہ سے سیر نہیں ہوتا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہاں جانور خود اپنے اندر سے روشنی نکالتے ہیں اور جو چیزیں ان کو غذا کے لیے درکار ہوتی ہیں وہ پانی کی سطح پر تیار ہوتی ہیں اور تہ نشیں ہو جاتی ہیں۔ ان کے جسم اس قدر مضبوط و مستحکم ہوتے ہیں اور اندرونی دباؤ کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ پانی کے اس عظیم دباؤ کے مقابلے میں اگر انسان کو عام حالات میں وہاں رکھا جائے تو اس کی ہڈیاں آٹے میں تبدیل

ہو جائیں، وہ زندگی گزارتے ہیں۔

۲۔ گلف سٹریم، بڑے بڑے سمندری دریا اور نہریں

آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ دنیا کے سمندروں میں بہت بڑے بڑے دریا جاری ہیں جن میں سب سے زیادہ قوت دار "گلف سٹریم" ہے۔ یہ عظیم دریا امریکی امریکہ کے ساحلوں سے شروع ہوتا ہے اور سارے "بحرِ اطلس" کو عبور کر کے شمالی یورپ کے ساحل تک جا پہنچتا ہے۔ وہ پانی کہ جو خطِ استوا کے قریبی علاقوں سے چلتے ہیں وہ گرم ہیں یہاں تک کہ ان کا رنگ کبھی کبھی ہوا چلنے والے پانیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس عظیم سمندری دریا "گلف سٹریم" کا عرض تقریباً ۱۵۰ کلومیٹر اور اس کی گہرائی کئی سو میٹر ہے۔ اس کی تیزی و روانی بعض علاقوں میں اتنی ہے کہ وہ ایک دن میں ۱۶۰ کلومیٹر کی راہ طے کرتا ہے۔ ان پانیوں کے درجہ حرارت کا فرق، ہمراہ بہنے والے پانیوں سے دس سے لے کر ۱۵ درجہ تک ہے۔ اسی لیے اس کے مغربی کنارے کو ٹھنڈی دیوار کہتے ہیں۔ "گلف اسٹریم" سے گرم ہوائیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ اپنی حرارت کی اچھی خاصی مقدار براعظمِ یورپ کے شمالی ملکوں تک لے جاتی ہیں اس طرح یہ "گلف اسٹریم" ان ملکوں کی ہوا کو بہت ہی خوشگوار بناتا ہے۔ اگر پانی کا یہ بہاؤ نہ ہوتا تو ان ملکوں میں زندگی بسر کرنا بہت ہی دشوار اور قوت شکن ہوتا۔ ہم پھر دہراتے ہیں کہ "گلف اسٹریم" ان دریاؤں میں سے ایک ہے اور دنیا کے پانچ براعظموں کے پانیوں میں ایسے دریاؤں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ان دریاؤں کا سب سے بڑا عامل اور سبب زمین کے منطقہ استوائی اور منطقہ قطبی کی حرارت کا فرق ہے کہ جو سمندروں کے اس پانی میں تحریک پیدا کرتا ہے۔

اس موضوع کا ادراک ایک معمولی تجربہ سے کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہمارے پاس پانی کا ایک بہت بڑا برتن ہو اس کے ایک طرف ہم برف کا ایک ٹکڑا رکھ دیں اور دوسری طرف گرم لوسہ کا ٹکڑا رکھیں اور سطحِ آب پر تھوڑی سی کٹی ہوئی گھاس ڈال دیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس پانی کی سطح میں ایک تحریک پیدا ہو جائے گا اور پانی آہستہ آہستہ گرم جگہ کی طرف سے ٹھنڈی جگہ کی طرف چلنا شروع کر دے گا۔ بعینہ یہی صورت حال دنیا کے تمام پانیوں میں موجود ہے اور وہ ان سمندری دریاؤں کے پیدا ہونے کا سرچشمہ ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ عظیم سمندری دریا اپنے اطراف کے پانی میں بہت کم آمیزش کرتے ہیں اور ہزاروں کلومیٹر کے راستے کو اسی طرح طے کرتے ہیں اور (مروج البحرین یسئلان بینہما برزخ لا یبغیان) کے مصداق بنتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ساتھ ساتھ چلنے والے ان گرم اور ٹھنڈے پانیوں کے بالمقابل ہونے کی جگہ پر ایک ایسی چیز پیدا ہوتی ہے جو انسان کے لیے بہت ہی مفید ہے۔ کیونکہ ان گرم و سرد پانیوں کے ٹکڑوں کے مقام پر خوردبین سے نظر آنے والے ان جانوروں کے لیے ایک ایسی بے جی اور موت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پانی میں معلق ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بے شمار غذائی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے اور یہاں مچھلیوں کے بڑے جگمگے ہو کر اس کو کھاتے ہیں۔ اسی لیے کثرۃ زمین پر یہ علاقہ مچھلی کے شکار کی بہترین جگہ ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا آیتوں کی ایک تفسیر یہ بھی ہے اور یہ دوسری تفسیروں سے متصادم بھی نہیں ہے۔ ان سب کا باہم مل جانا

ممکن ہے۔

۳۔ بطون آیات میں سے ایک تفسیر

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے . مرج البحرين يلتقيان... کی تفسیر میں فرمایا :

علی و فاطمہ بحران عمیقان ، لایبغی احدہما علی صاحبہ ینحرج

منہما اللؤلؤ والمرجان ، قال : الحسن والحسين :

علی و فاطمہ دو عمیق سمندر ہیں کہ جن میں سے کوئی ایک دوسرے پر تجاوز نہیں کرتا اور

ان دو دریاؤں سے لؤلؤ و مرجان یعنی حسن و حسین برآمد ہوئے ہیں۔

تفسیر درمنثور میں یہی معنی بعض اصحاب پیغمبر کی زبانی بیان ہوئے ہیں۔

مرحوم "طبرسی" نے بھی "مجمع البیان" میں اسی چیز کو مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ قرآن مجید کے کئی بطون ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ایک ہی آیت متعدد معانی رکھتی ہو۔ اور جو کچھ اس حدیث میں آیا ہے بطون قرآن میں ہے کہ جو اس کے ظاہری معنی سے متضادم نہیں ہوتا۔

- ۲۶۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝
- ۲۷۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝
- ۲۸۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝
- ۲۹۔ يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝
- ۳۰۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝

ترجمہ

- ۲۶۔ وہ تمام لوگ کہ جو اس زمین پر ہیں فنا ہو جائیں گے۔
- ۲۷۔ اور صرف تیرے پروردگار کی ذات ذو الجلال والاكرام باقی رہ جائے گی۔
- ۲۸۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟
- ۲۹۔ تمام وہ لوگ جو آسمان اور زمین میں ہیں اس سے سوال کرتے ہیں اور وہ ہر روز ایک نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے۔
- ۳۰۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

ہم سب فانی ہیں اور بقا صرف تیرے لیے ہے :

اپنی نعمت کو جاری رکھتے ہوئے ان آیتوں میں مزید فرماتا ہے : ”تمام وہ لوگ کہ جو زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں فنا ہو جائیں گے“ (کل من علیہا فان)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ فنا اللہ کی نعمتوں میں کس طرح شمار ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس اعتبار سے ہو کہ اس فنا سے مراد فنائے مطلق نہیں ہے بلکہ یہ عالم بقا کے لیے ایک دریچے کا کام دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا دالان اور گزرگاہ ہے کہ جس کو عبور کرنا سرائے تک پہنچنے کے لیے ضروری و لابدی ہے۔ دنیا اپنی تمام نعمتوں کے باوجود مومن کے لیے زندان ہے اور اس دنیا سے جانا تنگ و تاریک زندان سے نکلنے کے مترادف ہے۔

یا پھر فنا کا ذکر اس نقطہ نظر سے کیا گیا ہے کہ گزشتہ نعمتوں کا بیان، ممکن ہے ایک گروہ کے لیے اکل و شرب کی چیزوں، لوٹ و مرجان اور سواریوں میں مستغرق ہونے کا باعث بن جائے۔ لہذا یاد دلاتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان چیزوں میں دل لگا بیٹھو اور اپنے رب کی راہ میں ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ۔ یہ یاد دلانا بھی بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ”علیہا“ کی تفسیر زمین کی طرف لوٹتی ہے جس کی طرف گزشتہ آیتوں میں بھی اشارہ ہوا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن سے بھی واضح ہے۔ ”من علیہا“ سے مراد وہ لوگ کہ جو زمین پر ہیں) جن و انس ہیں۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اس احتمال کو تقویت دی ہے کہ یہ حیوانات اور دوسری چلنے والی مخلوق کے لیے بھی استعمال ہوا ہے لیکن ”من“ کے لفظ کے پیش نظر کہ جو ہمیشہ ذوی العقول کے لیے استعمال ہوا ہے پہلی تفسیر ہی مناسب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فنا کا مسئلہ جن و انس تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قرآن کی تصریح کے مطابق تمام اہل آسمان و زمین بلکہ تمام موجودات عالم فنا ہو جائیں گے۔ (کل شیء ہالک الا وجہہ) (قصص - ۸۸) لیکن چونکہ گفتگو ساکنان زمین سے تھی لہذا صرف انہی کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے : ”صرف تیرے پروردگار کی ذات ذوالجلال والاکرام باقی رہ جائے گی“ (وہی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام)۔ لغت کے اعتبار سے وجہ کے معنی چہرے کے ہیں۔ کسی شخص سے جب ہمارا آمنا سامنا ہو اور ہم اس سے ملاقات کریں تو ہم اس کے زور و ہمتے میں لیکن جب یہ لفظ خدا کے لیے استعمال ہو تو پھر مراد اس کی ذات پاک ہی ہوتی ہے۔ مفسرین نے ”وجہ ربک“ کو یہاں پروردگار کی صفات کے معنی میں لیا ہے کہ جن کی وجہ سے انسان پر برکتیں اور نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ مثلاً : علم، قدرت، رحمت اور مغفرت۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ اعمال ہیں جو خدا کے لیے انجام دیے جاتے ہیں۔ تو اس بنا پر سب فنا ہو جائیں گے لیکن وہ اکیلی چیز یعنی وہ اعمال باقی رہ جائیں گے کہ جو غلو و منت سے اس کی رضا کے لیے انجام دیے گئے ہیں۔ لیکن پہلے معنی سب سے زیادہ مناسب ہیں۔ باقی رہ ذوالجلال والاکرام کہ جو ”وجہہ“ کی صفت ہے اس سے خدا کی صفات جلال و جمال کی طرف اشارہ ہے۔ ”ذوالجلال“ ایسی صفات کی خبر دیتا ہے کہ جن سے خدا اجل و برتر ہے (صفات سلبیہ) اور ”اکرام“ ایسی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو کسی چیز کے حُسن اور قدر و قیمت کو واضح کرتی ہیں اور وہ خدا کی صفات ثبوتیہ ہیں مثلاً اس کا علم، قدرت اور حیات۔ تو اس بنا پر اس مجموعہ کے معنی یہ ہوں گے کہ صرف خدا

کی وہ ذات پاک، کہ جو صفات ثبوتیہ سے متصف اور صفات سلبیہ سے مبرا و منزہ ہے، اس عالم میں برقرار رہے گی۔

بعض مفسرین خدا کے صاحب اکرام ہونے کو صاحب الطاف و نعمات ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جن کے ذریعہ وہ اپنے اولیاء کا اکرام کرتا ہے اور انہیں گرامی قدر بناتا ہے۔ مذکورہ بالا آیتوں میں ان سب معانی کا جمع ہونا ممکن ہے۔ ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک شخص بارگاہ پیغمبر میں نماز میں مصروف تھا۔ اس کے بعد اس نے اس طرح دعا کی: اللہم انی اسئلتک بان لک

الحمد لا الہ الا انت المنان بدیع السماوات والارض ذو الجلال والاكرام یا حی یا قیوم پیغمبر نے اپنے اصحاب و انصار سے کہا: جانتے ہو اس نے خدا کو کس نام سے پکارا ہے؟ انہوں نے کہا: خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: والذی نفسی بیدہ لقد دعا اللہ باسمہ الاعظم الذی اذا دعی بہ اجاب واذا سئل بہ

اعطی۔ ”قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس نے خدا کو اس کے اسم اعظم کے حوالے سے پکارا ہے جس وقت کوئی خدا کو اس نام سے پکارے تو وہ اس کی دعا قبول کرتا ہے اور جب اس کے ذریعے سے سوال کرے تو وہ عطا فرماتا ہے۔ پروردگار عالم پھر ایک مرتبہ اپنی مخلوق کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے۔“

(غیبی الاء ربکما تکذبان)۔ اس سے بعد والی آیت کا نفس مضمون قبل کی آیتوں کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے: ”وہ تمام کج و آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اپنی حاجتیں اسی سے طلب کرتے ہیں اور اسی سے سوال کرتے ہیں۔“ (یسئلہ من فی السماوات والارض)۔ ایسا کیوں نہ ہو حالانکہ وہ سب فنا ہونے والے ہیں اور خدا باقی ہے۔ یہ نہیں کہ اس جہاں کے اختتام پر ساری کائنات سوائے پروردگار

کی پاک ذات کے راہ فنا طے کرے گی بلکہ اس وقت بھی اُس کے مقابلے میں فانی ہیں اور ان کی بقا اس کی بقا اور مشیت سے وابستہ ہے اگر ایک لمحے کے لیے وہ اپنا لطف و کرم کائنات سے اٹھائے ”تو سب فنا ہو جائیں“ ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی ہے کہ جس سے اہل زمین اور اہل آسمان سوال کریں۔ ”یسئلہ“ کی تعبیر فعل مضارع کی شکل میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سوال اور

تقاضا دائمی ہے۔ سب کے سب زبان حال سے اس مبداءً فیاض سے ہمیشہ فیض کے طالب ہیں، زندگی چاہتے ہیں اور اپنی ضرورتوں کا سوال کرتے ہیں اور یہ ممکن الوجود کی ذات کا اقتضا ہے کہ نہ صرف حدوث میں بلکہ اپنی بقا میں بھی وہ واجب الوجود کے ساتھ وابستہ ہیں اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”خدا ہر روز ایک نئی شان اور نئے کام میں ہے۔“ (کل یوم هو فی شأن)۔ جی ہاں اس کی تخلیق دائمی

مستمر ہے۔ اور سوال کرنے والوں اور صاحبان حاجات کو جواب دینا بھی اسی طرح ہے اور وہ ہر روز ایک نئی طرح ڈالتا ہے۔ ایک دن فن کچھ قوموں کو طاقت و قدرت عطا کرتا ہے، دوسرے دن انہیں زوال کا شکار بنا دیتا ہے، ایک روز صحت و سلامتی و جوانی عطا فرماتا ہے دوسرے دن ضعف و ناتوانی، ایک دن دل سے غم و اندوہ دور کرتا ہے، دوسرے دن غم و اندوہ کا سبب پیدا کر دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ

وہ ہر روز حکمت و نظام احسن کے مطابق کوئی نئی مخلوق نیا موجود اور نیا حادثہ وجود میں لاتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اگر توجہ کی جائے تو وہ ہم پر یہ واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ ایک تو ہماری حاجتیں دائمی طور پر اس کی ذات پاک سے وابستہ ہیں۔ دوسرے اس طرح ہمارے دل مایوسی کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ توجہ ہماری غفلت اور غرور کو ختم کرتی ہے جی ہاں اس کی ہر روز ایک نئی

شان ہے اور وہ ایک نئے کام میں مصروف ہے۔ اگرچہ مفسرین میں سے ہر ایک نے ان وسیع معانی کے کسی ایک گوشہ کو آیت کی تفسیر

کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ بعض نے صرف گناہوں کی بخشش، غم و اندوہ کو دور کرنے اور اقوام کی بلندی و زوال کو عنوان بنایا ہے۔ بعض نے صرف مسئلہ آفرینش، رزق، زندگی، موت اور عزت و ذلت کو، بعض نے صرف انسانوں کی خلقت اور موت کو عنوان کلام بنایا اور کہا ہے کہ خدا کے پاس ہر روز تین لشکر ہیں۔ ایک لشکر باپوں کے صلیبوں سے ماؤں کے رحموں کی طرف کوچ کرتا ہے، دوسرا لشکر ماؤں کے رحموں سے اس دنیا میں قدم رکھتا ہے اور تیسرا لشکر دنیا سے قبر کی طرف جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ اس دنیا کی ہر نئی تخلیق پیدائش اور انقلاب اپنے اندر تحول لیے ہوئے ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت منقول ہے کہ آپ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا: الحمد لله الذي لا يموت ولا تنقض عجايبه لانه كل يوم هو في شأن من احداث بدیع لحيکن۔ "حمد و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے کہ جو ہرگز نہیں مرتا، اس کے عجائبات خلقت ختم نہیں ہوتے کیونکہ اس کی ہر روز ایک نئی شان ہوتی ہے اور وہ ایک نیا موضوع پیدا کرتا ہے کہ جو پہلے ہرگز نہیں تھا۔ ایک اور حدیث ہے جو رسول خدا سے منقول ہے: آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: من شأنه ان يغفر ذنبا و يفرج كربا و يرفع قوما و يضع آخرين۔ "اس کے کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ گناہ کو بخشتا ہے، رنج و تکلیف کو برطرف کرتا ہے، ایک گروہ کو بلند کرتا ہے اور دوسرے کو گرا دیتا ہے۔"

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں "یوم" اس دن کے معنوں میں نہیں ہے جو رات کے مقابلہ میں ہے بلکہ ایک طولانی دور پر حاوی ہے اور ساعات و لمحات پر بھی۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ہر زمانہ میں ایک نئی شان ہے اور وہ ایک نیا کام کرتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے ایک نشان نزول بھی بیان کیا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے قول کی تردید کے لیے نازل ہوئی ہے۔ یہودیوں کا نظریہ یہ ہے کہ خدا ہفتہ کو کوئی کام نہیں کرتا۔ اس روز وہ تعطیل کرتا ہے۔ کوئی حکم اور فرمان جاری نہیں کرتا۔

قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی تخلیق اور تدبیر امور کا پروگرام ایک لمحے کے لیے بھی تعطیل کا متحمل نہیں ہوتا۔ پروردگار عالم پھر اس نعمت مستقل اور تمام مخلوقات آسمان و زمین کی حاجتوں کی جواب دہی کے بعد فرماتا ہے: "تم خدا کی کس کس نعمت کی تکذیب کرتے ہو۔" (غباری الاء ربکما تکذبان)۔

چند نکات

۱۔ فنا کی کیا حقیقت ہے؟

ہم نے مندرجہ بالا آیتوں میں پڑھا ہے کہ خدا کے علاوہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ یہ فنا مطلق کے معانی میں نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ روح انسانی بھی نابود ہو جائے گی یا انسان کے جسم سے حاصل ہونے والی مٹی بھی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ قرآن کی آیتیں

۱۔ اصول کافی مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۹۳

۲۔ مجمع البیان در ذیل آیات زیر بحث۔ یہ حدیث روح المعانی میں بھی صحیح بخاری سے نقل ہوئی ہے۔

۳۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۰۲

قیامت کے دن ہم کے لیے عالم برزخ کی تصریح کرتی ہیں۔
دوسری جانب وہ بارگاہِ کتا ہے: مَرُوْے قیامت میں قبروں سے اُٹھیں گے۔
بوسیدہ ہڈیاں خدا کے حکم سے اپنے جسم پر لباسِ حیات پہنیں گی۔

یہ سب چیزیں اس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ اس آیت میں اور اس سے مشابہت رکھنے والی آیتوں میں فنا نظامِ جسم و جاں کے درہم برہم ہونے، رشتوں کے قطع ہونے اور عالمِ خلقت کے نظم و ترتیب کے درہم برہم ہو کر ایک نئے عالم کی جگہ لینے کے معنوں میں ہے۔

۲۔ وہ ہر روز ایک نئی چیز کی تخلیق کرتا ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ (کل یوم ہوفی شأن) والی آیت اُمید آفریں بھی ہے اور غور شکن بھی نیز یہ استرار آفرینش و دوامِ خلقت کی نشانی بھی۔ بھلا اسی وجہ سے بعض اوقات پیشوایانِ اسلام افرادِ بشر کو اُمید دلانے کے لیے خصوصیت کے ساتھ اس آیت پر انحصار کرتے ہیں جیسا کہ حضرت ابوذر کی "ربذہ" کی طرف جلا وطنی کے واقعہ میں ہمیں ملتا ہے کہ حضرت علیؑ نے بہت ہی گہرے اور پراز معانی جملوں کے ساتھ حضرت ابوذر کی مشایعت کے موقع پر ان کی دلداری کی اور انہیں تسلی دی۔ اس کے بعد امام حسنؑ فرزندِ رشید امیر المومنین نے حضرت ابوذر کو چچا کہہ کر کچھ جملے فرمائے۔ اس کے بعد شہیدِ دل کے سالار حضرت امام حسین علیہ السلام نے لب کشائی کی اور فرمایا: یا عماہ ان اللہ تعالیٰ قادر ان یغیر ما قد تری اللہ کل یوم ہوفی شأن وقد منعك القوم دنیا ہو ومنعہم دینک۔۔۔۔۔ فاسئل اللہ الصبر والنصر۔ چچا جان! خداوند متعال قادر ہے کہ ان حالات کو بدل دے اس کی ہر روز ایک نئی شان ہے۔ انہوں نے آپ کو اپنی دنیا میں مزاحم دیکھا اور آپ کو روک دیا۔ آپ نے انہیں اپنے دین میں مداخلت کرتے ہوئے دیکھا اور اس سے انہیں روکا۔ خدا سے نصرت اور صبر و شکیبائی کی دُعا کیجئے۔

ہمیں تاریخ میں ملتا ہے کہ امام حسینؑ جس وقت کربلا کی طرف آرہے تھے تو جب آپ صفاح نامی منزل پر پہنچے تو فرزدق نامی شاعر نے آپ سے ملاقات کی امامؑ نے فرمایا: بیتن لی خبر الناس من خلفک۔ "مجھے بتاؤ کہ لوگوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا ہے۔" (عراق کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے)۔ فرزدق نے عرض کیا: (الخبیر سئلت قلوب الناس معک و سیوفہم مع بنی امیہ والقضاء ینزل من السماء واللہ یفعل ما یشاء)۔ "آپؑ نے ایک آگاہ شخص سے سوال کیا لوگوں کے دل تو آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔ البتہ فرمانِ الہی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور خدا، جو اس کی مصلحت ہوتی ہے اور ارادہ کرتا ہے، اسے انجام دیتا ہے۔" اس پر امام حسینؑ نے فرمایا:

۱۔ (مومنون - ۱۰۰)

۲۔ (یسین - ۵۱)

۳۔ (یسین - ۷۹)

۴۔ الفہریر جلد ۸، صفحہ ۳۰۱۔

(صدقت لله الامر یفعل ما یشاء وکل یوم ربنا فی شأن)
 " تُو نے سچ کہا ۔ خدا جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے اور ہمارے پروردگار کی ہر روز
 نئی شان ہے اور اس کا نیا کام ہے۔ " ۱

یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ یہ آیت مومنین کے لیے حوصلہ افزا آیت ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک امیر نے اپنے
 وزیر سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں سوال کیا لیکن اس نے بے خبری کا اظہار کیا اور دوسرے دن تک ہمت مانگی۔ وزیر جس
 وقت مایوسی کی حالت میں اپنے گھر پہنچا تو اُس کے ایک غلام نے جو صاحبِ معرفت تھا پوچھا : کیا بات ہے ؟ وزیر نے سارا ماجرا
 بیان کیا۔ اس نے کہا آپ امیر کے پاس جائیں اگر وہ اجازت دے تو میں اس کی تفسیر اُس کے سامنے پیش کر دوں گا۔ بہر حال امیر نے
 اس غلام کو طلب کیا اور اس سے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا : اے امیر شأْنُه یولج الیل فی النهار ویولج النهار
 فی الیل ویخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی ویشفی سقیماً ویسقم مسلماً ویبتلی معافاً ویعافی مبتلی
 ویعز ذلیلاً ویذل عزیزاً ویفقر غنیاً ویغنی فقیراً ۔ " خدا کی شان یہ ہے کہ دن اور رات کو ایک دوسرے کے
 بعد لاتا اور لے جاتا ہے ، مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے ، بیمار کو شفا دیتا ہے ، صحیح سالم کو بیمار کرتا ہے
 تندرست کو مبتلا کرتا ہے ، بتلا کو عافیت بخشتا ہے ، ذلیل کو عزت دیتا ہے ، عزت واکو ذلیل کرتا ہے ، دولت مند کو فقیر بنا دیتا ہے اور فقیر کو دولت مند
 بنا دیتا ہے۔ " امیر نے کہا : فرجت عنی فرج اللہ عنک " تُو نے میری مشکل حل کی خدا تیری مشکل حل کرے گا۔ " اس کے بعد
 اس غلام کو انعام و اکرام سے نوازا۔ ۲

۳۔ حرکت جوہری :

" حرکت جوہری " کے بعض طرفداروں نے قرآن کی چند آیتوں سے استدلال کیا ہے ، یا کم از کم اُسے اپنے مقصود کی طرف
 اشارہ سمجھا ہے۔ منجملہ دیگر آیتوں کے ایک یہ آیت بھی ہے۔ (کُل یوم هو فی شأن) اس کی وضاحت یہ ہے :۔ قدیم فلسفین
 کا نظریہ یہ تھا کہ حرکت صرف چار عرضی مقولوں میں ممکن ہے (مقولہ این ، کم ، کیف اور وضع) زیادہ آسان اور سادہ مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ
 ایک جسم ، مکان کے لحاظ سے ، تغیر کرے یا اس طرح اس کی نشوونما ہو کہ اس جسم کی مقدار میں اضافہ ہو جائے یا اس کے رنگ و بو
 اور ذائقہ میں تبدیلی پیدا ہو جائے (مثل ایک سیب کے جو درخت پر لگا ہوا ہے)۔ یا اپنی جگہ پر اپنے گرد گردش کرے (زمین
 کی حرکت وضعی کی طرح)۔ لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ جسم کا جوہر اور اس کی ذات میں حرکت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کیونکہ حرکت میں
 ذات متحرک کو ثابت و برقرار ہونا چاہیے۔ اس کے محض عوارض و درگاہوں ہوں۔ بصورتِ دیگر حرکت کا کوئی مفہوم نہ ہو گا۔ لیکن فلاسفہ متاخرین
 نے اس نظریہ کو رد کیا ہے اور وہ حرکت جوہری کے معترف ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ حرکت کی اساس اور بنیاد خود جوہر میں ہے جس
 کے آثار عوارض میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلا شخص جس نے اس نظریہ کو معقول شکل میں پیش کیا۔ " ملا صدرا نے شیرازی " تھا اس نے

کہا کہ تمام ذرات کائنات اور دنیا مادہ حرکت کا ایک مجموعہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اجسام کا مادہ ایک سیال وجود ہے جس کی ذات ہمیشہ متغیر ہوتی رہتی ہے اور اس کا ہر لمحہ ایک نیا وجود ہے جو قبل کے لمحے سے مختلف ہے۔ لیکن چونکہ یہ تبدیلیاں ایک دوسرے سے متصل ہوتی ہیں اس لیے ایک ہی شے شمار کی جاتی ہیں۔ اس نظریہ کی بنا پر ہم ہر روز ایک نیا وجود ہیں لیکن یہ وجود متصل و مستمر ہیں اور ایک ہی صورت رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مادہ چار بہتیں رکھتا ہے۔ طول، عرض، عمق اور بُعد۔ یہ بُعد وہ ہے جسے زمان کا نام دیتے ہیں اور یہ زمان جو ہر حرکت کے علاوہ دوسری اور کوئی چیز نہیں ہے، غور کیجئے۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حرکت جوہری ایٹموں کی اندرونی حرکت کے مسئلہ سے ارتباط نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ حرکت مکان میں ہے اور عرضی حرکت ہے۔ حرکت جوہری ایک زیادہ عمیق اور گہرا مفہوم رکھتی ہے کہ جو جسم کی ذات اور اس کی انفرادیت پر حاوی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں متحرک عین حرکت ہو جاتا ہے اور چیزیں خود اپنے داخل ہونے کی جگہ بن جاتی ہیں۔ غور کیجئے۔

ان کے پاس اس مقصد کے اثبات کے لیے مختلف دلائل ہیں جن کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ امر معیوب نہیں ہے کہ ہم یہاں اس فلسفیانہ عقیدہ کے نتیجے کی طرف اشارہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خدا شناسی کے مسئلہ کا ہر گوشہ لمحے سے زیادہ واضح طور پر ادراک کریں کیونکہ خلقت اور آفرینش صرف دنیا کے آغاز ہی میں ہمیں تھی بلکہ ہر ساعت اور ہر لمحے اس کا آغاز ہے اور خدا ہمیشہ نئی خلقت و آفرینش میں مصروف ہے اور ہم ہر وقت اس سے وابستہ اور اس کے فیض ذات سے مستفیض ہیں۔ انہوں نے (کمالِ یومِ ہوفی نشان) کی تفسیر اسی معانی میں کی ہے البتہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ تفسیر بھی آیت کے وسیع مفہوم کا ایک جز ہو۔

[illegible]

۳۱۔ سَنَفُوعُ لَكُمْ آيَهُ الثَّقَلَيْنِ ۝

۳۲۔ فَبِآيِ الْآءِ رَبِّكُمْ تَكْذِبُنِ ۝

۳۳۔ يَمْشُرُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِنْ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا
مِنْ أَقْطَارِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ
إِلَّا بِسُلْطَنِ ۝

۳۴۔ فَبِآيِ الْآءِ رَبِّكُمْ تَكْذِبُنِ ۝

۳۵۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمْ شَوَاطِلُ مِنْ نَارٍ ۝ وَنَحَاسٌ

فَلَا تَنْتَصِرُنِ ۝

۳۶۔ فَبِآيِ الْآءِ رَبِّكُمْ تَكْذِبُنِ ۝

ترجمہ

۳۱۔ اے گروہ جن و انس عنقریب ہم تمہارا احتساب کریں گے۔

۳۲۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۳۳۔ اگر تم سے ہو سکے تو زمین و آسمان کی سرحدوں سے نکل جاؤ مگر تم ہرگز قدرت

نہیں رکھتے مگر سوائے (خدا ہی) قوت کے ساتھ۔

- ۳۴۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟
- ۳۵۔ وہ دُھویں سے خالی آگ کے اور متارکم دُھویں والی آگ کے شعلے تمہاری طرف بھیجے گا اور تم کسی سے مدد طلب نہیں کر سکو گے۔
- ۳۶۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

اگر قدرت رکھتے ہو تو آسمانوں کی سرحدوں سے آگے نکل جاؤ

جو نعمتیں اب تک اس سورہ میں پیش کی گئی ہیں وہ اسی دُنیا سے تعلق رکھتی تھیں لیکن زیر بحث آیتوں میں قیامت کے حساب کتاب اور معاد کی بعض دوسری ضرورتوں کے بارے میں گفتگو ہے جو مُجرموں کے لیے تہدید ہے اور مومنین کے لیے نہ صرف تربیت آگاہی اور بیداری کا وسیلہ ہے بلکہ تشویق و حوصلہ افزائی کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی بنا پر یہ نعمت شمار ہوتی ہے۔ اس لیے ہر ایک کے بیان کے بعد، اسی سوال کی کہ جو نعمتوں کے بارے میں ہے، پروردگار عالم تکرار کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

”اے جن و انس ہم عنقریب تمہارا حساب کریں گے۔“ (سُفُّرُج لِّكُوْا يٰۤاَهْلَ الثَّقَلٰنِ) ۱۰

جی ہاں اس دن خداوند قادر جن و انس کے تمام اعمال، گفتار اور نیتوں کا نہایت باریک بینی سے حساب کرے گا اور ان کے لیے مناسب جزا و سزا تجویز کرے گا۔ خدا جس وقت کسی چیز میں مصروف ہو تو دوسری چیزوں سے غافل نہیں ہوتا اور ہر آن واحد میں تمام کائنات پر علمی احاطہ رکھتا ہے اور کبھی بھی کوئی چیز اسے دوسری چیز سے غافل نہیں کرتی۔ (لَا يَشْغَلُهُ شَأْنٌ عَنْ شَأْنٍ) لیکن اس کے باوجود ”سُفُّرُج“ کے الفاظ جاذبِ توجہ ہیں کیونکہ گفتگو کی یہ صورت حال وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں ایک شخص اپنے تمام کام چھوڑ دیتا ہے تاکہ پوری تن دہی اور ہوش و حواس سے اس کام کو انجام دے۔ لیکن یہ چیز صرف مخلوقات کے بارے میں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی محدودیت کی بنا پر جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو دوسری چیز سے غافل ہو جاتی ہیں۔ خدا کے بارے میں اس تعبیر کا استعمال حساب و کتاب کی تحقیق و تفتیش کے معاملہ میں تاکید کے علاوہ کچھ اور معانی نہیں رکھتا۔ ذرہ برابر کوئی شے اس کے قلم

۱۰ توجہ کرنی چاہیے کہ قرآن مجید کے قدیم رسم الخط میں چند موارد میں ”ایہا“ ایہ کی صورت میں لکھا ہوا ہے کہ جو زیر بحث آیت اور دوسری

(سورہ نور کی آیت ۳۱ اور زخرف کی آیت ۱۶) آیتوں میں ہے جب کہ دوسری آیتوں میں ایہا کا رسم الخط آفریقہ شیعہ الف کے ساتھ تحریر

ہوا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ قدیم رسم الخط کے ضابطہ اور بنیاد پر تھا۔

۱۱ باوجودیکہ ”الثَّقَلَانِ“ تثنیہ ہے لیکن لکھو میں ضمیر جمع کی آئی ہے اس بنا پر کہ دو گروہ ہوں کی طرف اشارہ ہے۔

انصاف کی زد سے نہیں بچے گی۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ خداوند بزرگ و عظیم اپنے حقیر بندوں کا حساب و کتاب اپنے ذمہ لے اور کس قدر وحشت ناک اور ہولناک ہے اس قسم کی جانچ پڑتال اور محاسبہ۔

”ثقلان“ کا مادہ ”ثقل“ (بروزن کبر) ہے جس کے معنی بار سنگین کے ہیں۔ یہ وزن کے معنی میں بھی آتا ہے باقی رہا ”ثقل“ (بروزن خبر) عام طور پر یہ لفظ مال و متاع اور مسافر کے سامان کے لیے بولا جاتا ہے۔ چن و انس کے گروہ پر اس کا اطلاق ان کی معنوی سنگینی کی بنا پر ہے۔ کیونکہ خدا نے انہیں عقل و شعور اور علم و آگہی کے لحاظ سے مخصوص وزن اور قدر عطا کی ہے۔ جسمانی طور پر بھی مجموعی حیثیت سے قابل ملاحظہ سنگینی کے حامل ہیں۔ اسی لیے سورہ ”زلزال“ کی آیت ۲ میں ہم دیکھتے ہیں۔ واخرجت الارض انقالها۔ جس کے ایک معنی قیامت کے دن انسانوں کا قبروں سے خروج ہے۔ لیکن بہر حال زیر بحث آیت کا یہ مفہوم زیادہ تر جنبہ معنوی رکھتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ گروہ جن کے بارے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص وزنی جسم نہیں رکھتے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ان دو گروہوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر ہے کہ وہ عمدہ گروہ جو تکلیف شرعی سے محنت میں یہی وہ دونوں ہیں۔ اس مفہوم کو بیان کرنے کے بعد دوبارہ اس سوال کی تکرار کرتا ہے! ”تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“ (فبای الاء ربکما تکذبان)۔

گزشتہ آیت کہ جو خدا کی طرف سے کیے جانے والے احتساب کے مسئلہ کو پیش کرتی ہے اس کے بعد پروردگار عالم ایک مرتبہ چن و انس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: ”تم چاہو کہ خدا کی طرف سے دی جانے والی سزا سے بچ سکو تو اگر ایسی قوت رکھتے ہو تو آسمان اور زمین کی سرحدوں سے نکل جاؤ اور خدا کے احاطہ قدرت سے باہر ہو جاؤ لیکن تم اس کام پر ہرگز قادر نہیں ہو سوائے اس کے کہ خدائی قوت و طاقت تمہیں حاصل ہو اور یہ خدائی قوت تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ (یا معشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السماوات والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان)۔ اس طرح تم ہرگز خدا کی عدالت، انصاف اور اس کے حکم سے صادر شدہ سزائوں سے فرار کی قدرت و توانائی نہیں رکھتے۔ جہاں کہیں جاؤ گے خدا کا ملک ملے گا اور جہاں کہیں رہو گے وہ اس کی حکومت کا مقام ہے۔ جی ہاں یہ ضعیف و ناتواں مخلوق قدرت خدا کے میدان سے بھاگ کر کہاں جاسکتی ہے۔ حضرت امیر المومنین علیؑ دعا کے کیل میں فرماتے ہیں: ولا یمکن الفرار من حکومتک۔ ”معشر معشر“ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ”دس“ ہیں۔ چونکہ دس کا عدد ایک کامل عدد ہے اس لیے لفظ ”معشر“ ایک مکمل جمعیت کے لیے بولا جاتا ہے کہ جو مختلف صنفوں اور گروہوں سے تشکیل پائے ”اقطار“ ”قطر“ کی جمع ہے یہ کسی چیز کے اطراف کے معنی میں ہے ”تنفذوا“ کا مادہ ”نفوذ“ ہے جس کے معنی کسی چیز کو ٹکڑے کرنے کے بعد اس کو عبور کر جانے کے ہیں اور ”من اقطار“ کے الفاظ اس طرف اشارہ ہیں کہ آسمانوں کے اطراف و جوانب کو چیر کر ان سے نکل جاؤ اور ان کے باہر سفر کرو۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ”جن“ کو جو مقدم کیا گیا ہے ہو سکتا ہو کہ وہ اس بنا پر ہو کہ وہ آسمانوں کی سیر پر زیادہ آمادہ رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت، قیامت کے ساتھ مربوط ہے یا دنیا سے، مفسرین کا اس میں اختلاف ہے۔ چونکہ اس کے قبل و بعد کی آیتیں دارِ آخرت کی روداد سے متعلق ہیں لہذا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی قیامت میں عدالت الہی کے چنگل سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے متعلق ہے۔ لیکن ”لا تنفذون الا بسلطان“ ”تم نہیں گزر سکتے مگر قوت کے ساتھ“ کو نظر میں رکھ کر بعض مفسرین

اسے انسانی ہوائی سفروں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ قرآن نے علمی و صنعتی تسلط کو اس کی شرط قرار دیا ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ قیامت کی طرف بھی نظر ہے اور دنیا کی طرف بھی یعنی تم نہ یہاں قدرت رکھتے ہو کہ قدرت الہی کے بغیر اطرافِ آسمان میں نفوذ کر جاؤ اور نہ آخرت میں۔ البتہ دنیا میں محدود وسیلہ اور ذریعہ تمہارے اختیار میں ہے لیکن وہاں تو کوئی بھی ذریعہ یا وسیلہ نہ ہوگا۔ بعض مفسرین نے اس کی ایک چوتھی تفسیر بھی کی ہے کہ آسمان کے اطراف میں نفوذ سے مراد فکری و علمی نفوذ ہے کہ جو استدلال کی قوت کی وجہ سے انسان کے لیے ممکن ہے۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ بعض اخبار و روایات اس کی تائید بھی کرتے ہیں جو منابعِ اسلامی میں مندرج ہیں۔ منجملہ دیگر حدیثوں کے ایک حدیث امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن خدا تمام بندوں کو ایک ہی مقام پر جمع کرے گا اور آسمانِ اول کے فرشتوں کو حکم دے گا کہ نیچے اتر آؤ۔ وہ فرشتے جو زوئے زمین پر بسنے والے جن و انس سے تعداد میں دو گنے ہیں نیچے اتر آئیں گے۔ اس کے بعد دوسرے آسمان کے فرشتے بھی کہ جو اتنی ہی تعداد میں ہیں نیچے اتر آئیں گے۔ اس طرح سات کے سات آسمانوں کے فرشتے اتر آئیں گے اور سات پر دوں کی مانند جن و انس کا چاروں طرف سے احاطہ کر لیں گے۔ یہ وہ مقام ہے کہ منادی ندا دے گا کہ اے جن و انس کی جمعیت اگر ہو سکتا ہو تو آسمانوں اور زمین کے اطراف سے نکل جاؤ۔ تم قدرتِ الہی کے بغیر ہرگز نہیں نکل سکتے۔ اور تم یہاں دیکھ رہے ہو کہ ان اطراف کو فرشتوں کے سات عظیم گروہوں نے گھیر رکھا ہے۔ (اب عدالت کے شکنجے سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے)۔

مختلف تفسیروں کے معانی کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ یہاں پھر دونوں گروہوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟" (فبای الاء ربکم اتکذبان)۔ یہ ٹھیک ہے کہ مذکورہ بالا تہدید بظاہر سزا و عذاب الہی کے سلسلہ کی بات ہے لیکن چونکہ اس کا ذکر تمام انسانوں کے لیے تنبیہ ہے اور اصلاح و تربیت کا سبب ہے، لہذا قدرتی طور پر نعمت بنیادی طور پر حساب و کتاب کا وجود کسی بھی نظام میں ایک نعمت ہی ہے کیونکہ اس کی بنا پر سب کا حساب کتاب ہوگا۔

اس کے بعد والی آیت جن و انس کے عدالتِ الہی کے شکنجے سے فرار کے سلسلہ میں اور ان کے عدم اختیار کے بارے میں جو کچھ قبل کی آیت میں آیا تھا، اس کی تاکید کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "بغیر دھویں کی آگ اور بہت سا تہ بہ تہ دھواں تمہاری طرف بھیجے گا" (اور اس طرح سے تمہیں ہر طرف سے گھیر لے گا کہ کوئی راہ فرار نہیں ہوگی)۔ اس وقت تم کسی سے مدد طلب نہیں کر سکو گے۔ (یرسل علیکم شواظ من نار و نحاس فلا تنصرون)۔ ایک طرف تمہارا فرشتوں نے احاطہ کر رکھا ہے اور دوسری طرف آگ کے گرم اور جلانے والے شعلوں اور تیرہ اور تار دم گھوٹنے والے دھویں نے اطرافِ مشرق کو گھیرا ہوا ہے اور بھاگنے کے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔ "شواظ" "راغب کی مفردات" اور "ابن منظور" کی "لسان العرب" اور دوسرے مفسرین کے مطابق بغیر دھویں والی آگ کے شعلوں کے معنی میں ہے اور بعض نے آگ کے ان شعلوں کو اس کے معنی بتایا ہے کہ جو بظاہر خود آگ سے الگ ہو جائیں گے اور سبز رنگ کے ہوں گے۔ بہر کیف اس تعبیر میں آگ کی شدت حرارت کی طرف اشارہ ہے۔

"نحاس" کے معنی دھواں ہے۔ (سُرخ شعلوں اور دھویں سے پُر آگ)۔ کہ جو تانبے کا رنگ اختیار کرے گی۔

بعض نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ وہ پچھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگی۔ یہ معنی بظاہر زیر بحث آیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ گفتگو ایسے موجد کے بارے میں ہے کہ جو قیامت میں انسان کا احاطہ کیے ہوئے ہو اور اسے عدالت الہی سے فرار سے روکے۔

قیامت کی عدالت انصاف کننی عجیب ہے۔ اس وقت انسان جلانے والی آگ اور دم گھونٹنے والے دھوئیں اور منجانب اللہ مامور فرشتوں کے حصار میں ہوگا۔ اور اس کے لیے اس عدالت کے حکم کے ماننے کے علاوہ کوئی جادہ گریز نہیں ہوگا۔ پھر ایک مرتبہ فرماتا ہے: اے گروہ جن و انس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو بھٹلاؤ گے؟ (فبای الاءر بکما تکذبان)۔ یہاں بھی ان آیات کو مبنی بر نعمت کہنا اسی استدلال کی بنا پر ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔

www.sirat-e-mustaqeem.com

۳۷۔ فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ

۳۸۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝

۳۹۔ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌ ۚ

۴۰۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝

۴۱۔ يُعْرِفُ الْجُرْمُونَ بِسَيِّئِهِمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي

وَالْأَقْدَامِ ۚ

۴۲۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝

۴۳۔ هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْجُرْمُونَ ۚ

۴۴۔ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ ۚ

۴۵۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ۝

ترجمہ

۳۷۔ جس وقت آسمان پھٹ جائے گا اور پگھلے ہوئے روغن کی طرح گلگلوں ہو جائے گا

(تو ہولناک حوادث واقع ہوں گے جس کے تحمل کی تم میں تاب نہیں ہوگی)۔

۳۸۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو بھٹلاؤ گے ؟

۳۹۔ اس دن جن و انس میں سے کسی سے اس کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔

۴۰۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۴۱۔ بلکہ مجرمین اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ اس وقت ان کے سر کے اگلے

بال اور پاؤں پکڑ لیے جائیں گے (اور وہ دوزخ میں پھینک دیے جائیں گے)۔

۴۲۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۴۳۔ یہ وہی دوزخ ہے کہ مجرم جس کا انکار کرتے تھے۔

۴۴۔ آج دوزخ اور اس جلانے والے پانی کے درمیان وہ آمدورفت رکھتے ہیں۔

۴۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے

گزشتہ آیتوں کے تتبع میں کہ جو قیامت کے بعض حوادث کو بیان کرتی تھیں یہ آیتیں بھی اسی طرح اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے قیامت کے منظر کی کچھ خصوصیات اور حساب و کتاب کی کیفیت اور عذاب و سزا کے بیان پر مبنی ہیں۔ پروردگار عالم پہلے فرماتا ہے: "جس وقت کہ آسمان شکافتہ ہو کر پگھلے ہوئے برغن کی طرح گلگون ہو جائے تو ہولناک حوادث واقع ہوں گے جن کے تحمل کی کسی میں طاقت نہیں ہوگی؛ (فاذا انشقت السماء فكانت وردة كالدھان)۔"

قیامت سے تعلق رکھنے والی تمام آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دن دنیا کا موجودہ نظام کلی طور پر درہم و برہم ہو جائے گا اور دنیا میں بہت ہی ہولناک حوادث رونما ہوں گے۔ ستارے، سیارے، زمین، آسمان سب تکیٹ ہو جائیں گے اور وہ مسائل کہ جن کا تصور آج ہمارے لیے مشکل ہے، درپیش ہوں گے۔ منجملہ ان مسائل کے کہ جو مذکورہ بالا آیات میں آئے ہیں یہ ہے کہ آسمانی گزے

۱۔ یہ کہ "۱۵۱" اس جلد میں شرطیہ ہے یا فجائیہ یا ظرفیہ کئی ایک احتمال ہیں لیکن بہتر وہی پہلا احتمال ہے اور شرط کی جزا محذوف ہے۔ ہو

سکتا ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو فاذا انشقت السماء فكانت وردة كالدھان كان احوال لا يطيقها البیان "جب آسمان پھٹ کر

پگھلے ہوئے تیل کی طرح ہوگا تو ایسے خوفناک منظر ہوں گے کہ جو بیان نہیں ہو سکتے۔

شق ہو جائیں گے اور سُرخ رنگ کے روغن کی طرح پگھلی ہوئی شکل اختیار کر لیں گے۔ "وردة" اور "ورد" کے معنی پھول ہیں اور چونکہ پھول عام طور پر سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں لہذا یہاں سُرخ رنگ پر دلالت کرتا ہے۔ یہ لفظ سُرخ گھوڑوں کے لیے بھی آیا ہے اور اس بنا پر کہ اس قسم کے گھوڑے مختلف موسموں میں اپنا رنگ بدل لیتے ہیں، فصل بہار میں وہ زردی مائل ہو جاتے ہیں اور سردی کے موسم میں سُرخ رنگ کے اور زیادہ سردی پڑے تو سیاہ رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ لہذا وہ تبدیلیاں جو قیامت کے دن آسمان میں واقع ہوں گی، ان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ کبھی آسمان آگ کے شعلوں کی طرح سُرخ و یوزان کبھی زرد کبھی دھوئیں سے آلودہ سیاہ ہوگا۔ "دھان" (بروزن کتاب) پگھلے ہوئے روغن کو کہتے ہیں۔ کبھی اس تلچھٹ کے لیے آتا ہے جو روغن میں تہ نشیں ہوتی ہے اور عام طور پر اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تشبیہ اس وجہ سے ہو کہ آسمان کا رنگ پگھلے ہوئے روغن کی شکل میں سُرخ نخل آئے گا یا پھر اس سے آسمانی گزروں کے پگھل جانے کی طرف اشارہ ہے یا اس کے مختلف رنگوں کی طرف۔ بعض مفسرین نے "دھان" کی سُرخ رنگ کے چڑے سے بھی تفسیر کی ہے۔ بہر صورت یہ تمام تشبیہات اس ہولناک منظر کا صرف ایک ہیولا پیش کر سکتی ہیں کیونکہ وہ صورت حال دنیا کے کسی واقعہ سے حقیقی مشابہت نہیں رکھتی اور وہ ایسے منظر ہیں کہ جب تک کوئی انہیں دیکھ نہ لے سمجھ نہیں سکتا۔ چونکہ میدان قیامت میں یا اس سے پہلے ان ہولناک حوادث کے وقوع کی خبر دینا بحرین و مومنین کے لیے تنبیہ ہے، لہذا الطاف الہی میں سے ایک لطف ہے۔ اسی بنا پر سابقہ جملے کی تکرار ہوتی ہے اور پروردگار عالم فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟" (فبائی الاء ربکم اتکذبان)۔ اس سے بعد کی آیت میں قیامت کے حوادث کو اپنی کی وجہ سے اس روز گنگار انسان کی جو حالت ہوگی اس کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: اس دن جن و انس میں سے کسی شخص سے بھی اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ (فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان)۔ سوال کیوں نہیں ہوگا؟ اس لیے کہ ہر چیز اس دن واضح اور آشکار ہوگی۔ وہ یوم البوز ہے۔ ہر انسان کے اعمال اس کے چہرے سے ظاہر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ سوچے کہ یہ آیت ان آیتوں سے متضاد ہے جو قیامت میں بندوں کے سوال کے مسئلہ پر تاکید کرتی ہیں مثلاً سورہ صافات کی آیت ۲۲۔ (وقفوہوا انہم مسئلون) انہیں روکو تاکہ ان سے سوال کیا جاسکے اور سورہ حجر کی آیت ۹۲۔ (فوربک لئنسئلہم اجمعین عما کانوا یعملون) "تیرے پروردگار کی قسم ان سب سے سوال کریں گے۔ ان کاموں کے متعلق کہ جنہیں وہ انجام دیتے تھے"۔ لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ قیامت ایک بہت طویل دن ہے اور انسان کو متعدد مواقع اور گزرگاہوں میں سے گزرنا ہے اور ہر منظر و موقف میں ایک مدت تک ٹھہرنا ہے۔ بعض روایات کے مطابق بجاس مواقع ہیں۔ ان میں سے بعض موقعوں میں بالکل سوال نہیں دیا بلکہ رخسار کا رنگ اندرونی کیفیت کا پتہ دے گا، جیسا کہ اس سے بعد والی آیت میں آئے گا۔ بعض مواقع میں انسان کے سر پر ہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضائے بدن شہادت دینے کے لیے مستعد ہو جائیں گے۔ اور بعض مواقع میں انسانوں سے نہایت باریک بینی کے ساتھ سوال ہوں گے۔

بعض دوسرے مواقف میں انسان اپنے دفاع کے لیے لڑائی جھگڑا کرنے لگیں گے۔

خلاصہ یہ کہ ہر منظر کے کچھ تقاضے ہیں اور ہر منظر دوسرے منظر سے زیادہ خوفناک ہے۔ پھر اس کے قبیح میں سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟" (فبای الاء ربکما تکذبان)۔ جی ہاں اس دن سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ مجرم اپنی علامتوں سے پہچانے جائیں گے۔ (یسرف المجرمون لیسما ھم)۔ ایک گروہ ایسا ہوگا کہ جن کے چہرے نورانی اور درخشاں ہوں گے جو ان کے ایمان و عمل صالح پر دلالت کرتے ہوں گے دوسرا گروہ سیاہ، تاریک اور قبیح چہروں والا ہوگا جو ان کے کفر اور گناہ کی علامتیں ہیں جیسا کہ سورہ "عبس" کی آیت ۲۸ تا ۴۱ میں ہمیں ملتا ہے۔ (وجوه یومئذ مسفرة ضاحکة متبشرة ووجوه یومئذ علیھا غیوة ترھقھا قترة) اس دن نورانی اور درخشاں چہرے بھی ہوں گے اور تاریک چہرے بھی کہ جنہیں خاص قسم کی سیاہی نے گھیر رکھا ہوگا۔ اس کے بعد فرماتا ہے: "اس کے بعد سر کے آگے کے بال اور پاؤں پکڑے جائیں گے اور انہیں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

(فیؤخذ بالنواصی والاقدام)۔ "نواصی" "ناصیہ" کی جمع ہے جیسا کہ "راغب مفردات" میں کہتا ہے کہ ناصیہ اصل میں سر کے آگے کے بالوں کے معنی میں ہے۔ اس کا مادہ "نصأ" (بر وزن نصر) ہے جس کے معنی اتصال و پیوستگی کے ہیں اور "اخذ به ناصیہ" سر کے اگلے بالوں کے پکڑنے کے معنی میں ہے اور کبھی کسی چیز پر مکمل قبضہ کے کنایہ کے طور پر بھی آتا ہے۔ "اقدام" جمع ہے "قدم" کی جس کے معنی پاؤں ہیں۔ مجرموں کے سروں کے اگلے بالوں اور ان کے پاؤں کا پکڑنا ہو سکتا ہے کہ حقیقی معانی کے اعتبار سے ہو کہ مامورین من اللہ ان دو چیزوں کو پکڑ کر زمین سے اٹھا کر نہایت ذلت و خواری کے ساتھ دوزخ میں پھینک دیں گے۔ یا یہ مجرمین کے انتہائی ضعف و ناتوانی کے ساتھ مامورین من اللہ کی گرفت میں آنے کا کنایہ ہے کیونکہ وہ مجرمین کے اس گروہ کو انتہائی ذلت سے جہنم کی طرف لے جائیں گے اور وہ منظر کیا ہی دردناک اور وحشت ناک ہوگا۔

چونکہ معاد کے سلسلہ میں ان چیزوں کا یاد دلانا تنبیہ ہونے کی وجہ سے سب کے لیے ایک نوازش ہے، لہذا سب کو مخاطب کر کے مزید کہتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟" (فبای الاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے: "یہ وہی دوزخ ہے کہ جس کا مجرم ہمیشہ انکار کرتے ہیں؟" (ھذہ جہنم الاتی یکذب بها المجرمون)۔ چونکہ مخاطب محشر میں موجود ہوں گے اور قیامت میں ان سے یہ بات کہی جائے گی، یا مخاطب ذات پیغمبر ہے اور دنیا میں اس سے کہا گیا ہے اس لیے مفسرین نے مختلف تفسیروں کی ہیں۔ لیکن آیت میں کچھ ایسے قرآن موجود ہیں جو دوسرے معانی کو تقویت دیتے ہیں کیونکہ فعل مضارع "یکذب" کا استعمال اور جملہ غائب کا مجرموں کے عنوان سے استفادہ اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ خدا اپنے پیغمبر سے کہتا ہے کہ یہ اوصاف اس دوزخ کے ہیں جس کا مجرم ہمیشہ انکار کرتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ مخاطب تمام جن و انس ہیں کہ جنہیں تنبیہ کرتا ہے کہ وہ جہنم جس کا مجرم انکار کرتے ہیں اس قسم کے اوصاف کا حامل ہے کہ جنہیں تم سن رہے ہو۔ لہذا خبردار

رہو۔ تمہارا انجام تمہیں وہاں تک نہ لے جائے۔ دوبارہ جہنم کی تصریح اور اس کے دردناک عذاب کے سلسلہ میں مزید کہتا ہے :

" مجرم دوزخ اور جلانے والے پانی کے درمیان آمد و رفت رکھتے ہیں۔ (یطوفون بینہا و بین حمیم ان)۔ " ان " اور " ان " یہاں اس پانی کے معنوں میں ہے کہ جو کھولتا ہوا ہو اور اصل میں " انا " (بروزن رضا) کے مادہ سے وقت کے معنی دیتا ہے کیونکہ جلانے والا پانی اپنی آخری حد کو پہنچ چکا ہے۔ تو اس طرح ایک طرف تو جہنم کے جلانے والے شعلوں کے درمیان چلیں گے اور پیائے ہوں گے اور پانی کی متناکریں گے دوسری طرف انہیں کھولتا ہوا پانی دیا جائے گا۔ (یا ان پر پھینکا جائے گا)۔ اور یہ دردناک سزا و عذاب ہے۔ بعض آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ " حمیم " نامی جلانے والا چشمہ جہنم کے قریب ہے کہ پہلے دوزخیوں کو ان میں لے جائیں گے اور پھر انہیں جہنم کی آگ میں پھینکیں گے۔ (یسحبون فی الحمیم ثم فی النار یسجرون) (مومن ۷۴) (یطوفون بینہا و بین حمیم ان) کی تعبیر زیر بحث آیت میں انہی معنوں سے مناسبت رکھتی ہے۔ پھر اس شدید خطر سے بیدار کرنے کی حالت کو اور اس تنبیہ کو جو بجائے خود ایک نطفہ پروردگار ہے بیان کر کے کہتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس نعمت کو جھٹلاؤ گے " (فبأی آلاء ربکما تکذبان)۔

- ۴۶۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٌ ۖ
- ۴۷۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبُنِ ۖ
- ۴۸۔ ذَوَاتَا أَفْنَانٍ ۖ
- ۴۹۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبُنِ ۖ
- ۵۰۔ فِيهِمَا عَيْنُونِ تَجْرِينِ ۖ
- ۵۱۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبُنِ ۖ
- ۵۲۔ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجِنِ ۖ
- ۵۳۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبُنِ ۖ
- ۵۴۔ مُتَّكِنِينَ عَلَى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ ۖ
- وَجَنَّاتُ الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ۖ
- ۵۵۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبُنِ ۖ

ترجمہ

۴۶۔ اور اس شخص کے لیے کہ جو اپنے پروردگار سے ڈرے جنت کے دو باغ ہیں

- ۴۷۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟
- ۴۸۔ وہ جنت کے ان دو باغوں میں انواع و اقسام کی نعمتیں اور طراوت رکھنے والے درخت رکھتے ہیں ۔
- ۴۹۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟
- ۵۰۔ ان میں مسلسل دو چشمے جاری ہیں ۔
- ۵۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟
- ۵۲۔ ان دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو دو قسمیں موجود ہیں ۔
- ۵۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟
- ۵۴۔ یہ اس حالت میں ہے کہ وہ ایسے فرشتوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں کہ جن کے استر ریشم کے ہیں اور ان دونوں باغوں کے پکے ہوئے پھل ان کی دسترس میں ہیں ۔
- ۵۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

یہ دونوں جنتیں خائفین کے انتظار میں ہیں

ان آیتوں میں دوزخیوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر پروردگار عالم نے جنتیوں کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ اس طرح اللہ نے جنت کی دلپذیر اور شوق انگیز نعمتوں کا شمار کرایا ہے تاکہ ان نعمتوں کا دوزخیوں پر سال ہو جانے والے عذاب اور سزاؤں سے موازنہ کر سکیں۔ دونوں میں سے ہر ایک کی اہمیت کو واضح کرے۔ وہ فرماتا ہے : ”اس شخص کے لیے کہ جو اپنے پروردگار کے مرتبہ سے غافل ہے جنت کے دوباغ میں“ (ولہن خلیف مقام مرتبہ جنتان)۔ ”مقام پروردگار سے خوف“ اس سے مراد قیامت کے مختلف موقعوں میں قیام کا خوف، حساب کی غرض سے بارگاہ الہی میں حاضر ہونے کا خوف یا خدا کے اس علم اور دائمی نگہبانی کا خوف ہے جو وہ تمام انسانوں کے بارے میں رکھتا ہے۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

دوسری تفسیر اس بات سے مناسبت رکھتی ہے جو سورہ "رعدہ" کی آیت ۲۳ میں آئی ہے جہاں خدا فرماتا ہے:

(اَفَمَنْ هُوَ قَاتِلٌ عَلٰی كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ) "کیا وہ جو سب کے سزا کرنے میں خود اپنے اور سب کے اعمال کا نگہبان و نگران ہے اس شخص کی مانند ہے جو یہ سنتیں نہیں رکھتا" ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: مَنْ عَلِمَ اَنْ اَللّٰهُ يَرَاهُ وَيَسْمَعُ مَا يَقُولُ وَيَعْلَمُ مَا يَعْمَلُهُ مِنْ خَيْرٍ اَوْ شَرٍّ فَيَحْزَنُ ذَلِكَ عَنِ الْقَتْلِ مِنَ الْاَعْمَالِ الَّذِي خَافَ مِنْ مَقَامِ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی "جو شخص جانتا ہے کہ خدا اس کو دیکھتا ہے اور جو کچھ یہ کہتا ہے وہ سنتا ہے اور غیر و شر میں سے جو کچھ یہ انجام دیتا ہے اُسے وہ جانتا ہے اور یہ تو یہ اس انسان کو اعمال قبیح سے روکتی ہے تو یہی وہ شخص ہے جو اپنے رب کے مقام سے خائف ہے اور اس نے اپنے آپ کو ہوائے نفس سے باز رکھا ہے۔"

ایک تیسری تفسیر اور بھی ہے اور وہ یہ کہ مراد صرف خدا کا خوف ہے نہ بہیم کی آگ کا نہ نعمات جنت کے لاچ کی وجہ سے کوئی خوف ہے بلکہ صرف مقام پروردگار اور اس کے جلال کا خوف ہے۔

ایک چوتھی تفسیر بھی ہے کہ "مقام پروردگار" سے مراد عدالت الہی کا مقام ہے کیونکہ اس کی ذات مقدس خوف کا باعث نہیں ہے بلکہ خوف اگر ہے تو اس کی عدالت سے ہے اور عدالت سے خوف کی بازگشت بھی خود انسان کے اپنے اعمال کی طرف ہے کیونکہ جس کا حساب پاک ہے اُسے محاسبہ سے کیا باک ہے مجرم جس وقت عدالت یا زندان کے پاس سے گزرتے ہیں تو ڈرتے ہیں لیکن بے گناہ لوگوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہاں عدالت ہے یا کوئی اور جگہ پروردگار سے خائف ہونے کے منتظر سرچشمے ہیں کبھی تو اپنے ناپاک اعمال اور غلط افکار کی وجہ سے خوف خدا لاحق ہوتا ہے اور کبھی مقررین بارگاہ الہی کے لیے اس کے قرب کی بنا پر، کبھی چھوٹا سا ترک اولیٰ اور مہولی سی غفلت بھی خوف خدا کا سبب بن جاتی ہے کبھی ان سبب سے بہت کرپب اس کی لامحدود ذات اور لامتناہی عظمت کا تصور کرتے ہیں تو اس کے مقابلے میں اپنی حقارت کا احساس کرنے سے خوف طاری ہو جاتا ہے یہ وہ خوف ہے جو پروردگار کی انتہائی معرفت کے وقت حاصل ہوتا ہے اور اس کی بارگاہ کے مخصوص عارف اور مخلص فرد کو لاحق ہوتا ہے۔ یہ چاروں تفسیریں آپس میں تضاد نہیں رکھتیں اور یہ ممکن ہے کہ مفہوم آیت میں ان سب کا اجتماع ہو باقی رہیں وہ تفسیریں بہشت کے دو باغ تو ہو سکتے ہیں کہ پہلی بہشت مادی و جسمانی ہو اور دوسری بہشت معنوی و روحانی ہو۔ لیکن اگرچہ آیت ۱۵ میں آیا ہے: "الَّذِينَ اتَّقَوْا عَذْرَ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُطْلِقِينَ قَوْمًا" اس آیت میں جسمانی جنت کے علاوہ، جس کے اور قول کے نیچے سے ظہور میں آتی ہے اور اس میں پاکیزہ و تابانی میں معنوی بہشت کے جو خوشنودی خدا ہے اس کا بھی بیان ہے۔ لہذا یہ بھی ممکن ہے کہ آیت ۱۵ کی ایک اعمال کے صلہ میں ہو جو جالبہجہ اور دوسری بہشت

آیت ۲۰ (و اما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الفواحش) کی تفسیر میں غزالی اگرچہ تو ان آیات کا مفہوم یکساں ہی ہے بلکہ

بطور تفضل عطا کی جائے گی۔ بسیا کہ سورہ نور کی آیت ۳۸ میں آیا ہے: **لِيَجْزِيَ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُمْ مِنْ فَضْلِهِ** مقصد یہ ہے کہ خدا ان کو ان کے بہترین اعمال کا اجر دے گا اور اپنے فضل کا اس پر اضافہ کرے گا۔ یا یہ کہ ایک جنت اطاعت کی بنا پر اور دوسری معصیت کے ترک کرنے کی بنا پر ہے۔ یا ایک ایمان و عقیدہ کی وجہ سے ہے اور دوسری اعمال صالح اور اسی قسم کے دوسرے امور کے صلہ میں ہے۔ یا یہ کہ چونکہ مخاطب جن و انس ہیں تو ان دونوں جنتوں میں سے ہر ایک الگ گروہ سے تعلق رکھتی ہے ان تفاسیر میں سے کسی کے حق میں بھی کوئی خاص دلیل نہیں ہے جب کہ یہ ممکن ہے کہ آیت سے یہ سب کی سب تفسیریں مراد ہوں۔ وہ چیز جو طے شدہ اور یقینی ہے کہ خدا جنت کے کئی باغات اپنے صالح مندوں کے اختیار میں دے گا جن میں ان کی آمد و رفت ہوگی اور دوزخی آگ اور جلانے والے پانی کے درمیان مقیم ہوں گے۔ یہ تھے جنت کے دو باغ۔ پھر اس عظیم نعمت کے بعد سب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو بھٹلاؤ گے“ (فبائی الاء ربکما تکذبان)۔

اس کے بعد ان دونوں بہشتوں کی تعریف و توصیف میں مزید ارشاد فرماتا ہے: وہ انواع و اقسام کی نعمتوں اور طراوت رکھنے والے شاخ دار درختوں کی حامل ہیں۔ (ذواتا افشان)۔ ”ذواتا“ ”ذات“ کا تثنیہ ہے جس کے معنی صاحب و حامل کے ہیں۔ ”افشان“ جمع ہے ”فشن“ (بروزن قلم) کی۔ یہ تروتازہ شاخوں اور ٹہنیوں کے معنی میں ہے جن میں خوب پتے لگے ہوئے ہوں۔ یہ لفظ بعض اوقات ”نوع“ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور زیر بحث آیت میں اس بات کا امکان ہے کہ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہو۔ پہلی صورت میں جنت کے درختوں کی طراوت رکھنے والی تروتازہ شاخوں کی طرف اشارہ ہو بر خلاف دنیا کے درختوں کی شاخوں کے کہ جو پُرانی اور نئی دونوں قسم کی شاخوں کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں بہشت کی نعمتوں کے تنوع اور اس کی مختلف نعمتوں کی طرف اشارہ ان دونوں معانی کے اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ جنت کے درخت اس قسم سے ہیں کہ ایک ہی درخت کی بہت سی شاخیں ہیں اور ہر شاخ پر مختلف قسم کے پھل ہیں۔ اس نعمت کے بیان کے بعد پھر اسی سوال کی تکرار ہے کہ ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو بھٹلاؤ گے“ (فبائی الاء ربکما تکذبان)۔

چونکہ ایک بہشت پر سرت اور طراوت رکھنے والے باغ میں درختوں کے علاوہ پانی کے چشمے بھی جاری ہونے چاہئیں لہذا بعد والی آیت میں کہتا ہے: ”ان دو بہشتوں میں دو چشمے ہیں کہ جو ہمیشہ جاری رہتے ہیں“ (فیہما عینان تجريان)۔ پھر اس نعمت کے مقابلے میں وہی سوال کرتا ہے: ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو بھٹلاؤ گے“ (فبائی الاء ربکما تکذبان)۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیت میں ان دونوں چشموں کی کیفیت کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہے صرف اس کے متعلق ”نکروہ“ کے عنوان کے ماتحت ایک تعبیر نظر آتی ہے کہ جو اس قسم کے مواقع پر عظمت و اہمیت کی دلیل ہے لیکن بعض مفسرین نے ان دو چشموں کو ”سلسبیل“ اور ”تنبیم“ نام کے دو چشمے جو بالترتیب سورہ ”دھر“ کی آیت ۱۸ اور ”مطفئین“ کی آیت ۲۰ میں بیان کیے گئے ہیں بطور تفسیر پیش کیے ہیں کبھی کہا ہے کہ ان دونوں چشموں میں سے ایک شراب طہور اور دوسرا غسل مصفی کا ہے۔ ان دونوں کا ذکر سورہ ”محمد“ کی آیت ۱۵ میں ہے۔ بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق ذات کی اصل جو کہ مفرد مؤنث ہے ”ذوات“ تھی کہ جس کی واؤ تخفیف کی وجہ سے حذف ہوگئی اور ذات کی شکل میں رہ گئی۔ چونکہ تثنیہ الفاظ کو ان کی اصل کی طرف پلٹا دیتا ہے تو یہاں ذواتان ہو گیا ہے اور اضافت کی وجہ سے اس کا نون حذف ہو گیا ہے۔ محج الجبرین ہیں آیا ہے کہ ”ذو“ بروزن صرافتی تو اس بنا پر تعجب کی بات نہیں کہ اس کی مؤنث ذوات ہو۔

اور اگر ہم "جنتان" کی تفسیر گزشتہ آیتوں میں موجود معنوی اور مادی جنتوں کے اعتبار سے کریں تو قدرتنا یہ دونوں چشمے بھی ایک معنوی (چشمہ معرفت) اور دوسرا مادی چشمہ (آب زلال، دودھ، شراب طہور یا شہد کا) ہوگا۔ لیکن ان تفسیروں کے لیے ہمارے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں جب گفتگو ہشتی باغوں کے پھلوں میوؤں تک پہنچ جاتی ہے تو فرماتا ہے: "ان میں ہر ایک پھل کی دو قسمیں موجود ہیں" (فیہامن کل فاکھۃ زوجان)۔ ایک وہ قسم جس کا نمونہ دنیا میں انہوں نے دیکھا ہے اور دوسری وہ قسم جس کی مثل و نظیر اس دنیا میں ہرگز نہیں دیکھی۔ بعض مفسرین دو قسم کی تفسیر گرمی اور سردی کے پھلوں، خشک و تر یا چھوٹے بڑے پھلوں کے اعتبار سے کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ اتنی بات طے شدہ ہے کہ جنت کے پھل مکمل طور پر متنوع اور گونا گوں ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ پرکشش اور عمدہ ہے۔ اس کے بعد، پروردگار عالم پھر فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟" (فبای الاء ربکم اتکذبان)۔

گزشتہ آیتوں میں جنت کے ان دونوں باغوں کی خصوصیات کے تین حصے بیان ہوئے ہیں۔ اب ہم اس کی چوتھی خصوصیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، پروردگار عالم فرماتا ہے: "یہ اس حالت میں ہیں کہ جتنی فرش پر بیٹھے ہیں اور تکیے لگائے ہوئے ہیں کہ جن کے استر ریشم اور استبرق کے ہیں" (متکئین علی فرش بطائئہامن استبرق)۔

عام طور پر انسان نیکیہ اس وقت لگاتا ہے کہ جب انتہائی آرام دہ اور اس کے ماحول میں ہو۔ یہ تعبیر ہشتیوں کی روح کی مکمل تسکین آرام کی نشان دہی کرتی ہے۔ "فرش" (بروزن شتر) جمع اس کی "فرش" ہے جس کے معنی ہیں ایسے فرش جو بچھائے جاتے ہیں۔ "بطائن" جمع ہے "بطانہ" کی جس کے معنی استر کے ہیں اور استبرق موٹے اور ضخیم ریشم کے معنوں میں ہے۔ قابل توجہ اور پرکشش ہوتا ہے کہ یہاں بہت قیمتی پارچہ جس کا دنیا میں تصور ہو سکتا ہے اس کا ان فرشوں کے استر کے طور پر ذکر ہوا ہے، جو اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا اوپر والا حصہ ایسی چیز ہے کہ جس کی لطافت و زیبائی اور جاذبیت تعریف و توصیف سے ماورا ہے۔ کیونکہ عام طور پر دنیا میں استر کو اس درجہ سے کہ وہ دکھائی نہیں دیتا، کم قیمت جنس سے تیار کرتے ہیں تو اس طرح اس جہاں کی کم قیمت اجناس کی جگہ اس جہاں میں نہایت قیمتی جنس مستعمل ہے۔ تو اب سوچنا چاہیے کہ اس جہاں کی بیش قیمت چیزیں کیسی ہوں گی۔

یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ پروردگار عالم کی ان نعمتوں میں سے کہ جو دوسرے جہان سے متعلق ہیں کوئی نعمت ایسی نہیں کہ جو الفاظ میں بیان ہو سکے یا یہ کہ ہم ان کے تصور کی طاقت رکھتے ہوں۔ ہمارے ذہنوں پر صرف ایک تصوراتی پیکر دُور ہی سے متجلی ہوتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی ہمیں ملتا ہے کہ جنتی "اراءک" یعنی سائبان والے تخت اور بغیر سائبان کے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے لیکن یہاں فرماتا ہے: کہ فرش پر تکیہ لگائے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لذات ہشتی کے تنوع کی بنا پر ہو کہ کبھی تخت پر اور کبھی فرش پر تکیہ لگا کر بیٹھیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان بیش قیمت فرشوں کو ان تختوں پر بچھا دیں۔ یا پھر اس سے زیادہ معاملات کی طرف اشارہ ہو جن کا ادراک اس دنیا میں رہنے والوں کے لیے ممکن نہیں ہے۔ آخر میں پانچویں نعمت کے سلسلہ میں اسی ہشتی باغ کی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ان دونوں ہشتیوں کے پتے ہوئے پھل ان کی دسترس میں ہوں گے (وجنا الجنۃین دان)۔ جی ہاں وہ رحمت و تکلیف کہ جو عام طور پر دنیا کے پھلوں کے حاصل کرنے میں ہوتی ہے وہاں کسی بھی طرح نہیں ہے۔

لہ "متکئین" حال ہے ان ہشتیوں کا گزشتہ آیتوں میں جنہیں (ولمن خاف مقام ربہ جنتان) کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

”جنتی“ (بروزن بقا) اس پھل کو کہتے ہیں کہ جس کو توڑنے کا وقت آن پہنچا ہو اور ”دان“ اصل میں ”دانی“ ہے اس کے معنی نزدیک کے ہیں۔ پھر سب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو بھٹلاؤ گے؟“ (فہامی اللہ ربکما تکذبان)۔

www.sirat-e-mustaqeem.net

۵۶۔ فِیْهِنَّ قُضِرَتْ الطَّرْفُ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا
جَانٌ ۚ

۵۷۔ فِیْآئِیْ الْاِیِّ رَبِّکُمْ تَكْذِبُن ۚ

۵۸۔ کَانَتْهُنَّ الْیَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ۚ

۵۹۔ فِیْآئِیْ الْاِیِّ رَبِّکُمْ تَكْذِبُن ۚ

۶۰۔ هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ

۶۱۔ فِیْآئِیْ الْاِیِّ رَبِّکُمْ تَكْذِبُن ۚ

ترجمہ

۵۶۔ جنت کے باغوں میں ایسی خواتین ہیں کہ جو سوائے اپنے شوہروں کے کسی سے محبت

نہیں رکھتیں اور اس سے پہلے کسی جن و انس نے انہیں مس نہیں کیا۔

۵۷۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۵۸۔ وہ یاقوت و مرجان کی مانند ہیں۔

۵۹۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۶۰۔ کیا نیکی کا بدلہ نیکی کے علاوہ کچھ اور ہے؟

۶۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

پروردگار عالم فرماتا ہے: "بہشت کے مخلوق میں ایسی عورتیں ہیں کہ جنہوں نے اپنے شوہروں کے علاوہ کبھی کسی دوسرے مرد کی طرف نہیں دیکھا اور ان کے علاوہ کبھی کسی دوسرے فرد سے محبت نہیں کی۔" (فیہن قاصرات الطرف) ۱

"اور کسی جن یا انسان نے اس سے پہلے ان سے ملاقات نہیں کی۔" (لویطمنھن النس قبلہم ولا جان) ۲

اس وجہ سے وہ دوشیزہ ہیں۔ کسی نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا یا وہ ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہیں۔ حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے کہ جنت والی بیوی اپنے شوہر سے کہے گی کہ مجھے پروردگار کی عزت کی قسم ہے کہ میں جنت میں تجھ سے بہتر کوئی چیز نہیں پاتی۔ حمد و سپاس مخصوص ہے، اس خدا کے لیے جس نے مجھے تیری بیوی اور تجھ کو میرا شوہر قرار دیا۔ ۳

"طرف" (بروزن حرف) کے معنی پلک کے ہیں۔ چونکہ دیکھنے کے وقت پلکیں حرکت کرتی ہیں، لہذا یہ کنایہ ہیں دیکھنے کا۔ اس بنا پر "قاصرات الطرف" کے الفاظ ایسی عورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جن کی نگاہ کوتاہ ہے یعنی وہ صرف اپنے شوہروں سے ہی لگاؤ رکھتی ہیں۔ اور یہ ایک بیوی کا عظیم ترین امتیاز ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی دوسرے کا تصور بھی نہ کرے اور کسی سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ پروردگار عالم اس نعمت بہشتی کے بعد پھر فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟" (خبائی الابرکما تکذبان)۔ اس کے بعد ان بہشتی عورتوں کی اور تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ یاقوت و مرجان کی طرح ہیں" (کانتھن الیاقوت والمرجان)۔ سرخی صفائی اور آب و تاب میں یاقوت اور خوبروی و سفیدی میں مرجان اس وقت کہ جب یہ دونوں رنگ سفید اور صاف سُرخ، آپس میں ملتے ہیں تو ایک نہایت خوبصورت رنگ بنتا ہے۔ "یاقوت" ایک معدنی پتھر ہے جو عام طور پر سُرخ رنگ کا ہوتا ہے اور مرجان ایک دریائی جانور ہے کہ جو درخت کی شاخ سے مشابہ ہوتا ہے جو کبھی سفید کبھی تیز سُرخ یا مختلف رنگوں کا ہوتا ہے۔

۱ "فیہن" میں حج کی ضمیمہ ممکن ہے قصور بہشتی کی طرف لوٹے یا ان دو جنتوں کے مختلف باغات کی طرف یا ان کی نعمتوں کی طرف۔

۲ "لویطمنھن" کا مادہ "طمٹ" ہے جس کے معنی ماہواری کا خون ہے۔ یہ زوال بکارت کے معنوں میں بھی آیا ہے اور یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ جنت کی باکرہ عورتیں ہرگز شوہر نہیں رکھتیں۔

یہاں بظاہر مراد اس کی سفید قسم سے ہے۔

باردگر جنت کی اس نعمت کے بیان کے بعد فرماتا ہے: ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔“ (خباثی
الادربکما تکذبان)۔ اس بحث کے آخر میں فرماتا ہے: ”کیا نیکی کی جزا نیکی کے علاوہ اور کوئی چیز ہو سکتی ہے؟“
(هل جزاء الاحسان الا الاحسان)۔

وہ افراد کہ جنہوں نے دنیا میں نیک کام کیے ہیں کیا خدا کی طرف سے ان کے لیے عمدہ جزا کے علاوہ کسی اور شے کی توقع کی جاسکتی ہے۔
اگرچہ اسلامی روایات میں یا مستشرقین کی تفسیروں میں احسان سے مراد توحید ہے یا توحید و معرفت ہے یا اسلام۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ
ان میں سے ہر ایک نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ کوئی سہی بھی نیکی جو عقیدہ، گفتار اور عمل میں ہو یہ اس کے مفہوم پر حادی ہے۔
امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہے:

”آیۃ فی کتاب اللہ مجلۃ، قلت وماہی؟ قال قول اللہ عزوجل:

”هل جزاء الاحسان الا الاحسان“ جرت فی الکافر والمؤمن، والبر والفاجر، ومن
صنع الیہ معروف فلیہ ان یکافؤ بہ وليس المكافاة ان تصنع کما صنع حتی تری
فان صنعت کما صنع کان له الفضل بالابتداء۔“

قرآن میں ایک آیت ہے کہ جو عمومیت کامل رکھتی ہے۔ راوی نے عرض کیا کہ وہ کونسی آیت ہے
فرمایا: خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ (هل جزاء الاحسان الا الاحسان) کہ جو کافر و سومن
اور نیک و بد کے بارے میں ہے۔ (کہ نیکی کا جواب نیکی سے دینا چاہیے) جس شخص کے
ساتھ نیکی کی جائے اسے نیکی سے بدلہ ادا کرنا چاہیے اور بدلہ یہ نہیں ہے کہ اس کی نیکی کی مقدار
کے برابر نیکی کی جائے بلکہ اس سے زیادہ نیکی کرنی چاہیے۔ اگر نیکی کی اتنی ہی مقدار ہوگی تو اس کی
نیکی افضل و برتر ہوگی کیونکہ اس نے ابتدا کی ہے۔

اسی وجہ سے بندہ کے نیک اعمال کے بدلہ میں خدا کی طرف سے جو سلوک ہوگا وہ زیادہ بہتر ہوگا۔ یہ اس استدلال کی بنا پر ہے کہ
جو امام نے مندرجہ بالا حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: ”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے ”احسان“ ایک ایسی شے ہے جو انصاف
سے بہتر ہے کیونکہ انصاف یہ ہے کہ انسان، جو کچھ اس کے ذمہ واجب ہے، اسے ادا کر دے اور جو اس کا دوسرے پر ہے وہ
لے لے لیکن احسان یہ ہے کہ انسان اس سے زیادہ کہ جس کا وہ ذمہ دار ہے عطا کرے اور جتنا اس کا حق ہے اس سے کم لے۔
پروردگار عالم پھر اپنے بندوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے۔“ (خباثی الادربکما

مرجان کے بارے میں اس سورہ کے اوائل میں آیت ۲۲ کے ذیل میں ہم نے تشریح کی ہے۔

”هل“ اس آیت میں استہنام انکاری کے طور پر ہے۔ حقیقت میں یہ آیت ان گزشتہ آیتوں کی دلیل ہے کہ جن میں جنت کی چھ نعمتوں کا
ذکر تھا۔

تفسیر عیاشی مطابق نقل ”نور الثقلین“ ج ۵ ص ۱۹۹ اور تفسیر ”مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۲۰۸

تکذبان)۔ وہ اس لیے کہ یہ قانون کہ "احسان کا بدلہ احسان ہے" بجائے خود ایک عظیم نعمت ہے جو خداوند عظیم کی طرف سے ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ اپنے نیک بندوں سے جو سلوک ہوگا وہ اس کے اپنے کرم کی بنا پر ہوگا نہ کہ ان کے اعمال کے مطابق۔ اب اگر وہ اطاعت کرتے ہیں اور نیک عمل بجالاتے ہیں تو وہ بھی اس کی دی ہوئی توفیق کی نعمت کی بنا پر ہے۔ خدا کی برکتیں بندوں ہی کی طرف لوٹتی ہیں۔

ایک نکتہ نیکی نیکی کی جزا ہے

جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا آیت میں پڑھا : (هل جزاء الا احسان الا احسان) قرآنی منطق کی رو سے ایک عمومی قانون ہے کہ جو خدا، مخلوق اور تمام بندگان خدا پر حاوی ہے۔ اس قانون کی عمومیت تمام مسلمانوں کو یہ درس دیتی ہے کہ جس شخص کے ساتھ جو نیکی ہو وہ اس کے بدلہ میں ضرور نیکی کرے اور امام جعفر صادق ؑ کے ارشاد کے مطابق اس کا بدلہ یہ نہیں ہے کہ ویسی ہی نیکی کی جائے بلکہ اس سے بہتر و برتر نیکی بروئے کار لائی جائے ورنہ جس نے احسان کرنے میں پہل کی ہے اس کی برتری اپنی جگہ مسلم ہے۔ بارگاہ خداوندی میں ہمارے اعمال کا مسئلہ ایک اور رُخ اختیار کر لیتا ہے کیونکہ خدا خود ایسا کریم ہے کہ جس کی رحمت کی موجوں نے تمام عالم امکان کا احاطہ کر رکھا ہے اور اس کا انعام و اکرام وہ ہے جو اس کی ذات کو زیب دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کے برابر ہو۔ اس وجہ سے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ تاریخ اُمم میں ہمیں متعدد بار ایسا ملتا ہے کہ پُر خلوص افراد کو چھوٹا سا کام انجام دینے کے نتیجے میں بڑے انعامات سے نوازا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ بعض مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ ایک مسلمان نے ایک کافر بڑھیا کو دیکھا جو پرندوں کے لیے سردی کے موسم میں دلنے ڈال رہی تھی تو اس مسلمان نے بڑھیا سے کہا کہ تجھ جیسی فرد کا یہ عمل بارگاہ خداوندی میں قابل قبول نہیں ہے۔ اس بڑھیا نے کہا: "میں یہ عمل ضرور کروں گی چاہے قابل قبول ہو یا نہ ہو" بات آئی گئی ہوئی۔ ایک مدت کے بعد اسی مسلمان کو اس بڑھیا نے حرم کعبہ میں دیکھا اور کہا کہ اے بندہ خدا پرندوں کے لیے مٹھی بھر دانے ڈالنے کی برکت نے مجھے نعمت اسلام سے نوازا ہے۔

- ۶۲۔ وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّتَيْنِ ۝
- ۶۳۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝
- ۶۴۔ مُدْمَمَتَيْنِ ۝
- ۶۵۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝
- ۶۶۔ فِيهِمَا عَيْنَتْنِ نَضَّاحَتَيْنِ ۝
- ۶۷۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝
- ۶۸۔ فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ۝
- ۶۹۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝

ترجمہ

- ۶۲۔ اور ان سے بہت نیچے دو اور بہشت ہیں ۔
- ۶۳۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟
- ۶۴۔ دونوں مکمل طور پر پُر مسرت و سرسبز ہیں ۔
- ۶۵۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟
- ۶۶۔ ان میں دو چشمے جوش کی حالت میں ہیں ۔

- ۶۷۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟
 ۶۸۔ ان میں پھل کثرت سے ہیں اور کھجور اور انار کے درخت ہیں۔
 ۶۹۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

دو اور جنتیں اپنے حیران کن اوصاف کے ساتھ

گزشتہ بحث کو جاری رکھتے ہوئے جس میں خوفِ خدا رکھنے والوں کو نصیب ہونے والی عالی قدر بہشتوں کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا پروردگارِ عالم ان آیتوں میں دو اور جنتوں کی بات کرتا ہے جو پست درجہ میں ہیں اور قدرتا ایسے افراد کے لیے ہیں کہ جو ایمان اور خوفِ الہی کی بہت نیچی سطح پر فائز ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایمان اور عملِ صالح کے اعتبار سے مختلف مراتب آتے ہیں۔ پہلے فرماتا ہے: ”اور ان سے نیچے دو اور بہشت ہیں“ (ومن دونہما جنتان)۔ مفسرین نے اس جملے کی دو تفسیریں کی ہیں ایک تو وہی جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ من دونہما کے الفاظ یعنی ان دو جنتوں کے علاوہ دو اور جنتیں ان مومنین کے لیے ہیں جو نئی نئی اشیاء کے اشتیاق میں بہشت کے ان باغات میں سیر کر رہے ہیں۔ انسان کی طبیعت اور اس کا مزاج نئی نئی اشیاء میں دلچسپی کا عادی ہے اور اس سے اس کو لطف حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ان آیتوں کے لب و لہجہ سے اور ان روایتوں کی رو سے جو اس تفسیر میں وارد ہوئی ہیں پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ پیغمبرِ اسلام کی ایک حدیث ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیم کے بارے میں فرمایا:

”جنتان من فضة وایتھما وما فیھما وجنتان من ذهب وایتھما وما فیھما“

”دو جنتیں جن کی عمارت اور جو اشیاء ان میں ہیں وہ سب چاندی کی ہیں اور دو

جنتیں ایسی ہیں کہ جن کی عمارت اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب سونے کا ہے۔“

سونے اور چاندی کی تعبیر ممکن ہے کہ ان دونوں نعمتوں کے فرق کی طرف اشارہ ہو رہا

ایک اور حدیث جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے اس میں ہمیں ملتا ہے کہ آپ نے فرمایا:

(لا تقولن الجنة واحدة، ان الله يقول ”ومن دونہما جنتان“ ولا تقولن

درجة واحدة ان الله يقول ”درجات بعضها فوق بعض“ انما تفاضل القوم بالأعمال)

”یہ نہ کہہ کہ ایک جنت ہے کیونکہ خدا کہتا ہے: ”ان دو جنتوں کے علاوہ دو اور جنتیں ہیں۔“

لہ ”مجمع البیان“ آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

اور یہ بھی نہ کہہ کہ ایک درجہ ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے :

”کئی درجات ہیں جن میں سے بعض بعض سے بہتر ہیں“ اور یہ فرق اعمال کی بنیاد پر ہے۔^۱

اسی وجہ سے پیغمبر اسلام کی ایک حدیث میں ہے :

جنتان من ذہب للمقربین وجنتان من ورق لاصحاب الیمین ۔

”دو سونے کی جنتیں ہیں کہ جو مقربین بارگاہ کے لیے ہیں اور دو جنتیں چاندی کی ہیں کہ جو اصحاب الیمین کے لیے ہیں۔“^۲

اس کے بعد پھر فرماتا ہے : ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے۔“ (فبأتی الاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد ان دونوں جنتوں کی وہ پانچ خصوصیتیں کہ جن میں سے کچھ اس کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں جو سابقہ دو جنتوں کے بارے میں بتائی گئیں اور کچھ ان سے مختلف ہیں اور ان کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”وہ دونوں پُرسرت و سرسبز ہیں۔“ (مدھامتان)۔ مدھامتان کا مادہ ”ادھیام“ ہے اور ”وہمہ“ (بروزن تہمہ) کی جڑ سے سیاہی اور رات کی تاریکی کے معنوں میں ہے۔ خوش رنگ سرسبز پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور چونکہ اس قسم کا رنگ گھاس اور درختوں کی انتہائی شادابی کی علامت ہوتا ہے لہذا یہ تعبیر ان دونوں جنتوں کی انتہائی سرسبزی و شادابی کو بھی واضح کرتی ہے۔ اس مقام پر پھر اضافہ کرتا ہے۔ ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے۔“ (فبأتی الاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد والی آیت میں ایک اور صفت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے : ”ان دونوں جنتوں میں دو چشمے ہیں جو جوش مار رہے ہیں (فیہما عینان نضاختان)۔“ ”نضاختان“ کا مادہ ”نضخ“ ہے جس کے معنی پانی کے ابل کر نکلنے کے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر جتن و انس سے استقامت انکاری کی صورت میں پوچھتا ہے۔ ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔“ (فبأتی الاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد کی آیت ان دونوں جنتوں کے پھلوں کے بارے میں کہتی ہے : ”ان میں پھل کثرت سے ہیں اور خرما اور انگور کے درخت ہیں (فیہما فاکھۃ و نخل و رمان)۔ اس میں شک نہیں کہ ”فاکھۃ“ کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اس سے تمام قسم کے پھل مراد ہوتے ہیں لیکن کھجور اور انار کی اہمیت اس کا سبب بنتی ہے کہ ان دو پھلوں کا بطور خاص ذکر کیا جائے۔ اور یہ جو بعض مفسرین نے خیال کیا ہے کہ مذکورہ دونوں پھل ”فاکھۃ“ کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں، یہ غلط ہے۔ کیونکہ علمائے لغت نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ اصولاً ”عام“ پر ”خاص“ کا عطف ایسے مواقع پر جب کوئی خاص امتیاز نہ رکھتا ہو معمول میں داخل ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۹۸ میں ہے (من کان عدواً للہ و ملائکتہ و رسلہ و جبریل و میکال فان اللہ عدو للکافرین) ”جو شخص خدا اس کے ملائکہ اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہو (اور کافر ہو) تو خدا کا فوہل کا دشمن ہے۔“ یہاں جبریل و میکائیل کو جو خدا کے عظیم فرشتوں میں سے دو فرشتے ہیں ملائکہ کے بیان کے بعد، بطور عام مورد توجہ قرار پائے ہیں۔ پھر اس سوال کی تکرار کرتے ہوئے فرماتا ہے : ”تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے۔“ (فبأتی الاء ربکما تکذبان)۔

^۱ ”مجمع السببان“ آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

^۲ ”در المنثور“ جلد ۶ ص ۱۴۶ جیسا کہ ہم نے کہا کہ سونے اور چاندی کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ ان دونوں جنتوں کے مرتبہ کفر کی طرف اشارہ ہو۔

ایک نکتہ پھلوں کی قدر و قیمت

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیتوں میں جنت کی غذاؤں کے سلسلہ میں صرف پھلوں پر انحصار کیا گیا ہے اور تمام پھلوں میں سے خرما اور انار کا نام لیا گیا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ کھجور کے درخت کو نخل کہا گیا ہے لیکن انار کے بارے میں خود پھل کا نام لیا ہے۔ یقیناً ہر ایک میں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے۔ جنت کی غذاؤں کے سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ پھلوں کا ذکر اس ہیئت کی بنا پر ہے کہ جو غذائیت کے سلسلہ میں پھلوں کو حاصل ہے۔ یہاں تک کہ انسانوں کو پھل کھانے والی مخلوق کہا جاتا ہے۔ پھلوں کا نقشہ اور ان کا اثر انسان کی خوشی اور شادابی کے سلسلہ میں نہ صرف علمی نقطہ نظر سے بلکہ عام تجربات کی روش سے بھی نمایاں ہے۔ باقی رہا کھجور کے درخت کا ذکر، اس کے پھل کی بجائے، تو ممکن ہے یہ اس لحاظ سے ہو کہ کھجور کا درخت اپنے پھل کے علاوہ بھی کئی حیثیتوں سے فائدہ مند ہے، جب کہ انار کا درخت ایسا نہیں ہے۔ کھجور کے پتوں سے مختلف قسم کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً فرش، ٹوپی، حمل و نقل کے مختلف ذرائع حتیٰ کہ اس سے سونے کے لیے چارپائی بھی بنائی جاتی ہے۔ اس کے پھلوں سے مختلف فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعض اجزاء بطور دوا کام آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے تنوں سے بعض مکانوں کے ستون کا کام لیا جاتا ہے۔ یا پھر انہیں کسی چھوٹی ٹنر کو عبور کرنے کے لیے پل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ جنت کے پھلوں میں سے صرف دو کا ذکر کیوں ہوا تو یہ ان دونوں کے تنوع کی وجہ سے۔ ان میں سے ایک، عام طور پر، گرم علاقوں میں اگتا ہے دوسرا سرد علاقوں میں۔ ایک میں قند و شکر کا مادہ ہے دوسرے میں تیزابی ایک مزاج و طبیعت کے اعتبار سے گرم ہے، دوسرا سرد ایک غذا ہے اور دوسرا پیاس کو دور کرتا ہے۔ کھجور میں موجود مواد حیاتی اور اس کے کئی دوائی کے جو موجودہ زمانے میں معلوم ہوئے ہیں ان کے بارے میں یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ کھجور میں تیرہ سے زیادہ حیاتیاتی مادہ اور پانچ قسم کے وٹامنز ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اور دوسرے خواص ہیں جن کے بارے میں ہم سورہ مریم کی آیت ۲۵ کے ذیل میں ایک قوت بخش غذا کے عنوان کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔

باقی رہا انار تو وہ بعض اسلامی روایات میں ”مسید الفاکھتہ“ یعنی بہترین پھل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ ماہرین جو غذا شناسی میں امتیاز خاص رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔ منجملہ دوسری خصوصیات کے انہوں نے کھجور میں خون صاف کرنے کی صلاحیت کا انکشاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں وٹامن (ش) کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ انار کے بارے میں بھی بہت سے فوائد کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ معدہ کو تقویت دیتا ہے، پڑانے زخم کو اچھا کرتا ہے، یرقان اور صفرا کے بخار کو دور کرتا، دفع خارش کے لیے مفید ہے، نظر کو تقویت دیتا ہے، مسوڑھوں کے لیے قوت بخش ہے اور اسہال کو ختم کرتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے :

اطعموا صبیانکم الرمان فانہ اسرع لشبابہم۔

اپنے بچوں کو انار کھلاؤ یہ ان کو جلد جوان کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے : (فانہ اسرع لالستہم)۔ انار کھانے سے بچے زیادہ جلدی بولنے لگتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

ما علی وجہ الارض ثمرة کانت احب الی رسول اللہ من الرمان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انار سے زیادہ رُوئے زمین کا کوئی پھل پسند نہیں تھا۔

- ۴۰۔ فِیْهِنَّ خَيْرٌ حَسَانٌ ۝
- ۴۱۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝
- ۴۲۔ حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِی الْخِيَامِ ۝
- ۴۳۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝
- ۴۴۔ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌ ۝
- ۴۵۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝
- ۴۶۔ مُتَّكِئِينَ عَلَى رَفْرَفٍ خُضِرٍ وَعَبَقَرٍ حَسَانٍ ۝
- ۴۷۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبْنَ ۝
- ۴۸۔ تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلْلِ وَالْإِكْرَامِ ۝

ترجمہ

- ۴۰۔ ان بہشت کے باغوں میں اچھے اخلاق والی خوبصورت عورتیں ہیں۔
- ۴۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے ؟
- ۴۲۔ ایسی عورتیں کہ جو جنت کے مستور خیموں میں ہیں۔
- ۴۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

- ۷۴ - ایسی عورتیں کہ جن سے کبھی پہلے کسی انسان یا جن نے ملاقات نہیں کی۔
- ۷۵ - پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے ؟
- ۷۶ - یہ اس حالت میں ہے کہ جتنی لوگ تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہیں جن پر بہترین اور خوبصورت ترین سبز رنگ کے فرش بچھائے گئے۔
- ۷۷ - پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟
- ۷۸ - بابرکت اور زوال نا آشنا ہے تیرے صاحب جلال و جمال پروردگار کا نام۔

تفسیر

جنت کی بیویوں کا دوسری مرتبہ تذکرہ

ان دونوں جنتوں کی نعمتوں کی تشریح کو جاری رکھتے ہوئے کہ جن کا ذکر سابقہ آیتوں میں ہوا ہے ان آیتوں میں بھی ان نعمتوں کے بار اور حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ان دونوں جنتوں میں بھی عورتیں ہیں جو اچھے اخلاق والی اور خوبصورت ہیں۔" (بعض خیرات حسان) ۱۰

ایسی عورتیں کہ جن میں حسن سیرت اور حسن صورت دونوں ہیں۔ اس لیے کہ "خیر" عام طور پر اچھی صفات اور معنوی خوبصورتی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور حسن زیادہ تر خوبصورتی یعنی جمال ظاہر کے لیے آتا ہے۔ ان روایتوں میں کہ جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں، جنت کی بیویوں کی بہت سی خوبیاں گنوانی گئی ہیں، جو دنیا کی عالی صفت عورتوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے تاکہ وہ تمام عورتوں کے لیے نمونہ بنیں۔ منجملہ دیگر خوبیوں کے ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خوش بیان ہیں۔ ان میں پاکیزگی ہے۔ وہ تکلیف نہیں پہنچاتیں، غیروں کی طرف نہیں دیکھتیں اور وغیرہ۔ خلاصہ کلام یہ کہ ان میں جمال و کمال کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک عمدہ بیوی میں ہونی چاہئیں۔ اور جو خوبیاں تمام عورتوں کے لیے لازم ہیں ان میں سے ہر ایک میں ہیں۔ اسی بنا پر قرآن مجید مختصر اور پرمعنی الفاظ میں انہیں "خیرات حسان" قرار دیتا ہے ۱۱۔

"فیہن" کی تفسیر جمع منوش ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان چاروں جنتوں کی طرف پلٹ رہی ہو کہ جن کا گزشتہ آیتوں میں تذکرہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخری دو جنتوں کی طرف مختلف قسم کے محل اور باغات کی بنا پر لوٹے اور یہ تفسیر زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس نے ان کے محلے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا ہے۔

"خیرات" کے بارے میں بعض نے کہا ہے کہ "خیرہ" (بروزن سیدہ) کی جمع ہے جسے تخفیف کی بنا پر "خیرات" پڑھا گیا ہے۔ بعض مفسرین اسے "خیرہ (بروزن جیرہ) کی جمع سمجھتے ہیں۔ ہر حال وہ وصف جمع رکھتا ہے ذکر افعال انفسا کے معنی کہ ان افعال کو جمع کر کے۔

اس نعمت کے تذکرہ کے بعد پھر اعادہ کرتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ (فبائی الاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد بہشت کی ان عورتوں کی تعریف و توصیف کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ ایسی خوریں ہیں جو جنت کے خیموں میں مستور ہیں۔" (حور مقصورات فی الخیام)۔ حور جمع ہے "حوراء" اور احور کی۔ اس کے معنی ہیں ایسی عورت جس کی آنکھ سیاہ ہو اور اس کا سفید صاف و شفاف رنگ ہو۔ یہ لفظ بعض اوقات ان عورتوں کے لیے بھی بولا گیا ہے جن کا چہرہ بالکل گورا ہو۔ "مقصورات" کی تعبیر اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ صرف اپنے شوہروں سے تعلق رکھتی ہیں اور دوسروں سے بالکل پوشیدہ ہیں۔ "خیام" خیمہ کی جمع ہے لیکن جیسا کہ مسلم روایات میں مندرج ہے جنت کے خیمے دنیا کے خیموں سے مشابہت نہیں رکھتے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین اور ارباب لغت کے نزدیک خیمہ صرف وہ نہیں ہے جو کپڑے سے بنا ہوا ہے جیسا کہ ہم لوگوں میں مشہور ہے بلکہ مکڑی سے بنے ہوئے گھروں کو بھی خیمہ کہتے ہیں۔ ہر مدد گھر کو خیمہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خیمہ ہر اس گھر کو کہتے ہیں جو اینٹ پتھر وغیرہ سے نہ بنا ہو۔

پھر اس پر معنی سوال کی تکرار کرتے ہوئے کہتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ (فبائی الاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد کی آیت میں جنت کی عورتوں کی تعریف کا ایک اور پہلو ہے۔ (لویطمثھن النسن قبلھم ولاجان)۔ البتہ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے وہ عورتیں اور مروجہ جن کی اس دنیا میں شادی ہوئی ہے اگر دونوں صاحبان ایمان اور جنتی ہوئے تو وہاں ایک دوسرے سے ملحق ہوں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہترین حالت اور کیفیت میں زندگی بسر کریں گے۔

روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں کا مرتبہ جنت کی عورتوں سے زیادہ ہو گا۔ "ان اعمال صالح اور عبادتوں کی بنا پر جو دنیا میں انہوں نے انجام دیے ہیں۔ اس کے بعد پھر فرماتا ہے: "تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔" (فبائی الاء ربکما تکذبان)۔

جنت کی عورتوں کی آفریں توصیف جو ان آیتوں میں ہے وہ یہ ہے کہ: "اس بہشت کے رہنے والے اس حالت میں ہیں کہ تخت اور پلنگ پر تکیے لگائے ہوئے ہیں جن پر سبز رنگ کے پارچوں کا بہترین فرش بچھایا گیا ہے۔" (متکین علی رفرف خضر و عبقری حسان)۔ "رفرف" دراصل درختوں کے بڑے اور چوڑے پتوں کے معنی میں ہے اور اس کے بعد رنگ برنگ کے ان خوبصورت پارچوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو باغات کے منظر سے مشابہت رکھتے ہیں۔

عبقری اصل میں ہر بے نظیر شے کے لیے ہے یا ایسی چیز جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ اسی لیے ایسے علماء اور دانشوروں کو جو

۱۔ "لسان العرب"، "مجمع البحرین" اور "المعجم"۔

۲۔ "طہ" کے معنی کے سلسلہ میں اسی سورہ کی آیت ۵۶ کے ذیل میں کافی وضاحت ہو چکی ہے۔

۳۔ (رعد ۲۳ - مومن ۸)۔

۴۔ "دور المنثور" ص ۵۱

۵۔ بعض مفسرین نے یہاں نوشیرواں کے نگارستان کے مشہور فرش کا بطور مثال تذکرہ کیا ہے۔ وہی فرش تھا کہ جو حد سے زیادہ بیش قیمت تھا اور ایک باغ کے منظر کو پیش کرتا تھا۔

ناور الوجود ہوں ”عباقرة“ کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ لفظ عبقر ابتدا میں ایک نام تھا جسے عربوں نے یوں کے شہر کے لیے منتخب کیا تھا اور چونکہ یہ شہر ایسا تھا جسے کسی نے دیکھا نہ تھا اور اپنے ساتھ ایک ندرت کا تصور رکھتا تھا لہذا وہ ہر بے مثل چیز کو اس سے منسوب کرتے ہیں اور عبقری کہتے ہیں۔ بعض کا یہ قول ہے کہ عبقر ایک شہر ہے جس میں ریشم کے بہترین پارچے تیار کیے جاتے ہیں۔

بہر حال اس کی اصل عملی طور پر متروک ہو چکی ہے اور عبقری ایک مستقل لفظ کی شکل میں ناور الوجود یا عزیز الوجود کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ مفرد ہے کبھی کبھی جمع کے معنوں میں بھی آتا ہے (مثلاً زیر بحث آیت) ”حسان“ جمع ”حسن“ (بروزن چین) کے معنی اچھے اور خوبصورت کے ہیں۔ بہر حال یہ سب تعبیریں اس چیز کو بیان کرتی ہیں کہ جنت کی تمام چیزیں ممتاز ہیں۔ اس کے پھل کھانے محل اور فرش، قصہ مختصر یہ کہ اس کی ہر شے اپنی نوع کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ الفاظ بھی ان نظیر مضامین کو اپنے اندر نہیں سمیٹ سکتے۔ یہ ہمارے ذہن میں ان کا ایک ہلکا سا نقشہ بناتے ہیں۔ اس کے بعد آخری مرتبہ اور اکتیسویں مرتبہ جن و انس کے تمام افراد سے سوال کرتا ہے: ”تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟“ (فہای الامور بکما تکذبان) تم معنوی نعمتوں کے منکر ہو یا مادی نعمتوں کے؟ اس جہان کی نعمتوں کے منکر ہو یا جنتوں کی نعمتوں کے منکر ہو؟ وہ نعمتیں کہ جنہوں نے تمہارے وجود کا احاطہ کر رکھا ہے اور تم ان میں مستغرق ہو اور کبھی غرور و غفلت کی بنا پر ان سب کو فراموش کر دیتے ہو اور ان سب نعمتوں کو بخشنے والے اور آئندہ جس کی نعمتوں کے منتظر ہو تم اس کی کون سی نعمتوں کا انکار کرتے ہو۔ اس سورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: ”با برکت اور زوال ناپذیر ہے تیرے پروردگار کا نام کہ جو صاحب جلال و اکرام ہے“ (تبارک اسمہ ربک ذی الجلال والاکرام)۔ ”تبارک“ ”برک“ (بروزن درک) کی اصل سے ہے اور اونٹ کے سینے کے معنی میں ہے۔ اونٹ جب کسی جگہ بیٹھ جاتے ہیں تو اپنا سینہ زمین کے ساتھ چمٹا لیتے ہیں اس بنا پر یہ لفظ ثابت قدم رہنے اور پائیدار ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز زوال ناپذیر ہونے کی صورت میں چونکہ سرمائے سے بہت فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس لیے مفید چیز کو مبارک کہا جاتا ہے اور ان معانی کی سب سے زیادہ مستحق جو ذات ہے وہ خدا ہے پاک ہے جو تمام برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ اس سورہ میں چونکہ پروردگار عالم کی انواع و اقسام کی نعمتوں کا ذکر ہے ایسی نعمتیں جو زمین و آسمان میں نوع بشر کی خلقت اور دنیا و آخرت سے تعلق رکھتی ہیں اور پروردگار عالم کے بابرکت وجود سے ان کا فیضان جاری ہے لہذا مناسب ترین تعبیر وہی ہے کہ جو اس آیت میں آئی ہے کیونکہ اسم سے یہاں مراد پروردگار عالم کے اوصاف ہیں، بالخصوص صفت رحمانیت کہ جو ان تمام برکتوں کا منشا ہے۔ بالفاظ دیگر خدا کے افعال کا سرچشمہ اس کی صفات ہیں۔ اگر عالم ہستی کو اس نے ایک نظام کے تحت پیدا کیا ہے اور ہر چیز میں ایک میزان رکھی ہے تو یہ اس کی حکمت کا ایک تقاضا ہے، اور اگر قانون عدالت کو ہر چیز میں جاری و ساری کیا تو یہ اس کے علم و عدل کا تقاضا ہے، اور اگر وہ مجرموں کو مختلف قسم کی سزائیں دیتا ہے اور ان پر عذاب نازل کرتا ہے تو اس کے منتقم ہونے کا یہی اقتضا ہے، اور اگر صالحین کو اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں انواع و اقسام کی معنوی اور مادی نعمتوں سے بہرہ ور فرماتا ہے تو یہ اس کے فضل و کرم اور رحمت واسعہ کا ایک تقاضا ہے۔ اس بنا پر اس کا اسم اس کی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی صفات عین ذات ہیں۔ ذی الجلال والاکرام کے الفاظ اس کی تمام صفات جلال و جمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ (ذی الجلال سے صفات سلبیہ کی طرف اشارہ والا کرام

سے صفات ثبوتیہ کی طرف اشارہ ہے۔ پرکشش بات یہ ہے کہ یہ سورہ خدا کے نام یعنی لفظ رحمن سے شروع ہوا ہے اور ذی الجلال والاكرام پر ختم ہو رہا ہے اور یہ دونوں (آغاز و انجام) سورہ کے تمام مضامین کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

چند نکات

۱۔ اس سورہ کی آیت ۲۷ میں دنیا کی مختلف مادی اور معنوی نعمتوں کے ذکر کے بعد فرماتا ہے: (و یبقی وجہ ربك ذوالجلال والاكرام) اور سورہ کے آخر میں انواع و اقسام کی ہستی نعمتوں کے بعد فرماتا ہے: (تبارك اسوربك ذی الجلال والاكرام) یہ دونوں جملے اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ تمام خطوط اس کی ذات پاک پر جا کر ختم ہوتے ہیں اور جو کچھ ہے اس کی ہی طرف سے ہے۔ دنیا بھی اسی کی طرف سے ہے اور عقبی بھی اسی کی طرف سے ہے اور اس کے حلال و حرام نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔

۲۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے دُعا کر رہا تھا اور کہتا تھا یا ذا الجلال والاكرام "وہ خدا جو صاحب جلال و اکرام ہے" پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (قد استجیب لك فاسئل) اب جبکہ خدا کو تُو نے اس نام سے پکارا ہے تو تیری دُعا مستجاب ہے جو کچھ چاہتا ہے اس سے سوال کر۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرد کو دیکھا کہ نماز میں مشغول ہے اس نے رکوع و سجود و تشہد کے بعد دُعا میں اس طرح کہا: اللہم انی اسئلك بان لك الحمد لا الہ الا انت وحدك لا شریك لك المنان بديع السماوات والارض یا ذا الجلال والاكرام یا حی یا قیوم انی اسئلك تو پیغمبر اسلام نے فرمایا: لقد دعا اللہ باسمه العظیم الذی اذا دعی به اجاب و اذا سئل به اعطى "اس شخص نے خدا کو اس کا عظیم نام لے کر پکارا ہے۔ جب اس نام سے اس کو پکارا جائے اور دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے اور اگر اس کے ذریعے وہ سوال کریں تو عطا کرتا ہے۔"

۳۔ ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے آیہ تبارك اسوربك ذی الجلال والاكرام کی تفسیر میں فرمایا: نحن جلال اللہ و کرامتہ التی اکرم اللہ العباد بطاعتنا۔ ہم اللہ کا جلال اور اس کی کرامت ہیں کہ جس نے بندوں کو ہماری اطاعت کی عزت بخشی ہے۔

یہ امر واضح رہے کہ اہلبیت پیغمبر خداؐ کے علاوہ کسی اور کی طرف رہنمائی نہیں فرماتے تھے اور سوائے اس کی اطاعت کے کسی اور چیز کی طرف نہیں بلاتے تھے وہ ہادیان راہ ہیں اور زندگی کے اس متلاطم سمندر میں نجات کی کشتیاں ہیں۔ اس بنا پر خدا کے جلال و اکرام کا ایک مصداق شمار ہوتے ہیں کیونکہ خدا اپنے اولیاء کے ذریعے بندوں کو نعمت ہدایت عطا فرماتا ہے۔

۴۔ بعض علمائے نقل کیا ہے کہ قرآن مجید کا پہلا حصہ جو مکہ میں قریش کے سامنے پڑھا گیا ہے وہ اسی سورہ رحمن کی ابتدائی آیات

۱۔ تفسیر "در المنثور" جلد ۶ ص ۱۵۳

۲۔ تفسیر "در المنثور" ج ۶ ص ۱۵۳

۳۔ تفسیر برہان ج ۴ ص ۲۷۶

تھیں۔ عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ جمع ہوئے اور کہا کہ ابھی تک قریش نے قرآن کا کوئی حصہ نہیں سنا تو ہم میں سے کون شخص ہے کہ جو ان کے سامنے کھلم کھلا قرآن پڑھے میں نے کہا کہ وہ شخص میں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں خوف ہے کہ وہ تجھے ایذا پہنچائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسا شخص یہ کام اپنے ذمہ لے کہ جس کا قبیلہ طاقتور ہو کہ جو اس کا دفاع کر سکے۔ میں نے کہا کہ مجھے میری حالت پر چھوڑ دیں خدا میرا دفاع کرے گا اور مجھے بچائے گا۔ دوسرے دن ابن مسعود دوپہر کے وقت مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہوئے۔ اُس وقت وہاں قریش اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا: **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** علم القرآن ... وہ اسی طرح پڑھتے رہے قریش خاموشی سے سنتے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے یہ فضول شخص کیا کتاب ہے تو اُن میں سے بعض نے کہا کہ یہ ان باتوں کے کچھ حصے بیان کر رہا ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لایا ہے۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ابن مسعود کے منہ پر تھپڑ مارنے لگے لیکن ابن مسعود نے اس سورہ کی تلاوت اسی طرح جاری رکھی اور اُسے اتنا پڑھا جتنا کہ خدا نے چاہا۔ اس کے بعد ابن مسعود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف لوٹ آئے۔ ان کے چہرہ پر زخموں کے نشان نمایاں تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے کہا کہ ہمیں تو اس چیز کا تیرے بارے میں پہلے ہی سے خوف تھا۔ ابن مسعود نے کہا: مجھے معلوم نہ تھا کہ دشمنانِ خدا اتنے گھٹیا نکلیں گے۔ اگر تم لوگ کہو تو میں کل بھی اس کام کو جاری رکھوں۔ اب مجھے کسی قسم کا خوف لاحق نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں اتنا ہی کافی ہے جو ان کی مرضی کے بغیر تو نے ان کے سامنے پڑھا۔

اسی بنا پر ابن مسعود پہلے شخص شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے مشرکین مکہ کے سامنے کھلم کھلا قرآن پڑھا۔ خداوند! **تُؤْذُو الْجَلَالَ وَالْاَكْرَامَ** ہے۔ تجھے تیرے جلال و اکرام کی قسم ہمیں بہشت کی نعمتوں سے محروم نہ رکھو۔ پُروردگار! تیری رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگرچہ ہم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو تیری رحمت کے شایانِ شان ہو پھر بھی تو ہمارے ساتھ وہ سلوک کر جو تیرے مقامِ رحمت کے شایانِ شان ہے۔

بارالہا! ہم تیری کسی نعمت کی کبھی تکذیب نہیں کرتے اور اپنے آپ کو تیرے احسان میں ہمیشہ محصور و مستغرق جانتے ہیں۔ ہمیں ان نعمتوں سے ہمیشہ بہرہ ور فرما۔ آمین یا رب العالمین!

۸ / ج ۱ / ۱۴۰۶ ہجری قمری

۲۹ / ۱۰ / ۱۳۶۴ شمسی

ترجمہ کا اختتام

۱۰ شوال ۱۴۰۷ھ ، ۷ جون ۱۹۸۷ء

قم بر مکان حقیر محل سلطان محمد شریف

کوئے جیشیدی بلاک

سُورَةُ وَقَعَةٍ

❖ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۹۶ آیتیں ہیں ۔

تاریخ آغاز

21.4/12/18

۲۹/۱۰/۱۳۶۴ ش

سُورہ واقعہ کے مضامین

”تاریخ القرآن“ میں ابن ندیم سے منقول ہے کہ سُورہ ”واقعہ“ چوالیسواں سُورہ ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔

اس سے پہلے سُورہ طہ اور اس کے بعد سورہ شعرا نازل ہوا۔ یہ سُورہ جیسا کہ اس کے لب و لہجے سے واضح ہے اور مفسرین نے بھی تصریح کی ہے، مکہ میں نازل ہوا۔ اگرچہ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی آیت ۸۲، ۸۱ مدینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن اس کے ثبوت کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور مذکورہ بالا آیتوں میں اس دعویٰ کی کوئی علامت بھی نہیں ہے۔ سُورہ واقعہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، قیامت اور اس کی خصوصیات کے مضامین پر مشتمل ہے اور یہ مسئلہ اس سُورہ کی ۹۶ آیتوں کا بنیادی موضوع ہے لیکن، ایک لحاظ سے اس سُورہ کے مضامین کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

- ۱۔ ظہور قیامت کا آغاز اور اس سے ملحق سخت و دشت ناک حوادث۔
- ۲۔ اس دن انسانوں کی اصحاب الیمین، اصحاب الشمال اور مقرئین میں تقسیم۔
- ۳۔ مقاماتِ مقربین کے بارے میں ایک تفصیلی بحث اور جنت میں انواع و اقسام کے ثواب اور سزائیں۔
- ۴۔ پہلے گروہ یعنی اصحاب الیمین کے بارے میں تفصیلی بحث اور انواع و اقسام کی الٰہی نعمتیں۔
- ۵۔ مسئلہ معاد کے سلسلہ میں مختلف دلائل کا بیان، خدا کی قدرت اور انسان کی حقیر و ناچیز نطفہ سے خلقت، نباتات میں تجلی حیات، نزول بارش اور آگ کا روشن ہونا کہ یہ سب توحید کی علامتوں کے ذیل میں آتا ہے۔
- ۶۔ اصحاب الشمال کے بارے میں قابلِ توجہ بحث اور دوزخ میں ان کی دردناک سزائیں۔
- ۷۔ حالتِ احتضار کی تصویر کشی اور اس دُنیا سے دُوسری دنیا کی طرف انتقال کہ جو قیامت کے مقدمات میں سے ہے۔
- ۸۔ مومنین کی جزا و ثواب اور کفار کے عذاب پر ایک اجمالی نظر۔ آخر میں سُورہ پروردگار کے عظیم نام پر ختم ہو جاتا ہے۔

اس سوره کی تلاوت کی فضیلت :

اس سوره کی تلاوت کے بارے میں اسلامی کتابوں میں بہت سی روایات موجود ہیں۔ ان حدیثوں میں سے ایک حدیث رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے : **من قرأ سورة الواقعة كتب لیس من الغافلین**۔ جو شخص سورہ واقعہ کی تلاوت کرے گا تو اس کے بارے میں کھا جائے گا کہ یہ غافلین میں سے نہیں ہے۔^۱

اس سوره کی آیتیں اس قدر دل ہلا دینے والی اور چوکا دینے والی ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد پھر انسان کے لیے غفلت کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ بنا پر پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک اور حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ جس وقت پیغمبر اسلام سے یہ سوال ہوا کہ آپ کے چہرہ مبارک پر بڑھاپے کے آثار اس قدر جلد کیوں نمایاں ہو گئے تو آپ نے جواب میں فرمایا : **شیتتی ہود ، والواقعة والمرسلات وعم يتساءلون**۔ ”سورہ ہود ، واقعہ ، المرسلات اور عم يتساءلون نے مجھے بوڑھا کر دیا۔“ کیونکہ ان سورتوں میں قیامت کے دل ہلا دینے والے واقعات ہولناک حادثوں اور پھر مومنوں کی سزاؤں کا بیان ہے۔ اس طرح گزشتہ قوموں کے لرزہ براندام کر دینے والے واقعات اور وہ مصیبتیں اور بلائیں ہیں کہ جو ان پر نازل ہوئیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک اور حدیث میں ہے کہ : **من قرأ فكل ليلة جمعة الواقعة احبه الله وحببه الى الناس اجمعين ولعير في الدنيا بؤساً ابداً ولا فقراً ولا فاقة ولا أفة من أفات الدنيا وكان من رفقاء امير المؤمنين**۔ ”جو شخص ہر شب جمعہ سورہ واقعہ کی تلاوت کرے تو خدا اس کو دوست رکھتا ہے اور اُسے لوگوں کا محبوب بنا دیتا ہے اور وہ دنیا میں ہرگز نارا ضی اور تکلیف نہیں دیکھتا اور فقر و فاقہ و آفات دنیا میں سے کوئی آفت اس پر نہیں آئے گی اور وہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے رفقا میں شمار ہوگا۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ عثمان ابن عفانؓ عبداللہ ابن مسعودؓ کی عیادت کے لیے گئے ، اس بیماری میں کہ جس میں عبداللہ ابن مسعودؓ کا انتقال ہوا تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ تم کس بات پر پریشان ہو۔ انہوں نے کہا کہ اپنے گناہوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔ انہوں نے کہا تمہارا دل کیا چاہتا ہے ؟ عبداللہ ابن مسعودؓ نے جواب میں کہا کہ اللہ کی رحمت۔ عثمانؓ نے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں تمہارے علاج کے لیے طبیب لے آؤں۔ وہ کہنے لگے مجھے طبیب ہی نے بیمار کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ اگر تمہارا دل چاہے تو میں حکم دوں کہ تمہارا عطیہ بیت المال سے لے آئیں۔ انہوں نے کہا کہ اس کی جس وقت مجھے ضرورت تھی اس وقت تم نے وہ مجھے نہیں دیا۔ آج جب کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے تو تم مجھے دیتے ہو۔ حضرت عثمانؓ کہنے لگے اگر وہ رقم تمہاری بیٹیوں کے کام آئے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ انہوں نے کہا کہ میری لڑکیوں کو بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے انہیں نصیحت کی ہے کہ سورہ واقعہ پڑھا کریں۔

پس نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ :

۱۔ تفسیر ”مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۲۱۲ ، تفسیر ”برہان“ جلد ۴ ص ۲۷۳

۲۔ خصال صدوق باب الاربعہ حدیث ۱۰

۳۔ ”ثواب الاعمال“ مطابق نقل ”نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۲۰۳

”من قرأ سورة الواقعة كل ليلة لم تصبه فاقة ابداً“
 ”جو شخص رات کو سورہ واقعہ پڑھے تو وہ کبھی بھی افلاس کا شکار نہیں ہوگا۔“

اسی بنا پر سورہ واقعہ کو ایک روایت میں سورہ غنی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔
 یہ امر بخوبی واضح ہے کہ صرف زبان سے ادا کر لینے سے یہ تمام برکتیں حاصل نہیں کی جاسکتیں بلکہ ضروری ہے کہ تلاوت کے ساتھ ساتھ تفکر ہو اور تفکر کے ساتھ عمل بھی ہو۔

www.sirat-e-mustaqeem.ir

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

- ۱- إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝
- ۲- لَيْسَ لَوْقَعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝
- ۳- خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝
- ۴- إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا ۝
- ۵- وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝
- ۶- فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًّا ۝
- ۷- وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً ۝
- ۸- فَأَصْحَبُ الْمِئْنَةِ ۝ مَا أَصْحَبُ الْمِئْنَةِ ۝
- ۹- وَأَصْحَبُ الشُّعْمَةِ ۝ مَا أَصْحَبُ الشُّعْمَةِ ۝
- ۱۰- وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۝
- ۱۱- أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ۝
- ۱۲- فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝

۱۳۔ شَلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۝
۱۴۔ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ۝

ترجمہ شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱۔ جس وقت قیامت کا عظیم واقعہ ہوگا۔
- ۲۔ تو کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکے گا۔
- ۳۔ ایک گروہ کو نیچے لے جائیں گے دوسرے کو اوپر لائیں گے۔
- ۴۔ یہ اس وقت ہوگا کہ جب زمین میں شدید زلزلہ آئے گا۔
- ۵۔ اور پہاڑ درہم و برہم ہوں گے۔
- ۶۔ اور غبار کی شکل میں بکھر جائیں گے۔
- ۷۔ اور تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔
- ۸۔ پہلا گروہ اصحابِ میمنہ، اور اصحابِ میمنہ کیا ہیں۔
- ۹۔ دوسرا گروہ اصحابِ شوم ہیں اور اصحابِ شوم کیا ہیں۔
- ۱۰۔ اور تیسرا گروہ وہ ہے جو سبقت کرنے والے اور پیش قدمی کرنے والے ہیں۔
- ۱۱۔ وہی مقرب ہیں۔
- ۱۲۔ جو بہشت کے پُر نعمت باغوں میں رہتے ہیں۔
- ۱۳۔ بہت سے گروہ پہلی اُمتوں میں سے ہیں۔
- ۱۴۔ اور تھوڑے آخری اُمت میں سے۔

تفسیر عظیم واقعہ

قیامت سے ربط رکھنے والے مسائل قرآن مجید میں عام طور پر عظیم انقلاب برپا کرنے والے اور سرکوبی کرنے والے حادثات کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور یہ قرآن کی ان بہت سی صورتوں میں نظر آتے ہیں جو قیامت کے متعلق بحث کرتی ہیں۔ اس سورہ واقعہ میں، جس کا مرکزی خیال معاد ہے اس کی ابتدائی آیات میں یہی واضح نظر آتا ہے۔ پروردگار عالم آغاز ہی میں فرماتا ہے: ”جس وقت قیامت کا عظیم واقعہ رونما ہوگا“ (اذا وقعت الواقعة)۔

کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ (لیس لوقعتها کاذبہ)۔ کیونکہ اس کے رونما ہونے سے پہلے کے حوادث اس قدر شدید اور ہولناک ہوں گے کہ ان کے اثرات دنیا کے فترہ فترہ پر نمایاں ہوں گے۔ ”واقعہ“ اجمالی طور پر قیامت کے برپا ہونے اور مردوں کے قبروں سے اٹھنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور چونکہ اس کا واقع ہونا قطعی اور یقینی ہے اس لیے اسے واقعہ سے تعبیر کیا گیا ہے یہاں تک کہ بعض مفسرین نے ”واقعہ“ کو قیامت کے ناموں میں سے ایک نام بتایا ہے۔ ”کاذبہ“ کے لفظ کو بعض مفسرین نے یہاں مصدری معنوں میں لیا ہے جو کہ اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا وقوع اس طرح ظاہر اور آشکار ہوگا کہ کسی قسم کی تکذیب اور اختلاف کی گنجائش نہیں ہوگی۔ بعض مفسرین نے اس کی اس کے ظاہری معنوں کے ساتھ تفسیر کی ہے اس اعتبار سے کہ یہ اسم فاعل ہے، اور کہا ہے کہ قیامت کے وقوع کے سامنے کوئی تکذیب کرنے والا موجود نہیں ہوگا۔

بہر حال قیامت نہ صرف یہ کہ کائنات کی تباہی کے ساتھ لازم ہے بلکہ اس کے نتیجے میں انسان بھی درہم و درہم ہو جائیں گے جیسا کہ بعد کی آیتوں میں پروردگار عالم فرماتا ہے: ”ایک گروہ کو نیچے لے جائیں گے اور دوسرے کو اوپر لے آئیں گے“ (خافضۃ رافعة)۔ ”تکبر کرنے والے، اکڑنے والے اور صدر نشین ظالم نیچے گرا دیے جائیں گے اور کمزور مومن اور نیک افراد اوج افتخار پر متمکن ہوں گے۔ خواہ مخواہ بنے ہوئے عزت دار ذلیل ہوں گے اور بلا وجہ محروم کیے گئے افراد عزیز ہوں گے۔ ایک گروہ قعر جہنم میں گرے گا۔ دوسرا گروہ بہشت کے اعلیٰ علیین میں قیام پذیر ہوگا۔ اور یہ خدائی عظیم و وسیع انقلاب کی خصوصیت ہے۔ اسی لیے امام زین العابدینؑ سے منسوب ایک روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا: ”خافضۃ خففت واللہ باعداء اللہ“

۱۔ ”اذا“ ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا ناصب لفظ ”لیس“ ہے کہ جو دوسری آیت میں آیا ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں۔ ”یوم الجمعة لیس لی شغل“ جمع کے دن میرا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس کا ناصب ”اذکر“ مقدر ہو یا کان کذا وکذا کا جملہ (کشاف زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔ لیکن پہلا احتمال سب سے زیادہ مناسب ہے۔

۲۔ ضمیر کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ تقدیر عبارت میں ”نفس کاذبہ“ یا ”قضية کاذبہ“ ہے (ضمنی طور پر ”لوقعتها“ کے لام کو بعض مفسرین نے توفیت سمجھا ہے)۔

۳۔ ”خافضۃ رافعة“ مبتدلے مضاف کی خبر ہے اور اصل میں ہی خافضۃ رافعة تھا۔

فی الناس، "رافعة" زفعت واللہ اولیاء اللہ المجتہ "قیامت خافضہ ہے کیونکہ خدا کی قسم وہ دشمنانِ خدا کو جہنم کی آگ میں گر دے گی اور رافعہ خدا کی قسم اولیاء اللہ کو بہشت میں لے جائے گی۔

اس کے بعد اسی سلسلہ میں توصیف کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: "یہ اس وقت ہوگا کہ جس وقت زمین شدت کے ساتھ لرزے لگے گی؟ (اذا سرجت الارض رجًا)۔ یہ زلزلہ اس قدر عظیم و شدید ہوگا کہ پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ (ولست الجبال بسًا)۔ اور غبار کی شکل میں بکھر جائیں گے۔ (فكانت هباءً منبثًا)۔ "رجت" کا مادہ "رج" (بروزن ج) ہے جس کے معنی شدید حرکت کرنے کے ہیں اور اضطراب کو "رجرجة" کہا جاتا ہے۔ "بست" کا مادہ "بس" ہے اور دراصل آٹے کو بانی سے نرم کرنے کے معنی میں ہے۔ "هباء" غبار کے معنی میں ہے اور "منبثا" پر لگندہ اور منتشر کے معنوں میں ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "هباء" بہت ہی چھوٹا غبار ہے جو فضا میں معلق ہو اور عام حالات میں نظر نہ آتا ہو مگر اس وقت کہ جب طوفان کی روشنی کسی سوراخ کے ذریعے اندھیرے کی جگہ داخل ہو جائے۔ اب سوچنا چاہیے کہ وہ زلزلہ کس حد تک سنگین ہوگا جو ایسے بڑے بڑے پہاڑوں کو جو اپنے استحکام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں اس طرح بتر بتر کر دے گا کہ وہ پکھرے ہوئے غبار میں بدل جائیں گے اور جو آواز اس عظیم دھماکے کی وجہ سے بلند ہوگی وہ اس سے بھی زیادہ وحشت ناک ہوگی۔ بہر حال قرآنی آیات میں قیامت کے قریب پہاڑوں کی وضع اور ان کی کیفیت کے بارے میں طرح طرح کی تعبیریں بیان ہوئی ہیں جو حقیقت میں پہاڑوں کے مختلف مرحلوں میں بہت بھیانک انداز میں پھٹنے کی خبر دیتی ہیں۔ پروردگار عالم کبھی فرماتا ہے: "پہاڑ حرکت میں آجائیں گے" (وتسیر الجبال سیرًا طور - ۱۰) اور کبھی فرماتا ہے: "پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھاڑ دیے جائیں گے" (واذا الجبال نسفت) (مرسلات ۱۰) اور کبھی فرماتا ہے: "انہیں اٹھا دیا جائے گا اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے" (فدکتا دکتہ واحدة) (حاقہ - ۱۴)۔ اور کبھی فرماتا ہے: "ریت کے تہہ بہ تہہ ٹیلوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ (وكانت الجبال کثیبا مہیلا) (مزل - ۱۴)۔ کبھی فرماتا ہے: "وہ غبار کی شکل میں پر لگندہ ہو جائیں گے" (زیر بحث آیت) اور آخر میں فرماتا ہے "دھلکی ہوئی ٹوٹی کی طرح ایسے فضا میں پکھر جائیں گے کہ صرف ان کا رنگ نظر آئے گا" (وتكون الجبال کالعهن المنفوش) (قارہ - ۵)

ہاں البتہ خدا کے علاوہ کوئی پورے طور پر نہیں جانتا کہ ان حادثوں کا کون سا راستہ ہے اور یہ بات ایسی نہیں ہے کہ جو ہمارے الفاظ کے سانچے میں ڈھل سکے۔ لیکن یہ تمام پُر معنی اشارے اس دھماکے کی عظمت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس عظیم واقعہ یعنی قیامت کے وقوع کے بیان کے بعد اس دن لوگوں کی جو حالت ہوگی اس کو پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے قرآن انہیں تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور پھر فرماتا ہے: "اس روز تم تین گروہ ہو جاؤ گے" (وکنتم اوزاجا ثلاثہ)۔ ہمیں معلوم ہے کہ لفظ "زوج" مذکر و مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ ان معاملات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو باہم قریب ہوں؛ چونکہ آدمیوں کی مختلف صنفیں قیامت میں ایک دوسرے کے قریب ہوں گی۔ لہذا ان کے لیے ازدواج استعمال ہوا ہے۔ پہلے گروہ کے بارے میں فرماتا ہے: "پہلے اصحابِ مینہ" ہیں، کیا ہیں اصحابِ مینہ؟ (فاصحاب المینۃ ما اصحاب المینۃ)۔

۱۔ خصال مطابق نقل نوراشتہ جلد ۵، ص ۲۰۴
۲۔ اپنی ترکیب کے اعتبار سے اس جملہ میں کئی احتمال ہیں جن میں سب سے مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے۔ "اصحاب المینہ" مبتلا ہے اور "ما" استفہامیہ و مؤخر مبتدأ اور اصحاب المینہ اس کی خبر ہے اور مجموعہ یہ دونوں پہلے مبتدا کی خبر ہیں اور "فا" جملے کے آغاز میں تفسیر کے عنوان کی حیثیت سے ہے۔

اصحابِ میمنہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نامہ اعمال ان کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور یہ صورت حال قیامت میں نیکو کار، اہل نجات مومنین کی نشانی ہوگی۔ چنانچہ آیاتِ قرآنی میں اس طرف بار بار اشارہ ہوا ہے۔ یا پھر یہ کہ ”میمنہ“ ”یمن“ سے مشتق ہے جس کے معنی سعادت اور خوش بختی کے ہیں۔ اس اعتبار سے پہلا گروہ سعادت مند اور خوش قسمت افراد کا ہے۔ اس کے بعد والی آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن میں دوسرے گروہ کو ”اصحابِ المشئمة“ (شوم سے مشتق) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ آخری تفسیر ہی مناسب ہے۔

”ما اصحابِ المیمنة“ کیا کہنے اس خوش قسمت گروہ کے ”یہ تعبیر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ ان لوگوں کی خوش قسمتی کی کوئی انتہا نہیں ہے اور یہ بہترین تعریف ہے جو اس گروہ سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص انسان ہے اور انسان بھی کیسا۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اصحابِ شوم اور کیا ہیں اصحابِ شوم“ (واصحابِ المشئمة ما اصحابِ المشئمة)۔ بدبخت، بے چارہ اور بے نوا گروہ، ایسے لوگ جن کا نامہ اعمال ان کے اٹے ہاتھ میں دیا جائے گا جو ان کی بدبختی اور ان کے جرم کی بجائے خود نشانی ہوگا۔ ما اصحابِ المشئمة کی تعبیر یہاں بھی ان کی بدبختی اور شقاوت کو ظاہر کرتی ہے۔ آخر میں تیسرے گروہ کی اس طرح تعریف کرتا ہے ”اور سبقت کرنے والے سابقین“ (والتابعون السابقون)۔ وہی مقرب ہیں۔ (اولئک المقربون)۔ ”سابقون“ وہ لوگ ہیں جو نہ صرف ایمان میں پیش قدمی کرتے ہیں بلکہ انسانی صفاتِ اخلاق میں بھی سبقت کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے نمونہ ہیں اور مخلوق کے لیے امام و پیشوا ہیں اور اسی وجہ سے خدا نے بزرگ و برتر کے مقربین بارگاہ ہیں۔ اس بنا پر اگر بعض مفسرین نے ان کے سابق ہونے کو اطاعتِ خداوندی یا پنجگانہ نماز یا جہاد یا ہجرت یا توبہ سے متعلق کیا ہے تو ہر ایک نے اس وسیع مفہوم کے صرف ایک گوشہ کی طرف توجہ کی ہے ورنہ یہ لفظ دوسری نیکیوں اور برکتوں کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور پھر اسلامی روایات میں اگر کبھی ”السابقون“ کا مصداق ان چار افراد کو قرار دیا گیا ہے یعنی اول بابیل دوسرے مومن آلِ فرعون، تیسرے حبیبِ نجا کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی امت کے مقابلے میں پیش قدمی کی ہے اور چوتھے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام جو مردوں میں سب سے پہلے صاحبِ ایمان تھے۔ یہ ایک واضح اور صحیح مصداق کی نشان دہی ہے اور مصداقِ آیت کو بخود کرنے کے معنی میں نہیں ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا کہ: اتدرون من السابقون الى خلق الله يوم القيامة ”کیا تم

۱۔ اگرچہ بعد والی آیت میں اصحابِ المشئمة کی جگہ اصحابِ الشمال آیا ہے۔

۲۔ اس آیت کی اور اس کے بعد والی آیت کی ترکیب کے بارے میں بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ پہلا ”السابقون“ مبتدا ہے اور دوسرا اس کی صفت یا تاکید ہے اور ”اولئک المقربون“ مبتدا اور خبر ہو کر مجموعہ خبر ہے۔ السابقون اول کی۔ بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ ”السابقون السابقون“ مبتدا و خبر ہیں۔ ”ابوالنجم“ کے مشہور شعر کی طرح جس میں وہ کہتا ہے: (انا ابوالنجم وشعری شعری) ”میں ابوالنجم ہوں اور میرا شعر صرف میرا ہی شعر ہے“ یہ واقعی ایک عالی تعریف و توصیف ہے۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ پہلے السابقون کے معنی ہیں ایمان میں سبقت کرنے والے اور دوسرے السابقون کے معنی ہیں جنت کی طرف سبقت کرنے والے۔ اس صورت میں بھی یہ مبتدا و خبر ہی ہوں گے۔

۳۔ یہی معنی ایک حدیث میں امام محمد باقر سے منقول ہیں۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۱۵۔

جانتے ہو کہ قیامت میں نطفہ پروردگار کے سایہ میں کون لوگ ہوں گے اصحاب نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول زیادہ آگاہ ہیں تو آپ نے فرمایا:

الذین اذا اعطوا الحق قبلوه واذا سألوه بذلوه وحكموا للناس كحكمهم لا يفتخروا۔

”وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انہیں حق دیا جائے تو اسے قبول کر لیتے ہیں اور جب ان سے حق کا سوال کیا جائے تو وہ اسے مسائل تک پہنچا دیتے ہیں۔ لوگوں کے بارے میں اسی طرح حکم کرتے ہیں جس طرح اپنے بارے میں حکم کرتے ہیں۔“

بعض روایتوں میں السابقون کا مفہوم مرسل وغیر مرسل پیغمبر بتایا گیا ہے۔

ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے اس آیت کے بارے میں رسول اللہ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ جبریل نے مجھ سے اس طرح کہا ہے: (ذالك على وشيعته هم السابقون الى الجنة، المقربون من الله بحكمته لهم) ”وہ علیؑ اور ان کے پیروکار ہیں جو بہشت کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں اور وہ مقربین بارگاہ خدا ہیں۔ اس احترام کی بنا پر جو خدا کی نظر میں ان کا ہے۔“

یہ بھی درحقیقت مذکورہ بالا مفہوم کے واضح مصداقوں کا بیان ہے، ایسا مفہوم کہ جس میں ہر ملت و امت کے تمام سابقین شامل ہیں۔ اس کے بعد ایک مختصر سے جملہ میں مقربین کے مقام بلند کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”مقربین جنت کے پُر نعمت باغات میں ہیں“ (فی جنات النعیم)۔

جنات النعیم کے مفہوم میں بہشت کی مادی و معنوی تمام اقسام کی نعمتیں شامل ہیں۔ ضمنی طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ صرف جنت کے باغات ہی نعمتوں کا مرکز ہیں، برخلاف باغات دنیا کے جو کبھی کبھی وسیلہ زحمت بھی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ مقربین کی آخرت کی حالت ان کی دنیا کی حالت سے مختلف ہے کیونکہ دنیا میں ان کا مقام بلند اپنے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کا پہلو بھی رکھتا ہے جب کہ آخرت میں صرف نعمت کا سبب ہے۔ واضح رہے کہ یہاں قرب سے مراد ”قرب مقامی“ ہے نہ کہ ”قرب مکانی“۔ اس لیے کہ خدا مکان نہیں رکھتا اور وہ ہم سے ہماری نسبت زیادہ قریب ہے۔ اس کے بعد والی آیت میں گزشتہ امتوں اور اس امت کے افراد کی تقسیم کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”بہت سے گروہ گزشتہ امتوں میں سے ہیں“ (ثلاثة من الاولین)۔ اور ایک بھونٹا سا گروہ آخری امت میں سے ہے۔ (وقلیل من الاخرین)۔ ”ثلة“ جیسا کہ راجع مفردات میں کہتا ہے۔ اصل میں پشم کے مجتمع ٹکڑوں کے معنی میں ہے اور اس کے بعد جماعت یا گروہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے اسے ”ثل عرشہ“ اس کا تخت گر پڑا اور اس کی حکومت ختم ہو گئی“ سے مشتق سمجھا ہے۔ اور وہ اسے قطع کے معنی میں سمجھتے ہیں یہاں مقابلہ کے قرینہ کے ماتحت (قلیل من الاخرین) کے ساتھ قطع عظیم کے معنی میں ہے۔ ان دونوں آیتوں کے مطابق مقربین کے

۱۔ تفسیر مراغی جلد ۲ ص ۱۳۴

۲۔ تفسیر نراشتلین جلد ۵ ص ۲۰۶

۳۔ تفسیر نراشتلین جلد ۵ ص ۲۰۹

۴۔ فی جنات النعیم (بارد مہر) ہو سکتا ہے مقربین سے متعلق ہوں یا ایک مخدوف سے متعلق ہو جو حال ہے مقربین کے لیے اور تقدیر

عبارت اس طرح ہے۔ کائناتین فی جنات النعیم۔ یا خبر کے بعد خبر ہے۔

زیادہ گزشتہ اُمتوں میں سے ہیں اور ان میں سے صرف تھوڑے سے اُمتِ محمدیہ میں سے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہاں یہ سوال درپیش ہو کہ یہ صورتِ حال اُمتِ اسلامیہ کی حد سے زیادہ اہمیت کے ساتھ کس طرح مطابقت رکھتی ہے؟ جب کہ خدا انہیں بہترین اُمت کے خطاب سے نوازتے ہوئے فرماتا ہے: **کنتوا خیر امتہ** - (آل عمران - ۱۱۰)۔ اس سوال کا جواب دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ پہلا یہ کہ مقررین سے مراد وہی سابقین اور ایمان میں پیش قدمی کرنے والے ہیں۔ یہ طے شدہ ہے کہ اُمتِ اسلامی میں صدرِ اول میں اسلام کو قبول کرنے کی طرف پیش قدمی کرنے والے تھوڑے سے افراد تھے۔ مردوں میں سب سے پہلے حضرت علیؑ اور عورتوں میں حضرت خدیجہؓ تھیں جب کہ گزشتہ پیغمبروں کی کثرت اور ان کی اُمتوں کی تعداد اور ہر اُمت میں پیش قدمی کرنے والوں کا موجود ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ تعداد میں زیادہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ عددی کثرت کیفی کثرت کی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس اُمت کے سابقین کی تعداد کم ہو لیکن مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بہت ہی افضل و برتر ہو جیسا کہ خود پیغمبروں میں بھی فرق ہے۔ (تلك المرسل فضلنا بعضہم علی بعض) ”ہم نے بعض رسولوں کو دوسرے بعض پر فضیلت برتری دی“۔ (بقرہ - ۲۵۳) اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ بعض مومنین ایمان میں سبقت کرنے والوں کے زمرے میں نہ ہوں لیکن دوسری صفات و خصوصیات کے حامل ہوں جو انہیں سابقین کے ہم پلہ قرار دیں اور اجر و جزا کے اعتبار سے وہ السابقون کے برابر ہوں۔ اس لیے بعض روایات میں امام محمد باقرؑ سے اس طرح منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

نحن السابقون السابقون ونحن الآخرون ”ہم السابقون السابقون ہیں اور ہم آخرون بھی ہیں“۔^۱

ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے پیروکاروں کی ایک جماعت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

(انتم السابقون الاولون والسابقون الآخرون والسابقون في الدنيا الى ولايتنا

وفي الآخرة الى الجنة) ”تم پہلے سابقون اور آخری سابقون ہو۔ تم دُنیا میں ہماری

ولاہیت کی طرف سبقت کرنے والے ہو اور آخرت میں جنت کی طرف سبقت کرنے والے“۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض مفسرینِ اولین و آخرین کا مصداقِ اولین اُمتِ اسلام اور آخرین اُمتِ اسلام کو بتاتے ہیں۔ لہذا اس تفسیر کے مطابق تمام مقررین اُمتِ اسلامی میں سے ہیں۔ لیکن یہ نقشہ نہ تو ظاہر آیات کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ان روایات کے ساتھ ہی جو ان آیتوں کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں جو گزشتہ اُمتوں کے افراد کو بھی خصوصیت کے ساتھ سابقین و اولین کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔

۱۔ تفسیر صافی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر صافی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

- ١٥- عَلَى سُرٍّ مَوْضُونَةٍ ۝
- ١٦- مُتَّكِنِينَ عَلَيْهَا مُتَّقِلِينَ ۝
- ١٧- يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُخَلَّدُونَ ۝
- ١٨- بَاصِّغَاتٍ وَابَّارِقَ ۝ وَكَاسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ۝
- ١٩- لَا يَصْدَعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُونَ ۝
- ٢٠- وَفَاحِكَةً مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ۝
- ٢١- وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۝
- ٢٢- وَخُورٌ عَيْنٌ ۝
- ٢٣- كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ۝
- ٢٤- جَزَاءُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝
- ٢٥- لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا ۝
- ٢٦- إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ۝

ترجمہ

- ۱۵۔ وہ صف کشیدہ اور ایک دوسرے سے پیوستہ پلنگوں پر بیٹھے ہیں۔
- ۱۶۔ ان پر تکیہ لگائے ہوئے ایک دوسرے کے روبرو ہیں۔
- ۱۷۔ نوجوانانِ جادوانی (شکوہ اور طراوت میں) ہمیشہ ان کے گرد پھرتے ہیں۔
- ۱۸۔ پیالوں کو زوں اور بہشت کی جاری نہروں کے جام لیے ہوئے۔
- ۱۹۔ لیکن ایسی شراب کہ نہ جس سے دردِ سر ہوتا ہے نہ وہ مست ہوتے ہیں۔
- ۲۰۔ اور ہر قسم کے پھل جس کی طرف وہ مائل ہوں۔
- ۲۱۔ اور ہر قسم کے پرندہ کا گوشت جسے وہ چاہیں۔
- ۲۲۔ اور حورالعین میں سے بیویان
- ۲۳۔ صدف میں پنہاں مروارید کی مانند۔
- ۲۴۔ یہ سب جزا ہے ان اعمال کی جنہیں وہ انجام دیتے تھے۔
- ۲۵۔ بہشت کے ان باغوں میں وہ نہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ گناہ سے آلودہ باتیں۔
- ۲۶۔ تنہا وہ چیز جسے وہ سنیں گے سلام ہی سلام ہے۔

تفسیر

جنت کی وہ نعمتیں جو مقربین کی منتظر ہیں

یہ آیتیں انواع و اقسام کی نعمتوں کو جو تیسرے گروہ یعنی مقربین کا نصیب ہوں گی بیان کرتی ہیں، وہ نعمتیں جن میں سے ہر ایک

دوسری سے زیادہ شوق انگیز و روح پرور ہے وہ نعمتیں جنہیں سات حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: ”وہ صف کشیدہ اور ایک دوسرے سے پیوستہ پلنگوں پر بیٹھے ہوں گے“ (علی سر موصوۃ)۔ ان پر تکبیر لگائے ایک دوسرے کے روبرو محبت اور خوشی سے پُر۔ (متکین علیہا متقابلین)۔ ”سرور“ جمع ہے ”سیر“ کی جس کا مادہ ”سرور“ ہے۔ اس کے معنی ایسے پلنگ اور تخت ہیں کہ جن پر صاحبانِ نعمت محفلِ مسرت میں بیٹھے ہوں گے۔ ”موصون“ کا مادہ ”وضن“ ہے (بر وزن وزن) اس کے معنی زرہ بُننے کے ہیں۔ اس کے بعد اس کا ہر اس بُنی ہوئی چیز پر اطلاق ہوا ہے جس کے تار و پود محکم ہوں یہاں اس سے مراد پلنگ اور تخت ہیں جو ایک دوسرے کے قریب اور آپس میں ملے ہوئے ہوں یا پھر یہ کہ یہ پلنگ ایک خاص قسم کی بافت رکھتے ہوں گے اور لولؤ و یا قوت وغیرہ سے بنے ہوئے ہوں گے جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ بہر حال ان پلنگوں کی ساخت ان کے بچھائے جانے کی جگہ اور وہ مجلس انس و ملہ تشکیل پائے گی اور سرور و شادمانی کی لہر جو اس میں موجزن ہوگی، ہر قسم کی تعریف و توصیف سے بالا ہے۔ قرآن مجید میں بارہا جنت کے پلنگوں کی اور اہل بہشت کی اجتماعی محفلوں کی نہایت عمدہ تعریف ہوئی ہے، جو بتاتی ہے کہ ان لذتوں میں سے ایک لذت ہی محافلِ انس و محبت ہیں۔ رہا یہ کہ وہاں موضوعِ سخن کیا ہوگا اسے کوئی نہیں بتا سکتا۔ کیا وہ اسرارِ آفرینش کے بارے میں گفتگو کریں گے اور خدا کی تخلیق کے عجائبات کو موضوعِ سخن بنائیں گے یا اصولِ معرفت اور اسمائے حسنیٰ کے بارے میں گفتگو ہوگی۔ یا وہ حوادث جو اس دنیا میں رونما ہوئے عنوانِ کلام ہوں گے یا وہ جانکاهِ مصائب، جن کے سبب سے انہیں راحت و آسودگی ملی، یا کچھ اور ہوں گے جن کے ادراک کی ہم اس دنیا میں طاقت نہیں رکھتے، کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔

اس کے بعد ان کی دوسری نعمت کے سلسلہ میں فرماتا ہے: ”ایسے نوجوان جو ہمیشہ جوانی کے بالکپن اور اس کی تازگی سے بہرہ ور رہتے ہیں ان کے گرد و پیش مصروفِ خدمت ہوں گے۔ (یطوف علیہم ولدان مغلدون)۔ ”یطوف“ کا مادہ طواف ہے اس سے ان کی مستقل خدمت کی طرف اشارہ ہے۔ ”مغلدون“ کی تعبیر اس صورت میں کہ تمام اہل بہشت جاودانی ہیں، ان کے نشاطِ جوانی تازگی اور خوبصورتی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ بات کہ یہ نوجوان کون ہیں، اس کے بارے میں مختلف تفسیریں ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اہل دنیا کے وہ فرزند ہیں جو بلوغ سے پہلے راہی ملکِ عدم ہو گئے اور چونکہ انہوں نے کوئی نیکی یا بُرائی نہیں کی اس لیے اللہ کے کرم کے نتیجے میں انہیں یہ منصب ملا ہے۔ وہ اپنے اس کام میں بہت لذت محسوس کرتے ہیں کہ وہ مقربینِ بارگاہِ الہی کی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ بات ایک حدیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے لیکن ایک تفسیر میں ملتا ہے کہ وہ مشرکین کے بچے ہیں جو بے گناہ ہونے کی بنا پر اس مرتبہ پر فائز ہوئے ہیں کیونکہ مومنین کے بچے تو اپنے ماں باپ کے پاس ہوں گے۔ تیسری تفسیر یہ بتاتی ہے کہ وہ جنت کے خدمت گار ہیں جنہیں خدا نے اس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ خوبصورت نوجوان، شرابِ طہور سے لبریز، ایسے پیالے، گوزے اور جام لیے ہوئے ہوں گے جو جنت کی نروں کے مشروبات سے بھرے ہوں گے۔ یہ اہل بہشت کے گرد پھریں گے اور انہیں سیراب کریں گے۔ (باکواب و اباریق و کاس من معین)۔

طہ مفرداتِ راغب مادہ ”سر“
 ۱ ”اکواب“ ”کوب“ کی جمع ہے اس کے معنی پیالہ یا دستہ دار ظرف ہے۔ ”اباریق“ ”اریق“ کی جمع ہے۔ ”آب ریز“ فارسی سے لیا گیا ہے۔ یہ ایسے برتنوں کے معنی ہیں جن میں دستہ دار ٹوٹی ہوئی ہے۔ گلاس لبریز جام کو کہا جاتا ہے۔ ”معین کا مادہ من“ (بر وزن من) ہے جس کے معنی جاری ہیں۔

لیکن یہ شراب ایسی نہ ہوگی جو ہوش اُڑا دے اور مست کر دے۔ جس وقت جنت میں رہنے والے اسے پیئیں گے تو انہیں نہ درد نہ ہوس لاحق ہوگا نہ وہ مست و بے ہوش ہوں گے۔ (لَا يَصْدَعُونَ عَنْهَا وَلَا يَنْزَفُونَ)۔
ان پر صرف ایک ایسے روحانی نشہ کی کیفیت طاری ہوگی جو تعریف و توصیف سے ماوراء ہے۔ یہ ان کے وجود کو بے مثل لذت سے ہمکنار کرے گی۔

اس کے بعد بہشت میں حاصل ہونے والی مادی نعمتوں کے چوتھے اور پانچویں حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: بہشتی نوجوان ہر قسم کے وہ پھل جن کی طرف اہل بہشت مائل ہوں گے ان کی خدمت میں پیش کریں گے۔ (وَفَاكِهَةٍ مَّا يَتَخَيَّرُونَ)۔
اور ہر قسم کے پرندے کا گوشت جسے وہ چاہیں گے۔ (وَلَحْمِ طَيْرٍ مَّا يَشْتَهُونَ)۔ پھل کو گوشت پر مقدم رکھنا اس وجہ سے ہے کہ غذائیت کے اعتبار سے وہ بہتر اور قیمتی ہے۔ علاوہ ازیں کھانے سے قبل پھل کھانا ایک کیفیت خاص رکھتا ہے۔ البتہ قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے درختوں کی شاخیں مکمل طور پر اہل بہشت کی دسترس میں ہوں گی، اس طرح کہ وہ ہر قسم کا پھل بہ آسانی حاصل کر کے تناول کریں گے۔ یہ معنی دوسری بہشتی غذاؤں پر بھی صادق آتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ جس وقت خدمت گار یہ نعمتیں لے کر ان کے سامنے آئیں گے تو اس کا لطف کچھ اور ہی ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بہشت میں رہنے والے افراد کا ایک قسم کا احترام ہے اور ان کی محافل انس کی رونق میں اضافہ کا باعث ہے۔ خود اس دنیا کی تمام مخلوق میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ باوجودیکہ پھل اور دیگر ماکولات ہمالوں کی دسترس میں ہوتے ہیں پھر بھی میزبان خود ان اشیاء کا تعارف کراتا ہے اور یہ ایک قسم کا احترام شمار ہوتا ہے۔ گوشت کی اقسام میں سے پرندوں کا گوشت چونکہ بہتر ہوتا ہے لہذا صرف اسی پر انحصار کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ پھل کے بارے میں ”یتخیرون“ ”انتخاب کریں گے“ اور گوشت کے بارے میں ”یشتہون“ ”اشتہار رکھتے ہیں“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بعض مترجمین ان دونوں تعبیروں کے درمیان فرق محسوس کرتے ہیں لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ دونوں ہم معنی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اہل جنت جس قسم کی غذا پسند کریں گے وہ ان کے خدمت گاروں کے اختیار میں دے دی جائے گی۔ اس کے بعد چھٹی نعمت یعنی پاک و پاکیزہ بیویوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے: ”اور حورالعین میں سے بیویاں رکھتے ہیں“۔ (وَحُورٌ عِينٌ)۔

”مثل صدف میں پنہاں موارید“ (کامثال اللؤلؤ المكنون)۔ حور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے ”حوراء“ کی جمع ہے اور ”احور“ اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کی آنکھ کی پتلی مکمل طور پر سیاہ ہو اور باقی حصہ کی سفیدی بالکل صاف و شفاف ہو اور ”عین“ ”عیناء“۔

”یصدعون“ ”صداع“ (بروزن جالب) کے مادہ سے ہے اس کے معنی درد سر کے ہیں۔ یہ لفظ اصل میں ”صدع“ یعنی چیرنے کے معنی میں ہے۔ انسان جب شدید درد سے دوچار ہو تو درد سر کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سر ٹھٹھ جائے گا اس لیے یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ”ینزفون“ ”نزف“ کے مادہ سے ہے اس کے معنی ہیں کنوئیں کا تمام پانی آہستہ آہستہ نکال لینا۔ یہ سستی اور عقل کی گمشدگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

”فَاكِهَةٍ“ اور ”لَحْمٍ“ دونوں اکواب پر معطوف ہیں اور اس طرح وہ ایسی چیزوں میں سے ہیں کہ جو (و لدان مغلدون) کے ذریعے مترجمین کے لیے ہیر بنیں گے۔

اگرچہ بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ ”حور عین“ ”غلمان مغلدون“ پر عطف ہے اس لیے وہ بھی جنتیوں کے گرد گھومتے رہتے ہیں لیکن اس کے پیش نظر کہ یہ معنی اہل بہشت کی مخلوق سے مناسبت نہیں رکھتے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (ولھو حور عین) اور ان کے لیے حورالعین ہیں۔

اور "اعین" جس کی جمع ہے موئی آنکھ کے معنی میں ہے اور چونکہ انسان کی خوبصورتی زیادہ تر اس کی آنکھوں کی وجہ سے ہوتی ہے لہذا اس بات پر خصوصیت کے ساتھ انحصار کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ حور کا مادہ "حیرت" ہے یعنی وہ اتنی خوبصورت ہیں کہ جنہیں دیکھ کر آنکھیں حیران رہ جائیں گی۔

ممکنوں کے معنی پوشیدہ کے ہیں یہاں مراد صدف میں پوشیدہ ہونا ہے کیونکہ مردار جب تک صدف میں ہوں انہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا اور وہ سدا خوبصورت اور صاف و شفاف رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ وہ دوسروں کی آنکھوں سے مکمل طور پر مستور ہوں یہ انہیں کسی کا ہاتھ لگا ہے اور نہ ان پر کسی کی نظر پڑی ہے۔ ان چھ مادی نعمتوں کے بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے "یہ سب کچھ جزا ہے ان اچھے اعمال کی جو انہوں نے انجام دیے ہیں۔" (جزاء بما کانوا یعملون)۔ تاکہ یہ تصور نہ ہو کہ یہ تمام نعمتیں اہل بہشت کو کسی حساب و کتاب کے بغیر دی جائیں گی، یا یہ کہ صرف ایمان و عمل صالح کا دعویٰ کرنا ان کے حصول کے لیے کافی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ مسلسل خالص عمل کی ضرورت ہے تاکہ خدا کی یہ مہربانیاں انسان کو نصیب ہو سکیں۔ (توجہ فرمائیے) یعملون فعل مضارع ہے اور استمرار کے معنی رکھتا ہے۔

ساتویں اور آخری نعمت جو معنوی پہلو رکھتی ہے یہ ہے کہ وہ جنت کے باغات میں لغو، بے ہودہ اور گناہ آلودہ باتیں نہیں سنیں گے۔ (لا یسمعون فیہا لغواً ولا تأثیماً)۔ نہ وہاں بھٹوتہمت اور افتراء کا وجود ہے نہ غیبت ہے نہ تسخر، نہ تکلیف دہ گفتگو نہ تلخ کلمات اور نہ لغو و بے ہودہ اور بے بنیاد باتیں ہیں۔ وہاں جو کچھ ہے وہ لطف و کرم ہے، خوبصورتی ہے، متانت و ادب اور پاکیزگی ہے۔ کیا ہی عمدہ ہوگا وہ ماحول کہ جس میں بُری باتیں نہ ہوں۔ اگر ہم ٹھیک طرح غور کریں تو ہماری اس دنیاوی زندگی کی زیادہ تر نادانسی و پریشانی کا سبب یہی لغو و بے ہودہ تکلیف دہ اور گناہ آلود باتیں ہیں جو دلوں کو دکھاتی ہیں اور ان پر زخم لگاتی ہیں۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "واصدربات جودہاں وہ سنیں گے وہ سلام ہی سلام ہے۔" (الّا قیلاً سلاماً سلاماً)۔

یہ سلام خدا کی طرف سے ہے، یا فرشتوں کی طرف سے ہے، یا خود اہل بہشت کی طرف سے ہے، یا ایک دوسرے کے لیے یا یہ سب صورتیں مراد ہیں۔ مناسب ترین تفسیر آخری تفسیر ہے۔ جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں خدا اور اہل بہشت کے ایک دوسرے کو سلام کرنے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

جی ہاں وہ سلام کے علاوہ اور کچھ نہیں سنیں گے۔ خدا اور اس کے مقرب فرشتوں کا سلام و درود اور ایک دوسرے کو خود ان کا سلام و درود اور ان پاکیزہ محفلوں میں جو دوستی اور محبت سے معمور ہیں ان کا ماحول سلامتی سے پُر ہے اور یہی معنی ان کے پورے

۱۔ ابراہیم متوح رازی جلد ۱۱ آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

۲۔ "سلاماً" مفعول بہ ہے قیلاً کے لیے جو مصدر ہے قول کی طرح یعنی ان کی گفتگو وہاں سلام ہے۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ

"سلاماً" قیلاً کے لیے صفت ہو یا مفعول بہ (یا مفعول مطلق) ہے فعل محذوف کے لیے اور تقریر عبارت میں "یسلمون

سلاماً" ہے لیکن پہلے معنی سب سے بہتر ہیں۔ دوسرا سلاماً تاکید کے لیے ہے۔

۳۔ یسین آیت ۵۸۔ رد ۲۴۔ یونس ۱۰۔

و جود پر حاوی ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ اسی محور کے گرد گھومتا ہے اور ان کی عام گفتگو اور مکالمہ کا نتیجہ سلام و صلح و صفا پر منتہی ہوتا ہے۔ اصولی طور پر بہشت دارالسلام ہے اور سلامتی و امن کا گھر ہے جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۱۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں۔
”لهم دارالسلام عند ربهم“

- ٢٤- وَأَصْحَبُ الْيَمِينِ ۖ مَا أَصْحَبُ الْيَمِينِ ۖ
- ٢٨- فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۖ
- ٢٩- وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ۖ
- ٣٠- وَظِلٍّ مَّمْدُودٍ ۖ
- ٣١- وَمَاءٍ مَّسْكُوبٍ ۖ
- ٣٢- وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۖ
- ٣٣- لَّا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ۖ
- ٣٤- وَفُرْشٍ مَّرْفُوعَةٍ ۖ
- ٣٥- إِنَّا أَنشَأْنَهُنَّ إِنشَاءً ۖ
- ٣٦- فَجَعَلْنَهُنَّ أَبْكَارًا ۖ
- ٣٧- عُرُبًا أَتْرَابًا ۖ
- ٣٨- لِأَصْحَبِ الْيَمِينِ ۖ
- ٣٩- ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۖ

۴۔ وَشَلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ۝

ترجمہ

- ۲۷۔ اور اصحابِ یمین کیا ہیں اصحابِ یمین ؟
- ۲۸۔ وہ بیری کے بے خار درخت کے سائے میں مقیم ہیں ۔
- ۲۹۔ اور پُر برگ درختِ طلح کے سائے میں رہتے ہیں ۔
- ۳۰۔ اور لبے اور وسیع سائے میں ۔
- ۳۱۔ اور آبشاروں کے پاس ۔
- ۳۲۔ اور فراواں پھل ۔
- ۳۳۔ جو کبھی مقطوع ہوتے ہیں نہ ممنوع ۔
- ۳۴۔ اور گراں قدر ہمسران (بیوی یا شوہر) ۔
- ۳۵۔ ہم نے انہیں نئی تخلیق عطا کی ہے ۔
- ۳۶۔ اور ہم نے سب کو بکر قرار دیا ۔
- ۳۷۔ ایسی بیویاں جو اپنے شوہروں سے عشق رکھتی ہیں اور خوش زبان، فصیح و بلیغ اور چہم رسن ہیں ۔
- ۳۸۔ یہ سب اصحابِ یمین کے لیے ہے ۔
- ۳۹۔ جن کا ایک گروہ پہلی اُمتوں میں سے ہے ۔
- ۴۰۔ اور ایک گروہ آخری اُمت میں سے ہے ۔

تفسیر

وہ نعمتیں جو اصحاب الیمین کو حاصل ہوں گی

ان مادی اور معنوی نعمتوں کے بیان کے بعد (جو مقربین بارگاہ الہی کو حاصل ہوں گی) بات اصحاب الیمین تک جا پہنچی ہے۔ وہ سعادت مند جماعت جن کا نام اعمال امتحانات الہی میں کامیابی کی علامت کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ یہاں پر درودگار عالم اپنی نعمتوں میں سے چھ کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے: مقربین کے لیے جو نعمتیں بیان ہوئیں وہ سات تھیں، یہ چھ میں یعنی ایک نعمت کم ہے۔ سب سے پہلے ان کے مرتبہ کی بلندی کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اصحاب الیمین، کیا کہنا اصحاب الیمین کا" (واصحاب الیمین ما اصحاب الیمین)۔

یہ افضل ترین تعریف ہے جو ان کی ہوئی ہے کیونکہ ایسی تعبیر ان مواقع پر ہوتی ہے جب کسی کے اوصاف بیان سے باہر ہوں۔ بہر کیف یہ تعبیر اصحاب الیمین کے بلند مرتبہ کو بیان کرتی ہے۔ اس کے بعد کی آیت اس گروہ کو حاصل ہونے والی پہلی نعمت کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ "وہ ایسے بیر کے درخت کے نیچے جگہ پائیں گے جس میں کانٹے بالکل نہیں ہیں"۔ (فی سدر مخضود)۔

حقیقت میں یہ بہترین تعریف ہے جو جنت کے درختوں کے لیے ہمارے دنیاوی الفاظ کے قالب میں ڈھل سکتی ہے۔ "سدر" بعض ارباب لغت کے بقول ایک تناور درخت ہوتا ہے جس کی بلندی بعض اوقات چالیس میٹر تک پہنچ جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی عمر دو ہزار سال تک ہوتی ہے۔ (اس کا سایہ بہت گھنا اور نر لطف ہوتا ہے)۔ اس درخت میں صرف ایک عیب ہے کہ اس میں کانٹے ہوتے ہیں لیکن "مخضود" کا لفظ "خضد" کے مادہ سے ہے۔ (بروزن مجد) اس کے معنی ہیں کانٹوں کا قطع کر دینا۔ اس لفظ کے استعمال کے بعد جنت کے سدر نامی درخت کی یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت قرآن کے بعض الفاظ اصحاب پیغمبر کیلئے مشکل ہو جاتے تو وہ کہتے کہ بادیہ نشین عربوں کے سوالات کی برکت سے پروردگار ہم کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دن ایک صحرا نشین عرب پیغمبر کی خدمت میں آیا اور عرض کیا اے خدا کے رسول! خدا نے قرآن میں ایک تکلیف پہنچانے والے درخت کا نام لیا ہے۔ میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ جنت میں اس قسم کا درخت کیسے ہوگا۔ فرمایا کونسا درخت؟ اس نے کہا "سدر" کا کیونکہ اس میں تو کانٹے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا: کیا خدا نے نہیں فرمایا؟ فی سدر مخضود۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے کانٹے دور کر دیے گئے ہیں اور ہر کانٹے کی جگہ پھل لگا دیا گیا ہے اور پھل بھی ایسا کہ جس میں بہتر قسم کا غذائی مادہ ہے جن میں سے ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتا۔ دوسری نعمت یہ ہے کہ وہ "طلح متراکم" کے درختوں کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہیں (وطلح منضود)۔ طلح ایک ایک سبز خوش رنگ اور خوببودار درخت ہے۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ وہ کیلے کا درخت ہے جس کے چوڑے سبز اور خوبصورت پتے ہوتے ہیں

۱۔ اس جملہ کی ترکیب اس سورہ کی آیت ۸ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

۲۔ جار مجرور مقدر عامل سے متعلق ہے اور مجموعہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح تھی۔ (ہم فی سدر مخضود)

۳۔ روح المعانی جلد ۲ ص ۱۲۰۔ در المنثور جلد ۶ ص ۱۵۶

اور اس کا پھل خوش ذائقہ اور شیریں ہوتا ہے۔ "منضود" کا مادہ "نضد" ہے جس کے معنی تہہ بہ تہہ ہونے کے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس کے پتوں یا پھلوں کے تہہ بہ تہہ ہونے کی وجہ سے ہو یا دونوں کی وجہ سے ہو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ درخت پھلوں سے اس طرح لدے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا تنا اور ٹہنیاں پھلوں میں بھیجی ہوئی ہوتی ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس امر کے پیش نظر کہ سدر کے درخت کے پتے کافی چھوٹے ہوتے ہیں اور کیلے کے پتے بڑے ہوتے ہیں ان دونوں درختوں کا ذکیہ جنت کے تمام درختوں کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو ان دونوں درختوں کے درمیان قرار پاتے ہیں۔

تیسری بہشت کی نعمت کو پروردگار عالم اس طرح بیان فرماتا ہے: "اور طریل و عریض سایہ" (و ظل ممدود)۔ بعض مفسرین اس سائے کو بین الطلوعین (طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک) کی حالت سے مشابہ قرار دیتے ہیں جب سایہ ہر جگہ کا احاطہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ مذکورہ معانی ایک حدیث میں جو روضہ کافی میں ہے پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہوئے ہیں۔ مقصود کلام یہ ہے کہ سورج کی گرمی اور اس کی تپش اہل بہشت کو کبھی پریشان نہیں کرے گی۔ وہ ہمیشہ پسندیدہ، محبوب، وسیع اور روح پرور سائے میں رہیں گے۔

چوتھے مرحلہ میں جنت کے پانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اہل بہشت آبشار کی مانند پانی (جو خوبصورت اور دلربا منظر رکھتا ہے) کے پاس رہتے ہیں۔" (و ماء مسکوب)۔ "مسکوب" کا مادہ "سکب" (بروزن کبک) ہے اس کے اصل معنی گرنے کے ہیں چونکہ آبشار کی صورت میں پانی کا اُدپر کی طرف سے نیچے کی طرف گرنا بہترین منظر پیش کرتا ہے اور اس کے زمزمے دل کے کانوں کو نوازتے ہیں اور اس کا منظر آنکھوں کو فروغ اور روشنی بخشتا ہے۔ اس لیے یہ امر جنت کی ایک نعمت قرار دیا گیا ہے اور چونکہ یہ درخت اور اُڑیل ہمیشہ اپنے ہمراہ انواع و اقسام کے پھل لیے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے پانچویں نعمت کے بیان میں مزید فرماتا ہے: "اور فراواں پھل" (و فاكهة كثيرة)۔ "جو نہ کبھی منقطع ہوتے ہیں نہ ممنوع ہوتے ہیں"۔ (لا مقطوعة ولا ممنوعة)۔ جی ہاں وہ پھل اس جہان کے پھلوں کی مانند نہیں ہیں جو صرف اپنی فصل میں آتے ہوں اور سال بھر میں صرف چند مہینے یا چند ہفتے درختوں پر لگتے ہوں اور یہ بھی نہیں کہ کانٹے ان کے حصول کی راہ میں حائل ہوں اور درخت کی بہت زیادہ بلندی جیسے کھجور کے درخت کی بلندی، بھی ان کے حصول میں مانع نہیں ہے اور خود انسان کے وجود میں کوئی ایسا تقاضا موجود نہیں ہے کہ جو ان کے استعمال سے روکتا ہو اور پھر جنت کا اصل میزبان خداوند متعال ہے وہ یا اس کے مامور منتظمین نہ کسی قسم کا کُجھل رکھتے ہیں نہ ان پھلوں کے استعمال کو منع کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر کوئی امر ایسا نہیں ہے جو ان پھلوں کے استعمال کی راہ میں رکاوٹ ہو بلکہ صورت حال یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ بروقت موجود ہے اور اس کے حصول کی راہ میں جو رکاوٹ ہو سکتی ہے وہ ہر وقت مفقود ہے۔

اس کے بعد ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ گراں قدر اور ہر بیویاں رکھتے ہیں" (و فرش مرفوعة)۔ "فرش" جمع ہے "فرش" کی جس کے معنی ہر وہ فرش ہے جو بچھایا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے کبھی کبھی بطور کنایہ زوج کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (خواہ مرد ہو یا عورت)۔ اسی بنا پر ایک مشہور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے۔ الولد للفرش

وللعاہل الحجب۔ ” وہ بچہ جو شوہر دار عورت سے پیدا ہو وہی اس کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اگر درمیان میں کوئی فاسق و فزاکا مرد ہو تو اس کے حصہ میں صرف پتھر ہے۔ (اور اس کے لطفہ سے فرزند کے انعقاد کا احتمال قابل قبول نہیں ہے)۔ بعض مفسرین نے قرش کی تفسیر اس کے حقیقی معنی کے اعتبار سے کی ہے۔ (کنائے کے طور پر جو معنی بنتے ہیں انہوں نے ان کو نظر انداز کیا ہے)۔ اور انہوں نے اس کو جنت کے بہت ہی بیش قیمت قرش کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن اس صورت میں بعد میں آنے والی آیتوں سے ارتباط ختم ہو جائے گا جن میں جنت کی خوروں اور بیویوں کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد جنت کی بیویوں کی اور خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ہم نے انہیں نئی خلقت و آفرینش بخشی ہے“ (انا انشأناھن) انشاء اس جملہ سے ممکن ہے اس دنیا کی مومن بیویوں کی طرف اشارہ مقصود ہو جنہیں خدا قیامت میں نئی خلقت عطا کرے گا اور وہ سب انتہائی شباب کے عالم میں ظاہر و باطنی جمال کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گی اور اگر مراد حوریں ہوں تو خدا ان کو نئی خلقت عطا کرتے ہوئے اس طرح بنائے گا کہ ضعیفی و ناتوانی کا گرد و غبار ان کے دامن حیات کو ہرگز نہیں چھو سکے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مومن بیویوں اور خوروں دونوں کی طرف اشارہ ہو۔ ”ہم نے ان سب کو باکرہ قرار دیا ہے“ (فجعلناھن ابکرا)۔ شاید یہ صفت ان کے لیے ہمیشہ باقی رہے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے نیز روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود مرو سے اختلاط کے باوجود ان کی جسمانی کیفیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔

ان بیویوں ہی کی خصوصیات کے بارے میں مزید فرماتا ہے: ”وہ اپنے شوہروں سے محبت رکھتی ہیں اور خوش گفتار و فصیح ہیں۔“ (عرباً عرب کی جمع عربیۃ (بروزن ضرورۃ) ہے یہ اس عورت کے معنوں میں ہے جو اپنے مرد سے محبت کرتی ہے اور پاکدامن ہوتی ہے۔ کیونکہ ”اعراب“ (بروزن اظہار) آشکار اور ظاہر کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ فصیح اور خوش گفتار ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ آیت میں دونوں معنی موجود ہوں۔ ان کی دوسری صفت یہ ہے کہ ”وہ اپنے شوہروں کی ہم سن ہیں اور ظاہری و باطنی خوبی اور حسن و جمال میں ایک دوسرے کے مانند ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بہتر ہے (اتواجا)۔“ اقواب جمع ہے ”ترب“ کی جو ”ذہن“ کے وزن پر ہے اور اس کے معنی مثل و مانند کے ہیں۔ بعض مفسرین کے خیال کے مطابق یہ معنی ”تواہب“ سے لیے گئے ہیں جو سینے کی ہڈیوں کے پتھر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈیاں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ یہ مشابہت اور برابری ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ ان سب کا سن و سال ان کے شوہروں سے مطابقت رکھتا ہو گا تاکہ وہ ایک دوسرے کے جذبات کو مکمل طور پر سمجھ سکیں اور ان کی آپس کی زندگی زیادہ لذت بخش ہو جائے۔ اگرچہ بعض اوقات سن و سال کا فرق ہوتے ہوئے بھی زندگی لذت بخش ہوتی ہے لیکن اکثر اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ کہ وہ خوبصورتی اور ظاہری و باطنی حسن و جمال میں ایک جیسے ہوں۔ مشہور و معروف تعبیر کے مطابق کہ ”وہ سب اچھے ہیں اور ایک سے ایک بہتر ہے۔“

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”یہ سب نعمتیں اصحاب الیمین کے لیے ہیں۔“ (لاصحاب الیمین)۔ یہ مذکورہ چھ نعمتوں کے ان کے ساتھ مخصوص ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ جملہ (انا انشأناھن) انشاء کے جملہ کی تکمیل ہے۔

۱۔ روح المعانی جلد ۲۴ ص ۱۲۳۔ ضمناً توجہ کرنی چاہیے کہ اس حالت کا ”قا“ تفریح کے ساتھ گزشتہ آیت پر عطف ہوا ہے۔
۲۔ پہلی صورت میں اصحاب الیمین مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ (ہذہ کلھا لاصحاب الیمین) یہ سب (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس گفتگو کے آخر میں فرماتا ہے ان میں سے ایک گروہ پہلی اُمتوں میں سے ہے۔ (ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ)۔ ”اور ایک گروہ آخری اقوام میں سے ہے۔“ (و ثَلَاثَةٌ مِنَ الْآخِرِينَ)۔ ”ثَلَاثَةٌ“ کے معنی پشیم کا ایک مجتمع ٹکڑا۔ اس کے علاوہ یہ اس کثیر جماعت کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو باہم ملی بھلی ہو۔ تو اس طرح اصحاب الیمین کے عظیم گروہ میں گزشتہ اُمتوں کے افراد بھی شامل ہیں اور اس میں اُمت اسلامی کے بھی بہت سے افراد شامل ہیں، کیونکہ اس اُمت میں بہت سے صالحین و مومنین موجود ہیں۔ اگرچہ اُمت اسلامی میں ایمان قبول کرنے کے سلسلہ میں سبقت کرنے والے افراد کی تعداد سابقہ اُمتوں اور ان کے انبیاء کی کثرت کی وجہ سے ان کے سابقین کی تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اصحاب الیمین کے دونوں گروہ اُمت اسلامی میں سے ہیں۔ ایک گروہ ان کے اولین میں سے ہے اور ایک گروہ ان کے آخرین میں سے ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے۔

- ۴۱۔ وَأَصْحَابُ الشِّمَالِ ۖ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ ۖ
- ۴۲۔ فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ ۖ
- ۴۳۔ وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُومٍ ۖ
- ۴۴۔ لَا بَارِدٍ وَلَا كَرِيمٍ ۖ
- ۴۵۔ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتْرَفِينَ ۖ
- ۴۶۔ وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ ۖ
- ۴۷۔ وَكَانُوا يَقُولُونَ ۖ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ
- عِظَامًا إِنَّا لَنَبْعُوثُ ۖ
- ۴۸۔ أَوَابَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۖ
- ۴۹۔ قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ۖ
- ۵۰۔ لَجُمُوعُونَ ۖ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ۖ

ترجمہ

۴۱۔ اور اصحاب شمال کیسے اصحاب شمال ہیں (کہ ان کا نامہ اعمال ان کے جرم کی بنا پر ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔

- ۴۲۔ وہ مار ڈالنے والی ہواؤں اور جلانے والے پانیوں کے درمیان ہوں گے۔
- ۴۳۔ اور تہہ بہ تہہ اور آتش زادھویں کے سائے میں۔
- ۴۴۔ ایسا سایہ جو نہ ٹھنڈا ہے نہ فائدہ مند۔
- ۴۵۔ وہ اس سے پہلے دُنیا میں مُست اور مغرور تھے۔
- ۴۶۔ اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔
- ۴۷۔ اور کہتے تھے کہ ہم جس وقت مُر گئے اور مٹی اور ہڈی ہو گئے تو کیا پھر قبروں سے نکالے جائیں گے؟
- ۴۸۔ یا ہمارے پہلے آباء و اجداد؟
- ۴۹۔ کہہ دے کہ اولین و آخرین۔
- ۵۰۔ سب کے سب معین دن کی وعدہ گاہ میں جمع ہوں گے۔

تفسیر

اصحابِ شمال کو ملنے والی سزائیں اور ان پر نازل ہونے والے دردناک عذاب

گروہِ مقررین و اصحابِ الیمین کو حاصل ہونے والی عظیم نعمتوں کے تذکرے کے بعد ایک تیسرے گروہ پر نازل ہونے والے دردناک عذاب کا تذکرہ کرتا ہے تاکہ تقابل کی صورت حال کے موجود ہونے کی وجہ سے تینوں گروہوں کی کیفیت اور ان کا حال واضح ہو جائے۔ فرماتا: ”اصحابِ الشمال اور کیا ہیں اصحابِ الشمال“ (و اصحاب الشمال ما اصحاب الشمال) وہی کہ جن کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گناہ گار ہیں، رستگار ہیں اور اہل دوزخ ہیں۔ اور جس طرح ہم نے مقررین اور اصحابِ الیمین کے بارے میں کہا ہے کہ ما اصحاب الیمین کہنے کا یہ اندازہ بتاتا ہے کہ یہ کسی کی انتہائی اچھی یا بُری حالت کے بیان کیلئے ہے۔ مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں کہ سعادت نے ہماری طرف رخ کیا ہے۔ کیسی سعادت نے یا مصیبت نے ہماری طرف رخ کیا ہے، کیسی مصیبت نے۔

اس کے بعد ان پر نازل ہونے والی تین سزاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ زہریلی ہواؤں اور جلانے والے پانی کے درمیان رکھے گئے ہیں“ (فی سموم وحمیم)۔ ”اور شدید دھوئیں اور آگ کے سایہ میں“ (و ظل من یحوم)۔ جلانے والی زہریلی ہوا ایک، ٹھسلا کر مارنے والا کھولتا ہوا پانی دو اور گرم اور گھونٹنے والا دھواں تین۔ یہ تینوں چیزیں انہیں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اُن کی قوت چھین لی ہے اور اگر وہ ان تینوں مصیبتوں کے علاوہ کوئی اور مصیبت نہ بھی رکھتے ہوں تو یہی تین مصیبتیں ان کی شامت اعمال کچیلے کافی ہیں۔ ”سموم“ کا مادہ ”سم“ ہے جس کے معنی زہر ہیں۔ یہاں زہر سے جلانے والی ہوا مراد ہے جو انسان کے جسم کے مساموں میں داخل ہو کر اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ (اصولی طور پر زہر کو ”سم“ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بدن کے تمام اجزا میں نفوذ کر جاتا ہے) ”حمیم“ گرم چیز کے معنی میں ہے اور یہاں گرم اور جلانے والے پانی کے معنی میں ہے جس کی طرف قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی اشارہ ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ حج کی آیت ۱۹ میں ہے۔ یصیب من فوقہ وسہو الحمیم۔ ان کے سروں پر گرم اور جلانے والا پانی ڈالا جائے گا۔ ”یحوم“ بھی اسی مادہ سے ہے اور یہاں ”ظل“ کی مناسبت سے گاڑھے، سیاہ اور گرم دھوئیں کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرماتا: ”وہ سایہ جس میں نہ کوئی ٹھنڈک ہے نہ فائدہ“ (لا بارد ولا کریم)۔

سائبان کبھی انسان کی سُورج کی تمازت سے حفاظت کرتا ہے اور کبھی ہوا اور بارش سے یا پھر اور دوسری منفعتیں لیے ہوئے ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ سائبان ان فائدوں میں سے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔ ”کریم“ کی تعبیر ”کرامت“ کے مادہ سے ہے اور فائدہ کے معنوں میں ہے اس لیے عربوں میں معمول ہے کہ جس وقت وہ چاہتے ہیں کہ کسی چیز یا شخص کو غیر مفید بتائیں تو وہ کہتے ہیں لا کرامۃ فیہ۔ یقینی امر ہے کہ وہ سایہ جو سیاہ ہے اور گلا گھونٹنے والے دھوئیں سے بنا ہے، سوائے برائی اور نقصان کے اُس سے کوئی اور توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ اگرچہ وہ عذاب جو دوزخیوں پر نازل ہوں گے ان کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن یہی تین قسمیں اس بات کے لیے کافی ہیں کہ انسان باقی کا اندازہ خود لگا لے۔

اس کے بعد والی آیتوں میں اصحاب الشمال کی گرفتاری کے دلائل کا ان کی مغنوس اور وحشت ناک داستان کے پہلے ہی تین جملوں میں خلاصہ کرتا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ اس سے پہلے دنیا میں نعمت حاصل ہونے پر مست اور مغرور تھے۔ (انہم کانوا قبل ذالک مترفین)۔ ”مترف“ جس طرح لسان العرب میں ”ترف“ کے مادہ سے (بروزن سبب) ہے اس کے معنی عیش و عشرت میں وقت گزارنے کے ہیں۔ مترف اس شخص کو کہتے ہیں جسے نعمتوں کی فراوانی نے مست و مغرور کر دیا ہو اور نافرمانی و سرکشی پر ابھارا ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمام اصحاب شمال مترفین کے زمرہ میں نہیں آتے۔ لیکن اس سے قرآن کا مقصود ان کے سرکردہ افراد ہیں۔ جیسا کہ موجودہ زمانے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشرہ کا فتنہ و فساد مست و مغرور عیش پرستوں کی وجہ سے ہے جو اپنے ساتھ دوسروں کی گمراہی کا سبب بھی ہیں۔ تمام لڑائیوں، خوں ریزیوں، مختلف قسم کے جرائم، شہوتوں کے مرکز اور باغیانہ سرگرمیوں کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسی بنا پر قرآن ہر چیز سے پہلے انہی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ نعمت کے معانی وسیع ہیں اور یہ صرف مال و دولت تک محدود نہیں ہے بلکہ جوانی اور سلامتی عمر بھی خدا کی نعمتوں میں سے ہیں کہ اگر غرور و غفلت کا باعث بنیں تو گناہوں کا اصلی سرچشمہ یہی ہیں۔ اور اصحاب شمال ان میں سے ہر ایک نعمت سے بہرہ ور تھے۔

اس کے بعد ان کے دوسرے گناہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”وہ بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے“ (وكانوا يصرون على الحنث العظيم)۔ ”حنث“ اصل میں ہر قسم کے گناہ کے معنوں میں ہے لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ عمدہ شکنی اور قسم کی مخالفت کے معنوں میں آتا ہے اس وجہ سے یہ واضح طور پر گناہ کے معنی رکھتا ہے۔ اصحاب شمال کی بُرائی یہی نہیں ہے کہ وہ گناہ کرتے تھے بلکہ بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ گناہ ممکن ہے کہ اصحاب میں سے بھی بعض اوقات سرزد ہو لیکن وہ اس پر کبھی اصرار نہیں کرتے اور جس وقت توفیق الہی شاہل حال ہوتی ہے فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں ”حنث العظیم“ سے مراد شرک لیا ہے کیونکہ اس سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ (ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء) خدا ہر قسم کے گناہ کو بخش سکتا ہے لیکن وہ شرک کے گناہ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

بعض مفسرین نے اس سے بھٹوٹ مراد لیا ہے جو تمام گناہوں سے بڑا ہے اور گناہوں کی کلید ہے خصوصاً جب وہ انبیاء کی تردید اور قیامت کی تکذیب کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ حقیقت حال یہ ہے کہ مذکورہ تمام گناہ حنث عظیم کے ذیل میں آتے ہیں۔

ان کا تیسرا غلط کام یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کیا ہم مرنے کے بعد جب محض ہماری ہڈیاں رہ جائیں گی اور ہم مٹی میں بدل جائیں گے کیا دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے؟ (وكانوا يقولون اذما متنا وكنا ترابا وعظما انا للبعوثون)۔ اصحاب شمال کے دوسرے بہت سے گناہوں میں سے ان کا ایک بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ قیامت کے انکار پر مصر تھے۔ یہاں دو مطالب قابل توجہ ہیں۔

پہلا یہ کہ جس وقت گفتگو مقرر ہو اور اصحاب میں سے بائیں میں تھی تو وہاں ان کے ان اعمال کی تشریح نہیں کی گئی جو ان کے لیے باعث اجر و ثواب تھے (سوائے مختصر اشارے کے جو مقررین کے بائیں میں تھا)۔ لیکن جب اصحاب شمال کا ذکر آیا تو اس سلسلے میں پُروردگار عالم کافی تشریح سے کام لیتا ہے تاکہ تمام بحث بھی ہموار اور حقیقت کا بیان بھی ہو جائے کہ یہ سزائیں جو دی جا رہی ہیں وہ عدالت الہی کے عین مطابق ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ تین گناہ جن کا تذکرہ مذکورہ تین

آیتوں میں ہوا ہے۔ درحقیقت اصحاب شمال کی طرف سے دین کے تین اصولوں کی نفی کی طرف اشارہ ہے۔ آخری آیت میں قیامت کی تکذیب تھی اور دوسری آیت میں توحید کا انکار تھا۔ اور پہلی آیت میں جہاں مترفین کی بات ہو رہی تھی انبیاء کی تکذیب کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے سورہ زخرف کی آیت ۲۳ میں پڑھا ہے۔

انا وجدنا آباءنا على امة وانا على اثارهم مقتدون۔ اس طرح ہم نے کسی شہر اور آبادی میں تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ ان کے مترفین نے کہا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم ان کے آثار کے پابند ہیں۔ ”ترابا وعظما“ کی تعبیر ممکن ہے کہ اس طرف اشارہ ہو کہ ہمارے گوشت مٹی میں تبدیل ہو جائیں گے اور ہماری برہنہ ہڈیاں رہ جائیں گی تو ایسی صورت

میں نئی خلقت کس طرح ممکن ہے۔ چونکہ مٹی اور نئی زندگی کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے لہذا اس کا ابتدا میں ذکر ہوا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ معاد کے مناظر اس دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ کس طرح اس دنیا کے بہت سے موجودات گھاس وغیرہ پرانے ہو کر مٹی ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد پھر لباس حیات پہن لیتے ہیں۔ اصولی طور پر جس نے پہلی مرتبہ تخلیق کی ہے اس کے لیے

اس کھرا عادہ کس طرح مشکل ہے۔ ہر حال یہی کیفیت تھی جس میں وہ ہمیشہ معاد کی تکذیب کرتے تھے۔

انہوں نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ انہماکِ تعجب کے لیے مزید کہتے تھے کیا ہمارے پہلے آباد اجداد جن کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا دوبارہ زندہ ہوں گے۔ (او اباً ونا الاولون) ۱

وہ جن کی خاک کا ہر ذرہ یا تو کسی گوشہ میں پڑا ہے یا کسی اور وجود کا جز بن چکا ہے۔ لیکن جیسا کہ سورہ یسین کے آخر میں تفصیل سے کہا جا چکا ہے کہ ان حکم دلائل کے مقابلے میں جو مسکحہ معاد پر دلالت کرتے ہیں یہ فقط چند فضول بہانے ہیں۔ اس کے بعد قرآن پینیر اسلام کو حکم دیتا ہے کہ ان کے جواب میں کہہ دے "نہ صرف تم اور تمہارے آباد اجداد بلکہ تمام اولین و آخرین ... (قل ان الاولین والآخرین)۔ سب معین دن کی وعدہ گاہ میں (قیامت کے دن) جمع ہوں گے۔ (لمجموعون الی میقات یوم معلوم) میقات کا مادہ وقت ہے اس کے معنی ہیں جو کسی کام یا وعدہ کے لیے معین ہوا ہو۔ یہاں میقات سے مراد قیامت کا مقررہ وقت ہے جس میں تمام انسان میدانِ مشر میں اپنے حساب و کتاب کے واسطے جمع ہوں گے۔ بعض اوقات بطور کنایہ اس مکان کے لیے بھی جو کبریٰ کام کی انجام دہی کے لیے مقرر ہوا ہو لفظ میقات استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً حج کے میقات (مواقیت) جو خاص مقامات کے نام ہیں جہاں سے حاجی احرام باندھتے ہیں۔ آیت کی مختلف تعبیروں سے ضمنی طور پر استفادہ ہوتا ہے قیامت کے بارے میں بہت سی تاکیدوں کا۔ (ان۔ لام۔ مجموعون اسم مفعول کی شکل میں اور یوم کی توصیف معلوم ہونے کے معنوں میں) اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگوں کا قبروں سے نکل کر مبعوث ہونا ایک ہی دن انجام پائے گا اور یہی معنی قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی آئے ہیں ۲

یہاں یہ ابھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو قیامت کے برپا ہونے کو ہر اُمت کے اعتبار سے مختلف زمانوں میں خیال کرتے ہیں وہ قرآنی آیات سے مکمل طور پر نا آشنا ہیں۔ شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ قیامت کے معلوم ہونے سے مراد اس کا پروردگار عالم کو معلوم ہونا ہے ورنہ کوئی شخص حتیٰ کہ انبیاء و مرسلین اور ملائکہ مقررین بھی اس کے برپا ہونے کے وقت سے باخبر نہیں ہیں۔

۱ او اباً ونا الاولون کا ہمزہ استفہام اور اس کی واو عاطفہ ہے جس پر ہمزہ کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

۲ الی اس جملہ میں اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قیامت اس جہاں کے آخرین واقع ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں الی لام کے معنوں میں ہو جیسا کہ

بہت سی آیات قرآنی میں لمیقات آیا ہے۔

۳ ہود آیت ۱۰۲ - مریم ۹۵۔

- ۵۱۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّالُّونَ الْهٰكِذِبُونَ ۝
 ۵۲۔ لَا اَكُلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زُقُوْمٍ ۝
 ۵۳۔ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝
 ۵۴۔ فَشَرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ۝
 ۵۵۔ فَشَرِبُوْنَ شُرْبَ الْهَيْمِ ۝
 ۵۶۔ هٰذَا نَزْلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ۝

ترجمہ

- ۵۱۔ پھر تم اے تکذیب کرنے والے گمراہ لوگو۔
 ۵۲۔ یقیناً زقوم کے درخت سے کھاؤ گے۔
 ۵۳۔ اور اپنے شکموں کو اس سے پُر کرو گے۔
 ۵۴۔ اور اس پر سے جلانے والا پانی پیو گے۔
 ۵۵۔ اور پیاس کی بیماری میں مبتلا اونٹوں کی طرح اس میں سے پیو گے۔
 ۵۶۔ یہ ہے قیامت میں ان کی پذیرائی کا ذریعہ۔

تفسیر

ان گمراہ مجرموں پر نازل ہونے والے عذاب کا ایک اور حصہ

یہ آیتیں اسی طرح اصحاب شمال پر نازل ہونے والے عذاب کے مباحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پروردگار عالم اصحاب شمال کو اسی انداز میں مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”پھر تم اے گمراہ اور تکذیب کرنے والو! (ثم انكم من الضالون المکذبون) ”زقوم“ کے درخت میں سے کھاؤ گے۔“ (لأنكم من شجر من زقوم)۔
”اپنے شکموں کو اُس سے پُر کرو گے“ فمالتون منها البطون۔ گزشتہ آیتوں میں اصحاب شمال کی دوزخ میں بسر ہونے والی زندگی کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ یہاں ان کی غذا کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے یہ اصحاب شمال، مقررین اور اصحابِ مین کے بالکل مقابل ہیں۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ ان آیتوں میں مخاطب وہ گمراہ ہیں جو تکذیب کرنے والے ہیں، وہ افراد جو ضلالت و گمراہی کا شکار ہونے کے علاوہ حق سے دشمنی اور اس کی خلاف ورزی کی روح اپنے وجود میں رکھتے ہیں اور اپنے اس غلط رویہ کو برقرار رکھنے والے ہیں۔

”زقوم“ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، ایک ایسی بدبودار گھاس ہے جس کا مزہ تلخ ہے۔ اس میں ایسا لیس ہوتا ہے کہ اگر وہ انسان کے بدن پر لگ جائے تو اس سے جسم پر درم ہو جاتا ہے اور یہ کبھی دوزخیوں کی ہر قسم کی ناقابلِ نفرت غذاؤں کے لیے بولا جاتا ہے۔
زقوم کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے جلد ۱۹ سورہ صافات کی آیت ۶۲ اور جلد ۲۱ سورہ دُخان کی آیت ۴۳ کے ذیل میں جو مندرجات ہیں ان کی طرف رجوع کیجئے۔ ”فمالتون منها البطون“ کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ پہلے انہیں بہت تیز بھوک لگے گی اتنی تیز کہ وہ اس نہایت ناگوار غذا کھالیں گے تو انہیں پیاس لگے گی۔ اب وہ پیاس لگے گی؟ تو بعد والی آیت میں قرآن بتاتا ہے۔ ”تم اس ناگوار غذا کے بعد جلانے والا پانی پیو گے۔“ (فشاربون عليه من الحمى)۔

”اس حریمانہ انداز میں پیو گے جس طرح وہ اُونٹ جو استسقا کی بیماری میں مبتلا ہوں۔“ (فشاربون مشرب الهيم)۔ اس بیماری میں مبتلا ہونے والا اُونٹ بہت پیاس محسوس کرتا ہے اور بار بار پانی پیتا ہے، یہاں تک کہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ جی ہاں یہ ہے بروز قیامت سرگزشت گمراہوں اور تکذیب کرنے والوں کی۔ ”حمیو“ حد سے زیادہ گرم اور جلانے والے پانی کے معنوں میں ہے۔ اسی بنا پر ایسے دوزخوں کو جو محبت کی آگ میں جل رہے ہوں ”ولی حمیو“ کہتے ہیں۔ حمام بھی اسی مادہ سے مشتق ہے۔ ”ہیم“ (بروزن میم) اہام کی جمع ہے۔ (اور بعض لوگ اسے اہیم اور ہیما کی جمع جانتے ہیں)۔ اصل میں ”ہیام“ (بروزن فرت) پیاس کی اس بیماری کو کہتے ہیں جو

۱۔ ”من شجر من زقوم“ اور ”من زقوم“ کا ”من“ بیان ہے۔

۲۔ مجمع البحرین، مفردات راغب، لسان العرب اور تفسیر روح المعانی۔

۳۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں ضمیر مؤنث (منہا) شجر من زقوم کی طرف لٹتی ہے اور اس آیت کی ضمیر مذکر ”علیہ“ وہ اس وجہ سے کہ لفظ شجر

دو نوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ثمر بھی۔ مجمع البیان در ذیل آیہ زیر بحث۔

اُونٹ کو لائق ہوتی ہے۔ یہ تعبیر عشق سوزاں اور عاشقان بے قرار کے بارے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ بعض مفسرین ھیم کو ایسی زمین ریگزار کے معنوں میں جانتے ہیں جس پر جتنا پانی ڈالا جائے وہ سب اس میں جذب ہو جاتا ہے گویا وہ کبھی سیراب نہیں ہوتی۔ زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں ایک مرتبہ پھر اسی کھانے اور پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یہ ہے قیامت میں ان کی پذیرائی کا ذریعہ“۔ (ہذا نزول یوم الدین)۔ یہ ایسی حالت میں ہے کہ جب دوسری طرف اصحابِ مدین بہت ہی لطیف و خوشگوار سایہ میں آرام و سکون سے ہیں، بہترین پھل کھاتے ہیں اور شرابِ مہر و آبِ خوشگوار پیتے ہیں اور عشقِ خدا میں مست ہیں۔ (بسیں تفاوت رہ از کجا است تا کجا)۔ ”نزل“ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے اس وسیلہ اور ذریعہ کے معنوں میں ہے جس سے مہمانِ عزیز کی پذیرائی کرتے ہیں اور بعض اوقات مہمان کے لیے سب سے پہلے لائے جانے والے کھانے اور مشروب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ دوزخی نہ تو مہمان ہیں اور نہ زقوم و محیم پذیرائی کے ذریعے شمار ہوتے ہیں۔ یہ ان پر ایک قسم کا طنز ہے تاکہ وہ اندازہ لگالیں کہ جب ان کی پذیرائی کا یہ عالم ہے تو پھر ان کی معذب صورتِ حال کتنی عبرت ناک ہوگی۔

- ۵۷۔ نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ۔
- ۵۸۔ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُونَ ۚ
- ۵۹۔ ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ۔
- ۶۰۔ نَحْنُ قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَبْبُوقِينَ ۚ
- ۶۱۔ عَلَىٰ أَنْ تُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ۔
- ۶۲۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ۔

ترجمہ

- ۵۷۔ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے، تو پھر نئی آفرینش کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟
- ۵۸۔ کیا اس لطفہ سے تم آگاہ ہو جو رحم میں ڈالتے ہو؟
- ۵۹۔ کیا تم اسے (جنینی دور میں) پے درپے آفرینش دیتے ہو یا ہم خلق کرتے ہیں؟
- ۶۰۔ ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا ہے اور ہم پر کوئی سبقت نہیں رکھتا۔
- ۶۱۔ اس مقصد کے لیے کہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی جگہ لے آئیں اور تمہیں اس جہان میں کہ جسے تم نہیں جانتے تمہیں نئی خلقت بخشیں۔
- ۶۲۔ تم نے پہلے عالم کو تو مان لیا تو کس طرح نہیں سمجھتے کہ اس کے بعد بھی ایک جہان ہے۔

تفسیر

عقیدہ معاد پر سات دلیلیں

گزشتہ آیتوں میں قیامت کی تکذیب کرنے والوں کے ضمن میں گفتگو تھی۔ بنیادی طور پر اس سورہ میں مسئلہ معاد کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور ان آیتوں میں معاد سے متعلق دلیلوں کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ قرآن مجید اس اہم عقیدہ کے ثبوت میں مجموعی طور پر سات دلیلیں پیش کرتا ہے جو ایمان کی بنیادوں کو قوی کرتی ہیں اور انسان کے دل کو خدا کی طرف سے کیے گئے ان وعدوں کے بارے میں پختہ یقین دلاتی ہیں جو گزشتہ آیتوں میں اصحابِ یمین اور اصحابِ شمال کے بارے میں مذکور ہوئے۔ پہلے مرحلہ میں پروردگار عالم فرماتا ہے: ”ہم نے تمہیں خلق کیا ہے تو نئی خلقت کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟“ (نحن خلقناکم فلولا تصدقون)۔

تم قبروں سے اٹھنے پر اور بدن کے خاک ہو جانے کے بعد معاد جسمانی پر کیوں تعجب کرتے ہو۔ کیا اس نے پہلی مرتبہ تمہیں مٹی سے پیدا نہیں کیا؟ کیا امثال و نظائر کا حکم ایک نہیں ہوتا؟ یہ استدلال حقیقت میں اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ یسین کی آیت ۷۸ میں آیا ہے جہاں قرآن ایک مشرک کے جواب میں جس نے ایک بوسیدہ ہڈی ہاتھ میں لے رکھی تھی اور کہتا تھا کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا، کہتا ہے۔ وضرب لنا مثلاً ونسی خلقه قال من یحیی العظام وہی رمیہا الذی انشاھا اول مرة وہو بکل خلق علیہ۔ ”اس نے ہمارے لیے مثال پیش کی اور اپنی پہلی خلقت کو بھول گیا اور اُس نے کہا کون ان بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا کہہ دے وہی جس نے انہیں ابتدا میں خلق کیا تھا وہ اپنی تمام مخلوق سے آگاہ ہے۔ پروردگار عالم بعد والی آیت میں دوسری دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”کیا اس نطفہ سے جسے تم رحم میں ڈالتے ہو تم باخبر ہو؟“

(افریئتمو ما تمنون)۔ کیا جنینی مراحل کے طول میں تم اسے بار بار کی خلقت دیتے ہو یا اس کے خالق ہم ہیں؟ (عانتو تخلقونہ ام نحن الخالقون)۔ کون ہے کہ جو اس بے قیمت نطفہ کو ہر روز ایک نئی شکل دیتا ہے اور خلقت کے بعد نئی خلقت سے نوازتا ہے۔ حقیقتاً یہ تدریجی تبدیلیاں جو نہایت تعجب انگیز ہیں اور جنہوں نے تمام فکر و دانش کو حیرت زدہ کر دیا ہے، کیا تمہاری طرف سے ہیں یا خدا کی طرف سے۔ کیا وہ ذات جو ان بار بار کی خلقتوں پر قدرت رکھتی ہے قیامت میں مڑوں کو زندہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ آیت حقیقت میں سورہ حج کی آیت ۵ سے مشابہت رکھتی ہے جہاں پروردگار عالم فرماتا ہے: یا ایہا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فاننا خلقناکم من تراب شو من نطفۃ شو من علقۃ شو من مضغۃ مخلقة و غیر مخلقة لنبین لکم

لہ ”لولاً“ اصطلاح کے مطابق مخفیض اور کسی کام کی انجام دہی کی تحریک کے لیے ہے اور بعض کے قول کے مطابق اصل میں یہ لم اور لا سے مرکب تھا جو سوال اور نفی کے معنی دیتے ہیں اس کے بعد میم واؤ کے ساتھ تبدیل ہو گیا۔ یہ لفظ ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی فرد یا کچھ افراد کسی کام کے کرنے میں تامل کریں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ کیوں اس طرح اور اُس طرح نہیں کرتے۔

لہ ”مریئتمو“ یہاں رویت سے علم کے معنوں میں ہے نہ کہ آنکھ سے دیکھنے کے معنوں میں۔

ولتفری الارحام ما نشاء الی اجل مستیٰ ثم ینخرجکون طفلاً ۔ اے لوگو! تم قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو تو اس نکتہ کی طرف توجہ کرو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر لطف سے، پھر بستہ شدہ خون سے، پھر مضغ سے (چبائے ہوئے گوشت کی شکل کی ایک چیز) جن میں سے بعض کی شکل و صورت ہے اور بعض شکل و صورت کے بغیر ہیں۔ مقصود کلام یہ ہے کہ ہم تم پر واضح کریں کہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں اور جن شکم مادر والے بچوں کو ہم چاہیں مدت معین تک شکم مادر میں رکھتے ہیں۔ (اور جسے چاہیں اسے ساقل کر دیتے ہیں) پھر تمہیں بچہ کی شکل میں باہر بھیجتے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر اگر اس چیز کو جسے موجودہ زمانے کے ماہرین نے اس بظاہر چیز پانی کے قطرہ کے بارے میں دریافت کیا ہے، پیش نظر رکھیں تو مطلب زیادہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا قول ہے کہ وہ چیز جو انسان کے لطف کی تولید کا باعث بنتی ہے وہ مرد کے لطف "سپرم" اور عورت کے لطف "اول" کا مرکب ہے اور "اسپرم" یعنی مرد کا لطف بہت ہی چھوٹا خوردبین سے نظر آنے والا کیڑا ہے۔ مرد کے ایک مرتبہ کے انزال میں دو سو سے لے کر پانچ سو ملین "اسپرم" موجود ہوتے ہیں۔ (یعنی دنیا کے کئی ممالک کی آبادی کے برابر) اور تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت ہی چھوٹا وجود عورت کے لطف کے ساتھ مل کر نشو و نما پاتا ہے اور حیرت انگیز اضافہ کے ساتھ انسانی بدن کے سیل بناتا ہے اور باوجود اس کے کہ تمام سیل (CELL) ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور بہت جلد ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، ان میں کا ایک گروہ انسان کے دل کی تشکیل کرتا ہے۔ دوسرا ہاتھ پاؤں کی اور ایک اور گروہ کان اور آنکھ کی۔ اور ہر ایک ٹھیک اپنی جگہ قرار پاتا ہے۔ نہ دل کے سیل گروہ کی جگہ جاتے ہیں نہ گروہ کے دل کی جگہ۔ کان کے لیے ظاہر ہونے والے سیل آنکھ کے لیے ظاہر ہونے والوں کی جگہ قرار نہیں پاتے اور نہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ لطف اپنے جنینی دور میں کئی پُر شور جہانوں کو طے کرتا ہے حتیٰ کہ ایک بچے کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ سب خدا کی دوام رکھنے والی صفتِ خالقیت کے زیر سایہ ہے۔ جب کہ اس خلقت کے سلسلہ میں انسان کا ایک معمولی سا نقش ایک ہی لمحے میں مکمل ہو جاتا ہے۔ (اور وہ رحم میں لطف ڈالنے کا لمحہ ہے اور بس۔ تو کیا یہ عقیدہ معاد پر ایک زندہ دلیل نہیں ہے کہ اس قسم کا قادر مطلق مردوں کے زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے؟

اس کے بعد تیسری دلیل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا اور کسی نے ہم پر سبقت نہیں کی (نحن قدرنا بینک الموت وما نحن بمسبوقین)۔ جی ہاں ہم کبھی مغلوب نہیں ہوں گے۔ اور اگر موت کو ہم نے مقدر کیا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ ہم عمر جاودانی نہیں دے سکتے بلکہ مقصد یہ تھا کہ تم میں سے ایک گروہ کو ہم اٹھالیں اور اس کی جگہ دوسرا گروہ لے آئیں اور انجام کار تمہیں ایسے جہان میں کہ جسے تم نہیں جانتے نئی خلقت بخشیں۔ (علیٰ ان نبذل امثالکم وننشکم فی ما لا تعلمون)۔ ان دو آیتوں کی تفسیر میں اس نظریہ کے علاوہ جو ہم نے اوپر بیان کیا ایک اور نظریہ موجود ہے اور وہ یہ کہ دوسری آیت پہلی آیت کے مقصود کا بیان نہیں ہے بلکہ اس کا جزو آخر ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: ہم ہرگز عاجز و مغلوب نہیں ہیں اس سے کہ ایک گروہ کو لے جائیں اور دوسرے گروہ کو اس کا جانشین بنادیں گے۔

۱۔ اولین دانش گاہ جلد ۱ (بحث جنین شناسی) ص ۲۴۱۔

۲۔ اس سلسلہ کی مزید وضاحتیں جلد ۷ سورہ حج کی آیت ۵ کے ذیل میں ہم نے جمع کر دی ہیں۔

۳۔ پہلی تفسیر کے مطابق "علیٰ ان نبذل" کا بار مجوز قدرنا سے متعلق ہے بجز آیت میں آیا ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق "مسبوقین" سے متعلق ہے (غور کیجئے)

”علیٰ ان نبذل امثالکم“ کے جملہ کے بارے میں بھی دو تفسیریں موجود ہیں۔ ایک وہی تفسیر جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ امثال سے مراد خود انسان ہیں جو قیامت میں دوبارہ پلٹ آئیں گے اور مثل کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ انسان اپنی تمام خصوصیات کے ہمراہ واپس نہیں آئے گا بلکہ ایک اور ہی زمانہ میں ہوگا اور جسم و روح کے اعتبار سے نئی خصوصیات کا حامل ہوگا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ بہر حال مقصود کلام یہ ہے کہ موت سے قیامت پر استدلال پیش کیا جائے۔ اس استدلال کی اس طرح وضاحت کی جاسکتی ہے۔ خداوند حکیم جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور باقاعدہ ایک گروہ انتقال کرتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے، اس کا یہ عمل کوئی نہ کوئی مقصد اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر صرف دنیاوی زندگی ہی یہ مقصد ہوتی تو پھر مناسب تھا کہ انسانی زندگی جاودانی ہوتی۔ نہ اس قدر مختصر اور ہزار ہا تکالیف سے لبریز کہ انسان کی آمد و رفت کی قیمت بھی نہیں رکھتی۔ اس بنا پر موت کا قانون بڑی عمدگی سے یہ گواہی دیتا ہے کہ دنیا ایک گزرگاہ ہے منزل نہیں ہے۔ ایک پل ہے نہ کہ ایک مقصد۔ اگر منزل ہوتی اور مقصد ہوتا تو پھر یہ دوام رکھتی۔ ”وَنُفِثْکُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُونَ“۔ ”تمہیں ہم پیدا کرتے ہیں ایسی صورت و شکل میں جسے تم نہیں جانتے“ ظاہر ہے یہ قیامت میں انسان کی خلقت کی طرف اشارہ ہے جو ممکن ہے اس دنیا کی موت و حیات کا مقصد ہو۔ یہ واضح ہے کہ چونکہ کسی شخص نے دارِ آخرت کو نہیں دیکھا لہذا وہ ان اصولوں اور نظاموں سے بے خبر ہے جو دہان رائج ہیں، یہاں تک کہ وہ ان کی حقیقت کا بیان ہمارے الفاظ میں بھی نہیں سہا سکتا۔ ہم دُور سے اس کا ایک ہیولا دیکھتے ہیں۔

ضمنی طور پر اوپر والی آیت اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ ہم تمہیں ایک نئے جہان میں نئی شکل و صورت نئے حالات اور نئی کیفیات میں پیدا کریں گے جس کی تمہیں خبر نہیں ہے۔

آخری آیت میں معاد کی چوتھی دلیل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ثم نشاء اولیٰ (اس جہان) کو جان چکے ہو تو کس طرح قائل نہیں ہوتے کہ دوسرا جہان اس کے بعد ہے؟“ (ولقد علمتوا النشأ الاولیٰ فلولات تذکرون)۔ اس دلیل کو دو طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ پہلی یہ کہ، مثال کے طور پر، اگر ہم ایک بیابان سے گزریں اور اس میں ایسا محل دیکھیں جو بہت آراستہ و پیراستہ ہو، اس کی عمارت میں عظمت و شکوہ ہو، وہ بہت مضبوط ہو، اس میں نہایت عمدہ سہولتیں موجود ہوں اور وہ بہت وسیع و عریض ہو، بعد میں لوگ ہم سے کہیں کہ یہ عظیم عمارت اس مقصد کے لیے ہے کہ صرف ایک چھوٹا سا قافلہ چند گھنٹے اس میں آرام کر کے چلا جائے۔ تو ہم اپنے ذہن میں یہ سوچیں گے کہ یہ کوئی حکیمانہ کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کے مقصد کے لیے مناسب یہ تھا کہ چند چھوٹے چھوٹے خیمے نصب کر دیے جاتے۔ اسی طرح یہ دنیا اتنی عظمت کے ساتھ، یہ تمام کرتے، سورج، چاند اور انواع و اقسام کی زمین میں بسنے والی مخلوقات، یہ تمام چیزیں صرف ایک چھوٹے سے مقصد یعنی انسان کی چند روزہ زندگی کے لیے نہیں بنائی جاسکتیں۔ ورنہ اس جہان کی خلقت فضول اور لا حاصل ہوتی۔ یہ عظیم مقامات انسان جیسے صاحب شرف و جود کے لیے بنائے گئے ہیں تاکہ ان کو دیکھ کر وہ خدا کے عظیم کرم و کرم حاصل کرے۔ ایسی معرفت جو دوسری زندگی کے لیے اس کا سرمایہ ثابت ہو۔ یہ بیان حقیقت میں اس کے مشابہ ہے جو سورہ ص کی آیت ۲۷ میں قیامت کے بارے میں پیش کی گئی ہے: ”وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا“۔ ”ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے فضول نہیں پیدا کیا۔ یہ کافروں کا گمان ہے۔“

دوسری بات، یہ کہ معاد کے منظر تم اس دنیا کے ہر گوشہ میں اپنی آنکھ سے دیکھتے ہو۔ ہر سال نباتات کی دنیا میں قیامت کے منظر کی تکرار ہوتی ہے۔ پروردگار عالم مردہ زمینوں کو بارش کے زندگی بخش قطروں کے نزول سے زندہ کرتا ہے جیسا کہ سورہ نجم سجدہ کی آیت ۳۹ میں فرماتا ہے: ان الذی احیاءھا لمحی الموتی۔ "وہ جو ان مردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے وہی ہے جو مردوں کو زندہ کرے گا۔" سورہ حج کی آیت ۶ میں بھی ان معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

ایک نکتہ

ہمارے اصول فقر میں یہ مسئلہ پیش کیا جاتا ہے کہ احکام شرعی کو قیاس کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ہم کہیں کہ وہ عورت جسے حیض آ رہا ہو چونکہ اپنے روزے قضا کرتی ہے لہذا نماز بھی قضا کرنی چاہیے (اصطلاح کے مطابق ضروری ہے کہ ٹکلی سے جزیئی تک ماہ پیدا کرنی چاہیے نہ کہ جزیئی سے دوسرے جزیئی تک)۔ زیادہ تر علمائے اہل سنت قیاس کو فقہ اسلامی کے سلسلہ میں منالغ تشریع میں سے ایک منہج تسلیم کرتے ہیں۔ ان علماء میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے کہ قیاس کی حیثیت کی نفی میں ہماری ہم نوا ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ قیاس کے بعض طرفداروں نے مندرجہ بالا آیت (ولقد علمتمو النشأة الاولیٰ فلولا تذکرون) سے یہ چاہا ہے کہ اپنے مقصود پر استدلال کریں، اس لیے کہ خدا کتا ہے: نشأة الاخریٰ یعنی قیامت کا نشأة الاولیٰ یعنی اس دنیا پر قیاس کرو۔ مگر یہ استدلال عجیب ہے کیونکہ اولاً جو کچھ اوپر والی آیت میں آیا ہے ایک عقلی استدلال اور منطقی قیاس ہے۔ چونکہ منکرین معاد کہتے تھے کہ خدا کس طرح قدرت رکھتا ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے۔ قرآن ان کے جواب میں کتا ہے وہی ذات والاصفات جراتدا میں تمہیں پیدا کرنے کی قدرت رکھتی تھی۔ وہی بعد میں بھی اس قسم کی قدرت رکھتی ہے۔ احکام شرعی میں قیاس ظنی ہرگز اس طرح نہیں ہے کیونکہ ہم تمام احکام کے مفاد و مصالح پر احاطہ نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ وہ جو قیاس کو ممنوع سمجھتے ہیں انہوں نے "قیاس اولویت" کا استغنا کیا ہے۔ مثلاً قرآن کتا ہے: "ماں باپ کی نسبت معمولی سے معمولی خشونت آمیز بات بھی نہ کرو" تو ہم یہ بدرجہ اولیٰ سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچانی چاہیے۔ زیر بحث آیت بھی "قیاس اولویت" کے قبیل میں سے ہے اور اس قیاس ظنی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی جو متنازع فیہ ہے۔ ابتدا میں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ خدا نے کثرۃ زمین اور مٹی کو پیدا کیا اور انسان کو اس مٹی سے پیدا کیا۔ آخرت کی تخلیق کے لیے کم از کم خاک تو موجود ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی سورہ روم کی آیت ۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں کہ وهو الذی یدعو الخلق شویعیدہ وهو اھون علیہ۔ وہی ہے جس نے آفرینش کا آغاز کیا اس کے بعد اسے لوٹائے گا اور یہ کام اس کے لیے بہت آسان ہے۔ اس گفتگو کو ہم ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہے: عجباً کل العجب للکذب بالنشأة الاخریٰ وهو یری النشأة الاولیٰ وعجبا للمصدق بالنشأة الاخریٰ وهو یسعی لدار الغرور۔ بہت ہی حیران کن ہے اس شخص کا معاملہ جو نشأة الاخریٰ یعنی آخرت کا انکار کرتا ہے جب کہ نشأة الاولیٰ یعنی دنیا کو وہ دیکھتا ہے اور بہت زیادہ تعجب ہے اس شخص پر جو نشأة اخریٰ پر ایمان رکھتا ہے لیکن اس کی ساری جگہ و دود اس دنیا کے لیے ہے۔

۱۔ اس حدیث کو "روح البیان"، "روح المعانی"، "قرطبی" اور "مراغی" نے مختصر سے فرق کے ساتھ خبر کے عنوان کے تحت پیغمبر اسلامؐ کے نام کی تصریح کے بغیر بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی تعبیرات کا انداز یہ ہے کہ یہ حدیث پیغمبرؐ سے کتاب کافی میں اس حدیث کا پہلا حصہ امام علیؑ ابن الحسینؑ سے منقول ہے۔

- ۶۳۔ اَفَرَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ۝
 ۶۴۔ اَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ اَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝
 ۶۵۔ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ۝
 ۶۶۔ اِنَّا لَمُنْفَرِمُونَ ۝
 ۶۷۔ بَلْ نَحْنُ مُحْرِمُونَ ۝

ترجمہ

- ۶۳۔ کیا کبھی اس کے بارے میں غور کیا ہے جو تم کاشت کرتے ہو؟
 ۶۴۔ کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟
 ۶۵۔ اگر ہم چاہیں تو اس زراعت کو مٹھی بھر خشک و کو بیہ گھاس میں اس طرح تبدیل کر دیں کہ تم حیران رہ جاؤ۔
 ۶۶۔ (اس طرح کہ تم کہو) واقعی ہمیں خسارہ ہوا ہے۔
 ۶۷۔ بلکہ ہم نکلی طور پر محروم ہیں۔

تفسیر

دانوں کو اُگانے والا خدا ہے یا تم ہو؟

اس سورہ میں جو سات دلیلیں معاد کے بارے میں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ہم نے اب تک چار دلیلیں پڑھی ہیں۔
 زیر بحث آیت اور آگے آنے والی آیات میں تین اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں جن میں سے ہر ایک انسانی زندگی میں خدا کی قدرت بے پایاں

کا نمونہ ہے۔ ان دلیلوں میں سے ایک غذا کے دانوں کی خلقت سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری پانی سے اور تیسری آگ سے متعلق ہے۔ انسانی زندگی کے تین بنیادی ارکان کو یہی چیزیں تو تشکیل دیتی ہیں۔ نباتات کے دانے انسانی غذا کا اہم ترین جز شمار ہوتے ہیں۔ پانی اہم ترین مشروب ہے اور آگ غذائی مواد اور دیگر امور زندگی کی اصلاح کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: کیا اس میں جسے تم کاشت کرتے ہو کبھی غور کیا ہے؟ (افرع بیتو ما تحرثون)۔ ”کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟“ (انتو تنعوتہ ام نحن الزارعون)۔ جاذب توجہ یہ کہ پہلی آیت میں ”تحرثون“ ہے جس کا مادہ ”حرث“ (بروزن درس) ہے جو کاشت کرنے کے معنی میں ہے (بکھینا اور انہیں نشوونما کے لیے آمادہ کرنا)۔ دوسری آیت میں تنزعون کا لفظ استعمال کرتا ہے جس کا مادہ ”زراعت“ ہے جو اُگلنے کے معنی میں ہے۔ واضح رہے کہ انسان کا کام صرف کاشت کرنا ہے اُسے اُگانا خدا کا کام ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے۔ لا یقولن احدکم زرع و لیقل حرث (فان الزراع هو اللہ) ”تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے زراعت کی بلکہ یہ کہے کہ میں نے کاشت کی کیونکہ زارع حقیقی خدا ہے۔“

اس دلیل کی تشریح اس طرح ہے کہ انسان جو کام زراعت کے سلسلہ میں کرتا ہے وہ بچے کے تولد کے سلسلہ میں جو اس کا کام ہے اس کچھ زیادہ غیر مشابہ نہیں ہے۔ یہ زمین میں صرف دانہ ڈالتا ہے پھر اُگ جاتا ہے۔ یہ خدا ہے جس نے دانہ کے اندر ایک بہت ہی چھوٹا سا زندہ سیل پیدا کیا ہے جو مساعدا محل میں قرار پاتا ہے تو ابتدا میں خود دانہ میں موجود مواد غذائی سے استفادہ کرتا ہے۔ کوئل نکالتا ہے اور جڑ کو مضبوط کرتا ہے۔ پھر عجیب و غریب تیزی کے ساتھ زمین کے مواد غذائی سے مدد حاصل کرتا ہے اور اس گھاس میں عجیب قسم کی مشینری حرکت میں آجاتی ہے جس سے وہ ایک حشر بپا کرتا ہے، تنے شاخ اور خوشہ بناتا ہے اور کبھی تو ایک بیج میں سے کئی سو یا کئی ہزار دانے نکلنے میں لگتے ہیں۔

ماہرین کہتے ہیں کہ وہ ترتیبیں جو ایک گھاس کی ساخت اور اس کے ڈھانچے میں نظر آتی ہیں، ایک ایسے عظیم صنعتی شہر کی ترتیبوں کی طرح ہیں جس میں متعدد کارخانے ہوں اور یہ ترتیبیں بہ نسبت اس صنعتی شہر کی ترتیبوں کے زیادہ تعجب انگیز اور پیچیدہ ہیں۔ کیا وہ ہستی جو اس قسم کی قدرت رکھتی ہے مُردوں کو زندہ کرنے سے عاجز ہے؟ اس حقیقت کے پیش نظر کہ، نباتات کی نشوونما کے سلسلہ میں انسان سوائے دانوں کو زمین میں ڈالنے کے کوئی اور کام نہیں کرتا، بعد والی آیت مزید کہتی ہے: ”اگر ہم چاہیں تو اس زراعت کو مٹھی بھر خشک دو کو بیدہ گھاس میں اس طرح تبدیل کر دیں کہ تم حیران رہ جاؤ۔“ (لو نشاء لجعلناہ حطامًا فظلتو تفکھون)۔ جی ہاں ہم تیز زہری آدھی بیج سے بھری گھاس کے دانوں کے گٹنے سے پہلے ہی خشک کر کے درہم درہم کر دے یا پھر کوئی اور آفت و مصیبت اس پر مسلط کر دیں جو حاصل ہونے والے سرمایہ کو ختم کر دے۔ بڑی دل کا سیلاب اس کی طرف بھیج سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عظیم بجلی کا ایک گوشہ اس پر مسلط کر دیں اس طرح کہ سوائے مٹھی بھر خشک روندی ہوئی گھاس کے اور کوئی چیز باقی نہ رہے اور تم اس منظر کے مشاہدہ سے حیرت و بے ہوشی میں غرق ہو جاؤ۔

۱۔ اس حدیث کا پہلا حصہ تفسیر مجمع البیان میں آیات زیر بحث کے ذیل میں آیا ہے جبکہ دوسرا حصہ روح البیان میں نقل ہوا ہے۔
۲۔ اگرچہ عام طور پر گندم کی بالی میں کئی سو دانے بہت کم نظر آتے ہیں لیکن جیسا کہ اس تفسیر کی پہلی جلد میں مطبوعات کی صریح گواہی کے مطابق جنرلی ایران کے ایک شہر میں بعض کھیتوں میں گندم کے بوٹے بہت بلند اور پُر خوشہ دیکھے گئے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات ایک بوٹے میں چار ہزار دانے موجود تھے۔

اگر حقیقی زراعت تم لوگ خود ہوتے تو کیا یہ امور ممکن تھے؟ تو پھر جان لو کہ یہ سب برکتیں کسی اور جانب سے ہیں۔ ”حطام“ کا مادہ ”حطم“ ہے جو (بروزن ختم) ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کے ٹوٹنے کے ہیں۔ زیادہ تر خشک چیزوں، مثال کے طور پر، بوسیدہ ڈھری یا گھاس کے خشک ٹٹکوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں مراد وہی گھاس ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ ”حطام“ سے مراد یہاں زمین کے نیچے بوسیدہ اور نہ اُگنے والا بیج ہے۔

”تفکھون“ ”فاحکھ“ کے مادہ سے پھل کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ”فکاکھت“ مزاج، خوش طبعی اور ایسی لطیف گوئی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو محافل محبت کی جان ہوتی ہے۔ لیکن کبھی یہ مادہ حیرت اور تعجب کے معنوں میں بھی آیا ہے اور زیر بحث آیت میں اسی قبیل سے ہے۔ یہ احتمال بھی ہے جیسا کہ انسان کبھی غصہ کی حالت میں بھی ہنستا ہے جسے غصہ کا ہنسنا کہتے ہیں۔ وہ سخت اور بڑی مصیبت کے وقت بھی مزاج سے کام لیتا ہے۔ اس بنا پر اس سے یہاں مراد وہ مزاج اور خوش طبعی ہے جو مصیبت کے وقت ہو۔ جی ہاں تعجب کرتے ہو اور حیرت میں ڈوب کر کہتے ہو۔ ”سچ مچ ہم نے نقصان اٹھایا ہے اور ہم سرمایہ کھو بیٹھے ہیں اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔“ (انا لمغر مون)۔

بلکہ ہم تو کئی طور پر بے چارے اور محروم ہیں۔ (بل نحن محرومون)۔ اگر حقیقی زراعت تم ہی ہوتے تو کیا اس قسم کی ضرورت حال ممکن تھی؟ یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ یہ سب آوازیں اور صدائیں اُسی طرف سے ہیں اور وہی ہے جو ایک ناجیز دانہ سے کبھی سرسبز گھاس اور کبھی سینکڑوں یا ہزاروں دانے پیدا کرتا ہے۔ وہ گھاس اور وہ نباتات جن کے دانے انسانوں کی غذا ہیں اور ان کے شاخ و برگ جانوروں کی غذا ہیں اور کبھی ان کی جڑیں اور باقی اجزا انواع و اقسام کی بیماریوں کی دوائیں ہیں۔

۱۔ تفسیر الباقی لازمی در ذیل آیات زیر بحث۔

۲۔ اے، اے اس جملہ میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (وتقولون انا لمغر مون)۔ ”مغر مون“ غرامت کے مادہ سے ہے۔ زیادہ نقصان کرنے اور وقت و سرمایہ ضائع کرنے کے معنوں میں ہے۔

- ۶۸۔ اَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝
 ۶۹۔ اَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ۝
 ۷۰۔ لَوْلَا جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝
 ۷۱۔ اَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝
 ۷۲۔ اَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ ۝
 ۷۳۔ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكَرَةً وَنَذَارًا لِّلْمُتَّوِّينَ ۝
 ۷۴۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝

ترجمہ

- ۶۸۔ کیا اس پانی پر غور کرتے ہو جسے تم پیتے ہو؟
 ۶۹۔ کیا تم ایسے بادل سے نازل کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں؟
 ۷۰۔ اگر ہم چاہیں تو اس خوشگوار پانی کو تلخ کر دیں تو کیوں تم شکر نہیں کرتے؟
 ۷۱۔ کیا اس آگ پر غور کیا ہے جسے تم روشن کرتے ہو؟
 ۷۲۔ کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم نے کیا ہے؟
 ۷۳۔ ہم نے اسے سب کے لیے یاد آوری اور مسافروں کے لیے مایہ زندگی قرار دیا ہے۔
 ۷۴۔ جب ایسا ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر (اور اس کی پاکیزگی کو بیان کر)

تفسیر

یہ پانی اور آگ کس کی طرف سے ہیں ؟

پہرہ دار عالم سورہ واقعہ کی ان آیتوں میں معاد کی پھٹی اور ساتویں دلیل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ آیتیں اس قدرت و اختیار کو بیان کرتی ہیں جو اُسے ہر چیز پر حاصل ہے اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچاتی ہیں کہ وہ مردوں کو زندہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے ”کیا تم نے اس پانی پر غور کیا ہے جسے تم پیتے ہو“ (افرویتو الماء الذی تشربون) ”کیا تم اسے بادل سے نازل کرتے ہو یا ہم نازل کرتے ہیں؟“ (انتم انا نزلتموه من المزن ام نحن المنزلون)۔ ”مزن“ (بروزن حزن) جیسا کہ ”راغب“ ”مفردات“ میں کہتا ہے۔ ”واضح بادلوں“ کے معنی میں ہے۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی برسنے والے بادل لیے ہیں۔

یہ آیتیں انسان کے وجدان میں سوالات کا ایک سلسلہ قائم کرتی ہیں اور اس سے اقرار لیتی ہیں اور درحقیقت کہتی ہیں: کیا اس پانی کے بارے میں جو تمہاری زندگی کا باعث ہے اور تم ہمیشہ اسے پیتے ہو کبھی غور کیا ہے؟ کون ہے جو سورج کو حکم دیتا ہے کہ سطح سمندر پر چمکے؟ وہ کون ہے جو کڑوے اور نمکین پانیوں میں سے صرف خالص شیریں پانی کے اجزا کو، جو ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہیں، بخار کی شکل میں آسمان کی طرف بھیجتا ہے؟ کون ہے جو ان بخارات کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اور ایک دوسرے میں سما کر پانی برسانے والے بادلوں کو تشکیل دیں؟ ہواؤں کو چلنے کا حکم کون دیتا ہے؟ بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے الگ کون کرتا ہے اور پھر انہیں خشک و مردہ زمینوں کی بلندیوں پر بھیجتا ہے؟ کس نے ہوا کے اوپر والے حصے کو یہ خاصیت بخشی ہے کہ سرد ہونے کے موقع پر آہستہ آہستہ بخارات کو جذب کرنے کی قوت کھو بیٹھیں اور اس کے نتیجے میں موجود بخارات قطروں کی شکل میں نرم و ملائم صورت میں آہستہ آہستہ زمین پر گریں؟ اگر سورج اپنا کام چھوڑ دے، ہوائیں چلنے سے رک جائیں، فضا کے اوپر والے حصے بخارات کو اصرار کر کے اپنے اندر روک لیں آسمان زمین کے بارے میں بخیل ہو جائے اس انداز میں کہ زراعتیں اور نخلستان اپنے لب تر نہ کر سکیں تو تم سب شدت تشنگی سے ہلاک ہو جاؤ گے اور تمہارے جانور، باغات اور زراعتیں سب خشک ہو جائیں گے۔ تو پھر سوچو جو قدرت رکھتا ہے کہ اس قسم کے آسان ذرائع سے اس طرح کی برکتیں تمہارے لیے فراہم کرے کیا مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا؟ یہ تو خود ایک قسم کا مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ مردہ زمینوں کو زندہ کرنا توحید و عظمت خدا کی بھی دلیل ہے اور قیامت و معاد کی بھی۔ اور اگر ہم مندرجہ بالا آیتوں میں دیکھتے ہیں کہ صرف پینے کے پانی پر انحصار کیا گیا ہے اور اس کی تاثیر سے جانوروں اور نباتات کی زندگی کے لیے پانی کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ آیتوں میں زراعت کے معاملہ پر گفتگو ہوئی تھی لہذا تکرار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ قابل توجہ یہ بات ہے کہ انسانی زندگی میں پانی کی اہمیت اور اس کے اثرات، نہ صرف یہ کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ، صنعتوں کے وجود میں آنے اور انسان کے علم و دانش کی ترقی کے باوجود کم نہیں ہوئے بلکہ، اس کے برعکس، صنعتی انسان پانی کا زیادہ محتاج ہے۔ اسی لیے ہمت سے عظیم صنعتی ادارے صرف بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے واقع ہیں اور ان کی کارکردگی انہی مقامات سے وابستہ ہے۔ آخر کار بعد والی آیت میں اس بحث کی تکمیل کے لیے مزید کہتا ہے: ”اگر ہم چاہیں تو اس میٹھے اور خوشگوار پانی کو کڑوے اور نمکین پانی میں تبدیل کر دیں“ (لو نشاء جعلناہ اجاباً)۔

” تو پھر کیوں اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔“ (فلولا تشکرون)۔ جی ہاں اگر خدا چاہتا تو پانی میں حل شدہ نمکیات کو اجازت دیتا کہ وہ پانی کے اجزاء کے ساتھ بخار بنے اور اس کے ساتھ آسمان کی طرف چلی جائے اور کڑوے اور نمکین بادلوں کی شکل بنائے اور بارش کے قطرے شور و تبلیغ سمندر کے پانی کا ذائقہ لیے ہوئے اُدپر سے نیچے گریں۔ لیکن اس نے اپنی قدرت کاملہ سے نمکین پانی کو یہ اجازت نہیں دی۔ نہ صرف پانی کے نمکین حصہ کو بلکہ ایذا رساں، مضر صحت، اور تکلیف دہ جراثیم کو بھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ پانی کے بخارات کے ہمراہ آسمان کی طرف بلندی پر جائیں اور بارش کے قطروں کو آلودہ کریں۔ اسی بنا پر بارش کے قطرے، جس وقت فضا آلودہ نہ ہو، زیادہ خالص پاکیزہ اور خوشگوار پانی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ”اجاج“ کا مادہ ”اج“ (بروزن ج) ہے۔ یہ اصل میں ”ایج“ سے لیا گیا ہے جس کے معنی آگ کے بھڑکنے اور جلانے کے ہیں۔ اس پانی کو جو کڑوا ہٹ، نمکیات اور حرارت کی وجہ سے منہ کو جلا دے ”اجاج“ کہتے ہیں۔ اس گفتگو کو ہم پیغمبر اسلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ ان التبی كان اذا شرب الماء قال الحمد لله الذي سقانا عذبا فخراتا برحمته ولو يجعله ملحا اجاجا بذنوبنا۔ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانی نوش فرماتے تو ارشاد فرماتے :

” حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے اپنی رحمت سے ہمیں میٹھے اور خوشگوار پانی سے سیراب کیا اور اسے ہمارے گناہوں کی وجہ سے نمکین اور کڑوا نہیں بنایا۔“

انجام کار ہم اسی سلسلہ آیات میں ساتویں اور آفری دلیل تک پہنچتے ہیں۔ وہ ساتویں دلیل آگ کی خلقت ہے۔ آگ جو انسانی زندگی کے آلات و اسباب میں سب سے زیادہ اہم ہے اور تمام صنعتوں میں زیادہ مؤثر ذریعہ ہے اس کو موضوع بنا کر خدا فرماتا ہے: ”کیا اس آگ کے بارے میں جسے روشن کرتے ہو کبھی تم نے غور و فکر سے کام لیا ہے؟“ (افریت النار التي تورون)۔ کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم نے پیدا کیا ہے؟ (انتوا انشأتوا شجرتها ام نحن المنشئون)۔ ”تورون“ کا مادہ ”وری“ (بروزن نفی) ہے اس کے معنی پھیلانا ہیں۔ وہ آگ جو آگ جلانے کے وسائل میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کو چنگاری سلگا کر باہر نکالیں تو اسے ”وری“ اور ”ابرہ“ کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے۔ پہلی چنگاری پیدا کرنے اور آگ جلانے کے لیے موجودہ زمانہ میں ماچس اور لائٹ سے کام لیا جاتا ہے کبھی لوبہ اور چمقماق سے یہی کام لیتے تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے رگڑتے تھے تو اس میں سے چنگاری نکلتی تھی لیکن حجاز کے دیہاتی دو قسم کے مخصوص درختوں سے جو صحرا میں اُگتے ہیں اور ”مرخ“ اور ”عفاس“ کہلاتے ہیں ان سے وہ آگ جلانے والی لکڑیوں کے نام سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ پہلی لکڑی کو نیچے رکھ لیتے اور دوسری کو اس کے اُپر پتھر اور چمقماق کی مانند ان میں سے چنگاری نکلتی۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کی انہی معانی میں تفسیر کی ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ آگ جو اس قسم کے درختوں میں پھیلی ہوئی ہے اور اس سے ماچس یا چمقماق کی طرح فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، پروردگار اسے اپنی انتہائی قدرت پر دلالت کرتا ہے کہ شجر اخضر (سرسبز درخت) میں آگ پیدا کی ہے حالانکہ پانی درخت کی جان ہے۔ پانی کہاں اور آگ کہاں۔ وہ ذات پاک جو اس قسم کی قدرت رکھتی ہے کہ پانی اور آگ کو ایک دوسرے کے اندر محفوظ رکھے وہ مژدوں کو لباس حیات پہنانے سے کس طرح قاصر ہو سکتی ہے اور بروز قیامت انہیں کس طرح زندہ نہیں کیتی! سوا کے لیے اسی دلیل سے مشابہت رکھتی ہوئی دلیل سورہ یسین کی آخری آیات میں بھی آئی ہے۔ (الذی جعل لکون الشجر الاخضر نارا فاذا انبتومنه لوفقدون) ”وہی ذات جس نے سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کی اور تم اس کے ذریعہ آگ

روشن کرتے ہو۔ (سین - ۸۰) لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ قرآنی تعبیر ہو سکتا ہے ایک زیادہ لطیف دلیل یعنی قوتوں کی قیامت کی طرف اشارہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہاں گفتگو صرف ماچس اور لائٹر وغیرہ کی نہیں ہے بلکہ وہ چیزیں مراد ہیں جو جلانے کے کام آتی ہیں یعنی لکڑیاں اور ایندھن وغیرہ جو جل کر یہ ساری طاقت اور حرارت ہم پہنچاتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے علمی لحاظ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ آگ جو آج ہم لکڑیوں کے جلنے کے وقت دیکھتے ہیں یہ وہ حرارت ہے جو درختوں نے طویل عرصہ کے درمیان سُورج سے حاصل کی ہے اور اپنے اندر اس کا ذخیرہ کر لیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سُورج کی پچاس سال کی چمک اور روشنی درخت کے تنے سے ختم ہو گئی ہے۔ ہم اس سے غافل ہیں کہ وہ حرارت درخت میں جمع ہے۔ جس وقت آگ کی چمکاری خشک لکڑیوں تک پہنچتی ہے اور وہ جلنے لگتی ہیں تو درخت وہ حرارت اور روشنی واپس کر دیتا ہے۔ یعنی اس طرح یہاں قیامت بپا ہوگی اور مژدہ طاقتیں از سر نو زندہ ہو جائیں گی اور وہ ہم سے کہیں گی وہ خدا جس نے ہماری قیامت برپا کر دی ہے وہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ تم انسانوں کی قیامت بھی برپا کر دے۔ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے تفصیلی بحث جلد ۱۸ کی طرف رجوع کریں۔ "تورون" جس کے معنی آگ جلانا ہیں۔ اگرچہ یہاں عام طور پر اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد ماچس وغیرہ سے فائدہ اٹھانا ہے لیکن اس میں کوئی شے مانع نہیں ہے کہ اس سے مراد ایندھن ہو کیونکہ بہر حال اس میں آگ پوشیدہ ہوتی ہے جو ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دونوں تفسیروں ایک دوسرے سے متضاد بھی نہیں ہیں پہلے معنی عام لوگ سمجھتے ہیں اور دوسرے معنی جو زیادہ دقیق ہیں وہ زمانے کے گزرنے اور علم و دانش کی ترقی کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بعد والی آیت میں مذکورہ بالا مباحث کی تاکید کے لیے مزید فرماتا ہے: "ہم نے اس آگ کو جو درختوں سے خارج ہوتی ہے اور ان کے لیے یاد دہانی کا ذریعہ اور مسافروں کے لیے زندگی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ (نحن جعلناھا تذکرة و متاعا للمقوين)۔ سبز درختوں میں سے آگ کا ظاہر ہونا ایک طرف بے جان بدنوں میں قیامت کے دن مروجوں کے واپس آنے کو یاد دلاتا ہے اور دوسری طرف آتش و دوزخ کا احساس دلاتا ہے۔ نیز فرماتا ہے: "نار ککو هذه التي توفقدون جن من سبعین جن من نار جھنم۔"

یہ آگ جو تم جلاتے ہو جہنم کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

باقی رہی تعبیر (متاعا للمقوين) کی تو وہ اس آگ کے دنیاوی فوائد کی طرف ایک مختصر اور پُر معنی اشارہ ہے۔ کیونکہ مقویوں کی دو تفسیروں کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ مادہ "قواء" (بروزن کتاب) سے مشتق ہے جس کے معنی خشک اور خالی بیابان کے ہیں۔ اس بنا پر مقویں ان افراد کو کہتے ہیں جو صحراؤں میں پھرتے ہیں اور چونکہ صحرائیں انشین افراد عام طور پر فقیر ہوتے ہیں لہذا یہ تعبیر بعض اوقات فقیر کے معنی میں بھی آئی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ قوت کے مادہ سے طاقتور کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر لفظ مذکور ایسے الفاظ میں سے ہے جو دو متضاد معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ آگ اور درخت (ماچس اور ایندھن وغیرہ) سب کے لیے ذریعہ استفادہ ہیں لیکن چونکہ مسافر سردی کو دور کرنے اور کھانا پکانے کے لیے خصوصاً پُرانے زمانے کے سفر میں جو قافلوں کے ذریعے ہوتے تھے، خصوصیت سے ان چیزوں کے حاجت مند تھے لہذا انہی کے ذکر پر انحصار کیا گیا۔ "اقویا" طاقتوروں کا آگ سے فائدہ اٹھانا اپنی زندگی کی وسعت یعنی سہولتوں کی بنا

پر واضح ہے۔ خصوصاً اگر اس بحث کو ہم موجودہ زمانے تک لے آئیں کہ کس طرح وہ حرارت جو انواع و اقسام کی آگ سے پیدا ہونے والی ہے اور وہ دنیا کے صنعت کو متحرک کرتی ہے اور کارخانوں کے عظیم پتیلوں کو گردش میں لاتی ہے اگر یہ حرارت یہ شعلہ عظیم (جو سب کا سب درختوں سے متعلق ہے یہاں تک کہ وہ آگ جو پتھر کے کوئلہ یا مٹی کے تیل کے مواد سے حاصل کی جاتی ہے، وہ بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ درختوں ہی سے متعلق ہے) کسی دن بجھ جائے تو نہ صرف یہ کہ چراغ تمدن گل ہو جائے بلکہ انسانوں کی زندگی کا چراغ بھی خاموش ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ آگ انسانی انکشافات میں سے ایک بہت اہم چیز ہے جب کہ اس کے تمام اثرات کا سرچشمہ خلقت و آفرینش ہی ہے اور انسان کی کاوش کا دخل اس میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جس وقت سے آگ دریافت ہوئی ہے، بشریت نے اپنے تمدن کے ایک نئے مرحلہ میں قدم رکھا ہے۔ جی ہاں قرآن مجید نے اس ایک مختصر سے جملہ میں ان تمام حقائق کی طرف اجمالی اور سربستہ شکل میں اشارہ کیا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں پہلے تو آگ کا معنوی فائدہ پیش ہوا ہے جو یقیناً قیامت کی یاد دہانی تھا۔ اس کے بعد اس کا دنیاوی فائدہ بیان ہوا اور وہ اس لیے کہ پہلا فائدہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے بلکہ اصل و اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تین نعمتوں (غذائی اناج، پانی اور آگ) کے ذکر کے موقع پر ایک خاص ترتیب رکھی گئی ہے جو پورے طور پر ایک طبعی ترتیب ہے۔ سب سے پہلے انسان غذا میں استعمال ہونے والے دانوں کو لیتا ہے اس کے بعد ان دانوں میں پانی ملتا ہے پھر اسے آگ پر رکھ کر پکاتا ہے۔ اور اس قابل بناتا ہے کہ انہیں بطور غذا استعمال کیا جائے۔ آخری زمرہ بحث آیت میں نتیجہ پیش کرتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے: "اب جب کہ ایسا ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اسے پاک و منزہ شمار کر"۔ (فسیح باسمو ربك العظیم)۔

جی ہاں وہ خدا جس نے یہ سب نعمتیں پیدا کی ہیں جن میں سے ہر ایک اس کی توحید قدرت اور عظمت پر دلالت کرتی ہے اور قیامت کا ثبوت ہے۔ وہ ہر قسم کے عیب و نقص سے مبرا و منزہ ہے۔ وہ پروردگار بھی ہے عظیم بھی ہے اور قادر مطلق بھی۔ اس جملہ میں اگرچہ تنہا پیغمبر اسلام سے خطاب ہے لیکن یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ اس سے مراد تمام انسان ہیں۔

ایک نکتہ

یہاں ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیات سے متعلق ہم پیغمبر اسلام اور امیر المومنین علیؑ کی چند حدیثیں پیش کریں۔
۱۔ تفسیر روح المعانی میں ایک حدیث حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ ایک رات نماز کے بعد سورہ واقعہ کو پڑھتے ہوئے جب آپ (افرویتو ما تمنون) انتو تخلقونہ ام نحن الخالقون) پر پہنچے تو آپ نے تین مرتبہ عرض کیا۔ (بل انت یارب) "بلکہ تو ہی (انسان کا خالق ہے)۔ اسے پروردگار" اور جس وقت انتو تزعونہ ام نحن الزارعون) پر آئے تو پھر تین مرتبہ عرض کیا۔ (بل انت یارب) "بلکہ زراعت حقیقی اسے پروردگار تو ہی ہے"۔ اس کے بعد جس وقت (و انتم انزلتموہن المزن ام نحن المنزلون) پر آئے تو پھر تین مرتبہ عرض کیا۔ (بل انت یارب)۔ "اسے پروردگار تو ہی ہے۔ (جو بادلوں سے مینہ برساتا ہے)۔ اس کے بعد (انتو انشأتہو شجر فہا ام نحن المنشئون) کی تلاوت فرمائی تو پھر تین مرتبہ عرض کیا۔

۲۔ "یا" باسمو ربك میں ہو سکتا ہے تقدیر کے لیے ہو (اس طرح سے کہ (صح) کا فعل متعدی بمنزلہ لازم لیا گیا ہو) بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ یہاں "یا" استعانت کے لیے ہے یا زائدہ ہے یا ملاسبت کے لیے ہے لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔

(بل انت یارب) ” تو ہی ہے (جس نے آگ پیدا کرنے والے درختوں کو پیدا کیا)۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مناسب یہ ہے کہ انسان ان جملوں کا اقتضائے حال کے مطابق جواب دے اس طرح جیسے خدا اُس سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس حقیقت کو اپنی رُوح میں جاگزیں کرے اور صرف غور و فکر سے عارجِ بجا تلاوت پر قناعت نہ کرے۔

۲۔ ایک دوسری حدیث میں پیغمبر اسلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لَا تَمْنَعُوا عِبَادَ اللَّهِ فَضْلَ الْمَاءِ وَلَا كَلَامَ وَلَا نَامًا فَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى جَعَلَهَا مَتَاعًا لِلْمُقْوِينَ وَقُوَّةً لِلْمُسْتَغْفِينَ۔ ”تمہارے پاس جو فالتو پانی ہو اسے بنگاؤ خدا کو استعمال کرنے سے کبھی نہ روکنا۔ اسی طرح اُس اضافی چراگاہ اور آگ کا معاملہ ہے جو تمہارے اختیار میں ہو، لوگوں کو اُس کے استعمال سے نہ روکنا، کیونکہ خدا نے انہیں مسافروں کی زندگی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کی قوت کا سبب قرار دیا ہے۔“

۳۔ ایک اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ جس وقت فَسَّحَ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ کی آیت پیغمبر پر نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا: اجعلوها فی رکوعکمْ اسے اپنا ذکر رکوع قرار دو۔ (اپنے رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّ الْعَظِيمِ و بحمدہ کہا کرو)۔

۱۔ تفسیر روح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۳۰۔

۲۔ تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۶۱۔

۳۔ اس حدیث کو مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ایک صحیح حدیث کے عنوان کے ماتحت درج کیا ہے (جلد ۹ ص ۲۲۴) اور یہ حدیث کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں بھی ہے۔ (مطابق تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۵) اور اسی طرح تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۶۸ پر بھی درج ہے۔

- ۷۵۔ فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْجِ النُّجُومِ ۝
 ۷۶۔ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّوَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ۝
 ۷۷۔ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝
 ۷۸۔ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝
 ۷۹۔ لَا يَسُئُ إِلَّا الْأُطْهَارُونَ ۝
 ۸۰۔ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝
 ۸۱۔ أَفَبِهَذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ ۝
 ۸۲۔ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْتُمْ تُكْذِبُونَ ۝

ترجمہ

- ۷۵۔ قسم ہے ستاروں کی جگہ اور ان کے محل طلوع و غروب کی۔
 ۷۶۔ اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔
 ۷۷۔ کہ وہ قرآن کریم ہے۔
 ۷۸۔ جو ایک محفوظ و مکنون کتاب میں ہے۔
 ۷۹۔ سوائے پاکیزہ لوگوں کے کوئی اسے مس نہیں کر سکتا۔

۸۰۔ یہ ایسی چیز ہے جو پروردگار عالین کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

۸۱۔ کیا اس بات کو (اس قرآن کو ان اوصاف کے ساتھ جو بتائے گئے ہیں) کمزور اور

چھوٹا سمجھتے ہو؟

۸۲۔ اور جو رزق اس نے تمہیں دیا ہے بجائے شکر کے اس کی تکذیب کرتے ہو؟

تفسیر

صرف پاکیزہ افراد حرم قرآن تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں

ان بہت سے مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قیامت کے بارے میں سات دلیلوں کے ساتھ آئے ان آیات میں گفتگو قرآن مجید کی اہمیت کے بارے میں ہے کیونکہ مسئلہ نبوت اور مسئلہ نزول قرآن مبدا و معاد کے مسائل کے بعد اہم ترین اعتقادی ارکان کو تشکیل دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید توحید و معاد جیسے دو اصولوں کے پس منظر کے لیے عمیق بحث پیش کرتا ہے اور مسئلہ نبوت نزول قرآن کے مرتبہ کا استحکام توحید و معاد کا استحکام شمار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ایک بڑی قسم کے ساتھ گفتگو شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”قسم ہے ستاروں کی جگہ کی اور ان کے محل طلوع و غروب کی“ (فلا أقسم بمواقع النجوم)۔ بہت سے مفسرین کا یہ عقیدہ ہے کہ ”لا“ یہاں نفی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ”زائد“ ہے اور تاکید کے لیے ہے۔ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں یہی تعبیر روز قیامت، نفس لوامہ، مشرق اور مغربوں کے پروردگار اور پروردگار شفق کی قسموں کے سلسلہ میں آئی ہے۔ بعض دوسرے مفسرین ”لا“ کو یہاں نفی کے معنوں میں لیتے ہیں اور اس طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ موضوع قسم اس سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے۔ جیسا کہ روزمرہ ہم دیکھتے ہیں کہ میں فلاں چیز کی قسم نہیں کھاتا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ قرآن میں خدا کی پاک ذات کی صراحت کے ساتھ قسم کھائی گئی ہے تو کیا ستارے خدا سے بہتر و برتر ہیں کہ ان کی قسم نہ کھائی جائے۔ مفسرین نے مواقع النجوم کے بارے میں متعدد تفسیریں پیش کی ہیں۔ پہلی وہی جو ہم نے ابھی بیان کی یعنی ستاروں کی جگہ اور ان کے مدار و گزر گاہ کی قسم۔ دوسرے یہ کہ مراد ان کا محل طلوع و غروب ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے ستاروں کا قیامت میں گرنامراد ہو۔ بعض نے اس کی صرف ستاروں کے غروب کے ساتھ تفسیر کی ہے اور بعض نے، چند روایات کی پیروی کرتے ہوئے، اسے قرآن کے مختلف حصوں کے مختلف زمانی فاصلوں کے ساتھ نزول کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ (کیونکہ نجوم جو نجوم کی جمع ہے وہ تدریجی کاموں کے بارے میں استعمال ہوتی ہے اور ان سے معانی کے درمیان منافات بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ سب معانی زیر بحث آیت کی تفسیر میں شامل ہوں۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان آیات کے نزول کے وقت اکثر لوگ اس قسم کی اہمیت کو نہیں جانتے تھے لیکن اس زمانہ میں ہم پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ آسمان کے ستاروں میں سے

ہر ایک کی ایک معین جگہ ہے اور اس کا مدار قانون جاذبہ و دافعہ کے مطابق معین و مقرر ہے اور بہت ہی دقیق حساب کے مطابق ہے اور ان میں سے ہر ایک کی سرعت رفتار ایک معین پروگرام کے مطابق طے پاتی ہے۔ جو کڑے زیادہ دور واقع ہیں ان کا بالکل ٹھیک حساب لگانا اگرچہ ممکن نہیں ہے لیکن نظام شمسی، جو ہم سے قریب کے ستاروں کا خاندان تشکیل دیتا ہے اس میں صحیح مطالعہ بروئے کار لایا جاسکتا ہے اس کے مداروں کا نظام اس حد تک قطعی اور صحیح حساب ہے کہ انسان کے دماغ کو حیران کر دیتا ہے۔ جس وقت ہم اس نکتہ کی طرف توجہ کریں کہ ماہرین کی گواہی کے مطابق صرف ہماری کمکشال میں تقریباً ایک ہزار ملین ستارے موجود ہیں اور عالم میں اس کے علاوہ اور بہت سی کمکشالیں ہیں جن میں سے ہر ایک کی ایک مخصوص سمت ہے تو ہمیں قرآن کی اس قسم کا اندازہ ہوتا ہے اللہ والعلم الحدیث نامی کتاب میں ہم پڑھتے ہیں کہ ماہرین علم الافلاک کا نظریہ ہے کہ یہ ستارے جو اربوں سے زیادہ تعداد میں ہیں ان میں سے بعض کو بغیر کسی مددگار کے صرف اپنی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے اور ان میں سے بہت زیادہ حصہ کو سوا ٹیلیسکوپ کی مدد کے نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ ان ستاروں کا ایک حصہ تو ٹیلیسکوپ کے ذریعے بھی نہیں دیکھا جاسکتا۔ صرف مخصوص قسم کے وسائل سے ان کی تصویر لی جاسکتی ہے۔ یہ سب اپنے مخصوص مدار میں تیرتے ہیں اور اس بات کا کوئی بھی احتمال نہیں ہے کہ ان میں سے ایک کسی دوسرے کے ایسے علاقہ میں، جہاں اس کی کشش کام کر رہی ہو موجود ہو یا یہ کہ یہ ستارے ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں۔ فی الحقیقت ان ستاروں کا ٹکراؤ ایسا ہی ہے جیسے ہم فرض کریں کہ ایک بحری جہاز جو ایک سمندر میں ہے وہ دوسرے اس جہاز سے جو دوسرے بڑے سمندر میں ہو ٹکرا جائے جب کہ دونوں جہاز ایک ہی سمت میں اور ایک ہی رفتار سے چل رہے ہوں۔ اس قسم کا احتمال اگر محال نہیں تو بعید ضرور ہے۔

ستاروں کی کیفیت اور وضع کے سلسلہ میں ان علمی انکشافات کی طرف توجہ کرتے ہوئے مذکورہ بالا قسم کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے اسی بنا پر بعد والی آیت میں پروردگار عالم مزید فرماتا ہے: ”یہ بہت ہی بڑی قسم ہے اگر تم جان لو۔“ (وانہ لقسو لوتعلمون عظیمیہ)۔ ”لوتعلمون“ (اگر تم جان لو) کے الفاظ اچھی طرح گواہی دیتے ہیں کہ انسان کا علم اور اس کی دانش اُس زمانے میں اس حقیقت کا مکمل طور پر ادراک نہیں کر سکے تھے اور یہ خود قرآن کا ایک علمی اعجاز شمار ہوتا ہے کہ ایسے زمانے میں جب کہ شاید ایک گروہ یہ خیال کرتا تھا کہ ستارے چاندنی کی میخیں ہیں جو آسمان کی پھت میں ٹھونکی گئی ہیں۔ اس قسم کا بیان، اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو فی الحقیقت جہالت و نادانی سے مملو تھا، ممکن نہیں تھا کہ ایک عام انسان سے صادر ہو۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ عظیم قسم کس مقصد کے لیے بیان ہوئی ہے۔ بعد والی آیت اس کے رُخ سے پردہ اٹھاتی ہے اور کہتی ہے: ”جو کچھ محمدؐ لے کر آئے ہیں وہ قرآن کریم ہے۔“ (انہ لقرآن کریم)۔ اور اس طرح ان کج فہم اور ضدی مشرکین کو جن کا ہمیشہ یہ اصرار تھا کہ یہ آیتیں ایک قسم کی کہانت ہیں، یا نعوذ باللہ جنون آمیز باتیں ہیں، یا شعراء کے اشعار کی طرح ہیں، یا پھر شیاطین کی طرف سے ہیں، یہ جواب دیتا ہے کہ یہ وحی آسمانی ہے اور ایسا کلام ہے جس کی عظمت کے آثار بالکل نمایاں ہیں اور اس کے موضوعات و مضامین اس کے مبداء نزول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ صورت حال اتنی واضح ہے کہ محتاج بیان نہیں ہے قرآن کی تعریف لفظ کریم کے ساتھ (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ کرم جب خدا سے متعلق ہو تو اس کے معنی احسان و انعام کے ہیں اور انسان سے متعلق ہو تو قابل تعریف اخلاق و اعمال کے حامل ہونے کے معنی میں ہے) مجموعی طور پر عظیم اوصاف کی طرف اشارہ ہے۔

اور قرآن کے فصیح و بلیغ لفظوں اور جملوں کے اعتبار سے اس کی ظاہری خوبصورتیوں اور پرکشش موضوعات و مضامین کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اس لیے کہ یہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور وہ ہر جمال و کمال اور غری و زیبائی و خوبصورتی کا مبداء و منشا ہے۔ جی ہاں قرآن جس کا کلام وہ بھی کریم ہے اور خود قرآن بھی کریم ہے اور اس کو لانے والا بھی کریم ہے اور اس کے مقاصد بھی کریم ہیں۔ اس کے بعد اس آسمانی کتاب کی دوسری صفت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یہ آیات ایک مستور اور پوشیدہ کتاب میں ہیں“ (فی کتاب مکنون)۔ اس لوج محفوظ (علم خفا) میں جو ہر قسم کی خطا و لغزش اور تغیر و تبدل سے مصون ہے۔ واضح ہے کہ وہ کتاب جس کا اس قسم کا سرچشمہ ہے اور اس کا اصلی نسخہ وہاں ہے وہ ہر قسم کی تبدیلی، خطا اور شک و شبہ سے محفوظ ہے۔ تیسری صفت کے سلسلہ میں فرماتا ہے: ”اس کتاب کو پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی مس نہیں کر سکتا۔ (لایمسہ الا المطہرون)۔“

بہت سے مفسرین نے ان روایات کی پیروی کرتے ہوئے جو ائمہ معصومین سے منقول ہیں اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ غسل و وضو کے بغیر قرآن کی تحریر کو ہاتھ نہ لگایا جائے جب کہ دوسرا گروہ اس آیت کو ایک ایسا اشارہ سمجھتا ہے جو اُن پاک و پاکیزہ فرشتوں کی طرف ہے جو قرآن سے آگاہی رکھتے ہیں یا وہ قلب بغیر پر نازل وحی کا ذریعہ تھے۔ مشرکین جو کہتے تھے کہ یہ کلمات شیاطین نے آنحضرتؐ پر نازل کیے ہیں ان کے نقطہ نظر کے مقابل بعض مفسرین اسے اس طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے بلند حقائق و مفہیم کا پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی ادراک نہیں کر سکتا جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲ میں پڑھتے ہیں۔ (ذالک الکتاب لاریب فیہ ہدی للمتقین) اس کتاب میں کوئی شک نہیں یہ پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ پاکیزگی کی کم سے کم حد، جو حقیقت جوئی کی روح ہے وہ قرآن کے کمترین ادراک کے لیے لازمی ہے اور جس قدر پاکیزگی و طہارت زیادہ ہوگی موضوعات و مفہیم قرآن کا ادراک انسان کے لیے اتنا ہی زیادہ ممکن ہوگا۔ ان تینوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے لہذا ممکن ہے مفہوم آیت میں یہ سب شامل ہوں۔

پروردگار عالم قرآن مجید کی چوتھی اور آخری توصیف کے سلسلہ میں فرماتا ہے: ”یہ قرآن عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے“ (تنزیل من رب العالمین)۔

وہ جو تمام اہل جہاں کا مربی و مالک ہے اُس نے اس قرآن کو انسانوں کی تربیت کے لیے پیغمبرؐ کے پاکیزہ دل پر نازل کیا ہے اور جس طرح عالم سکون میں وہی مالک و مربی ہے عالم تشریع میں بھی جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”کیا اس قرآن کو ان اوصاف کے ساتھ جو بتلئے گئے ہیں کمزور اور چھوٹا شمار کرتے ہو۔ آسان ہے تو اس کی تکذیب کرتے ہو؟ (افہذا الحدیث انتو مدہنون)۔ جب کہ اس سے صدق و حقانیت کی نشانیاں اچھی طرح واضح ہوتی ہیں۔ تو چاہیے کہ تم کلام خدا کو انتہائی کاوش کے ساتھ قبول کرو اور ایک حقیقت واقعی سمجھ کر اس کے سامنے جاؤ۔“ ”ہذا الحدیث“ ”یہ بات“ قرآن کی طرف اشارہ ہے اور ”مدہنون“ ”دھن“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی روغن اور تیل کے ہیں۔ چونکہ بدن کی کھال یا دوسری چیزوں کو نرم کرنے کے لیے روغن ملتے ہیں اس لیے لفظ ”ادھان“ نرمی سے پیش آنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کبھی سستی اور مقابلہ نہ کرنے کی کیفیت کے لیے بھی آتا ہے۔ چونکہ منافقین اور بھوٹے افراد کی عام طور پر ملائم زبان ہوتی ہے، اس بنا پر یہ لفظ کبھی تکذیب و انکار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

لہ ”لایمسہ“ جملہ خبریہ ہے جو نہی یا نفی کے معنی میں ہو سکتا ہے۔

تہ تنزیل یہاں مصدر ہے اسم مفعول کے معنی میں یعنی منزل کے معنی میں اور مبتداء محذوف کی خبر ہے یا خبر کے بعد خبر ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ان دونوں معانی کا احتمال ہے۔ اصولی طور پر انسان جس چیز کو باور کرتا ہے اسے پوری قوت اور مضبوطی سے پکڑتا ہے اور اگر مضبوطی سے نہ پکڑے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسے باور نہیں کرتا۔ زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں فرماتا ہے : ”تم بجائے اس کے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں، خصوصاً قرآن جیسی عظیم نعمت، کا شکر ادا کرو تم اس کی تکذیب کرتے ہو۔“ (وتجعلون رزقکم انکم تکذبون)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قرآن میں سے تمہارا حصہ صرف یہ ہے کہ تم اس کی تکذیب کرتے رہو یا تم نے تکذیب کو اپنا ذریعہ معاش قرار دے لیا ہے۔ لیکن آخری دو تفسیروں میں سے پہلی تفسیر گزشتہ آیات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور اس شان نزول کے ساتھ بھی زیادہ ہم آہنگ ہے جو اس آیت کے لیے بیان ہوئی ہے کیونکہ بہت سے مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک سفر میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ انہیں شدید پیاس لگی۔ پیغمبر اسلام نے دُعا فرمائی۔ نتیجتاً بارش کا نزول ہوا اور سب سیراب ہو گئے۔ اسی دوران میں پیغمبر اسلام نے سنا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ فلاں ستارے کے طلوع کی وجہ سے بارش ہوئی۔ (عرب زمانہ جاہلیت میں ”انوار“ کا عقیدہ رکھتے تھے اس سے ان کی مراد ایسے ستارے تھے جو مختلف فصلوں میں آسمان پر ظاہر ہوتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان میں سے ہر ستارے کے ظہور کے ساتھ بارش ہوتی ہے اس لیے وہ کہتے تھے (مطرنا بنو فلاں)۔ یہ بارش فلاں ستارے کے طلوع کی برکت کی وجہ سے ہے اور یہ بھی شرک و بُت پرستی و ستارہ پرستی کا ایک ادنیٰ مظاہرہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے بہت کم آیتوں کی تفسیر کی ہے منجملہ ان چند آیتوں کے جن کی آپ نے تفسیر کی ہے ایک آیت یہ ہے ”وتجعلون رزقکم انکم تکذبون“۔ آپ نے فرمایا کہ : ”اُس سے مراد یہ ہے کہ اپنی روزی کے شکر کی بجائے تم تکذیب کرتے ہو۔“

چند نکات

۱۔ قرآن مجید کی خصوصیات

ان چار اوصاف سے جو مندرجہ بالا آیتوں میں قرآن کے بارے میں بیان ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کی عظمت ایک تو اس کے موضوعات و مضامین کی وجہ سے ہے دوسرے اس کے معانی کے عمق کی وجہ سے ہے تیسرے اس پاکیزگی کی وجہ سے ہے نیک اور پاک افراد کے سوا کوئی اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور چوتھے اس وجہ سے کہ یہ حد سے زیادہ تربیتی پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ ان چاروں موضوعات میں سے ہر موضوع مفصل بحث کا محتاج ہے جسے ہم نے

۱۔ اس تفسیر کے مطابق یہاں شکر کا لفظ معذوف ہے اور تقدیر عبارتوں میں ہے۔ ”وتجعلون رزقکم انکم تکذبون“ یا شکر کیا ہے شکر رزق کا۔

۲۔ ان دونوں تفسیروں کے مطابق کوئی چیز مقدر نہیں ہے۔

۳۔ اس حدیث کو طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے تفسیر در المنثور جلد ۶، ص ۱۶۳۔ قرطبی جلد ۹، ص ۶۳۹۸۔ مراغی جلد ۲۴، ص ۱۵۲۔ اور روح المعانی جلد ۲۴، ص ۱۱۵ نے بھی مختصر سے فرق کے ساتھ زیر بحث آیات کے ذیل میں اسے نقل کیا ہے۔

۴۔ تفسیر در المنثور جلد ۶، ص ۱۶۳۔ نور الثقلین جلد ۵، ص ۲۲۴۔

مناسب آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

۲۔ قرآن و طہارت

مندرجہ بالا آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ قرآن کو پاک لوگوں کے علاوہ کوئی مس نہیں کرتا اور ہم نے بتایا ہے کہ اس آیت کی مس ظاہری سے بھی تفسیر ہوئی ہے اور مس معنوی سے بھی اور دونوں تفسیریں آپس میں تضاد بھی نہیں رکھتیں۔ اور آیت کے مفہوم کلی میں موجود ہیں۔ پہلے حصہ میں روایاتِ اہل بیت میں حضرت ابوالحسن امام علی ابن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے :

المصحف لا تقسه علی غیر طہر ولا جنبا ولا تمس خطہ ولا تعلقہ ان اللہ تعالیٰ یقول : لا یمسہ الا المطہرون

قرآن کو وضو کے بغیر مس نہ کر اور جنابت کی حالت میں بھی مس نہ کر اور اس حالت میں اس کی تحریر کو مت چھو اور اسے حائل نہ کر کیونکہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے سوائے پاکیزہ لوگوں کے اسے کوئی مس نہیں کرتا۔

یہی معنی ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مختصر فرق کے ساتھ منقول ہیں :

متابع اہل سنت میں بھی آیا ہے اور مختلف طرق سے بھی نقل ہوا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا :

لا یمس القرآن الا طہا۔

”قرآن کو پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی مس نہ کرے۔“

مس معنوی کے بارے میں ابن عباس کے ذریعے پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

”انہ لقراں کریم فی کتاب مکنون“ قال عند اللہ فی صصف مطہرة لا یمسہ الا المطہرون قال المقربون۔

”یہ قرآن کریم ہے جو پوشیدہ (روح محفوظ) کتاب میں ہے، خدا کے پاس پاکیزہ صفحات میں ہے اور سوائے پاکیزہ لوگوں کے اسے کوئی مس نہیں کرتا، پاک لوگوں سے مراد مقربین ہیں۔“

یہ مطلب از روئے عقل بھی مدلل ہے کیونکہ قرآن مجید اگرچہ سب لوگوں کی ہدایت کے لیے ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہت سے ایسے لوگ تھے جو قرآن کو پیغمبرؐ کے لب ہائے مبارک سے سُنتے تھے اور اس آبِ زلالِ حقیقت کو سرچشمہ وحی میں دیکھتے تھے لیکن چونکہ تعصب، عناد اور ہٹ دھرمی کا شکار تھے انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا لیکن جن لوگوں نے تھوڑا سا اپنے آپ کو پاک کیا اور حق جوئی کے جذبے اور تحقیق کی روح کے ساتھ اس کی طرف آئے وہ ہدایت پا گئے۔ اس بنا پر جس شخص میں جس قدر انسانی پاکیزگی زیادہ

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱ ص ۲۶۹۔ حدیث ۳۔ اس حدیث کے مطابق ابوہریرہؓ کی آیت میں نفی نہیں سے کنایہ ہے۔

۲۔ وسائل الشیعہ جلد ۱ ص ۲۷۰۔ حدیث ۵۔

۳۔ یہ حدیث در المنثور میں عبد اللہ ابن عمرؓ، معاذ ابن جبلؓ اور ابن حزم کے واسطے سے پیغمبرؐ سے منقول ہے ج ۶ ص ۱۶۲

۴۔ در المنثور ج ۶ ص ۱۶۲

ہوگی اور تقویٰ زیادہ ہوگا وہ قرآن مجید سے زیادہ عمیق مفہام حاصل کر سکے گا۔ لہذا یہ آیت اس طرح جسمانی اور روحانی دونوں بہتوں سے منطبق ہوتی ہے۔ بغیر کسے یہ امر واضح ہے کہ ذات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ائمہ معصومین اور ملائکہ مقربین اس کے زیادہ واضح مصداق ہیں اور وہ حقائق قرآن کا سب سے بہتر ادراک کرتے ہیں۔

- ۸۳۔ فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ ۖ
 ۸۴۔ وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ ۖ
 ۸۵۔ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ ۖ
 ۸۶۔ فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۖ
 ۸۷۔ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۖ

ترجمہ

- ۸۳۔ پس کیوں جب کہ رُوح گلے تک پہنچ جائے گی۔ (اے واپس لوٹانے کی تم توانائی نہیں رکھتے) ؟
 ۸۴۔ اور تم اس حالت میں نظارہ کرو گے۔ (اور کوئی کام تمہارے ہاتھ سے نہیں ہوسکے گا)۔
 ۸۵۔ اور ہم اس سے زیادہ نزدیک ہیں تمہاری نسبت لیکن تم دیکھتے نہیں ہو۔
 ۸۶۔ اگر تمہارے اعمال کی تمہیں بالکل جزا نہ دی جائے۔
 ۸۷۔ تو پھر اس کو لوٹا دو اگر سچ کہتے ہو۔

تفسیر

جس وقت کہ جان گلے تک پہنچ جائے گی

منجملہ دیگر حساس لمحات کے جو انسان کو بہت زیادہ گہری فکر میں مستغرق کر دیتے ہیں احتضار یعنی انسانی زندگی کے اختتام کا لمحہ ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے کہ جہاں معاملہ انسان کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے اور اس پاس کھڑے ہوئے لوگ جان کنی میں مبتلا فرد کو ناامیدی سے دیکھتے ہیں کہ یہ شمع کی طرح ہے جس کی زندگی ختم ہو چکی ہے اور آہستہ آہستہ بجھ رہی ہے۔ وہ زندگی سے رخصت ہوتا ہے۔ اس وقت اس کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔ جی ہاں انسان کا مکمل ضعف ان حساس لمحات میں آشکار ہو جائے گا۔ نہ صرف گزشتہ زمانوں میں، بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی، علاج کی تمام سہولتوں کے باوجود، جان کنی کے عالم کی زبوں حالی باکل گزشتہ دور کی طرح واضح و آشکار ہے۔ قرآن مجید معاد کے مباحث کی تکمیل اور منکرین و مکذبین کی جواب دہی میں اس لمحے کی گویا تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے: ”پس کیوں جس وقت جان گلے میں آجائے گی تو اس کو واپس لوٹانے کی طاقت تم نہیں رکھتے“ (فلولا اذا بلغت الحلقوم)۔

”اور تم اس حالت میں نظارہ کرو گے اور تم سے کچھ نہیں ہو سکے گا“ (وانتو حينئذ تنظرون)۔ یہاں مخاطب وہ لوگ ہیں جو جان کنی میں مبتلا فرد کے متعلقین ہیں۔ ایک تو وہ اس کی خستہ حالت کو دیکھیں گے، دوسرے اپنی بے چارگی و ناتوانی کو محسوس کریں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ موت و حیات خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے اور وہ اس سے بھی باخبر ہیں کہ ان کا اپنا انجام بھی یہی ہونا ہے۔

اس کے بعد پروردگار عالم مزید فرماتا ہے: ”حالانکہ تمہاری نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہیں اور ہمارے فرشتے جو اس کی رُوح قبض کرنے کے لیے آمادہ ہیں، وہ بھی تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہیں لیکن تم نہیں دیکھتے“ (ونحن اقرب اليه منك و لكن لا تبصرون)۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جان کنی میں مبتلا شخص کی جان پر کیا گزر رہی ہے اور اس کے وجود کی گہرائی میں کیسا تلاطم برپا ہے اور وہ ہم ہی ہیں جس نے اس کی رُوح کے قبض کرنے کا معین وقت پر فرمان جاری کیا ہے لیکن تم تو صرف اس کے ظاہری حالات کو دیکھتے ہو اور اس گھر سے دوسرے گھر کی طرف انتقال سے اور ان طوفانوں سے جو اس وقت برپا ہیں، تم بے خبر ہو۔ اس بنا پر اس آیت سے مراد خدا کا جان کنی میں مبتلا فرد سے قریب ہونا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد رُوح قبض کرنے والے فرشتہ کا نزدیک ہونا ہے لیکن پہلی تفسیر آیت کے ظاہر سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ بہر حال نہ صرف اس موقع پر بلکہ ہر حالت میں خدا ہر شخص کی نسبت ہم سے زیادہ نزدیک ہے یہاں تک کہ وہ خود ہم سے بھی ہم سے زیادہ نزدیک ہے۔ اگرچہ ہم بے خبری کی وجہ سے اس سے دور ہیں۔

آیت عنفوت رکعتی ہے جس کا گزشتہ آیات سے استفادہ ہوتا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے: (فلولا اذا بلغت الحلقوم لا ترجعونها ولا

تملكون شيئا)۔ یہاں فعل کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ نفس کی طرف لوٹتا ہے۔

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ یہاں مخاطب جان کنی میں مبتلا ہونے والا شخص ہے، بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ بعد والی آیت واضح کرتی ہے

کہ مخاطب اس کے متعلقین اور ارد گرد بیٹھنے والے افراد ہیں۔

اس حقیقت کا اظہار جاں کنی کے موقع پر دیگر تمام موقعوں کی نسبت زیادہ واضح و آشکار ہے۔ اس کے بعد مزید تاکید کے لیے اور اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے مزید فرماتا ہے: ”اگر تمہیں تمہارے اعمال کی بالکل جزا نہ دی جائے۔ (فلولا ان كنتو غید مدینین)۔ تو پھر اس کو واپس لوٹا دو اگر تم سچے ہو“ (ترجمنہ ان كنتو صادقین)۔ یہ تمہارا ضعف اس بات کی دلیل ہے کہ موت و حیات کا مالک کوئی اور ہے اور جزا و سزا کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور وہ وہی ہے کہ جو مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ ”مدینین“ جمع ہے ”مدین“ کی۔ یہ دین کے مادہ سے ہے جس کے معنی جزا میں۔ بعض نے اس کے معنی مرلوبین بتائے ہیں یعنی اگر اب تمہارا کوئی اور نہیں ہے اور اپنے امر کے تم خود ہی مالک ہو تو اس کو واپس لوٹا دو۔ یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ تم کسی اور کے محکوم ہو۔

چند نکات

۱۔ جبارین کی ناتوانی کا لمحہ

حقیقت میں ان آیات کا مقصود کلام یہ ہے کہ موت و حیات کے مسئلہ پر خدا کے اختیار کو بیان کیا جائے تاکہ اس سے مسئلہ معاد تک ایک پل بنایا جاسکے۔ اس موقع پر موت اور جاں کنی کا انتخاب انسان کی مکمل ناتوانی اور اس کے ضعف کے ظہور کی وجہ سے ہے۔ باوجود اس تمام اختیار کے جس کو وہ اپنے لیے خیال کرتا ہے، یہ امر معیوب نہیں کہ بعض ایسے جبار لوگوں کی طرف ہم توجہ کریں جن کے اوج قدرت و اختیار میں ان کی موت کا لمحہ آیا ہے تاکہ ان آیتوں کی گہرائی زیادہ آشکار ہو۔ مسعودی نے مروج الذهب میں مامون اور اس کی فرج کی دم سے جنگ کے بارے میں ایک داستان بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ مامون جس وقت میدان جنگ سے لوٹ رہا تھا تو وہ ”بدیدوں“ نامی چشٹے پر پہنچا جو قشیرہ کے علاقہ میں مشہور ہے۔ آرام کرنے کی غرض سے اس نے وہاں پڑاؤ کیا۔ اس چشٹے کے پانی کی صفائی، ٹھنڈک اور چمک نے اسے بہت مسرور کیا اور اس طرح وہ اس علاقہ کی شادابی، تازگی اور باشاشت سے بہت خوش ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ درختوں کو کاٹ کر چشٹے پر ایک پل بنا دیں اور اس پر لکڑیوں اور پتوں سے ایک جھت بنا دیں۔ وہ وہاں آرام کرنے لگا اس حالت میں کہ بانی اس کے پاؤں کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ پانی اس قدر صاف و شفاف تھا کہ اس نے ایک درہم پانی کے اندر پھینکا جو پانی کی تہ میں پہنچ گیا لیکن اس پر جو تحریر کندہ تھی وہ صاف پڑھی جا رہی تھی۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ کوئی اس میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک مچھلی جو خاصی بڑی تھی، تقریباً ایک ہاتھ کے برابر ہوگی، وہ ظاہر ہوئی مچھلی بالکل ایک چاندی کے ٹکڑے کی طرح تھی۔ مامون نے کہا جو شخص اس کو پکڑ کر لائے گا میں اس کو تلوار انعام میں دوں گا۔ ایک خدمت گار نے پیش قدمی کی اور اس کو پکڑ لیا۔ جس وقت اس مچھلی کو وہ مامون کی خدمت میں لایا تو مچھلی نے طنزاً سر کر دیا اور وہ خدمت گار کے ہاتھ سے نکل کر باہر گر پڑی اور ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح پانی میں گر گئی۔ اس کے گرنے سے تھوڑا سا پانی مامون کے گلے سینے اور شانوں پر پڑا اور اس کا لباس خاصا بھیگ گیا۔ خدمت گار دوبارہ پانی میں اتر گیا اور اس نے مچھلی کو پکڑ لیا اور اس کو ایک رد مال میں لپیٹ کر مامون کے سامنے رکھ دیا اس حالت میں کہ وہ مچھلی حرکت کر رہی تھی۔ مامون نے کہا ابھی ابھی اسے بھون کر سُرخ کرو۔ اسی اثنا میں مامون اچانک سردی کی وجہ سے کانپنے لگا اور حالت یہ ہوئی کہ وہ دو قدم چل نہیں سکتا تھا۔ اُسے کئی لحاف اوڑھائے گئے مگر وہ پھر بھی کپکپاتا رہا۔ وہ پتلا رہا تھا سردی سردی۔ اس کے لیے آگ جلائی گئی پھر بھی اسے آفاقہ نہ ہوا۔ اسی اثنا میں مچھلی سُرخ کر کے اس کے لیے لے آئی لیکن وہ اس کو چیکھ بھی نہ سکا۔ جب اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تو بجائے شروع اور ابن ماسویہ جو دونوں شاہی طبیب تھے طلب کیے گئے اس وقت مامون

نزع کے عالم میں تھا۔ بختیشوع نے اس کا ایک ہاتھ اور ابن ماسویہ نے دوسرا ہاتھ پکڑ کر اس کی نبض دیکھی جو مکمل طور پر غیر معتدل تھی اور اس کی موت کی خبر دے رہی تھی۔ اس حالت میں اُسے ایک خاص قسم کا پسینہ آ رہا تھا جو تیل کی طرح چپکنے والا تھا۔ یہ دونوں طبیب اس کی تشخیص میں منہمک تھے۔ ان دونوں نے اقرار کیا کہ انہوں نے ایسی کسی مرض کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ بہر حال جو صورت حال ہے وہ اس کی موت کی خبر دیتی ہے۔ مامون کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی تو کھنے لگا مجھے کسی اونیچی جگہ لے چلو جہاں سے میں اپنے لشکر کو دیکھ سکوں۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اسے اونیچی جگہ پر لے جایا گیا۔ وہاں سے جب اس نے اپنے لشکریوں کے غیموں اور اس بہت سی آگ کو دیکھا جو لشکر نے اپنے پڑاؤ میں روشن کر رکھی تھی تو اس نے کہا: یا من لایزول ملکہ ارحو من قد زال ملکہ۔ اے وہ خدا جس کی حکومت کو کبھی زوال نہیں ہے اس پر رحم کر جس کی حکومت رو بہ زوال ہے۔ اس کے بعد اُسے اٹھا کر لائے اور بستر پر لٹا دیا گیا اور ایک شخص کو اس کے پاس بٹھایا جو اسے شہادتین کی تلقین کرے۔ چونکہ مامون کی سماعت کمزور ہو چکی تھی، اس شخص نے اپنی آواز بلند کی تو ابن ماسویہ نے کہا فریاد نہ کر اور اونیچی آواز نہ نکال خدا کی قسم وہ اس وقت خدا اور "مانی" کے درمیان فرق نہیں کر سکتا۔ اس وقت مامون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے اتنے سُرخ ہو چکے تھے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے ابن ماسویہ کی خبر لے لیکن اس پر اُسے قدرت نہ تھی۔ بس اسی لمحہ اس کی جان نکل گئی بلکہ

ہو سکتا ہے کہ اس کی بیماری پہلے سے ہو یا بعض مؤرخین کے بقول جو شخص اُس چشمے کا پانی پیتا تھا بیمار ہو جاتا تھا۔ وہ پھلی زہریلے اثرات رکھتی تھی۔ جو کچھ بھی تھا اُس کی حکومت و قدرت چند لمحوں میں ختم ہو گئی اور بڑے بڑے جنگ کے میدانوں کا قیران و سپلاؤ موت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ اس لمحے کسی میں قدرت نہ تھی کہ وہ اس کے لیے کوئی قدم اٹھائے یا کم از کم اسے اس کی اصل منزل یعنی اس کے گھر تک لے جائے۔ تاریخ کے دامن میں اس قسم کی بہت سی عبرت انگیز داستانیں ہیں۔

۲۔ کیا جانکنی تدریجی امر ہے ؟

جان کے گلے تک پہنچنے کی تعبیر جو گزشتہ آیات میں آئی ہے (فلولا اذا بلغت الحلقوم) وہ زندگی کے آخری لمحات کا کنایہ ہے۔ شاید اس کا منشا یہ ہے کہ زیادہ تر اعضائے بدن ہاتھ پیر وغیرہ موت کے وقت باقی اعضا سے پہلے بیکار ہو جاتے ہیں اور گلا وہ عضو ہے جو سب سے آخر میں بیکار ہوتا ہے سورہ قیامت کی آیت ۲۶ میں ہم پڑھتے ہیں۔ (کلا اذا بلغت التراقي) کفار کبھی ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ رُوح ان کی (ترقوہ) ہنسی کی ہڈی تک پہنچ جائے۔ (ترقوہ وہ ہڈیاں ہیں جو حلق کے اطراف کو گھیرے ہوئے ہیں)۔

- ۸۸۔ فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۖ
- ۸۹۔ فَرُوحٌ وَرِيحَانٌ ۖ وَجَنَّتٌ نَّعِيمٌ ۖ
- ۹۰۔ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۖ
- ۹۱۔ فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۖ
- ۹۲۔ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ ۖ
- ۹۳۔ فَنُزْلٌ مِّنْ حَبِيمٍ ۖ
- ۹۴۔ وَتَصْلِيَةٌ جَّحِيمٍ ۖ
- ۹۵۔ إِنَّ هَذَا لَهَوْحٌ لِّيَقِينِ ۖ
- ۹۶۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۖ

ترجمہ

- ۸۸۔ لیکن اگر وہ مقربین میں سے ہو ۔
- ۸۹۔ تو رُوح و ریحان اور ہر نعمت بہشت میں ہے ۔
- ۹۰۔ اور اگر اصحابِ یمن میں سے ہے ۔
- ۹۱۔ تو اس سے کہا جائے گا تجھ پر سلام ہو تیرے دوستوں کی طرف سے جو اصحابِ یمن میں سے ہیں ۔

- ۹۲۔ لیکن اگر وہ تکذیب کرنے والے گمراہوں میں سے ہو۔
۹۳۔ تو دوزخ کے جوش دیے ہوئے پانی سے اس کی تواضع ہوگی۔
۹۴۔ اس کے بعد اس کی سرنوشت یہ ہوگی کہ اس کا دوزخ میں درود ہوگا۔
۹۵۔ یہ وہی حق و یقین ہے۔
۹۶۔ اب جب کہ لیا ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اُسے پاک شمار کر۔

تفسیر

نیکو کاروں اور بدکاروں کا انجام

یہ آیات اس سورہ کی ابتدائی اور آخری آیات کا ایک قسم کا امتزاج ہیں۔ یہ آیتیں جب انسان موت کے آستانے پر ہو تو اس کی حالت کے تغیر کی تصویر کشی کرتی ہیں کہ کس طرح بعض لوگ انتہائی آرام و سکون اور راحت و خوشی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ اور ایک دہ گروہ ہے جو جہنم کی آگ کے دُور سے نظر آنے والے نظارے کی وجہ سے انتہائی اضطراب و وحشت کے عالم میں جان بیٹھتے ہیں۔ پہلے فرماتا ہے: "جن شخص پر جاں کنی کا عالم طاری ہوتا ہے اگر وہ مقررین میں سے ہو (فاما ان کان من المقربین) تو انتہائی راحت و آرام میں ہے اُسے نعمتوں سے لبریز جنت میں جگہ مل جائے گی۔ (فروح وریحان و جنة نعیم)۔

"روح" بروزن "قول" جیسا کہ علمائے لغت نے کہا ہے اصل میں تنفس کے معنی میں ہے اور ریحان خوشبودار گھاس یا کسی خوشبودار چیز کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے بولا گیا ہے جو سبب حیات و راحت ہو۔ جیسا کہ "ریحان" ہر قسم کی نعمت اور فرحت بخش روزی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر روح و ریحان انسان کے آرام کے تمام وسائل اور خدائی نعمت و برکت پر محیط ہیں۔ دُور لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ روح ان تمام امور کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو تکالیف سے رہائی بخشنے تاکہ وہ سکھ کا سانس لے سکے۔

باقی رہا "ریحان" تو وہ ان نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو تکالیف سے رہائی کے بعد انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اسلامی مفسرین نے ان ہر دو الفاظ کے لیے متعدد تفسیریں تجویز کی ہیں جو غالباً دس تفسیروں سے زیادہ ہیں۔ کبھی انہوں نے کہا ہے کہ "روح" کے معنی رحمت اور ریحان ہر شرافت و فضیلت کو کہتے ہیں اور کبھی کہا ہے کہ "روح" جہنم کی آگ سے نجات کو اور "ریحان" جنت میں داخلہ کو کہتے ہیں اور کبھی "روح" اس آرام و سکون کو کہتے ہیں جو قبر میں میسر آئے۔ اور "ریحان" کے معنی وہ سکون ہے جو بہشت میں حاصل ہو۔ کبھی "روح" سے مراد کشف الکروب (بے آرامیوں کا برطرف ہونا) لیا ہے اور "ریحان" کی تفسیر غفران الذنوب کی ہے۔ کبھی "روح" کو (الظلالی وجہ اللہ) اور "ریحان" کو استماع کلام اللہ شمار کیا ہے اور اس قسم کی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے

کہا ہے۔ یہ سب اس جامع مفہوم کے مصداق ہیں جن کا ذکر آیت کی تفسیر میں ہوا۔ قابل توجہ یہ ہے کہ ”روح“ اور ”ریحان“ کے ذکر کے بعد جنت نعیم کی گفتگو درمیان میں لائی گئی ہے جو ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ ”روح و ریحان“ موت کے وقت اور قبر و برزخ اور بہشت میں مومن کو حاصل ہوں گے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

فاما ان كان من المقربين فروح وريحان يعنى في قبره وجنة نعيم يعنى في الآخرة۔

”لیکن اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لیے قبر میں روح و ریحان ہے اور اس کے لیے آخرت میں پُر نعمت بہشت ہے۔“

اس کے بعد پروردگار عالم فرماتا ہے: ”لیکن اگر دوسرے گروہ یعنی اصحاب یمین میں سے پہل و ہی نیک اور صالح مرد اور عورتیں جن کے نامہ اعمال کامیابی اور قبولیت کی نشانی کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے (وامان کان من اصحاب الیمین)۔ تو اس سے کہا جائے گا تجھ کو تیرے ان دوستوں کی طرف سے سلام ہو جو اصحاب یمین میں سے ہیں۔ (فسلام لك من اصحاب الیمین)۔ اس طرح روح قبض کرنے والے فرشتے انتقال کے وقت اس کے دوستوں کا سلام اسے پہنچائیں گے جیسا کہ اس سورہ واقعہ کی آیت ۲۶ میں اہل بہشت کی تعریف و توصیف میں ہم نے پڑھا ہے (الّا قیلاً سلاماً سلاماً) اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی موجود ہے، اور وہ یہ کہ یہ سلام فرشتوں کی طرف سے ہو جو اس سے کہیں گے تجھ پر سلام ہو اے وہ شخص جو اصحاب یمین میں سے ہے یعنی تیرے اعزاز و افتخار و تعریف و توصیف کے لیے یہی کافی ہے کہ تو ان کی صف میں قرار پایا ہے۔“

دوسری قرآنی آیات میں بھی مومنین کو موت کے موقع پر فرشتوں کا سلام آیا ہے مثلاً سورہ نحل کی آیت ۳۲ جس میں پروردگار عالم فرماتا ہے: الذین تتوفاهم الملائكة طیبین یقولون سلام علیکوادخلوا الجنة بما کنتم تعملون۔

”وہ لوگ کہ فرشتے جن کی رُوحوں کو قبض کرتے ہیں در آنحالیکہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں۔ وہ ان سے کہتے ہیں تم پر سلام ہو جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کی بنیاد پر جنہیں تم انجام دیتے تھے۔“

یہ سلام کی تعبیر بہت پُر معنی ہے چاہے وہ سلام فرشتوں کی طرف سے ہو چاہے اصحاب یمین کی طرف سے۔ وہ سلام جو ”روح و ریحان“ اور ہر قسم کی سلامتی و سکون و آرام ہے اور نعمت کی نشانی ہے۔“

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اصحاب الیمین (وہ لوگ جن کے نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے) کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ عام طور پر انسان اپنے اہم اور ماہرانہ کام دائیں ہاتھ سے انجام دیتا ہے لہذا دایاں ہاتھ ہمارت، توانائی اور کامیابی کی علامت ہے۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۸ حدیث ۱۰۳، ۱۰۴۔

۲۔ ”روح“ ہو سکتا ہے مبتدلے محذوف کی خبر ہو اور تقدیر عبارت یہ ہو۔ (فجنۃ روح) اور یا مبتدلے خبر محذوف ہے اور تقدیر عبارت (فہ روح) ہے اور پورا جملہ فروح اما کی جزا ہے اور ان شرطیہ اس جزا کے ہوتے ہوئے دوسری جزا سے مستثنیٰ ہے (غور فرمائیے)

۳۔ اس بنا پر آیت میں دو تقدیریں ہیں۔ اس شکل میں لایا ہے کہ سلام لك انك من اصحاب الیمین لیکن پہلی تفسیر کی بنا پر صرف ایک ہی تقدیر ہے اور وہ (یقال له)۔ ان سلاموں کے بارے میں جو جنتیوں پر نثار ہوں گے جلد ۱۸ ص ۲۰ سورہ یسین کی آیت ۵۸ کے ذیل میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا :

(ھو شیعتنا و محبوبنا)

”اصحابِ مبین ہمارے شیعہ اور ہمارے دوست ہیں“۔

اس کے بعد ہم تیسرے گروہ کو عنوانِ کلام بناتے ہیں جنہیں سورہ کے اوائل میں اصحابِ شمال کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے : ”لیکن اگر وہ تکذیب کرنے والے گمراہوں میں سے ہو“ (واما ان کان من المکذبین الضالین)۔ تو اس کی دوزخ کے کھولتے ہوئے اور زہریلے پانی سے ضیافت و پذیرائی ہوگی۔ (فذل من حمیم)۔

اور اس کے بعد اس کی قسمت یہ ہے کہ اس کا جہنم میں درود ہوگا۔ (وتصلیۃ جحیم)۔ جی ہاں موت کی آمد پر خدا کی طرف سے نازل ہونے والے ابتدائی عذاب وہ چکھیں گے اور قبر و برزخ میں قیامت کے عذابوں کے تلخ ذائقہ ان کے حصہ میں آئیں گے اور چونکہ گفتگو محض کے بارے میں ہے مناسب یہ ہے کہ ”فذل من حمیم“ کا جملہ برزخ کے عذاب کے بارے میں ہے اور ”وتصلیۃ جحیم“ قیامت کے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ یہ معنی متعدد روایات میں آئمہ اہل بیتؑ سے منقول ہیں۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ محکذبین اور ضالین کا ذکر ایک جگہ ہوا ہے جن میں سے پہلے کا تعلق قیامت، خداوند یکتا اور نبوتِ پیغمبر کی تکذیب سے ہے اور آیت میں اسی طرف اشارہ ہے اور دوسرے کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو راہِ حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔ یہ تفسیر اس کے علاوہ کہ تاکید کے معنوں میں ہے، اس نکتہ کی طرف اشارہ بھی ہو سکتی ہے کہ گمراہوں کے درمیان ایسے مستضعف و جاہل اور قاصدِ راہِ حق سے عناد نہیں رکھتے نہ ہٹ دھرمی کا شکار ہیں تو اس بات کا امکان ہے کہ ان کے حال پر اللہ کا لطف و کرم ہو۔ لیکن ایسے تکذیب کرنے والے جو حق سے عناد رکھتے ہوں اور ہٹ دھرم ہوں ان کا نصیب وہی ہوگا جو اوپر بیان ہو چکا ہے ”حمیم“ کھولتے ہوئے پانی یا گرم اور زہریلے ہواؤں کے معنی میں ہے اور تصلیہ کا مادہ ”صلی“ (بروزن سعی) ہے اس کے معنی جلنا اور آگ میں داخل ہونا ہے۔ باقی متعدی رہا وہ تصلیہ جو متعدی کے معنی رکھتا ہے وہ صرف جلانے کے معنی میں آتا ہے۔ اس گفتگو کے آخر میں مزید فرماتا ہے : ”یہ وہی حق و یقین ہے“ (انّ هذا هو حق الیقین)۔ اب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اُسے منترہ شمار کر۔ (فسبح باسم ربک العظیم)۔ منترین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ (حق الیقین) اضافتِ بیانیہ کے قبیل میں ہے یعنی جو کچھ مقررین، اصحابِ مبین اور تکذیب کرنے والے تین گروہوں کے بارے میں کہا گیا ہے وہ عینِ واقعیت و حق و یقین ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ چونکہ یقین کے کئی مدارج ہیں اس کا اعلیٰ درجہ حق الیقین ہے۔ واقعی یقین جو مکمل ہو اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو۔

۱۔ تفسیر برہان جلد ۴ ص ۲۸۵

۲۔ نزل مبتدئ معذوف کی خبر ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے۔ (فجزائہ نزل من حمیم) یا مبتدئ ہے معذوف خبر کا اور تقدیر عبارت یوں ہے

(فذل من حمیم)۔

۳۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۹

۴۔ اس تفسیر کے مطابق حق کی اضافت یقین کی طرف اختصاص و تشبیہ کے لیے ہے۔ بعض نے اسے موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل میں سے سمجھا

اور کہا ہے کہ (الیقین الحق) وہ یقین جو حق ہے یہ ان معنوں میں ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ضمنی طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ اس آیت میں لفظ لہذا تین گروہوں کے حالات کی طرف اشارہ ہے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ بعض نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ سورہ واقعہ کے سارے موضوعات و مضامین کی طرف اشارہ ہے یا سارے قرآن کی طرف اشارہ ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ”فسیح“ (پس تسبیح کر) کی تعبیر فاطر ربیع کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ ان تین گروہوں کے بارے میں کہا گیا ہے وہ عین عدالت ہے۔ لہذا اس بنا پر اپنے خدا کو ہر قسم کے ظلم اور بے انصافی سے پاک و منزہ شمار کریا یہ کہ اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے گروہ کی حالت زار سے دوچار نہ ہو تو خدا کو ہر قسم کے شرک و نا انصافی سے، جو انکار قیامت کا لازمہ ہیں، پاک و منزہ سمجھ۔ بہت سے مفسرین نے آخری آیت کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ اس کے نزول کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اجعلوها فی رکوعکم ”اس کو اپنے رکوع میں قرار دو“ (اور سبحان ربی العظیم کہو)۔ اور جس وقت سبیح اس سورہ الاعلیٰ نازل ہوا تو فرمایا: اجعلوها فی سجودکم ”اسے اپنے سجدے میں قرار دو“ (سبحان ربی الاعلیٰ کہو)۔

اسی سورہ کی آیت ۷۴ کی تفسیر میں بھی ہم نے اس روایت سے مشابہ روایتیں مفسرین کی جانب سے نقل کی ہیں۔

ایک نکتہ

عالم برزخ

اوپر والی آیات ان آیات میں سے ہیں جو عالم برزخ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ان آیات کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ موت کے آنے پر پہنچ کر جب انسان دوسرے جہان کی طرف انتقال کے لیے آمادہ ہوگا تو درج ذیل حالات میں سے کسی حالت سے دوچار ہوگا۔ اسے خدا کی نعمتیں میسر ہوں گی۔ اس کے حال پر اللہ کا لطف و کرم ہوگا۔ اعمال کی جزا ملے گی اور ”روح و ریحان“ سے ہمکنار ہوگا یا اسے دردناک سزائیں ملیں گی اور عذاب الہی اس پر نازل ہوگا۔ آیت میں موجود قرائن یہ بتاتے ہیں کہ ان میں سے ایک حتمہ قیامت سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے کا تعلق قبر و برزخ سے ہے اور یہ خود اس عالم کے وجود پر ایک دلیل شمار ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ پہلی چیز جس کی مومن کو موت کے وقت بشارت دی جائے گی وہ ”روح و ریحان“ ہیں اور نعمتوں سے بھر جنت ہے اور پہلی چیز جس کی مومن کو قبر میں بشارت دی جائے گی، خوشنودہی خدا کی بشارت ہوگی۔ اس سے کہا جائے گا ہم تجھے جنت میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ خدا نے ان تمام افراد کو بخش دیا ہے جنہوں نے تیرے جنازے کی مشالعت کی ہے اور تیرے بارے میں جو انہوں نے شہادت دی ہے اللہ نے اس کی تصدیق کر دی ہے اور تیرے بارے میں ان کی دُعا سے مغفرت کو مستجاب کیا ہے۔

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انسان جس وقت ایام دنیا میں سے آخری دن اور ایام آخرت میں سے پہلے دن کی منزل پر پہنچے گا تو اس کی دولت، اولاد اور اعمال اس کے سامنے مجسم ہو کر آئیں گے۔ وہ اپنے اعمال سے کہے گا میں

تمہارے معاملہ میں بالکل بے پرواہ تھا۔ اگرچہ تم مجھ پر گراں تھے۔ اب تم میرے متعلق کیا خبر رکھتے ہو تو اس کا عمل اس سے کہے گا میں قبض اور قیامت میں تیرا ہم نشین ہوں تاکہ میں اور تو دونوں حضور پروردگار عالم میں پیش ہوں۔ اس کے بعد امام نے مزید فرمایا: ”اگر وہ خدا کا دوست ہو گا تو اس کا عمل بہت ہی خوشبودار انسان کی شکل میں، انتہائی خوبصورتی کے عالم میں، نہایت پرکشش لباس پہنے ہوئے آئے گا اور کہے گا تجھے سکون و آرام و نعمت و مہربت اور پر نعمت جنت کی خوشخبری ہو۔ تیرا خیر مقدم کیا جائے گا۔ تو وہ انسان سوال کرے گا کہ تو کون ہے۔ وہ اس کے جواب میں کہے گا: میں تیرا عمل صالح ہوں۔ میں دنیا سے تیرے ساتھ بہشت کی طرف جاؤں گا۔“

عالم برزخ کے بارے میں زیادہ تفصیل ہم سورۃ مومنوں کی آیت ۱۰۰ کے ذیل میں تحریر کر چکے ہیں۔
اے پروردگار! ہمیں مقربین، اصحابِ یمن اور اپنے خالص اولیاء میں شمار کر اور موت کے وقت میں رُح درِ یحان اور جنتِ نعیم کی نعمتوں سے سرفراز فرما۔

خداوند! قیامت کا عذاب ایسا دردناک عذاب ہے کہ اسے برداشت کرنے کی کسی میں طاقت نہیں ہے اور تیری بے شمار رحمتیں اور عظیم مہبتیں ہیں جن کا کوئی شخص بھی اپنے عمل سے جہدار نہیں ہو گا۔ اس روز ہمارا سرمایہ صرف تیرا لطف و کرم ہو گا۔
بارِ الہا! قیامتِ کبریٰ اور موت جو قیامتِ صغریٰ ہے، اس کے آنے سے پہلے ہمیں بیدار کر دے تاکہ اپنے آپ کو ہم اس عظیم سفر کے لیے آمادہ کر سکیں جو ہمارے سامنے ہے۔ آمین یا رب العالمین۔

سورہ ”واقعہ“ کا انتقام
۱۴۰۶ / ۲۵ / ۶
۱۳۶۴ / ۱۱ / ۲۵ ش
انتقام ترجمہ ساڑھے پانچ بجے صبح بروز منگل
۱۹ شوال ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۶ جون ۱۹۸۷ء
برمکان حقیر واقع قم - ایران

سُورَةُ حَدِيدٍ

❖ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا۔

❖ اس میں ۲۹ آیتیں ہیں۔

تاریخ شریف

۸ / ۲ ج / ۱۴۰۶ ھ

۲۹ / ۱۱ / ۱۳۶۴ ش

سُورَةُ حَٰدِیْدِ کے مشمولات

یہ سورہ ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کے مدنی ہونے پر مفسرین کا اجماع ہے۔ مدنی سورتوں کی خصوصیات کے طور پر اعتقادی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے علاوہ اس سورہ نے کئی اجتماعی، حکومتی اور عملی احکام پیش کیے ہیں جن کے نمونے انشاء اللہ ہم آیت ۱۰، ۱۱ اور ۲۵ میں دیکھیں گے۔

- ۱۔ اس سورہ کی ابتدائی آیات میں توحید اور صفات خدا کے بارے میں نہایت مدلل اور دلچسپ بحث ہے۔ خدا کی تقریباً بیس ایسی صفتیں ان میں مذکور ہیں جن کا ادراک انسان کو معرفت خدا کی ایک بلند منزل پر فائز کرتا ہے۔
- ۲۔ دوسرا حصہ قرآن سے متعلق ہے اور اس نور الہی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو بشرک کی تاریکیوں میں چمکا۔
- ۳۔ تیسرا حصہ قیامت میں مومنین اور منافقین کی جو کیفیت ہوگی اس پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پہلا گروہ نور ایمان کے سائے میں بارخ فردوس کی طرف گامزن ہو جاتا ہے اور دوسرا گروہ بشرک کی ظلمتوں میں محصور رہ جاتا ہے۔ اس سورہ میں یہ دونوں مباحث ہیں۔ اس طرح سورہ میں اسلام کے تین بنیادی اصول توحید، نبوت اور قیامت نہایت خوبی سے بیان ہوئے ہیں۔
- ۴۔ ایک اور حصہ میں قبول ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور بشرک سے دستبردار ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس حصہ میں گزشتہ کافر قوموں میں سے ایک قوم کا احوال بھی پیش کیا گیا ہے۔
- ۵۔ سورہ کا اہم حصہ یہ ہے کہ اس میں راہ خدا میں انفاق پر زور دیا گیا ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور مالی دنیا کے بے قدر و قیمت ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔
- ۶۔ یہ مختصر سا حصہ ہے لیکن نہایت مدلل ہے۔ اس میں عدالت اجتماعی پر گفتگو ہوئی ہے جو انبیاء کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔
- ۷۔ آخری حصہ میں رہبانیت اور اجتماعی طور پر گوشہ نشینی اختیار کرنے کے مسئلہ پر بحث کے ساتھ اس کی مذمت کی گئی ہے اور اسلامی نقطہ نظر کا اس سے اختلاف واضح کیا گیا ہے۔

ان مباحث کے درمیان کچھ اور نکات بھی بڑی مناسبت کے ساتھ زیر بحث آئے ہیں اور آخر میں ایک خواب غفلت سے بیدار کرنے والا اور ہدایت ہم پہنچانے والا مجموعہ احکام تشکیل پاتا ہے۔

اس سورہ کا نام جو حدید رکھا گیا ہے وہ اس تعبیر کی بنا پر ہے جو آیہ ۲۵ میں آئی ہے۔

سورہ حدید کی تلاوت کی فضیلت

روایات اسلامی میں اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں قابل ذکر باتیں سامنے آئی ہیں۔ تلاوت محض تلاوت نہیں بلکہ ایسی تلاوت جس میں غور و فکر اور تدبر و فکر کا عنصر شامل ہو اور جو تحریک عمل کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے ہو۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں منقول ہے کہ (من قرأ سورة الحديد كتب من الذين آمنوا بالله ورسوله) ”جو سورہ حدید پڑھے گا وہ ان لوگوں کے زمرہ میں شمار ہوگا جو خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں۔“

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول ہے کہ آپؐ سونے سے پہلے سبجات کی تلاوت فرماتے تھے۔ سبجات وہ سورتیں ہیں جو سبح اللہ یا یسبح اللہ سے شروع ہوتی ہیں اور وہ پانچ سورتیں ہیں۔ سورہ حدید، حشر، صف، جمعہ اور تغابن۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے (ان فیہن آیۃ افضل من الف آیۃ) ان میں ایک ایسی آیت ہے جو ہزار آیتوں سے افضل و برتر ہے۔ البتہ آپؐ نے اس آیت کو معین نہیں فرمایا لیکن بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد سورہ حشر کی آخری آیت ہے اگرچہ اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ من قرأ المباحات کلھا قبل ان ینام لم یمت حتی یدرک القائم وان مات کان فی جوار رسول اللہ

”جو شخص سبجات کی تلاوت کرے تو وہ اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھے گا جب تک حضرت مہدیؑ کا ظہور نہ ہو جائے اور اگر اس سے پہلے وہ دنیا سے اٹھ گیا تو دوسرے جہان میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہمسایہ ہوگا۔“

۱۔ ”مجمع البیان“ آغاز سورہ حدید۔

۲۔ مجمع البیان آغاز سورہ حدید و در المنثور جلد ۶ ص ۱۷۰۔

۳۔ مجمع البیان آغاز سورہ حدید۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

- ۱۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝
- ۲۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُّحِیْ وَيُمِیْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝
- ۳۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

ترجمہ شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔
- ۲۔ آسمانوں اور زمین کی مالکیت (و حاکمیت) اس کے لیے ہے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔
- ۳۔ اول و آخر اور ظاہر و باطن وہی ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر گہری فکر رکھنے والوں کی علامات

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ توحید اور صفات باری تعالیٰ کے بیان سے شروع ہوا ہے۔ وہ صفتیں جو بیان ہوئی ہیں وہ تعداد میں بیس ہیں۔ یہ صفات ایسی ہیں کہ ان کی معرفت انسان کی سطح فکر کو بلند کرتی ہے اور وہ اپنے رب سے روشناس ہو جاتا ہے۔ ان صفتوں میں سے ہر ایک پر دروکار عالم کی صفاتِ جلال و کمال کے کسی گوشہ کو لیے ہوئے ہے اور صاحبانِ فکر و نظر اس میں جس قدر غور و فکر کرتے ہیں انہیں نئے حقائق دستیاب ہوتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے یہ بات سُننے میں آئی ہے کہ جس وقت آپ سے لوگوں نے توحید الہی کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

ان الله عز وجل علم انه يكون في آخر الزمان اقوام متعمقون
فانزل الله تعالى "قل هو الله احد" والآيات من سورة الحديد الى
قوله "عليه ذات الصدور" فمن رام وراء ذلك فقد هلك -
" خداوند تعالیٰ جانتا تھا کہ آخری زمانے میں کچھ قومیں آئیں گی جو مسائل میں غور و فکر سے کام
لیں گی لہذا خدا نے سورہ قل هو اللہ اور سورہ حدید کی ابتدائی آیات علیہ ذات
الصدور تک نازل فرمائیں۔ پس جو شخص اس سے ہٹ کر کسی اور شے کا طالب ہوگا
وہ ہلاک ہو جائے گا۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیتوں سے طالبانِ حقیقت کو خدا کی ممکن معرفت کے بیشتر حصہ پر عبور ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس سورہ کی پہلی آیت خدا کی تسبیح سے شروع ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتا ہے اور وہی ایسا قادر ہے جسے کبھی شکست نہیں ہوتی اور وہ حکیم علی الاطلاق ہے۔ سُبِّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ ہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ گزشتہ سورہ تسبیح کے حکم کے ساتھ ختم ہوا ہے اور یہ سورہ تسبیح الہی سے شروع ہو رہا ہے اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ سورتیں جو خدا کی تسبیح سے شروع ہوتی ہیں اور جنہیں مسجات کہتے ہیں ان میں تین مواقع ایسے ہیں کہ جہاں تسبیح کا ذکر ماضی کے صیغہ سُبِّحَ سے شروع ہوا ہے۔ (حدید، حشر اور صف) اور دو مواقع ایسے ہیں کہ وہاں صیغہ مضارع استعمال ہوا ہے۔ یعنی یُسَبِّحُ (جمع اور تغابن) تبصر کا یہ فرق شاید اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ گزشتہ اور آئندہ یعنی ہمیشہ اس جہان کے موجودات اس ذاتِ اقدس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ یہ تسبیح ہوتی رہی تھی، ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ تسبیح سے مراد خدا کی ذات کو ہر عیب و نقص سے پاک قرار دینا ہے۔

اور تمام موجوداتِ عالم کی یہ گواہی کہ خدا تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے یا تو اس بنا پر ہے کہ ان سب کے نظامِ حیات میں اس طرح کی حکمت و دانائی اور ایسے نظم و نسق، حساب و کتاب اور عجائب و غرائب موجود ہیں جو سب کے سب زبانِ حال سے ذکر پروردگار کرتے ہیں اور اس کی تسبیح و حمد و ثنا کرتے ہیں اور با آواز بلند کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار کی قدرت اور اس کا اختیار بے حد و بے پایاں ہے۔ اسی لیے اس آیت کے آخر میں (وہو العزیز الحکیم) کا جملہ آیا ہے یا پھر یہ کہ اس عالم کے تمام ذرات اک طرح کے ادراک و شعور سے بہرہ ور ہیں اور وہ اپنے مقام پر زبانِ حال سے خدا کی تسبیح و حمد کرتے ہیں۔ یہ اور بات کہ اپنے علم کے محدود ہونے کی بنا پر ہم اس تسبیح سے بے خبر ہیں۔ تمام موجوداتِ عالم کی تسبیح کے بارے میں سورہ اسراء کی آیت ۴۴ کے ذیل میں (جلد ۶ ملاحظہ فرمائیں)۔ اس نکتہ کو یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ لفظ ”ما“ جو (سَبِّحْ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ) میں استعمال ہوا ہے وہ وسیع معانی پر مشتمل ہے، اس سے تمام موجوداتِ عالم مراد ہیں خواہ وہ صاحبِ عقل و دُوح ہوں یا بے دُوح، یہ سب پر احاطہ رکھتا ہے!

خداوندِ عالم کی دو صفتیں یعنی عزت اور حکمت کے بعد عالمِ ہستی میں جو اس کی مالکیت، تدبیر اور تصرف کا فرما ہے اور جو لازماً قدرت ہے اس کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”خدا کے لیے آسمانوں اور زمین کی مالکیت و حاکمیت“ (لہ ملک السماوات والارض)۔ ”وہی جو زندہ کرتا ہے اور ماتا ہے“ (یحیی ویمیت)۔ ”اور وہ ہر کام پر قدرت رکھتا ہے“ (وہو علیٰ کل شئ قَدِیْر)۔ عالمِ ہستی میں خدا کی مالکیت اعتباری اور تشریعی نہیں ہے بلکہ مالکیتِ حقیقی و مملوئینی ہے یعنی وہ ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے اور سارا جہان اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور اس کے ارادہ و فرمان کے ماتحت ہے۔ اسی لیے اس کے بعد زندہ کرنے، مارنے اور ہر چیز پر اختیار رکھنے کی گفتگو درمیان میں آئی ہے۔ تو اس طرح اب ہم ان دو آیتوں میں خدا کی صفات میں سے چھ صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ عزت اور قدرت میں فرق یہ ہے کہ عزت عام طور پر دفاع کے انتظامات کو درہم و برہم کرتی ہے اور قدرت کی توجہ اسباب کو ایجاد کرنے کی طرف ہے۔ اس بنا پر یہ دو مختلف صفتیں شمار ہوتی ہیں، اگرچہ بنیادی طور پر قوت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں (غور فرمائیے) زندہ کرنے اور مارنے کا مسئلہ بہت سی آیتوں میں بیان ہوا ہے اور درحقیقت یہ دونوں موضوع ایسے ہیں جن کے پیچیدہ اسرار کسی پر واضح و روشن نہیں ہیں۔ نہ کوئی شخص مکمل طور پر زندگی کی حقیقت سے باخبر ہے اور نہ موت کی حقیقت کو کوئی کما حقہ جانتا ہے بلکہ جو کچھ ہم ان دونوں کے بارے میں جانتے ہیں وہ ان کے آثار ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ تمام چیزوں سے زیادہ نزدیک ہم سے ہماری زندگی ہے۔ اس کے باوجود اس کی حقیقت اور اس کے اسرار ہم سے ہی سب سے زیادہ مخفی ہیں۔ قابلِ توجہ یہ کہ نیچی ٹوہمیت کا جملہ مضارِع کی شکل میں تمام زمانوں میں موت و حیات کے استمرار کی دلیل ہے۔ ان دونوں کا اطلاق نہ صرف انسانوں کی زندگی و موت تک محدود ہے بلکہ فرشتے اور دوسرے تمام زندہ موجوداتِ مع حیواناتِ حشریہ کہ یہ گھاس پھوس پر بھی احاطہ رکھتے ہیں اور نہ صرف اس دنیا ہی کی زندگی بلکہ عالمِ برزخ و قیامت کی زندگی کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ جی ہاں حیات و موت اپنی تمام صورتوں کے اعتبار سے خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس کے بعد پانچ اور صفتوں کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہ اول ہے اور وہ آخر ہے، ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔“ (ہو الاول والاخر والظاہر والباطن وهو بکل شئ علیم)۔ اول و آخر ہونے کی صفت اس کی ازلیت و ابدیت کی باوجودیکہ تسبیح حرفِ جر کے بغیر متدی ہوتا ہے مثلاً کما جاتا ہے ”سبحوہ“ لیکن یہاں لام کے ساتھ آیا ہے اور یہ ممکن ہے کہ تاکید کے لیے ہو۔

بہت لطیف تعبیر ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ واجب الوجود اور لامتناہی ہے یعنی اس کی ہستی خود اپنی ذات ہی سے ہے نہ کہ خارج سے کہ اس کی کوئی ابتدا ہو اور وہ ختم ہو۔ اس بنا پر وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہ عالم ہستی کا سر آغاز ہے اور وہی ہے کہ جو عالم فنا کے بعد بھی ہوگا۔ اس بنا پر اول و آخر کی تعبیر کسی خاص زمانے تک محدود نہیں ہے اور کسی معین مدت تک اشارہ نہیں کرتی۔ ظاہر و باطن کی توصیف بھی تمام چیزوں کی نسبت اس کے احاطہ وجودی کی ایک اور تعبیر ہے۔ وہ ہر چیز سے زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس کے آثار نے ہر جگہ کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور وہ ہر چیز سے زیادہ مخفی ہے کیونکہ اس کی کمنہ ذات کسی پر آشکار نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں یہ مفہوم لیا ہے۔ (الاول بلا ابتدا والآخر بلا انتہاء والظاہر بلا اقترب والباطن بلا احتجاب) ”وہ ایسا اول ہے کہ جس کا آغاز نہیں ہے اور ایسا آخر ہے جس کا اختتام نہیں ہے۔ باوجود قریب نہ ہونے کے ظاہر ہے اور پوشیدہ ہے باوجود ظاہر ہونے کے۔ کچھ اور مفسرین ایک تعبیر پیش کرتے ہیں۔ (الاول بسرہ والآخر بعفوه والظاہر بالחסانہ وتوفیقہ اذا اطعته والباطن بسترہ اذا عصیته) وہ اول ہے نیکوں میں اور آخر ہے عفو و بخشش کی بنا پر۔ اگر تو اس کی اطاعت کرے تو وہ اپنے احسان و توفیق کے ساتھ تجھ پر ظاہر ہوتا ہے اور اگر تو اس کی نافرمانی کرے تو ستر و پوشش کے ذریعے پنہاں ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے اور عالم ہستی کا آغاز و انجام اور ظاہر و باطن ہے۔ بعض مفسرین نے ظاہر کے معنی یہاں غالب تجویز کیے ہیں (ظہور معنی غلبہ) اور نوح البلاغہ کے بعض خطبوں میں ان معانی کا قرینہ نظر آتا ہے جہاں خلقت زمین کے بارے میں امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں :

(هو الظاهر علیہا بسلطانہ وعظمتہ وهو الباطن لہا بعلمہ ومعرفہ)

وہ اس پر اپنے تسلط اور عظمت کی بنا پر غلبہ رکھتا ہے اور اپنے علم و معرفت کی وجہ سے

اس کے باطن میں راہ رکھتا ہے۔

ان دونوں تفسیروں کے اجتماع کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بہر حال ان امور کے نتائج میں سے ایک وہی ہے جو آیت کے آخر میں آیا ہے : (وہو بکل شیء علیہ) کیونکہ وہ جو آغاز سے تھا اور آخر تک باقی رہے گا اور جہاں کے ظاہر و باطن میں ہے وہ یقیناً ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ایک نکتہ

خدا کی صفات میں اضداد کا جمع ہونا

بہت سی صفات ایسی ہیں جو انسانوں میں اور دوسرے موجودات میں سے کسی ایک وجود میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ وہ صفات ایک دوسرے سے تضاد رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک گروہ میں اولین شخص ہوں تو یقیناً میں آخری شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ظاہر ہوں تو پوشیدہ نہیں ہو سکتا اور اگر پوشیدہ ہوں تو ظاہر نہیں ہوں گا۔ یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ ہمارا وجود محدود ہے اور ہر محدود

وجود اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب گفتگو صفاتِ خدا تک پہنچتی ہے تو پھر اوصافِ اپنی شکل بدل لیتے ہیں۔ وہاں ظاہر و باطن آپس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آغاز و انجام کا ایک جگہ جمع ہونا اس کی ذات کے لامتناہی ہونے کی بنا پر کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ وہ احادیث جو خود پیغمبر اسلامؐ سے ائمہ اہل بیتؑ سے مروی ہیں ان میں اس عنوان پر بہت ہی پرکشش وضاحتیں موجود ہیں اور مذکورہ موضوعات کی تفسیریں بہت حد تک نعاون ہیں۔ منجملہ دیگر حدیثوں کے ان میں ایک حدیث ہے جو صحیح مسلم میں درج ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا :

(اللهم انت الاول فليس قبلك شيء وانت الاخر فليس بعدك شيء وانت

الظاهر فليس فوقك شيء وانت الباطن فليس دونك شيء)

”خداوند! تو ایسا اول ہے جس سے پہلے کوئی چیز نہیں اور ایسا آخر ہے جس کے بعد کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح تو وہ ظاہر ہے اور غائب ہے کہ تجھ سے برتر کوئی وجود نہیں۔ اسی طرح تو باطن و پنہاں ہے کہ تجھ سے ماوراء کسی چیز کا تصور نہیں ہو سکتا۔“

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

ليس لا وليته ابتداء ولا لازليته انقضاء هو الاول لمرئيل والباقي

بلا اجل الظاهر لا يقال مم؟ والباطن لا يقال فيم؟

اس کی اولیت کی ابتدا نہیں ہے اور اس کی ازلیت کی کوئی انتہا نہیں ہے وہ ایسا پہلے ہے جو ہمیشہ سے تھا اور ایسا باقی ہے جس کے اختتام کی کوئی مدت معین نہیں ہے۔ ایسا ظاہر و آشکار ہے جس کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس چیز سے ظاہر ہوا اور ایسا پنہاں ہے کہ نہیں کہا جاسکتا کس چیز میں پوشیدہ ہے۔“

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام بھی ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں :

(الحمد لله الذي لم يكن فيه اول معلوم ولا آخر متناه

فلا تدرك العقول واوهامها ولا الفكر وخطراتها ولا الالباب واذعانها

صفته فتقول مثي؟ ولا بدع مما؟ ولا ظاهراً على ما؟ ولا باطناً فيما؟)۔

”حمد ہے اس خدا کے لیے جس کی ابتدا معلوم نہیں اور نہ اس کی انتہا محدود ہے عقل و فہم اور فکر و خرد کبھی اس کی صفات کا ادراک نہیں کر سکتے۔ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس وقت ہے اور کس سے اس کی ابتدا ہوئی اور کس چیز پر ظاہر ہوا اور کس میں پنہاں ہے۔“

بہ عقل نازی حکیم تا کے بہ عقل این رہ نمی شود طے -
 بہ کنہ ذاتش خرد برد پے اگر رسد خس بہ قعر دریا
 اسے حکیم و دانا و فلسفی تو اپنی عقل پر کب تک ناز کرے گا تو عقل کے ذریعے اس راہ کو طے نہیں کر سکتا۔ اس کی
 کنہ ذات تک عقل جب پہنچ سکتی ہے جب خس و خاشاک سمندر کی حقیقت کو سمجھ لیں بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ
 خرد بہ ذاتش نمی برد پے وگر رسد خس بہ قعر دریا
 خس و خاشاک سمندر کی حقیقت کو سمجھ بھی لیں تب بھی عقل اس کی کنہ ذات تک نہیں پہنچ سکتی۔

- ۴۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ
فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ
وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝
- ۵۔ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ
- ۶۔ يُوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۚ
وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

ترجمہ

- ۴۔ وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن (پچھ ادوار) میں پیدا کیا اور تختِ
قدرت پر جلوہ گر ہوا (اور تدبیرِ عالم کی) جو کچھ زمین میں جذب ہو جاتا ہے وہ اسے
جانتا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو زمین سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان سے
نازل ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان کی طرف صعود کرتا ہے وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں
کہیں بھی رہو اور جسے تم انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے۔

- ۵۔ آسمانوں اور زمین کی ملکیت اسی کے لیے ہے اور ہر چیز اسی کی طرف لوٹتی ہے۔
۶۔ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ ان چیزوں کو جانتا ہے جو دلوں پر حکومت کرتی ہیں۔

تفسیر

وہ ہمیشہ قدرت پر جلوہ گر ہے

ان گیارہ اوصاف کے بعد جو گزشتہ آیتوں میں پروردگار عالم کی ذات پاک کے بارے میں بیان ہوئے ہیں نو آیتوں میں مزید اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ پہلی زیر بحث آیت میں خدا کی صفات جمال و جلال میں سے پانچ صفتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سب سے پہلے خالقیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں خلق کیا ہے“ (ہوالذی خلق السموات والارض فی ستة ایام)۔ چھ دن میں خلقت کا مسئلہ قرآن مجید میں سات مرتبہ بیان ہوا ہے۔ سب سے پہلے سورہ اعراف کی آیت ۵۴ میں اور آخری مرتبہ اس زیر بحث آیت میں (سورہ حدید کی آیت ۴)۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ ان آیات میں یوم سے مراد عام دن نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک دور ہے چاہے وہ دور چھوٹا ہو چاہے بڑا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کئی ملین سال پر محیط ہو۔ اور یہ ایسی تعبیر ہے جو عربی زبان میں بھی استعمال ہوتی ہے اور دوسری زبانوں میں بھی۔ مثلاً کہتے ہیں: آج فلاں گروہ کی باری ہے کہ وہ حکومت کرے اور کل دوسروں کی باری ہوگی یعنی ان کا دور ہوگا۔ اس بات کو ہم شواہد اور مبسوط مشرح کے ساتھ جلد ۶ سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔

البتہ خدا کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ سارے جہان کو ایک ہی لمحے میں خلق کر دے لیکن یہ مسلم ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو خالق آفریدگار کی بہت کم عظمت، قدرت اور اس کا علم ظاہر ہوتا لیکن اگر انہیں کئی ارب سال میں مختلف ادوار اور مختلف صورتوں میں منظم اور طے شدہ پروگراموں کے ماتحت پیدا کرے تو یہ اس کی قدرت و حکمت پر زیادہ واضح و آشکار دلائل لیے ہوئے ہوگا۔ علاوہ ازیں تخلیقی عمل کا اس طرح بتدریج ہونا انسانی ترقی کی تدریجی رفتار اور مختلف مقاصد کے حصول میں عجلت نہ کرنے کے بارے میں ایک نمونہ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد مسئلہ حکومت اور تدبیر عالم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”خدا نے عالم کو پیدا کرنے کے بعد تخت حکومت پر بٹھار کیا“ (ثم استوی علی العرش)۔ وہ تمام حکومت اور تدبیر عالم کو ہمیشہ سے اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نہ جسم ہے اور نہ عرش کے معنی تخت سلطنت کے ہیں بلکہ یہ تعبیر خدا کی حاکمیت مطلقہ اور عالم ہستی میں اس کی تدبیر کے نفوذ کا ایک لطیف کنایہ ہے۔ لغت میں عرش اس چیز کے معنوں میں ہے جس پر چھت ہو۔ اور کبھی چھت کو بھی عرش کہا جاتا ہے اور یہ لفظ بادشاہوں کے اونچے اونچے تختوں کے

معنوں میں بھی آیا ہے اور قدرت و طاقت کے کنائے کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں اس کے تحت کی بنیادیں گر گئیں یا عربی میں کہتے ہیں: (فلان ثل عرشہ) جو اس بات کا کنایہ ہے کہ اس کا اقتدار برباد ہو گیا۔

بہر حال اس کے برخلاف، جو بے خبروں کے ایک گروہ نے خیال کیا ہے کہ خدا نے اس عالم کو پیدا کر کے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ زمام حکومت اور تدبیر عالم کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھے ہوئے ہے۔ اس جہان کے نظاموں کی ہر ایک ایک چیز کی اس کی ذات سے وابستگی اس طرح ہے کہ اگر ایک لمحے کے لیے ان سے نظر لطف ہٹا لے اور اپنے فیض و کرم کو منقطع کر لے تو "فرد ریزند قابہما" سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے۔ اس حقیقت کی طرف توجہ کی جائے تو پھر انسان کو یہ بلند خی نظر عطا ہوتی ہے کہ وہ خدا کو ہر جگہ ہر چیز کے ساتھ اور اپنی جان کے اندر دیکھے، محسوس کرے اور اس سے محبت کرے۔

اس کے بعد اپنے علم بے پایاں کی ایک اور شاخ کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "جو کچھ زمین میں نفوذ کرتا ہے اور جو کچھ اس سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان کی طرف صعود کرتا ہے وہ اس سب سے واقف و باخبر ہے۔ (یعلم ما یلج فی الارض وما ینخرج منها وما ینزل من السماء وما یرج فیہا)۔ اگرچہ یہ تمام امور ہو بکل مٹی ہو علیہ کے مفہوم میں داخل ہیں جو گزشتہ آیات کا ایک جز ہے لیکن ان معانی کی تشریح و تفصیل اس سلسلہ میں انسان کو خدا کے علم کی وسعت کی طرف زیادہ توجہ دلاتی ہے۔ جی ہاں وہ اس سے آگاہ ہے جو زمین میں نفوذ کرتا ہے اور اس میں جذب ہو جاتا ہے۔ بارش کے تمام قطرات سے، سیلابوں کی موجوں سے، نباتات کے دانوں سے جو ہوا کی مدد سے یا کیڑے مکوڑوں کے ذریعہ زمین پر بکھر جاتے ہیں اور اس میں نفوذ کر جاتے ہیں، درختوں کی جڑوں سے جب وہ پانی اور غذا کی تلاش میں زمین کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہیں، انواع و اقسام کی ایسی کانوں اور ذخیروں سے جو کسی وقت سطح زمین پر پھٹتے اور اس کے بعد اس میں دفن ہو گئے، گھنٹیوں اور دفینوں سے، مردوں کے جسموں سے، انواع و اقسام کے کیڑے مکوڑوں سے جو زمین کے اندر گھر بناتے ہیں، جی ہاں وہ ان سب سے آگاہ ہے۔ ان گھاس کی پتیوں سے جو زمین سے سر نکالتی ہیں اور ان چشموں سے جو ظاہر ہوتے ہیں اور مٹی اور پتھر کا دل چیر کر باہر آتے ہیں، معدنوں اور گھنٹیوں سے، ان انسانوں سے جو اس مٹی سے بنے ہیں، ان آتش فشاں پہاڑوں سے جو زمین کے اندر سے شعلے نکالتے ہیں۔ ان گیسوں اور بخارات سے جو زمین سے اُپر اُٹھتے ہیں، ان جاذبہ موجوں سے جو اس کے اندر سے اُٹھتی ہیں، خدا ان تمام سے، ان کے ایک ایک جز اور ذرہ ذرہ سے واقف اسی طرح جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے، بارش کے قطروں سے سورج کی حیات بخش کرنوں تک، فرشتوں کے دستوں سے لے کر وحی و کتب آسمانی کی طاقتور تحریریں تک، اس عالم کی روشنی سے لے کر شہاب ثاقب اور ان سرگرداں پتھروں اور سنگریزوں تک جو زمین میں جذب ہوتے ہیں، وہ ان سب کی حقیقتوں سے باخبر ہے۔ نیز جو کچھ آسمانوں کی طرف صعود کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ فرشتے ہوں، انسانوں کی ارواح ہوں، بادل کے اعمال ہوں، انواع و اقسام کی دعائیں ہوں، طرح طرح کے پرندے اور بخارات ہوں، بادل ہوں یا ان کے علاوہ دوسری چیزیں ہوں جنہیں ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے، وہ سب اس کی بارگاہ علم میں آشکار ہویدا ہیں۔ اگر اس سلسلہ میں تھوڑا سا سوچیں کہ ہر لمحہ اربوں کی تعداد میں مختلف موجودات زمین کے اندر داخل ہوتے ہیں یا وہ جو آسمان کی طرف صعود کرتے ہیں اور عدد و حساب سے باہر ہیں اور خدا کے علاوہ کوئی

جی ان کا شمار نہیں کر سکتا تو پھر ہم پروردگار کے علم کی وسعت سے آگاہ ہو سکیں گے۔ آخر میں چوتھی اور پانچویں صفت کے سلسلہ میں ایک حسان کلمہ پر انصاف کرتے فرماتے ہیں: ”وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو (وہو معکم اینا کلمہ)“ جیسا کہ پہلے تو یہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ اسے جانتا ہے۔ (واللہ بما تعملون بصیر) وہ کس طرح ہمارے ساتھ ہے جو جبکہ ہم نہ صرف اپنے وجود میں بلکہ اپنی بقا کے بارے میں بھی ہر لمحے اس کے محتاج ہیں اور اس سے مدد لیتے ہیں۔ وہ عالم ہستی کی رُوح ہے، جانِ جہاں ہے بلکہ ہر شے سے بہتر و برتر ہے۔ اس وقت جب ہم ایک ذرہ خاک کی شکل میں ایک گوشہ میں پڑے ہوئے تھے اور پھر اس لمحے جب ہم جنین کی صورت میں شکمِ مادر میں تھے وہ ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ساری عمر ہمارے ساتھ رہا اور عالمِ برزخ میں بھی ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہم سے بے خبر ہو۔ فی الحقیقت یہ احساس کہ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے اور نہ صرف ہم کو عظمت و شکوہ بخشا ہے بلکہ ہمارے نفس کو اعتماد و اطمینان عطا کرتا ہے اور شجاعت و شہامت پیدا کرتا ہے اور اس کے علاوہ اسے یعنی ہمارے نفس کو شدید ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور نگران ہے۔ اس کی قربت کا یہ احساس ایک عظیم درسِ اصلاحِ احوال ہے۔ جی ہاں یہ اعتقاد انسان کے لیے نقوی، پاکیزگی اور کامیابی کا بنیادی سبب ہے اور اس میں اُس کی (انسان کی) عظمت و بزرگی کی رمز بھی پنہاں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہ کوئی کنایہ یا مجاز نہیں ہے بلکہ ایسی حقیقت ہے جو دلنیز، عقل انگیز اور رُوح پرور بھی ہے اور ہمارے دلوں میں رعب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں احساسِ فطری بھی دلاتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

اَنْ مِنْ اَفْضَلِ اِيْمَانِ الْمَرْءِ اَنْ يَلْعَنَ اللّٰهَ تَعَالٰى مَعَهُ حَيْثُ كَانَ

انسان کے ایمان کا افضل ترین درجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ جہاں کہیں بھی وہ ہے خدا اس کے ساتھ ہے۔

ایک اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے سوال کیا: "این احدک یا رب؟" پر دو گار میں تجھے کہاں پاؤں؟ (قال یا موسیٰ اذا قصدت الی فقد وصلت الی) فرمایا اے موسیٰ تو جیسے ہی میرا ارادہ کرے (تو سمجھ لے) کہ مجھ تک پہنچ گیا ہوں۔

اصولی طور پر بندہ کے ساتھ خدا کی یہ معیت اس قدر پُر لطف اور دقیق ہے کہ ہر مفکر و مومن انسان اپنی پروازِ فکر اور جذبہ ایمانی کے مطابق اس کا ادراک کرتا ہے اور اس کی گہرائی سے باخبر ہوتا ہے۔ اس کی حاکمیت و تدبیر کے بعد گفتگو سارے عالم ہستی پر اس کی حاکمیت تک جا پہنچتی ہے۔ فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین کی مالکیت اسی کے لیے ہے" (لہ ملک السماوات والأرض)۔

آخر میں مرجعیت کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور تمام کاموں کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (والی اللہ ترجع الامور)۔ جی ہاں جب وہ ہمارا خالق و مالک اور حاکم و مدبّر ہے اور ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے تو یقیناً ہم سب کی اور ہمارے امور کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہوگی۔ ہم اس کی منزلِ عشق کے مسافر ہیں۔ اُمید اور دوسری توانائیوں کا بلوچہ اپنے کاندھے پر رکھے ہوئے منزلِ عدم سے چلے ہیں اور اعلیٰم وجود تک یہ سارا راستہ ہم نے طے کیا ہے۔ ہم اس کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے کیونکہ وہی ہمارا مبدأ و منتہی ہے۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ گزشتہ تین آیتوں میں بعینہ یہی توصیف بیان ہوئی تھی لہٰذا ملک السموات

والارض ممکن ہے یہ تکرار اس بنا پر ہو کہ وہاں گفتگو صرف زندہ موجودات کی موت و حیات سے متعلق تھی اور یہاں بحث کا دامن زیادہ وسیع ہے اور اب گفتگو یہ ہے کہ تمام امور کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ پہلے ہر چیز پر خدا کے قادر ہونے کے سلسلہ میں ایک تعارفی بیان ہے کہ ہر چیز کی بازگشت اس کی طرف ہے۔ یہ دونوں امور اس بات کا لازمہ ہیں کہ زمین اور آسمان دونوں خدا کی ملکیت ہیں "الامور" کی تعبیر جو جمع کی صورت میں ہے یہ بتاتی ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات اسی کی سمت رُخ کیے ہوئے چل رہے ہیں اور ایسا چلنا ہے کہ اس میں کسی مقام پر کوئی توقف نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر آیت کا مفہوم صرف اس حد تک محدود نہیں ہے کہ قیامت کے لیے انسانوں کی بازگشت اس کی طرف ہے، اگرچہ معاد کے موضوع کا تعلق خصوصیت کے ساتھ انسان سے ہے۔ آخری زیر بحث آیت میں دو اور صفتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے" (یولج اللیل فی النهار ویولج النهار فی اللیل)۔

جی ہاں بتدریج ایک میں کمی کر دیتا ہے اور دوسرے میں اضافہ کر دیتا ہے۔ رات اور دن کے طول میں تغیر کرتا ہے۔ وہ تغیر جو سال بھر کی چار فصلوں کے ہمراہ ہے۔ ان تمام برکتوں کے ساتھ جو ان فصلوں میں انسان کے لیے بھیجی ہوئی ہیں۔ اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی ہے وہ یہ کہ سورج کے طلوع و غروب کے وقت روشنی و تاریکی کے نظام میں کبھی یک نخت تبدیلی نہیں ہوتی تاکہ انسان اور دیگر زندہ موجودات کے لیے مختلف قسم کی مشکلات پیدا نہ ہوں۔ یہ صورتِ احوال رفتہ رفتہ وقوع پذیر ہوتی ہے اور وہ موجودات کو آہستہ آہستہ دن کی روشنی سے رات کی تاریکی کی طرف اور رات کی تاریکی سے دن کی روشنی کی طرف منتقل کرتا ہے اور رات اور دن کی آمد کا اعلان کافی پہلے کرتا ہے تاکہ سب لوگ اس تبدیلی کے لیے خود کو آمادہ کر لیں۔ دونوں تفسیروں کو مفہوم آیت میں جمع کرنے سے کوئی علمی قباحت لازم نہیں آتی۔ آخر میں مزید کہتا ہے: "اور وہ اس چیز سے جو دلوں پر حاکم ہے باخبر ہے" (وہو علیٰ بذات الصدور) جس طرح سورج کی حیات بخش کرنیں اور دن کی روشنی رات کی تاریکی کی گہرائیوں میں نفوذ کرتی ہے اور ہر جگہ کو روشن کر دیتی ہے، اسی طرح پروردگار کا علم بھی انسان کے دل و جان کے تمام اطراف و جوانب میں نفوذ کرتا ہے اور اس کے تمام اسرار کو واضح و روشن کر دیتا ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں گفتگو یہ تھی کہ خدا ہمارے اعمال سے باخبر ہے (واللہ بما تعملون بصیر) یہاں گفتگو یہ ہے کہ وہ ہماری نیتوں، ہمارے عقائد و اعمال اور افکار سب سے باخبر ہے۔ (وہو علیٰ بذات الصدور) لفظ "ذات" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، عربی زبان میں عین و حقیقت کے معنی میں نہیں۔ یہ فلسفیوں کی ایک اصطلاح ہے یہ لفظ لغت میں کسی چیز کے "صاحب" کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر ذات الصدور ان نیتوں اور عقائد کی طرف اشارہ ہے جن کا انسان کے دلوں پر قبضہ ہے اور وہ ان پر حکومت کرتے ہیں (غور فرمائیے)۔ کتنا اچھا ہوا اگر انسان خدا کی ان تمام صفتوں کا اپنے دل و جان کی گہرائیوں سے اقرار کرے اور اپنے اعمال، نیتوں اور عقائد سے اس کو باخبر سمجھے تو کیا اس شعور کے بعد یہ ممکن ہے کہ انسان اطاعت و بندگی کے راستے سے ہٹ کر بُرائی کی راہ اختیار کرے۔

۱۔ "یولج" مادہ "ایلاج" سے ہے اور وہ بھی "ولوج" کے مادہ سے لیا گیا ہے "ولوج" کے معنی داخل ہونے اور نفوذ کرنے کے

ہیں اور "ایلاج" داخل کرنے اور نفوذ کرنے کے معنی میں ہے۔

ایک نکتہ خدا کے اسم اعظم کی نشانیاں

ہم جانتے ہیں کہ فلسفیوں اور متکلمین نے خدا کی صفات کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ "صفات ذات" جو اس کے جلال و جمال کا بیان ہیں اور "صفات فعل" جو ان افعال کو بیان کرتی ہیں جو اس کی ذات مبارک سے صادر ہوں ان چھ آیتوں میں جو اس سورہ کی ابتدا میں آئی ہیں، حدیث کے مطابق چاہیے کہ انہیں گہری نظر رکھنے والوں کی آیات کا نام دیا جائے۔ صفات ذات و افعال میں سے بعض متین ان میں بیان ہوئی ہیں۔ خدا کے علم اس کی قدرت، حکمت، ازلیت اور ابدیت سے لے کر تمام موجودات کے بارے میں اس کی خالقیت، تدبیر، مالکیت اور حاکمیت کا ان میں بیان ہے۔ اس کا ہر شے پر محیط ہونا اور ہر جگہ موجود ہونا بھی ان میں مذکور ہوا ہے اور وہ بھی ایسی تعبیر کے ساتھ جو انہیں مزید گہرائی بخشتی ہیں۔ ان صفات کی طرف توجہ کرنا، ان پر ایمان رکھنا اور اپنے وجود کے اندر ان کے شعور کا ہلکا سا شعلہ روشن کرنے کی کوشش کرنا ہماری تدریجی ترقی کے لیے اور راہ خدا میں ہمارے آگے بڑھنے کے لیے بہترین مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں براہِ ابنِ عاتق سے منقول ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت علیؑ کی خدمت میں عرض کیا: یا امیر المؤمنین! اسئلک باللہ ورسولہ، الاخصصتی باعظم ما خصک بہ رسول اللہ (ص) واختصہ بہ جبرئیل، وارسلہ بہ الرحمن، فقال اذا اردت ان تدعوا للہ باسمہ الاعظم، فاقرا من اول سورة الحديد الى اخرت آیات منها علیو بذات الصدور، واخر سورة الحشر یعنی اربع آیات، ثور ارفع یدیک فقل یا من هو کذا اسئلک بحق هذه الاسماء ان تصلى علی محمد (ص) وان تفعل کذا وکذا مما ترید، فواللہ الذی لا الہ غیرہ لتقلبن بحاجتک انشاء اللہ۔ اے امیر المؤمنین! میں خدا اور اس کے رسولؐ کا واسطہ دے کر آپ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ سب سے عظیم چیز جس سے پیغمبر نے آپ کو مخصوص کیا اور جبرئیل نے آنحضرتؐ کو مخصوص کیا اور خدا نے اسے دے کر جبرئیل کو بھیجا وہ مجھے عطا فرمائے۔ فرمایا:

"جب تم چاہو کہ خدا کو اس کے اسم اعظم کے ساتھ پکارو تو سورہ حدید کی ابتدائی چھ آیتیں علیو بذات الصدور تک پڑھ کر اسے پکارو اور اس کے بعد سورہ حشر کی آخری چار آیتیں پڑھو۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہو: اے وہ خدا جو ایسا ہے! میں تجھ ان اسماء کے حق کا واسطہ دے کر پکارتا ہوں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیج۔ اور میری فلاں حاجت پوری کر دے۔ اس کے بعد جو چاہو کہو۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں انشاء اللہ تماری حاجت پوری ہو جائے گی۔"

ان آیات کی عظمت اور ان کے موضوعات و مضامین کی اہمیت کے لیے یہی ایک حدیث کافی ہے۔ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اسم اعظم الہی صرف الفاظ نہیں ہیں ان کا تعلق اور ان کا اپنا نام بھی ضروری ہے۔

٤- اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ
مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۖ فَاَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ
وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

٨- وَمَالَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ يَدْعُوْكُمْ
لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

٩- هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖ اٰيٰتٍ مِّنْ بَيْنِ مَا يَخْرِجُكُمْ
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ۝

١٠- وَمَالَكُمْ اَلَّا تَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيرٰثُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ
مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَتْلَ ۚ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً
مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدِ وَقَتْلَوْا وَكَلَّا وَعَدَ اللّٰهُ

الْحُسْنٰی ۖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝
مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعَّهُ
لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ ۝

ترجمہ

- ۷۔ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ اور اس چیز میں سے جس میں اس نے تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے اتفاق کرو (کیونکہ) وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے اتفاق کیا ہے ان کے لیے اجر عظیم ہے۔
- ۸۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے ہو حالانکہ رسولؐ تمہیں پکارتا ہے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ اور تم سے اس نے عہد و پیمان لیا ہے۔ (فطرت و عقل کے مطابق پیمان) اگر پیمان کے لیے آمادہ ہو۔
- ۹۔ وہی ہے جو اپنے بندہ (ﷺ) پر آیاتِ بینات نازل کرتا ہے تاکہ وہ تمہیں تارکیوں سے نکال کر ایمان کی طرف لے جائے اور خدا تم پر مہربان و رحیم ہے۔
- ۱۰۔ راہِ خدا میں اتفاق کیوں نہ کرو حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث سب خدا کے لیے ہے (اور کوئی شخص کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا)۔ وہ لوگ جنہوں نے کامیابی اور فتح سے پہلے اتفاق کیا ہے اور جنگ کی ہے۔ (ان لوگوں سے جنہوں نے کامیابی کے بعد اتفاق کیا ہے) بہتر ہیں۔ وہ ان سے بلند مقام رکھتے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد اتفاق

کیا ہے اور جہاد کیا ہے اور خدا نے دونوں سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور خدا اُس سے جو کام تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔

۱۱۔ کون ہے جو خدا کو قرضِ حسنہ دے (جو اموال اُسے دیے ہیں ان میں سے انفاق کرے) تاکہ خدا اس میں اس کے لیے اضافہ کر دے اور اس کے لیے اجر فراواں ہے۔

تفسیر

ایمان و انفاق نجات و خوش بختی کے لیے دو عظیم سرمائے ہیں

عالم ہستی میں خدا کی عظمت کے کچھ دلائل اور اس کے ایسے اوصافِ جلال و جمال جو رجوع الی اللہ کا سبب بنتے ہیں، ان کے بیان کے بعد، ان آیات میں، نتیجہ اخذ کرتے ہوئے سب کو ایمان و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ (امنوا باللہ ورسولہ)۔ یہ دعوتِ فکر ایک عام دعوتِ فکر ہے جس میں تمام انسان شامل ہیں۔ مومنین کو زیادہ کامل الایمان اور راسخ الایمان ہونے کی طرف اور غیر مومنین کو اصل ایمان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ ایسی دعوتِ فکر ہے جو مدلل ہے اور اس کے ثبوتِ توحید کے بیان پر مشتمل گزشتہ آیات میں گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد ایمان کے ایک اہم اثر یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ فرمایا ہے: ”جس میں خدا نے تمہیں دوسروں کا جانشین قرار دیا ہے اس میں سے انفاق کرو۔“ (وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ)۔ یہ دعوتِ فکر قربانی و فداکاری کا تقاضا کرتی ہے اور ان نعمتوں کے بارے میں جو انسان کے اختیار میں ہیں ایک ایسے رویہ کو انگیزتی دیتی ہے جو سخاوت پر مبنی ہو اور اس دعوتِ فکر کو اس نکتہ پر مرکوز کرتا ہے کہ یہ نہ بھولو کہ اصل میں ہر شے کا مالک خدا ہے اور یہ دولت اور یہ سرمایہ جو تمہیں عطا کیا گیا ہے، یہ امانت کے طور پر ہے اور چند روزہ ہے کیونکہ یہ اس سے پہلے دوسری قوموں کے اختیار میں تھا۔ حقیقت واقعہ یہی ہے۔ گزشتہ آیتوں میں ہم نے پڑھا ہے کہ سارے جہان کا مالک حقیقی خدا ہے۔ اس حقیقت پر ایمان رکھنا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ہم اس کے امانت دار ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ ایک امانت دار امانت رکھولنے والے کے حکم کی پرواہ نہ کرے۔ اس حقیقت کا شعور انسان کو سخاوت و ایثار کی روح عطا کرتا ہے اور اس کے دل اور ہاتھ کو انفاق فی سبیل اللہ کے عزم سے نوازتا ہے۔ ”مستخلفین“ (جانشین کی تعبیر ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ انسان زمین پر اس کی نعمتوں کے تصرف کے سلسلہ میں خدا کی نمائندگی کرتا ہے۔ یا اس سے گزشتہ اقوام کی جانشینی مراد ہو یا دونوں مراد ہوں۔ اور ”مما“ (ان چیزوں میں سے جو) کی تعبیر ایک عام تعبیر ہے اور محض مال و دولت ہی نہیں بلکہ اس میں خدا کی عطا کی ہوئی تمام نعمتیں شامل ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے کہا ہے کہ انفاق کا ایک وسیع مفہوم ہے جو صرف مال و دولت تک محدود نہیں اس میں علم اور ہدایت بھی شامل ہیں اور وہ عزت بھی جو کسی کو معاشرہ میں حاصل ہو۔ اس کے علاوہ دیگر مادی و معنوی سرمائے بھی اس کے مفہوم

نے فرمایا: ”سب سے زیادہ تعجب اس قوم پر ہے جو تمہارے بعد آئے گی وہ صرف اوراق

اپنے سامنے دیکھے گی اور جو کچھ ان میں تحریر ہے اس پر ایمان لے آئے گی۔“

یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ لوگ جو رحلتِ پیغمبر کے سالہا سال بعد دنیا میں آئیں گے اور صرف کتابوں میں پیغمبر کے آثار دیکھیں گے اور آپ کے دین کی حقانیت کی تہہ تک پہنچ جائیں گے وہ دوسروں کے مقابلہ میں امتیازِ خاص کے مالک ہیں۔ ”میشاق“ (وہ عہد جس میں تاکید کا عنصر شامل ہو) کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ فطرتِ توحیدی کی طرف اشارہ ہو یا اُن دلائل عقلی کی طرف جو مشاہدہ فطرت سے انسان پر آشکار ہوتے ہیں اور ”بر بکو“ (تمہارے پروردگار) کی تعبیر مذکورہ حقیقت پر شاہد ہے۔ بعض مفسرین میثاق کو یہاں ”عالمِ ذر“ کے عہد و پیمان کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں لیکن یہ معنی بعید از فہم نظر آتے ہیں سوائے اس تفسیر کے جو عالمِ ذر کے لیے ہم نے پہلے بیان کی ہے۔

بعد والی آیت انہی معانی کی توضیح کے سلسلے میں کہتی ہے: ”وہی ہے جس نے واضح آیات اپنے بندہ پر نازل کیں تاکہ وہ تمہیں شرک و جہالت اور نادانی کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان، توحید اور علم کی روشنی کی طرف لے آئے اور خدا تم پر رؤف و مہربان ہے۔“ (ہو الذی یُنزل علی عبده آیات بَیِّنَات لِّیُخْرِجَکُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّورِ وَان اللہ بَکُمْ لَوَّفٌ رَّحِیْمٌ)۔ ایک گروہ نے یہاں آیاتِ بَیِّنَات کا مفہوم معجزات بتایا ہے اور دوسرے گروہ نے قرآن لیکن آیت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور یہ سب معانی اس میں شامل ہیں، اگرچہ نازل کرنے کے الفاظ قرآن سے مناسبت رکھتے ہیں۔ وہی قرآن جو ظلمت و کفر اور ضلالت و نادانی کے پورے چاک کرتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان کے باطن میں آفتابِ ایمان و آگہی طلوع ہوتا ہے۔ ”رؤف و رحیم“ کے الفاظ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہیں کہ خدا کی طرف سے یہ دعوتِ ایمان و اتفاق، جو تم سب کے سامنے پیش کی گئی ہے، رحمتِ اللہ کے مظاہر ہیں۔ اس دعویتِ ایمان کی تمام برکتیں اس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی تمہیں کو حاصل ہوں گی۔

اس بات کے بارے میں کہ رؤف اور رحیم کے درمیان کوئی فرق ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس قسم کا فرق ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ مناسب ترین رُخِ کلام یہی ہے کہ رؤف میں جو محبت کا پہلو ہے اس سے خدا کی وہ محبت مراد ہے جو اُسے اپنے اطاعت گزاروں سے ہے اور رحیم میں جو رحمت کا پہلو ہے اس سے مراد وہ رحمت ہے جو نافرمان افراد کے شامل حال ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ رافت کا لفظ اس کے ظہور سے پہلے بھی بولا جاتا ہے لیکن رحمت اسی وقت بولا جاتا ہے جب وہ ظہور میں آچکی ہو۔ اس کے بعد اتفاق کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”تم راہِ خدا میں اتفاق کیوں نہ کرو حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اسی کے لیے ہے۔“ (وَمَا لَکُمْ اَلَّا تَتَّفِقُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ وَلَہٗ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)۔ یعنی آخر کار تم اس جہان اور اس کی نعمتوں سے محروم ہو جاؤ گے اور سب کچھ چھوڑ کر چلے جاؤ گے لہذا اب جب کہ تمہارے اختیار میں ہے، تو اپنا حصہ کیوں نہیں حاصل کرتے۔ ”میراث“ اصل میں جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے، اس مال کے معنی میں ہے جو بغیر کسی معاہدہ کے انسان کے ہاتھ لگتا ہے اور جو کچھ میت کی طرف سے پس ماندگان کو ملتا ہے وہ اس کا ایک مصداق ہے۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے اس لفظ کے بیان کے وقت یہی معنی سننے والے کے ذہن میں آتے ہیں۔ (لَہٗ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ نہ صرف اموال اور روئے زمین کی دیگر شے ہیں بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین

۱۔ صحیح بخاری مطابق نقل ”مراغی“ و ”تفسیر فی ظلال القرآن“ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر نمونہ جلد ۴ در ذیل آیت ۱۷۲ از سورہ اعراف ص ۳۳۱ سے رجوع فرمائیں۔

میں موجود ہے، اسی کی ذات پاک کی طرف لوٹتا ہے۔ تمام مخلوق فنا ہو جائے گی اور خدا ان سب کا وارث ہو گا۔ چونکہ اتفاق فی سبیل اللہ مختلف حالات کے اعتبار سے مختلف قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے اس لیے بعد والے جملہ میں مزید فرماتا ہے: "جنہوں نے فتح کے بعد اتفاق کیا ہے وہ ان کے برابر نہیں ہیں جنہوں نے فتح سے پہلے اتفاق کیا تھا اور جنگ کی ہے" (لا یستوی منکھ من الفق من قبل الفتح وقاتل)۔

اس فتح سے مراد کون سی فتح ہے اس کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے بعض اس سے فتح مکہ مراد لیتے ہیں جو ہجرت کے آٹھویں سال واقع ہوئی اور بعض اس سے فتح حدیبیہ مراد لیتے ہیں جو پچھٹے سال ہجری میں ہوئی البتہ اس بات کے پیش نظر کہ لفظ فتح سورہ (انا فتحنا لک فتحاً مبیناً) کی تفسیر فتح حدیبیہ سے کی گئی ہے لہذا مناسب یہ ہے کہ یہاں بھی فتح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن "قاتل" جنگ کرنے کی تعبیر فتح مکہ سے مناسبت رکھتی ہے کیونکہ حدیبیہ میں تو جنگ ہوئی ہی نہیں ہاں البتہ فتح مکہ کے سلسلہ میں مختصر سی تیز جنگ ہوئی تھی جو طول نہ پکڑ سکی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں "الفتح" سے مراد خود جنس فتح اور اسلامی جنگوں میں سے ہر جنگ میں مسلمانوں کی فتح مراد ہو یعنی وہ لوگ جو بحران کے مواقع پر جان و مال کے خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے، ان افراد سے جو طوفانوں اور آندھلیوں کے رکنے کے بعد آگے بڑھے ہیں، افضل و برتر ہیں۔ اسی لیے تاکید مزید کے لیے فرماتا ہے: "اس گروہ کا مقام برتر ہے ان لوگوں سے جنہوں نے فتح کے بعد اتفاق و جہاد کیا ہے۔"

(اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا)۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت جو آیت کو فتح مکہ یا فتح حدیبیہ سے منسوب کرتی ہے اس نے اس آیت میں اتفاق کرنے والے کا مصداق حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سمجھا ہے حالانکہ اس میں شک نہیں کہ زمانہ ہجرت سے لے کر اس وقت تک جو چھ یا آٹھ سال کا طویل عرصہ ہے، اس میں بہت سی جنگیں ہوئیں اور ہزاروں افراد نے راہ خدا میں اتفاق بھی کیا اور جہاد بھی کیا کیونکہ فتح مکہ میں تاریخ کے مطابق دس ہزار افراد نے شرکت کی اور یقیناً اس گروہ میں سے کافی افراد نے جنگ سے متعلق اغراجات کے لیے مالی امداد بھی کی ہوگی اور اتفاق فی سبیل اللہ بھی کیا ہوگا اور یہ طے شدہ ہے کہ "قبل" کی تعبیر کے معنی اس فتح کے موقع سے متعلق ہیں نہ کہ آغاز اسلام سے جو اکیس سال پہلے کی بات ہے۔

اس نکتہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض مفسرین اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اتفاق جہاد سے افضل ہے تاکہ ان کے پہلے کیے ہوئے فیضان کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اور شاید اوپر والی آیت میں جہاد سے پہلے اتفاق کے ذکر کو اسی مفہوم کا گواہ سمجھتے ہوں۔ حالانکہ واضح ہے کہ اتفاق مالی کو مقدم رکھنا اس بنا پر ہے کہ جنگ کے وسائل، اس کے متعلقات، ساز و سامان اور آلات حرب وغیرہ اس اتفاق کے ذریعے ہی فراہم ہوتے ہیں ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جان دینا اور شہادت کے لیے آمادہ ہونا اتفاق مال سے کہیں بہتر و برتر ہے۔ بہر حال چونکہ دونوں گروہ درجات کے فرق کے ساتھ عنایت پروردگار کے مستحق ہیں اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا نے دونوں گروہوں سے اچھا وعدہ کیا ہے" (وعداً وعد اللہ الحسنی)۔ یہ ان تمام لوگوں کی ایک طرح کی قدر دانی ہے جنہوں نے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے۔ "حسنی" کا یہاں ایک وسیع مفہوم ہے جس سے مراد دنیا و آخرت کی بھلائیاں ہیں۔ چونکہ عمل کی قدر و قیمت خلوص پر مبنی ہوتی ہے لہذا آیت کے آخر میں

لہ اس آیت میں کچھ مخدوف ہے جس کا مذکور سے استفادہ ہوتا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (لا یستوی من الفق من قبل الفتح وقاتل

والذین انفقوا بعد الفتح وقاتلوا)

فرماتا ہے: "خدا اُس سے جسے تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے" (واللہ بما تعملون خبیر)۔ خدا تمہارے اعمال کی کیت و کیفیت سے باخبر ہے اور تمہاری نیتوں اور معیار خلوص سے بھی آگاہ ہے۔ آخری زیر بحث آیت میں اتفاق فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں شوق و لالنے کے لیے پھر ایک جاذبِ نظر اور عمدہ تعبیر کے ذریعے فرماتا ہے: "کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دے اور ان اموال میں سے جو اس نے اُسے بخشے ہیں اتفاق کرے تاکہ خدا اس کے لیے اس میں بہت سا اضافہ کر دے اور بہت سا اجر قرار دے" (من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ ولہ اجر عظیم)۔ حقیقتاً یہ تعبیر عجیب ہے کہ وہ خدا جو تمام نعمتوں کا بخشنے والا ہے اور ہمارے وجود کے تمام اجزاء جس کے فیض بے پایاں کے سمندر سے بہرہ مند ہوتے ہیں، اور وہ ان سب کا مالک ہے، وہ خود ہمیں صاحبِ مال شمار کر کے ہم سے قرض کا خواہاں ہے اور پھر، عام قرضوں کے خلاف جن میں اتنا ہی مال واپس کیا جاتا ہے جتنا قرض دیا جائے، بہت زیادہ اضافہ کر دے گا کبھی سینکڑوں کی تعداد میں کبھی ہزاروں کی تعداد میں۔ اجر عظیم کا وعدہ اس کے علاوہ کیا ہے جو ایک عظیم صلہ جسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

چند نکات

۱۔ اتفاق کے اسباب

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیتوں میں اتفاق کی تشریح کے لیے، عام اس سے کہ جہاد کے سلسلہ میں مدد کی جائے یا حاجت منڈل کی، دوسرے موضوعات کی تعبیریں بھی نظر آتی ہیں جن میں سے ہر ایک اس مقصد کے حصول کی طرف بڑھنے کا سبب بن سکتا ہے۔ ساتویں آیت میں لوگوں کے ایک دوسرے کے جانشین بننے کے سلسلہ کی طرف اشارہ ہے یا ان ثروتوں کے سلسلہ میں خدا کے جانشین بننے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ حقیقی ملکیت کو خدا سے مخصوص کیا گیا ہے اور تمام لوگوں کو اس کے سلسلہ میں خدا کا نمائندہ تصور کیا گیا ہے۔ یہ اندازِ فکر ممکن ہے کہ انسان کے لئے اور اتفاق کے معاملہ میں کشادہ رکھے اور اس کام پر آمادہ ہونے کا سبب بنے دسویں آیت میں ایک اور تعبیر آئی ہے جو سرمائے کی ناپائیداری اور تمام انسانوں کے فنا ہو جانے کے بعد اس کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ تعبیر "میراث" ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین کی میراث خدا کے لیے ہے"۔ گیارہویں آیت میں جو تعبیر ہے وہ سب سے زیادہ حساس ہے اس میں خدا کو قرض لینے والا شمار کیا گیا ہے اور وہ ایسا قرض ہے کہ جس میں سود کا دخل نہیں ہے اور یہ قرض کئی ہزار گنا کر کے واپس کیا جائے گا۔ وہ عظیم اجر اس کے علاوہ ہے جس کا تصور بھی محال ہے۔ یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ حسنِ عمل سے انحراف رکھنے والے افکار، حرص و حسد، خود خواہی اور طویل خواہشات کو ابھارنے والے ان جہلوں کو ختم کرے جو اتفاق کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور ایک ایسے معاشرہ کو تشکیل دے جن میں اجتماعی روح کار فرما ہو، محبت پر مبنی رشتوں کا احساس ہو اور جس میں بہت زیادہ تعاون کی بنیاد موجود ہو۔

۲۔ راہِ خدا میں اتفاق کے شرائط

مندرجہ بالا آیت میں "قرضاً حسناً" کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قرض دینے کی بھی اقسام ہیں جن میں سے

بعض کو "قرض حسنہ" (اچھا قرض) شمار کیا جاتا ہے اور بعض کو ایسا قرض جس کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہ ہو۔ قرآن مجید نے اس قرض حسنہ کی شرائط بعض آیات میں بیان کی ہیں جو خدا کو دیا جائے اور بالفاظ دیگر جو ایسا اتفاق ہے جس کی قدر کی جانی چاہیے۔

۱۔ مال کے بہترین حصہ میں سے اس کا انتخاب ہونہ کر کم حیثیت مال میں سے۔ (یا ایہا الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض ولا تيمموا الخبیث منه تنفقون ولستم باخذیہ الا ان تفضوا فیہ واعلموا ان اللہ غنی حمید) "اے ایمان لانے والو! پاکیزہ اموال میں سے جو تمہارے ہاتھ آیا ہے یا جسے تم نے زمین میں سے تمہارے لیے نکالا ہے، خرچ کرو اور ناپاک حصول کو خرچ کرنے کی طرف دھیان نہ دو جب کہ تم خود تیار نہیں ہو کہ انہیں قبول کرو مگر چشم پوشی کے طور پر اور جان لو کہ خدا بے نیاز ہے اور لائق حمد و ستائش ہے۔" (بقرہ - ۲۶۷)

۲۔ ایسے اموال میں سے جو جس کی انسان کو ضرورت ہو جیسا کہ فرماتا ہے: (و یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصة) وہ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں جب کہ وہ خود شدت کے ساتھ اس کے حاجت مند ہوں۔ (حشر - ۹)

۳۔ ایسے لوگوں پر اتفاق کرو جنہیں شدید ضرورت لاحق ہو اور اولیت کو نظر میں رکھو۔ (للفقراء الذین احصر وافی سبیل اللہ) "تمہارا اتفاق ایسے ضرورت مندوں کے ساتھ مخصوص ہو جو راہ خدا میں محصور ہو گئے ہوں۔" (بقرہ - ۲۷۳)

۴۔ اتفاق اگر پوشیدہ طور پر ہو تو بہتر ہے۔ (وان تحفوها وتؤتوها الفقراء فهو خیر لکم) "اگر ضرورت مندوں کو دو اور چھپا کر دو تو بہتر ہے۔" (بقرہ - ۲۷۱)

۵۔ کسی طرح کا احسان جتنا اور آزار پہنچانا اس کے ساتھ نہ ہو۔ (یا ایہا الذین آمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالامن والاذی) اے ایمان لانے والو صدقات کو احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے سے باطل نہ کرو۔ (بقرہ - ۲۶۷)

۶۔ اتفاق اخلاص اور حسن نیت کے ساتھ کیا جائے۔ (ینفقون اموالہم ابتغاء مرضات اللہ) "وہ لوگ جو اپنا مال خوشنودینی خدا کے لیے صرف کرتے ہیں۔" (بقرہ - ۲۶۵)

۷۔ "جو کچھ اتفاق کرو اسے چھوٹا اور کم اہم شمار کیا جائے خواہ وہ بظاہر بہت بڑا ہو اور لاتمن تستکثر (دثر - ۶) اتفاق ایسے مال میں سے ہو جس سے اُسے دلی لگاؤ ہو اور عشق ہو۔ (لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون)

"نیکی کی حقیقت کو اس وقت تک نہیں پاسکو گے جب تک اس مال میں سے اتفاق نہ کرو جسے عزیز رکھتے ہو۔" (آل عمران - ۹۲) آدمی کو چاہیے کہ اپنے آپ کو کبھی بالکب حقیقی تصور نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ سمجھے۔

۸۔ (والنفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ) "اس مال سے اتفاق کرو جس میں خدا نے تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے" اور ہر چیز سے پہلے اتفاق مال حلال میں سے ہونا چاہیے کیونکہ خدا صرف ایسے ہی اتفاق کو پسند کرتا ہے لا ینایتقبل

اللہ من المتقین (مائتہ - ۲۷) ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (لا یقبل اللہ صدقة من غلول) خدا اس اتفاق کو کبھی قبول نہیں کرتا جس میں خیانت کا دخل ہو۔

۹۔ اس آیت کی کئی تفسیریں ہیں جن میں سے ایک وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔ مزید تشریح انشاء اللہ آپ سورہ مدثر کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔ (ع حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شرائط اتفاق کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ اس موضوع کا نہایت اہم حصہ ہے لیکن ان شرائط کو یہیں تک محدود نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر آیات کلام مجید اور روایات اسلامی پر زیادہ تفکر کیا جائے تو اور بھی شرائط دستیاب ہو سکتے ہیں۔ جو کچھ عرض کیا گیا ہے ان میں سے بعض شرائط اتفاق واجب شمار ہوتے ہیں (مثلاً احسان نہ جتنا، تکلیف نہ پہنچانا، ریاکاری سے اجتناب کرنا)۔ بعض شرائط کمال ہیں مثلاً خود ضرورت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا، اس شرط کا نہ ہونا اتفاق کی قیمت کو کم نہیں کرتا اگرچہ اس کو اعلیٰ سطح پر بھی قرار نہیں دیتا۔

جو کچھ کہا گیا ہے اگرچہ اتفاق کے موضوع پر تھا لیکن ان میں سے بہت سی شرطیں عام قرضوں پر بھی صادق آتی ہیں اور اصطلاح کے مطابق قرض حسنہ کی شرائط لازم یا شرائط کمال میں سے ہیں۔ راہ خدا میں اتفاق کی اہمیت کے بارے میں مبسوط تشریح سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۱ سے لے کر ۲۶۷ تک کے ذیل میں ہم عرض کر چکے ہیں۔ (تفسیر نمونہ جلد ۱)۔

۳۔ ایمان، جہاد اور اتفاق میں پیش قدمی کرنے والے

اس میں شک نہیں کہ جو ایمان اور اعمال خیر میں دوسروں سے مقدم ہوتے ہیں ان میں شجاعت بھی ہوتی ہے اور انہیں زیادہ آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے اور ان میں جذبہ ایثار و قربانی بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ سب درگاہ خدا میں برابر نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں اس مسئلہ پر انحصار کیا گیا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے (فتح مکہ یا فتح حدیبیہ) سے پہلے یا مطلق فتوحات اسلام میں اتفاق کیا ہے اور جہاد کیا ہے، بارگاہ خدا میں دوسرے ان کے برابر نہیں ہیں۔ ایک حدیث میں ابوسعید خدری سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ حدیبیہ کے سال (چھ ہجری) ہم رسول خداؐ کے ساتھ تھے جس وقت ہم ”عسفان“ (مکہ کے قریب ایک جگہ ہے) پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

”ہو سکتا ہے کہ عنقریب ایسی قوم آئے جو اپنے اعمال کا تمہارے اعمال سے موازنہ کرتے ہوئے تمہیں چھوٹا تصور کرے۔“

ہم نے کہا وہ کون ہیں ؟ اسے خدا کے رسولؐ! کیا اس سے مراد قریش ہیں ؟ فرمایا :
”نہیں، وہ اہل یمن ہیں جن کے دل تم سے زیادہ رقیق اور نرم ہیں (اور ان کے اعمال تم سے زیادہ ہیں)۔“

ہم نے عرض کیا کہ کیا وہ ہم سے بہتر ہیں۔ فرمایا :
”اگر ان میں سے کسی ایک کے پاس سونے کا پہاڑ ہو اور وہ اس کا راہ خدا میں اتفاق کرے تو نیکٹ
یا اس سے نصف جو تم خرچ کرتے ہو وہ اس کے برابر بھی نہیں ہے۔ جان لو کہ یہ فرق ہے ہمارا

(حاشیہ صفحہ ۳۵۸) ان دس اوصاف کو مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے روح المعانی میں نقل کیا ہے اور ہم نے مختصر تفسیر

(حاشیہ صفحہ ۳۵۸) اور تکمیل کے ساتھ اس کا اُدھر ذکر کیا ہے۔

ظاہر مراد ایک مدطعام ہے جو کھو سے بہت کم ہے۔

اور دوسرے لوگوں کے درمیان اور خدا کا یہ ارشاد اس کا شاہد ہے کہ (لا یستوی منکم

من انفق من قبل الفتح وقاتل ... ۱۱۰)۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پروردگار کو قرض دینے سے مراد اس کی راہ میں ہر قسم کا انفاق ہے جس کا ایک اہم مصداق پیغمبر اسلام ﷺ اور امام المسلمین کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ حکومت اسلامی کے قیام و انصرام کے سلسلہ میں اسے ضروری مصارف میں خرچ کرے۔ اسی لیے کافی کی ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(ان الله لو يسئل خلقه مما فی ایدیہم قرضاً من حاجة به الی ذالک و

ما کان لله من حق فانما هو لولیه)

”خدا نے اپنے بندوں سے کسی احتیاج کی بنا پر قرض کا مطالبہ نہیں کیا۔ جو خدا کے حقوق ہیں

وہ اس کے ولی اور نمائندہ کے لیے ہیں“۔

ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے:

(من ذالذی یقرض الله) کے ذیل میں مروی ہے کہ (نزلت فی صلۃ الامام)

”یہ آیت امام کو ہدیہ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے“۔

آشزنگارش
اہلِ تسلیم کی ایک جماعت

زیرِ نظر
استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد ۱۳ - ۲

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی مدظلہ العالی

زیرِ سرپرستی
حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ



پیشکش: حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور
حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب _____ تفسیر نمونہ
جلد _____ ۱۳
زیر نظر _____ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم _____ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
ناشر _____ مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ارگنکارام ملنگ
شامہراہ قائد اعظم، لاہور
مطبع _____ معراج دین پرنٹرز، لاہور
تاریخ اشاعت _____ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
ہدیہ _____ 200/=

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴، الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۴۱۲۲۴۲۳-۴۳۱۴۳۱۱

۱۲- یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ
 أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّتِ
 تَجَرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ هُوَ
 الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

۱۳- یَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا
 نَقْتَسِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ
 فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَهُ بَابٌ بَاطِنُهُ
 فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝
 ۱۴- ينادونهم ألم نكن معكم قالوا بلى ولكنكم
 فتنتم أنفسكم وتربصتم وارتبتم
 وغررتكم الأمانى حتى جاء أمر الله وعرَّكم
 بالله الفُرُورَ ۝

۱۵- فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ

كَفَرُوا بِمَاؤُوبُكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلَاكُمْ وَ بِئْسَ الْمَصِيرُ ۝

ترجمہ

۱۲۔ یہ عظیم اجر اس دن کا ہے جب تو صاحبانِ ایمان مردوں اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے دائیں طرف تیزی سے چل رہا ہو گا۔ (اور ان سے کہیں گے) آج تمہارے لیے بشارت ہو جنت کے ایسے باغوں کی جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

۱۳۔ وہ دن کہ جس میں منافق مرد اور عورتیں مومنین سے کہیں گے کہ ہماری طرف نظر کرو تا کہ ہم تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے کی طرف پلٹ جاؤ اور کسبِ نور کرو۔ تو اس وقت ان کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہو گا۔ جس کے اندر رحمت اور باہر عذاب ہے۔

۱۴۔ انہیں پکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ وہ کہیں گے ہاں لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور پیغمبر کی موت کے منتظر رہے اور ہر چیز میں شک اور تردد رکھتے تھے اور تمہیں تمہاری لمبی چوڑی آرزوؤں نے دھوکے میں رکھا۔ یہاں تک کہ خدا کا فرمان آن پہنچا اور شیطان نے تمہیں خدا کے مقابلہ میں فریب دیا۔

۱۵۔ اس لیے آج تم سے اور کفار سے کوئی تاوان قبول نہیں کیا جائے گا اور تمہارے رہنے

کی جگہ آگ ہے۔ وہ تمہاری سرپرست ہے اور کیا ہی بُری جگہ ہے۔

تفسیر ہمیں اپنے نور سے استفادہ کرنے دو

چونکہ گزشتہ آیتوں میں سے آخری آیت میں خدا نے اتفاق کرنے والوں کو اجر کریم کی خوش خبری دی تھی، نہرِ بحث آیت میں یہ معین کرتا ہے کہ یہ اجر کریم کس دن دیا جائے گا۔ فرماتا ہے: ”یہ اس دن پر مقرر ہے کہ جس دن ایماندار مرد اور عورتوں کو توذکیہ کے ان کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں طرف تیزی سے چل رہا ہوگا۔“ (یوم تری المؤمنین والمؤمنات یسئلنی نورہم بین ایدیہم وبایمافہم)۔ اگرچہ یہاں مخاطب پیغمبر اسلام ہیں لیکن مسلم ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس منظر کو دیکھیں گے لیکن چونکہ پیغمبر کی مومنین سے شناسائی ضروری ہے تاکہ وہ ان پر خصوصی نظر رکھیں تو اس نشانی سے آپ انہیں اچھی طرح پہچان لیں گے۔ اگرچہ مفسرین نے اس نور کے سلسلہ میں بہت سے احتمال تجویز کیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس سے مراد نورِ ایمان کا مجسم ہونا ہے۔ چونکہ نور ہم (صاحبِ ایمان مردوں اور عورتوں کا نور) کے الفاظ آئے ہیں اور تعجب کی بات بھی نہیں ہے، کیونکہ اس دن انسانوں کے عقائد و اعمال کی تجسیم ہوگی، ایمان جو نورِ ہدایت ہے، ظاہری نور اور روشنی کی شکل میں مجسم ہوگا اور کفر کہ جو تاریکی مطلق ہے ظاہری تاریکی کی صورت میں مجسم ہوگا اسی لیے سورہ تحریم کی آیت میں ہے یوم لا یخزی اللہ النبی والذین آمنوا معہ نورہم یشعل بین ایدیہم) اور اس دن اللہ اپنے پیغمبر اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں رسوا نہیں کرے گا اور ان کا نور ان کے آگے چلے گا۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی آیا ہے کہ خدا مومنین کو ظلمت کی طرف سے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ ”یسئلنی“ سعی کے مادہ سے ہے جس کے معنی تیز حرکت اور چلنے کے ہیں۔ یہ لفظ اس امر کی دلیل ہے کہ بروزِ عشر خود مومنین بھی وہ راہِ بہشت جو سعادتِ جاودانی کا مرکز ہے تیزی سے طے کریں گے کیونکہ ان کے نور کی سرلیح حرکت ان کی اپنی سرلیح حرکت سے علیحدہ نہیں ہے۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ گفتگو صرف دو قسم کے افراد کے بارے میں درمیان میں آئی ہے۔ (ایک وہ نور جو مومنین کے آگے چل رہا ہے۔ دوسرے وہ نور جو ان کے دائیں جانب ہے)۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر مومنین کے دو گروہوں کے بارے میں ہو۔ ایک تو مقربین کا گروہ ہے جن کی صورت نورانی ہے اور ان کا نور ان کے آگے آگے چلتا ہے۔ دوسرے اصحابِ یمین جن کا نور ان کے دائیں جانب ہے اس لیے کہ ان کا نام اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اس میں سے نور پھوٹے گا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں اشارے ایک ہی گروہ کی طرف ہوں اور نورِ یمین کنایہ ہو۔ اس نور کا جو ان کے نیک اعمال سے نکلے گا اور ان کے تمام اطراف کو گھیر لے گا اور روشن کرے گا۔ بہر حال یہ نور بہشت بریں تک ان کی رہنمائی کرے گا اور اس کے سائے میں وہ جنت کی راہ تیزی سے طے کریں گے۔ چونکہ یہ نور بلا شک و شبہ ان کے ایمان اور عملِ صالح سے نکلے گا تو ایمان اور عملِ صالح کے اختلافِ مراتب کی وجہ سے لوگ بھی مختلف ہوں گے۔ ایک وہ جن کا ایمان بہت زیادہ قوی ہو گا ان کا نور زیادہ فاصلہ کو روشن کرے گا اور وہ لوگ جن کا ایمان کافی کمزور ہے انہیں کمتر درجہ کا نور حاصل ہوگا یہاں تک کہ ان کے پاؤں کی انگلیوں کی نوکوں کو روشن

کرے گا جیسا کہ تفسیر علی ابن ابراہیم میں آیہ زیر بحث کے ذیل میں اشارہ ہوا ہے کہ "لنقسم النور بین الناس یوم القیامۃ علی قدر ایمانہم" قیامت کے دن نور لوگوں کے درمیان ان کے ایمان کی مقدار کے مطابق تقسیم ہوگا۔

یہ وہ مقام ہے جہاں ان کے احترام کی وجہ سے ملائکہ کی طرف سے ایک آواز آئے گی: "تمہارے لیے آج کے دن جنت کے باغات کی بشارت ہو جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں" (بشر اکم الیوم جنت تجری من تحتہا الانہاس)۔ "اس میں تم ہمیشہ رہو گے اور یہ ایک عظیم کامیابی و دستگیری ہے" (خالدین فیہا ذالک هو الفوز العظیم)۔

باقی رہے وہ منافقین جو کفر و نفاق اور گناہ کی وحشت ناک تاریکی میں مقیم ہوں گے تو اس موقع پر وہ فریاد کریں گے۔ وہ مومنین سے نور حاصل کرنے کی التجا کریں گے لیکن سوائے انکار کے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں پروردگار عالم فرماتا ہے:

(یوم یقول المنافقون والمنافقات للذین امنوا انظرونا فکتبس من نورکم)۔

"وہ دن جس میں منافق مرد اور عورتیں مومنین سے کہیں گے ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔"

"اقتباس کا مادہ" قس "ہے جس کے معنی میں آگ کا شعلہ لینا۔ اس کے علاوہ نمونوں کے انتخاب کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ "انظرونا" کے لفظ سے یہ مراد ہے کہ ہماری طرف نگاہ کرو تاکہ تمہارے چہرہ کے نور سے ہم فائدہ اٹھائیں اور اپنا راستہ دیکھ لیں، یا ہم پر لطف و محبت کی نگاہ ڈالو اور اپنے نور کا ایک حصہ ہمیں بھی دو۔ یہ احتمال بھی ہے کہ "انظرونا" سے مراد انتظار کرنا ہو یعنی ہمیں ملتے تاکہ ہم بھی تم تک پہنچ جائیں اور تمہارے نور کے زیر سایہ اپنی راہ تلاش کریں۔ لیکن بہر حال جو جواب انہیں دیا جائے گا وہ یہ ہے کہ اپنے پیچھے کی طرف پلٹ جاؤ اور کسب نور کرو۔ (قیل ارجعوا وراءکم فالتمسوا نورا)۔ یہ نور حاصل کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ یہ نور اس دنیا میں جسے تم پیچھے چھوڑ آئے ہو، ایمان اور عمل صالح کے ذریعے حاصل کرتے۔ اب وقت گزر چکا ہے اور دیر ہو چکی ہے۔ اس وقت اچانک ان کے گرد ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہوگا۔ (فضرب بینہم سورۃ باب)۔ لیکن اس عظیم دیوار کے دونوں اطراف ہیں یا اس دروازہ کے دونوں اطراف ہیں بڑا فرق ہوگا۔ "اس کے اندر رحمت اور باہر عذاب ہے۔"

(باطنہ فیہ الرحمۃ وظاہرہ من قبلہ العذاب)۔ سور کے معنی از روئے لغت دیوار کے ہیں جو گزشتہ زمانے میں شہروں کے گرد کھینچتے تھے جسے فصیل کہتے ہیں اور فارسی میں بارود کہتے ہیں۔ اس فصیل میں مختلف فاصلوں پر محافظوں اور نگہبانوں کے لیے برج ہوتے تھے لہذا مجموعی حیثیت سے اسے "برج و بارود" کہتے ہیں۔ قابل توجہ یہ ہے کہ پروردگار عالم فرماتا ہے: "اس کے اندر رحمت ہے اور باہر عذاب ہے"۔ یعنی مومنین ساکنین شہر کی طرح اس بارغ کے اندر ہیں اور منافقین بیگانوں اور اجنبیوں کی طرح صحرائی حصہ میں ہیں۔ اس سے پہلے وہ ایک ہی معاشرہ میں اور ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے لیکن مختلف عقائد و اعمال کی ایک عظیم دیوار انہیں ایک دوسرے سے جدا کیے ہوئے تھی۔ قیامت میں یہی معنی مجسم ہو جائیں گے۔ رہی یہ بات کہ یہ دروازہ کس لیے ہے، ممکن ہے اس لیے ہو کہ منافقین اس دروازہ سے جنت کی نعمتوں کو دیکھیں اور حسرت و افسوس سے دوچار ہوں۔ یا یہ کہ وہ افراد جن کے گناہ کم ہیں وہ اصلاح کے بعد وہاں سے

۱۔ تفسیر نرائش، جلد ۵ ص ۲۴۱، حدیث ۶۰

۲۔ "انظرونا" کا مادہ نظر ہے جس کے معنی میں سوچ، بچا کرنا، نگاہ کرنا، کسی شے کا مشاہدہ کرنا یا ادراک کرنا۔ کبھی تا مل یا جستجو کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جب الی کے ساتھ متعدی ہو تو کسی چیز پر نظر ڈالنے کے معنی میں ہے اور جب فی کے ساتھ متعدی ہو تو تا مل و تدبر کرنے کے معنی میں ہے اور جب حرف جر کے بغیر متعدی ہو اور ہم کہیں کر نظرتہ و انظر تہ و انتظر تہ تو تاخیر کرنے یا انتظار کرنے کے معنی میں ہے۔

گزر جائیں اور مومنین کے پاس آجائیں لیکن یہ دیوار اس طرح کی نہیں ہے کہ جس پر سے آواز نہ گزر سکے اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے: ”انہیں پکار کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوتے تھے“ (یٰسٰدٰوٰنہٰوٰلہٰ عٰزٰزٰکٰن مَعٰکُمْ)۔ ہم دُنیا میں بھی تمہارے ساتھ ایک ہی معاشرہ میں زندگی بسر کرتے تھے اور یہاں بھی تمہارے ساتھ ہی تھے۔ کیا ہوا کہ تم اپنا ہم سے الگ ہو گئے اور جو بار رحمت الہی میں پہنچ گئے اور ہمیں عذاب کے چنگل میں چھوڑ گئے۔ تو وہ جواب میں کہیں گے کہ ہاں ہم اکٹھے ہی تھے۔ (قَالُوا بَلٰی)۔ ہر جگہ اکٹھے تھے، کوچہ و بازار میں، سفر و حضر میں، کبھی ایک دوسرے کے ہمسائے تھے یہاں تک کہ کبھی ایک ہی گھر میں رہتے تھے لیکن عقیدہ و عمل کے اعتبار سے جدا بنا لیا تھا اور اصول و فروع میں تم حق سے بیگانہ تھے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

”تم بڑی بڑی خطاؤں میں گرفتار تھے منجملہ دیگر خطاؤں کے:

- ۱۔ ”تم نے راہ کفر کے عبور کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو فریب دیا اور ہلاک ہوئے۔ (وَلٰکُمْ فِتْنٰتٌ عَٰلَفٰکُمْ)۔
- ۲۔ ”تم پیغمبر کی موت، مسلمانوں کی فنا اور دین اسلام کی بساط اُلٹنے کے انتظار میں تھے۔ (وَتَرٰیصَتُمْ)۔ اس کے علاوہ ہر مثبت کام کے انجام دینے اور ہر حرکتِ صالحہ کے موقع پر صبر اور انتظار کی حالت میں رہتے تھے اور اس کی وجوہات بیان کرتے تھے۔
- ۳۔ ”ہمیشہ قیامت، پیغمبر کی دعوت اسلام اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا رہتے تھے (وَارْتَبْتُمْ)۔
- ۴۔ ”تم ہمیشہ لمبی چوڑی آرزوؤں میں اسیر رہتے، ایسی آرزوئیں جنہوں نے کبھی تمہارا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ خدا کی طرف سے تمہاری موت کا فرمان آن پہنچا۔ (وَعَرٰتِکُمْ اَلْمَآئِیۃُ حَتّٰی جَآءَ اَمْرٌ اَللّٰہُ)۔ ہاں ان آرزوؤں نے تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی صحیح غور و فکر کی ہمت نہیں دی۔ تم خواب و خیال کی حالت میں مستغرق تھے اور توہمات کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے اور مادی مقاصد اور شہوات کے حصول کی آرزو تم پر غالب تھی۔

۵۔ اُن تمام چیزوں سے قطع نظر، شیطان فریب کار جس نے تمہارے وجود میں اپنا ٹھکانہ مضبوط طور پر بنا رکھا تھا، اس نے تم کو دھوکا دیا۔ (وَعَرٰتِکُمْ بِاللّٰہِ الْغُرُورُ)۔ اس نے دوسروں کے ذریعے تمہیں مغرور کیا۔ کبھی دنیا کو تمہارے سامنے جاوادی بنا کر پیش کیا اور قیامت کو ایک بھولی ہوئی چیز بتایا۔ کبھی تمہیں رحمتِ خدا کے سلسلہ میں مغرور کیا، کبھی وجود پروردگار کو مشکوک بنایا۔ یہ پانچ عوامل تھے جنہوں نے باہم مل کر تمہاری راہِ فکر و عمل کو ہماری راہِ فکر و عمل سے بالکل جدا کر دیا۔ (فِتْنَتُمْ) کا مادہ فتنہ ہے۔ اس کے مختلف معانی ہیں آزمائش و امتحان، فریب دہی، بلا و عذاب، ضلالت و گمراہی اور شرک و بت پرستی۔ یہاں آخری دو معانی زیادہ مناسب ہیں۔ ”قریصتم“ کا مادہ ”قریص“ ہے۔ اس کے معنی میں انتظار کرنا چاہے نعمت کا انتظار ہو یا مصیبت کی فراوانی کا۔ یہاں زیادہ تر پیغمبر کی موت اور اسلام کے خاتمہ کا انتظار مل رہا ہے۔ گناہ سے توبہ اور ہر قسم کے کارِ خیر کے انجام دینے کے بارے میں مختلف بہانے بنانے کے معنی میں بھی ہے (وَارْتَبْتُمْ) ریب کے مادہ سے ہر ایسے شک اور تردد کے معنی میں ہے جس کے چہرہ سے بعد میں پردہ اٹھ جائے۔ یہاں زیادہ تر قیامت اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں شک کرنے کے معنی میں ہے۔ اگرچہ آیت میں استعمال ہونے والے الفاظ کا مفہوم وسیع ہے لیکن عنوانات کی ترتیب اس طرح ہے۔ مسئلہ شرک، اسلام اور پیغمبر کی عمر کا اختتام پھر قیامت میں شک اس کے بعد آرزوؤں اور شیطان کے دیئے ہوئے فریب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بد اعمالیاں اس بنا پر یہ پہلے تین قسم کے جملے اصول دین میں سے اول تین اصولوں کے بارے میں ہیں اور آخری دو فروع دین سے متعلق ہیں۔ آخر کار مومنین ایک صورتِ حال میں منافقین کو مخاطب

کرتے ہوئے کہتے ہیں: "آج کے دن تم سے کوئی نادان یا جرماء وصول نہیں کیا جائے گا کہ تم عذاب الہی سے نجات پاؤ۔" (خالیوم لا یؤخذ منکم فدیۃ) "اور نہ کفار ہی سے" (ولا من الذین کفروا) اس طرح کفار کی قسمت بھی منافقوں جیسی ہے۔ یہ سب کے سب اپنے گناہوں اور بد اعمالیوں میں گرفتار ہیں اور ان کی نجات کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پھر فرماتا ہے: "تمہاری جگہ آگ ہے۔" (مأواکم النار) "اور تمہارا مولا اور سرپرست بھی وہی جہنم ہے" (ہی مولا کو)۔

"اور کیا ہی بُری جگہ ہے" (وبئس المصیر)۔ دنیا میں انسان عام طور پر سزاؤں سے بچنے کے لیے یا تو مالی نقصان برداشت کرتا ہے یا پھر کسی مددگار اور سفارش کرنے والے سے اعانت کا طلب گار ہوتا ہے لیکن آخرت میں کفار اور منافقین کے لیے ان دونوں میں سے کچھ نہیں ہے۔ قیامت اصولی طور پر وہ تمام مادی وسائل و اسباب بیکار ہو جائیں گے جو اس دنیا میں حصول مقاصد کے لیے کارآمد ہوتے ہیں وہاں رشتے منقطع ہو جائیں گے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۶ میں ہم پڑھتے ہیں: (ولقطعت بہمواالاسباب) "اس دن نہ لین دین ہے اور نہ دوستی کا رابطہ" (یوم لا بیع فیہ ولا خلیۃ) (بقرہ ۲۵۴) "نہ کوئی عرض لیا جائے گا" (ولا یؤخذ منہا عدل) (بقرہ ۴۸)۔ "اور نہ کوئی شخص اپنے دوست کی فریاد کو پہنچے گا" (یوم لا یغنی مولیٰ عن مولیٰ شیئاً) (دخان ۴۱) "نہ منصوبے اور بہانے کام آئیں گے" (یوم لا یغنی عنہم کیدہم شیئاً) (طور ۴۵) "نہ نسب اور رشتہ داری کا رابطہ کسی کام آئے گا" (فلا انساب بینہم یومئذ) (مومنون ۱۰۱) "خلاصہ یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے اعمال میں گرفتار اور اپنے افعال میں گروی ہیں" (کل نفس بما کسبت رہینۃ) (مدثر ۳۸) اس طرح قرآن واضح کرتا ہے کہ اس دن نجات کا واحد ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے یہاں تک کہ شفاعت کا دائرہ بھی محدود ہے۔ شفاعت صرف ان کے لیے ہے جو مذکورہ دونوں صفتوں میں سے کچھ حصہ اپنے پاس رکھتے ہوں نہ کہ وہ لوگ جو ایمان و عمل صالح سے بالکل بیگانہ ہیں اور جنہوں نے خدا اور اس کے اولیا سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کر رکھا ہے۔

ایک نکتہ

قیامت میں مجرموں کا بے مقصد مدد کرنا

چونکہ بہت سے لوگ عرصہ عشر میں آنے کے وقت اس نظام سے جو وہاں رائج ہے نا آشنا ہیں لہذا وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہاں بھی دنیاوی نظام رائج ہیں لہذا اُن سے فائدہ اٹھائیں گے لیکن وہ بہت جلد سمجھ جائیں گے کہ وہ ایک عظیم غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کبھی مجرم مومنین سے مدد طلب کریں گے اور کہیں گے: (انظرونا لبقیتس من نورکم) ہم پر ایک نگاہ ڈالو تاکہ ہم تمہارے ایمان اور عمل صالح کی روشنی سے کچھ نور حاصل کریں۔ (آیات زیر بحث) لیکن انہیں بہت جلد انکار سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہ سنیں گے کہ منبع نور یہاں نہیں بلکہ وہاں دنیا میں تھا جہاں سے تم بے خبری کی حالت میں گزر آئے ہو۔ کبھی مجرم ایک دوسرے سے مدد طلب کریں گے: (پیردکار اپنے بہرہ ور) اور کہیں گے: (فصل انتہ منفعون عنامن عذاب اللہ من شیء) کیا تم ہمارے بدلے عذاب الہی کا ایک حصہ قبول کرتے

انہیں یہاں بھی انکار سے دوچار ہونا پڑے گا حتیٰ کہ وہ خازنین پہنچیں گے : (ادعوہ بکھو
 یخفف عنا یومئذ العذاب) ” اپنے پروردگار سے استدعا کرو کہ ایک دن کے لیے ہم پر سے عذاب ہٹالے ۔
 (مومن - ۴۹) کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر خدا سے مدد طلب کریں گے اور عرض کریں گے : (ربنا اخرجنا منها
 فان عدنا فانا ظالمون) ” پروردگار ہمیں اس جلائے والی آگ سے باہر لے آ۔ اگر ہم دوبارہ لوٹ آئے تو ہم
 ظالم ہیں ۔ (مومن - ۱۰۷)

www.sirat-e-mustaqeem.net

- ۱۶۔ اَلْمَرِيَانِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ
 اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۚ وَلَا يَكُوْلُوْا كَالَّذِيْنَ
 اُوْتُوْا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ
 قُلُوْبُهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُوْنَ ۝
- ۱۷۔ اَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ قَدَبِيْنَا
 لَكُمْ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝
- ۱۸۔ اِنَّ الْبَصَدِقِيْنَ وَالْبَصَدِقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ
 قَرْضًا حَسَنًا يُّضَعْفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝

ترجمہ

- ۱۶۔ کیا وہ وقت نہیں آیا کہ جب مومنین کے دل ذکرِ خدا اور جو حق سے نازل ہوا ہے
 اس سے خشوع اختیار کریں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے آسمانی کتاب
 دی گئی ہے پھر ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور ان کے دلوں میں قساوت پیدا ہو گئی اور
 ان میں سے بہت سے گنہگار ہیں۔
- ۱۷۔ جان لو کہ خدا زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ ہم نے اپنی آیات

شان نزول

پہلی زیر بحث آیت کے متعلق کئی شان نزول بیان ہوئی ہیں مجملہ ان سب کے ایک یہ ہے کہ آیت مذکورہ ہجرت کے ایک سال بعد منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس بنا پر کہ ایک دن انہوں نے حضرت سلمان فارسی سے پوچھا جو کچھ تو رات میں ہے ہم سے اس کی بات کرو کیونکہ تو رات میں تعجب خیز مسائل میں اس طرح وہ چاہتے تھے کہ قرآن کو نظر انداز کر دیں۔ اس بنا پر سورہ یوسف کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو سلمان نے ان سے کہا کہ یہ قرآن احسن القصص ہے اور بہترین واقعات بیان کرتا ہے اور تمہارے لیے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سودمند ہے۔ انہوں نے ایک مدت تک اپنے سوال کو نہ دہرایا پھر وہ سلمان کے پاس آئے اور اپنی خواہش کی تکرار کی تو اس وقت یہ آیت (اللہ نزل احسن الحدیث کتاباً متشابہاً مثانی تقشعر منه جلود الذین یخشونہ۔۔۔) خدانے بہترین گفتگو کو نازل کیا ہے۔ ایسی کتاب جس کی آیات (نطف و زیبائی اور معانی کے لحاظ سے) ایک دوسرے کے مانند ہیں اس کی آیات مکرر ہیں۔ (لیکن تکرار رشوق انگیز ہے)۔ ان آیتوں کے سُنانے سے وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔۔۔) (نور ۲۳)

پھر انہوں نے ایک مدت تک اپنے سوال کو نہ دہرایا پھر تیسری مرتبہ سلمان کے پاس آئے اور اپنا سوال دہرایا تو اس وقت زیر بحث آیت نازل ہوئی (اور ان کا مواخذہ کیا کہ کیا اس بات کا موقع نہیں آیا کہ تم خدا سے ڈرو اور ان باتوں سے دستبردار ہو جاؤ)۔

ایک اور شان نزول اس طرح ہے کہ پیغمبر کے اصحاب مکہ میں خشک سالی اور سختی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ پھر جس وقت انہوں نے ہجرت کی اور ان کو نعمتوں کی فراوانی حاصل ہوئی تو ان کی کیفیت بدل گئی اور ایک جماعت کے دلوں میں سختی آگئی حالانکہ اسکان اس بات کا زیادہ تھا کہ قرآن ہمراہ ہونے کی وجہ سے، ان کے ایمان خلوص اور یقین میں اضافہ ہو۔ (تو والی آیت نازل ہوئی اور اس نے ان کو تنبیہ کی)۔

اس آیت کے سلسلہ میں کچھ اور شان نزول بھی نظر آتی ہیں لیکن چونکہ وہ آیت کو مکی بتاتی ہیں لہذا قابل اعتبار نہیں ہیں کیونکہ مشورہ یہ ہے کہ یہ ساری سورت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

تفسیر
غفلت و بے خبری کب تک

ان تمام سرکوبی کرنے والی تنبیہوں اور گزشتہ آیتوں میں بیدار کرنے والی تحریکوں اور قیامت میں کافروں اور منافقوں کا جو حال ہوگا اس کو

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۲۳۷۔ تفسیر در المنثور میں بھی کسی شان نزول بیان ہوئی ہیں جو مذکورہ دوسری شان نزول مطابقت رکھتی ہیں۔ در المنثور جلد ۶ ص ۱۷۵۔
 بیضاوی نے بھی اپنی تفسیر انوار التنزیل میں یہ شان نزول نقل کی ہے۔

بیان کرنے کے بعد پہلی زیر بحث آیت میں پروردگار عالم نتیجہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے : کیا اس چیز کا وقت نہیں آیا کہ صاحب ایمان افراد کے دل ، ذکر خدا سے اور جو کچھ حق میں سے نازل ہوا ہے ، اس سے خوف کھائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جنہیں گزشتہ زمانے میں آسمانی کتاب دی گئی (مثل یہود و نصاریٰ کے) پھر ان کے اور پیغمبروں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ انہوں نے طولانی عمر پائی اور خدا کو فراموش کیا۔ ان کے دلوں میں قسادت پیدا ہو گئی ان میں سے بہت سے فاسق اور گنہگار تھے۔ (المریأ للذین آمنوا ان تخشع قلوبہم لذكر الله وما نزل من الحق ولا یكونوا كالذین اوتوا الكتاب من قبل فطال علیہم الامد فقت قلوبہم وکثیر منهم فاسقون) ۱

”تخشع“ کا مادہ ”خشوع“ ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ حالت تواضع اور جسمانی و روحانی ادب جو کسی عظیم حقیقت یا بزرگ شخصیت کے سامنے کوئی انسان اختیار کرے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر خدا کی یاد انسان کے دل اور اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جائے اور وہ ان آیات کو مٹنے جو پیغمبر خدا پر نازل ہوئی ہیں اور ان میں غور و فکر کرے تو ان آیتوں کو خوف خدا کا سبب بننا چاہیے۔ لیکن قرآن یہاں مؤمنین کے ایک گروہ کو سخت ملامت کرتا ہے کہ وہ ان حقائق کے پیش نظر کیوں خشوع اختیار نہیں کرتے اور بہت سی گزشتہ امتوں کی طرح کیوں غفلت و بے خبری کا شکار ہیں۔ وہی غفلت جس کا نتیجہ قسادت قلبی ہے اور وہی قسادت جس کا اثر فسق و فجور اور گناہ ہے۔ کیا صرف ایمان کے دعویٰ پر قناعت کرنا اور اہم مسائل کے نزدیک سے بے آسانی گزر جانا اور خود کو خوشحالی کے سپرد کر دینا اور ناز و نعمت میں رہنا اور ہمیشہ عیش و عشرت میں مگن رہنا ایمان کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے؟ (طال علیہم الامد) ”ان پر زمانہ طولانی ہو گیا“ یہ جملہ ہو سکتا ہے ان لوگوں اور ان کے پیغمبروں کے درمیان فاصلہ کی طرف اشارہ ہو یا ان کے طول عمر اور آرزوؤں کی کثرت کی طرف یا عذاب الہی کے طویل زمانہ تک نازل نہ ہونے کی طرف یا ان سب کی طرف اس لیے کہ ممکن ہے ان میں سے ہر چیز غفلت و قسادت قلبی کا سبب ہو اور وہ فسق و گناہ کا سبب بنے ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

(لا تعاجلوا الامر قبل بلوغه فتندموا ولا یطولن علیکم الامد فتسوق قلوبکم)۔

”کسی کام کے سلسلہ میں اس کا وقت آنے سے پہلے ، جلدی نہ کرو ورنہ پشیمان ہو گے اور تمہارے اور حق کے درمیان طویل فاصلہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس سے تمہارے دل قسادت کا شکار ہو جائیں گے۔“ ۲

ایک اور حدیث میں حضرت عیسیٰؑ کی زبانی یہ مروی ہے کہ :

(لا تکثروا الکلام بغیر ذکر الله فتسوق قلوبکم فان القلب القاسی

بعید من الله ولا تنظروا فی ذنوب العباد کانکوا رباباً والنظر وافی ذنوبکم

۱ ”یا ان“ کا مادہ ”أتی“ (بروزن اسن) ہے اور ”انا“ بروزن ”ندا“ کے مادہ سے اور ”انما“ بروزن ”جفاء“ کے مادہ سے نزدیک ہونے اور

کسی چیز کے حضور کے وقت کے معنوں میں ہے۔

۲ ”بخاری دار“ جلد ۸۷ ص ۸۳ حدیث ۸۵۔

کانکم عبید، والناس رجالان: مبتلی، ومعافی، فارحوا اهل البلاء، واحمدوا
الله علی العافیة

”خدا کے ذکر سے جو غالی ہوں وہ باتیں زیادہ نہ کرو یہ قساوت قلب کا باعث ہے اور
قساوت رکھنے والا دل خدا سے دُور ہے۔ بندوں کے گناہوں پر اس طرح نظر ڈالو جس طرح
مالک اپنے غلاموں پر نظر ڈالتے ہیں بلکہ اپنے گناہوں کی طرف اس طرح دیکھو جیسے کوئی غلام
اپنے آقا کے سامنے ہو۔ لوگ دو طرح کے ہیں۔ ایک گروہ مبتلا ہے اور دوسرا اہل عافیت
کا گروہ ہے۔ مبتلاؤں پر رحم کرو اور اہل عافیت کو دیکھ کر خدا کی حمد و ستائش کرو۔“

چونکہ ذکر خدا سے مُردہ دلوں کا زندہ ہونا اور قرآن کے سامنے خضوع و خشوع اختیار کرنے سے حیات معنوی کا پیدا ہونا، بارش کے
حیات بخش قطروں کی برکت سے مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرماتا،
”جان لو کہ خدا زمین کو مُردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔“ (اعلموا ان الله یحیی الاموات بعد موتها)۔ ”ہم اپنی آیتوں کو
آفرینش کے میلان میں اور وحی کے میدان میں تمہارے لیے واضح کرتے ہیں اس خیال سے کہ شاید تم عقل سے کام لو۔“ (قد بینا لکم الایات لعلکم تعقلون)۔ درحقیقت آیات
بھی بارش کے وسیلہ سے زمین مُردہ کے زندہ ہونے کی طرف اور ذکر خدا و قرآن کے وسیلہ سے دل ہائے مُردہ کے زندہ ہونے کی طرف اشارہ
قرآن وہ ہے جو خدا کی طرف سے قلب پاک پیغمبر پر نازل ہوا ہے۔ ذکر خدا و قرآن دونوں تدبیر و تعقل کے مستحق ہیں اسی لیے اسلامی روایات
میں دونوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک حدیث امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

العدل بعد الجور

زمین کا عدالت و انصاف کے ذریعے زندہ ہونا مُراد ہے بعد اس کے کہ وہ ظلم و جور سے مُردہ ہو چکی ہو۔

ایک دوسری حدیث امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے ”اعلموا ان الله یحیی الاموات بعد موتها“ کی تفسیر میں فرمایا:

(یحیی الله تعالی بالقائے بعد موتها یعنی بہ موتها کفر اهلها والکافر میت)۔

”خدا زمین کو حضرت ہمدی کے ذریعے زندہ کرے گا بعد اس کے کہ وہ مُردہ ہو چکی ہوگی اور

زمین کے مُردہ ہونے سے مُراد اس کے رہنے والوں کا کفر ہے اور کافر مُردہ ہے۔“

یہ بات کہے بغیر ظاہر ہے کہ یہ تفسیریں زیر بحث آیت کے بمصادقوں کا بیان ہیں اور ہرگز آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کرتیں ایک

اور حدیث میں امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے کہ:

فان الله یحیی القلوب المیتة بنور الحکمة لکما یحیی الامراض المیتة بواہل المطر
”خدا مُردہ دلوں کو نور حکمت سے زندہ کرتا ہے جیسا کہ مُردہ زمینوں کو بارشوں سے زندہ کرتا ہے۔“

لک ”مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۲۳۸

مکمل الین ”مطابق نقل“ نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۲۴۲

مکمل بحار جلد ۷ ص ۳۰۸

بعد والی آیت ایک مرتبہ پھر اتفاق، جو شجر ایمان کا ایک پھل ہے، اس کی طرف توجہ دلاتی ہے اور اسے موضوع گفتگو بناتی ہے اور وہی تعبیر جو گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں اسے کچھ اضافوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے:

”وہ مرد اور عورتیں جو راہِ خدا میں اتفاق کریں اور وہ جو اس طرح خدا کو قرضِ حسنہ دیں خدا اس قرض کو کئی گنا کرتا ہے اور ان مردوں اور عورتوں کے لیے بیش قیمت اجر ہے: (اِنَّ الْمَصْدَقِيْنَ وَالْمَصْدَقَاتِ وَقَرْضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يَّضَاعَفْ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ) ۱۱

مسئلہ اتفاق کو خدا نے قرضِ حسنہ دینے کے عنوان کے ماتحت کیوں پیش کیا ہے اور مذکورہ اضافہ اور اجرِ کریم کس بنا پر ہے اس سورہ کی آیت ۱۱ کے ذیل میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ اس آیت میں اور اسی قسم کی دوسری آیتوں میں خدا کو قرضِ حسنہ دینے سے مراد بندوں کو قرض دینا ہے اس لیے کہ خدا کو قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مومن بندے ہی ہیں جنہیں قرض کی ضرورت ہے لیکن آیات کے سیاق و سباق کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ نظر آتا ہے کہ ان آیات میں قرضِ حسنہ سے مراد وہی اتفاق فی سبیل اللہ ہے اگرچہ بندگانِ خدا کو قرض دینا بھی افضل و برتر اعمال میں سے ہے اور یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ فاضل مقداد نے بھی کنز العرفان میں انہی معانی کی طرف اشارہ کیا ہے، اگرچہ وہ قرضِ حسنہ کی تفسیر میں تمام اعمالِ صالح کو پیش کرتے ہیں۔

وہ گنہگار افراد جنہوں نے یہ آیت سن کر توبہ کی

آیت (الْعِیَّانُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا - - -) قرآنِ مجید کی ان لہزہ برنام کر دینے والی آیتوں میں سے ہے جو انسان کے دل اور اس کی روح کو مسخر کرتی ہیں اور غفلت کے پردے چاک کر کے پکار پکار کر کہتی ہیں کیا اس کا موقع نہیں آپہنچا کہ ایماندار دلِ خدا کے ذکر سے اور جو حق سے نازل ہوا ہے اس کو سن کر خدا کا خوف اختیار کریں اور ان لوگوں کے مانند نہ ہوں جنہوں نے کتابِ آسمانی کی آیات کا اور اک کیا لیکن طولِ زمان کے زیر اثر ان کے دل قساوت کی طرف مائل رہے۔ اس لیے تاریخ کے طویل دور میں ہم بہت سے گنہگار افراد کو دیکھتے ہیں جو اس آیت کو سن کر اس طرح کانپ اٹھتے ہیں کہ ایک ہی لمحے میں اپنے تمام گناہوں کو ترک کر دیتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض زاہدوں اور عابدوں میں قرار پائے ہیں۔ مجملہ دوسروں کے فضیل بن عیاض ہیں۔ فضیل جو کتبِ رجال میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے موثق راویوں میں سے ہیں اور مشہور زاہدوں میں شمار ہوتے ہیں وہ آخری زندگی میں جوارِ کعبہ میں رہائش رکھتے تھے۔ انہوں نے اسی علاقہ میں بروز عاشورہ دنیا سے رخصت سفر باندھا۔ وہ ابتدا میں ایک خطرناک رہزن تھے جس سے تمام لوگ ڈرتے تھے۔ وہ ایک آبادی کے قریب سے گزر رہے تھے کہ ایک لڑکی کو انہوں نے دیکھا۔ اس سے انہیں محبت ہو گئی۔ اس لڑکی کے عشق نے انہیں اس بات کی انگیزت دی کہ رات کے وقت وہ اس کے گھر کی دیوار پھانڈ کر اندر داخل ہوں اور ہر قیمت پر اس کا وصال حاصل کریں۔ وہ جس وقت دیوار پھانڈ رہے تھے تو اس وقت قریب کے گھروں میں سے لے ”الْمَصْدَقِيْنَ وَالْمَصْدَقَاتِ“ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمَتَصَدِّقَاتِ کے معنی میں ہے اور اقْرَضُوا اللّٰهَ کا عطف جو جملہ فعلیہ ہے گزشتہ جملہ اسمیہ پر اسی بنا پر ہے کیونکہ یہ جملہ الذین اقْرَضُوا اللّٰهَ کے معنی میں ہے۔

ایک گھر میں کوئی شخص تلاوت قرآن مجید میں مشغول تھا اور وہ اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا : **المریأں للذین آمنوا ان تخشع قلوبہم لذكر اللہ**۔ یہ آیت ایک تیر کی طرح فضیل کے دل پر لگی۔ انہوں نے دل میں چھین محسوس کی۔ ان کے دل میں ایک قسم کا ہیجان برپا ہو گیا۔ انہوں نے تھوڑا سا اس پر غور و فکر کیا کہ کون ہے جو یہ گفتگو کر رہا ہے اور کہے یہ پیام دے رہا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اے فضیل کیا وہ وقت نہیں آپہنچا کہ توبہ بیدار ہو اور اس راہ خطا سے لوٹ آئے ؟ اس گناہ سے اپنا دامن بچالے اور توبہ کی راہ اختیار کرے ؟ اچانک فضیل کی صدا بلند ہوئی۔ وہ مسلسل کہے جا رہے تھے : (**بلی واللہ قد آن ، بلی واللہ قد آن**) " خدا کی قسم اس کا وقت آپہنچا " خدا کی قسم اس کا وقت آپہنچا ہے " انہوں نے آخری فیصلہ کیا اور پختہ ارادہ کر لیا اور وہ بجلی کی سی ایک جست لگا کر حلقہ اشتیاق سے نکل آئے اور صاف سدا میں شامل ہو گئے۔ وہ دیوار سے نیچے اتر آئے اور ایک ایسے خرابے میں داخل ہوئے جہاں مسافروں کی ایک جماعت قیام پذیر تھی۔ وہ مسافر اپنی منزل کی طرف کوچ کرنے کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے مشورہ کر رہے تھے اور آپس میں یہ کہہ رہے تھے ، کہ فضیل اور اس کے ساتھی راستے میں ہیں اگر ہم جائیں گے تو وہ ہمارا راستہ روک لیں گے اور ہمارا مال و اسباب لوٹ لیں گے۔ فضیل لرز گئے اور اپنے آپ کو سخت ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ میں کتنا بُرا شخص ہوں۔ یہ کون سی شقاوت و بد بختی ہے جس میں مبتلا ہوں۔ رات کی تاریکی میں گناہ کے ارادہ سے میں باہر نکلا ہوں اور مسلمانوں کا ایک گروہ میرے خوف کی وجہ سے اس خرابے میں پناہ لینے پر مجبور ہوا ہے۔ انہوں نے آسمان کی طرف مُنہ کیا اور توبہ کرنے والے دل سے ان الفاظ کو اپنی زبان پر جاری کیا : **اللہم اِنِّی تبت الیک وجعلت توبتی الیک جوار بیتک الحرام**۔ خدایا میں تیری طرف لوٹ آیا اور اپنی توبہ یہ قرار دی ہے کہ ہمیشہ تیرے گھر کے قُرب میں رہوں گا۔ خدایا میں اپنی بدکاری پر رنجیدہ ہوں اور اپنی دنائت کی وجہ سے آہ و بکا کرتا ہوں تو میرے درد کی دوا کر۔ اے ہر درد کی دوا کرنے والے ! اے ہر عیب سے پاک و منزہ ! اے وہ جو میری خدمات بجالانے سے بے نیاز ہے ! اے وہ جسے میری خیانت سے کوئی نقصان نہیں ! مجھے اپنی رحمت کے صدقہ میں بخش دے اور مجھ ہواد ہوس کے اسیر کو اس قید و بند سے ہائی بخش خُدا نے ان کی دُعا قبول کی اور ان پر عنایات فرمائیں وہ وہاں سے لوٹ کر مکہ آئے برسوں تک وہاں مجاور رہے اور اولیاء اللہ میں سے ہو گئے

عمر گدائے کُوئے تواز ہشت غلد مستغنی است اسیر عشق تو از ہر دو کون آزاد است

تیرے کوچہ کا گدا آٹھوں ہشتوں سے مستغنی ہے اور تیرے عشق کا قیدی دونوں جہاں سے آزاد ہے

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بصرہ کے مشہور افراد میں سے ایک فرد کہتا ہے کہ میں ایک راستے سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک چیخ میں نے سُنی۔ میں اس چیخ مارنے والے کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص زمین پر بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون لوگوں نے بتایا کہ یہ ایک بیدار دل شخص ہے۔ قرآن کی ایک آیت اس نے سُنی ہے اور مدہوش ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ کون سی آیت تو انہوں نے بتایا : **المریأں للذین آمنوا ان تخشع قلوبہم لذكر اللہ**۔۔۔۔۔ میری آواز سن کر وہ بے ہوش شخص اچانک ہوش میں آگیا اور ہوش میں آکر اس نے ان دل سوز اشعار کو پڑھنا شروع کیا :

و للنعن غصن البان ان یتبما
المریأں ان یتبکی علیہ و یرجما

اما ان للہجران ان یتصرما
وللعاشق انصب الذی ذاب وانحنی

کتبت بماء الشوق بین جوانی

کتابا حکى نقش الوشى المنینیا

کیا اس کا موقع نہیں آیا کہ ہجر کا وقت ختم ہو اور میری اُمید کی بلند شاخ اور اس کی خوشبو مسکرائے اور کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ اس بقیار عاشق کے لیے جو پھل کر پانی ہو چکا ہے اور اس کی کمر ٹھک گئی ہے لوگ گریہ کریں اور وہ مرکز رحم قرار پائے سچی ہاں شوق کے پانی کی روشنائی سے میں نے اپنے صفحہ دل پر لکھ دیا ہے اور ایک ایسا نامہ شوق تحریر کیا ہے جو بہت ہی خوبصورت عمدہ اور جاذب توجہ ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا مشکل ہے مشکل ہے مشکل ہے یہ کہہ کر وہ دوبارہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اس کو ہم نے ہلا کر دیکھا تو وہ اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکا تھا۔

۱۹. وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّٰدِقُونَ
وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ

أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝

۲۰. اَعْلَمُوا اَنَّهَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا الْعِبْ وَلَهُمْ وِزْنٌ وَّ
تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ
كَمَثَلٍ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ
فَتَرِبَهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَّفِى الْاٰخِرَةِ
عَذَابٌ شَدِيدٌ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَّ
مَّا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

ترجمہ

۱۹۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے وہ صدیقین و شہداء ہیں۔ اپنے
پروردگار کے پاس۔ ان کے (اعمال) کا اجر اور ان کا نور (ایمان) ان کے لیے ہے
اور جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ اصحاب جحیم ہیں۔

۲۰۔ جان لو کہ زندگی دُنیا صرف کھیل کود، سرگرمی، تھل پرستی اور تمہارے درمیان تفاخر ہے اور مال و اولاد میں اضافہ کا طلب کرنا اس بارش کی طرح جس کا حاصل کسانوں کو تعجب میں ڈال دیتا ہے پھر وہ (کھیتی) خشک ہو جاتی ہے اس طرح کہ تو اسے زرد دیکھتا ہے پھر وہ خشک بھوسہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آخرت میں یا عذاب شدید ہے یا مغفرت و رضائے الہی۔ بہر حال زندگی دُنیا متاعِ غرور کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

تفسیر

دُنیا متاعِ غرور کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں

گزشتہ آیات کی بحث جس میں مومنین اور بارگاہِ خدا میں ان کے اجر سے متعلق گفتگو تھی اس کو جاری رکھتے ہوئے پروردگارِ عالم زیر بحث آیت میں مزید فرماتا ہے:

”وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین اور شہداء ہیں: (وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ وَالشّٰهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ)۔ ”صدیق“ صدق سے ہے اور صیغہ مبالغہ اور اس شخص کے معنی میں ہے جو سراپا صداقت ہو۔ وہ جس کا علم اس کی گفتار کی تصدیق کرتا ہو اور وہ سچائی کا کامل نمونہ ہو۔ ”شہداء“ جمع شہید کی، اس کی مادہ شہود ہے جس کے معنی ایسا حضور ہیں جس کے ساتھ مشاہدہ وابستہ ہو۔ چاہے وہ ظاہری آنکھ سے ہو چاہے دل کی آنکھ سے۔ اور اگر گواہ پر شاہد و شہید کا اطلاق ہوتا ہے تو وہ اس بنا پر ہے کہ اس نے کسی منظر کا مشاہدہ حاضرہ کر لیا ہے۔ اسی طرح جس طرح اس کا اطلاق شہیدانِ راہِ خدا پر میدانِ جہاد میں ان کے حاضر ہونے کی بنا پر ہوتا ہے۔ لیکن زیر بحث آیت میں ہو سکتا ہے کہ، اعمال کی شہادت کے معنی میں ہو جیسا کہ قرآن کی دوسری آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اور انبیاء اپنی اپنی امتوں کے اعمال کے گواہ ہیں اور پیغمبرِ اسلام ان کے گواہ بھی ہیں اور اپنی امت کے بھی اور مسلمان بھی لوگوں کے اعمال کے شاہد اور گواہ ہیں۔

اس بنا پر شہداء کا مقام (اعمال کے گواہ) ایک بلند مقام ہے جو ایمان دار افراد کو حاصل ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ یہاں شہداء انہی شہداء کے راہِ خدا کے معنوں میں ہے یعنی جو مومن ہے وہ شہیدوں جیسا ابر رکھتا ہے اور بمنزلہ شہداء ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: (ادع اللہ ان یرزقنی الشہادۃ)۔ خدا سے دُعا

۱۔ تفسیر نمونہ کی جلد ۷ سورہ حج کی آیت ۸۸ کے ذیل میں اور جلد ۲ سورہ نساء کی آیت ۴۱ کے ذیل میں جو تحریر ہے اس کی طرف رجوع فرمائیں۔

کیجئے کہ وہ مجھے شہادت عطا فرمائے۔

امامؑ نے فرمایا :

”ان المؤمن شہید وقرأ هذه الآية“

مومن شہید ہے اور پھر آپؐ نے اس آیت، (وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ --) کی تلاوت فرمائی۔
مذکورہ دونوں معانی کا اجتماع بھی ممکن ہے اس لیے کہ قرآن مجید میں شہید و شہداء کے الفاظ عام طور پر گواہوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔
بہر حال خدا مومنین کی دو صفیں بیان کرتا ہے۔ پہلی صفت صدیق اور دوسری شہید، اور یہ چیز بتاتی ہے کہ زیر بحث آیت میں مومنین سے مراد وہ افراد ہیں جن کو ایمان کا بلند ترین مقام حاصل ہے ورنہ ایک عام مومن اسی قسم کے اوصاف کا حامل نہیں ہوتا۔
اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”ان کے لیے ان کے اعمال کا اجر ہے اور ان کے ایمان کا نور“ (لھم اجرھم ونورھم)۔
یہ تفصیلی تعبیر عظیم اجر اور ان کے حد سے زیادہ نور کی طرف اشارہ ہے۔ آخر میں فرماتا ہے: ”لیکن وہ لوگ جو کافر ہو گئے اور انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ اہل دوزخ ہیں“ (وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ)۔ تاکران دونوں گروہوں کے تقابل سے، پہلے گروہ کا مقام بلند اور دوسرے گروہ کی پستی آشکار ہو جائے اور چونکہ پہلے گروہ میں ایمان کی بلند سطح متبر نظر آتی لہذا اس گروہ کا بھی شدید کفر پیش نظر ہے اسی لیے اس گروہ کا ذکر آیات الہی کی تکذیب کے عنوان سے ہوا ہے اور چونکہ دنیا کی محبت ہر گناہ کا چشمہ ہے (رأس كل خطیئة) اس لیے بعد والی آیت میں دنیا کی کیفیت حیات اور اس کے مختلف مرحلوں کی گویا نمایاں تصویر کشی ہوئی ہے اور ہر مقام پر جو عوامل کار فرما ہیں وہ پیش کیئے گئے ہیں۔

پروردگار عالم فرماتا ہے: ”جان لو کہ زندگی دنیا صرف کھیل کود، جوش و خروش، تجمل پرستی، ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کرنا مال و اولاد میں اضافہ کا مطالعہ کرنا ہے“ (اعلموا انما الحیاء الدنیا لعب ولھو ورنیۃ و تفاخر بینکم و تکاثرف الاموال والاولاد)۔ اس اعتبار سے غفلت، جوش و خروش، تجمل پرستی، تفاخر اور تکاثر انسانی زندگی کے پانچ مرحلوں کو تشکیل دیتا ہے۔ پہلا بچپن کا دور ہے جس میں زندگی بے خبری اور لہو و لعب میں مصور رہتی ہے۔ اس کے بعد لڑکپن کا دور آتا ہے۔ اس میں سرگرمی اور جوش و خروش کھیل کود کی جگہ لے لیتے ہیں اور اس مرحلہ میں انسان ایسے مسائل میں الجھا رہتا ہے جو اسے صرف اپنے ساتھ سرگرم رکھیں لیکن سنجیدہ مسائل سے دور۔ تیسرا مرحلہ جوانی کا ہے جس میں شور و غوغا ہوتا ہے اور تجمل پرستی ہوتی ہے۔ اس مرحلے سے گزرے تو چوتھا مرحلہ آتا ہے۔ اس میں مقام و منصب کے حاصل کرنے اور فخر و مباہات کرنے کے جذبات انسان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ آخر کار وہ پانچویں مرحلہ میں داخل ہو جاتا ہے جس میں افزائش مال و اولاد کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ پہلے مرحلے تو زندگی اور عمر کے مطابق طے شدہ ہیں لیکن بعد کے مرحلے مختلف افراد

۱۔ تفسیر عیاشی مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۴۲۔

۲۔ اوپر والی تفسیر کے مطابق (اولئک هم الصدیقون والشہداء عندی) میں کوئی چیز متقدر نہیں ہے اور مومنین کے اس گروہ کو صدیقین و شہداء کے مصداق شمار کیا گیا ہے لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بہرہ صلیقین و شہداء ہیں نہ کہ خود وہی ہیں یعنی ان کا اجر تو انہیں ملے گا لیکن تمام اعزازات و افتخارات نہیں ملیں گے اور وہ کہتے ہیں کہ آیت کی تقدیر عبارت اس طرح ہے (اولئک لھم مثل اجر الصدیقین والشہداء) تفسیر روح المعانی اور المیزان (در ذیل آیات زیر بحث) اور طبعاً لھم اور اجرھم کی تفسیروں کا مرجع بھی مختلف ہوگا لیکن یہ تفسیر ظاہر آیات کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

میں شکل طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ انسان میں مال کی افزائش کا جذبہ آخر تک برقرار رہتا ہے۔ اگرچہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان پانچ اصولوں میں سے ہر مرحلہ انسانی زندگی کے آٹھ سال پر محیط ہوتا ہے اور مجموعی طور پر چالیس سال تک جا پہنچتا ہے۔ جب انسان اس مرحلہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی شخصیت بچتہ ہو جاتی ہے۔ یہ امر بھی پورے طور پر ممکن ہے کہ بعض انسانوں کی شخصیتیں پہلے یا دوسرے مرحلے ہی میں ٹھہر جاتی ہیں اور یہ بڑھاپے تک کھیل کود، سرگرمی اور معرکہ آرائی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یا یہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت تجمل پرستی میں بٹ کر رہ جاتی ہے اور انہیں مکان، سواری اور عمدہ لباس کی فراہمی کے علاوہ اور کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ یہ ادھیڑ عمر کے لوگ ہونے کے باوجود بچتے ہوتے ہیں اور بڑھاپے ہو کر بھی بچوں کے سے جذبات و احساسات رکھتے ہیں۔ اس کے بعد پروردگار عالم انسان کی دنیاوی زندگی اور اس کے آغاز و انجام کی ایک مثال یا کر کے پوری کیفیت کو نگاہ انسانی کے سامنے مجسم کر کے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے: "مثل بارش کے ہے جو آسمان سے زمین کی طرف آتی ہے اور اس طرح زمین کو زندہ کرتی ہے کہ اس پر نمایاں ہونے والے سبزے زراعت کرنے والوں کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خشک ہو جاتے ہیں اور ایسے ہو جاتے ہیں کہ تو انہیں زرد رنگ کا دیکھتا ہے۔ پھر ٹوٹ پھوٹ کر اور چھوٹے چھوٹے تنکے بن کر خشک کٹی ہوئی گھاس میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔" (کامل غیث العجب الکفار نباتہ شعبہ بیج فترۃ مصفرا شویکون حطاماً)۔

یہاں لفظ کفار بے ایمان افراد کے معنوں میں نہیں ہے بلکہ زراعت کرنے والوں کے معنی میں ہے کیونکہ کفر کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور چونکہ کسان بیج چھڑک کر اُسے زمین کے اندر چھپا دیتا ہے اس لیے اُسے کافر کہتے ہیں اور اسی لیے کفر بعض اوقات قبر کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ وہ مرنے والے کے جسم کو چھپا دیتی ہے۔ کبھی رات کو بھی کافر کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی تاریکی ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ درحقیقت زیر بحث آیت سورہ فتح کی آیت کے مانند ہے جس میں گیارہ و نبات کے متعلق زیادہ گفتگو کرتا ہے تو فرماتا: (یعجب الزراعی) "زراعت کرنے والوں کو تعجب میں ڈال دیتی ہے" (یعنی کفار کی بجائے زراعت کیا گیا ہے)۔ بعض مفسرین نے یہاں اس احتمال کو بھی پیش کیا ہے کہ یہاں کفار سے مراد وہی کفار کے وجود کا انکار کرنے والے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے چند توجیہات بھی پیش کی ہیں۔ لیکن یہ تفسیر زیادہ مناسب نظر نہیں آتی کیونکہ اظہار تعجب میں کافر و مومن دونوں شریک ہیں۔ "حطام" کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی توڑنے اور چھوٹا کرنے کے ہیں۔ گھاس کے ان اجزاء کو حطام کہا جاتا ہے جو تیز ہوا کی جنبش سے بکھر جاتے ہیں۔ جی ہاں وہ مرحلے جو انسان ستر سال یا اس سے زیادہ عمر میں طے کرتا ہے وہ گھاس اور دیگر نباتات پر چند مہینوں میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور انسان ایک کھیت کے کنارے بیٹھ کر عمر کے گزرنے اور اس کے آغاز و انجام کو مختصر سی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کے حاصل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "لیکن آخرت کا معاملہ دو حالتوں سے خارج نہیں ہے یا عذاب شدید ہے یا اس کی مغفرت، رضا اور خوشنودی" (وفی الآخرة عذاب شدید ومغفرة من الله ورضوان)۔ آخر کار آیت کہ اس جملہ پر ختم کرتا ہے: "اور زندگی دنیا سوائے متاع غرور اور فریب کے اور کوئی چیز نہیں ہے" (وما الحیوة الدنیا الا متاع الغرور)۔ "غرور" اصل میں "غر" (بروزن حر) کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا اثر ظاہری۔ اسی لیے گھوڑے کی پیشانی پر ظاہر ہونے والے اثر کو "غرہ" کہتے ہیں۔ اس کے بعد غفلت کی حالت پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ جہاں ظاہر میں انسان ہوشیار ہے لیکن حقیقت میں بے خبر ہے یہ فریب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ "متاع" ہر قسم کے فائدہ اٹھانے کے وسائل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تو اس بنا پر دنیا متاع غرور ہے۔

۱۔ "بیج" کا مادہ "ہیجان" ہے یہ نشت میں دو معانی کے لیے آیا ہے ایک گھاس کا خشک ہو جانا دوسرے حرکت میں آنا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں معانی ایک ہی اصل کی طرف لوٹتے ہوں کیونکہ جب گھاس خشک ہو جائے تو وہ حرکت اور پراگندگی کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

کے مجملہ کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا فریب کاری کے لیے وسیلے کی مانند ہے، اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے بھی اور دوسروں کو فریب دینے کے لیے بھی۔ البتہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو دنیا کو اپنا انتہائی مقصود قرار دیتے ہیں اور اسی میں دل لگا لیتے ہیں اور اسی پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کی آخری آرزو یہی ہوتی ہے کہ دنیا حاصل کر لیں۔ لیکن اگر اس دنیا کی نعمتیں بلند اقدار اور سعادتِ جاودانی کے حصول کا ذریعہ بن جائیں تو پھر وہ ہرگز دنیا نہیں ہے، بلکہ آخرت کی کھیتی۔ عظیم مقاصد تک پہنچنے کا ایک پل ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر دنیا کی طرف ایک گزر گاہ یا آرام کرنے کی جگہ کی حیثیت سے نظر کی جائے تو اس کے دو پہلو سامنے آتے ہیں جن میں سے ایک میں جھگڑا اور فساد ہے، حد سے تجاوز ہے، ظلم ہے اور سرکشی و غفلت ہے۔ دوسرے پہلو میں بیداری کا وسیلہ ہے، آگاہی ہے، ایثار و قربانی ہے، بھائی چارہ ہے اور معاف کر دینا ہے۔

چند نکات

۱۔ قرآن مجید میں عظیم پیغمبروں اور ان جیسے افراد کی ایک جماعت کی تعریف صدق کے عنوان کے تحت کی گئی ہے۔ منجملہ دیگر افراد کے ایک حضرت ابراہیم ہیں۔ (انہ کان صدیقاً نسیاً) (سورہ مريم آیت ۶۱) خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ادریسؑ کے بارے میں بھی یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ (مريم ۵۶) حضرت مریمؑ مادر جناب عیسیٰؑ کے بارے میں بھی ہم پڑھتے ہیں: (وامد صدیقۃ)۔ (مائده ۷۵)۔

قرآن کی بعض آیتوں میں صدیقین کا ذکر پیغمبروں کے ہمراہ ہوا ہے جیسا کہ سورہ نسا کی آیت ۶۹ میں ہم دیکھتے ہیں: (ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحن اولئک رفیقاً) جو شخص خدا و پیغمبر کی اطاعت کرے وہ (قیامت میں) ایسے لوگوں کا ہم نشین ہوگا جن پر خدا نے اپنی نعمت کو تمام کیا ہے، پیغمبروں، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے اور وہ اچھے رفقاء ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ لفظ مبالغہ کا صیغہ ہے اس کا مادہ صدق ہے اور یہ اس شخص کیلئے بولا جاتا ہے جس کے وجود کا صدق و راستی نے احاطہ کر لیا ہو اور صداقت اس کی پوری زندگی پر حاوی ہو۔ یہ چیز مقام صدق کی اہمیت کو بتاتی ہے۔

باقی رہے شہداء تو جیسا کہ ہم نے کہا ہے کبھی تو اعمال کے گواہ کے معنوں میں اور کبھی شہیدانِ راہِ خدا کے معنوں میں اور زیر بحث آیت میں ان دونوں معانی کا اجتماع بھی ممکن ہے البتہ شہید اسلامی فرہنگ اور تمدن کے اعتبار سے صرف انہی افراد میں محدود نہیں ہے جو میدانِ جہاد میں قتل ہو جائیں اگرچہ وہ اس کے واضح ترین مصداق ہیں۔ حتیٰ کہ وہ تمام افراد جو عقیدہ حق رکھتے ہیں، راہِ حق میں قدم اٹھاتے ہیں اور اسی راہ میں دنیا سے چلے جاتے ہیں، روایاتِ اسلامی کے مطابق سب زمرہ شہداء میں آتے ہیں۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ :

(العارف منکم هذا الامر المنتظر له المحتسب فيه الخیر من جاہد اللہ مع قائم آل محمدؑ بسیفہ) ثم قال بل واللہ من جاہد مع رسول اللہ بسیفہ، ثم قال الثالثة: بل واللہ من استشهد مع رسول اللہ فی فسطاطہ. وفیک ایتہ من کتاب اللہ قلت وای ایتہ جعلت فداک؟ قال قول اللہ عز وجل والذین امنوا باللہ ورسولہ اولئک هم الصدیقون والشہداء عند ربہم۔۔۔۔۔ شو قال صرعو اللہ صادقین شہداء عند ربکم) جو شخص تم میں سے مسلہٴ ولایت سے آشنا ہو اور ظہورِ مہدیؑ کے انتظار میں زندگی گزارے اور

اپنے آپ کو ان کی عادل حکومت کے لیے آمادہ رکھے اس شخص کی مانند ہے جو ہمدی آل محمدؐ کی معیت میں اپنے ہتھیاروں سے جنگ کرے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا بلکہ خدا کی قسم، اس شخص کے مانند ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں اپنے ہتھیاروں سے جہاد کیا۔ پھر آپ نے تیسری مرتبہ فرمایا بلکہ خدا کی قسم اس شخص کے مانند ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہ کر آپ کے خیمے میں شہید ہوا ہو پھر فرمایا تمہارے بارے میں قرآن میں آیت نازل ہوئی ہے راوی نے کہا: آپ پر قربان ہو جاؤں، کون سی آیت؟ فرمایا: خدا کا یہ کلام جس میں فرماتا ہے وہ جو خدا اور اس کے بھیجے ہوئے افراد پر ایمان لائے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین اور شہداء ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: تو اس طرح سے تم خدا کی قسم اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین بھی ہو اور شہداء بھی۔

اس گفتگو کو ہم حضرت امیر المومنین علیؑ کی ایک گفتگو پر ختم کرتے ہیں جس وقت آپ کے اصحاب کا ایک گروہ جہاد کے وقت کے انتظار میں اور راہِ خدا میں شہادت پانے کے شوق میں بے تاب تھا تو آپ نے یہ جملہ فرمایا:

(وَلَا تَسْتَعْجِلُوا بِالْمَوْتِ لَعَلَّكُمْ فَنَاءَ مِنْ مَاتَ مِنْكُمْ عَلَى فِرَاشِهِ وَ

هُوَ عَلَى مَعْرِفَةِ حَقِّ رُبِّهِ وَحَقِّ رَسُولِهِ وَاهْل بَيْتِهِ مَاتَ شَهِيدًا)

اس چیز میں جس میں خدا عجلت روا نہیں رکھتا جلدی مت کرو کیونکہ تم میں سے جو شخص اپنے بستر پر مر جائے لیکن حق پروردگار، حق پیغمبر اور حق اہل بیت کی معرفت رکھتا ہو، وہ شہید مرا ہے۔

دُنیاوی زندگی ان اسبابِ عمل کا مجموعہ ہے

قرآن کی مختلف آیتوں میں کبھی تو دنیاوی زندگی کو لہو و لعب کہا گیا ہے مثلاً: (وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ) "دنیاوی زندگی لہو و لعب کے علاوہ کچھ نہیں ہے" (الانعام-۳۲) اور کبھی لہو و لعب، زینت، تفاخر اور تکاثر کے الفاظ آئے ہیں مثلاً (زیر بحث آیات) اور کبھی اسے "متاع غرور" سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً (آل عمران-۱۸۵) اور آیات زیر بحث اور کبھی "متاع قلیل" (نساء-۷۷) اور کبھی عارضی و ظاہری اور جلد گزر جانے والے امر سے تعبیر کیا ہے۔ (نساء-۹۴) ان تعبیروں سے اور قرآن کی دوسری تعبیروں کے مجموعہ سے اسلام کا مادی زندگی اور اس سے متعلق نعمتوں کے بارے میں جو نظریہ ہے وہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اسلام اس زندگی کو بالکل بے قدر و قیمت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف

میلان و توجہ کو اور اس سے وابستگی کو بے مقصد امور (لعب) اور خواہ مخواہ مصروف رکھنے والے مقاصد (لہو) اور تجمل پرستی (زینتہ) اور حُبِّ مقام و منصب اور ریاست اور دوسروں پر برتری کی خواہش (تفاخر) اور حرص و از اور افزوں طلبی (تمکاش) شمار کرتا ہے۔ اور دنیا سے عشق کرنے کو انواع و اقسام کے مظالم اور گناہوں کا سرچشمہ قرار دیتا ہے لیکن اگر یہ نعمتیں اپنی بہت کو بدل لیں اور مقاصد الہی تک پہنچنے کا ذریعہ بن جائیں تو ایسا سرمایہ بن جائیں گی جنہیں خدا مؤمنین سے فرماتا ہے اور بہشتِ جاوداں اور سعادتِ ابدی انہیں بخشا ہے۔

”ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهو الجنة“ (توبہ - ۱۱۱)

www.sirat-e-mustaqeem.net

٢١- سَابِقُوا إِلَى مَفْزَعٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا

كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ

وَرُسُلِهِ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ

ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

٢٢- مَا أَصَابَ مَن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ

إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى

اللَّهِ يَسِيرٌ ۝

٢٣- لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا

آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝

٢٤- الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۚ وَمَن

يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْفَنِي الْحَمِيدُ ۝

ترجمہ

۲۱۔ ایک دوسرے پر سبقت کرو اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنت تک پہنچنے کے لیے جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت جیسی ہے اور تیار کی گئی ہے ایسے لوگوں کے لیے جو خدا اور رسولوں پر ایمان لائے ہیں یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے دیتا ہے اور خدا صاحب فضل عظیم ہے۔

۲۲۔ کوئی مصیبت زمین میں اور تمہارے وجود میں نمودار نہیں ہوتی مگر یہ کہ زمین کی تخلیق سے پہلے سے لوح محفوظ میں ثبت ہے اور یہ چیز خدا کے لیے آسان ہے۔

۲۳۔ یہ اس لیے ہے تاکہ اس پر جسے تم گم کر چکے ہو افسوس نہ کرو اور جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس سے خوش نہ ہو اور خدا کسی متکبر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

۲۴۔ وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کی دعوت دیتے ہیں اور جو شخص (اس فرمان سے) رُوگرداں ہو (خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا) کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔

تفسیر ایک عظیم معنوی مقابلہ

دنیا اور اس کی لذتوں کی ناپائیداری کے بیان کے بعد اور اس بیان کے بعد کہ لوگ اس دنیا میں بے قیمت سرنائے کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے تفاخر و تمکاثر کرتے ہیں لوگوں کو، زیر بحث آیات میں، ان چیزوں کے طریقہ کسب کے لیے جو پائیدار اور ہر قسم کی سعی و کوشش کے لائق ہیں، دعوتِ فکر دیتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کی بخشش، مغفرت اور اس جنت کے حصول کے لیے جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے مانند ہے اور جو ایسے لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خدا اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لائے ہیں، ایک دوسرے پر سبقت کرو۔"

(سابقہ قولی مغفرة من ربك و جنة عرضها كعرض السماء والارض أعدت للذين آمنوا بالله

و (رسالہ)۔ حقیقت میں پروردگار کی طرف سے عطا کی ہوئی مغفرت، کلیدِ جنت ہے۔ وہ جنت جو زمین و آسمان کی وسعتوں کو گھیرے ہوئے ہے اور ابھی سے عومنین کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ جنت اُدھار ہے اور اُدھار سے دل نہیں لگانا چاہیے۔ جنت اگرچہ اُدھا فرض کی گئی ہے لیکن وہ ہر نقد سے زیادہ شمار کی جاتی ہے کیونکہ اس کا وعدہ اس خدا کی طرف سے کیا گیا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ چر جائیدہ پُرے طور پر نقد ہے اور آب بھی موجود ہے۔ ان معانی سے مشابہت رکھتی ہوئی گفتگو سورۃ آل عمران کی آیت ۱۳۳ میں آئی ہے اس فرق کے ساتھ کہ یہاں "مسابقوا" "مسابقہ" کے مادہ سے اور وہاں "سارعوا" "مسارعہ" کے مادہ سے ہے اور ایسے افراد کے لیے ایک دوسرے کے مقابلہ میں تیزی و سرعت کرنے کے معنی میں آیا ہے جو ایک دوسرے کے مقابل ہوں (باب معاملہ کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو دو افراد کے ایک دوسرے پر غلبہ کی کوشش کو مختتم کرتا ہے)۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ وہاں "عرضا السماوات والارض" ہے اور یہاں "عرض السماء والارض" ہے۔ تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تعبیریں ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ وہاں فرماتا ہے: "پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے" اور یہاں فرماتا ہے: "مومنین کے لیے"۔ چونکہ پرہیزگاری شجر ایمان کا ثمر ہے لہذا یہ دونوں تعبیریں ایک ہی حقیقت کی ترجمان ہیں۔ یہ ضرورت حال بتاتی ہے کہ دونوں آیتیں دو مختلف بیانات کے ساتھ ایک ہی حقیقت کو پیش کرتی ہیں۔ اسی بنا پر، جیسا کہ بعض مفسرین کا نقطہ نظر ہے کہ انہوں نے سورۃ آل عمران کی آیت کو مقررین کی جنت کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور زیر بحث آیت میں مومنین کی بہشت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے تو یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ یہاں عرض کا لفظ طول کے مقابلہ میں نہیں ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے، اور اس کے بعد وہ ایسی طویل و عریض جنت کی تلاش میں ہیں جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہو اور اس کا دوش کی وجہ سے وہ رحمت اُٹھا رہے ہیں۔ ایسے موقع پر عرض کے معنی وسعت کے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں: "پہنہ و دشت" جس کے معنی ہیں وسعت صحرا۔ مغفرت کی تعبیر جو جنت کی بشارت سے پہلے دونوں آیات میں آئی ہے وہ اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ جب تک انسان گناہ سے پاک نہ ہو وہ جنت اور جوار پروردگار میں ورود کے قابل نہیں ہوگا یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ پروردگار کی مغفرت کی طرف سبقت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حصولِ مغفرت کے اسباب کی طرف توجہ کی جائے جیسے توبہ کا راستہ اختیار کرنا، وہ اطاعتیں جو نظر انداز ہو گئی ہیں ان کی تلافی کرنا اور اصولی طور پر اطاعت پروردگار گناہوں اور عاصی سے پرہیز ہی کا نام ہے۔ اور اگر بعض احادیث و روایات میں واجبات و مستحبات پر انحصار کیا گیا ہے، مثال کے طور پر جماعت کی صفِ اول کی طرف بڑھنا، جہاد کی پہلی صفیں لگانا، امام جماعت کے ساتھ تکبیر و الاحرام کنا، اول وقت میں نماز پڑھنا تو یہ مثالوں کے ذکر کے طور پر ہے یا واضح اور روشن مصادیق کا بیان ہے اور آیت کے مفہوم کی وسعت میں کمی نہیں کرتا۔ آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے: "یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا صاحبِ فضل عظیم" (ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم)۔ یقیناً اس قسم کی وسیع جنت جس میں اتنی عظیم نعمتیں ہوں وہ ایسی چیز نہیں ہوتی جو ناپجز اعمال کے ذریعہ انسان کو حاصل ہو جائے یہ صرف اللہ کا فضل و کرم ہے جو قلیل اعمال کے بدلے اتنا بڑا اجر مقرر کیا گیا ہے اور خدا سے اس کے علاوہ اور کوئی توقع بھی نہیں کی جاسکتی وہ اس لیے کہ اجر ہمیشہ اعمال کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ اجر دینے والے کے کرم کے مطابق ہوتا ہے۔ بہر حال یہ تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ ثواب اور جوارِ عمل کی مزدوری نہیں ہیں بلکہ یہ ایک طرح کا فضل و کرم ہے۔ اس کے بعد دُنیا سے عدم دلگاہی اس کے حصول پر خوش نہ ہونے اور اس کے منہ موڑنے پر غمگین نہ ہونے کے بارے میں تاکید مزید کے لیے فرماتا ہے: "کوئی مصیبت زمین میں واقع نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ تمہاری اور زمین کی خلقت سے پہلے سے کتاب (لوح محفوظ) میں ثبت ہے اور یہ امر خدا کے لیے آسان ہے" (ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی النفسک الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذالک علی اللہ

یسیر

جی ہاں وہ مصیبتیں جو زمین میں پیش آتی ہیں مثلاً زلزلے، طوفان، سیلاب اور انواع و اقسام کے دردناک حوادث جن سے انسان دوچار ہوتا ہے وہ سب پہلے سے طے شدہ ہیں، اور لوح محفوظ میں ثبت ہیں۔ لیکن توجہ کرنی چاہیے کہ وہ مصیبتیں جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے، صرف اسی نوعیت کی ہیں جن سے کسی طرح نہیں بچا جاسکتا اور وہ انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں (بالفاظ دیگر یہاں صرصر اضافی ہے)۔ اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۳۰ ہمیں بتاتی ہے کہ: **وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ** **أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ**۔ ”جو مصیبت بھی تمہیں پہنچے وہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جنہیں تم انجام دیتے ہو اور بہت سے گناہوں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ آیتیں ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں، جس وقت یہ آیتیں ایک دوسرے کے مقابل ہوں تو بتاتی ہیں کہ وہ مصیبتیں جو انسان پر نازل ہوتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں ایک تو وہ جو انسان کے اعمال کی سزا ہوتی ہیں یا گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں۔ یہ مصیبتیں بے شمار ہیں۔ ظلم و ستم، بے انصافیاں، خیانتیں، وعدہ خلافیاں وغیرہ اور نہ معلوم کتنے کام اور ایسی چیزیں جو ہمارے خود کردہ مصائب کا سرچشمہ ہیں۔ لیکن مصائب کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں ہم کسی قسم کا دخل نہیں رکھتے۔ اس حصہ کے مصائب ایک ایسے ناگزیر امر کی صورت میں انسان یا معاشرہ کا مقدر بنتے ہیں جن سے کسی طرح بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان دونوں کا حساب الگ الگ اسی لیے بہت سے انبیاء، اولیاء اور صلحاء اس قسم کی مصیبتوں کا شکار ہوتے تھے۔ ان مصائب کا ایک دقیق فلسفہ ہے جس کی طرف ہم خدا شناسی اور عدل الہی کے مباحث میں اور یہ مسئلہ آفات و بلیات کے ماتحت اشارہ کر چکے ہیں۔

ایک حدیث ہماری نظر سے گزری ہے کہ جس وقت امام زین العابدین علیہ السلام کو یزید کی مجلس میں ایسی حالت میں لے جایا گیا کہ آپ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے تو یزید نے امام کی طرف رخ کر کے سورہ شوریٰ کی آیت پڑھی: **وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ**۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ظاہر کرے کہ خاندان رسالت کے مصائب خود ان کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح وہ دل امام پر زبان کا زخم لگانا چاہتا تھا لیکن امام نے فوراً اس کے کلام کی تردید کی اور فرمایا:

(كَلَّا مَا نَزَّلَتْ هَذِهِ فَيَنَّا نَمَّا نَزَّلَتْ فَيَنَّا مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي

الْأَرْضِ وَلَا فِي الْفَسْكَ وَالْآفَاكِ) کتاب من قبل ان نہراھا

ایسا نہیں ہے یہ آیت ہمارے بارے میں نازل نہیں ہوئی بلکہ ہمارے بارے میں ایک

اور آیت نازل ہوئی ہے جو یہ ہے کہ: جو مصیبت بھی تمہارے وجود میں یا زمین پر پڑتی ہے

تمہاری خلقت سے پہلے سے لوح محفوظ میں ثبت ہے۔ (اور اس کا ایک فلسفہ ہے اور حکمت ہے)

اس سلسلہ میں تفصیلی بحث ہم سورہ شوریٰ کی آیت ۱۱ کے ذیل جلد ۱۱ میں کر چکے ہیں۔

یہ کہ ”نہراھا“ مراد ضمیر کیا چیز ہے اس میں کئی احتمال ہیں۔ بعض اس کا مرجع زمین اور انفس کو سمجھتے ہیں بعض مصیبت کو اور بعض سب کو لیکن آیت کے لب و لہجہ پر توجہ کرتے ہوئے پہلے معنی مناسب ہیں کیونکہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ زمین و آسمان اور تمہاری خلقت سے پہلے ان مصائب کی پیش بینی ہوئی ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۶۷۔

جلد ۲ ص ۵۱۵ سے آگے اور سورہ نساء کی آیت ۷۸ کے ذیل میں بھی ایک اور بحث تھی جو زیر بحث آیات کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔

مکتب اہل بیتؑ کے شاگردوں نے یہی معانی سمجھے ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ جس وقت ”سعید ابن جبیرؓ“ کو حجاج کے پاس لے گئے اور اس نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تو حاضرین میں سے ایک شخص رونے لگا تو سعیدؓ نے کہا: کیوں رو رہے ہو؟ اس نے کہا: اس مصیبت کی بنا پر جو آپ کو پیش آئی ہے تو انہوں نے کہا اگر یہ نہ کرو یہ علم خدا میں تھا کہ اس طرح ہو۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ خدا فرماتا ہے: (ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا) ط

البتہ تمام حوادث جو عالم میں رونما ہوتے ہیں لوح محفوظ میں ثبت ہیں اور خدا کے علم بے پایاں میں ہیں۔ اگر یہاں صرف زمین اور نفوس انسانی میں رونما ہونے والے مصائب کی طرف اشارہ ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موضوع سخن یہی تھا جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بعد والی آیت میں اس کا نتیجہ پیش کیا گیا ہے: (ان ذالک علی اللہ یسیر)۔ کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ لوح محفوظ میں تمام حالات کا ثبت ہونا حوادث کی کثرت کے باوجود خدا کے لیے دشوار نہیں ہے اور لوح محفوظ سے مراد خدا کا لامحدود علم ہے یا صغیر جہان خلقت ہے یا بظہر نظام علت معلول جو خدا کے علم فعلی کا مصداق ہے (غور فرمائیے) ہمیں دیکھنا ہے کہ لوح محفوظ میں ان مصائب کی تقدیر اور پھر قرآن میں اس حقیقت کا بیان دراصل کیا چیز ہے۔ بعد والی آیت اس اہم راز کے چہرے سے پردہ اٹھاتی ہے اور کہتی ہے: ”یہ اس بنا پر ہے کہ جو کچھ تم نے گنوا ہے اس پر غلگین نہ ہونا اور جو کچھ خدا نے تمہیں دیا ہے اس پر خوش نہ ہونا۔“ (لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم) یہ دو جملے حقیقت میں فلسفہ آفرینش کے ایک پیچیدہ مسئلہ کو حل کرتے ہیں اس لیے کہ انسان عالم ہستی میں ہمیشہ مشکلات اور حوادث سے دوچار رہتا ہے اور اکثر اوقات اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ، اس کے باوجود کہ خدا مہربان و کریم ہے، یہ دردناک حوادث کس وجہ سے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ مقصد یہ تھا کہ تم اس جہان سے خوش اور اس چمک دمک کے اسیر نہ بن جانا، اس گزرگاہ اور اس پل کی حیثیت کو جس کا نام دُنیا ہے اور اپنی حیثیت کو فراموش نہ کر دینا اور اس کے والا و شیدا نہ بن جانا اور اس کو ابھی اور جاودانی نہ سمجھنا کیونکہ یہ حد سے زیادہ وابستگی تمہاری سعادت کی بہت بڑی دشمن ہے۔ وہ تمہیں یادِ خدا سے غافل کرتی ہے اور ترقی کے راستے سے منحرف کرتی ہے۔ یہ مصیبتیں غفلوں کے لیے ”ہوشیار رہو“ کی آواز ہیں اور سوئی ہوئی ارواح کے لیے اس جہان کی ناپائیداری کی ایک رمز ہیں اور اس زندگی کے مختصر ہونے کی طرف ایک اشارہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دارالغور کے فریب دینے والے مظاہر انسان کو بہت جلد اپنی طرف کھینچ کر یادِ خدا سے غافل کر دیتے ہیں۔ جب وہ اچانک باخبر ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ قافلہ چلا گیا اور وہ محروم ہے جب کہ سامنے ایک وسیع بیابان ہے۔ یہ حوادث جو ہمیشہ زندگی میں تھے اور ہمیشہ رہیں گے یہاں تک کہ علم و دانش کی عظیم ترقی بھی زلزلوں، طوفانوں، سیلابوں، بیماریوں اور اس قسم کے دردناک حوادث سے پناہ نہیں دلا سکتے اور نہیں دلا سکیں گے۔ یہ زمانہ کی بے مہری کے بارے میں ایک درس ہے جو انسان کو پکار پکار کر بتاتا ہے۔

۱۔ این دشت خواب گاہ شہیدان است فرصت شمار وقت تماشا را

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان اس دنیا میں خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ٹھکرا دے یا ان سے فائدہ نہ اٹھائے مطلب یہ ہے کہ ان کا قیدی نہ بن جائے اور ان کو مقصدِ حیات نہ بنائے اور محض اسی کو اپنی زندگی کا حصہ شمار نہ کرے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جو کچھ انسان گنوا دے اُسے (فات کو) (جو کچھ تم سے فوت ہو جائے) سے تعبیر کر رہا ہے لیکن ہاتھ آنے والی نعمتوں کو اپنی طرف

نسبت دیتا ہے۔ (بما اتاکم) کیونکہ فنا ہونا خود اشیا کی ذات میں پوشیدہ ہے اور وجود کا سرچشمہ وجود خداوندی ہے۔ جی ہاں مصیبتیں ہیں جو غرور کو شکستہ کرتی ہیں اسی لیے آیت کے آخر میں کہتا ہے: "خدا کسی متکبر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔" (واللہ لایحب کل مغتال فخور)۔ "مغتال" خیال کے مادہ سے لیا گیا ہے اور متکبر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ متکبر فضیلت کے خیال اور دوسروں کے مقابلہ میں برتری کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ "فخور" مبالغہ کا صیغہ ہے اس کا مادہ فخر ہے۔ فخر کے معنی ہیں وہ شخص جو دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فخر کرے۔ ان حالات کا صرف وہی شخص شکار ہوتا ہے جو ناز و نعمت میں کھو جائے۔ لیکن مصیبتیں اور آفتیں ان لوگوں کو مدہوشی سے محفوظ رکھتی ہیں جو بیداری کی حالت میں ہوں اور ہدایت پانے کے قابل ہوں۔

صاحب ایمان افراد، مذکورہ بالا اصل کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جس وقت خدا کی جانب سے کوئی نعمت پائیں تو وہ خود کو اس نعمت کا امانت دار سمجھتے ہیں۔ وہ نہ اس کے چلے جانے سے غمگین ہوتے ہیں نہ اس کی موجودگی سے مغرور ہوتے ہیں۔ درحقیقت وہ اپنے آپ کو بیت المال کے نگران اور جواب دہ فرد کی حیثیت دیتے ہیں جو ایک دن بہت زیادہ مال حاصل کرتے ہیں اور دوسرے دن ہزاروں کی تعداد میں واپس دے دیتے ہیں۔ انہیں نہ اس مال کے حاصل ہونے سے خوشی ہوتی ہے نہ اس کے چلے جانے کا رنج ہوتا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام اس آیت کے بارے میں کتنی عمدہ تعبیر پیش کرتے ہیں:

(الزهد کلہ بین کلمتین من القرآن قال اللہ تعالیٰ لکیلا تأسوا علی ما فأنتم ولا تفرحوا بما

أتاکم و من لم یأس علی الماضي و لم یفرح بالآتی فقد أخذ الزهد بطرفیہ)۔

سارا زہد قرآن کے دو جملوں کے درمیان میں ہے جہاں خداوند متعال فرماتا ہے: "یہ اس لیے

ہے کہ جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے اس کے لیے غمگین نہ ہونا اور جو کچھ خدا نے تمہیں دیا ہے

اس پر غور نہ کرنا۔ لہذا جو شخص گزشتہ پر تاسف نہ کرے اور جو کچھ اس کے قبضہ میں ہو اس پر

مغرور نہ ہو تو اس نے زہد کو دونوں طرف سے قبضہ میں کر رکھا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس حقیقت کی طرف توجہ کرنا کہ، ناکامیاں انسان کی زندگی کے ساتھ ابتدا سے رکھی گئی ہیں اور سنت حکیمانہ کے مطابق مقرر ہوئی ہیں اور دنیا ہمیشہ نشیب و فراز رکھتی ہے، انسان کو مصیبتوں کی برداشت کے ضمن میں بہادر اور حوادث کے مقابلہ میں صابر اور ثابت قدم بنادیتا ہے۔ وہ انسان کو سکون قلب عطا کرتا ہے اور بے تابوں اور رونے دھونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ یہ چیز صرف ان مصائب کے بارے میں ہے جن سے بچنا ممکن نہیں ہے ورنہ وہ مصیبتیں اور ناکامیاں جو خود انسان کے گناہوں اور اس کی سہل انگاری کا نتیجہ ہوتی ہیں وہ اس بحث سے خارج ہیں۔ زندگی کے نظام الاوقات میں ان سے مقابلہ کرنا ایک صحیح راہ عمل ہے اس بحث کو ہم ایک سرگزشت پر ختم کرتے ہیں جو بعض مفسرین نے بیان کی ہے۔ قتیبہ بن سعیدؒ کہتا ہے میں ایک عرب قبیلہ میں گیا جو صحرا میں تھادہ صحرا اونٹوں سے پُر تھا جو سب مرچکے تھے اور لا تعداد تھے۔ وہاں ایک بڑھیا عورت تھی میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اونٹ کس کے تھے۔ اس نے کہا اس بوڑھے شخص کے تھے جو ٹیلے پر تو دیکھ رہا ہے کہ اونٹوں میں اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ یہ سب اونٹ تیرے تھے۔

اُس نے کہا کہ میرے نام سے تھے۔ میں نے کہا کہ کیا وجہ ہوئی جو ان کا یہ حال ہوا۔ اس نے جواب میں (بغیر ان کے کہ ان کی موت کا سبب بیان کرے) کہا کہ جن نے دیے تھے اس نے واپس لے لیے۔ میں نے کہا تجھے کوئی پریشانی نہیں ہے اور تُو نے اس سلسلہ میں کیا کیا ہے۔ اس نے کہا میں نے یہ دو شعر کہے ہیں :

عمر لا والذی انا عبد من خلأفته
ما سرنی ان ابلی فی مبارکھا
والصرع فی الدهر نصب الرزء والمحن
وما جرى من قضاء الله لم یکن

قسم ہے اُس کی جس کی مخلوق میں سے میں بھی ایک بندہ ہوں کہ انسان دنیا میں محنتوں اور مصیبتوں کا ہدف ہے۔ میرے اُونٹ اگر اپنے بیٹھنے اور سونے کی جگہ پر ہوتے ہیں اور یہ قضائے الہی جو آئی ہے نہ آتی تو میں خوش نہ ہوتا۔ (میں تو صرف اس کی رضا پر راضی ہوں اور جو کچھ اس نے چاہا ہے اسی کو پسند کرتا ہوں)۔
آخری زیر بحث آیت اس چیز کی توضیح و تفسیر ہے جو گزشتہ آیت میں آئی ہے۔ وہ حقیقت میں مختار فخر کا تعارف کراتی ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے : " وہ ایسے افراد ہیں جو بُخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بُخل کی دعوت دیتے ہیں : (الذین یبخلون ویأمرون الناس بالبخل)۔

جی ہاں دنیا کی نعمتوں سے بہت زیادہ دل لگانے کا نتیجہ بخل و غور ہے اور تکبر و غور کا لازمہ بُخل کرنا اور دوسروں کو بُخل کی دعوت دینا ہے۔ بُخل کرنا تو اس بنا پر ہے کہ وہ ان اموال ہی کو اپنا سرمایہ حیات سمجھتے ہیں جو انہیں حاصل ہے اور کبھی نہیں چاہتے کہ وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ دوسروں کو بُخل کی دعوت دینا اس بنا پر ہے کہ اگر کوئی دوسرا سخاوت کرے گا تو یہ ذلیل ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ بُخل کو دوست رکھتے ہیں لہذا ایسی چیز کے مبلغ میں جسے دوست رکھتے ہیں۔ اور اس بنا پر کہ کہیں یہ تصور نہ پیدا ہو جائے کہ خدا کا انفاق کے سلسلہ پر اصرار کرنا اور بُخل کو ترک کرنے کی تاکید کرنا، حتیٰ کہ بندوں سے قرض لینے کی بات کرنا، جیسا کہ گزشتہ آیات میں آیا ہے، اس کی کسی احتیاج اور ضرورت کی وجہ سے ہے لہذا آخر میں فرماتا ہے : " جو شخص اس حکم سے منہ پھیرے تو وہ خدا کو نقصان نہیں پہنچاتا اس لیے کہ خدا بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔ (ومن یتول فان الله هو الغنی الحمید)۔ سب اس کے محتاج و نیازمند ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے وہ سب سے بے نیاز ہے کیونکہ تمام چیزوں کے خزانے اور منابع اس کے قبضہ میں ہیں اور چونکہ وہ تمام صفات کمال کا جامع ہے اس لیے ہر حمد و ستائش کے قابل ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیت میں لفظ بخل صرف انفاق مال میں بُخل کرنے سے تعلق رکھتا ہے پھر بھی اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے جو علم میں بُخل کرنے اور حقوق وغیرہ کی ادائیگی میں بُخل کرنے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

۱۔ تفسیر الباقی جلد ۱۱ ص ۵۳۔ انہی معانی کی مثال تفسیر روح البیان جلد ۹ ص ۳۶۷ پر نقل کی گئی ہے۔

۲۔ (الذین...)۔ بل ہے کل مختار فخر (تفسیر کشف در ذیل آیات زیر بحث) ضمناً توجہ کرنی چاہیے کہ بل اور مبدل منہ میں معرکہ اور مکہ ہونے کا تطابق شرط نہیں ہے۔

۲۵ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ
الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا
الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ
وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ
اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

ترجمہ

۲۵ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ان پر اپنی کتاب (آسمانی)
(اور حق اور عادلانہ قوانین کی شناسائی کی) میزان نازل کی تاکہ لوگ عدالت کے ساتھ
قیام کریں۔ اور ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں شدید قوت ہے اور لوگوں کے لیے
منافع ہیں تاکہ خدا جان لے کہ کون شخص اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے
بغیر اس کے کہ وہ اسے دیکھیں۔ خدا قوی اور ناقابل شکست ہے۔

تفسیر

بعثت انبیاء کا مقصد اعلیٰ

چونکہ پروردگار کی رحمت، مغفرت اور بہشت کی طرف سبقت کرنا (جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے) ربہم الہی
کی رہبری کا محتاج ہے لہذا زیر بحث آیت میں جو قرآن کی زیادہ منہوم رکھنے والی آیتوں میں سے ایک آیت ہے، اس حقیقت کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے اور انبیاء کے بھیجنے کا مقصد اور ان کے دستور العمل کو نہایت باریک بینی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے :

”ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے“ (لقد ارسلنا رسلنا بالبینات)۔ اور ہم نے ان کے ساتھ آسمانی کتاب اور میزان کو نازل کیا: (وانزلنا معہم الکتاب والمیزان)۔ تاکہ لوگ عدل و انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ (لیقوم الناس بالقسط)۔ ”بینات“ (واضح دلائل) اس کے معنی وسیع ہیں جن میں معجزات اور عقلی دلائل دونوں شامل ہیں اور جن کی صلاحیت خدا کے رسول اپنی ذات میں رکھتے تھے۔ ”کتاب“ سے مراد وہی کتب آسمانی ہیں اور چونکہ سب کی روح اور حقیقت ایک ہے لہذا لفظ کتاب مفرد آیا ہے، اگرچہ زمانے کے گزرنے اور انسانوں کے علمی ارتقا سے اس کا مفہوم زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ باقی رہی میزان تو وہ وزن کرنے اور ناپ تول کے آلے اور ذریعہ کے معنی میں ہے۔ اس کا مادی مصداق وہی ترازو ہے جس کے ذریعے چیزوں کے وزن کی ناپ تول ہوتی ہے۔ لیکن مسئلہ طور پر یہاں اس کا مصداق اس کی معنوی حقیقت ہے یعنی ایسی چیز جس سے تمام انسانوں کے اعمال کی ناپ تول کی جاسکتی ہے اور وہ کلی طور پر خدائی احکام و قوانین ہیں یا اس کا انہیں دستور ہے اور جو نیکیوں بُرائیوں، قدروں، قیمتوں اور ان کی ضد کو جانچنے کا معیار ہے۔ اس اعتبار سے انبیائین چیزیں اپنے ساتھ رکھتے تھے، واضح دلائل، کتب آسمانی اور حق و باطل کی ناپ تول کا معیار اور اس چیز میں کوئی مانع نہیں ہے کہ قرآن مجید ”مبینہ“ (مجزہ) بھی ہو۔ آسمانی کتاب بھی اور احکام و قوانین کو بیان کرنے والا بھی۔ یعنی ایک ہی چیز میں تینوں پہلو موجود ہوں۔ بہر حال ان عظیم افراد (انبیاء) کو پورے ساز و سامان کے ساتھ بھیجنے کا مقصد قسط و عدل کا اجرا ہے۔ دراصل یہ آیت رسولوں کے بھیجنے کے متعدد مقاصد میں سے ایک مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انبیاء و مرسلین متعدد مقاصد کے لیے کام کرتے تھے۔ ان کے آنے کا ایک مقصد لوگوں کی تعلیم و تربیت تھا جیسا کہ سورہ جمعہ کی آیت ۲ میں آیا ہے۔ (ہو الذی بعث فی الامیین رسولاً منہمیتلو علیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلہم الکتاب والحکمہ) وہی ہے جس نے مکہ والوں میں سے ایک فرد کو رسول بنا کر بھیجا تاکہ وہ ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ انسان کی غلامی کی زنجیریں توڑ دے جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں درج ہے :

(ویضع عنہم اصرہم والاعلال الی کانت علیہم) پیغمبر اسلام ان کے کانٹھوں پر سے بہت بھاری بوجھ ہٹاتا ہے اور وہ زنجیریں جو ان کے ہاتھ پاؤں اور گردن میں ہیں ان کو توڑ دیتا ہے۔ تیسرا مقصد اخلاقی اقدار کی تکمیل ہے جیسا کہ مشہور حدیث میں ہے :

(بعثت لاتمومکارم الاخلاق)

یہیں اخلاقی فضائل کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں!

آخری ایک مقصد اور ہے اور وہ ہے ”اقامہ قسط“ جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے اور اس طرح بعثت انبیاء کے مقاصد کا سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی تعلیم و تربیت کے عنوان کے ماتحت خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات بالکل آشکار ہے کہ زیر بحث آیت میں تنزیل کتب کے قرینے کے پیش نظر رسولوں سے مراد اولوالعزم پیغمبر ہیں یا وہ پیغمبر ہیں جو ان کے مانند ہیں۔

ایک دوسرا نکتہ ”لیقوم الناس بالقسط“ کے جملہ میں یہ ہے کہ لوگوں کی ترغیب کے بارے میں گفتگو کرتا ہے یہ نہیں فرماتا : ”مقصد یہ تھا کہ انبیاء انسانوں میں قیام عدل کی تحریک پیدا کریں“ بلکہ فرماتا ہے کہ : ”لوگ انصاف کو بروئے کار لائیں“۔

جی ہاں اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ خود عدالت و انصاف کو جاری کرنے والے بن جائیں اور اس راہ کو اپنے قدموں سے طے کریں۔ لیکن چونکہ ایک انسانی معاشرہ میں ہر حال جس قدر بھی اخلاق اعتقاد اور تقویٰ کی سطح بلند ہوگی اس میں پھر بھی ایسے افراد پیدا ہوں گے جو طغیان و سرکشی کے لیے آمادہ ہوں اور قیام عدل کی راہ میں روڑے اٹھائیں اس لیے اس آیت کو برقرار رکھنے اور دوام بخشنے کے لیے فرماتا ہے: ”ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں شدید قوت ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں“ (وانزلنا الحديد فيه بأس شديد ومنافع للناس)۔ جی ہاں انبیائے خدا کی تین قوتیں اہل عدالت کے لیے اپنے اصلی مقصد کو اس وقت حاصل کر سکتی ہیں جب وہ لوہے جیسی طاقت اور شدید قوت سے بہرہ ور ہوں۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہ تصور کیا ہے کہ انزلنا کے الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ لوہا زمین پر دوسرے کڑوں سے آیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ انزال کی تعبیر اس قسم کے مواقع پر ایسی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو بلند مقام کی جانب سے پست مقامات کو دی جائیں۔ چونکہ ہر چیز کے عزائن خدا کے پاس ہیں اور وہی ہے جس نے لوہے کو اس کی گونا گوں منفعتوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس لیے لفظ انزال آیا ہے۔ اسی بنا پر ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا:

(انزالہ ذالک خلقہ ایاہ)

لوہے کو نازل کرنے سے مراد اس کو پیدا کرنا ہے۔

جیسا کہ سورہ زمر کی آیت ۶ میں چوپاؤں کے بارے میں ہمیں ملتا ہے:

(وانزل لکم من الانعام ثمانية انواع)

”اور تمہارے چوپاؤں کے آٹھ جوڑے نازل کیے ہیں“

بعض مفسرین نے انزلنا کو ”نزل“ (بروزن شتر) کے مادہ سے ایسی چیز کے معنی میں لیا ہے جسے نعمان کی تواضع کے لیے تیار کرتے ہیں لیکن ظاہر وہی پہلے معنی ہیں۔ ”بأس“ لغت میں شہرت قدرت کے معنی میں ہے اور جنگ کو بھی باس کہا جاتا ہے اس لیے بعض مفسرین نے جنگی وسائل کے معنی میں لیا ہے۔ عام اس سے کہ وہ دفاعی ہوں یا جنگویانہ۔

ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: (یعنی السلاح وغير ذالک) مراد اسلحہ وغیرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان مصداق ہی کی قبیل میں سے ہے۔ ”منافع“ سے مراد ہر قسم کا نفع ہے جو انسان لوہے سے حاصل کرتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ لوہے کی اہمیت انسانی زندگی میں اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے انکشاف سے تاریخ بشر میں ایک نیا دور شروع ہو گیا جو لوہے کے دور کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ اس کے انکشاف سے انسانی زندگی کا چہرہ تمام روئے زمین پر دوسری سمتوں میں پھیل گیا ہے۔ یہ صورت حال مذکورہ آیت میں منافع کی وسعت کو بیان کرتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی مختلف آیات میں انہی معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک مقام پر فرماتا ہے:

”جس وقت ذوالقرنین نے اپنی مشہور دیوار کے بنانے کا پکا ارادہ کیا تو کہا: (اقونی زبر الحديد) ”میرے لیے لوہے

کے بڑے بڑے ٹکڑے لے آؤ۔ (کہف ۹۶) اور جس وقت خدا نے داؤد پر اپنا کرم کیا تو لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا تاکہ وہ اس سے زہر بن گیا

اور جنگ کے خطروں اور دشمنوں کے حملوں میں کمی واقع ہو سکے۔ (والتَّالِہُ الخدیدانِ اعملِ سابلغات) (سبا ۱۰، ۱۱)۔ اس کے بعد ارسال رسل، نزول کتب آسمانی اور لوہے جیسے وسائل کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”مقصود یہ ہے کہ خدا جان لے کہ کون لوگ اس کی اور اس کے رسولوں کی اس کے غیب میں مدد کرتے ہیں“ (ولیعلم اللہ من ینصرہ ویرسلہ بالغیب)۔ یہاں خدا کے علم سے مراد اس کے علم کی تحقیق عینی ہے یعنی یہ بات واضح ہو جائے کہ کون لوگ خدا کی اور اس کے مکتب فکر کی مدد کے لیے آمادہ ہوتے ہیں اور قیام بالقط کرتے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جو اس عظیم ذمہ داری سے روگردانی کرتے ہیں۔ حقیقت میں اس آیت کا مفہوم اس کے مشابہ ہے جو سورہ آل عمران کی آیت ۱۷۹ میں آیا ہے، (ما کان اللہ لیذر المؤمنین علی ما انتو علیہ حتی یمیزا الخبیث من الطیب) ”ممکن نہیں تھا کہ خدا مؤمنین کو اس شکل میں جس میں تم ہو چھوڑ دے مگر یہ کہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے“۔ تو اس طرح انسانوں کی آزمائش اور امتحان کا مسئلہ اور مختلف صفوں کو الگ کرنا اور ان کا تصفیہ کرنا اس دستور العمل کا ایک عظیم مقصد تھا۔ خدا کی مدد کرنے کی جو تعبیر ہے وہ سطرطہ اس کے دین و آئین اور اس کے نمائندوں کی مدد کرنے اور دین حق اور عدل و انصاف کو پھیلانے کے معنی میں ہے اس لیے کہ خدا کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ سب اس کے نیازمند ہیں۔ اس لیے ان معانی کو ثابت کرنے کے لیے آیت کو اس جملے پر ختم کرتا ہے کہ ”خدا قویٰ اور ناقابل شکست ہے“ (ان اللہ قویٰ عزیز)۔ اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایک ہی اشارے سے سارے جہان کو زیر و زبر کر لے اور اپنے تمام دشمنوں کو ختم کر دے اور اپنے اولیاء کو کامیابی عطا کرے لیکن وہ مقصد اصلی جسے انسان کی تربیت اور اس کا ارتقا کما جاسکتا ہے اس طرح حاصل نہیں ہوتا اس لیے وہ انسان کو دین حق کی مدد کے لیے دعوت عمل دیتا ہے۔

چند نکات

۱۔ منطق اور زبردستی کی قلمرو

مندرجہ بالا آیت گویا تعلیم و تربیت، انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف کی وسعت اور اس کے اجراء کے سلسلہ میں اسلام کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اسلام سب سے پہلے بینات، واضح دلائل، کتب آسمانی اور اس کی قدر و قیمت کے ناپ تول کے معیار اور احکام و قوانین کے بیان سے مدد لیتا ہے۔ اس طرح فکری و معاشرتی انقلاب کی بنیاد رکھتا ہے اور عقل و منطق سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں اثر انداز نہ ہوں اور معاملہ مشکل ہو جائے، یعنی طاقت در اور سرکش افراد پیدا ہو جائیں جو نہ بینات کے سامنے جھکتے ہیں اور نہ کتاب و میزان کے لیے کسی قدر و قیمت کے قائل ہیں، تو پھر نوبت حدید تک پہنچ جاتی ہے جس میں باس شدید ہے پھر ہتھیاروں سے سرکشوں کے دماغ کو کچلا جاتا ہے تاکہ وہ عدل و انصاف کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ اس مرحلہ پر ایماندار افراد سے مدد لی جاتی ہے اور یہ جو ایک حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(بعثت بالسيف بين يدي الساعة حتى يعبد الله وحده لا شريك له وجعل رزقي

تحت ظل رمحي)

”میں قیامت کی قیام گاہ پر تلوار کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں تاکہ لوگ خدائے یگانہ کی عبادت کریں

اور میری روزی میرے نیزے کے سائے میں ہے۔“

حاشیہ ۱ گلے صفحہ پر

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میں مامور ہوں کہ اس سرکش گروہ کے مقابلہ میں تلوار اٹھاؤں، اپنے کام کی بنیادی ضرورت کے طور پر نہیں بلکہ اس طرح جس طرح مذکورہ بالا آیت میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے :

(الخیر کله فی السیف وتحت السیف وفی ظل السیف)

”تمام خوبیاں تلوار میں، تلوار کے نیچے اور تلوار کے سائے میں ہیں۔“

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ :

(ان الله عز وجل فرض الجهاد وعظمه وجعله نصرة وناصره والله

ماصلحت دنیا ولادین الالبہ)

”خدا نے جہاد کو واجب کیا ہے، اس کو بڑا شمار کیا ہے اور اس کو مددگار قرار دیا ہے۔ خدا

کی قسم دین و دنیا میں کسی چیز کی بھی اصلاح جہاد کے بغیر ممکن نہیں۔“

اس بات کو ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا :

(لا یقیہ الناس الا السیف والسیوف مقالید الجنة والناس)

لوگوں کو تلوار کے علاوہ کوئی چیز سیدھا نہیں کر سکتی اور تلواریں دوزخ و جنت کی چابیاں ہیں۔“

اسی وجہ سے خدا کے مقرر کردہ رہبروں کے ایک ہاتھ میں کتاب آسمانی ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو پہلے دلیل و منطق سے حق و انصاف کی طرف بلاتے ہیں لیکن جب طاقتور اور شہ زور افراد منطق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تو پھر ان کے خلاف تلوار استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ زندگی کی عمدہ ضرورتیں لوہے سے تعلق رکھتی ہیں

بعض مفسرین مندرجہ بالا آیت کا ایک تجزیہ پیش کرتے ہیں جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔ انسان کی زندگی کے چار اصول ہیں :

۱۔ زراعت ، ۲۔ صنعت ، ۳۔ مسکن ، ۴۔ حکومت

وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان غذا ، لباس اور مکان کا محتاج ہے اور چونکہ وہ ایک اجتماعی و معاشرتی وجود ہے لہذا وہ تنہائی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بالفاظ دیگر اجتماع کے مسائل اجتماع ہی سے حل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ہر اجتماع میں مفادات کا تصادم ضرور ہوتا ہے اس لیے اس کے سد باب کے لیے ایک حکومت کی ضرورت ہوتی ہے جو اس معاشرہ میں انصاف قائم کر سکے۔ حیران کن بات یہ

گوشہ صفحہ کا حاشیہ ۱

۱۔ تفسیر مراغی جلد ۲۶ ص ۱۸۳

۲۔ حاشیہ ص ۱۱۰ (حدیث ۱۱۰۸)

۳۔ فروغ کافی جلد ۵ ص ۲ حدیث ۱

ہے کہ یہ چاروں ”حدید“ یعنی لوہے کی احتیاج رکھتے ہیں۔ اگر یہ وسیلہ نہ ہوتا تو انسان کی زندگی بہت مشکل ہو جاتی۔ پھر یہ کہ چونکہ انسان کو لوہے کی بہت زیادہ ضرورت ہے لہذا خدا نے اسے بہت زیادہ اور آسانی سے حاصل ہونے والا بنایا ہے۔ (یہ ٹھیک ہے کہ دوسری دھاتیں بھی انسانی زندگی میں دخل رکھتی ہیں لیکن زیادہ ضرورت لوہے کی ہے)۔ یہاں سے (فیہ باس شدید و منافع للناس) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

۲۶۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا
النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ فَمِنْهُمْ مُهْتَدٍ وَكَثِيرٌ
مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝

۲۷۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى
ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ ۖ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ
الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رُفُقَةً وَرَحْمَةً ۗ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا
مَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا
رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ
أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ ہم نے نوح و ابراہیم کو بھیجا اور ان کی ذریت میں نبوت و کتاب قرار دی بعض ان میں
سنے ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں سے بہت سے فاسق ہیں۔

۲۷۔ پھر ان کے بعد ہم نے دوسرے رسول بھیجے ان کے بعد ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو
مبعوث کیا اور انہیں انجیل عطا کی۔ ان لوگوں کے دل میں جنہوں نے ان کی پیروی کی ہم نے

رحمت و رافت پہنچائی اور جس رہبانیت کا انہوں نے اختراع کیا تھا وہ ہم نے ان پر عائد نہیں کی تھی۔ اگرچہ خوشنودی خدا ان کا مقصد تھا لیکن اس کے حق کی انہوں نے رعایت نہیں کی۔ اس لیے ہم نے ان میں سے جو ایمان لے آئے ان کو اُجڑ دیا اور ان میں کثرت فاسقوں کی ہے۔

تفسیر

ہم نے یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے

جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآن کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کے اصول کلی کے ایک سلسلہ کو بیان کرنے کے بعد گزشتہ قوموں کے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ وہ اس بیان کے سلسلہ میں شاہد کا کام دیں اس مقصد کے لیے یہاں بھی گزشتہ مسائل کے بعد ارسال رسل، بینات و کتاب و میزان کے ذکر اور مغفرت و سعادتِ جاودانی تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کے مقابلہ میں سبقت کرنے کے تذکرے کے ساتھ گزشتہ اقوام اور پیغمبروں کے نام لیتا ہے اور اسلام کے اصول کلی کو ان کی زندگی میں ثابت کرتا ہے۔ سب سے پہلے سلسلہ گفتگو نوح و ابراہیم سے شروع کرتا ہے جو شیخ الانبیاء ہیں اور نمایاں رسولانِ حق میں سے ہیں اور فرماتا ہے:

”ہم نے نوح و ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی فریت میں نبوت و کتاب آسمانی قرار دی“ (وَلَقَدْ ارسلنا نوحًا و ابراہیم وجعلنا فی ذریتہما الذبۃ و الکتاب)۔ لیکن ان لوگوں نے ان عظیم نعمتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایک گروہ ان کی تعلیم پر ایمان لایا اور ان میں سے اکثریت گنہگاروں اور بے ایمان لوگوں کی ہے۔ (فمنہم مہتد و کثیر منہم فاسقون)۔ جی ہاں وہ نبوت جس کے ساتھ شریعت اور آئین بھی تھے حضرت نوحؑ سے شروع ہوئی اور ان کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے جو دوسرے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اس شریعت کو دوام بخشا اور یہی ان کی فریت میں برقرار رکھی گئی۔ لیکن ہمیشہ اس نورِ ہدایت سے اقلیت ہی نے فائدہ اٹھایا جب کہ اکثریت نے راہِ خطا طے کی۔ اس کے بعد اجمالاً طور پر دوسرے پیغمبروں کے سلسلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے آخری نبی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے فرماتا ہے: (ثم قفینا علی آثارہم برسلا)۔ جو یکے بعد دیگرے آئے اور انہوں نے لوگوں کے راستے میں ہدایت کے چراغ روشن کیے یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ ”ہم اس کے بعد عیسیٰ ابن مریمؑ کو لے آئے۔“ (وقفینا بعیسی ابن مریم)۔ ”قفینا“ ”قفا“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی پشت کے ہیں۔ قافیہ کو اسی لیے قافیہ کہتے ہیں کہ شعر کے آخری حصے ایک دوسرے کے مشابہ اور عقب میں قرار پاتے ہیں مذکورہ بالا جملے سے مراد یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین نے یکساں طریقہ پر ہم آہنگ مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یکے بعد دیگرے عرصہ وجود میں قدم

رکھا ہے اور ایک دوسرے کی تعلیمات کی تائید و تکمیل کی ہے۔ یہ تعبیر درحقیقت ”توحید نبوت“ کی طرف ایک بہت ہی خوبصورت اشارہ ہے۔ اس کے بعد حضرت مسیح کی کتاب آسمانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

”ہم نے اسے انجیل عطا کی“ (واٹیناہ الانجیل) اس کے بعد ان کے پیروکاروں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے : ”ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس کی پیروی کی رحمت و رافت قرار دی“ (وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوه رافۃ ورحمة) بعض مفسرین نے رحمت و رافت دونوں کے ایک ہی معنی تجویز کیے ہیں لیکن مفسرین کا ایک گروہ ان دونوں کے درمیان فرق کا قائل ہے۔ رافت رفع مضرات کی محبت کے لیے ہے اور رحمت حصول منافع کی محبت کے معنوں میں ہے۔ اسی لیے رافت کا ذکر عام طور پر رحمت سے پہلے ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زنا کاروں کی سزا والی آیت میں فرماتا ہے : ولا تأخذکم بہما لافۃ فی دین اللہ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ تم خدا کی مقرر کی ہوئی حد کے جاری کرنے کے سلسلہ میں رافت و محبت کا شکار ہو جاؤ اور خدا کے حکم کو فراموش کر دو“ (نور-۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سچے پیروکاروں کی رحمت و رافت کا مسئلہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی طرف صرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہو بلکہ سورہ مائدہ کی آیت ۸۲ میں بھی ہمیں ملتا ہے۔ ولتجدن اقربہم مودۃ للذین امنوا الذین قالوا انا نصاری میں جو کہتے ہیں ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں تارک دنیا اور صاحب علم افراد ہیں اور وہ (حق کے مقابلے میں) سمجھتے نہیں کرتے۔ اگرچہ یہ آیت زیادہ تر حبشہ کے عیسائیوں اور نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور ان سے خلوص محبت روا رکھا تھا، لیکن کلی طور پر سچے عیسائیوں کی رافت و محبت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے مراد وہ غنچوار بھیڑیے اور آدم نمادلو نہیں ہیں جو ہمارے زمانے میں اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں اور ساری دنیا میں غارت گری کرتے ہیں اور لوگوں کو خون میں نہلاتے ہیں۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے : ”ان کے دلوں کو ہم نے رہبانیت کی طرف لگا دیا ہے جو خود ان کی اختراع ہے اور اسے ہم نے ان کے لیے مقرر نہیں کیا تھا۔ ان کا مقصد تھا کہ خوشنودی خدا حاصل کریں لیکن انہوں نے حق کی رعایت نہیں کی لہذا ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے، اجر عطا کیا لیکن ان میں سے بہت سے فاسق و گنہگار ہیں“ (ورہبانیۃ ابتدعوہا ما کتبناہا علیہم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوہا حق رعایتہا فاتینا الذین امنوا منهم اجرہم وکثیر منهم فاسقون)۔ تو اس طرح انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسیح کے آئین توحید کی رعایت نہیں کی بلکہ اس رہبانیت کے حق کی بھی رعایت نہیں کی جو خود ان کی اپنی اختراع تھی اور زہد و رہبانیت کے نام پر انہوں نے مخلوق خدا کے راستے میں جال بچھائے ہیں اور گرجاؤں کو مختلف قسم کے فسادات کا مرکز

۱۔ اس آیت کی ترکیب اور معنی میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے۔ بعض نے اسے رافت و رحمت پر عطف سمجھا ہے اور لفظ ”حب“ رہبانیت سے ا

پہلے مقدر سمجھا ہے کیونکہ رہبانیت کوئی ایسی چیز نہیں جو دل میں ہو بلکہ اس کی محبت کا تعلق دل سے ہے اور ایک جماعت نے اسے فعل معترض منصوب سمجھا ہے جس کا مفسر ابتدعوہا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے ”ابتدعوا رہبانیۃ ابتدعوہا“ (الا ابتغاء رضوان اللہ) میں بھی دو نظریے ہیں پہلایہ کہ اشتباہ سے قطع ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے : (ولکنہم ابتدعوہا ابتغاء رضوان اللہ) دوسرا یہ کہ اشتباہ سے قطع ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے رہبانیت کی ایک قسم ان پر مقرر کی تھی جو ان کا مقصد رضائے الہی کو حاصل کرنا تھا لیکن انہوں نے رہبانیت کی ایک دوسری ذرا ایجاد کی جو حق تعالیٰ کی رضا کے خلاف تھی میں نظر آئے کہ دونوں موارد میں پہلی تفسیر زیادہ مناسب

بنا دیا ہے اور انہوں نے دین مسیح میں بہت سی غرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق رہبانیت دین مسیح کا جز نہیں تھی بلکہ حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں نے اُن کے بعد اس کی اختراع کی تھی۔ ابتدا میں اس رہبانیت کا ایک معتدل انداز تھا لیکن بعد میں اس میں دین سے بالکل انحراف کی کیفیت پیدا ہو گئی اور اس کی وجہ سے بہت سے مفاسد رونما ہوئے۔ دوسری تفسیر کے مطابق دین مسیح میں ایک طرح کا زہر موجود تھا لیکن اس کے پیروکاروں نے جو بدعتیں رہبانیت کے نام پر جاری کیں وہ کچھ اور تھیں جس کا پروردگار عالم نے انہیں کبھی تکلف نہیں بنایا تھا۔

پہلی تفسیر مناسب ہی نہیں بلکہ بعض حیثیتوں کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے۔ بہر کیف مندرجہ بالا آیات سے ظاہری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رہبانیت دین مسیح میں موجود نہیں تھی ان کے پیروکاروں نے ان کے بعد اسے اپنی طرف سے دین مسیح میں شامل کیا ہے۔ ابتدا میں ایک قسم کے زہر کی طرف جھکاؤ اچھا لگتا تھا۔ مثال کے طور پر بہت سے مراسم اور سنن حسنہ جو ابھی تک لوگوں میں رائج ہیں اور کوئی شخص بھی ان کو شرعی احکام کے ماتحت نہیں سمجھتا لیکن یہ سنت اور یہ رسم بعد میں دین حق سے انحراف کی شکل اختیار کر گئی حتیٰ کہ آلودہ گناہ ہو گئی۔ (فما رعوہا حق رعایتہا) ”انہوں نے اس کے حق کی رعایت نہیں کی“ اس جملہ کی قرآنی تعبیر اس امر کی دلیل ہے کہ اگر اس کے حق کو ادا کیا جاتا تو وہ ایک اچھی سنت ہوتی اور سورہ باندہ کی آیت ۸۲ کی تعبیر جو رہبانیت اختیار کرنے والوں اور سچے عیسائی علما کو ابھی نظر سے دیکھتی ہے وہ اس مقصد کی شاہد ہے۔ (غور کیجئے) اور اگر رہبانیت رافت و رحمت پر عطف ہے تو پھر اس مدعا پر ایک اور شاہد پیدا ہو جائے گا کیونکہ وہ پھر رافت و رحمت کا ہم ردیف ہو گا جسے خدا نے ایک پسندیدہ عنوان کے ماتحت ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر کوئی سنت حسنہ لوگوں میں رائج ہو جائے (مثلاً زہد کا دستور) جس کے اصول کلی دین حق میں موجود ہوں اور لوگ اس سنت کو خصوصیت کے ساتھ دین سے منسوب بھی نہ کریں بلکہ اسے اصول کلی کا ایک مصداق سمجھیں اور اس کا حق ادا کریں تو اس میں کوئی بُرائی نہیں بدعتی دہاں سے شروع ہوتی ہے کہ جب افراط و تفریط کی صورت حال پیدا ہو جائے اور اس سنت حسنہ کو سنت سیئہ میں تبدیل کر دے، جیسا کہ موجودہ زمانے میں ہمارے ہاں مراسم سوگاری اور دین کے پیشواؤں کا یوم ولادت و وفات منانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اور اسی طرح شہیدوں اور مرحوم عزیزوں کی یاد منانا، ان کا یوم ولادت و شہادت منانا یا دسواں اور چالیسواں کرنا یہ اسلام کے اصول کلی کے مطابق ہے اور تعظیم شعائر کے ذیل میں آتا ہے اور دین کے رہبروں اور شہدائے عموم مسلمین کی یاد منانے کا جو معمول ہے اسی سے ماخوذ و مربوط ہے۔ شہدائے کربلا کی عواداری اور اس قسم کے آیات مہتاب کی بنیاد اسلام کے اصولوں کی روح کلی کے مطابق ہے۔ ان مراسم کی جزئیات و تفصیل کسی مخصوص شرعی حکم کے ماتحت نہیں ہے بلکہ یہ دستور اسلامی کی روح کلی کے مطابق انجام پاتی ہیں تو جب تک ان مراسم میں حدود و شریعت سے تجاوز نہیں اور گناہ و خرافات سے آلودہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے تو یقیناً یہ ”ابتغاء رضوان اللہ“ کی مصداق ہیں اور سنت حسنہ کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔ اگر یہ شکل نہ ہو تو پھر معاملہ مختلف ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ رہبانیت ”رہبہ“ کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی خوف خدا

۱۔ پہلی تفسیر اشتنا کے منتقل ہونے کی صورت میں ہے اور دوسری تفسیر اس کے متصل ہونے کے مطابق ہے۔ غور کیجئے یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگر رہبانیت کا عطف ”رافت و رحمت“ پر ہو جیسا کہ ہم نے متن میں منتخب کیا ہے تو پھر دلوں میں اس کے جل کرنے سے مراد ان کا اس سلسلہ کی طرف میلان قلبی ہے جب کہ ”ما کتبناھا“ سے مراد یہ ہے کہ مسلمان رہبانیت دین مسیح میں ایک حکم الہی کی شکل میں نہیں تھا اگرچہ اس سے لگاؤ اور اس کی محبت خدا نے ہی ان کے دل میں ڈالی تھی تو اس بنا پر ابتداء دعا کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا۔

کے ہیں۔ شروع میں یہ رہبانیت دنیا سے بے اعتنائی کا مصداق تھی لیکن بعد میں اس میں بہت سی تحریفیں دخل انداز ہو گئیں۔ اگر اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اس رہبانیت کا شدت سے مخالف ہے تو اس کی اس حد سے تجاوز کی ہوئی آخری صورت کی بنا پر ہتے چنانچہ نکات کی بحث میں ہم انشاء اللہ اس کی مزید تشریح کریں گے۔

چند نکات

۱۔ اسلام اور رہبانیت

جیسا کہ ہم نے کہا ہے رہبانیت ”رہبہ“ کے مادہ سے خوف کے معنوں میں ہے اور یہاں مراد خوف خدا ہے۔ ”مفردات“ میں ”راغب“ کے بقول اس سے ایسا خوف مراد ہے جس میں پرہیز و اضطراب کی آمیزش ہو اور ”ترہب“ یعنی ”تعبد“ اور عبادت کرنے کے معنی ہیں ہے لہذا رہبانیت کے معنی شدید تعبد ہیں۔ مذکورہ بالا آیت کی ہم جس طرح بھی تفسیر کریں اس سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ عیسائیوں میں ایک طرح کی رہبانیت موجود تھی اگرچہ دین مسیح میں اس طرح کا لازم حکم نہیں دیا گیا تھا لیکن مسیح کے پیروکاروں نے اس رہبانیت کے سلسلہ میں اس کی حدود سے تجاوز کیا اور وہ اسے دین سے برگشتگی کی طرف لے گئے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس کی شدت سے مذمت کی اور یہ مشہور حدیث (لا رہبانیۃ فی الاسلام) ”اسلام میں رہبانیت نہیں ہے“ بہت سے مناجات اسلامی میں نظر آتی ہے۔ عیسائیوں کی رہبانیت کے سلسلہ میں دوسری قبیح بدعتوں کے علاوہ ایک بدعت یہ تھی کہ تارک الدنیا مردوں اور عورتوں نے ازدواج کو اپنے اُدھر پر حرام کر لیا تھا اور دوسری چیز یہ تھی کہ اجتماعی گوشہ نشینی کو جائز سمجھ لیا گیا تھا۔ اس طرح معاشرتی ذمہ داریوں کو ٹھوکر مار کر عبادت کرنے کے ارادہ سے دُور دراز کے گرجاؤں کو منتخب کرنا اور معاشرتی ماحول سے دُور زندگی بسر کرنا دین کا جُز و سمجھا جانے لگا تھا۔ اس طرح گرجاؤں اور رہبانیت کے قائل لوگوں کی زندگی کے مرکزوں سے بہت سے مفاسد وابستہ ہو گئے تھے جن کے ایک گوشہ کے بارے میں انشاء اللہ اس بحث کی تکمیل کے وقت ہم ایک بحث پیش کریں گے۔

یہ ٹھیک ہے کہ تارک الدنیا عورتوں اور مردوں (راہبین و راہبات) نے بہت سی مثبت خدمات انجام دی ہیں، مثال کے طور پر ناقابل علاج بیماریوں کی تیمارداری کا فرض انجام دینا (جذام اور کوڑھ کے مریض)۔ اور دُور دراز علاقوں میں جا کر وحشی اقوام میں تبلیغ کا فرض انجام دینا اور اسی طرح کے دیگر مطالعاتی اور تحقیقی پروگراموں کو بروئے کار لانا لیکن یہ تمام امور ان پروگراموں سے متعلق مفاسد کے مقابلہ میں بہت کم ہیں اور مفاسد کئی گنا زیادہ ہیں۔

اصولی طور پر انسان ایک ایسا موجود ہے جو معاشرتی طور پر زندگی گزارنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اُس کی مادی و معنوی ترقی بھی اسی میں مضمر ہے کہ وہ تمدنی اور اجتماعی زندگی بسر کرے۔ اسی لیے کسی آسمانی مذہب نے انسان کے بارے میں اس اجتماعی زندگی کے خلاف کوئی راہ عمل تجویز نہیں کی بلکہ اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔ خدا نے انسان میں اس کی حفاظت نسل کے لیے عریضہ جنسی پیدا کیا ہے۔ لہذا ہر وہ چیز جو اس حفاظت نسل کی مطلق طور پر نفی کرے وہ یقیناً باطل ہے۔ اسلامی رُہبانیت مختلف چیز ہے۔ اس کے معنی ہیں سادہ طور پر زندگی بسر کرنا، عیش و عشرت کو ترک کرنا اور مال و مقام کے شُگل میں نہ پھنسنا۔

۱۔ مجمع البحرین میں مادہ ”رہب“ میں یہ حدیث آئی ہے اور خایہ ابن اثیر میں بھی بیان ہوئی ہے۔

اس زہد کا عیسائیت کی رہبانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہبانیت کے معنی میں معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے فرار اختیار کرنا جبکہ زہد کے معنی میں اجتماعی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا۔ مشہور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ عثمان بن مظعونؓ کا بیٹا مر گیا تھا تو وہ بہت غمگین ہوئے یہاں تک کہ انہوں نے گھر کو مسجد بنالیا اور عبادت میں مشغول ہو گئے اور باقی تمام کام چھوڑ دیے۔ یہ خبر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے عثمان کو بلایا اور فرمایا :

(یا عثمان ان الله تبارك وتعالى لم يكتب علينا الرهبانية اضرار هبانية

امتى الجهاد في سبيل الله)

”اے عثمان خدا نے میری امت کے لیے رہبانیت کو تجویز نہیں کیا ہے۔ میری امت کی رہبانیت تو یہ ہے کہ راہ خدا میں جہاد کیا جائے۔“ اس کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تو چاہتا ہے کہ مادی زندگی سے رُود گرداں ہو جائے تو اس عمل کو منفی شکل میں انجام نہ دے اور اجتماعی گوشہ نشینی کی راہ اختیار نہ کر بلکہ اسے ایک مثبت طریق عمل میں تلاش کر اور وہ مثبت طریق عمل راہ خدا میں جہاد ہے۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لیے ایک تفصیلی بحث نماز باجماعت کی فضیلت کے مسئلہ میں بیان کرتے ہیں جو گوشہ نشینی اور رُتبت کی نفی کی تائید میں ہے۔ ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ کے بھائی علیؑ ابن جعفرؑ نے آپ سے سوال کیا:

الرجل المسلم هل يصلح ان يسبح في الارض او يتربص في بيت لا يخرج منه؟

قال لا۔

کیا مرد مسلمان کے لیے مناسب ہے کہ وہ سیاحت کرے یا رہبانیت اختیار کرے

اور اپنے گھر میں بیٹھ رہے اور باہر نہ نکلے تو امام نے فرمایا نہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ سیاحت جس کی اس روایت میں ممانعت ہوئی ہے رہبانیت ہی کی قسم کی ایک چیز ہے یعنی وہ ایک طرح کی سیر کرنے والی رہبانیت ہے اور وہ یوں ہے کہ بعض افراد بغیر اس کے کہ ان کا کوئی گھر بار یا کاروبار ہو جہاں گردی کی شکل میں سامان سفر کے بغیر ہمیشہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف جاتے تھے اور لوگوں سے مدد حاصل کر کے اور گدائی کر کے زندگی بسر کرتے تھے اور اسے ایک قسم کا زہد اور ترک دنیا خیال کرتے تھے لیکن اسلام اس کی ہی نہیں بلکہ ”مقیم رہبانیت“ کی بھی نفی کرتا ہے جی ہاں تعلیمات اسلامی کی نظر میں اہم یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی اختیار کرتے ہوئے زہد اختیار کرے نہ یہ کہ معاشرتی زندگی کو خیر واداکر زاہد بنے۔

۲۔ رہبانیت کا تاریخی سرچشمہ

مسیحیت کی موجودہ تاریخیں بتاتی ہیں کہ وہ رہبانیت جو موجودہ شکل میں ہے یہ مسیحیت کے قرونِ اولیٰ میں موجود نہیں تھی وہ اس

کی ابتدا تیسری صدی میلادی کے بعد امپراطور روم ریسوس کے ظہور اور مسیح کے پیروکاروں سے اس کی شدید لڑائی کے بعد سے بتاتی ہیں۔ عیسائیوں نے اس امپراطور (خونخوار) سے شکست کھانے کے بعد پہاڑوں اور بیابانوں میں پناہ لی تھی۔

اسلامی روایات میں بھی یہی معانی دقیق شکل میں پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہیں کہ ایک دن آنحضرتؐ نے ابن مسعودؓ سے فرمایا :

”تم جانتے ہو کہ رہبانیت کب پیدا ہوئی؟ انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا پیغمبر بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جبارین کی ایک جماعت کا ظہور ہوا اور عومنین نے تین مرتبہ ان سے جنگ کی اور شکست کھائی لہذا بیابانوں میں جا چھپے اور عیسیٰ علیہ السلام (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ظہور کے انتظار میں پہاڑوں کے غاروں میں عبادت میں مشغول ہو گئے۔ ان میں سے بعض اپنے دین پر باقی رہے اور بعض نے کفر کی راہ اختیار کی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا :

جانتے ہو میری امت کی رہبانیت کیا ہے؟ عرض کیا خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا : الحجۃ والجہاد والصلوة والصوم والحج والعمرة -

”میری امت کی رہبانیت : ہجرت، جہاد، نماز، روزہ، حج اور عمرہ ہے۔“

مشہور عیسائی مؤرخ ”ویل دورانت“ اپنی مشہور تاریخ کی جلد ۱۳ میں ایک تفصیلی بحث راہبوں کے بارے میں درج کرتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ راہبوں کے ساتھ راہبوں کا میل جل چوتھی میلادی سے شروع ہوا اور رہبانیت کا معاملہ روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ دسویں صدی میلادی میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس اجتماعی طور پر ظہور میں آنے والے معاملے کے دوسرے معاملات کی طرح تاریخی اسباب کے علاوہ نفسیاتی اسباب بھی ہیں منجملہ ان تمام کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ اصولی طور پر متفرق افراد و اقوام کا شکستوں اور ناکامیوں کے مقابلہ میں جو رد عمل ہے وہ مختلف ہوتا ہے۔ بعض گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں اور باطن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اجتماعی مصروفیتوں سے بے تعلق کر لیتے ہیں جب کہ دوسرا گروہ شکست سے استقامت کا درس لیتا ہے اور اپنے اندر زیادہ صلابت اور ثابت قدمی پیدا کر لیتا ہے۔ پہلا گروہ رہبانیت یا اسی قسم کی کسی صورت حال کو اختیار کر لیتا ہے اور دوسرا گروہ زیادہ اجتماعی رد عمل پیش کرتا ہے۔

۳۔ رہبانیت سے پیدا ہونے والے اجتماعی اور اخلاقی مفاسد

قوانین خلقت سے انحراف ہمیشہ اپنے سچے منفی رد عمل رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جس وقت انسان اجتماعی

۱۔ دائرۃ المعارف قرن بیستم مادہ ”رہب“

۲۔ تفسیر ”مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۲۴۳ (تھوڑے سے خلاصہ کے ساتھ) تفسیر و المنثور میں اس کے مقابل ایک اور حدیث نقل ہوئی ہے (جلد ۶ ص ۱۷۷)۔

۳۔ تاریخ ”ویل دورانت“ جلد ۱۳ ص ۲۴۳

زندگی سے جو اس کی فطرت میں رچی بسی ہے، دُور ہو جائے تو شدید ردِ عمل کا شکار ہو جاتا ہے اس لیے رہبانیت جو انسان کے اصولِ فطرت اور طبیعت و مزاج کے برخلاف ہے زیادہ مفاسد کا باعث بنتی ہے۔

۱۔ رہبانیت انسان کے مدنی الطبع ہونے کی رُوح کے خلاف جنگ کرتی ہے اور انسانی معاشروں کو انحطاط اور پس ماندگی کی طرف لے جاتی ہے۔

۲۔ رہبانیت نہ صرف یہ کہ کمالِ نفس، تمذیبِ رُوح اور تمذیبِ اخلاق کا سبب نہیں ہے بلکہ اخلاقی تنزل، سستی و کلامی، بدبینی، غرور و تکبر و عجب اور نامتقول احساس برتری کا باعث بنتی ہے۔ فرض کیجئے کہ انسان حالتِ گوشہ نشینی میں اخلاقی فضیلت تک پہنچ بھی جائے تو یہ کیفیت فضیلت شمار نہیں ہوگی۔ فضیلت تو یہ ہے کہ انسان اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے اندر رہ کر خود کو اخلاقی گراؤوں سے بچا سکے۔

۳۔ ترک ازدواج جو رہبانیت کے اصولوں میں سے ہے نہ صرف یہ کہ کسی کمال کو پیدا نہیں کرتا بلکہ کئی نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ دائرۃ المعارف قرنِ بیستم میں ہم پڑھتے ہیں کہ بعض راہب صنفِ نازک کی طرف توجہ کو اس قدر شیطانی عمل سمجھتے تھے کہ وہ اس بات پر تیار نہیں ہوتے تھے کہ کسی مادہ جاذب کو اپنے گھر لے جائیں اس خوف سے کہ کہیں رُوحِ شیطانی اس کی رُوحانیت پر ضرب نہ لگا دے اس کے باوجود تاریخ گراؤں کے بارے میں اپنے اندر بہت زیادہ قبا حثیں لیے ہوئے ہیں یہاں تک کہ بقول "ویل دورانٹ" "ایونسان کے تیسرے پوپ" نے ایک گرجے کی فاحشہ خانے کے عنوان سے تعریف کی ہے۔

ان میں سے بعض گرجے شکم پرستوں، دُنیا طلبوں اور اچھا وقت گزارنے والوں کے اجتماع کا مرکز بن چکے تھے۔ یہاں تک کہ بہترین شراب گرجوں ہی میں ملتی تھی۔ البتہ تاریخ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے شادی قطعاً نہیں کی لیکن یہ چیز ہرگز اس امر سے آپ کی نفی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ حضرت مسیحؑ کی مختصر سی عمر اور دُنیا کے مختلف علاقوں کی طرف ان کے مسلسل سفر نے ان کو اس امر کی ہمت نہ دی۔ رہبانیت کے بارے میں بحث کرنا ایک مستقل کتاب چاہتا ہے۔ اگر ہم اس کی تفصیلات کی طرف جائیں تو بحث تفسیری سے خارج ہو جائیں گے۔ اس بحث کو حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؑ نے آیہ ذیل کی تفسیر میں فرمایا:

قل هل ننبئکم بالاحسنین اعمالاً الذین ضلّ سبیحہم فی الحیوۃ الدنیا
وہم یحسبون انہم یحسنون صنعا۔

"کہہ دے کیا میں تمہیں خبر دوں کہ لوگوں میں سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں وہ وہ ہیں جن کی کوشش دُنیاوی زندگی میں گم ہو گئی لیکن اس کے باوجود وہ گمان کرتے ہیں کہ اچھا کام انجام دے رہے ہیں۔"

حضرت علی علیہ السلام نے اس کی تفسیر میں فرمایا: (ہم الہبان الذین حبسوا انفسہم فی السواری) اس کا ایک واضح مصداق

وہ راہب ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو پہاڑوں اور بیابانوں کی اونچی جگہوں میں قید کر رکھا ہے۔ اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اچھا کام انجام دے رہے ہیں۔^۱

۴۔ انجیل یا اناجیل

انجیل اصل میں ایک یونانی لفظ ہے اس کے معنی ہیں بشارت یا جدید تعلیم اور یہ اس کتاب کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ یہ لفظ بارہ مرتبہ قرآن مجید میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ مفرد کی شکل میں ہے لیکن قابل توجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو چیز انجیل کے نام سے مشہور ہے وہ بہت سی کتابوں کا مجموعہ ہے جنہیں اناجیل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے مشہور چار انجیلیں ہیں "لوقا" "مرقس" "متی" اور "یوحنا"۔

عیسائیوں کا نظریہ ہے کہ چار انجیلیں اصحاب مسیح یا ان اصحاب کے شاگردوں میں سے چار افراد کے ذریعہ تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی تالیف کی تاریخ حضرت مسیحؑ کے ۳۸ سال بعد سے لے کر تقریباً ایک صدی بعد تک پہنچتی ہے۔ اس بنا پر مسیح علیہ السلام کی اصل کتاب ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے مستقل طور پر پردہ خفا میں چلی گئی ہے۔ صرف اس کے بعض حصے جو ان چاروں افراد کے حلفے میں ہو گئے تھے ان کے اپنے افکار کی آمیزش کے ساتھ ان چاروں انجیلوں میں تحریر ہوئے ہیں۔ اس عنوان پر زیادہ تفصیلی بحث ہم سورہ آل عمران کی آیت ۱۸ میں پیش کر چکے ہیں۔

۲۸- يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرِسُوْلِهِ لِيُؤْتِكُمْ
كَفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلَ لَكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ
بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۲۹- لِّعَلَّآ يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ
فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنُ يَّشَآءُ ۚ
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

ترجمہ

۲۸- اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو خدا سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تاکہ وہ
اپنی رحمت کے دو حصے تمہیں بخش دے اور تمہارے لیے ایسا نور قرار دے جس کے
ساتھ (لوگوں کے درمیان اپنی راہ حیات میں) چلو پھرو اور تمہارے گناہوں کو بخش دے
اور خدا غفور و رحیم ہے۔

۲۹- تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ فضل خدا میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے اور فضل
(رحمت) سب کا سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور خدا
صاحب فضل عظیم ہے۔

شان نزول

بہت سے مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کے لیے ایک شان نزول نقل کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جعفر بن ابی طالب کو ستر افراد کے ساتھ نجاشی (حبشہ) کی طرف بھیجا۔ حضرت جعفر نجاشی کے پاس گئے اور اسے اسلام کی دعوت دی۔ وہ دعوت قبول کر کے ایمان لے آیا۔ حبشہ سے واپسی کے وقت اس ملک کے چالیس افراد نے جو ایمان لائے تھے حضرت جعفر سے کہا ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اس پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوں اور اپنا اسلام اس کے سامنے پیش کریں۔ پھر وہ حضرت جعفر کے ساتھ مدینہ آئے۔ جس وقت انہوں نے مسلمانوں کا فقر و فاقہ دیکھا تو رسول خدا سے عرض کیا کہ ہم اپنے دیار میں بہت زیادہ مال متاع رکھتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے ملک کی طرف پلٹ جائیں اور اپنا مال اپنے ساتھ لے آئیں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دے دی وہ گئے اور اپنا مال لے آئے اور اسے اپنے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان کی توصیف کی۔ الذین آتینا ہم الکتاب من قبلہ ہم بلہ یؤمنون۔۔۔۔۔ (قصص ۵۴)

اہل کتاب میں سے وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے تھے جب انہوں نے یہ جملہ جو مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں آیا ہے سنا۔ اولئک یؤتون اجرہم مرتین بما صبروا۔ ”وہ اپنا اجر اپنے صبر و استقامت کی بنا پر دو مرتبہ حاصل کریں گے“ تو وہ مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہا: اے مسلمانو! جو شخص تمہاری کتاب اور ہماری کتاب دونوں پر ایمان لائے گا اسے دوہرا اجر ملے گا اور جو ہماری کتاب پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے تمہاری طرح صرف ایک اجر ہے۔ اس بنا پر تمہارے اپنے اقرار کے مطابق تم ہر پر کوئی فضیلت نہیں رکھتے۔ یہ وہ منزل تھی کہ جس کے پیش نظر اوپر والی آیات نازل ہوئیں۔ یا ایہذا الذین آمنوا اتقوا اللہ اور اعلان کیا کہ مسلمانوں کو بھی دو گنا اجر ملے گا۔ علاوہ خدائی نور اور مغفرت کے اور پھر مزید کہا کہ ”اہل کتاب جان لیں کہ وہ خدا کے فضل و رحمت میں سے کوئی چیز اپنے ہاتھ میں لینے کی طاقت نہیں رکھتے۔“

چونکہ گزشتہ آیات میں گفتگو عیسائیوں اور اہل کتاب کے بارے میں تھی زیر بحث آیات اسی کی تکمیل ہیں جو گزشتہ آیات میں آیا ہے پہلے فرماتا ہے: (یا ایہذا الذین آمنوا اتقوا اللہ و آمنوا برسولہ)۔ ”اے ایمان لانے والو خدا کے بارے میں تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔“ اس آیت کا مخاطب کون ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں:

پہلا یہ کہ مخاطب مؤمنین ہیں البتہ ان سے کہا جائے گا کہ ظاہری ایمان کافی نہیں ہے بلکہ وہ ایمان درکار ہے جو رُوح کی گہرائی تک جس کے نتیجے میں ہونے والے اعمال تقویٰ سے متصف ہوں تاکہ وہ اجر جو آیت میں بیان ہوئے ہیں وہ حاصل کر سکیں۔

دوسرا یہ کہ مخاطب اہل کتاب ہیں سے مؤمنین ہیں یعنی اے وہ لوگو جو گزشتہ پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان لائے ہو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لے آؤ تاکہ انواع و اقسام کے اجر حاصل کر سکو۔ جو چیز دوسری تفسیر کی شاہد بن سکتی ہے وہ کئی گنا اجر ہے جس کا ذکر آیت کے ذیل میں آیا ہے۔ ایک اجر گزشتہ انبیاء پر ایمان لانے کا اور دوسرا اجر پیغمبر اسلام پر ایمان لانے کا۔ لیکن یہ تفسیر، علاوہ اس کے کہ، بعد والی آیت کے ساتھ، جیسا کہ ہم وضاحت کریں گے، سازگار نہیں ہے، آیت کی شان نزول اور یا ایہذا الذین آمنوا

کے اطلاق کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس بنا پر قبول کر لینا چاہیے کہ مخاطب سب مؤمنین ہیں جنہوں نے بظاہر پیغمبر کی طرف سے دی ہوئی دعوت اسلام کو قبول کر لیا ہے لیکن وہ ایمان راسخ جو ان کی رُوح کی گہرائیوں کو روشن کرے اور ان کے اعمال سے ظاہر ہو بھی ان میں پیدا نہیں ہوا ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں تین ایسی نعمتوں کی طرف جو مضبوط ایمان اور تقویٰ کے سائے میں حاصل ہوتی ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اگر ایسا کرو تو خدا تمہیں اپنی رحمت میں سے دو حصہ دے گا اور تمہیں روشنی بخشے گا۔ جس کے سہارے زندگی کی لہ تلاش کرو وہ تمہیں بخش دے گا اور خدا غفور رحیم ہے۔“ (یٰؤتکم کفلیں من رحمۃ ویجعل لکم نوراً تمشون بہ ویغفر لکم واللہ غفور رحیم)۔ ”کفل“ (بروزن طفل) اس حصہ کے معنی میں ہے جو انسان کی حاجت کو پورا کر دے اور ضامن کو اسی وجہ سے کفیل کہتے ہیں کہ وہ مہم مقابل کی کفالت کرتے ہوئے اس کا حصہ دیتا ہے۔

بہر حال ان دو حصوں سے مراد وہی ہے جو سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۱ میں آیا ہے: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً خَلَاوْنَا! دُنیا میں بھی ہم کو نیکی دے اور آخرت میں بھی نیکی عطا فرما۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ ان دونوں حصوں میں سے ایک حصہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے ہے اور دوسرا حصہ گزشتہ انبیاء پر ایمان لانے کی وجہ سے ہے کیونکہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ تمام گزشتہ انبیاء اور ان کی آسمانی کتابوں پر ایمان لائے اور سب کو محترم شمار کرے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد پلے در پلے اور دائمی اجر ہیں۔ مذکورہ بالا معانی اور یہ معانی دونوں بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان کے دوسرے اجر (ویجعل لکم نوراً تمشون بہ) سے، بعض مفسرین کے بقول، مراد وہی نور ایمان ہے جو قیامت میں ان کے آگے اور دائیں سمت چل رہا ہوگا اور اس نور کی بدولت مؤمنین ظلماتِ معشر کو چیر کر نکل جائیں گے اور سعادتِ ابدی یعنی بہشت کی طرف بڑھیں گے جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۱۲ میں آیا ہے: (یوم تری المؤمنین والمؤمنات یسئلی نورہم بین ید یدھم وبایمانھم) جب کہ بعض دوسرے مفسرین اسے نور قرآن کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو دنیا میں مومنین کے پاس آیا ہے۔ جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت ۱۵ میں ہم پڑھتے ہیں: (قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین) خدا کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا ہے اور کتاب مبین آئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آیت کا مفہوم مطلق اور وسیع ہے جو دنیا کے ساتھ اختصاص رکھتا ہے۔ اور نہ آخرت کے ساتھ۔ دوسرے معنی میں ایمان اور تقویٰ سبب بنتے ہیں کہ مومنین کے دل پر سے حجاب ہٹ جائیں اور وہ حقائق کا چہرہ ویسا ہی دیکھیں جیسا وہ ہے اور اس کے سائے میں انہیں وہ مخصوص نگاہ نصیب ہو جن سے بے ایمان افراد محروم ہیں۔ اور یہ جو روایات اہل بیت میں آیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں نور سے مراد وہ امام معصوم ہے جس کی لوگ اقتداء کرتے ہیں تو یہ حقیقت میں ایک واضح مصداق کا بیان

۱۔ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ کفل (بروزن کل) سے لیا گیا ہے اور وہ اس چیز کو کہتے ہیں جو چوپاؤں کی کفل (پیٹھ کا آخری حصہ) پر رکھتے ہیں تاکہ وہ شخص جو سواری پر سوار ہو وہ گر نہ پائے۔ اس لیے ہر وہ چیز جو نگہداری کا سبب ہو اُسے کفل کہا جاتا ہے اور اگر ضامن کو کنیل کہتے ہیں تو وہ بھی اسی بنا پر ہے (ابوالفتح رازی در ذیل آیات زیر بحث)۔ لیکن راغب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے دو معنی ہیں اور دوسرے معنی بے قدر و قیمت چیز ہے چوپاؤں کی کفل کے مشابہ (پیٹھ) کیونکہ جو شخص وہاں سوار ہو اُسے گرنے کا خوف نہیں ہوتا۔ (غوری کجی)۔

آخر میں مومنین کا تیسرا اجر وہی گناہوں کا بخشا ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے لیے کوئی نعمت خوشگوار ثابت نہیں ہو سکتی۔ پہلے اسے عذاب الہی سے محفوظ ہونا چاہیے اس کے بعد وہ ایمان اور تقویٰ کے نور سے اپنی راہ روشن کرے اور آخر میں وہ خدا کی کئی گنا رحمتوں سے فیض یاب ہو۔ بعد والی آیت جو اس سورۃ کی آخری آیت ہے اس میں اس دلیل کا بیان ہے جو گزشتہ آیات میں آئی ہے فرماتا ہے: یہ کئی گنا خدائی نعمتیں نورانیت اور مغفرت کے علاوہ اس وجہ سے ہیں تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ فضل خدا میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے اور یہ کہ فضل و رحمت سب اسی کے ہاتھ میں ہے اور جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور خدا عظیم فضل و رحمت کا مالک ہے: (لَعَلَّاهِلِ الْكِتَابِ لَا يَغْتَابُوا لِيَقْدَرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَانَ الْفَضْلُ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ)۔

یہ ان کا جواب ہے جو یہ کہتے تھے کہ (مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق) خداوند اہل کتاب کے اس گروہ کو جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا ہے دو اجر دے گا تو اس وجہ سے ہم جو ایمان نہیں لائے وہ مسلمانوں کی طرح ایک اجر تو رکھتے ہیں۔ قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ مسلمان عام طور پر دو اجر رکھتے ہیں کیونکہ وہ پیغمبر اسلام اور تمام گزشتہ پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اہل کتاب کا وہ گروہ جو ایمان نہیں لایا وہ کوئی حصہ نہیں رکھتا تھا کہ انہیں پتہ چل جائے کہ رحمت الہی ان کے اختیار میں نہیں ہے کہ جسے چاہے وہ دے سکے اور جسے چاہے نہ دیں۔ یہ آیت، ہو سکتا ہے کہ، یہود و نصاریٰ کی بلند پروازیوں اور بے بنیاد دعویٰ کا بھی جواب ہو جو بہشت اور رحمت الہی کو اپنے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور دوسروں کو اس سے محروم خیال کرتے تھے۔ (وقالوا لن يدخل الجنة الا من كان هوداً او نصارى تلك امانتهم قل هاتوا برهانكم ان كنتم صادقين) انہوں نے کہا کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں کہہ دے اگر سچ کہتے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔ (بقروہ - ۱۱۱)

ایک نکتہ

تقویٰ اور نگاہ دور رس کا رابطہ

قرآن مجید نے تقویٰ کے بہت سے آثار بیان کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ انسان کی فکر اور اس کے دل سے پردے

قرآن مجید نے تقویٰ کے بہت سے آثار بیان کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ انسان کی فکر اور اس کے دل سے پردے

لے کر لا (لَعَلَّاهِلِ الْكِتَابِ) میں زائد ہے یا اصلی متن کے درمیان اختلاف ہے۔ بہت سے لاکھ زائدہ اور تائید کے لیے سمجھتے ہیں (جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے) اور اگر لاکھ اصلی سمجھا جائے تو پھر آیت کے معانی گونا گوں بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک مراد یہ ہے کہ اہل کتاب جان لیں کہ اگر وہ بھی اسلام و ایمان کو قبول کر لیں تو اپنے لیے فضل خدا کو فراہم کر سکتے ہیں۔ (دوسرے نقطوں میں یہاں نفی و رد نفی اثبات کے معنوں میں ہے) یا یہ کہ ہم نے یہ سب مواہب مسلمانوں کو دیے ہیں تاکہ اہل کتاب یہ تصور نہ کریں کہ مسلمان فضل خدا میں سے کوئی حصہ نہیں رکھتے لیکن آیت کے قول کی طرف توجہ کرتے ہوئے: (ان الفضل بيد الله) اور اس شان نزول کو دیکھتے ہوئے جسے ہم نے اوپر نقل کیا ہے لا کا زائد ہونا زیادہ مناسب نظر آتا ہے بلکہ بعض کے نظریے کے مطابق قرآن تمام ساروں میں جہاں جملہ منفی پر مشتمل ہوا زائدہ ہوگا مثلاً: (ما منك الا تسجد اذا امرتک) (اعراف - ۱۳) (وما تشعرون كما انھا اذا جاءت لا يؤمنون) (انعام - ۱۰۹) وغیرہ۔

ہٹ جائیں۔ ایمان اور تقویٰ کا نگاہ دور رس سے جو رابطہ ہے۔ اس کے متعلق قرآن کی دوسری آیات میں اشارے ہیں۔ سورہ انفال کی آیت ۲۹ میں ہم پڑھتے ہیں: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَشَاءُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا**۔ اے ایمان لانے والو! اگر تقویٰ اختیار کرو اور گناہوں سے پرہیز کرو تو خدا تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کا ذریعہ قرار دے گا۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں آیا ہے: **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ**۔ ”خدا کا خوف اختیار کرو گے تو خدا تمہیں علم و دانش سے نوازے گا۔“ اور زیر بحث آیات میں بھی یہ معنی صراحت کے ساتھ آئے ہیں کہ اگر ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو خدا تمہارے لیے نور قرار دے گا جس کے سائے میں تم قدم بڑھا سکو گے۔ ان دونوں کا رابطہ، علاوہ عمومی پہلوؤں کے، جنہیں ہم نہیں سمجھ سکتے، تحلیل عقلی کے نتیجے میں سمجھ میں آ سکتا ہے کیونکہ معرفت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور سب سے بڑا پردہ جو انسان کے دل پر پڑا رہتا ہے اور اسے حقائق کو نہیں دیکھنے دیتا اس کی وہ سرکش خواہشات اور لاتعداد تمنائیں اور آرزوئیں ہیں اور دنیا کی چمک دمک میں اس کا الجھا ہوا ہونا ہے جو اسے صحیح فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے حقائق کا چہرہ نہیں دیکھنے دیتا۔ جس وقت ایمان اور تقویٰ کے زیر سایہ گرد و غبار بیٹھ جاتا ہے اور رُوح انسانی پر چھائے ہوئے تاریک بادل چھٹ جاتے ہیں تو پھر صفحہ دل پر آفتاب حقیقت چمکتا ہے اور حقائق تک اس کی دسترس ہو جاتی ہے اور اس کو ادراک کی لذت نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ وہ لذت ہے جو تعریف و توصیف سے ماوراء ہے۔ اس کے بعد انسان اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ جی ہاں یہ تقویٰ ہی ہے جو انسان کو آگاہی بخشتا ہے اور جس طرح علم اور آگاہی اسے تقویٰ سے ہم کنار کرتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے متقابل تاثیر رکھتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں مشہور حدیث میں ملتا ہے:

لَوْلَا أَنَّ الشَّيَاطِينَ يَحْوَطُونَ عَلَى قُلُوبِ بَنِي آدَمَ لَنَظَرُوا إِلَىٰ مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ
اگر شیاطین انسانی دلوں پر مسلط نہ ہو جاتے تو وہ ملکوت سموات کو دیکھ سکتے۔

اس بات کے بہتر ادراک کے لیے ہم حضرت علیؑ کے ارشاد گرامی سے استفادہ کرتے ہیں:

لَا دِينَ مَعَ هَوًى - لَا عَقْلَ مَعَ هَوًى مِنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ أَعْمَاهُ وَاصْمَهُ وَادْلَهُ وَاضْلَهُ -

جہاں ہوائے نفس ہو وہاں دین نہیں ہوتا۔ اسی طرح عقل اور ہوائے نفس ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔

جب انسان ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے تو وہ اسے اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے اور وہ ذلیل و گمراہ ہو جاتا ہے۔ پروردگار! ہمیں ہوائے نفس سے محفوظ رکھو اور ہمیں تقویٰ اور نگاہ دور رس عطا فرما۔

خداوند! تمام رحمتیں تیرے قبضہ قدرت میں ہیں ہمیں ان سے محروم نہ کر۔

بارالہ! ہمیں حق اور عدل و انصاف قائم کرنے کی توفیق عطا فرما اور بینات سے استفادہ کے زیر سایہ منہ زور افراد کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کا حوصلہ اور حریم کتاب و میزان کی پاسداری کی توفیق عطا فرما۔

سورہ ”صدید“ کا اختتام
۲۰ / رجب / ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ تاریخ ۲۶ شوال ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۳ جون ۱۹۸۷ء بروز منگل بوقت سوا ایک بجے دوپہر برمکان حقیر قم کئے جمشیدی محل سلطان محمد شریف اعوان

قرآن مجید کے اٹھائیسویں پارہ کا آغاز

۵۔ سُورَةُ مُجَادِلَةٍ

❖ یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوئی۔

❖ اس میں ۲۲ آیتیں ہیں۔

تاریخ شروع ۲۰ / رجب / ۱۴۰۶ھ

۱۱ / ۱ / ۱۳۶۵ھ ش

سُورۃ ”مجادلہ“ کے مضامین

- یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہو اس لیے اور مدنی سورتوں کی طبیعت و مزاج کے مطابق زیادہ ترقیاتی احکام، اجتماعی نظام زندگی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اس سُورہ کے تمام مباحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :
- ۱۔ پہلا حصہ ”ظہار“ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ یہ زمانہ جاہلیت میں ایک قسم کی طلاق اور دائمی جدائی شمار ہوتی تھی۔ اسلام نے اس میں اعتدال پیدا کیا اور اس کی صحیح راہ متعین کی۔
 - ۲۔ دوسرے حصہ میں آداب مجالست کے احکام کے بارے میں گفتگو ہے۔ سرگوشی سے منع کیا گیا ہے اور جو نئے لوگ مجلس میں داخل ہوں انہیں جگہ دینے کے بارے میں احکام ہیں۔
 - ۳۔ تیسرے اور آخری حصہ میں جو بحث ہے وہ گویا مُنہ سے بولتی ہوئی بھی ہے، تفصیلی بھی اور سرکوبی کرنے والی بھی۔ منافقین یعنی وہ لوگ جو بظاہر اسلام کا دم بھرتے ہیں لیکن دشمنان اسلام کے ساتھ پوشیدہ طور پر ربط و ضبط رکھتے ہیں، ان کے بارے میں گفتگو ہے۔ سچے مسلمانوں کو گروہ شیاطین و منافقین میں داخل ہونے سے ڈرایا گیا ہے اور انہیں ”حُب فی اللہ“ اور ”بغض فی اللہ“ کے پیش نظر حزب اللہ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔

سُورۃ ”مجادلہ“ کی تلاوت کی فضیلت

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں دو روایتیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہیں۔ پہلی روایت میں ہے کہ :

من قرأ سورة المجادلة كتب من حزب الله يوم القيامة

جو شخص سورہ مجادلہ کی تلاوت کرے (اور اس میں غور و فکر کرے اور اس پر کاربند ہو) تو بروز قیامت وہ حزب اللہ میں شمار ہوگا۔

دوسری حدیث میں ہم پڑھتے ہیں :

من قرأ سورة الحديد والمجادلة في صلوة فريضة وادمنها لم يعذب الله حتى يموت ابداً ولا يرى في نفسه ولا في اهله سوءاً ابداً ولا لاختصاصه في بدنه

جو شخص سورہ حدید و مجادلہ واجب نمازوں میں پڑھے اور اس کا ورد رکھے تو خدا اس کی پوری زندگی میں اس پر کوئی عذاب نازل نہیں کرے گا اور وہ اپنی ذات میں اور اپنے اہل خانہ میں کوئی بُرائی نہیں دیکھے گا نیز فقر و بد حالی میں گرفتار نہیں ہوگا۔

ان کو سورتوں کے مضامین کی جو مناسبت مذکورہ بالا اہم اور جہاں کے ساتھ ہے وہ واضح ہے اور یہ چیز خود بتاتی ہے کہ تلاوت کا مقصد زندگی میں عملی شکل دینا ہے، ایسی تلاوت نہیں جو غور و غوض اور عمل سے خالی ہو۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

١- قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي

إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۖ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۝

٢- الَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْكُمْ مِنْ نِسَائِهِمْ مَا هُنَّ أُمَّهَاتُهُمْ

إِنَّ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا إِلَىٰ وُلْدِنَهُمْ ۖ وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنْكَرًا

مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا ۖ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوفٌ غَفُورٌ ۝

٣- وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا

قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَا ۚ ذَٰلِكُمْ

تُعَظُّونَ بِهِ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

٤- فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِن قَبْلِ

أَنْ يَتَمَاسَا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فِاطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا

ذَٰلِكَ لَتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۖ

وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ

ترجمہ

- ۱۔ شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے
خدا نے اس عورت کا قول سنا جس نے اپنے شوہر کے بارے میں تجھ سے رجوع کیا تھا
اور خدا کی بارگاہ میں شکایت کی تھی۔ خدا تمہاری آپس کی گفتگو (اس عورت کا اصرار اس کی مشکل
کے حل کے سلسلہ میں) سن رہا تھا اور خدا سننے اور دیکھنے والا ہے۔
- ۲۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں کے بارے میں ظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں (انت علی
کظہراقی) (تو میرے لیے میری ماں کی پشت کی مانند ہے) تو وہ ہرگز ان کی مائیں
نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو صرف وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ وہ بڑی قبیح اور باطل بات
کرتے ہیں اور خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔
- ۳۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنی ہی کہی ہوئی بات سے پلٹ جاتے ہیں
تو ان کو ان کے ساتھ صحبت کرنے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا چاہیے۔ یہ وہ حکم ہے
جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔
- ۴۔ اور جو شخص غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ صحبت کرنے سے پہلے دو ماہ
پے در پے روزے رکھے اور جو اس کی بھی طاقت نہیں رکھتا وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔
یہ اس وجہ سے ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ یہ خدا کی حدود
ہیں جو ان کی مخالفت کریں گے ان پر دردناک عذاب ہوگا۔

شان نزول

اگر معتبرین نے اس سورہ کی پہلی آیات کے لیے کسی شان نزول نقل کی ہیں جن میں سے ہر ایک کا نفس مضمون اجمالی طور پر ایک ہی ہے اگرچہ جزئیات میں ایک دوسرے سے اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف اس چیز پر جس کے ہم تفسیری بحث میں ضرورت مند ہیں اثر انداز نہیں ہوگا۔

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ گروہ انصار کی ایک عورت جس کا نام "خولہ" تھا۔ (دوسری روایات میں اس عورت کے اور بھی نام بیان ہوئے ہیں) وہ قبیلہ "خزرج" سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے شوہر کا نام "اوس بن صامت" تھا۔ کسی بات پر خولہ کا شوہر اس سے ناراض ہو گیا وہ ایک تند خو اور شدید الجس آدمی تھا۔ اُس نے اپنی عورت سے علیحدگی کا مصمم ارادہ کر لیا اور کہا "انت علی کظھر اتقی" (تو میرے لیے میری مال کی پشت کی طرح ہے)۔ زمانہ جاہلیت میں یہ طلاق کی ایک قسم تھی لیکن یہ طلاق اس طرح کی تھی کہ نہ تو اس میں رجوع ممکن تھا نہ عورت مرد سے آزاد ہوتی تھی کہ اپنے لیے کوئی دوسرا شوہر منتخب کرے۔ یہ بدترین حالت تھی جس سے کوئی شوہر وار عورت بچا ہوتی تھی۔ وہ شخص جلد ہی پشیمان ہو گیا اور چونکہ زمانہ جاہلیت میں "ظہار" (مذکورہ بالا جملہ کہنا) ایک ایسی طلاق شمار ہوتا تھا جس میں طرفین ایک دوسرے سے قطعاً رجوع نہیں کر سکتے تھے، وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ میرا خیال ہے تو مجھ پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی۔ عورت نے کہا ایسا نہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا اور اس مشکل کا حل دریافت کر۔ مرد نے کہا مجھے شرم آتی ہے۔ عورت نے کہا میں جاتی ہوں۔ اس نے کہا: کوئی فرج نہیں ٹوچ لی جا۔ وہ عورت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے شوہر "اوس بن صامت" نے مجھ سے شادی کی تھی۔ اُس وقت میں صاحب دولت ثروت تھی اور خوبصورت تھی۔ میرا خاندان بھی اچھا تھا۔ وہ میرا مال اپنے مصروف میں لے آیا۔ اب جب کہ میں جوان نہیں رہی میرا خاندان بھی پرگندہ ہو گیا ہے تو اب اُس نے "ظہار" کیا ہے۔ لیکن وہ اپنے اس اقدام پر پشیمان ہے۔ تو کیا ایسی صورت ہے کہ ہم ایک دوسرے سے رجوع کر لیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :
"تو اُس پر حرام ہو گئی ہے۔"

عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس نے صیغہ طلاق جاری نہیں کیا۔ پھر وہ میری اولاد کا باپ بھی ہے۔ اور ان سب چیزوں کے علاوہ مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"تو اُس پر حرام ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں میرے پاس سر دست کوئی دوسرا حکم نہیں ہے۔"

وہ عورت مسلسل اصرار کرتی تھی اور گڑگڑا کر عرض حال کرتی تھی۔ آخر کار اس عورت نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا : (اشکو الی اللہ فافتحی وحابتی وشدۃ حالی اللہم خانزل علی لسان نبیک) پروردگار! میں اپنی بے چارگی اور احتیاج کی شدت تجھ سے عرض کرتی ہوں۔ خداوند! کوئی فرمان اپنے پیغمبر پر نازل فرما اور اس مشکل کو حل کر دے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے عرض کیا :

اللهم انك تعلم حالي فارحمني فان لي صبية صغار ان ضمتهم اليه ضاعوا وان ضمتهم الي جلعوا
خداوند! تو میری حالت کو جانتا ہے مجھ پر رحم کر میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جنہیں میں اگر اپنے شوہر کے حوالے کر دوں تو وہ ضائع ہو جائیں گے اور اگر اپنے پاس رکھوں تو بھوکے مر جائیں گے۔

اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی حالت طاری ہوئی اور اس سورہ کی ابتدائی آیات آپ پر نازل ہوئیں جو ظہار کی مشکل کو حل کرنے کا راستہ بتاتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنے شوہر کو بلا کر لا۔

جب وہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ آیات کی اس کے سامنے تلاوت کی اور فرمایا:

”کیا تو ایک غلام ظہار کے کفارے کے طور پر آزاد کر سکتا ہے؟“

اُس نے کہا: ”اگر ایسا کروں گا تو میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔“

فرمایا: ”دو مہینے تک مسلسل روزے رکھ سکتا ہے؟“

اُس نے کہا: ”میرے کھانے میں تین مرتبہ تاخیر ہو جائے تو میری آنکھ بیکار ہو جائے اور مجھے خوف ہے کہ میں نابینا ہو جاؤں۔“

فرمایا: ”تو کیا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے؟“

عرض کیا: نہیں مگر اس طرح کہ آپ میری مدد کریں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تیری مدد کروں گا اور پندرہ صاع (پندرہ من ایرانی جو

ساٹھ مسکینوں کی خوراک ہیں ہر شخص کے لیے ایک مُد یعنی ۱۶ من تقریباً چودہ پھٹا تک) غذا

اس کو دی۔ اس نے کفارہ ادا کیا۔ اس طرح وہ میاں بیوی اپنی سابقہ ازدواجی زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اس شانِ نزول کو بہت سے لوگوں نے تفسیر و تاریخ و حدیث کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرطبی،

ابوالفتوح رازی اور کنز العرفان کے نام نمایاں ہیں۔

تفسیر

ظہار زمانہ جاہلیت کا ایک قبیح عمل

جو کچھ شانِ نزول کے سلسلہ میں عرض کیا گیا اسے اور آیات زیر بحث کے نفسِ مضمون کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سورہ کی

ابتدائی آیات کی تفسیر واضح ہو گئی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

”خدا نے اس عورت کا قول سنا جس نے اپنے شوہر کے بارے میں تجھ سے رجوع کیا تھا اور بحث و تکرار کرتی تھی، اس کی التجا

کو قبول کیا۔ (قد سمع الله قول التي تجادل في زوجها)۔ ”جدل“ کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی رسی بیٹنے

کے ہیں۔ چونکہ طرفین اصرار آمیز گفتگو کے موقع پر یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے کو خاموش کر دیں لہذا اس پر مجادلہ کا اطلاق ہوا ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”وہ عورت، اس کے علاوہ کہ تجھ سے مجادلہ کرتی تھی اُس نے خدا کی بارگاہ میں شکایت بھی کی اور حلِ مشکل کی استدعا بھی کی۔ (وَأَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ)۔ یہ اس حالت میں تھا کہ جب خدا تمہاری گفتگو اور اس عورت کے اصرار کو سُن رہا تھا۔ (وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا)۔ ”تَحَاوُر“ حور (بروزن غور) کے مادہ سے گفتگو یا غور و غوض میں رجوع کرنے کے معنوں میں ہے اور محاورہ کا طرفین کی گفتگو پر اطلاق ہوتا ہے۔ ”اور خدا سُننے اور دیکھنے والا ہے۔ (إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ)۔ جی ہاں! خدا تمام سموعات و مبصرات سے، بغیر اس کے کہ بینائی و سماعت کے اعضا کا محتاج ہو، آگاہ ہے۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ہر چیز کو دیکھتا اور ہر بات کو سُنتا ہے۔ اس کے بعد ظہار کے حکم کی طرف رجوع ہے اور تمہید کلام کے طور پر اس بے ہودہ نظریہ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے کے لیے مختصر مگر قاطع جملے ارشاد فرماتا ہے: ”تم میں سے وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: (أَنْتَ عَلَيَّ كَظْهَرَاتِي)۔ ”تو میرے لیے میری ماں کی پشت کی طرح“ وہ ہرگز ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو صرف وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا ہے (الَّذِينَ يَظَاهَرُونَ مِنْكُمْ مِنْ نِسَائِهِمْ مَا هُنَّ أُمَّهَاتُهُمْ)۔ ان امہاتہم اِلَّا اللَّائِي وَلِدْنَهُمْ۔“ ماں اور بیٹا ہونا ایسا نہیں ہے جو صرف الفاظ سے درست ہو جائے وہ تو ایک ظاہر ہونے والی حقیقت واقعی ہے جو کسی صورت میں بھی الفاظ کے ساتھ کھیلنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس بنا پر اگر کوئی انسان سو مرتبہ بھی اپنی بیوی سے کہے کہ ”تو میری ماں کی طرح ہے تو وہ ماں کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی۔ یہ محض ایک فضول بات ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”وہ ایک بُری اور قبیح بات کہتے ہیں۔ اور ان کا قول باطل و بے بنیاد ہے۔“ (وَأَنْتُمْ لَيَقُولُونَ مَنْكُوا مِنَ الْقَوْلِ وَ زُورًا)۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس بات کا کہنے والا قصدِ اخبار نہیں رکھتا بلکہ اس کا مقصد ”انشاء“ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس جملے کو صیغہ ظلاق کا درجہ دے لیکن اس جملے کا نفس مضمون ٹھیک ”منہ بولے بیٹے“ جیسی خرافات کی طرح بے بنیاد ہے جو زمانہ جاہلیت کی ایک رسم تھی کہ کسی بچے کو اپنا بیٹا کہہ دیتے تھے اور پھر اس پر احکامِ پسر جاری کرتے تھے جس کی قرآن نے مذمت کی ہے اور اسے باطل و بے بنیاد بات قرار دیا ہے۔ ذالک قولکم بافواہکوا۔ یہ ایسی بات ہے جسے تم صرف اپنے منہ سے کہتے ہو اس میں کوئی حقیقت نہیں (وَأَنْتُمْ لَيَقُولُونَ مَنْكُوا مِنَ الْقَوْلِ وَ زُورًا)۔ اس آیت کے مطابق ظہار ایک منکر اور حرام عمل ہے لیکن چونکہ تکلیف شرعی گزشتہ اعمال سے تعلق نہیں رکھتی اور اس کا اطلاق نزول کے وقت سے ہوتا ہے لہذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔“ (وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوفٌ رَحِيمٌ) اس بنا پر اگر کوئی مسلمان ان آیات کے نزول سے پہلے اس عمل کا مرتکب ہوا ہے تو اسے پریشان نہیں ہونا چاہیے خدا اسے بخش دے گا۔ بعض فقہاء اور مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اب بھی ظہار ایک گناہ ہے، گناہانِ صغیرہ کے مانند بخشتا ہوا بخشنے جس کے بارے میں گناہانِ کبیرہ کے ترک کی صورت میں عفو کا وعدہ کیا لیکن اس مضموم پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور اُدھر والا جملہ اس امر پر گواہ نہیں بن سکتا۔ بہر حال کفارے کا مسئلہ اپنی پوری قوت کے ساتھ باقی ہے۔ حقیقت میں یہ تعبیر اس کے مشابہ ہے جو سورہ احزاب کی آیت ۵ میں آیا ہے جہاں ”منہ بولے بیٹے“ کے مسئلہ کی نفی کرنے کے بعد مزید فرماتا ہے: (وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمُوهُ وَلَٰكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا)۔

”زور“ اصل میں سینے کے اوپر والے حصہ کا ٹیٹھا اور جھکا ہوا ہونا ہے۔ یہ منحرف ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے اور چونکہ بھٹی بات اور باطل گفتگو حق سے بخلاف رکھی ہے لہذا اسے زور کہتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ لفظ بات کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

”کنز العمال“ جلد ۲ ص ۲۹۰۔ المیزان میں بھی انہی معانی کی طرف اشارہ ہے۔

اس غلطی کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے جو اس موضوع پر تم سے سرزد ہوئی ہے لیکن جو کچھ تم عمداً کہو تو خدا اس پر مواخذہ کرتا ہے اور خدا غفور و رحیم ہے۔ (گزشتہ بے راہ روی کے بارے میں)۔ ”عفو“ اور ”غفور“ کے درمیان کیا فرق ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”عفو“ بخشش خدا کی طرف اشارہ ہے اور ”غفور“ گناہ کی پردہ پوشی کی طرف۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی کے گناہ کو تو بخش دے لیکن اس کو چھپائے ہرگز نہیں۔ لیکن خدا بخشتا بھی ہے اور چھپاتا بھی ہے۔ بعض مفسرین نے غفران کے معنی یہ لیے ہیں کہ کسی شخص کو عذاب سے چھپایا جائے جس کا مفہوم عفو سے مختلف ہے اگرچہ نتیجہ ایک ہی ہے۔ چونکہ یہ قبیح اور تکلیف دہ گفتگو کو ایسی چیز نہیں مانتی کہ اسلامی نقطہ نظر سے اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے لہذا اس کا کفارہ نسبتاً سنگین قرار دیا گیا ہے تاکہ اس کی تکرار کا سبب اب کیا جائے۔ فرماتا ہے: ”وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں اور پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات سے پلٹتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ مباشرت سے پہلے ایک غلام آزاد کریں۔ (والذین یظاہرون من نسائھن یشہو یدودون لما قالوا فتحریر رقبة من قبل ان یتامسا)۔ ”پھر اپنے کھسے سے (شہو یدودون لما قالوا) پلٹتے ہیں کے جملے کے بارے میں کئی احتمال پیش کیے گئے ہیں۔ فاضل مقداد نے کنز العرفان میں اس کی چھ تفسیریں نقل کی ہیں۔ لیکن اس کا ظاہر (خصوصاً ”من قبل ان یتامسا“ پر توجہ کرتے ہوئے) یہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر نادم ہوتے ہیں اور گھریلو زندگی اور جنسی آمیزش کی طرف پلٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ روایات آئمہ اہل بیت میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہے۔

اس جملے کی اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں لیکن وہ آیت کے معانی کے ساتھ چنداں مناسبت نہیں رکھتیں۔ مثلاً یہ کہ ”عود“ سے مراد ”ظہار“ کی تکرار ہے۔ یا یہ کہ ”عود“ سے مراد ایسے مواقع پر زمانہ جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنا ہے یا یہ کہ ”عود“ اس عمل کے تدارک اور تلافی کے معنوں میں ہے اور اسی قسم کے دیگر احتمالات۔ ”رقبة“ اصل میں گردن کے معنوں میں ہے لیکن یہاں انسان کا کنایہ اس بنا پر ہے کہ گردن دیگر اعضائے بدن کے مقابلہ میں زیادہ حساس سمجھی جاتی ہے۔ کبھی لفظ اس بھی کہا جاتا ہے اور اس سے مراد انسان ہوتا ہے مثلاً پانچ افراد کی جگہ پانچ لاش کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”یہ ایک دستور ہے جس کا تمہیں حفظ کیا گیا ہے (ذالکم لتوعظون بہ)۔ یہ گمان نہ کرنا کہ ظہار کے سلسلہ میں اس قسم کا کفارہ غیر معتدل ہے۔ کیونکہ یہ پند و نصیحت، بیداری اور تمہارے نفوس کی تربیت کا سبب ہے تاکہ اس قسم کے حرام کاموں کے سلسلہ میں تم اپنے نفوس کو قابو میں رکھ سکو۔ اصولی طور پر تمام کفارے تربیتی پہلو رکھتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ کفارے جو مالی حیثیت رکھتے ہیں ان کی تاثیر تعزیرات کے مقابلہ میں، جو بدنی حیثیت رکھتی ہیں، کم ہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس بات کا اسکان تھا کہ بعض افراد مختلف بہانوں سے کفارے سے جان چھڑائیں گے اور ظہار کے بعد بغیر کفارہ ادا کیے اپنی بیوی سے جنسی آمیزش رکھیں گناہیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”خدا اس سے جو تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔“ (واللہ بصا تاملون خبیر)۔ ظہار سے بھی آگاہ ہے اور کفارہ نہ دینے سے بھی اور تمہاری نیتوں سے بھی۔ اور چونکہ ایک غلام کا آزاد کرنا تمام افراد کے لیے ممکن نہیں جیسا کہ ہم نے آیت کی شان نزول میں دیکھا ہے، ”اوس بن صامت“ جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہیں اس نے پیغمبر کی خدمت میں عرض کیا کہ میں یہ کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہوں اور اگر ایسا کروں تو تمام پونجی کو گنوا دوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان مالی اعتبار سے تو غلام

۱۔ مجمع البیان در ذیل آیات محل بحث۔

۲۔ کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۹۰ و مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۹۷ کی طرف رجوع کیا جائے۔

کے آزاد کرنے کی قدرت رکھتا ہو لیکن اسے کوئی غلام دستیاب نہ ہو جیسا کہ ہمارے زمانے میں ہے۔ اس لیے اسلام کے دین جادو والی ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ بعد کے مرحلہ میں غلاموں کے آزاد کرنے کا کوئی نعم البطل مذکور ہو اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”جو شخص غلام آزاد کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو جنسی آمیزش سے پہلے دو ماہ مسلسل روزے رکھے۔ (فمن لم يجد فصيام شهرين متتابعين من قبل ان يتماسا)۔ اس قبیح عمل کو روکنے کے لیے یہ قمار بھی ایک گمراہ اثر رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ روزہ روح کی صفائی اور تہذیب نفس کا باعث لہذا اس قسم کے اعمال کے اعادہ کا سد باب کر سکتا ہے۔ البتہ ظاہر آیت تو یہ ہے کہ روزے ساٹھ دن تک مسلسل رکھے جائیں۔ بہت سے فقہائے اہل سنت نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے لیکن اہل بیتؑ کی روایتوں میں آیا ہے کہ اگر دوسرے مہینے میں سے کچھ دن ٹھیک ایک دن بھی پہلے مہینے کے تسلسل کے ساتھ روزہ رکھے تو شہرین متتابعین یعنی مسلسل دو ماہ کا تقاضا پورا ہو جائے گا اور یہ تصریح ظہور آیت پر حاکم ہے۔

یہ چیز بتاتی ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں اور سورۃ نسا کی آیت ۹۲ میں (کفارہ قتل خطا) تتابع سے مراد فی الجملہ پچھتر روزے ہونا ہے۔ البتہ اس قسم کی تفسیر صرف امام معصوم سے سننے میں آئی ہے جو علوم پیغمبرؐ کا وارث ہے اور اس قسم کے روزے رکھنا مکلفین کے لیے آسانی کا باعث ہیں اس موضوع کے بارے میں مزید تفصیل کتاب الصوم اور ابواب ظہار و کفارہ قتل خطا میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے (فمن لم يجد) کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ وہ ضروریات زندگی سے زائد کوئی چیز نہ رکھتا ہو جس سے غلام خرید کر آزاد کر سکے۔ اور چونکہ بعض لوگ دوسرے کفارہ یعنی مسلسل دو ماہ روزے رکھنے پر بھی قادر نہیں ہیں لہذا ایک اور متبادل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”جب کوئی دو ماہ تک مسلسل روزے نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ سکینوں کو کھانا کھلائے۔ (فمن لم يستطع فاطعام ستين مكيئا)۔ اطعام کے معنی یہ ہیں کہ ایک مرتبہ اتنی غذا دے کہ کھانے والا سیر ہو جائے لیکن اسلامی روایات میں ایک مد طعام (ایرانی من کا چوتھا حصہ یا تقریباً ۵۰ گرام معین ہوا) جب کہ بعض فقہانے اسے دو مد (ڈیڑھ کلو) قرار دیا ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں ایک مرتبہ پھر اس قسم کے کفاروں کے اصل مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یہ اس لیے ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آؤ“ (ذالک لتؤمنوا باللہ ورسولہ)۔ جی ہاں! کفاروں کے ذریعہ گناہوں کی تلافی ایمان کے ستونوں اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرتی ہے اور انسان کو مقدرات الہی کا علم و عمل پابند کرتی ہے آیت کے آخر میں اس کے پیش نظر کہ تمام مسلمان اس مسئلہ کو ایک پختہ امر کے طور پر قبول کریں فرماتا ہے: ”یہ احکام خدا کی حدود ہیں

۱۔ ”وسائل الشیخ“ جلد ۴ ص ۲۷۱ سے رجوع فرمائیں (باب ۳ از ابواب بقیۃ الصوم الواجب)

۲۔ ہمارے فقہاء کے درمیان جیسا کہ ہم نے کہا ہے مشہور وہی ایک مد ہے اور اس کی دلیل بہت سی روایات ہیں جو شاید حدیث تراویح میں سے بعض قتل خطا کے کفارے کے بارے میں اور بعض قسم کے کفارے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور بعض ماہ مبارک رمضان کے کفارے کے بارے میں اس منہمک کے ساتھ کہ فقہائے اہل سنت نے کفاروں کی اقسام میں فرق نہیں رکھا لیکن مرحوم ”شیخ طوسی“ سے ”خلافت“، ”مبسوط“، ”نہایت“ اور ”تبیان“ میں منقول ہے کہ اس کی مقدار دو مد ہے اور اس سلسلہ میں ابو بصیر کی روایت سے استدلال کیلئے جو کفارہ ظہار کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے اور اس کی مقدار دو مد معین کرتی ہے لیکن یہ روایت یا تو کفارہ ظہار سے مخصوص ہوئی چاہیے یا اگر ہم قبول کر لیں کہ فقہاء کفاروں کے درمیان فرق کے قابل نہیں ہوئے جیسا کہ واقعی ایسا ہے تو پھر اسے استحباب پر عمل کرنا چاہیے۔

جو خدا کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور کافر ہو جائیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (و تلك حدود الله وللكافرين عذاب الیم)۔ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ لفظ کفر کے مختلف معانی ہیں جن میں سے ایک کفر عملی ہے یعنی معصیت و گناہ ہے اور زیر بحث آیت میں یہی معنی مراد ہیں جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۹۷ میں ان لوگوں کے بارے میں جو فریضہ حج بجالاتے ہیں فرماتا ہے: **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مِنْ اسْتِطَاعٍ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ**۔ لوگوں پر لازم ہے کہ جو استطاعت رکھتے ہیں وہ خدا کے لیے اس کے گھر کا ارادہ کریں اور جو شخص کفر کرے (اور حج کو پھوڑ دے) اس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اللہ عالمین سے بے نیاز ہے۔ ”حد“ اس چیز کے معنوں میں ہے جو دو چیزوں کے درمیان مانع ہے۔ اسی لیے مختلف ملکوں کی سرحدوں کو محدود کہا جاتا ہے۔ احکام الہی کو اس لیے حدود کہتے ہیں کہ ان کو عبور کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مزید تشریح پہلی جلد سورہ بقرہ آیت ۱۸۷ کے ذیل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

بعض احکام ظہار

۱۔ ظہار کی رسم جس طرف قرآن مجید کی دو آیتوں میں (زیر بحث آیت اور سورہ احزاب آیت ۴) اشارہ ہوا ہے، زمانہ جاہلیت کے قبیح کاموں میں سے تھی۔ جب کوئی مرد اپنی بیوی سے اکتا جاتا تو اس غرض سے کہ عورت کو تنگ کرے یہ کہہ دیتا کہ (انت علی کا کھڑا تھی) ”تو میرے لیے میری ماں کی طرح ہے۔“

اس کے بعد وہ یہ سمجھتا تھا کہ عورت اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی یہاں تک کہ وہ دوسرا شوہر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح وہ عضو معطل ہو کر رہ جاتی۔ اسلام نے اس اقدام کو، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، غلط قرار دیا اور اس کے بارے میں کفارہ کا حکم صادر کیا۔ لہذا اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے ظہار کرے تو اس کی بیوی حاکم شرع سے رجوع کر کے اس مرد سے یا تو طلاق حاصل کر سکتی ہے یا اسے ازدواجی زندگی کی طرف پلٹ جانے کا پابند بنا سکتی ہے۔ لیکن ازدواجی زندگی کو بحال کرنے سے پہلے وہ کفارہ جو مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے اس مرد کو ادا کرنا ہوگا یعنی استطاعت کی صورت میں غلام آزاد کرے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو مسلسل دو مہینے تک روزے رکھے اور اگر اس کی بھی مقدرت نہ ہو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے اس طرح یہ کفارہ اصلاح و تربیت کا کام کرتا ہے۔

۲۔ ظہار گناہانِ کبیرہ میں سے ہے اور مندرجہ بالا آیات کا لب و لہجہ اس پر گواہ ہے۔ یہ جو بعض فقہاء نے اسے صغائر میں شمار کیا ہے اور وہ اسے قابل معافی سمجھتے ہیں یہ درست نہیں ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص کسی قسم کا بھی کفارہ ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو کیا صرف توبہ و استغفار پر اکتفا کر سکتا ہے اور ازدواجی زندگی کی طرف پلٹ سکتا ہے؟ فقہاء کے درمیان اس میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت اس حدیث پر انحصار کرتے ہوئے جو امام جعفر

ؓ ”ظہر“ مندرجہ بالا عبارت میں جیسا کہ بعض مفسرین نے کھا ہے پشت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ کنایہ ہے اس رابطہ کا جو زوجیت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے۔ (تجھ سے زوجیت والا رابطہ اپنی ماں سے رابطہ کی طرح ہے)۔ ”لسان العرب“ مادہ ظہر اور تفسیر غازی کی طرف رجوع فرمائیں۔

صادق سے منقول ہے ۱۰

اس نظریہ کی حامل ہے کہ دوسرے کفاروں کے سلسلہ میں تو عدم استطاعت کی صورت میں توبہ کفایت کر سکتی ہے لیکن کفارۃ ظہار میں کفایت نہیں کرتی لہذا طلاق کے ذریعہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا جائے۔ ایک دوسری جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں توبہ و استغفار کفارہ کا بدل ثابت ہوں گے اور وہ اس کی دلیل ایک اور روایت سے پیش کرتے ہیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے ۱۱:

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ بصورت استطاعت اٹھارہ دن کے روزے کافی ہیں ۱۲:

مذکورہ روایتوں کو ایک جگہ جمع کرنا بھی ممکن ہے، اس طرح سے کہ ہر طرح کے عدم استطاعت کی صورت میں ازدواجی زندگی کی طرف پلٹا جاسکتا ہے۔ اگرچہ مستحب ہے کہ ایسی صورت میں طلاق دے کر بیوی سے الگ ہو جائے (کیونکہ اس قسم کی جمع دونوں احادیث کے معتبر ہونے کی صورت میں ایک واضح جمع ہے اور فقہ میں اس کی بہت سی نظائر ہیں)۔

۴۔ بہت سے فقہاء کا نظریہ ہے کہ اگر کئی مرتبہ ظہار کرے (یعنی مذکورہ جملے کی شدت قصد کے ساتھ تکرار کرے تو پھر اسے اتنے ہی کفارے دینے ہوں گے خواہ ایک ہی دفعہ تکرار صورت پذیر ہو مگر یہ کہ تکرار سے اس کا مقصد صرف تاکید ہو نہ کہ نیا ظہار۔

۵۔ جب کفارہ ادا کرنے سے پہلے اپنی بیوی سے جنسی اختلاط کرے تو دو کفارے دینے ہوں گے۔ ایک کفارہ ظہار کا اور دوسرا کفارہ ظہار کا کفارہ ادا کرنے سے پہلے جنسی اختلاط کا۔ اس حکم پر فقہاء کے درمیان اتفاق رائے ہے۔ البتہ مذکورہ آیات اس کے بارے میں خاموش ہیں لیکن روایات اہلبیت میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے ۱۳:

۶۔ ظہار کے بارے میں اسلام کا واضح اور قطعی طرز عمل اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ اسلام اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ خود غرض مرد ظالم نہ رسم و رواج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت کے حقوق کو پامال کریں، بلکہ وہ ہر اس غلط اور بے ہودہ رسم و رواج کو جو لوگوں میں رائج ہو، خواہ وہ کتنا ہی مضبوط و مستحکم کیوں نہ ہو، ختم کرتا ہے۔

۷۔ ایک غلام کو آزاد کرنا جو ظہار کا پہلا کفارہ ہے علاوہ اس کے کہ وہ خود غرض مردوں کے جھگڑ میں پھنسی ہوئی عورت کی غلامی اور کنیزی کے ساتھ ایک پرکشش مناسبت رکھتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ تمام ممکنہ طریقوں سے غلامی کی رسم کو ختم کرے لہذا نہ صرف کفارۃ ظہار میں بلکہ قتل خطا کے کفارے میں اسی طرح ماہ رمضان کے روزے کے کفارے میں، (جس نے عمداً روزہ نہ رکھا ہو)، اسی طرح قسم کی مخالفت کے کفارے میں یا نذر توڑنے کے بارے میں یہی امر وارد ہوا ہے جو غلاموں کی اصلی آزادی کو عملی حیثیت سے حقیقی بنانے کا خود ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

۱۔ "وسائل الشیعہ" جلد ۱۵ ص ۵۵۴ (حدیث اباب ۶)

۲۔ "وسائل الشیعہ" ص ۵۵۵ (حدیث ۴)

۳۔ "کنز العرفان" جلد ۲ ص ۲۹۲

۴۔ "وسائل الشیعہ" جلد ۱۵ ص ۵۲۶ (حدیث ۱، ۳، ۴، ۵، ۶)

۵۔ إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُتِبَتْ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ أَنْزَلْنَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَلِلْكَافِرِينَ
عَذَابٌ مُهِينٌ ۝

۶۔ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا أُخْصَصَهُ
اللَّهُ وَلِنُؤْمِنَهُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

۷۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط مَا
يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُمْ أَوْ أَرْبَعَةٌ وَلَا خَمْسَةٌ إِلَّا
هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا آدْنَى مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرُ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ
إِنْ مَا كَالُوا ط ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَمَةِ ط
إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۵۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہوں گے جس
طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار ہوئے۔ ہم نے واضح آیات نازل کی ہیں اور کافروں
کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

۶۔ جس دن خدا ان سب کو اٹھائے گا اور ان اعمال سے جو انہوں نے انجام دیے ہیں انہیں باخبر کرے گا، وہ اعمال جن کا خدا نے احصا کیا ہے اور وہ انہیں بھول گئے ہیں اور خدا ہر چیز کا شاہد و ناظر ہے۔

۷۔ کیا تو نہیں جانتا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے خدا سے جانتا ہے۔ کسی جگہ تین اشخاص آپس میں سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور کہیں پانچ افراد سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا ہوتا ہے۔ اور اس سے کم تعداد میں اور نہ اس سے زیادہ تعداد میں مگر یہ کہ وہ ان کے ہمراہ ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا کیونکہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

تفسیر

وہ جو خدا سے دشمنی کرتے ہیں

کیونکہ گزشتہ آیات کا آخری جملہ سب کے لیے خطہ کا اشارہ ہے کہ حدودِ الہی کی رعایت کی جائے اور ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔ زیر بحث آیت میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو نہ صرف یہ کہ ان حدود سے تجاوز کرتے ہیں بلکہ خدا اور اس کے رسولؐ سے لڑنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اس طرح خدا، اس دنیا میں اور دوسرے جہان میں، ان لوگوں کے انجام کو ظاہر کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: ”جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہوں گے جیسا کہ ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار ہوئے“ (اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادِدُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کَمَا کَبَتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ) ”یحادون“ ”محادہ“ کے مادہ سے ہے اور مسلح ہو کر لڑنے کے معنی میں ہے اور حدید یعنی لوہے سے استفادہ ہے اور غیر مسلح ہو کر لڑنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ محادہ کے معنی اصل میں ممانعت کے ہیں۔ اس کا مادہ حد ہے جو دو چیزوں کے درمیان مانع کی حیثیت رکھتی ہے اسی لیے دربان کو حداد کہتے ہیں۔ دونوں معنی نتیجے کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ اگرچہ دونوں دو مختلف اصل سے لیے گئے ہیں۔ ”کبتوا“ کا مادہ ”کبت“ (بروزن) ”ثبت“ ہے۔ اس کے معنی مانع کے ہیں۔ ایسا مانع جو ذلیل بھی کرتا ہو۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا ان لوگوں کی سزا ذلت و خواری قرار دیتا ہے جو اس سے اور اس کے پیغمبر سے لڑنے کے لیے آمادہ ہیں۔ وہ ان کو اپنے لطف

بے پایاں سے محروم کر دیتا ہے۔

یہ تعبیر اس تعبیر کی نظیر ہے جو سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۴ میں آئی ہے۔ جس میں ان افراد کے بارے میں، جو لوگوں کو مساجد میں نہیں جانے دیتے، عبادت سے روکتے ہیں اور دین حق سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، فرماتا ہے: **لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ**۔ ”ان کے لیے دنیا میں ذلت و رسوائی ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے“۔ سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ میں بھی اسی طرح ان لوگوں کے بارے میں جو خدا اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جائیں اور زمین میں فساد کریں، فرماتا ہے: **ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ**۔ ”یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی کا باعث ہے اور آخرت میں ان کے لیے عذاب عظیم ہے“۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: ”ہم نے واضح آیات نازل کیں“۔ (وقد انزلنا آیات بینات)۔ اس سلسلہ میں کافی اتمام حجت ہوا ہے اور مخالفت کے لیے کوئی عُذر یا بہانہ باقی نہیں رہا۔ اس کے باوجود اگر مخالفت کریں تو پھر ان کو سزا ملنی چاہیے اور نہ صرف اس دنیا میں انہیں سزا دی جائے گی بلکہ ”کفار کے لیے قیامت میں ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے“ (وللکافرین عذاب مہین) تو اس طرح گزشتہ جملہ میں ان کے دنیاوی عذاب کی طرف اشارہ ہوا اور اس جملہ میں ان کے اخروی عذاب کی طرف اشارہ ہوا اور ان معانی پر شاہد (کما بکت الذین من قبلہم) (جیسا کہ ان سے پہلے کے لوگ سوا ہوئے) کا جملہ ہے۔ بعد والی آیت بھی انہی معانی کی گواہی دیتی ہے۔ بہر حال یہ ضدی تہدید ان لوگوں کے بارے میں ہے جو پیغمبر اور قرآن کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جنگ بدر و خندق وغیرہ میں ذلت و خواری اور شکست سے دوچار ہوئے تھے۔ آخر کار فتح مکہ نے ان کے اقتدار کی بساط اُلٹ دی اور اسلام ہر جگہ کامیاب ہوا۔ بعد والی آیت میں ان کے اخروی عذاب کے وقوع کے زمانے کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے: ”یہ ایسے دن ہو گا جب خدا ان کو قبروں سے اٹھائے گا اور جو اعمال انہوں نے انجام دیے ہیں انہیں ان سے باخبر کرے گا۔ (یوم یبشھو اللہ جمیعاً فینبھوہم بما عملوا)۔

جی ہاں خدا نے ان کے تمام اعمال کو شمار کیا ہے اگرچہ وہ خود اسے فراموش کر چکے ہیں۔ (احصاہ اللہ ونسوہ)۔ اسی وجہ سے جب ان کی نظر اپنے نامہ اعمال پر پڑے گی تو ان کی فریاد بلند ہوگی۔ **ما لہذا الکتاب لا یفاد صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا**۔ ”اس کتاب کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں جو اس میں منضبط نہ ہو“۔ (کمف ۴۶) اور یہ خود ایک دردناک عذاب ہے کہ خدا ان کے بھولے ہوئے گناہ ان کو یاد دلانے کا اور وہ میدانِ حشر میں تمام مخلوق کے سامنے رسوا ہوں گے۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”خدا ہر چیز کا شاہد اور ہر جگہ ناظر ہے“ (واللہ علی کل شیء شہید)۔ یہ درحقیقت بمنزلہ دلیل ہے اس چیز کے لیے جو گزشتہ جملے میں بیان ہوا ہے۔ جی ہاں خدا کا حضور ہر جگہ اور ہر زمانے میں، خود ہمارے اندر اور باہر، اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ نہ صرف اعمال بلکہ وہ ہماری نیتوں اور عقائد کا بھی احصا کرتا ہے اور وہ عظیم دن جو ”یوم البروز“ ہے ان سب باتوں کو کھول دے گا تاکہ خود انسان بھی اور دوسرے بھی جان لیں کہ اگر سخت عذاب نازل ہوا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کے بعد خدا کے ہر جگہ حاضر و ناظر

۱۔ بعض مفسرین نے ”کبتوا“ کو نفرین کے معنی میں لیا ہے۔ چونکہ خدا کے قادر مطلق کی طرف سے کسی کے لیے نفرین اس بات کی دلیل ہے کہ جس گروہ

کے خلاف نفرین ہے وہ ذلیل و خوار ہے لیکن آیت کی تعبیر کا ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ خبریہ ہے نہ کہ اِشائیہ۔

۲۔ یوم ظرف ہے اور للکافرین سے متعلق ہے یا مہین سے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے اور بہت سے مفسرین نے اسی سے اتفاق کیا ہے

اور یہ بعض مفسرین نے احتمال تجویز کیا ہے کہ ”اذکر“ محذوف ہے۔ یہ بہت زیادہ محذوف نظر آتا ہے۔

ہونے اور ہر چیز سے آگاہ ہونے کی تاکید کے لیے مسئلہ نجومی کو موضوع بنا کر فرماتا ہے: ”کیا تو نہیں جانتا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا اسے جانتا ہے“ (الم تر ان الله یلعو ما فی السموات وما فی الارض)۔ اگرچہ روئے سخن یہاں بیگزیر کی طرف ہے لیکن مراد تمام لوگ ہیں۔

در حقیقت یہ مسئلہ نجومی کے بیان کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: کبھی تین افراد آپس میں سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور کبھی پانچ افراد آپس میں باتیں نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا ہوتا ہے۔ (ما یكون من نجوى ثلاثة الا هو رابعهم ولا خمسة الا هو سادسهم) اور نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ تعداد مگر یہ کہ خدا ان کے ہمراہ ہوتا ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ (ولا ادنى من ذلك ولا اکثر الا هو معهم ایما کافوا)۔ پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا کیونکہ خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔ (ثم ینبئهم بما عملوا یوم القیامة ان الله بكل شیء علیم)۔

اس آیت میں چند نکات قابل توجہ ہیں

- ۱۔ نجومی اور نجات اصل میں بلند جگہ کے معنوں میں ہیں جو اپنے ارتقاع کی وجہ سے اپنے اطراف سے بڑا ہوتی ہو اور چونکہ انسان جب چاہے کہ دوسرا اس کی باتوں سے آگاہ نہ ہو تو وہ ایسی جگہ جاتا ہے جو دوسروں سے الگ ہو اس لیے سرگوشی کو نجومی کہتے ہیں یا پھر اس لحاظ سے کہ چونکہ نجومی کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے اسرار دوسروں تک پہنچ جائیں لہذا وہ انہیں نجات بخشتا ہے۔
- ۲۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ نجومی حتمی طور پر تین یا تین سے زیادہ افراد کے مابین ہونا چاہیے اور اگر صرف دو افراد کے درمیان ہو تو اسے (سرار) (بروزن کنار) کہتے ہیں لیکن یہ خود آیت کے ظہور کے خلاف ہے کیونکہ (ولا ادنى من ذلك) کا جملہ تین سے کم افراد یعنی دو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ البتہ جس وقت دو شخص آپس میں نجومی کریں تو ضروری ہے کہ تیسرا آدمی ان کے قریب موجود ہو ورنہ نجومی لازم نہیں آتا لیکن یہ بات جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ربط نہیں رکھتی۔
- ۳۔ قابل توجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں پہلے تین افراد کے نجومی کی اور پھر پانچ کے نجومی کی بات ہوئی ہے لیکن چار افراد کے نجومی کی جو ان دونوں کے درمیان ہے، بات نہیں ہوئی۔ اگرچہ یہ محض مثال کی بات ہے مگر بعض نے اس کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں جن میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ کلام میں فصاحت و بلاغت کی رعایت رکھی گئی ہے اور تکرار سے پہلو بچایا گیا ہے، اس لیے کہ اگر فرماتا کہ تین افراد نجومی کرتے ہیں تو خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور چار افراد نجومی کرتے ہیں تو خدا ان کا پانچواں ہوتا ہے تو چار کے عدد کی محض تکرار ہوئی اور یہ فصاحت سے بعید ہوتا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیات منافقین کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ٹھیک انہی اعداد کے مطابق تھے۔ یعنی تین اور پانچ کی تعداد میں تھے۔

۴۔ اس سے مراد کہ خدا چوتھا یا چھٹا ہے یہ ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے ورنہ اس کی پاک ذات نہ ممکن

۱۔ ”الم تر“ رؤیت کے مادہ سے اصل میں حسی مشاہدہ کے معنی میں ہے لیکن بہت سے مواقع پر شہود قلبی اور علم و آگاہی کے معنی میں آیا ہے۔

۲۔ ”نجومی“ اگرچہ مصدر ہے لیکن یہاں اسم فاعل کے معنوں میں ہے یا زیر عدل (زید خود عدالت ہے) کے قبیل میں سے ہے۔

رکھتی ہے اور نہ اعداد کے حوالے سے اس کی تعریف و توصیف کی جاسکتی ہے۔ اس کی یگانگت بھی وحدت عددی نہیں ہے بلکہ اس معنی میں ہے کہ وہ مثل و نظیر اور شبیہ نہیں رکھتا۔

۵۔ آیت کے ذیل میں بات کو نجوی سے بھی اوپر لے جا کر کہتا ہے: "خدا ہر جگہ لوگوں کے ساتھ ہے اور قیامت کے دن ان کو ان کے اعمال سے باخبر کرے گا۔ آیت کو خدا کے احاطہ علی پر جا کر ختم کرتا ہے جیسا کہ آیت کی جو ابتدا ہے وہ تمام چیزوں کے بارے میں خدا کا احاطہ علی ہے۔

۶۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے ابن عباسؓ سے ایک شان نزول نقل کی ہے کہ یہ آیت تین افراد ربیعہ، حبیب اور صفوان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ خدا اس چیز کو جو ہم کہتے ہیں جانتا ہے۔ دوسرے نے کہا اس کی کچھ مقدار کو جانتا ہے اور کچھ کو نہیں جانتا۔ تیسرے نے کہا: اگر کچھ مقدار کو جانتا ہے تو پھر ساری بات کو جانتا ہے (تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی) اور بتایا کہ خدا ہر نجوی میں موجود ہے اور آسمان و زمین کی ہر چیز سے آگاہ ہے تاکہ یہ دل کے اندھے اپنی غلط فہمی سے بچ جائیں۔

ایک نکتہ

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ خدا نہ جسم ہے اور نہ عوارض جسمانی رکھتا ہے، اس وجہ سے اس کے لیے زمان و مکان کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اگر ہم تصور کریں کہ اس کے لیے کوئی جگہ ہو جہاں حاضری و ناظر ہو تو ہم نے اسے محدود کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہر چیز پر احاطہ علی رکھتا ہے۔ باوجودیکہ اس کے لیے کوئی مکان متصور نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں اس کے فرشتے ہر جگہ موجود ہیں جو تمام اقوال و اعمال کو دیکھتے ہیں اور ثبت کرتے ہیں اسی لیے اس آیت کی تفسیر میں ہم حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث لیتے ہیں:

(انما اراد بذلك استيلاء امناؤه بالقدرة التي ركبها فيهم على جميع خلقه
وان فعلهم فعله)

مراد یہ ہے کہ خدا کے اُمناء اس قدرت کی بنا پر جو انہیں بخشی گئی ہے اس کی ساری مخلوق پر تسلط رکھتے ہیں اور چونکہ ان کا فعل اُس کا فعل ہے لہذا اس حضور کی اُس کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

البتہ یہ اس معاملہ کا ایک رخ ہے لیکن دوسری جہت سے خود ذاتِ خدا کا حضور پیش کیا جا رہا ہے۔ ہم ایک اور حدیث میں دیکھتے ہیں کہ دُنیا نے عیسائیت کے ایک بہت بڑے عالم نے امیر المومنین علی علیہ السلام سے پوچھا خدا کہاں ہے فرمایا:

”ھوہا هنا وھاهنا و فوق و تحت و محیط بنا و معنا و هو قولہ ما یکون من نجوی“

ثلاثة الالهو رابعهم.....“

وہ اس جگہ ہے اور اس جگہ ہے وہ اُد پر ہے نیچے ہے اور ہم پر احاطہ کیے ہوئے ہے
اور ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے اور یہی معنی ہیں جن کے متعلق خدا کہتا ہے تین افراد آپس میں
سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے۔
مشہور حدیث ابیلیج میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدا کو سمیع کا نام جو دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تین افراد
آپس میں نجوی نہیں کرتے مگر یہ کہ وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اس کے بعد آپ نے فرمایا :

”يسمع ديبب النمل على الصفا وخفقتان الطير في الهواء لا يخفى عليه خافية
ولا شيء مما ادركه الاسماع والابصار وما لا تدركه الاسماع والابصار
ما جل من ذالك وما دق وما صغر وما كبر“

سخت پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی صدا وہ سُنتا ہے اور فضا میں پرندوں کے پر مارنے کی
آواز وہ سُنتا ہے کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ شے جس کا کان اور آنکھیں
ادراک کرتی ہیں اور وہ جس کا ادراک نہیں کرتیں پھوٹی اور بڑی سب کی سب اس کے لیے
ظاہر و آشکار ہیں۔

۸۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَْعُوْدُوْنَ لِمَا

نُوْا عَنْهُ وَيَتَنَجَّوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ

الرَّسُوْلِ وَاِذَا جَاؤُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ

اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِىْ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ

حَسْبُكُمْ جَهَنَّمُ يَصْلُوْنَهَا فَبِئْسَ الْبَصِيْرُ ۝

۹۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ

وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

۱۰۔ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ

بِضَارٍ لَهُمْ شَيْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

ترجمہ

۸۔ کیا تو نے نہیں دیکھا انہیں جن کو نجوی کی ممانعت کی گئی اس کے بعد اس کام کی طرف جس سے

انہیں روکا گیا تھا لوٹ گئے اور گناہ و تعدی اور خدا کے رسول کی نافرمانی کو انجام دینے کے لیے

سرکوشی کرتے ہیں اور جس وقت تیرے پاس آتے ہیں تو تجھے وہ سلام کرتے ہیں جو خدا نے

تجھے نہیں کیا اور دل میں کہتے ہیں کہ خدا کیوں ہمیں ہماری باتوں پر عذاب نہیں کرتا۔ جہنم ان کے لیے کافی ہے۔ اس میں وہ وارد ہوں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔

۹۔ اے ایمان لانے والو جس وقت سرگوشی کرتے ہو تو گناہ، تعدی اور رسول خدا کی نافرمانی کھیلے نہ کرو اور اچھے کام اور تقویٰ کے بارے میں سرگوشی کرو اور اُس خدا کی مخالفت سے جس کی طرف تمہاری بازگشت ہے اور اس کے ہاں تمہیں جمع ہونا ہے، پرہیز کرو۔

۱۰۔ بخوبی صرف شیطان کی طرف سے ہے وہ چاہتا ہے کہ مومنین اس سے غمگین ہوں لیکن انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا حکم خدا کے بغیر اس لیے مومنین کو چاہیئے کہ وہ خدا پر توکل کریں۔

شان نزول

پہلی زیر بحث آیت کے بارے میں دو شان نزول نقل ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک آیت کے ایک حصہ سے مربوط ہے۔ پہلی یہ کہ یہودیوں اور منافقوں کی ایک جماعت مومنین سے علیحدہ آپس میں سرگوشی کرتی اور ایک دوسرے کے کانوں میں باتیں کرتی اور کہتی یہ کہ مومنین کو آنکھوں سے پریشان کن اشارے کرتی۔ جب مومنین یہ منظر دیکھتے تو کہتے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے عزیزوں اور رشتہ داروں کے بارے میں جو بہادری گئے ہوتے ہیں ان ہم کوئی پریشان کن خبر پہنچی ہے۔ یہ اُس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ یہ چیز مومنین کے غم و اندوہ کا باعث بنتی جب انہوں نے یہ حرکت بار بار کی تو مومنین نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی۔ رسول خداؐ نے حکم دیا کہ کوئی شخص مسلمانوں کے سامنے ایک دوسرے سے سرگوشی نہ کرے تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ (اور انہیں اس کام پر سختی سے سزائیں کی گئیں)

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور بہت سی کتب تفسیر نے تحریر کیا ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور السلام علیک کی بجائے السلام علیک یا ابا القاسم کہا۔ (اس کا مفہوم ہے تجھ پر موت یا ملامت دہشتگی ہو)۔ پیغمبرؐ نے ان کے جواب میں فرمایا: وعلیکم (یہی چیز تم پر ہو)۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں: کہ میں اس مفہوم کی طرف متوجہ ہوئی اور میں نے کہا: علیکم السلام ولعنکم اللہ وغضب علیکم۔ تم پر موت وارد ہو۔ خدا تم پر غضب کرے تو پیغمبرؐ نے فرمایا: ”نمی سے کام لو اور سختی و بدگوئی سے پرہیز کرو“

تو میں نے کہا: کہ آپ نہیں سن رہے تھے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ”تجھ پر موت ہو“ فرمایا:

”کیا تُو نے نہیں سنا کہ میں نے ان کے جواب میں علیکم کہا ہے۔“

یہ وہ موقع تھا کہ مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی کہ ”جس وقت یہ گروہ تمہارے پاس آتا ہے تو ایسا سلام کرتا ہے جیسا سلام خدا نے تم پر نہیں کیا۔“

تفسیر

ان آیات کی بحث اس طرح نجوی کے ان مباحث کا تسلسل ہے جو گزشتہ آیتوں میں تھے۔ پہلے فرماتا ہے : ”کیا تُو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں سرگوشی سے منع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کام کی طرف پلٹے جس کی ممانعت کی گئی تھی اور وہ گناہ، تعدی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کو انجام دینے کے لیے نجوی کرتے ہیں۔“

(المتر الى الذين نهوا عن النجوى ثم يعودون لما نهوا عنه ويتناجون بالاشعر والعدوان ومعصيت الرسول)۔ اس تعبیر سے ابھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انہیں خبردار کیا گیا تھا کہ وہ نجوی سے پرہیز کریں۔ وہ ایسا کام ہے جو دوسروں میں برکائی اور پریشانی پیدا کرتا ہے لیکن انہوں نے، نہ صرف یہ کہ، اس حکم پر کان نہیں دھرا بلکہ اپنے نجوی کے لیے ایسے امور منتخب کیے جن میں گناہ کی انجام دہی تھی اور جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف تھے۔

اشعر، عدوان اور معصیت الرسول میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ اثم ان گناہوں کو کہتے ہیں جو انفرادی پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً (شراب پینا) اور عدوان ان امور کے لیے آتا ہے جو دوسروں کے حقوق کے سلسلہ میں تجاوز کا باعث ہوں۔ باقی رہی معصیت الرسول تو وہ ان فرامین سے تعلق رکھتی ہے جنہیں خود پیغمبر اسلام حکومت اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے اسلامی معاشرہ کی مصلحتوں کے سلسلہ میں صادر فرماتے تھے۔ اس وجہ سے وہ اپنی سرگوشیوں میں ہر قسم کے غلط کاموں کو شامل کرتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ عمل خود انہی سے تعلق رکھتے تھے یا دوسروں سے متعلق تھے یا حکومت اسلامی اور ذات پیغمبر سے ان کا تعلق تھا۔ ”يعودون“ اور ”يتناجون“ کی تعبیر جو فعل مضارع کی صورت میں آئی ہے، بتاتی ہے کہ وہ یہ کام بار بار کرتے تھے اور ان کا مقصد عزمین کے دلوں میں پریشانی اور شک پیدا کرنا تھا۔ بہر حال مندرجہ بالا آیت، ایک اخبار غیبی کے عنوان سے ان کے غلط اعمال کے چہرے سے پردہ اٹھاتی ہے اور ان کی راہ انحراف کا انکشاف کرتی ہے۔ اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے منافقوں اور یہودیوں کے ایک اور غلط عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے :

”اور جس وقت وہ تیرے پاس آتے ہیں تو ایسا سلام کرتے ہیں جیسا خدا نے تجھے نہیں کیا۔“

(واذا جاءوك حيوك بما لم يحيك به الله)۔ ”حيوك“ ”تحيت“ کے مادہ سے اصل میں حیات سے لیا گیا ہے اور سلامتی و زندگی تازہ کے لیے دُعا کرنے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں تحیت الہی سے مراد وہی سلام علیک (یا سلام اللہ علیک) کا جملہ ہے جس سے ملتا جلتا جملہ قرآنی آیتوں میں پیغمبروں اور بشتیوں کے لیے بار بار آیا ہے۔ منجملہ دیگر آیتوں کے ہم سورہ صافات کی آیت ۱۸۱ میں دیکھتے ہیں و سلام علی المرسلین۔ ”پروردگار کے تمام رسولوں پر سلام۔“ باقی رہا وہ سلام جو خدا نے نہیں بتایا اور جو جائز نہیں تھا وہ السلام علیکم کا جملہ تھا (تجھ پر موت یا ملامت و خستگی ہو)۔ یہ احتمال بھی ہے کہ زمانہ جاہلیت کے سلام کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ وہ کہتے تھے

”انعم صلیحاً“ (تیری صبح راحت سے ہم کنار ہو)۔ (انعم مساء) ”تیرا وقت عصر راحت سے ہم کنار ہو“ بغیر اس کے کہ خدا کی طرف توجہ کرے اور اس سے اپنے مقابل کے لیے سلامتی طلب کرے۔

یہ صورت حال اگرچہ زمانہ جاہلیت میں تھی لیکن اس کا حرام ہونا ثابت نہیں ہے لہذا مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں اسے پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”وہ نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ اس طرح بادل غرور میں مست ہیں کہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر ہمارے اعمال بُرے ہیں اور خدا جانتا ہے تو ہماری باتوں کی وجہ سے ہم پر عذاب نازل کیوں نہیں کرتا۔ (و یقولون فی انفسہم لو لا یعذبنا اللہ بما نقول) اس طرح بغیر کی نبوت پر اپنے ایمان کے نہ ہونے کو پایہ ثبوت تک پہنچاتے ہیں لیکن قرآن ایک مختصر سے جملہ میں انہیں اس طرح جواب دیتا ہے۔ ”جہنم ان کے لیے کافی ہے اور کسی اور عذاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وہی جہنم جس میں وہ عنقریب داخل ہوں گے اور وہ کیا ہی بُری جگہ ہے۔“ (حبصہ وجہنم یصلونہا فبئس المصیر)۔ ہر کیف یہ تعبیر اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ وہ دنیاوی عذاب سے بچ جائیں گے اور اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ اگر کوئی اور عذاب، جہنم کے عذاب کے علاوہ، نہ بھی ہو تو یہ جہنم کا عذاب ہی ان کے لیے کافی ہے اور یہ اپنے تمام اعمال کا عذاب اکٹھا جہنم میں دیکھیں گے اور چونکہ مومنین کبھی کبھی ضرورت اور اپنی دلی خواہش کے ماتحت سرگوشی کرتے تھے لہذا بعد والی آیت میں روئے سخن ان کی طرف کرتے ہوئے، اس خیال کے پیش نظر کہ وہ اس کام میں منافقوں اور یہودیوں جیسے گناہوں میں آلودہ نہ ہوں، فرماتا ہے:

”اے ایمان لانے والو! جس وقت تم بخوبی کرو تو گناہ، تعدی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کے لیے بخوبی نہ کرو تمہارے بخوبی کا مضمون پاکیزہ ہو اور خوف خدا لیے ہوئے ہو۔ نیک کاموں اور تقویٰ کے لیے بخوبی کرو۔“ (یا ایہا الذین آمنوا اذا تناجیتم فلا تناجوا بالاثم والعدوان ومعصیت الرسول وتناجوا بالبر والتقویٰ)۔ اور خدا کی معصیت سے پرہیز کرو تم سب کی بارگشت خدا ہی کی طرف ہے۔“ (واتقوا اللہ الذی الیہ تحشرون)۔ اس تعبیر سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ بخوبی اگر مومنین کے درمیان ہو تو وہ سوائے ظن اور ہدگمانی کے جذبات کو نہ ابھارے، پریشانی پیدا نہ کرے اور اس کا نفس مضمون نیکیوں کی وصیت پر مبنی ہو پھر وہ جائز ہو لیکن اگر بخوبی یہودیوں اور منافقوں کے درمیان واقع ہو، جس کا مقصد ہی پاکیزہ دل مومنین کو تکلیف پہنچانا ہے تب یہ عمل قبیح اور حرام ہے پھر جائیکہ اس کا نفس مضمون بھی شیطانی ہو۔ اس لیے بعد والی آیت میں جو زیر بحث آیتوں میں سے آخری آیت ہے مزید فرماتا ہے: ”بخوبی صرف شیطان کی طرف سے ہے۔ (انما النجوى من الشیطن)۔“ اس مقصد کے پیش نظر کہ مومنین پریشان و غمگین ہوں۔ (لیحزن الذین آمنوا)۔ لیکن انہیں جان لینا چاہیے کہ شیطان اذن پروردگار کے بغیر مومنین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ (ولیس بضارہم شیئاً الا باذن اللہ) عالم ہستی میں جو مؤثر ہے اس کی تاثیر حکم خدا ہی سے ہے یہاں تک کہ آگ کا جلانا اور تلوار کا کاٹنا بھی اسی کے حکم کے ماتحت ہے۔ اگر جلیل حکم نہ دے تو خلیل کے حکم سے چھری نہیں کاٹتی۔ اسی لیے مومنین کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیے اور اس کے علاوہ کسی چیز سے نہیں ڈرنا چاہیے اور اس کے غیر سے نجات نہ کی جائے۔ (وعلى اللہ فلیتوکل المؤمنون)۔ وہ توکل کی روح اور خدا پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اچھی طرح مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں اور شیطان کے بیروکاروں کے منصوبے کو ناکام بنا سکتے ہیں اور ان کی سازشوں کو درہم و درہم کر سکتے ہیں۔

چند نکات

۱۔ نجوی کی اقسام اور سرگوشی کی باتیں : یہ عمل فقہ اسلامی کے لحاظ سے شرائط کے اختلاف کے مطابق مختلف احکام رکھتا ہے اور اصطلاح کے مطابق پانچوں احکام میں تقسیم ہوتا ہے۔ یعنی کبھی مرام ہے اور وہ اس صورت میں کہ کسی مسلمان کی اذیت اور اس کے فکار کے برباد کرنے کا موجب ہو۔ (جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں اس کی طرف اشارہ ہوا تھا)۔ چونکہ اس کا مقصد مومنین کو غمگین کرنا ہے اس لیے ایسا نجوی شیطانی ہے۔ اس کے برعکس یہ کبھی واجب ہو جاتا ہے اور وہ اس صورت میں کہ جب کوئی ایسا مسئلہ زیر بحث ہو جس کا پوشیدہ رکھنا ضروری ہو، اس کا افشا خطرناک ہو اور مسلمانوں کے حقوق کو برباد کرتا ہو۔ یہی نجوی کبھی مستحب ہو جاتا ہے وہ اس صورت میں کہ جب انسان اچھے نیک اور تقویٰ کے کاموں میں اسے اختیار کرے۔ اس طرح اس کے بارے میں کراہت اور اباہت کا حکم ہے اصولی طور پر بات یہ ہے کہ اگر کوئی اہم ترین مقصد پیش نظر ہو تو نجوی کرنا کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے اور آداب مجلس کے خلاف ہے کیونکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے بے اعتمادی اور بے اعتنائی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں :

اذا كنت ثلاثاً فلا يتساج اثنان دون صلحهما فان ذلك يعزله
جب تم تین افراد ایک جگہ ہو تو دو افراد تیسرے سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کرو کیونکہ یہ چیز تیسرے شخص کو غمگین کر دیتی ہے۔^۱

ایک اور حدیث میں ابوسعید خدری سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم پیغمبر کے احکام کے اہل کے لیے ایک رات کسی ضروری مقصد کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانہ اقدس کی طرف رواں تھے اور بہت سے افراد جمع ہو گئے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا :

ما هذه النجوى العتھوا عن النجوى ؟

یہ کیا سرگوشی ہے کیا تمہیں نجوی سے منع نہیں کیا گیا؟

دیگر متعدد روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان مومنین کو غمگین کرنے کے لیے ہر ذریعہ سے فائدہ اٹھاتا ہے نہ صرف نجوی سے بلکہ خواب کے عالم میں کئی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے عجز کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کے غم و اندوہ کا موجب ہوں۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ مومنین اس قسم کے مواقع پر خدا کی پاک ذات سے پناہ طلب کر کے اور اسی پر توکل کر کے اس قسم کے شیطانی مخلص کو اپنے سے دور کر سکتے ہیں۔^۲

۱۔ تفسیر مجمع البیان در ذیل آیات زیر بحث در المکتور جلد ۶ ص ۱۸۴ و اصول کافی جلد ۲ ص ۴۸۳ باب المناجات، حدیث ۲۰۱۔

۲۔ در المکتور جلد ۶ ص ۱۸۴

۳۔ ان روایات سے آگاہی کے لیے تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۶۱، ۲۶۲، حدیث ۳۲۰، ۳۱ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ خدا کا سلام کون سا ہے ؟

عام طور پر مجالس و محافل میں درود کے موقع پر لوگ ایک دوسرے سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو احترام و محبت کی ترجمانی کرتی ہیں اور وہ اس کا نام " تحیت " رکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام کو بھی خدا کی رضا کا حامل ہونا چاہیے۔ جیسا کہ معاشرت کے تمام آداب و رسوم کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ سلام میں مقابل کے احترام و اکرام کے علاوہ خدا کی یاد بھی بھلکنی چاہیے۔ جیسا کہ سلام کرتے وقت ہم اپنے مقابل کی سلامتی کی خدا سے استدعا کرتے ہیں۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے کہ پیغمبر کے اصحاب کی ایک جماعت جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی تو انعم صباحاً و انعم مساءً کہتی ہوئی (تیری صبح راحت سے ہم کنار ہو اور تیرا وقت عصر راحت سے ہم کنار ہو)۔ یہ زمانہ جاہلیت کا سلام تھا۔ قرآن نے اس سے منع کیا اور رسول خدا نے ان سے فرمایا کہ خدا نے ہمیں اس سے بہتر سلام کا حکم دیا ہے۔ وہ اہل بہشت کا سلام ہے :

" السلام علیکم " جس کے معنی سلام اللہ علیکم ہیں۔ اسلامی سلام کا امتیاز یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ ذکر خدا کو لیے ہوئے ہے۔ دوسری طرف ہر قسم کی سلامتی کو پیش کرتا ہے۔ وہ دین و ایمان کی سلامتی ہو یا جسم و جان کی۔ سلام کا مقصد محض راحت و آسائش کی خواہش نہیں ہے بلکہ سلام اور اس کے آداب کے سلسلہ میں ہم سورہ نسا کی آیت ۸۶ کے ذیل میں تفصیلی بحث پیش کر چکے ہیں۔ تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۴۱ سے آگے ملاحظہ فرمائیں۔

۱۱۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ
فَاتَفَسَّحُوا لِمَنْ يَفْسَحُ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَإِذَا قِيلَ انْشُرُوا فَالْشُّرُوا
يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

ترجمہ

۱۱۔ اے ایمان لانے والو! جس وقت تم سے کہا جائے کہ مجلس کو وسعت بخشو (منے آنے والوں کو جگہ دو) تو اسے وسعت بخشو۔ خدا تمہارے لیے (جنت کو) وسعت دے گا۔ جب کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو خدا ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور علم سے بہرہ ور ہیں عظیم درجات بخشے گا۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

شان نزول

طبرسی نے مجمع البیان میں اور آلوسی نے روح المعانی میں اور دوسرے مفسرین کی ایک جماعت نے تحریر کیا ہے کہ پیغمبر اسلام ایک جمعہ کو ”صفہ“ (بڑا سا چہرہ جو مسجد نبوی کے قریب تھا) پر تشریف فرما تھے اور ایک گروہ آپ کی خدمت میں حاضر تھا اور جگہ تنگ تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ آپ مجاہدین بدر کا زیادہ احترام کرتے تھے۔ خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار اسی دوران بدریوں کا ایک گروہ آیا اس وقت دوسرے لوگ آپ کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے اور جگہ خالی نہ تھی۔ وہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آئے تو انہوں نے سلام کیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب سلام دیا مگر وہ لوگ کھڑے رہے اور منتظر رہے کہ حاضرین انہیں جگہ دیں۔ لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ یہ بات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناگوار گزری۔ اپنے چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کچھ کی طرف آپ نے رخ کیا اور فرمایا فلاں فلاں شخص کھڑا ہو جائے۔ اس طرح چند افراد کو آپ نے اٹھایا تاکہ آنے والے بیٹھ سکیں۔ (یہ ایک قسم کا ایمان اور جہاد میں سبقت کرنے والوں کے بارے میں ادب اور احترام کا درس تھا)۔ لیکن یہ بات ان چند افراد کو ناگوار گزری جو اپنی جگہ

سے اٹھتے تھے خٹکی کے آئینار ان کے چہروں سے نمایاں تھے۔ منافقین جو ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے تھے وہ کہنے لگے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصاف سے کام نہیں لیا وہ لوگ جو عاشقانہ انداز میں آپ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے انہیں ان لوگوں کی خاطر جو مجلس میں بعد وارد ہوئے تھے اٹھا دیا اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (اور مجلسوں میں بیٹھنے کے آداب کے کچھ حصہ کی ان کے لیے شرح کی)۔

تفسیر

مجالس میں پہلے آنے والوں کا احترام

اس حکم کے بعد جو گزشتہ آیات میں مجالس میں سرگوشی ترک کرنے اور اسے مخصوص مواقع تک محدود کرنے کے سلسلہ میں آیا تھا اس آیت میں ایک اور مجلسی آداب کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :

”اے ایمان لانے والو! جس وقت تم سے کہا جائے کہ مجلس کو وسعت دو اور نئے آنے والوں کو جگہ دو تو اس کی اطاعت کرو“
(یا ایہا الذین امنوا اذا قيل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا) ۱

اگر ایسا کرو گے تو خدا تمہاری جگہ کو جنت میں وسعت بخشے گا اور اس جہان میں بھی تمہارے دل و جان اور رزق میں وسعت دے گا۔ (يفسح الله لکم) ”تفسحوا“ ”فسح“ (بروزن قفل) کے مادہ سے ہے اور وسیع مکان کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر ”تفسح“ وسعت دینے کے معنی میں ہے اور اسے آداب مجلس میں شامل سمجھنا چاہیئے۔ جس وقت کوئی نیا شخص مجلس میں وارد ہو تو حاضرین قریب قریب ہو جائیں اور اس کو جگہ دے دیں تاکہ وہ پریشان اور نادام نہ ہو۔ یہ موضوع محبت اور دوستی کے رشتوں کو محکم کرنے کے وسائل میں سے ہے۔ یہ بخوبی کے برعکس ہے جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے اور جو نفرت، بدبینی اور دشمنی کے عوامل میں سے ہے۔ قابل توجہ یہ امر ہے کہ قرآن مجید جو عظیم آسمانی کتاب ہے اور مسلمانوں کے بنیادی قانون کی حیثیت رکھتا ہے، اس نے اخلاقی مسائل اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بہت سی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے اہم اور بنیادی قوانین کے ذیل میں بھی ان جزئیات کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ مسلمان یہ تصور نہ کریں کہ ان کے لیے صرف کئی اصولوں کا پابند ہونا ہی کافی ہے۔ (يفسح الله لکم) ”خدا تمہیں وسعت بخشے گا“ کے جملے کی مفسرین کی ایک جماعت نے یہ تفسیر کی ہے کہ جنت کی مجالس کو وسعت دی جائے گی۔ یہ وہ اجر ہے جو خدا ان افراد کو دے گا جو اس جہان میں آداب مجلس کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ چونکہ آیت مطلق ہے اور اس میں کوئی قید و شرط نہیں ہے لہذا اس کا مفہوم وسیع اور خدا کی طرف ہر قسم کی وسعت بخشنے پر حاوی ہے اور وہ وسعت جنت میں ہو یا دنیا میں، روح و فکر میں ہو یا عمر اور زندگی میں، مال و متاع میں ہو یا رزق میں، سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فضل خدا سے یہ بعید نہیں ہے کہ اس قسم کے بھوٹے سے کام کے صلہ میں وہ اس طرح کا عظیم اجر عطا کرے

۱۔ روح المعانی جلد ۲۸ ص ۲۵ و مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۵۳۔ دوسرے مفسرین لازمی، قرطبی، سیوطی اور فی ظلال نے بھی یہی مفہوم زیر بحث آیت کے ذیل میں مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۲۔ ”تفسحوا“ اور ”فافسحوا“ کی دو تعبیریں کا فرق جن میں سے ایک باب تفعیل ہے اور دوسری باب ثلثی مجرور سے ہے شاید اس وجہ سے ہو کہ پہلی ایک قسم کے تکلف کی حامل ہے اور دوسری اس سے خالی ہے یعنی جب کہنے والا زحمت کرتے ہوئے کہے کہ فواد کو جگہ دو تو وہ زحمت کا احساس نہیں کرے گا (یہ بخوبی)

کیونکہ اجر کی مقدار اس کے کرم پر منحصر ہے نہ کہ ہمارے اعمال پر۔ اور چونکہ کبھی مجلسوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کچھ افراد کے اُٹھے بغیر دوسروں کے لیے جگہ نہیں بنتی یا اگر ہو تو ان کی ضرورت کے مطابق نہیں ہوتی لہذا آیت کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

” جس وقت تم سے کہا جائے کہ اُٹھ کھڑے ہو تو اُٹھ کھڑے ہو۔“ (واذا قيل انشزوا فانشزوا)۔

نہ تو بہاتے بناؤ اور نہ جس وقت اُٹھو اس وقت پریشان ہو۔ کیونکہ بعض اوقات نووارد افراد بیٹھنے کے تم سے زیادہ حقدار ہوتے ہیں ، زیادہ تھکن کی وجہ سے یا ضعیفی کی وجہ سے یا خاص احترام کی بنا پر یا اور کسی ایسے ہی سبب کی بنا پر۔ حاضرین کو چاہیے کہ وہ ایثار سے کام لیں اور اس اسلامی ادب پر عمل پیرا ہوں جیسا کہ ہم نے شان نزول میں پڑھا ہے کہ پیغمبرؐ نے ایک جماعت کو، جو آپؐ کے قریب بیٹھی ہوئی تھی، حکم دیا کہ اپنی جگہ ان نوواردوں کو دے دو جو مجاہدین بدر میں سے ہیں اور علم و فضل کے لحاظ سے دوسروں پر برتری رکھتے ہیں۔ بعض منترین نے اس بنا پر کہ ”انشزوا“ (اُٹھ کھڑے ہو) یہاں مطلق ہے اس کی زیادہ وسیع معانی پر مبنی تفسیر کی ہے جس میں مجلس سے اُٹھنا بھی شامل ہے اور یہ ہماؤ کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے اور نماز اور دوسرے امور خیر کے لیے مستعد ہونے کے معانی پر بھی حاوی ہے۔ لیکن اس سے پہلے جملے کی طرف توجہ سے، جس میں ”فی المجالس“ کی قید ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جملہ بھی اسی شرط کا پابند ہے جس کی تکرار سے، قرینہ کے بموجب ہونے کی بنا پر، پرہیز کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس حکم کے اجر کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

” اگر ایسا کرو گے تو خدا ان لوگوں کو جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور علم سے بہرہ ور ہیں۔ عظیم درجات بخشے گا۔“ (يرفع الله الذين

امنوا منكم والذين اوتوا العلم درجات)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت ایمان و علم کی دلیل ہے۔ نیز اس طرف اشارہ ہے کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض افراد کو حکم دیا ہے کہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو جاؤ اور نووارد افراد کو جگہ دے دو تو یہ ایک ایسا مقدس مقصود ہے جس کا حکم خدا کی طرف سے ہے اور یہ ایمان و علم میں سبقت کرنے والوں کے احترام کی بنا پر ہے۔ درجات کی تعبیر (نکرہ کی شکل میں اور صیغہ جمع کے ساتھ) عظیم اور بلند مراتب کی طرف اشارہ ہے جو خدا اس قسم کے افراد کو عطا کرتا ہے جو علم و ایمان دونوں کے حامل ہوں۔ حقیقت میں وہ لوگ جو نووارد افراد کو اپنے پاس جگہ دیتے ہیں ایک درجہ پر فائز ہوتے ہیں اور جو اشارے سے کام لیں اور اپنی جگہ ان کو دے دیں اور وہ علم و معرفت سے بھی بہرہ ور ہوں تو ان کے لیے بہت سے درجات ہیں۔ اور چونکہ ایک گروہ ان آداب کو خلوص دل سے بروئے کار لاتا ہے لہذا آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے : ”خدا اس سے جسے تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔“ (والله بما تعملون خبير)۔

چند نکات

اگرچہ یہ آیت ایک خاص موقع کو لے کر نازل ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا ایک عام مفہوم بھی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ جو چیزیں

لہ ”انشزوا“ ”نشز“ (بروزن نصر) کے مادہ سے ہے جس کے معنی بلند زمین کے ہیں۔ اس لیے یہ لفظ اُٹھنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

”ناشزہ“ اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو اس عورت سے بہتر سمجھتی ہو جو اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ یہ لفظ کبھی زندہ کرنے کے معنی میں بھی

آتا ہے کیونکہ یہ چیز کسی کے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہونے کا سبب بنتی ہے۔

لہ مندرجہ بالا آیت میں ”یرفع“ اس صیغہ امر کی وجہ سے مجزوم ہے جو اس سے پہلے ہے اور حقیقت میں مفہوم شرط رکھتا ہے اور یرفع اس کی جزا کے طور پر ہے

انسان کے رتبہ کو خدا کی بارگاہ میں بلند کرتی ہیں وہ دو ہیں؟ ایک ایمان اور دوسرے علم۔ ہمیں معلوم ہے کہ شہید کا اسلام میں بلند ترین مقام ہے لیکن اس کے باوجود ایک حدیث پیغمبر اسلام سے منقول ہے :

(فضل العالم علی الشہید درجۃ وفضل الشہید علی العابد درجۃ ...)

وفضل العالم علی سائر الناس کفضل علیٰ اداہم)

عالم شہید سے ایک درجہ بلند ہے اور شہید عابد سے ایک درجہ بلند ہے اور عالم کی فضیلت باقی لوگوں پر ان میں سے پست ترین کے مقابلے میں میری فضیلت جیسی ہے۔

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ :

(من جائتہ منیتہ وھو یطلب العلم فیتنہ و بین الانبیاء درجۃ)

جس کو طالب علمی کے زمانہ میں موت آجائے اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجہ کا فاصلہ ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ چاندنی راتوں میں خصوصاً مہینے کی چودھویں رات کو جب چاند بالکل مکمل ہوتا ہے ستارے چاند کے نور میں مدھم ہو جاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ عالم و عابد کے موازنہ میں ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ :

(فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب)

عالم کی عابد پر فضیلت و برتری چودھویں رات کے باقی تمام ستاروں پر برتری کے مانند ہے۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ عابد عبادت انجام دیتا ہے جو مقصد خلقت انسانی ہے لیکن روح عبادت معرفت الہی ہے لہذا عالم عابد پر حد سے زیادہ برتری رکھتا ہے۔ چونکہ مندرجہ بالا روایات میں عالم کی عابد کے مقابلہ میں فضیلت و برتری کے بارے میں آیا ہے اس سے مراد ان دونوں کے درمیان ایک عظیم فاصلہ ہے اس لیے ایک دوسری حدیث میں ان دونوں کے فرق کے سلسلہ میں ایک درجہ کی بجائے سو درجہ کا فرق بیان ہوا ہے جس میں ہر درجہ کا فاصلہ دوسرے درجہ سے تیز رفتار گھوڑے کے ستر سال تک دوڑنے کی مقدار کے برابر ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ قیامت میں شفاعت ہر شخص کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ مقربان بارگاہ خدا کا مقام ہے لیکن ہمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ملتی ہے :

(یشفع لیوم القیامۃ ثلاثۃ الانبیاء ثم العلماء ثم الشهداء)

قیامت میں تین گروہ شفاعت کریں گے انبیاء ان کے بعد علما اور پھر شہداء

حقیقت میں راہ خدا پر چلنا، خوشنودی خدا کا حاصل کرنا اور اس کے قرب کی توفیق کا حصول دو عوامل کا مرکب ہے ایک تو ایمان و عمل دوسرے آگاہی و تقویٰ جس میں سے کوئی بھی دوسرے کے بغیر ہدایت و کامیابی حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

۲۔ آداب مجلس

قرآن کریم میں بارہا اہم مسائل کے ساتھ ساتھ مجالس کے اسلامی آداب کی طرف اشارے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر سلام کرنے کے آداب، دعوت طعام کے آداب، پیچھے برکے ساتھ گفتگو کرنے کے آداب، نوواردوں کو مجلس میں جگہ دینے کے آداب، علی الخصوص فضیلت کے حامل افراد اور ایمان کی طرف سبقت کرنے والے افراد کو مجلس میں جگہ دینے کے آداب۔

اس بات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہر موضوع کے لیے اس کے مقام کے اعتبار سے اس کی اہمیت کا قائل ہے۔ اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ انسانی معاشرت کے آداب کچھ افراد کی بے اعتنائی کی وجہ سے پامال کر دیئے جائیں۔ کتب احادیث میں سینکڑوں روایات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین سے دوسروں کے ساتھ معاشرت کے آداب کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور مرحوم شیخ "حرعالمی" نے انہیں کتاب وسائل کی جلد آٹھ باب ۱۶۶ میں جمع کر دی ہے اور جو جزئیات ان روایات میں ہیں وہ بتاتی ہیں کہ اسلام اس سلسلہ میں کس حد تک باریک بین اور سخت گیر ہے۔ ان روایات میں بیٹھنے، بات کرنے، مسکرانے، مذاق کرنے، کھانا کھلانے، خط لکھنے حتیٰ کہ دوستوں کی طرف نگاہ کرنے کے بارے میں بھی ہدایات مل جاتی ہیں اور جو احکام ہر موضوع پر دیے گئے ہیں ان کا نقل کرنا ہمیں تفسیری بحث کے دائرہ سے خارج کر دے گا۔ ہم حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

(لیجتمع فی قلبك الافتقار الی الناس والاستغناء عنهم یكون افتقارک

الیهم فی لین کلامک وحسن سیرتک ویكون استغنائک عنهم نزاهة

عرضک وبقاء عزک)۔

"تیرے دل میں لوگوں کے لیے نیاز مندی و حاجت مندی اور بے نیازی و بے احتیاجی دونوں موجود ہونے چاہئیں۔ تیری نیاز مندی و حاجت مندی گفتگو کی نرمی اور حسن سلوک کے ذریعہ ظاہر ہو اور تیری بے نیازی و بے احتیاجی حفظ آبرو اور عزت نفس کے ذریعہ جلوہ گر ہوئے۔

۱۔ یہ احکام ترتیب کے ساتھ درج ذیل آیات میں آئے ہیں۔ سلام کرنے کے آداب سورہ نسا آیت ۸۶۔ دعوت طعام کے آداب سورہ احزاب ۵۳۔ پیچھے
سے گفتگو کرنے کے آداب حجرات آیت ۲ اور مجلس میں جگہ دینے کے آداب زیر بحث آیت میں۔

۲۔ "وسائل الشیخ" جلد ۸ ص ۴۰۱۔

۱۲۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِ مُوَابِنِ
يَدَي نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ ۖ ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ
فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

۱۳۔ ءَا شَفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَي نَجْوَاكُمْ صَدَقَتْ
فَإِذَا لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَأَتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۖ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا
تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

۱۲۔ اے ایمان لانے والوں جس وقت تم چاہو کہ رسول خدا کے ساتھ نجوی کرو تو اس سے پہلے
(راہ خدا میں) صدقہ دے دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ بات ہے اور اگر استطاعت
نہ رکھتے ہو تو خدا غفور و رحیم ہے۔

۱۳۔ کیا ڈر گئے ہو کہ فقیر ہو جاؤ گے جو تم نے سرگوشی سے پہلے صدقہ دینے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب
جب کہ یہ کام تم نے نہیں کیا اور خدا نے تمہاری توبہ کو قبول کر لیا ہے تو نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو
اور خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو۔ (جان لو) کہ خدا اس کام سے جسے تم انجام دیتے ہو
باخبر ہے۔

شان نزول

مرحوم طبری مجمع البیان میں اور دیگر مشہور مفسرین کی ایک جماعت نے ان آیات کی شان نزول کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ اغنیا کا ایک گروہ مصل پیغمبرؐ میں آکر آپ سے بخوبی کیا کرتا تھا۔ (یہ کام علاوہ اس کے کہ پیغمبرؐ کے قیمتی وقت کے بے جا صرف کا سبب بنتا غریبوں کی پریشانی اور امیر لوگوں کے ایک قسم کے امتیاز کا باعث بھی بنتا)۔ اس موقع کے لیے پروردگار عالم نے مندرجہ بالا آیات نازل کیں اور انہیں حکم دیا کہ پیغمبرؐ سے بخوبی کرنے سے پہلے حاجت مندوں کو صدقہ دیا کرو۔ اغنیا نے جب یہ دیکھا تو بخوبی سے احتراز برتنے لگے اس پر دوسری آیت نازل ہوئی (انہیں ملامت کی اور پہلے حکم کو منسوخ کیا)۔ اور سب کو بخوبی کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن بخوبی صرف وہی جو اطاعت پروردگار کے سلسلہ میں ہوئے۔

بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ بخوبی کرنے والے گروہ کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس طرح دوسروں کے مقابلہ میں برتری حاصل کریں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مخصوص بزرگانہ حیثیت کے پیش نظر باوجود اس کے کہ وہ اس بات سے ناخوش تھے، ان لوگوں کو اس سرگوشی سے منع نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ قرآن نے ان لوگوں کو اس کام سے منع کیا۔

تفسیر

ایک جاذب توجہ امتحان

گوشہ آیت کے ایک حصہ میں بخوبی کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات اسی مضمون کو جاری و ساری رکھتی ہیں اور اس کی تکمیل کرتی ہیں۔ پہلے فرماتا ہے :

”اے ایمان لانے والو! تم جب چاہو کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بخوبی کرو تو اس سے پہلے راہ خدا میں صدقہ دے دو۔ (یا ایہا الذین آمنوا اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی ذبواکم صدقۃ)۔ جیسا کہ شان نزول میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ حکم اس لیے تھا کہ لوگوں کا ایک گروہ خصوصاً اغنیا پیغمبرؐ سے بخوبی کرتے اور ان کو مصروف رکھتے۔ یہ ایسا کام تھا جو دوسروں کے لیے غم و اندوہ کا باعث بنتا تھا اور بخوبی کرنے والوں کے لیے سبب امتیاز ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں پیغمبر اسلامؐ کے قیمتی وقت کے ضائع ہونے کا سبب بھی بنتا تھا تو مندرجہ بالا حکم نازل ہوا۔ یہ حکم ان کے لیے ایک آزمائش، حاجت مندوں کے لیے مدد کا باعث اور مذکورہ رحمتوں کے کم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

”یہ تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے“ (ذالک خیر لکم واطھس)۔ صدقہ کا اغنیا کے لیے خیر ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ موجب ثواب تھا اور حاجت مندوں کے واسطے اس لیے کہ ان کی مدد کا ذریعہ تھا۔ باقی رہا اظہر ہونا تو وہ اس وجہ سے تھا کہ وہ

اغنیاء کے دلوں سے مال کی محبت کو دھوتا تھا اور حاجت مندوں کے دلوں سے کینے اور پریشانی کو دور کرتا تھا۔ نجومی جب مفت نہ ہو سکتا اور صدقہ کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہوتا تو خود بخود کم ہو جاتا جیسا کہ کم ہوا لہذا یہ چیز مسلمانوں کے فکری اور اجتماعی ماحول کے لیے ایک قسم کی پاکیزگی بن گئی۔ لیکن اگر نجومی سے پہلے صدقہ کا وجوب عمومیت رکھتا تو پھر فقرا، اہم مسائل یا اپنی ضرورتیں پیغمبر کی بارگاہ میں پیش کرنے سے قاصر رہ جاتے۔ لہذا آیت کے ذیل میں صدقہ کا حکم اس گروہ سے واپس لیتے ہوئے فرماتا ہے :

”اور اگر استطاعت نہ رکھتے ہوں تو خدا غفور الرحیم ہے۔“ (فان لم تجدوا فان الله غفور رحيم)۔ اس طرح جو لوگ مالی اعتبار سے مضبوط تھے ان کے لیے نجومی سے پہلے صدقہ دینا واجب تھا اور جن کی مالی حالت اچھی نہ تھی وہ صدقہ کے بغیر نجومی کر سکتے تھے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا حکم نے ایک عجیب تاثیر پیدا کی اور ایک عمدہ آزمائش پیش کی۔ ایک شخص کے علاوہ سب نے صدقہ دینے اور نجومی کرنے سے پہلو تہی کی اور وہ ایک شخص حضرت علی علیہ السلام تھے۔ یہ وہ مقام تھا کہ جہاں جس چیز کی وضاحت اور اس کے نمایاں ہونے کی ضرورت تھی وہ واضح ہو گئی اور جو کچھ مسلمانوں کو اس حکم سے سمجھنا چاہیے تھا اور درس لینا چاہیے تھا اس کو انہوں نے سمجھا اور درس لیا۔ لہذا بعد والی آیت نازل ہوئی اور اس حکم کو منسوخ کر دیا اور یہ حکم پیش کیا :

”کیا تم ڈر گئے کہ فقیر ہو جاؤ گے جس کی وجہ سے نجومی سے پہلے صدقہ دینے سے تم نے احتراز کیا۔ (عاشفقتم ان تقدموا بین یدی فجواکم صدقات)۔ معلوم ہوتا ہے کہ مال کی محبت تمہارے دل میں پیغمبر سے نجومی کرنے کے لگاؤ سے زیادہ پرکشش اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان سرگوشیوں میں عام طور پر زندگی کے مسائل موضوع گفتگو نہیں ہوتے تھے ورنہ کیا مانع تھا جو لوگ نجومی کرنے سے پہلے صدقہ دے دیتے اور پھر نجومی کرتے خصوصاً جب کہ صدقہ کے لیے کوئی مقدار بھی مقرر نہیں تھی اور وہ تھوڑی سی رقم سے اس مشکل کو حل کر سکتے تھے پھر مزید فرماتا ہے :

”اب جب کہ تم نے یہ کام نہیں کیا اور خود تم اپنی کوتاہی کو بھانپ چکے ہو اور خدا نے بھی تمہیں معاف کر دیا ہے اور تمہاری توبہ قبول کر لی ہے تو نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے باز ہے۔“ (فاذ لم تفعلوا و تاب الله علیکم فاقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ و اطیعوا الله ورسوله و الله خبیر بما تعملون)۔ توبہ کی تعبیر بتاتی ہے کہ وہ گزشتہ نجومیوں میں گناہ کے مرتکب ہوتے تھے خواہ ریا کاری کی بنا پر یا پیغمبر کو تکلیف پہنچانے کی وجہ سے یا فقیر مومنین کو اذیت دے کر۔ اگرچہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ گفتگو نجومی کے جواز میں نہیں ہوئی لیکن اس آیت کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ پہلا حکم اٹھا لیا گیا۔ جہاں تک نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور خدا و پیغمبر کی اطاعت کرنے کا معاملہ ہے تو وہ ان امور کی اہمیت کی بنا پر ہے۔ نیز اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اس کے بعد سرگوشی کرو تو وہ ان عظیم مقاصد کے حصول کے لیے ہو اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی راہ میں ہو۔

چند نکات

۱۔ آیہ نجومی و صدقہ پر عمل کرنے والا تنہا شخص

اکثر شیعہ اور اہل سنت مفسرین نے لکھا ہے کہ اکیلا وہ شخص جس نے اس آیت پر عمل کیا وہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام تھے

جیسا کہ طبری ایک روایت میں غواجناب سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :

(آیۃ من کتاب اللہ لم یعمل بها احد قبلی ولا یعمل بها احد بعدی کان لی دینار فصرفته بعشرة دراهم فکنت اذا جئت الی النبی تصدقت بدرهم) قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جس پر نہ مجھ سے پہلے کسی نے عمل کیا ہے اور نہ کوئی میرے بعد عمل کرے گا۔ میرے پاس ایک دینار تھا۔ میں نے اسے دس درہموں میں تبدیل کر لیا۔ جس وقت میں چاہتا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجوئی کروں تو ایک درہم صدقہ میں دے دیتا۔ یہی مضمون شوکانی نے عبد الرزاق، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ سے نقل کیا ہے۔

فخر رازی نے بھی اس حدیث کو کہ وہ اکیلا شخص، جس نے مندرجہ بالا آیت پر عمل کیا، حضرت علی علیہ السلام تھے، محدثین کی جماعت کے ذریعہ ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

در المنثور میں بھی متعدد روایات مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں اسی معنی میں آئی ہیں۔ تفسیر روح البیان میں عبد اللہ ابن عمر بن خطاب سے منقول ہے کہ :

(کان لعلی ثلاث لو كانت لی واحدة منهم كانت احب الی من حمص النعم) تزویجہ فاطمہ واعطاءہ الراية لیوم خیبر وایۃ النجوى)

حضرت علی علیہ السلام کی تین ایسی فضیلتیں ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہو جاتی تو سرخ بالوں والے اڈنٹوں سے بہتر ہتی (یہ تعبیر عربوں میں گراماں ہا مال کی طرف اشارہ کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اسے ضرب النثل کے طور پر کسی چیز کے بہت ہی نفیس ہونے کے بیان کے وقت استعمال کرتے ہیں)۔ پہلی فضیلت یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شادی ان سے کرنا، دوسرے خیبر کے دن علم ان کو عطا کرنا اور تیسری آیتہ نجوی۔

حضرت علی علیہ السلام کے لیے اس عظیم فضیلت کا ثابت ہونا اکثر کتب تفسیر و حدیث میں آیا ہے اور اس طرح مشہور و معروف کہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

۱۔ طبری جلد ۲۸ ص ۱۵

۲۔ تفسیر البیان فی تفسیر القرآن جلد ۱ ص ۳۷۵۔ سید قطب نے بھی یہی روایت فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۲۱ پر نقل کی ہے۔

۳۔ تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۴۱

۴۔ در المنثور جلد ۶ ص ۱۸۵

۵۔ تفسیر روح البیان ج ۱ ص ۴۰۶ (اس حدیث کو طبری نے مجمع البیان میں، زعفرانی نے کشف میں اور قرطبی نے تفسیر جامع میں زیر بحث آیات کے ذیل میں نقل کیا ہے۔)

۲۔ نجویٰ سے پہلے صدقہ کی تشریع اور پھر نسخ کا فلسفہ

پیغمبرؐ سے نجویٰ کرنے سے پہلے وجوب صدقہ کی تشریع کیوں ہوئی اور پھر تھوڑی سی مدت کے بعد وہ کیوں منسوخ ہو گیا؟ اس سوال کا جواب مندرجہ بالا آیت اور اس کی شان نزول میں موجود قرآن سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ مقصد ان بلند بانگ دعویٰ کرنے والوں کی آزمائش تھا جو اس طریقہ سے پیغمبرؐ سے ایک خاص لگاؤ کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ معلوم ہو گیا کہ یہ لگاؤ اور محبت کا اظہار صرف اس صورت میں تھا جب تک نجویٰ مفت تھا لیکن جس وقت تھوڑا سا مال خرچ کرنا پڑ گیا تو محبت کے اظہار کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا۔ اس بات سے قطع نظر اس حکم نے مسلمانوں پر ہمیشہ اثر کیا اور ان پر واضح کر دیا کہ جب تک ضرورت نہ ہو پیغمبرؐ اور دوسرے عظیم اسلامی رہبروں کا گراں بہا وقت نجویٰ اور سرگوشی میں ضائع نہیں کرنا چاہیے اور دوسرے لوگوں کی تکلیف کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ درحقیقت یہ آئندہ کی سرگوشیوں کو قابو میں لانے کا ایک عمل تھا۔ اس بنا پر مذکورہ حکم ابتدا میں ایک عارضی و وقتی پہلو رکھتا تھا لیکن جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو وہ منسوخ ہو گیا کیونکہ اس کو برقرار رکھنا بھی مشکل پیدا کر دیتا۔ بعض اوقات ضروری مسائل پیش آتے ہیں جن میں ضروری ہوتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ انہیں پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا جائے چنانچہ اگر صدقہ کا حکم باقی رہ جاتا تو اکثر اوقات ان ضرورتوں کے تقاضے پورے نہ ہوتے اور اس طرح اسلامی معاشرہ کو نقصان پہنچتا۔

موارد نسخ میں کلی طور پر حکم ہمیشہ پہلے ہی سے محدود اور وقتی پہلو رکھتا تھا۔ اگرچہ لوگ بعض اوقات اس معنی سے آگاہ نہ ہوتے اور اسے حکم سمجھ لیتے جو ہمیشہ کے لیے ہو۔

۳۔ کیا یہ فضیلت تھی؟

اس میں شک نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں دولت مندوں کے زمرہ میں داخل نہیں تھے آپؐ کی زندگی سادہ اور زہاد نہ تھی۔ اس کے باوجود اس حکم الہی کے احترام میں اس مختصر سی مدت میں آپؐ نے چند مرتبہ صدقہ دیا اور ضروری سائل نجویٰ کے ذریعہ پیغمبرؐ کے سامنے رکھے۔ اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ مسئلہ مفسرین اور ارباب حدیث کے درمیان طے شدہ اور مسلم ہے لیکن بعض لوگ اس حقیقت کو قبول کرنے کے باوجود اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اس کے افضل ہونے کا انکار کریں۔ وہ منجملہ دیگر باتوں کے یہ کہتے ہیں کہ اگر بزرگان صحابہؓ نے یہ اقدام نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی یا ان کے پاس کافی وقت نہیں تھا یا وہ خیال کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فقر کی تکلیف و پریشانی اور اغنیاء کی وحشت کا سبب بنے۔ اس بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے یہ اقدام کسی فضیلت اور دوسروں سے سلب فضیلت کا سبب نہیں ہے۔

لیکن انہوں نے دوسری آیت کے متن پر غور نہیں کیا جس میں خدا سرزنش کے عنوان سے فرماتا ہے: (۶) اشفقتم ان تقدموا بین یدی تجواکم صدقات) "کیا تم فقر و فاقہ سے ڈر گئے ہو اور تم نے بخل کیا ہے جو نجویٰ کے لیے صدقہ نہیں دیا۔" یہاں تک کہ آیت کے ذیل میں توبہ کا ذکر آتا ہے جو واضح طور پر ان معافی پر دلالت کرتا ہے کہ صدقہ دے کر پیغمبرؐ سے نجویٰ کا اقدام کرنا ایک

پسندیدہ کام تھا ورنہ توبہ اور سزائش کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ اصحاب پیغمبرؐ میں سے جانے پہچانے افراد کی ایک جماعت اس واقعہ سے پہلے پیغمبرؐ سے نجویٰ کرتی تھی۔ (کیونکہ عام اور دور افتادہ افراد یہ اقدام بہت کم کرتے تھے) لیکن انہی مشہور صحابہ نے صدقہ کے حکم کے بعد نجویٰ کرنا پھوڑ دیا۔ وہ تنہا شخص جس نے اس حکم کا احترام کیا اور اسے عملی جامہ پہنایا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ اس میں کوئی قباحت ہوگی کہ ہم واضح آیات اور روایات کے پیش نظر جو اس سلسلہ میں مختلف اسلامی کتب میں مندرج ہیں انہیں قبول کر لیں اور کمزور و بے بنیاد احتمالات کی بنا پر ایک حقیقت کو نظر انداز نہ کریں اور عبداللہ ابن عمر کے ہمنا بن جائیں جو اس فضیلت کو حضرت فاطمہ علیہا السلام کے ساتھ تزویج اور فتح خیبر کے دن کی عمل داری سے مربوط اور حمرانعم (سُرخ رنگ کے اونٹ) سے افضل و برتر سمجھتے ہیں۔

۴۔ مدت حکم اور مقدار صدقہ

مندرجہ بالا حکم یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجویٰ کرنے سے پہلے صدقہ کا وجوب کتنی مدت پر عادی ہو کر منسوخ ہوا، اس سلسلہ میں مختلف قول نقل ہوئے ہیں۔ بعض اس کو صرف ایک گھنٹے اور بعض ایک رات تک محدود سمجھتے ہیں اور بعض اس مدت کو دس روز پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ صحیح تیسرا قول ہی ہے کیونکہ ایک گھنٹہ یا ایک رات اس قسم کے امتحانی حکم کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے، اس لیے کہ وہ غدر پیش کر سکتے تھے کہ اس مختصر سی مدت میں نجویٰ کے لیے کوئی سبب پیش نہیں آیا لیکن دس دن کی مدت حقائق کو واضح کر سکتی ہے اور اس حکم سے مختلف کرنے والوں کے لیے ملامت و سزائش کے اسباب فراہم کر سکتی ہے۔ جہاں تک صدقہ کی مقدار کا تعلق ہے تو آیت میں اس کو بیان نہیں کیا گیا اور اسلامی روایات کے مطالعہ سے بھی کوئی مقدار دستیاب نہیں ہوتی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اقدام کے لیے ایک درہم بھی کفایت کرتا تھا۔

۱۴۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَا هُمْ
مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ ۝

۱۵۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا اِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ۝

۱۶۔ اِتَّخَذُوْا اِيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ
عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝

۱۷۔ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا
اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

۱۸۔ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُوْنَ
لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلَى شَيْءٍ اَلَا اِنَّهُمْ
هُمُ الْكَٰذِبُوْنَ ۝

۱۹۔ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنۡسَاهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۝

أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۖ إِلَّا إِنْ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝

ترجمہ

- ۱۴۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے ان افراد کے ساتھ دوستی کر لی ہے جو محلِ غضبِ خدا ہیں یہ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے جھوٹی قسم کھاتے ہیں (کہ وہ تم میں سے ہیں) حالانکہ وہ خود جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔
- ۱۵۔ خدا نے ان کے لیے شدید عذاب فراہم کر رکھا ہے کیونکہ جن اعمال کو وہ انجام دیتے ہیں وہ بُرے ہیں۔
- ۱۶۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال قرار دیا ہے اور لوگوں کو خدا کی راہ سے روک رکھا ہے لہذا ان کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔
- ۱۷۔ ان کے مال و اولاد کسی طرح بھی انہیں عذاب الہی سے محفوظ نہیں رکھ سکتے وہ اصحابِ آتش ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔
- ۱۸۔ یاد کرو اس دن کو جب خدا سب کو قبروں سے اٹھائے گا وہ خدا کے لیے بھی جھوٹی قسم کھائیں گے جس طرح (آج) تمہارے لیے قسم کھاتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ (ان جھوٹی قسموں کے ساتھ) کوئی کام انجام دے سکتے ہیں۔ وہ جھوٹے ہیں۔
- ۱۹۔ شیطان ان پر غالب آچکا ہے اور خدا کی یاد ان کے دلوں سے نکال کر لے گیا ہے۔ وہ شیطان کا گروہ ہیں۔ جان لو کہ شیطان کا گروہ ہی خسارے میں ہے۔

تفسیر حزب شیطان

یہ آیات منافقین کی بعض سازشوں کو بے نقاب کرتی ہیں اور ان کی نشانیں کے ساتھ مسلمانوں سے ان کا تعارف کراتی ہیں۔ ان آیات کے بعد اس چیز کا عنوان کلام بنا شاید اس مناسبت سے ہے کہ پیغمبرؐ سے نبوی کرنے والوں میں کچھ منافق افراد بھی تھے جو اس چیز کو اپنی سازشوں پر پردہ ڈالنے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اظہارِ قرب کے لیے استعمال کرتے تھے اور یہی بات سبب بنی کہ قرآن ایک امر کلی کی شکل میں اس کو پیش کرتا ہے۔ پروردگار عالم پہلے فرماتا ہے :

”کیا تو نے ان افراد کو نہیں دیکھا جو ایسی قوم سے دوستی کی طرح ڈالتے ہیں جس پر خدا نے غضب کیا ہے۔“ الموتر الى الذين تولوا قوماً غضب الله عليهم۔ یہ مغضوب علیہم قوم واضح طور پر قوم یہود تھی جس کا سورہ مائدہ آیت ۶۰ میں اسی عنوان سے تعارف ہوا ہے۔ وہاں یہودیوں کے بارے میں پروردگار عالم فرماتا ہے :

قل هل انبئكم بشر من ذالك مثوبة عند الله من لعنه الله وغضب عليه... کہہ دے کیا تمہیں ان افراد سے باخبر کروں جن کی وضع و کیفیت اس سے زیادہ بُری ہے وہ ایسے لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور انہیں موردِ غضب قرار دیا اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

”یہ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے (یہود) (ماہر منکم ولا منہم)۔ نہ مشکلات میں اور نہ پریشانیوں میں تمہارے مددگار ہیں نہ ان کے کوئی جگہری دوست ہیں بلکہ منافق ہیں جو ہر روز رخ بدل لیتے ہیں اور ہر روز نئی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں یہ تعبیر سورہ مائدہ کی آیت ۵۱ کے ساتھ منافات نہیں رکھتی جو کہتی ہے : ومن يتولهم منكم فانه منہم۔ جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی اور محبت کرے وہ انہی میں سے ہے اس لیے کہ وہ تمہارے دشمنوں میں شمار ہوں گے اگرچہ حقیقتاً ان کا جز شمار نہ ہوں اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے : ”تم سے اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے قسم کھاتے ہیں لیکن جھوٹی قسم ہے وہ خود بخود جانتے ہیں، (و يحلفون على الكذب وهم يعلمون)۔ یہ منافقین کے طور طریقے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے قبیح اور قابلِ نفرت چہرہ کو چھپانے کے لیے جھوٹی قسموں کی پناہ لیتے ہیں جب کہ ان کا عمل ان کا بہترین تعارف کراتا ہے۔ اس کے بعد ان ہٹ دھرم منافقین پر ہونے والے عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

”خدا نے ان کے لیے عذاب شدید تیار کیا ہے۔“ (اعد الله لهم عذاباً شديداً)۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ عذاب عادلانہ ہے کیونکہ وہ بُرے اعمال بجا لاتے ہیں۔ (انهم ساء ما كانوا يعملون)۔ اس کے بعد ان منافقین کی علامتوں کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے فرماتا ہے :

”انہوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے روکے رکھیں“ (اتخذوا ايمانهم حجة فصلوا عن سبيل الله)۔
(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور سوائے اصلاح کے ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے حالانکہ اس قسم کے پردہ کے پیچھے وہ انواع و اقسام کے فساد، تخریبی کارروائیوں اور سازشوں میں مصروف ہیں اور حقیقت میں خدا کا مقدس نام لے کر راہ خدا سے روکنے کا فائدہ اٹھاتے ہیں جہاں جھوٹی قسمیں کھانا منافقین کی نشانی ہے جو یہاں کے علاوہ سورہ منافقین میں بھی ان کے اوصاف کے بیان میں پیش ہوئی ہے (سورہ منافقین) آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے :

”اس بنا پر ان کے لیے عذاب ہے“ (فلہم عذاب مہین)۔ وہ چاہتے تھے کہ ان جھوٹی قسموں کے ذریعے اپنے لیے سامان عزت فراہم کریں لیکن خدا انہیں ذلیل و خوار کرنے والے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اس نے پہلے بھی فرمایا ہے : ”ان کے لیے عذاب شدید ہے“ (اسی سورہ کی آیت ۱۵) اس لیے کہ یہ سچے مومنین کے دلوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ دونوں عذاب آخرت سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ دو مختلف اوصاف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لہذا تکرار بھی نہیں ہے کیونکہ عذاب کی تشریح ان دو صفتوں کے ساتھ قرآن مجید میں عام طور پر آخرت کے عذابوں کے سلسلہ میں آتی ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ پہلا عذاب دنیا یا قبر سے متعلق ہے اور دوسرا عذاب آخرت سے مربوط ہے اور چونکہ منافقین عام طور پر حل مشکلات کے سلسلہ میں اپنے مال اور اولاد (اقتصادی اور انسانی قوت) پر انحصار کرتے تھے لہذا قرآن بعد والی آیت میں کہتا ہے : ”ان کے مال اور اولاد انہیں عذاب الہی سے کسی طرح بھی محفوظ نہیں رکھیں گے“ (لن تغنی عنہم اموالہم ولا اولادہم من اللہ شیئاً)۔

بلکہ یہی اموال ان کی گردن میں لعنت کا طوق بن جائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب کا سبب بنیں گے، جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۰ میں ہم پڑھتے ہیں : سیطوقون ما بخلوا به يوم القيامة اور اسی طرح ان کی گمراہ اولاد ان کے عذاب کا باعث ہوگی اور اگر ان کے درمیان مومن اور نیکوکار افراد ہوں تو وہ ان سے بیزاری اختیار کرتے ہیں۔ جی ہاں قیامت کا دن ایسا دن ہے کہ جس میں خدا کی (رحمت) کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ بیکار ہو جائے گا جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۶ میں ہم پڑھتے ہیں : (و تقطعت بصر الاسباب)۔ ”ان کا ہاتھ ہر قسم کے ذریعے اور اسباب سے منقطع ہو جائے گا“ اور پھر آیت کے آخر میں اس جملہ کے ساتھ تہدید کرتا ہے۔ ”وہ اصحاب دوزخ ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے“ (اولئك اصحاب النار هم فيها خالدون)۔ اور اس طرح ان پر نازل ہونے والے عذاب کو کبھی شدید کہہ کر باعث تہدید بناتا ہے اور کبھی ”مہین“ ذلیل کرنے والا کہہ کر اور کبھی اس کا جادوانی ہونا باعث تہدید ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک منافقین کے اعمال کی وجہ سے مناسب حال ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ منافقین قیامت میں بھی اپنی منافقت سے دست بردار نہیں ہوں گے جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے ”یاد کرو اس دن کو جس میں خدا ان سب کو معوٹ کرے گا اور ان کے اعمال ان کے سامنے پیش کرے گا اور اپنی داد گاہ عدل میں ان سے سوال کرے گا لیکن وہ خدا کے سامنے بھی جھوٹی قسمیں کھائیں گے جیسی کہ وہ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔ (يوم يبعثہم اللہ) (ماہر مفسرین)

لہ جنتہ اصل میں ”جن“ (بروزن فن) کے مادہ سے کسی چیز کے پھیلنے کے معنی میں ہے اور چونکہ ڈھال انسان کو دشمن کی ضربوں کے مقابل میں بچاتی ہے

لہذا اسے جنتہ، جن اور جنتہ کہتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہاں لفظ عذاب کو مقدر سمجھا ہے اور کہا ہے کہ مراد من عذاب اللہ ہے (قرطبی، روح البیان، کشاف) لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ آیت میں کوئی چیز مقدر نہ ہو اور من اللہ سے مراد ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں پائیں گے۔

جیسا فیحلفون لہ کما یحلفون لکم۔

قیامت انسان کے اس دنیا کے اعمال اور نیتوں کی تجلی گاہ ہے اور چونکہ منافقین یہی احساسات اپنے ساتھ قبر اور برزخ میں لے کر جائیں گے لہذا میدان قیامت میں بھی آشکار ہوں گے اور باوجودیکہ وہ جانتے ہیں کہ خدا علام الغیوب ہے اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے لیکن پھر بھی پرانی عادات کی بنا پر جھوٹی قسمیں کھائیں گے۔ یہ چیز اس داد گاہ عدل الہی کے بعض موافق میں ان کے گناہوں کے اقرار کے ساتھ متصادم نہیں کیونکہ قیامت کے مختلف منازل و موافق میں ہر جگہ ایک الگ انضباط اوقات ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

”وہ گمان کرتے ہیں کہ ان جھوٹی قسموں سے وہ اپنے لیے کوئی نفع حاصل کر سکتے ہیں یا کسی نقصان کو دور کر سکتے ہیں (و یحسبون انہم علی شیء)۔ یہ ایک واسطہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن چونکہ دنیا میں انہوں نے یہ عادت بنا رکھی تھی کہ جھوٹی قسموں کے ذریعہ خطروں اور مضر چیزوں کو اپنے سے دور کریں اور فائدہ حاصل کریں لہذا یہ قبیح اور پست و پختہ عادتیں وہاں بھی اپنا اثر دکھائیں گی۔ آخر کار آیت کو اس جملہ پر ختم کرتا ہے : ”جان لو کہ وہ بھڑٹے ہیں“ (الا انہم ہم الکاذبون)۔ یہ اعلان ممکن ہے کہ دنیا کے ساتھ تعلق رکھتا یا قیامت سے مربوط ہو یا دونوں کے ساتھ ربط رکھتا ہو۔ اس طرح ان کی رسوائی کا ڈنکا ہر جگہ بج رہا ہے اور ہر جگہ منادی ہو رہی ہے آخری زیر بحث آیت میں ان تاریک دل رکھنے والے منافقین کی حقیقی سرگزشت کو اس طرح بیان کرتا ہے : ”شیطان ان پر مسلط ہو گیا ہے اور تیزی کے ساتھ ہانکتا ہے اور اس بنا پر ان کے دل سے خدا کی یاد نکال کھسے گیا ہے (استحوذ علیہم الشیطان فانساهم ذکر اللہ)۔ اسی دلیل کی رو سے ”وہ گروہ شیطان ہیں“ (اولئک حزب الشیطان)۔

آگاہ رہو کہ گروہ شیطان ہی گھانا اٹھانے والوں میں ہے۔ (الا ان حزب الشیطان هم الخاسرون)۔ ”استحوذ“ ”حوذ“ (بروزن ”موز“) کے مادہ سے ہے اور اونٹ کی ران کے پشت والے حصہ کے معنی میں ہے اور چونکہ ساربان اونٹوں کو ہنکاتے وقت ان کی رانوں کی پشت پر ضرب لگاتا ہے اس لیے یہ لفظ تسلط حاصل کرنے اور تیزی کے ساتھ ہانکنے کے لیے آیا جی ہاں بھڑٹے اور مفور منافقین باوجود مال و دولت اور مقام و منزلت کے اس کے علاوہ اور کوئی قسمت نہیں رکھتے کہ وہ شیطان کی گرفت اور اس کی خواہشات کے اختیار میں ہوتے ہیں اور وہ خدا کو کھلی طور پر بھول جاتے ہیں اور نہ صرف خدا سے منحرف ہو جاتے ہیں بلکہ شیطان کے عمال، انصار، مددگار اور لشکر کے زمرہ میں آکر دوسروں کو گمراہ کرنے والے قرار پاتے ہیں۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فتنوں اور اختلافات کے وقوع کے آغاز کے بارے میں فرماتے ہیں :

(ایہا الناس انما بدأ وقع الفتن اھواء تتبع واحکام تبتدع یخالف فیہا کتاب اللہ، یتولی فیہا رجال رجالہ فلو ان الباطل خلص لم یخف علی ذی حجی، ولو ان الحق خلص لم یکن اختلاف، ولكن یؤخذ من ہذا ضعف ومن ہذا ضعف، فیمزجان فیجیان معافھنالك استحوذ الشیطان علی اولیائہ ونجی الذین سبقت لھم من اللہ الخ)۔

”اے لوگو! فتنوں کے وقوع کا آغاز باطل آراء میں جن کی پیروی کی جاتی ہے اور ایسی باتیں ہیں جو حکم خدا کے خلاف قائم کی جاتی ہیں۔ لوگوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی دوستی میں ان

لہ ”یوم“ ظرف ہے اور ”اذکر“ محذوف سے متعلق ہے یا اس کے ماقبل یعنی لہم عذاب مہین سے یا اولئک اصحاب النار سے متعلق ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

امور میں ان کی پیروی اختیار کرتا ہے۔ اگر باطل اپنی خالص شکل میں خود نمائی کرتا تو کسی صاحب عقل کی نگاہ سے پنہاں نہ رہتا اور اگر حق باطل کی آمیزش سے پاک و صاف ہوتا تو اختلاف پیدا نہ ہوتا لیکن کچھ حصہ اس کا لے لیتے ہیں اور کچھ حصہ اس کا اور انہیں آپس میں ملا دیتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے کہ شیطان اپنے دوستوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور وہ لوگ جن کے توفیق الہی شامل حال ہے وہ ربائی پا جاتے ہیں۔ ۱

یہی تفسیر امام حسین علیہ السلام کے کلام میں کر بلا میں نظر آتی ہے۔ جس وقت اہل کوفہ کی صفوں کو اندھیری رات اور غل بچاتے ہوئے سیلاب کی طرح اپنے منبر مقابل دیکھا تو فرمایا:

”بہت بُرے لوگ ہو کہ خدا کی اطاعت اور پیغمبر پر ایمان کا اظہار کرتے ہو لیکن اب اس لیے آئے ہو کہ اولاد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرو۔“

(لقد استنحوذ علیکم الشیطان فانسا کو ذکرا للہ العظیم) شیطان نے تم پر غلبہ حاصل کر لیا ہے وہ فدائے عظیم کی یاد تمہارے دلوں سے نکال کر لے گیا ہے اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

”تم کو اور جو کچھ تم چاہتے ہو خدا نیست و نابود کر دے انا للہ وانا الیہ راجعون“

حزب الشیطان اور حزب اللہ کے بارے میں انشاء اللہ آئندہ آیات کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کریں گے۔

- ۲۰۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرُسُوْلَهٗ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ ۝
- ۲۱۔ کَتَبَ اللّٰهُ لِاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ۝ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیُّ عَزِیْزٌ ۝
- ۲۲۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَادُّوْنَ مَنْ
- حَادَّ اللّٰهَ وَرُسُوْلَهٗ وَلَوْ کَانُوْا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَاؤُهُمْ
- اَوْ اِخْوَانَهُمْ ۝ وَعَشِیْرَتُهُمْ ۝ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ
- الْاِیْمَانَ ۝ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۝ وَیُدْخِلُهُمْ جَنَّٰتٍ
- تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۝ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
- وَرَضُوْا عَنْهُ ۝ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰهِ ۝ اِلَّا اِنْ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ
- الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ

- ۲۰۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ترین افراد کے زمرہ میں ہیں۔
- ۲۱۔ خدا نے اس طرح مقرر کر رکھا تھا کہ میں اور میرے رسولؐ کامیاب ہوں گے کیونکہ خدا قوی اور ناقابل شکست ہے۔
- ۲۲۔ کسی ایسی قوم کو تو نہیں پائے گا جو خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہو اور وہ خدا اور اس کے

رسول کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کرے خواہ وہ ان کے آباؤ اجداد، اولاد، بھائی اور رشتہ دار کیوں نہ ہوں وہ ایسے لوگ ہیں جن کے صفحہ دل پر ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کی تقویت فرمائی ہے۔ انہیں جنت کے باغوں میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ خدا ان سے خوش ہے اور وہ خدا سے خوش ہیں۔ وہ اللہ کا حزب ہیں۔ جان لو کہ اللہ کا حزب ہی کامیاب ہے۔

تفسیر

حزب اللہ کامیاب ہے

گزشتہ آیات میں گفتگو منافقین اور دشمنان خدا کے بارے میں اور ان کی کچھ صفات اور علامتوں سے متعلق تھی۔ اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے ان آیتوں میں جو سورہ مجادلہ کی آخری آیات ہیں ان کی کچھ اور نشانیاں پیش کرتا ہے اور ان کی حتمی سرنوشت جو شکست بادی ہے اسے واضح کرتا ہے پہلے فرماتا ہے :

”وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ترین افراد کے زمرہ میں ہیں“

(ان الذین یحادون اللہ ورسولہ اولئک فی الاذلین)۔

بعد والی آیت حقیقت میں ان معانی کی دلیل ہے فرماتا ہے :

”خدا نے اس طرح مقرر کیا تھا کہ میں اور میرے پیغمبر ہی کامیاب ہوں گے“ (کتب اللہ لا غلبن انا ورسلی)۔ ”ایسا

کیوں نہ ہو اس لیے کہ خدا قوی اور ناقابل شکست ہے“ (ان اللہ قوی عزیز)۔ جس قدر خدا صاحب قوت ہے اتنے ہی اس کے

دشمن کمزور اور ذلیل ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ آیت میں (اذلین) کی تعبیر آئی ہے تو اس کی وجہ یہی تھی ”کتب“ (لکھا ہے)

کی تعبیر اس کامیابی کے قطعی ہونے کی تاکید ہے اور لاغلبن کا جملہ لام تاکید اور نون تفضیل کے ساتھ اس کامیابی کے موکر ہونے کی دلیل ہے

اس طرح کہ کسی شخص کے لیے کسی قسم کے شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ صافات کی آیت ۱۷۱ تا ۱۷۴

میں آئی ہے۔ (ولقد سبقت کلمتنا للعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون وان جندنا لھم الغالبون)

”ہمارا قطعی وعدہ ہمارے مرسل بندوں کے بارے میں پہلے سے مسلم ہو چکا ہے کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر تمام میدانوں

لہ۔ ”یحادون“۔ ”محاذہ“ کے مادہ سے سلج یا غیر مسلح مبارزہ کے معنی میں ہے یا ممانعت کے معنی میں ہے۔ (ہم اس سورہ کی آیت ۵ کے ذیل میں

وضاحت کر چکے ہیں)

میں کامیاب ہے۔

تاریخ کے طویل دور میں خدا کے پیغمبروں اور اس کے بھیجے ہوئے افراد کی کامیابی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوئی ہے۔ مختلف ممالک کی صورت میں مثلاً طوفانِ نوحؑ میں، صاعقہ عادیثہ میں، قومِ لوط کو تباہ و برباد کرنے والے زلزلے کی صورت میں اور اسی قسم کی چیزوں میں مختلف جنگوں میں مثلاً جنگِ بدر و حنین، فتح مکہ اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باقی غزوات میں۔ ان سب سے زیادہ اہم شیطانی مکاتبِ فکر اور حق و عدالت کے دشمنوں پر ان کی منطقی کامیابی تھی۔ یہاں ان لوگوں کے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ وعدہ قطعی تھا تو پھر کیوں بہت سے انبیاء و مرسلین، آئمہ معصومینؑ اور سچے مومنین کو ان کے دشمنوں نے شہید کیا اور وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوئے ان اعتراض کرنے والوں نے حقیقت میں کامیابی کے معنی کو صحیح طرح نہیں سمجھا۔ مثلاً ممکن ہے (تصور کریں) کہ امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں شکست کھائی اس لیے کہ آپؑ خود اور آپ کے یاور و انصار تمام کے تمام شہید ہو گئے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ اپنے اصلی مقصد تک پہنچ گئے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ بنی اُمیہ رسوا ہوں اور مکتبِ آزادی کی بنیاد رکھی جائے اور ساری دنیا کے لوگوں کو درسِ آزادی دیا جائے آپؑ نے یہ مقصد یقیناً حاصل کیا اور آپ آج بھی سرورِ شہیدانِ عالم اور جہانِ انسانیت کے رہبرِ کامل کی حیثیت سے انسانوں کے ایک عظیم طبقہ کے دلوں پر کامیابی کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں۔

اس چیز کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ یہی حکم یعنی خدائی وعدہ کے مطابق کامیابی انبیاء و اولیاء کے پیروکاروں کے بارے میں بھی ثابت یعنی ان کی کامیابی کی بھی خدا کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے جیسا کہ سورہ مؤمن کی آیت ۵۱ میں ہم پڑھتے ہیں۔ (اِنَّا لَنَنْصُرَنَّ رَسُلَنَا وَالَّذِينَ اٰمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ اَلَا نَشْهَدُ) ہم یقیناً اپنے رسولوں کی اور ایمان لانے والوں کی زندگی دنیا میں اور اس دن جب گواہ قیام کریں گے (قیامت کے دن) مدد کریں گے۔ یقیناً خدا جس کی مدد کرے وہ کامیاب ہے۔ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ خدا کا یہ حتیٰ وعدہ قید اور شرط کے بغیر نہیں ہے۔ اس کی شرط ایمان اور آئنا ایمان ہیں اس کی شرط یہ ہے کہ بندہ سستی و کمزوری کو اپنے اندر پیدا نہ کرنے دے اور مشکلات سے نہ گھبرائے اور غمگین نہ ہو جیسا کہ آل عمران کی آیت ۱۶۱ میں فرماتا ہے:

(وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمْ اَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ) اس کی دوسری شرط یہ ہے کہ تغیرات کو اپنی ذات سے شروع کرے کیونکہ خدا کسی قوم و ملت کی نعمتوں کو متغیر نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اپنے اندر تغیر پیدا نہ کریں۔ (ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكْ مَغِيْرًا لِّنَعْمَةٍ اَلْعَمٰه اَعْلٰی قَوْمٍ حَتّٰی يَغْيُرُوْا مَا بَا نَفْسُهُمْ) (انفال ۵۳) انہیں خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ اپنی صفوں کو متحد رکھیں اور اپنی قوتوں کو مجتمع کریں، نیتوں کو خالص رکھیں اور مطمئن رہیں کہ دشمن خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو وہ خود بظاہر کمزور ہوں اور تعداد میں کم ہوں لیکن آخر کار جہاد، کوشش اور خدا پر توکل کی وجہ سے وہ کامیاب ہوں گے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے مندرجہ بالا آیت کے لیے ایک شانِ نزول بیان کی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے جس وقت حجاز کی بعض آبادیوں کی فتح کو دیکھا تو انہوں نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں ایران کی فتح بھی نصیب کرے گا اس پر منافقین نے کہا کہ تم سمجھتے ہو کہ ایران درمیان میں ان تیسوں کی مانند ہیں جنہیں تم نے فتح کر لیا ہے اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس کامیابی کا ان وعدہ کیا آخری زریحِ نبیائت جو سورہ مجادلہ کی آخری اور آیاتِ قرآنی میں سب سے زیادہ سرکوبی کرنے والی آیت ہے مومنین کو باخبر کرتی ہے کہ خدا کی رحمت

اور دشمنانِ خدا کی محبت " کو ایک ہی دل میں جمع کرنا ممکن نہیں ہے لہذا وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کریں۔ اگر واقعی وہ یمن میں تو انہیں دشمنانِ خدا کی دوستی سے پرہیز کرنا چاہیئے ورنہ وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ نہ کریں۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے :

"کسی ایسے گروہ کو جو خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو تو نہیں پائے گا کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کریں چاہے وہ ان کے آباؤ اجداد، اولاد یا رشتہ دار ہوں۔ (لا تجد قومًا يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادون من حاد الله ورسوله ولو كانوا آباءهم أو ابنائهم أو اخوانهم أو عشيرتهم)۔ جی ہاں! ایک دل میں دو متضاد محبتیں جمع نہیں ہو سکتیں اور جو دو متضاد محبتوں کے حامل ہوں وہ یا تو ضعیف الایمان ہوتے ہیں یا پھر منافق ہوتے ہیں اسی لیے عزراتِ الہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ مخالف صفوں میں مسلمانوں کے عزیز و اقارب کی ایک جماعت تھی لیکن چونکہ انہوں نے اپنا رشتہ خدا سے توڑ رکھا تھا اور وہ حق تعالیٰ کے دشمنوں کی صف سے وابستہ تھے لہذا مسلمانوں نے ان سے جنگ کی یہاں تک کہ ان میں سے بہت سوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آباؤ اجداد اولاد اور رشتہ داروں کی محبت بہت اچھی چیز ہے اور انسان کے جذبِ کرم کے زندہ ہونے کی نشانی ہے لیکن جب اس محبت کا مقابلہ خدا کی محبت سے ہو تو پھر یہ محبت اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے۔ البتہ انسان کے مرکزِ محبت صرف یہی چار گروہ نہیں ہوتے جن کا ذکر مذکورہ آیت میں ہوا۔ یہ انسان کے نزدیک ترین افراد ہیں اور ان کی مثال کو پیش نظر رکھ کر باقی افراد کی کیفیت بھی واضح ہو جائے گی۔ اسی لیے زیر بحث آیت میں گفتگو بیوی، شوہر، مال و دولت، تجارت اور گھروں کے متعلق، جو مرکزِ محبت ہو سکتے ہیں، درمیان میں نہیں آئی۔ جبکہ سورہ توبہ کی آیت ۲۴ میں یہ سب امور موردِ توجہ قرار پائے ہیں خدا فرماتا ہے :

(قل ان كان آباؤكم وابنائكم واخوانكم وازواجكم وعشيرتكم واموال اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومساكن ترضونها احب اليكم من الله ورسوله وجهاد في سبيله فترضوا حتى يأتي الله بامرہ واللہ لا يهدي القوم الفاسقين) "کہہ دے اگر تمہارے باپ دادا، اولاد، بھائی اور قبیلہ اور وہ مال جو تمہارے ہاتھ لگے ہیں اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں خطرہ ہے اور وہ گھر جن سے تمہارا دلی تعلق ہے خدا اس کے پیغمبر اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر اس انتظار میں رہو کہ خدا اپنا عذاب تم پر نازل کر دے اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔"

دوسرے امور کے زیر بحث آیت میں مذکور نہ ہونے کی دوسری دلیل ممکن ہے وہ شانِ ہائے نزول ہوں جو آیت کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ منجملہ دوسری شانِ ہائے نزول کے ایک یہ ہے کہ "حاطبؓ ابن ابی بلتعہ" نے اہل مکہ کو خط لکھا اور انہیں خبردار کیا کہ ہو سکتا ہے رسولِ خدا فتح مکہ کے لیے روانہ ہوں۔ جب یہ بات کھلی، تو حاطب نے عذر پیش کیا کہ میرے عزیز و اقارب مکہ میں کفار کے جنگل میں ہیں میں نے چاہا کہ اہل مکہ کی خدمت کروں تاکہ میرے عزیز امان میں رہیں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن ابی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کا بیٹا صاحبِ ایمان تھا۔ اس نے ایک دن دیکھا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانی نوش فرما رہے ہیں تو اس نے عرض کیا کہ تھوڑا سا پانی اس برتن میں رہنے دیجئے تاکہ میں وہ اپنے باپ کو پلاؤں شاید خدا اس کے دل کو پاک کر دے۔ مختصر یہ کہ وہ جس وقت پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے ہوئے پانی میں سے بچا ہوا پانی اپنے باپ کے پاس لے کر پہنچا تو اس نے وہ پانی پینے سے انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق

ایک بہت ہی توہین آمیز جملہ کہا۔ اس کا بیٹا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے اپنے باپ کے قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ پیغمبرؐ نے اجازت نہ دی اور فرمایا اس کا لحاظ کرو لیکن دل میں اس کے اعمال سے بیزار رہو۔ اس کے بعد پروردگار عالم اس گروہ کے عظیم اجر کو پیش کرتا ہے جس کے دل مکمل طور پر عشق خدا کے قبضہ میں ہیں اور پانچ مضموعات کو بیان کرتا ہے جن میں سے بعض امداد اور توفیق کی شکل میں ہیں اور بعض نتیجہ اور انجام کار کی صورت میں۔ پہلے اور دوسرے حصہ کے سلسلہ میں فرماتا ہے: ”وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا نے ایمان کا خط ان کے دلوں کے صفحے پر کھینچ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کو تقویت پہنچائی ہے۔“ (اولئک کتب فی قلوبہم الایمان وایدہم بروح منہ)۔ واضح رہے کہ یہ امداد اور لطف الہی انسان کے لاوہ و اختیار کی آزادی کی روح سے متصادم نہیں ہوتے کیونکہ پہلے قدم، یعنی دشمنان کی محبت کو ترک کرنا، خود انہی کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے امداد ”استقرار ایمان“ کی شکل میں ان کی جانب آئی ہے۔

کیا یہ روح الہی جس سے خدا مومنین کی تائید کرتا ہے ایمان کی بنیادوں کی تقویت ہے یا عقلی دلائل میں یا قرآن ہے یا وہ خدا کا عظیم فضل جس کا نام روح ہے؟ اس سلسلے میں مختلف تفسیریں اور احتمالات بیان ہوئے ہیں اور ان سب کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ روح ایک طرح کی جدید حیات معنوی ہے جس کا فیضان خدا مومنین پر کرتا ہے۔ تیسرے مرحلہ میں فرماتا ہے: ”خدا انہیں جنت کے باغات میں داخل کرے گا جن کے درختوں اور محلوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔“ (ویدخلہم جنت تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا)۔ چوتھے مرحلے میں اضافہ کرتا ہے:

”خدا اُن سے راضی اور خوش ہے اور وہ خدا سے راضی و خوش ہیں: (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ)۔ قیامت کے مادی انعامات یعنی خور و قصور کے مقابلے میں یہ عظیم ترین روحانی اجر ہے جو مومنین کے اس گروہ کو دیا جائے گا۔ یہ گروہ احساس کرے گا کہ خدا ان سے راضی ہے۔ ان کے مجبوری کی یہ رضامندی کہ اس نے انہیں قبول کر لیا ہے اور اپنی عنایت سے انہیں نوازا ہے اور اپنی بساط قرب پر انہیں بٹھایا ہے بہترین لطف دینے والا احساس ہے جو انہیں حاصل ہوگا اور اس کا نتیجہ خدا سے ان کی مکمل خوشنودی ہے۔ جی ہاں کوئی نعمت اس دوسری نعمت کے برابر نہیں ہے۔ اور یہ دوسری نعمتوں کی کلید ہے اس لیے کہ جب خدا کسی سے خوش ہو تو جو وہ طلب کرے گا خدا اسے دے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ کریم بھی ہے اور قادر و توانا بھی کیا ہی عمدہ تعبیر ہے۔ فرماتا ہے:

”خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہیں۔“ یعنی ان کا مقام اس قدر اُونچا ہو گیا ہے کہ ان کا نام خدا کے نام کے ساتھ اور ان کی رضامندی خدا کی رضا کے پہلو بہ پہلو قرار پاتی ہے۔ آخری مرحلہ میں ایک ایسے عمومی اعلان کی شکل میں جو ایک لائق نعمت کی ترجمانی کرتا ہے، فرماتا ہے:

”وہ اللہ کی جماعت ہیں اور جان لو کہ اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہے۔“ (اولئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ہم المفلحون)۔ نہ صرف انہیں دوسرے جہان میں کامیابی اور قیامت میں انواع و اقسام کی مادی و معنوی نعمتیں حاصل ہوں گی بلکہ جیسا کہ گزشتہ آیات میں بھی آیا ہے اس دنیا میں بھی اللہ کی مہربانی سے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کریں گے اور اس دنیا کے اختتام پر بھی حق و عدالت کی حکومت ان کے قبضہ میں ہوگی۔

چند نکات

۱۔ حزب اللہ اور حزب شیطان کی اصل نشانی

قرآن مجید کی دو آیتوں میں حزب اللہ کی طرف اشارہ ہوا ہے (زیر بحث آیت اور سورہ مائدہ کی آیت ۵۶) اور ایک آیت میں حزب شیطان کی طرف اشارہ ہے۔ دونوں مواقع جن پر حزب اللہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے (حُب فی اللہ اور بُغض فی اللہ) اور اولیائے حق کی ولایت کے مسئلہ پر انحصار کرتا ہے۔ سورہ مائدہ میں مسئلہ ولایت اور خدا و رسول کی اطاعت کے وجوب کی بات کرتا ہے جس میں مذکور ہے کہ (علی) نے حالت مکہ میں زکوٰۃ دی ہے۔ (ومن یتول اللہ ورسولہ والذین آمنوا فان حزب اللہ ہم الغالبون)۔ زیر بحث آیت میں بھی دشمنان خدا کی دوستی سے قطع روابط پر تنبیہ کرتا ہے۔ اس بنا پر حزب اللہ کا خط وہی خط ولایت ہے اور خدا، پیغمبر اور اس کے اوصیاء کے دشمنوں سے قطع تعلق کا خط ہے۔ اس کے مقابلے میں حزب شیطان کے تعارف کے وقت جس کی طرف اس سورہ کی گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے اس کی جو واضح ترین نشانیاں بتاتا رہ نفاق، حق سے دشمنی، یا خدا کی فراموشی، تجھوٹ اور فریب ہیں۔ قابل توجہ یہ ہے کہ ایک موقع پر کہتا ہے: (فان حزب اللہ ہم الغالبون) اور دوسری جگہ فرماتا ہے: (الا ان حزب اللہ ہم المفلحون) اس طرف توجہ کرنے سے کہ فلاح بھی دشمن کے مقابلے میں کامیابی اور ان پر غلبہ کے ہمراہ ہے۔ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ دونوں آیتوں کا مفہوم ایک مربوط صورت میں اس امر کے ساتھ ظاہر ہے کہ فلاح و رستگاری غلبہ و کامیابی کی نسبت زیادہ گہرا مفہوم رکھتی ہے اس لیے کہ وہ مقصد تک پہنچنے کو بھی مشخص کرتی ہے۔ اس کے برعکس حزب شیطان کا تذکرہ اس کی شکست، اس کے نقصان اور مقاصد میں ناکامی کے حوالے سے کرتا ہے۔ مسئلہ ولایت، ولایت خاص معانی میں اور "حُب فی اللہ اور بُغض فی اللہ" عام معانی میں ایک ایسا مسئلہ ہے کہ روایات اسلامی میں اس کی بہت تاکید ملتی ہے۔ یہاں ہم کہ حضرت سلمان فارسیؓ امیر المومنینؓ سے عرض کرتے ہیں کہ جب بھی میں پیغمبرؐ کی خدمت میں گیا تو انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"کہ لے سلمان! یہ شخص اور اس کا گروہ کامیاب ہے۔ (یا ابا الحسن ما اطلعت علی رسول اللہ الا خرب بین ھکتنی وقال یا سلمان ھذا و حزبہ ہم المفلحون)۔"

دوسرے مورد میں یعنی ولایت عامہ کے سلسلہ میں ایک حدیث پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمیں ملتی ہے:

(ود المؤمن للمؤمن فی اللہ من اعظم شعب الایمان)

ایک مومن کی دوسرے مومن سے برائے خدا خوشنودی اہم ترین شعبہ ایمان ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ پر وحی کی کہ کیا کوئی عمل میرے لیے بھی انجام دیا ہے۔ عرض کیا: جی ہاں میں نے

تیرے لیے نماز پڑھی ہے، روزہ رکھا ہے اتفاق کیا ہے اور تجھے یاد کرتا رہا ہوں۔ فرمایا:

نماز تیرے لیے حق کی نشانی تھی۔ روزہ جہنم کی آگ کے مقابلے میں سپر تھا۔ اتفاق محشر کے لیے سایہ

اور ذکر نور ہے۔ لے موسیٰ میرے لیے تم نے کونسا عمل کیا ہے؟

۱۔ یہ حدیث تفسیر برہان میں اہل سنت کی کتب سے نقل ہوئی ہے۔ (برہان جلد ۴ ص ۳۲۱)

۲۔ اصول کافی جلد ۲ باب حب فی اللہ حدیث ۳۔

عرض کیا خداوند! خود تو اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرما۔ فرمایا:

(اهل وائیت لی ولیا و اهل عادیت لی عدوا قط فعلم موسیٰ ان افضل الاعمال الحب فی الله والبغض فی الله)

کبھی میرے لیے کسی سے محبت کی ہے اور میری خاطر کسی سے دشمنی کی ہے یہ وہ مقام کہ حضرت موسیٰؑ سمجھ گئے کہ افضل ترین عمل حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے اللہ کے لیے دوستی اور اللہ کے لیے دشمنی۔

ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

(لا یصحض رجل الا یمان بالله حتی یكون الله احب الیه من نفسه وابیه وامه وولده واهله وماله ومن الناس کلهم)

”کسی شخص کا اللہ پر ایمان کامل نہیں ہوتا تا وقتیکہ خدا اس کو اس کی جان، اس کے ماں باپ، اولاد، اہل خانہ اور اس کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔“

اس عنوان کے ماتحت اثبات کی سمت بھی، یعنی دوستانہ خدائے دوستی اور نفی کی سمت میں بھی دوستانہ خدائے دشمنی سے روایات بہت زیادہ ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اس گفتگو کو امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک پُر معنی حدیث پر ختم کر دیں۔ آپؑ نے فرمایا ہے:

(اذا اردت ان تعلم ان فیک خیرا فانظر الی قلبک فان کان یحب اهل طاعة الله عز وجل و یبغض اهل معصيته ففیک خیر والله یحبک وان کان یبغض اهل طاعة الله و یحب اهل معصيته، لیس فیک خیر والله یبغضک والمرمع من احب)۔

اگر یہ جاننا چاہو کہ تم ایک اچھے انسان ہو تو اپنے دل میں جھانک کر دیکھو اگر وہ اللہ کی اطاعت کرنے والوں کو دوست اور اس کے نافرمانوں کو دشمن رکھتا ہے تو جان لو کہ تم اچھے انسان ہو اور خدا بھی تمہیں دوست رکھتا ہے اور اگر تمہارا دل خدا کی اطاعت کرنے والوں کو دشمن اور اس کی معصیت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے تو پھر تم میں کوئی غُلبہ نہیں اور خدا تم سے دشمنی رکھتا ہے اور انسان ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا ہے جسے وہ دوست رکھتا ہے۔

۲۔ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا اجر

جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھا ہے کہ خدا نے ان لوگوں کے لیے جو اس کے عشق کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور تعلق کو اس سے لگاؤ کے ماتحت قرار دیتے ہیں، اس کے دوستوں کو دوست اور اس کے دشمنوں کو دشمن قرار دیتے ہیں، پانچ عظیم اجر مقرر کیے ہیں جن میں سے تین اجر تو اسی دنیا میں عطا کرتا ہے اور دو اجر قیامت میں عطا فرمائے گا۔ اس جہان کی پہلی نعمت ایمان کا ان کے دلوں میں قرار

ثبات ہے۔ خدا ان کے دلوں میں ایمان کا نقش اس طرح مرتسم کرتا ہے کہ حوادث کے ہاتھ اور زندگی کے طوفان اسے محو نہیں کر سکتے اور قطع نظر اس سے ایک نئی روح سے ان کو تقویت دیتا ہے اور تیسرے یہ کہ انہیں اپنے حزب میں شمار کرتا ہے اور دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی عطا کرتا ہے۔ آخرت میں بہشتِ جادواں اپنی تمام نعمتوں کے ہمراہ ان کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی مطلق خوشنودی و رضائی کا اعلان کرتا ہے۔ ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

(مامن مؤمن الا و لقلبہ اذنان فی جوفہ اذن یفث فیہا الوسواس الخناس و اذن یفث فیہا الملک فیؤید اللہ المؤمن بالملک فذلک قولہ و اید یھو بروح منہ)

ہر مومن کے دل کے دو کان ہیں ایک وہ جس میں " وسواس خناس " پھونک مارتا ہے اور دوسرے کان میں ملک پھونک مارتا ہے۔ خدا مومن کو فرشتے کے ذریعہ تقویت دیتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق فرماتا ہے : (و اید یھو بروح منہ)

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کی تفسیر کے سلسلہ میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

(اذا زفی الرجل فارقہ روح الایمان)

جب انسان زنا کرتا ہے تو اس وقت روحِ ایمان اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ یہ روحِ ایمان وہی ہے جس کے متعلق خدا نے قرآن میں فرمایا ہے : (و اید یھو بروح منہ)

مندرجہ بالا احادیث سے روحِ ایمان کی وسعت اور روحِ انسانی کے اعلیٰ مرتبہ اور شمولِ فرشتہ کے بارے میں وضاحت ہوتی ہے۔ یہ آیات اس حقیقت کو بھی بتاتی ہیں کہ روحِ ایمان کے اس مرتبہ کے ہوتے ہوئے انسان شراب غوری اور اس قسم کے دوسرے گناہوں کا مرتکب نہیں ہوتا۔

خداوند ! اگر تو ہمیں یہ روحِ ایمان عطا کر دے تو اپنے کمزور اور ضعیف بندوں پر تیرا احسان عظیم ہو گا۔ اس کے بعد انہیں کوئی غم نہیں رہے گا۔ پروردگار ! ہمیں اپنے دوستوں کی دوستی اور اپنے دشمنوں کی دشمنی کی توفیق عطا فرما اور اپنے دشمنوں کی دوستی اور دوستوں کی دشمنی سے محفوظ فرما۔ بارالہ ! تو نے سچے مومنین سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے اور انہیں حزب اللہ شمار کیا ہے۔ ہمیں اس حزب میں داخل ہونے کی اجازت

رسمت فرما اور اپنی کامیابی ہمارے شامل حال فرما (امیں یا ارحم الراحمین)

اختتام ترجمہ ۳۰ شوال بروز ہفتہ ۱۴۰۷ھ
مطابق ۲۷ جون ۱۹۸۷ء بوقت بارہ بجے دن برمکان
حقیر قلم المقدسہ کوئے حبشیہ علی سلطان محمد شریف ایلان

سورۃ مجادلہ کا اختتام
جمعہ ۸ شعبان ۱۴۰۶ھ

۶۔ سُورَہ حَشْرُ

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا۔
اس میں ۲۴ آیتیں ہیں

شروع جمعہ ۸ شعبان ۱۲۰۶ھ ق
۲۹ / ۱ / ۱۳۶۵ھ ش

سے اس
اور یہ گزشتہ
واضح نمونہ

تبلیغ کے
فلسفہ یہود اور
میں یہودیوں
مذہب بالاء
کی تاثیر کا یہ
کے اہم حصے
۳۱
سج ہونے
بعض مفسرین

سُورۂ حشر کے مضامین

یہ سُورہ زیادہ تر مسلمانوں اور یہود بنی نظیر کی لڑائی سے متعلق بیانات پر مشتمل ہے اور آخر کار ان کے مدینہ سے اخراج یعنی ان کے وجود سے اس مقدس سرزمین کے پاک ہو جانے پر ختم ہوتا ہے، اس لیے یہ قرآن مجید کے بیدار کرنے والی اور بھنجوڑنے والی اہم سورتوں میں سے ایک ہے اور یہ گزشتہ سُورہ کی آخری آیات سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے جن میں حزب اللہ سے کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے اور فی الحقیقت یہ کامیابی کا ایک واضح نمونہ ہے۔

اس سُورہ کے مشمولات کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلے حصہ میں صرف ایک آیت ہے جو اس سُورہ کے مختلف مباحث کے لیے دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں پروردگار علیم و حکیم کی اس تسبیح کے بارے میں گفتگو ہے جو تمام موجودات بجالاتے ہیں۔ دوسرے حصہ میں دوسرے لے کر دس تک کل نو آیتیں ہیں یہ مسلمانوں کی مدینہ کے عہد میں یہودیوں سے لڑائی کے واقعہ کو بیان کرتی ہیں۔ تیسرا حصہ جو آیت گیارہ سے لے کر سترہ تک محیط ہے، منافقین کے بارے میں ہے جو اس اقدام میں یہودیوں سے ساز باز رکھتے تھے۔ چوتھا حصہ جو چند آیتوں سے زیادہ نہیں تمام مسلمانوں کے لیے پند و نصائح کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہے اور درحقیقت مندرجہ بالا واقعہ سے نتیجہ اخذ کرنے کے مترادف ہے۔ پانچویں حصہ میں صرف ایک آیت ہے اس میں قرآن کی توصیف یلغ ہے اور پاکبازی میں رُوح کی تاثیر کا بیان ہے۔ چھٹے اور آخری حصہ میں بائیس سے لے کر چوبیس تک تین آیتیں ہیں اس میں خدا کے اوصاف جلال و جمال اور اس کے اسمائے حسنی کے اہم حصہ کا بیان ہے۔ یہ حصہ اللہ کی معرفت کے سلسلہ میں انسان کی نہایت عمدہ انداز میں مدد کرتا ہے۔

اس سُورہ کا نام اس کی دوسری آیت سے ماخوذ ہے جس میں مدینہ سے یہودیوں کے کوچ کرنے کے لیے جمع ہونے اور مسلمانوں کے اس امر کے لیے محسوس کرنے کا ذکر ہے کہ یہودیوں کو مدینہ سے نکالا جائے۔ یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس حشر (جمع ہونے) کا قیامت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے اس سُورہ کا نام سورہ بنی نظیر بتایا ہے کیونکہ اس کا زیادہ حصہ انہی کے بارے میں ہے۔ بالآخر یہ سُورہ بھی مسجحات میں سے ایک ہے۔

یعنی اُن سورتوں میں سے ایک ہے جو خدا کی تسبیح سے شروع ہوتی ہیں اور یہ ایک خُسن اتفاق ہے کہ اس سورہ کا اختتام بھی تسبیح الہی پر ہوا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔ منجملہ دیگر فضیلتوں کے ایک فضیلت کے بارے میں ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ملتے ہیں:

(من قرأ سورة الحشر لم يبق جنة ولا نار ولا عرش ولا كرسى ولا حجاب ولا السموات السبع ولا الارضون السبع والهوام والرياح والطير والشجر والدواب والشمس والقمر والملئكة الا صلوا عليه واستغفروا له وان مات من يومه او ليومته مات شهيداً)

جو شخص سورہ حشر پڑھے تو جنت و دوزخ، عرش و کرسی، حجاب، ساتوں آسمان، ساتوں زمینیں، حشرات الارض، ہوائیں، پرندے، درخت، چلتے پھرتے ہوئے جاندار چاند اور سورج اور ملائکہ سب اس کے لیے دُعائے مغفرت کریں گے اور وہ اگر اس دن یا رات فوت ہو جائے تو شہید شمار ہوگا۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

من قرأ اذا امسى الرحمن والحشر وكل الله بداره ملكا شاهداً سيفه حتى يصبح)

جو شخص سورہ الرحمن اور سورہ حشر غروب آفتاب کے وقت پڑھے تو خدا ایک فرشتے کو ننگی تلوار کے ساتھ اس کے گھر کی حفاظت پر مامور کرے گا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام آثار اس سورہ کے مضامین میں غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ غور و فکر اس کی قرأت کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے اور انسانی زندگی پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ
هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ
دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ أَنْ يَخْرُجُوا وَظَنُّوا
أَنْهُمْ مَالِغَتُهُمْ حُصُونُهُمْ مِنَ اللَّهِ فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ
حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُونَ
بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِ الْمُؤْمِنِينَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِ
الْأَبْصَارِ ۝

وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝
ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِيْنَةٍ أَوْ نَزَعْتُمْ مِنْهَا قَائِمَةً عَلَى أَصُولِهَا

فَبَاذِنِ اللَّهُ وَلِيْخَزِيْهِ الْفٰسِقِيْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کی تسبیح کرتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔
- ۲۔ وہی ہے جس نے اہل کتاب کفار کو مسلمانوں سے پہلے مقابلہ میں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تم گمان نہیں کر سکتے تھے کہ وہ خارج ہوں گے اور وہ خود بھی گمان کرتے تھے کہ ان کے مستحکم قلعے انہیں عذاب الہی سے مانع ہوں گے لیکن خدا نے جہاں سے وہ گمان نہیں کرتے تھے ان کو آ لیا۔ اور ان کے دل میں خوف ڈال دیا اس طرح سے کہ وہ اپنے گھروں کو خود بھی ویران کرتے اور مومنین بھی ان کو ویران کرتے تھے۔ پس اے آنکھوں والو عبرت حاصل کرو۔
- ۳۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ خدا نے جلا وطنی ان کے لیے مقرر کر دی تھی تو وہ ان پر اس دنیا میں عذاب نازل کرتا اور ان کے لیے آخرت میں بھی آگ کا عذاب ہے۔
- ۴۔ یہ اس بنا پر ہے کہ انہوں نے خدا اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی کی اور جو خدا کے ساتھ دشمنی کرے تو عذاب الہی اس کے لیے شدید ہے۔
- ۵۔ کھجور کا ہر قیمتی درخت جو تم نے قطع کیا یا اسے اس کی جگہ برقرار رکھا سب کچھ خدا کے فرمان سے تھا، تاکہ خدا فاسقوں کو رُسوا کرے۔

شان نزول

مفسرین و محدثین و ارباب تاریخ نے ان آیات کے بارے میں ایک مفصل شان نزول بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ مدینہ میں یہودیوں کے تین قبیلے رہتے تھے، بنی نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع، کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً اہل حجاز نہ تھے لیکن چونکہ اپنی مذہبی کتب میں انہوں

نے پڑھا تھا کہ:

جس وقت رسول:

دوسری ہمد شکو

کہ پہنچا۔ وہ اور:

لہذا ہوسنیان چالید

ہمد و پیمان کو شکو

دین کے قریب پہنچتے

پیغمبر اسلام صلی

کہ کہیں ایسا نہ

لے کعب بن ا

موقع اس شخص کے

پھر اس پر پھینک

صلی اللہ علیہ وآلہ

دینہ جائیں گے

پہاں دشمنی واضح

پیغمبر اسلام صلی

ان دجر سے کہ

اس نے کعب کو قتل

مسلمان اس ہمد

نالاکی اور دروازہ

نالاکی دے جائیں

نالاکی کر آئے

نالاکی و حرکت

نالاکی و سلم آ

نالاکی جواب

نالاکی کہا کہ وہ

نالاکی جماعت

نے پڑھا تھا کہ ایک پیغمبر مدینہ میں ظہور کرے گا لہذا انہوں نے اس سرزمین کی طرف کوچ کیا اور وہ اس عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں تھے۔ جس وقت رسول خداؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپؐ نے ان کے ساتھ عدم تعرض کا عہد باندھا لیکن ان کو جب بھی موقع ملا انہوں نے یہ عہد توڑا۔ دوسری عہد شکنیوں کے علاوہ یہ کہ جنگ اُحد کے بعد (جنگ اُحد ہجرت کے تیسرے سال واقع ہوئی) کعب بن اشرف چالیس سواروں کے ساتھ گر چہا۔ وہ اور اس کے ساتھی سب قریش کے پاس گئے اور ان سے عہد کیا کہ سب مل کر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جنگ کریں۔ اس کے بعد اوسمان چالیس مکی افراد کے ساتھ اور کعب بن اشرف ان چالیس یہودیوں کے ساتھ مسجد الحرام میں وارد ہوئے اور انہوں نے خانہ کعبہ کے پاس اپنے اردو بیان کو مستحکم کیا۔ یہ خبر بذریعہ وحی پیغمبر اسلامؐ کو مل گئی دوسرے یہ کہ ایک روز پیغمبر اسلامؐ اپنے چند بزرگ اصحاب کے ساتھ قبلہ بنی نضیر کے پاس آئے یہ لوگ بڑے قریب پہنچے تھے پیغمبر اسلامؐ کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ بنی عامر کے مقتدیوں کی دیت ادا کرنے کے سلسلہ میں جو عمر بن امیہ (ایک صحابی) کے قتل ہو گئے تھے ان سے مدد فرمیں۔ پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کا مقصد حقیقی یہ تھا کہ آپؐ اس طرح بنو نضیر کے حالات قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اس لیے کہ انہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان غفلت کا شکار ہو کر دشمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں۔ پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود کے قلعہ کے باہر تھے۔ آپؐ نے کعب بن اشرف سے اس سلسلہ میں بات کی۔ اسی دوران یہودیوں کے درمیان سازش ہونے لگی۔ وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ایسا عہد رقع اس شخص کے سلسلہ میں دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اب جب کہ یہ تمہاری دیوار کے پاس بیٹھا ہے ایک آدمی پھت پر جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس پر پھینک دے اور ہمیں اس سے نجات دلا دے۔ ایک یہودی جس کا نام عرب بن جاش تھا، نے آمادگی ظاہر کی وہ پھت پر چلا گیا۔ رسول خداؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذریعہ وحی باخبر ہوئے اور وہاں سے اٹھ کر مدینہ آ گئے۔ آپؐ نے اپنے اصحاب سے کوئی بات نہیں کی ان کا خیال تھا کہ پیغمبرؐ لوٹ کر مدینہ جائیں گے ان کو معلوم ہوا کہ آپؐ مدینہ پہنچ گئے چنانچہ وہ بھی مدینہ پلٹ آئے یہ وہ منزل تھی کہ جہاں پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہودیوں کی بال شکنی واضح و ثابت ہو گئی۔ آپؐ نے مسلمانوں کو جنگ کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ بنی نضیر کے ایک شاعر نے پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو کہی اور آپؐ کے بارے میں بدگوئی بھی کی۔ ان کی یہ بیانیہ شکنی کی یہ ایک اور دلیل تھی۔ پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دھم سے کہ ان پر پہلے سے ایک کاری ضرب لگائیں محمد بن مسلمہ کو جو کعب بن اشرف رئیس یہود سے آشنائی رکھتا تھا، حکم دیا کہ وہ کعب کو قتل کر دے۔ ان کے کعب کو قتل کر دیا۔ کعب بن اشرف کے قتل ہو جانے نے یہودیوں کو متزلزل کر دیا۔ اُس کے ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ ہر سال ان عہد شکن قوم سے جنگ کرنے کے لیے چل پڑے۔ جس وقت وہ اس صورت حال سے باخبر ہوئے تو انہوں نے اپنے مضبوط و مستحکم قلعوں میں آلا اور دروازے بند کر لیے۔ پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ چند کھجوروں کے درخت جو قلعوں کے قریب ہیں کاٹ دیے جائیں تاکہ وہ دیوے جائیں۔ یہ کام غالباً اس مقصد کے پیش نظر ہوا کہ یہودی اپنے مال و اسباب سے بہت محبت رکھتے تھے وہ اس نقصان کی وجہ سے قلعوں سے نکل کر آگے سامنے جنگ کریں گے۔ مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ کاٹے جانے والے کھجوروں کے یہ درخت مسلمانوں کی نکل و حرکت میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔ لہذا انہیں کاٹ دیا جانا چاہیے تھا۔ بہر حال اس پر یہودیوں نے فریاد کی۔ انہوں نے کہا: ”اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؐ تو ہمیشہ اس قسم کے کاموں سے منع کرتے تھے یہ کیا سلسلہ ہے؟ تو اس سورہ کی مندرجہ بالا آیات میں سے پانچویں آیت نازل ہوئی۔ انہیں جواب دیا کہ یہ ایک مخصوص حکم الہی تھا۔ محاصروں نے کچھ دن طول کھینچا اور پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خول ریزی سے پرہیز کرتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ مدینہ کو خیر باد کہہ دیں اور کہیں دوسری جگہ چلے جائیں۔ انہوں نے اس بات کو قبول کر لیا۔ کچھ سامان اپنا لے لیا اور کچھ چھوڑ دیا۔ ان کا معیت ”اذرعات“ شام کی طرف اور ایک مختصر سی تعداد خیبر کی طرف چلی گئی۔ ایک گروہ حیرہ کی طرف چلا گیا۔ ان کے چھوڑے ہوئے اموال زمینیں

کر کیا۔

لئے

میا۔

نیں

اب

ساتھ

تھا

مدینہ

انہوں

باغات اور گھر مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ چلتے وقت بتنا ان سے ہو سکا انہوں نے اپنے گھر توڑ پھوڑ دیے۔ یہ واقعہ جنگ احد کے چھ ماہ بعد اور ایک گروہ کے نظریہ کے مطابق جنگ بدر کے چھ ماہ بعد ہوا۔

تفسیر

یہود بنی نظیر کی مدینہ میں سازش کا خاتمہ

یہود خدا کی تسبیح و تعزیر اور اس کی عزت و حکمت کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

”جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کی تسبیح کرتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔“ (سبح لله ما فی السماوات وما فی الارض وهو العزیز الحکیم) یہ درحقیقت یہود بنی نظیر کی سرگزشت کے بیان کی تہید ہے۔ یہ لوگ خدا اور اس کی صفات کی معرفت کے سلسلہ میں الزام و اقسام کی تحریروں کا شکار تھے انہیں اپنی قوت و عزت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ زمین و آسمان کے موجودات کی عمومی تسبیح، عام اس سے کہ تسبیح کرنے والے فرشتے ہوں یا انسان یا حیوانات و جمادات و نباتات، ممکن ہے کہ زبان قال کے ساتھ ہوا پھر زبان حال کے ساتھ، اس لیے کہ حیران کن نظام جو ہر ذرہ کی تخلیق میں مصروف کار ہے وہ زبان حال سے خدا کے علم و قدرت اور اس کی عظمت کو بیان کرتا ہے پھر علماء کی ایک جماعت کے نظریہ کے مطابق ہر موجود اپنے وجود میں عقل و ادراک و شعور کا ایک حصہ رکھتا ہے اگرچہ ہم اس سے آگاہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام وجود اپنی زبان سے خدا کی تسبیح کرتے ہیں اگرچہ ہمارے کان ان کے سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ تمام عالم میں اس کی تسبیح و حمد کا غلغلہ ہے۔ اگرچہ ہم اس سے بے خبر ہیں لیکن وہ جو صحیح معنی میں زندہ ہیں اور پتھر نہیں ہیں ان کو غیب کے سلسلہ میں ایک چشم بنا عطا ہوئی ہے وہ عالم کے تمام موجودات کے رازدار ہیں وہ پانی اور مٹی کے نطق کو ابھی طرح سننے میں۔ یہ نطق اہل دل کو محسوس ہوتا ہے۔

بہ ذکرش ہر چہ خواہی در خروش است دلے داند چنین معنی کہ گوش است

نہ بلبل بر گلش تسبیح خوان است کہ ہر خارے بہ توحیدش زبان است

جس کو تو دیکھے گا وہ اس کی تسبیح میں مصروف ہے لیکن اسے وہ سن سکتا ہے جسے خدا نے کان عطا کیے ہیں۔ نہ صرف بلبل اپنے بلبل کو دیکھ کر تسبیح کر رہا ہے بلکہ ہر خار اس کی توحید کی زبان ہے۔

اس سلسلہ میں مزید تشریح سورہ اسرہ کی آیت ۴۴ کے ذیل میں آچکی ہے (جلد ۶ ص ۵۷۵ تا ۵۸۲)۔ اس تہید کو بیان کرنے کے بعد مدینہ کے بنو نظیر کے ٹکٹنے کی داستان بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”خدا وہی ہے جس نے اہل کتاب کفار کو مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلے اجتماع میں ہجرت کے گھروں سے نکالا۔“ (هو الذی اخرج الذی کفروا من اهل الکتاب من ديارهم لاول الحشر)۔ ”حشر“ اصل میں کسی گروہ کو میدان جنگ یا اسی قسم کی کسی دوسری جگہ کی طرف بھیجنے کے معنی میں ہے۔ یہاں اس سے مراد مسلمانوں کا اجتماع اور مدینہ سے یہودیوں کے قلعوں کی طرف چل پڑنا ہے یا یہودیوں کا مسلمانوں سے لڑنے کے لیے اکٹھا ہونا ہے۔ چونکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ پہلا اجتماع تھا لہذا قرآن میں اسے ”اول الحشر“ کا عنوان دیا گیا ہے اور یہ خود ایک لطیف تشبیہ

یہودی نظیر اور یہود خیبر سے مقابلہ کی طرف۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے سلسلہ میں کئی ایسے احتمال پیش کیے ہیں جو آیت کے نفس مضمون سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ دوسرے احتمالات میں سے ایک یہ ہے کہ حشر اول سے مراد روز قیامت کا حشر ہے، جب قبروں سے محشر کی طرف رجوع ہوگا۔ زیادہ عجیب یہ ہے کہ بعض نے اس آیت کو اس امر کی دلیل قرار دیا ہے کہ قیامت میں حشر سرزمین شام میں واقع ہوگا کیونکہ یہودی مدینہ سے نکل کر شام کی طرف گئے تھے۔ یہ تمام ضعیف احتمال لفظ حشر سے پیدا ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ لفظ حشر قیامت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق ہر قسم کے اجتماع، قرار گاہ سے نکلنے اور میدان میں حاضر ہونے پر ہوا ہے۔ جیسا کہ سورہ نمل کی آیت ۱۷ میں ہم دیکھتے ہیں: (وحشوا لسلیمان جنودہ من الجن والانس والطیئ) سلیمانؑ کا لشکر جن و انس اور پرندوں میں سے ان کے پاس جمع ہوا۔ اسی (روحانی جادوگر)وں سے حضرت موسیٰؑ کے مبارزہ کے مشاہدہ کے لیے اجتماع کے بارے میں ہمیں ملتا ہے کہ: (وان یحشر الناس ضحیٰ)۔ ہماری قرار داد یہ ہے کہ جس وقت دن چڑھے سب لوگ جمع ہوں۔ (ظہ - ۵۹)۔

اس کے بعد مزید کتاب ہے: "تم ہرگز یہ گمان نہ کرتے تھے کہ وہ اس مقام سے چلے جائیں گے اور وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ ان کے سختی قلعے کشت اور عذاب الہی سے انہیں محفوظ رکھیں گے۔ (ما ظننتم ان یدخرجوا وظنوا انھو مانعتھم حصونھم من اللہ)۔ وہ اس امر مغرور اور اپنی ذات سے رضامند تھے کہ ان کی تکیہ گاہ ان کے مضبوط قلعے اور ان کی ظاہری قوت تھی۔ آیت کا یہ انداز بیان بتاتا ہے کہ بنو نضیر کے یہودی مدینہ میں وسیع وسائل کے حامل تھے اور ان کے پاس بہت ساز و سامان تھا۔ اس طرح نہ وہ خود باور کرتے تھے کہ آسانی کے ساتھ مغلوب ہوں گے نہ دوسرے لوگ یقیناً چونکہ خدا چاہتا تھا کہ سب پر واضح کر دے کہ اس کے ارادہ کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی یہاں تک کہ ایک واقعہ ہوئے بغیر انہیں اس سرزمین سے نکال دیا اس لیے اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے:

"لیکن خدا اچھا ہے انہیں گمان نہیں تھا ان کو آلیا اور ان کے دل میں خوف ڈالا اس طرح سے کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے لے کر گئے۔ (فاتناھم اللہ من حیث لم یحتسبوا وقذف فی قلوبھم الرعب یخربون بیوتھم بایدیھم وایدی المؤمنین)۔ جی ہاں خدا نے اس غیر مرئی (نظر نہ آنے والا) لشکر یعنی خوف کے لشکر کو جسے بہت سی جنگوں میں مؤمنین کی مدد کے لیے بھیجتا تھا ان کے دلوں پر مسلط کیا اور ان سے ہر قسم کے مقابلہ کی طاقت بھین لی۔ انہوں نے اپنے آپ کو بیرونی لشکر کے مقابلہ کے لیے تیار کیا تھا۔ وہ اس سے بے خبر تھے کہ خدا ان کے اندر سے ایک لشکر ان کے لیے بھیجے گا اور اس طرح انہیں ایک تنگ گلی میں بند کر دے گا کہ وہ خود دشمن سے مل کر ان کا تخریب کاری اور ویرانی میں مدد کریں گے۔ ٹھیک ہے کہ ان کے رئیس کعب بن اشرف کے مارے جانے نے اس واقعہ سے پہلے ان کے دل میں ایک طرح کی وحشت پیدا کر دی تھی، لیکن یہ طے ہے کہ آیت سے مراد یہ نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے گمان کیا ہے بلکہ یہ ایک قسم کی روحانی امداد تھی جو بارہا اسلامی جنگوں میں مسلمانوں کی مدد کے لیے سامنے آئی ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ مسلمان باہر سے ان کے گھروں کو تباہ کرتے تھے اور اندر جلتے کاراستہ پائیں اور یہودی انہیں اندر سے ویران کرتے تھے تاکہ وہ مکان صحیح و سلامت مسلمانوں کے ہاتھ نہ آئیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ ان کے استحکام کا ویران ہونا تھا۔ اس آیت کے بارے میں کچھ اور تفاسیر بھی پیش کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہودی اندر سے اپنے مکانوں کی دیواروں کو توڑتے تھے کہ بھاگ کھڑے ہوں اور مسلمان باہر سے توڑتے تھے کہ ان پر قبضہ کر سکیں (لیکن یہ احتمال بعید ہے)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت کا معنی کنایہ رکھے گئے ہیں۔ جیسے کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص نے اپنا گھر اور اپنی زندگی اپنے ہاتھ سے تباہ کی یعنی نادانیوں اور کج فہمیوں کی وجہ سے اپنی اہل کے برباد ہونے کا سبب بنا۔ یا یہ کہ یہودیوں کا بعض گھروں کو ویران کرنے سے مقصد یہ تھا کہ قلعوں کے اندر کے کوچوں کے دھانے بند کر دیں تاکہ

یہودی

لعنہم

کا حکم

ذات کی

یاد دہانی

بیان کرتا

ن ہیں

کی تسبیح

ہوتی ہے

بنی نضیر

بعد میں

لذی

رف بھیجے

کے لیے

بیشک

مسلمان اندر نہ آسکیں اور آئندہ یہاں رہائش اختیار نہ کر سکیں؛ یا یہ کہ قلعوں کے اندر کے کچھ گھر انہوں نے غراب کیے تاکہ اگر قلعہ کے اندر کا حصہ میدان جنگ بن جائے تو جنگ کرنے کے لیے کافی جگہ موجود ہو؛ یا یہ کہ بعض گھروں کی تعمیر میں گراں قیمت اشیاء صرف ہوئی تھیں۔ انہوں نے گھروں کو خراب کیا تاکہ جو کچھ اٹھانے کے قابل ہو اسے اٹھا کر لے جائیں لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ آیت کے آخر میں ایک مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو“ (فاعتبروا یا اولی الابصار)۔ ”اعتبروا“ کے اعتبار کے مادہ سے اصل میں عبور سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی ایک چیز سے گزر کر دوسری چیز کی طرف جانا ہے۔ یہ جو اشکب چشم کو ”عبور“ کہا جاتا ہے آنسوؤں کے قطروں کا آنکھ کو عبور کرنے کی بنا پر ہے اور عبارت کو اس بنا پر عبارت کہتے ہیں کہ وہ مفہیم کو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل کرتے ہیں اور خواب کے مفہوم پر تعبیر خواب کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ وہ انسان کو اس کے ظاہر سے اس کے باطن کی طرف منتقل کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے وہ حادث جو انسان کو نصیحت کا سرمایہ دیتے ہیں انہیں عبرت کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کی کلی تعلیمات کے ایک سلسلہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور ایک مطلب سے دوسرے مطلب کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ ”اولی الابصار“ کی تعبیر (آنکھوں والے) ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو حوادث کو اچھی طرح دیکھتے ہیں اور اپنی بصیرت سے ان کی تہہ نہک پہنچتے ہیں۔ بصر کا لفظ عام طور پر بینائی کے عضو، بصیرت، باطنی یعنی ادراک، نگاہی کے لیے بولا جاتا ہے۔

حقیقت میں اولی الابصار وہ لوگ ہیں جو درس عبرت حاصل کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن انہیں تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اس حادثہ سے ضرور سبق حاصل کریں۔ اس میں شک نہیں کہ عبرت پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ مشابہ حوادث جو حکم عقلی کے لحاظ سے یکساں ہیں ان کا ایک دوسرے پر قیاس کریں۔ مثلاً دوسرے کفار اور ان کی عمد شکنیوں کی حالت کا بنو نضیر کے یہودیوں کے احوال پر قیاس کریں لیکن یہ جملہ سرگزشت قیاسات ظنی سے تعلق نہیں رکھتا جن سے بعض لوگ احکام دینی کے استنباط میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ بعض فقہائے اہل سنت نے اس مقصد کے اثبات کے لیے مندرجہ بالا آیت سے استفادہ کیا ہے جب کہ بعض دوسروں نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ غلامیہ کہ عبرت اور اعتبار سے مراد مندرجہ بالا آیت میں ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منطقی اور قطعی انتقال ہے نہ یہ کہ خیال و گمان پر عمل کرنا۔ بھلا واقعی اس قوم یہودی سرگزشت، باوجود اس قوت عظمت و شوکت کے اور باوجود مسائل و امکانات و استقامات کے عبرت اٹھائے تھے، یہاں تک کہ بغیر اس کے کہ کو اتھ لگائیں، مسلمانوں کی ایسی جمعیت کے مقابل میں جو بظاہر ہر گز ان کے مقابلہ کے قابل نہیں تھی، تسلیم نہ کر دیا اور ہتھیار ڈال دیے۔ اپنے گھر اپنے ہاتھوں پر یاد کیے اور اپنے مال ضرورت مند مسلمانوں کے لیے چھوڑ گئے اور مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔ حالانکہ تاریخوں کے حوالوں کے مطابق ابتداء میں انہوں نے مدینہ میں سکونت اختیار کی تھی کہ جس پیغمبر کی آمد کا ان کی کتابوں میں وعدہ کیا گیا تھا اس کو حاصل کریں اور اس کے اصحاب کی صحبت اقل میں قرار پائیں۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

(كان اكثر عبادة ابي ذر التفكر والاعتبار)

ابو ذر کی زیادہ تر عبادت غور و فکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا تھی۔

۱ مفروقات راغب۔

۲ کتاب خصال مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۴۴

۳ امیر المومنین

۱

۲

(ولولا)

جمع کرنے

عذاب ان

دنیا میں د

قلعوں سے

کے خلاف

جی ہاں

اس لیے

”

کا بیان

حاصل ہیں

”

بانہم

(ومن

مذمتا

سورہ انف

بیان کرنے

ذیل میں

۱

۲

لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دردناک حوادث کو خود آزمائیں اور شکستوں کا تلخ مزہ خود چکھیں لیکن کوئی عبرت حاصل نہ کریں
امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں :
(السعد من وعظ ونصیحت حاصل کرے)

سعادت مند وہی ہے جو دوسروں سے وعظ و نصیحت حاصل کرے۔

اس کے بعد والی آیت کہتی ہے :

”اگر یہ نہ ہوتا کہ خدا نے ان کے لیے مقرر کر رکھا تھا کہ جلاوطن ہو جائیں اور اس جگہ کو چھوڑ دیں تو ان پر اسی دنیا میں عذاب نازل کرتا۔
(ولولا ان كتب الله عليهم الجلاء لعذبهم في الدنيا)۔ اس میں شک نہیں کہ جلا وطنی اور ان عمدہ سرمایوں کا چھوڑ جانا جو جمع کرنے میں انہوں نے ایک عمر صرف کی تھی خود ان کے لیے ایک دردناک عذاب تھا۔ اسی بنا پر اُدپر والے جملہ سے مراد یہ ہے کہ اگر یہ عذاب ان کے لیے مقدر نہ کیا گیا ہوتا تو دوسرا عذاب ان پر نازل ہوتا یعنی مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوتے اور قتل ہو جاتے۔ خدا چاہتا تھا کہ وہ دنیا میں در بدر مارے مارے پھریں اور یہ در بدر ہونا ان کے لیے بسا اوقات زیادہ دردناک تھا اس لیے کہ جس وقت وہ اپنے ان تمام قلعوں، سبجے، سجائے گھروں، کھیتوں اور باغات کو یاد کرتے جو اب دوسروں کے قبضہ میں تھے اور وہ خود عہد شکنی اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف سازشیں کرنے کی وجہ سے دوسرے علاقوں میں محروم و سرگرداں تھے تو وہ بہت زیادہ تکلیف اور روحانی عذاب میں گرفتار ہوتے تھے۔ جی ہاں! خدا یہ چاہتا تھا کہ یہ مغرور، فریب کار اور عہد شکن گروہ اس قسم کے دردناک عذاب سے دوچار ہو لیکن یہ صرف ان کا دنیاوی عذاب تھا اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے :

”اور ان کے لیے آخرت میں بھی جہنم کا عذاب ہے“ (ولهم في الآخرة عذاب النار)۔

یہ ہے دنیا و آخرت ان لوگوں کی جو حق و انصاف کو ٹھکرا دیتے ہیں اور غرور و خود پرستی کے رہنما پر سوار ہوتے ہیں۔ چونکہ اس واقعہ کا بیان، علاوہ اس کے کہ پروردگار کی قدرت اور پیغمبر اسلام کی حقانیت کا بیان ہے، تمام لوگوں کو تنبیہ کرتا ہے جو یہود بنی نظیر جیسے اعمال کے حامل ہیں تاکہ مسئلہ انہی تک محدود نہ رہے لہذا بعد والی آیت میں ایک با مقصد تعلیم دیتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

”یہ دنیا و آخرت کا عذاب اس بنا پر ان پر نازل ہوا کہ وہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن بن گئے“ (ذالک بانهم شاقوا) (ورسولہ)۔ اور جو شخص خدا کی دشمنی اختیار کرے تو وہ اس پر عذاب نازل کرتا ہے اس لیے کہ وہ شدید العقاب ہے۔ (ومن يشاق الله فان الله شديد العقاب)۔

”شاقوا“ مادہ ”شقاق“ سے اصل میں دو چیزوں کے درمیان شکاف پڑنے اور جدائی کے معنوں میں ہے اور چونکہ دشمن ہمیشہ متبادل قرار پاتا ہے اور اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہے لہذا اس کے عمل کو شقاق کہتے ہیں۔ بعینہ یہی آیت بہت جزوی اختلاف کے ساتھ سورہ انفال کی آیت ۱۳ میں جنگ بدر کے واقعہ اور مشرکین کے شکست کھانے کے واقعہ کے بعد آئی ہے جو ہر لحاظ سے اس کے مضمون کو بیان کرتی ہے۔ قابل توجہ یہ کہ پروردگار عالم آغاز آیت میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی کو پیش کرتا ہے جب کہ آیت کے ذیل میں صرف خدا کی دشمنی کی بات کرتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ رسول خدا سے دشمنی بھی خدا کی دشمنی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے

سے جدا نہیں ہیں۔ شدید العقاب کی تعبیر ارحم الراحمین ہونے کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ جو عفو و رحمت کا مقام ہے وہاں وہ ارحم الراحمین ہے اور جہاں عذاب، سزا اور عقوبت کا مقام ہے وہاں وہ اشد المعاقبین ہے جیسا کہ دُعائیں آیا ہے۔ واقعہً انک انت ارحم الراحمین فی موضع العفو والرحمة و اشد المعاقبین فی موضع النکال والنقمة ۱

مجھے یقین ہے کہ جو عفو و رحمت کے مقام پر ارحم الراحمین ہے اور عذاب و سزا کی منزل میں اشد المعاقبین ہے۔ زیر بحث آیات کی آخری آیت میں خداوند عالم ایک اعتراض کا جواب پیش کرتا ہے جو بنو نظیر کے یہود نے جیسا کہ ہم شان نزول میں بھی کہہ چکے ہیں اُس موقع پر پیغمبر اسلام پر کیا تھا جب آپؐ نے حکم دیا تھا کہ یہودیوں کے قلعوں کے پاس کی کھجوروں کے کچھ درخت کاٹ دیے جائیں (تاکہ جنگ کے لیے جگہ کھلی ہو جائے یا اس لیے کہ یہودی پریشان ہوں اور قلعوں سے باہر نکل کر جنگ کریں) انہوں نے کہا تھا کہ اے محمدؐ کیا وہ آپؐ ہی نہیں تھے جو اس قسم کے کاموں سے منع کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی کہ ”کھجور کے جس قیمتی درخت کو تم نے کاٹا تھا یا اسے اپنی حالت پر رہنے دیا ہے یہ سب کچھ خدا کے حکم سے تھا۔“

(ما قطعتم من لينة او تركتموها قائمة على اصولها فبازن الله) ۲

مقصود یہ تھا کہ فاسقین کو ذلیل و رسوا کرے۔ (ولیحزى الفاسقين)۔ ”لینہ“ ”لون“ کے مادہ سے ہے اور اس کے معنی کھجور کے درخت کی ایک اعلیٰ نوع کے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کی ”لین“ کے مادہ سے کھجور کے درخت کی ایک نوع کی نرمی کے معنوں میں تفسیر کی ہے۔ یہ درخت نرم ہوتا ہے اور اس کی شاخیں زمین کے قریب ہوتی ہیں۔ اس درخت میں گنے والی کھجوریں نرم اور لذیذ ہوتی ہیں۔ اور کہیں لینہ کی تفسیر ”الوان“ کے حوالے سے ہوتی ہے جس کے معنی کھجور کے درخت کی مختلف انواع ہیں۔ اس کی تفسیر ”مخل کریمہ بھی کی گئی ہے۔ یہ سب تفسیریں ایک ہی نوعیت کی ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بنو نظیر کے کھجوروں کے درخت بعض مسلمانوں نے کاٹے جبکہ دوسرے مسلمان مخالف تھے۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور نزاع کو ختم کیا۔ ۳

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اصحاب میں سے دو افراد کے عمل سے متعلق ہے کہ جن میں سے ایک کھجور کے اچھے درخت کاٹ رہا تھا تاکہ یہودی غصہ میں آکر قلعوں سے باہر نکل آئیں۔ دوسرا کم قیمت درختوں کو کاٹتا تھا تاکہ جو قیمتی درخت ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس بنا پر ان کے درمیان اختلاف ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا کہ دونوں کام اللہ کے حکم سے تھے۔ ۴

لیکن آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ”لینہ“ اچھی قسم کے درختوں کو کاٹا اور ان میں سے بعض کو چھوڑ دیا۔ یہ چیز یہودیوں کے اعتراض کا سبب بنی اور قرآن نے اس کا جواب دیا تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ کام ہولائے نفس کے نتیجے میں نہیں تھا بلکہ اس سلسلہ کی ایک حکم الہی صادر ہوا تھا کہ محدود طریقہ پر اس کام کو کیا جائے تاکہ نقصان زیادہ نہ ہو۔ بہر صورت یہ حکم اسلام کے ایک مشہور قانون کا استثناء تھا جو یہ کہتا ہے کہ دشمن پر حملے کے وقت درختوں کو نہیں کاٹنا چاہیے، جانوروں کو ذبح نہیں کرنا چاہیے اور کھیتوں میں آگ نہیں لگانی چاہیے۔ یہ سب سوائے صرف ایسے موقف سے تعلق رکھتا تھا کہ جہاں دشمن کو قلعہ سے باہر نکلانے یا میدان جنگ بنانے کی ضرورت تھی۔

۱ دُعائے افتتاح از ”ادعیہ ماہ مبارک رمضان“

۲ اُپر والی آیت میں ماشرطیہ ہے اور فبازن اللہ اس کی جزا ہے۔

تفسیر الباقی لازمی جلد ۱ ص ۹۳۔ یہی معنی تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۸۸ پر بیان ہوئے ہیں۔

۳ تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۸۳۔

تف

مرقا نور
بانی ہے

جس کا

نے پڑ

الفضل

آیات

یہ نظیر

تأسی

کے دا

کافر

حصہ پڑ

آپ کو

نہیں دے

میں کہ

ان کے

میں مل

کے فائدہ

۱

ان کی میں ضروری جوڑی اشتہار عام طور پر موجود ہوتے ہیں جیسا کہ اصل کئی مردار کا گوشت نہ کھانا ہے لیکن مجبوری اور اضطرار کی صورت میں اکل میت تہ مردار کا کھانا ہے (ولیعزى الفاسقین) تاکہ فاسقوں کو ذلیل و رسوا کرے۔ یہ جملہ بتاتا ہے کہ اس کا ایک محدود مقصد یہ تھا کہ دشمن کو ذلیل کیا جائے اور ان کچھ حوصلوں کو پست کیا جائے۔

چند نکات

خدا کے غیر مرنی لشکر

اہل دنیا کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی ظاہری اور مادی قوتوں پر انحصار کرتے ہیں لیکن خدا پرستوں کا انحصار خدائی مدد پر ہوتا ہے۔ ان کا ایک نمونہ ہم نے بنو نظیر کے شکست کھانے اور مدینہ سے باہر نکلنے کے سلسلہ میں مندرجہ بالا آیتوں میں دیکھا ہے۔ ان آیتوں میں ہم نے یہ لکھا ہے کہ کامیابی کا ایک مؤثر سبب وہی خوف تھا جو خدا نے یودیوں کے دلوں میں ڈالا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہی اہل سے توڑنے لگے اور اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اپنے اموال کو نظر انداز کر دیں اور اس علاقہ سے باہر نکل جائیں۔ ان معانی کی نظیر قرآنی آیت میں چند مرتبہ آئی ہے۔ مغلہ دوسرے مواقع کے ایک موقع پر جب کہ معلمان بنو قریظہ سے جنگ احزاب میں آمنے سامنے ہوئے تھے،

(و انزل الذین ظاہر وہم من اهل الكتاب من صياحيهم وقذف في قلوبهم الرعب فربما تقتلون و الذین فریقاً) ”خدا نے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کو جس نے مشرکین عرب کی حمایت کی اس کے محکم قتلوں سے نیچے اتارا اور ان کے دل میں خوف ڈال دیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک گروہ کو قتل کرنے کا ارادہ ہوا اور ایک گروہ کو اسیر کیا“ (احزاب ۲۶)

یہی مفہوم جنگ بدر کے واقعہ میں بھی موجود ہے جہاں کہا گیا ہے۔ (سالفی و قلوب الذین کفرو الرعب) ”میں عنقریب اہل دنیا کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا“ اسی رعب کا ایک حصہ جو خدا کے ایک غیر مرنی لشکر کا حکم رکھتا ہے، طبعی ہے اگرچہ اس کا ایک حصہ پراسرار ہے اور اس کے روابط عام وسائل کے ذریعہ ہم پر مکشف نہیں ہیں جو چیز طبعی و فطری ہے کہ مومنین ہمیشہ ہر حالت میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھیں چاہے قتل ہو کر شہید ہو جائیں اور چاہے دشمن کی سرکوبی کریں۔ جس کی یہ منطق ہو وہ خوف اور وحشت کو اپنے دل میں لگے رکھتا ہے بلکہ اس قسم کا عجیب انسان اپنے دشمن کے لیے باعثِ خوف و وحشت ہوتا ہے۔ جیسا کہ دنیا میں ہم بڑے بڑے ممالک کو دیکھتے ہیں کہ ان کے وجود جدید ترین ہتھیار رکھنے کے اور بہت عظیم ہونے کے سچے مومنوں کے ایک چھوٹے گروہ سے ڈرتے ہیں اور ان سے جنگ کرنا ان کے لیے خوف کا باعث ہوتا ہے اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان سے نہ الجھیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا :

(نصرت بالرعب مسيرة شهر)

”میری خدا کی جانب سے ایک ماہ کے فاصلہ سے خوف و وحشت سے مدد کی گئی ہے۔“

یعنی نہ صرف وہ لوگ جو میدان جنگ میں میرے سامنے ہوتے ہیں مجھ سے خوف کھاتے ہیں بلکہ جن علاقوں میں دشمن مجھ سے ایک ماہ کے فاصلے پر ہوتے ہیں ان پر بھی وحشت و اضطراب طاری رہتا ہے۔ حضرت مہدیؑ کی فوج کے بارے میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ تین لشکر

آپ کی مدد کریں گے۔ ۱۔ الملائكة والمؤمنون والرحب) "فرشتے مومن اور خوف"

حقیقت میں وہ تو کوشش کرتے ہیں کہ انہیں باہر سے کوئی ضرب نہ لگے لیکن خدا انہیں اندر سے ضرب لگاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اندرونی ضرب زیادہ جانکاه اور ناقابل تلافی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر تمام دنیا کے ہتھیار اور لشکر کسی کے قبضہ میں ہوں لیکن اس میں جنگ کرنے کا جذبہ اور حوصلہ نہ ہو تو اسے ضرور شکست ہوگی۔

۲۔ موجودہ زمانے میں یہودیوں کی سازشیں

تاریخ اسلام اپنے آغاز ہی سے یہودیوں کی سازشوں سے بھری پڑی ہے۔ ادہم بہت سے دردناک حوادث میں میدان کے اندر یا پس منظر میں ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ پیغمبرؐ کے عشق و محبت میں سرزین حجاز میں آئے تھے لیکن ان کے عظیم ظہور کے بعد بڑی دشمن ہو گئے اور موجودہ زمانے میں بھی اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں میں ہم یہودیوں کو منظر یا پس منظر میں دیکھتے ہیں اور یہ صاحبان بصیرت کے لیے سامان عبرت ہے۔

جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ بتاتی ہے، یہودیوں کو پسپا کرنے کا واحد راستہ ان سے براہ راست مقابلہ کرنا ہے، خصوصاً صیہونیت جس کی لغت میں عدل و انصاف اور نرمی کا کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ طاقت ان کی زبان ہے۔ سوائے قوت و طاقت کے ان سے بات نہیں کی جاسکتی لیکن اس کے باوجود وہ سچے مومنین سے بہت ڈرتے ہیں۔ اگر موجودہ زمانے کے مسلمان اصحاب پیغمبرؐ کی طرح ایمان و استقامت سے کافی حد تک بہرہ ور ہوں تو ان کا خوف خون خوار دشمنوں پر غالب آجائے اور اسی لشکرِ خدائی کے ذریعہ یہودیوں کو مقبوضہ علاقوں سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔ یہ ایسا درس ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں چودہ سو سال پہلے دیا تھا۔

وَمَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ
وَلَا رِكَابٍ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ
عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

مَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى
وَالْيَتَامَى وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَى لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ
الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ
عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ

اور جو کچھ خدا اپنے رسول کو ان یہود سے لوٹا دے تو وہ ایسی چیز ہے جس پر قبضہ کرنے کے لیے (تم نے کوئی زحمت نہیں اٹھائی) نہ تم نے گھوڑا دوڑایا ہے، نہ کوئی اونٹ لیکن خدا اپنے رسولوں کو جس پر چاہے مسلط کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔
جو کچھ خدا ان آبادیوں والوں سے اپنے رسول پر لوٹائے وہ خدا، رسول، ذوی القربی، یتیموں، مسکینوں اور ابن السبیل (راستہ میں عاجز ہو کر رہ جانے والوں) کے لیے ہے تاکہ (عظیم مال) دست بدست تمہارے دولت مندوں کے درمیان گردش نہ کرے۔ جو کچھ خدا کا رسول تمہارے لیے لایا ہے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رُک جاؤ اور خدا کی مخالفت سے پرہیز

کرو کیونکہ خدا شدید العتاب ہے۔

شان نزول

چونکہ یہ آیتیں گزشتہ آیتوں کی تکمیل ہیں جو یہودی بنی نظیر کی شکستوں کو بیان کر رہی تھیں، لہذا ان کی شان نزول بھی اُسی شان نزول کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ بنی نظیر کے یہودیوں کے مدینہ سے چلے جانے کے بعد ان کے باغات، زمینیں، زراعتیں گھر اور دوسرے مال کا کچھ حصہ مدینہ میں رہ گیا۔ مسلمانوں کے سرداروں کی ایک جماعت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور زمانہ جاہلیت کے قانون کے مطابق جو بات ان کے دل میں تھی وہ انہوں نے عرض کی اور وہ یہ کہ اس مال غنیمت کا منتخب حصہ اور باقی کی ایک چوتھائی آپ لے لیجے اور باقی ہمیں دے دیجئے تاکہ اسے ہم اپنے درمیان تقسیم کر لیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور صراحت کے ساتھ کہا کہ چونکہ ان اموال غنیمت کے لیے جنگ نہیں ہوئی اور مسلمانوں نے کوئی زحمت و مشقت برداشت نہیں کی لہذا یہ تمام مال و اسباب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت ہیں۔ جس طرح ان کی مصلحت ہوگی وہ تقسیم کریں گے اور جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اموال ان مہاجرین کے درمیان جو مدینہ میں مال دنیا نہ رکھتے تھے اور انصار کی وہ تھوڑی سی تعداد جنہیں مال کی شدید احتیاج تھی، ان کے درمیان تقسیم کر دیے۔

تفسیر

ان اموال غنیمت کے بارے میں حکم جو جنگ کے بغیر ہاتھ لگیں

یہ آیتیں جیسا کہ ہم نے کہا ہے، بنی نظیر کے اموال غنیمت کے بارے میں جو حکم ہے اسے پیش کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام اموال غنیمت کے سلسلہ میں ایک قانون کلی کو بھی واضح کرتی ہیں جو مال بغیر کسی زحمت و مشقت کے اسلامی معاشرہ کو ملے اسے فقہ اسلامی میں ”فے“ کہتے ہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

”جو کچھ خدا نے اپنے رسول کی طرف ان سے پٹا یا وہ ایسی چیز ہے جس کے حصول کے لیے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے ہیں اور نہ او“
وما افاء اللہ علیٰ رسولہ منہم فما او جفتمو علیہ من خیل ولا رماحاً (کاب) ۱۷

”افاء“ ”فے“ کے مادہ سے اصل میں رجوع و بازگشت کے معنی میں ہے اور یہ جو اموال غنیمت پر اس کا اطلاق ہوا ہے شاید اسی بنا پر ہے کہ خدا نے اس جہان کی تمام نعمتیں اصل میں مومنین کے لیے اور سب سے پہلے اپنے پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے پیدا

۱۷ ”جمع البیان“ اور دوسری تفاسیر در ذیل آیات زیر بحث۔

۱۸ ”ما“ ما افاء اللہ میں موصولہ ہے اور مبتدا اور ”ما“ فما او جفتم میں تانیہ ہے اور یہ سارا جملہ خبر ہے۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ پہلا ”ما“ شرطیہ اور دوسرا اس کے بعد والے جملہ کے ساتھ جواب شرط ہو (خا کا آنا اس خبر پر جو شرط کے مشابہ ہو کوئی مانع نہیں رکھتا)۔

کی ہیں جو اشرف کائنات و فخر موجودات ہیں اور غیر مومن و کفار افراد حقیقت میں ان اموال کے غاصب ہیں (اگرچہ وہ حسب قوانین شرعی و عرفی ایک شمار ہوں) جس وقت یہ اموال حقیقی مالکوں کی طرف لوٹیں تو فی ان کے لیے بہترین عنوان ہے - "او جفتم" "ایجاد" کے مادہ سے تیزی سے ہانکنے کے معنی میں ہے جس کا عام طور پر جنگوں میں اتفاق ہوتا ہے۔ خیال کے معنی گھوڑے ہیں۔ (یہ ایسی جمع ہے جس کا مفرد خود اس کی جنس میں سے نہیں ہے)۔

"رکاب" "رکوب" کے مادہ سے عام طور پر سواری کے اڈتوں کے لیے آتا ہے۔ پورے جملہ سے مقصود یہ ہے کہ وہ تمام مواقع جن میں مال غنیمت حاصل کرنے کے سلسلہ میں کوئی جنگ واقع نہ ہو وہاں مال غنیمت جنگجو افراد میں تقسیم نہیں ہوگا اور وہ مکمل طور پر رئیس مسلمان کے اختیار میں ہوگا اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق بعد والی آیت میں بیان شدہ مصارف میں سے کسی مصارف میں صرف کرے گا۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"اس طرح نہیں کہ کامیابیاں ہمیشہ تہادی جنگوں کا نتیجہ ہوں لیکن خدا اپنے رسولوں کو جس پر چاہے تسلط عطا کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔" (والکن اللہ یسلطہ رسلہ علی من یشاء واللہ علی کل شیء قدير)۔ جی ہاں یہود بنی نظیر جیسے قومی دشمن پر کامیابی خدا کی مدد کے نتیجے میں ممکن ہوئی تاکہ تم جان لو خدا ہر چیز پر قادر ہے اور چشمِ نذر میں ایک طاقتور قوم کو زبوں حال بنا سکتا ہے اور ایک گروہ کو ان پر تسلط کر سکتا ہے اور پہلے گروہ کے تمام امکانات و وسائل دوسرے گروہ کو منتقل کر سکتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے کہ مسلمان اس قسم کے میدانوں میں ان کی معرفت کا درس بھی لے سکتے ہیں اور پیغمبر کی حقانیت کی نشانیاں بھی دیکھ سکتے ہیں اور ذاتِ پاک خدا سے خلوص اور اسی پر انحصار کو شامل کرنا بنا سکتے ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود بنی نظیر کے اموال غنیمت جنگ کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آئے بلکہ انہوں نے انگریزوں کی اور یہودیوں کے قلعوں کا محاصرہ کیا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ کسی حد تک تلوار بھی چلی جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بنو نظیر کے قلعے، جیسا کہ مؤرخین نے کہا ہے، مدینہ سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں تھے۔ (بعض مفسرین نے یہ فاصلہ دو میل یا تین کلومیٹر سے کم بیان کیا ہے) مسلمان زیادہ قلعوں کی طرف آئے اس وجہ سے انہوں نے کوئی مشقت برداشت نہیں کی۔ باقی رہی تلواروں کی جنگ تو وہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ محاصرہ نے بھی زیادہ طول نہیں کھینچا۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت میں وہ چیز جسے جنگ کا نام دیا جاسکے، واقع نہیں ہوئی اور کوئی نظریہ ثمن زمین پر نہیں گرا۔ بعد والی آیت وضاحت کے ساتھ فے کا مصروف بتاتی ہے جو گزشتہ آیت میں آیا تھا۔ خداوندِ عالم ایک قاعدہ کلی کے طور پر فرماتا ہے:

"جو کچھ خدا نے ان آبادیوں والے لوگوں سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پلٹا یا ہے وہ خدا، رسول، اس کے فوجی القریٰ، مسکینوں اور راستوں میں در ماندہ لوگوں کے لیے ہے۔ (ما افاء اللہ علی رسولہ من اهل القرۃ فللہ وللرسول ولذی القربان والیتامی والمساکین والین السبیل)۔ یعنی صلح جنگ کے اموال غنیمت کی مانند نہیں جن کا صرف پانچواں حصہ پیغمبر اور دوسرے ثابت مندوں کے اختیار میں ہے، باقی چار حصہ جنگجو افراد کے لیے ہیں۔ نیز اگر گزشتہ آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ تمام کا تمام رسول خدا سے منسوب ہے تو اس کا مضمون یہ نہیں ہے کہ وہ سارے کا سارا اپنے شخصی اور ذاتی مصارف میں صرف کریں بلکہ اس لیے کہ وہ اسلامی حکومت راغب مفردات میں کتابہ خطی اصل میں خیال کے مادہ سے خیالات اور ذہنی تصورات کے معنی میں ہے اور "خیلا" مخبر اور اپن آپ کو بڑا سمجھنے کے معنی میں ہے اس لیے کہ ایک قسم کا تخیل فضیلت سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ انسان جب گھوڑے پر سوار ہو تو عام طور پر ایک قسم کا غرور محسوس کرتا ہے لہذا لفظ خیل کا گھوڑے پر اطلاق ہوا ہے۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ خیل گھوڑوں اور سواروں دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

ل کو جاری
نیں زارت
ماضر ہوئی
ربانی کی ایک
کے ساتھ
ب رسول
آلہ وسلم
در میان

اقتہ ان
سلامی میں

در نہ اور

اسی بنا
پیدا

لا ما

کے سربراہ ہیں اور خصوصاً حاجت مندوں کے حقوق کے محافظ ہیں لہذا وہ اس کا زیادہ حصہ ان پر خرچ کریں گے۔

اس آیت میں کئی طور پر فہم کے لیے چھ مصروف بیان ہوئے ہیں :

۱۔ سہم خدا :- واضح ہے کہ خدا ہر چیز کا مالک ہے اور اس کے ساتھ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی نسبت تشریعی و اعزازی ہے تاکہ دوسرے گروہ جو اس کے بعد بیان ہوئے ہیں کسی قسم کی حقارت محسوس نہ کریں اور اپنا حصہ خدا کے حصہ کا سلسلہ خیال کریں۔ اس طرح ان کی شخصیت عام افراد کے ذہنوں میں کسی نقص کا شکار نہ ہو۔

۲۔ سہم پیغمبر :- جس سے فطری طور پر ان کی ذاتی ضرورتیں اس کے بعد مقامی حاجتیں اور وہ توقعات جو لوگ ان سے رکھتے ہیں وہ سب اس سے پوری ہوں۔

۳۔ سہم ذوی القربی :- اس میں شک نہیں کہ اس سے یہاں مراد پیغمبر کے ذوی القربی ہیں اور بنی ہاشم میں جو زکوٰۃ کے لینے سے محروم ہیں جو عام مسلمانوں کے اموال کا جز ہے۔

اصولی طور پر اس کے کوئی معنی نہیں کہ اس سے مراد عام لوگوں کے ذوی القربی ہوں کیونکہ اس صورت میں تمام مسلمانوں کو بغیر کسی استثناء کے شامل کرنا پڑے گا کیونکہ تمام لوگ ایک دوسرے کے عزیز و اقربا ہیں۔ اب رہا یہ کہ ذوی القربی میں احتیاج و فقر شرط ہے یا نہیں اس پر مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اگرچہ وہ قرآن جو اس آیت کے آخر میں اور بعد والی آیت میں ہیں اس کا شرط ہونا زیادہ صحیح نظر نہیں آتا۔

۴، ۵، ۶۔ یتیموں، مسکینوں اور سفر میں دراندہ افراد کا حصہ ہے۔ یہ کہ یہ تینوں گروہ بنی ہاشم میں سے ہونے چاہئیں یا عام یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا اس میں حصہ ہے مفسرین کے درمیان اس میں اختلاف ہے۔ زیادہ تر فقہائے اہل سنت اور ان کے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ عمومیت رکھتا ہے جب کہ وہ روایتیں جو طرق البیہت سے ہم تک پہنچی ہیں وہ اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ بنی ہاشم کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے مخصوص ہے لیکن بعض روایات میں تصریح ہوئی ہے کہ یہ حکم عمومیت رکھتا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے اس طرح مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

(کان ابی یقول لنا سہو رسول اللہ وسہو ذی القربی ونحن شرکاء الناس فیما بقی)

ہمارے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ذوی القربی کا حصہ ہے اور ہم ان باقی ماندہ حصوں میں لوگوں کے ساتھ شریک ہیں۔

اس سورہ کی آیت ۸، ۹ جو اس آیت کی وضاحت کرتی ہیں اور گواہی دیتی ہیں کہ یہ حصہ بنی ہاشم کے لیے مخصوص نہیں ہے کیونکہ ان میں عام فقر، ہمارے انصار کے بارے میں گفتگو ہے۔ علاوہ ازیں مفسرین نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر نے بنو نضیر کے واقعہ کے بعد ان اموال

یہ تفسیر نہ صرف شیعہ مفسرین نے بلکہ بہت سے اہل سنت مفسرین نے بھی تحریر کی ہے مثلاً غرلازی نے اپنی تفسیر کبیر میں، بروسی نے روح البیان میں، سید قطب نے فی ظلال میں، مراغی نے اپنی تفسیر میں اور آکوسی نے روح المعانی میں۔

لے مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۱، وسائل الشیعہ جلد ۶ ص ۳۶۸ (حدیث ۱۲ باب ۱ ابواب انفال)۔

کو جو وہ چھو
حاجت مند
تزیج دینی پ
اس
یہ

(کیلا
مفہ

یہ کہ رؤسا
پرتقا حصہ آپ

تو مندرجہ بالا
بنیادی اصول

مال و دولت
ہم اپنی طرف

حصول کے سہ
ٹھیک طرح

ماشرہ میں نہ
"جو کچھ

اس لیے کہ نہ
یہ جملہ اگرچہ بنو

یہ چیز سنت
پیغمبر کے ادا

کے ہوں یا افتہ
کے لیے چاہیے کہ

لے وسائل
لے دولہ

جگہ

کو جو وہ چھوڑ گئے تھے ہاجرین میں جو عام طور پر مدینہ میں سخت حالات میں زندگی گزار رہے تھے، اور انصار کے تین گروہوں میں جو بہت زیادہ حاجت مند تھے تقسیم کر دیے اور یہ امر آیت کے مفہوم کی عمومیت کی دلیل ہے۔ اب اگر بعض روایات اس کی تائید نہ کرتی ہوں تو ظاہر قرآن کو ترجیح دینی چاہیئے۔

اس کے بعد اس حساب شدہ تقسیم کے فلسفہ کو پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

"یہ اس بنا پر ہے کہ یہ عظیم اموال تمہارے امیر لوگوں کے درمیان دست بدست گردش نہ کرتے رہیں اور حاجت مند ان سے محروم ہوں۔"

(کیلا یكون دولة بین الاغنیاء منكم)۔

مفسرین نے اس جملہ کے لیے خصوصیت کے ساتھ ایک شان نزول بیان کی ہے جس کی طرف پہلے بھی اجمالاً اشارہ ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ رؤسا مسلمین کی ایک جماعت واقعہ بنی نظیر کے بعد پیغمبر کی خدمت میں آئی اور عرض کیا جس کو آپ خود منتخب کریں وہ اور ان اموال غنیمت کا بڑا حصہ آپ لیجئے اور بقایا ہمارے اختیار میں دے دیجئے تاکہ ہم اپنے درمیان تقسیم کر لیں جیسا کہ اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں تھا۔ (مذہب بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں متنبہ کیا کہ یہ اموال اغنیاء میں دست بدست گردش نہ کرنے پائیں۔ یہ آیت اقتصاد اسلامی کے ایک بنیادی اصول کو بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے اقتصادی نظام کا مزاج۔ جسے کہ باوجود شخصی اور خصوصی مالکیت کے احترام کے سلسلہ کار ایسا رکھا جائے کہ مال و دولت ایک مخصوص گروہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ صرف انہیں کے درمیان گردش کریں۔ البتہ اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ام لہی طرف سے قوانین وضع کر لیں اور مال و دولت ایک گروہ سے لے کر دوسرے گروہ کے حوالے کر دیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر دولت کے حصول کے سلسلہ میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے اصول سرکاری مالیات مثلاً خمس، زکوٰۃ اور اخراج وغیرہ کے احکام اور بیٹ المال و انفال کے احکام ٹیک طرح سے عملی جامہ پہن لیں تو خود بخود یہ نتیجہ نکل آئے گا کہ باوجود انفرادی کوششوں کے احترام کے اجتماعی مصلحتیں بھی پوری ہو جائیں گی۔ اور بالمشورہ میں نہ بہت امیر طبقہ رہے گا نہ بہت غریب، بلکہ دولت کی معتدل تقسیم بروئے کار آئے گی۔ خداوند تعالیٰ آیت کے آخر میں فرماتا ہے : "جو کچھ خدا کا رسول تمہارے لیے لایا ہے اُسے لے لو اور جس سے اس نے تمہیں منع کیا ہے اس سے باز رہو اور تقویٰ اختیار کرو، اس لیے کہ خدا شدید العقاب ہے۔" (وما اتاکم الرسول فخذوه وما نہاکم عنہ فانتہوا واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب)۔ یہ جملہ اگرچہ بنی نظیر کے اموال غنیمت کے بارے میں نازل ہوا ہے لیکن یہ مسلمانوں کے تمام کاروبار زندگی میں ایک حکم عمومی کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بنی نظیر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حجت ہونے کی ایک واضح دلیل ہے۔ اس اصول اساسی کے پیش نظر تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ بنی نظیر کے اموال و نواہی کو گوش دل سے سنیں اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں، خواہ وہ حکومت اسلامی سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں ہوں یا اقتصادی مسائل سے متعلق ہوں یا حقوق بندگان کے بارے میں ہوں یا ان سے علیحدہ ہوں۔ یہ حقیقت خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ جو لوگ مخالفت کریں گے ان کو شدید عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

۱۔ مسائل الشیعہ جلد ۶ ص ۳۵۶ (حدیث ۴ باب الابوالانفال)۔

۲۔ "دولہ" (دال کے زبر اور پیش کے ساتھ) ایک ہی معنی میں ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے ان کے درمیان فرق کیا ہے کہ پہلے کو اموال کے ساتھ مخصوص اور دوسرے کو جنگ کے ساتھ اور مقام کے ساتھ لوبا جانا ہے یا پہلے کو اسم صدر اور دوسرے کو مصدر شمار کیا ہے۔ بہر حال تداول کے مادہ سے دست بدست کرنے کے معنی میں دونوں ایک ہی ہیں۔

ایک نکتہ

۱۔ فی کا مصرف (وہ اموال غنیمت جو بغیر جنگ کے حاصل ہوں ان کا مصرف)

وہ اموال جو فی کے عنوان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبضہ میں سربراہ حکومت اسلامی کی حیثیت سے آتے تھے وہ ان تمام اموال پر مشتمل ہوتے تھے جو بغیر جنگ مسلمانوں کے ہاتھ لگتے تھے۔ یہ اموال اسلامی معاشرہ میں اعتدال ثروت کے سلسلہ میں اہم کردار انجام دے سکتے تھے کیونکہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے خلاف یہ اموال کبھی بھی اقوام و قبائل کے دولت مندوں میں تقسیم نہیں ہوتے تھے بلکہ براہ راست مسلمانوں کے سربراہ اعلیٰ کے اختیار میں ہوتے تھے اور وہ بھی سب سے زیادہ استحقاق کے اصول کو پیش نظر رکھ کر تقسیم کیے جاسکتے تھے جیسا کہ انفال کی بحث میں ہم نے کہا ہے کہ فی انفال کا ایک حصہ ہے اور اس کا دوسرا حصہ وہ تمام اموال ہیں جن کا مالک مشخص نہیں ہوتا۔ اس کی تشریح فقہ اسلامی میں ہو چکی ہے اور اس سے متعلق زیادہ موضوعات ہیں۔ اس طرح الہی نعمتوں کا زیادہ حصہ حکومت اسلامی کے قبضہ میں جاتا اور اس کے بعد ضرورت مندوں کو ملتا۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی اور دوسری آیت کے درمیان، جیسا کہ ہم نے اُدپر ذکر کیا ہے، کوئی تضاد نہیں اگرچہ پہلی آیت بظاہر فی کو خود پیغمبر کے اختیار میں دیتی ہے اور دوسری آیت میں اس کے کچھ مصرف بیان ہوئے ہیں اور وہ اس لیے کہ یہ کچھ مصرف ان شدید استحقاق رکھنے والوں سے متعلق ہیں جن کا پیغمبر کو خصوصیت سے خیال رکھنا چاہیے۔ بالفاظ دیگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام اموال کو اپنی ذات کے لیے اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ حکومت اسلامی کے سربراہ و امیر کی حیثیت سے جس شعبہ میں ضرورت محسوس کرتے ہیں صرف فرماتے ہیں کہ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہ حق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ائمہ معصومین کو اور ان کے بعد ان کے نائبین کو یعنی مجتہدین جامع الشرائط کو پہنچتا ہے کیونکہ اسلامی احکام کبھی معطل نہیں ہوتے اور حکومت اسلامی ان اہم ترین مسائل میں سے ہے جس سے مسلمان سرور کار رکھتے ہیں اور اس حکومت کی بنیاد کا ایک حصہ اقتصادی مسائل پر منحصر ہے اور اصلی اسلامی اقتصادی مسائل یہی ہیں۔

۲۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ہو سکتا ہے یہ سوال پیش ہو کہ خدا نے یہ حکم کس طرح دیا ہے کہ تمام افراد، بغیر کسی استثناء کے، جو کچھ پیغمبر کہیں اسے بلا جمل و حجت قبول کر لیں لیکن اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ پیغمبر کو معصوم کہتے ہیں اور یہ حق صرف ان کے لیے اور ان کے معصوم جانشینوں کے لیے ہے؟

۱۔ "انفال" کے بارے میں مختلف موضوعات اس طرح ہیں: (۱) وہ زمینیں جن کے مالکوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور وہ وہاں سے چلے گئے (بسی نظیر کے یہودیوں کی زمینیں کی طرح) (۲) وہ زمینیں جن کے مالکوں نے انہیں اپنی مرضی سے مسلمانوں کے سربراہ کے سپرد کر دیا (فدک کی طرح) (۳) اراضی موت (غیر آباد زمینیں)۔ (۴) سمندر کے کنارے۔ (۵) پہاڑوں کی چوٹیاں۔ (۶) درے (۷) جنگلات (۸) بادشاہوں کے منتخب اموال جو جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں۔ (۹) جو کچھ مسلمانوں کا پیشوا اموال غنیمت میں سے اپنے لیے رکھے (۱۰) وہ اموال غنیمت جو ان جنگوں کے ذریعہ مسلمانوں کے ہاتھ لگیں جو سربراہ مسلمین کی اجازت کے بغیر لڑی گئی ہوں۔ (۱۱) معدنیات (۱۲) اس شخص کی میراث جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ (مذکورہ بالا بعض موارد میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے لیکن اکثریت ان موارد کو قبول کرتی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایتوں میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اگر خدا نے اپنے پیغمبر کو اس قسم کے اختیارات دیے ہیں تو یہ اس لیے ہیں کہ خدا نے اسے مکمل طور پر آزمایا ہے اور وہ حد سے زیادہ اخلاقی حسنہ کا مالک ہے خلیفہ عظیم کا مصداق ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہ حق اس پیغمبر کو منجانب اللہ تفویض کیا گیا ہے۔

۳۔ فدک کی غم انگیز داستان

فدک اطراف مدینہ میں تقریباً ایک سو چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر خیبر کے نزدیک ایک آباد قصبہ تھا۔ جب سات ہجری میں خیبر کے قلعے کے بعد دیگرے افواج اسلامی نے فتح کر لیے اور یہودیوں کی مرکزی قوت ٹوٹ گئی تو فدک کے رہنے والے یہودی صلح کے خیال سے بارگاہ پیغمبر میں سر تسلیم خم کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی آدھی زمینیں اور باغات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیے اور آدھے اپنے اس رکھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصہ کی زمینوں کی کاشتکاری بھی اپنے ذمہ لی۔ اپنی کاشتکاری کی نعت کی اجرت وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وصول کرتے تھے۔ اس سورہ کی آیت فی کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ زمینیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت خا تھیں۔ اُن کی آمدنی کو آپ اپنے مصرف میں لاتے تھے یا ان مدات میں خرچ کرتے تھے جن کی طرف اس سورہ کی آیت ۷ میں اشارہ ہوا ہے۔ لہذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ساری زمینیں اپنی بیٹی حضرت فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا کو عنایت فرمادیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جسے بہت سے شیعہ اور اہل سنت مفسرین نے تصریح کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ منجملہ دیگر مفسرین کے تفسیر دار المنثور میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس وقت آیت (فَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقُّہٗ) ۱، ۳۸ نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فدک عنایت فرمایا :

(اقطع رسول اللہ فاطمۃ فدک) ۲

کتاب کنز العمال جو مسند احمد کے حاشیہ پر لکھی گئی ہے ، میں صلہ رحم کے عنوان کے ماتحت ابوسعید خدری سے منقول ہے کہ جس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو طلب کیا اور فرمایا :

(یا فاطمۃ لك فدک)

اے فاطمہ فدک تیری ملکیت ہے۔

حاکم نیشاپوری نے بھی اپنی تاریخ میں اس حقیقت کو تحریر کیا ہے۔

ابن ابی الحدید معتزلی نے بھی نہج البلاغہ کی شرح میں داستان فدک تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور اسی طرح بہت سے دیگر مؤرخین نے

وہ روایات جو اس بحث کو بھی طرح پیش کرتی ہیں ان کے لیے تفسیر فراشتلین کی جلد ۵ ص ۲۷۹ سے لے کر ص ۲۸۲ تک ملاحظہ کیے جائیں۔

دار المنثور جلد ۴ ص ۱۷۷۔

کنز العمال جلد ۲ ص ۱۵۸۔

کتاب فدک ص ۹ ملاحظہ فرمائیں۔

شرح ابن ابی الحدید جلد ۱۶ ص ۲۰۹ سے آگے۔

لیکن وہ افراد جو اس اقتصادی قوت کو حضرت علی علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کے قبضہ میں رہنے دینا اپنی سیاسی قوت کے لیے مضر سمجھتے تھے انہوں نے مصمم ارادہ کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کے یاور و انصار کو ہر لحاظ سے کمزور اور گوشہ نشین کر دیں۔ حدیث مہمول (نحن معاشم لانیسیاء ولا نورث) کے بہانے انہوں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا اور باوجودیکہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا قانونی طور پر اس پر تصرف تھیں اور کوئی شخص "ذوالیہد" (جس کے قبضہ میں مال ہو) سے گواہ کا مطالبہ نہیں کرتا جناب سیدہ سے گواہ طلب کیے گئے۔ بی بی نے گواہ پیش کیے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود انہیں فک عطا فرمایا ہے لیکن انہوں نے ان تمام چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بعد میں آنے والے خلفائے سے جو کوئی اہلیت سے محبت کا اظہار کرتا تو وہ فک انہیں لوٹا دیتا لیکن زیادہ دیر نہ گزرتی کہ دوسرا خلیفہ اس کو چھین لیتا اور دوبارہ اس پر قبضہ کر لیتا۔ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس بار بار یہ اقدام کرتے رہے۔ واقعہ فک اور اس سے تعلق رکھنے والے مختلف واقعہ عداوت جو صدر اسلام میں اور بعد کے ادوار میں پیش آئے بہت زیادہ دردناک اور غم انگیز ہیں اور وہ تاریخ اسلام کا ایک عبرت انگیز حصہ بھی ہیں جو محققانہ طور پر مستقل مطالعہ کا متقاضی ہے تاکہ تاریخ اسلام کے مختلف حوادث نگاہوں کے سامنے آسکیں۔

۸۔ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝
۹۔ وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

۱۰۔ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ

۸۔ یہ اموال ان مہاجرین کے لیے ہیں جو اپنے گھر بار اور اموال سے باہر نکالے گئے ہیں اور وہ

اللہ کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں وہ سچے ہیں۔

۹۔ اور ان لوگوں کے لیے جو دارالہجرۃ (مدینہ) اور ایمان کے گھر میں مہاجرین سے پہلے سکونت اختیار کیے ہوئے ہیں وہ ایسے لوگوں کو جو ان کی طرف ہجرت کریں دوست رکھتے ہیں اور اپنے دل میں اس چیز کے لیے جو مہاجرین کو دی گئی ہے کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے وہ مہاجرین کو خود پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ شدت سے فقیر ہوں اور جن لوگوں کو خدا نے نخل اور اپنے نفس کی حرص سے بچار کھا ہے وہی رُست گار اور نجات پانے والے ہیں۔

۱۰۔ اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے ہیں اور کہتے ہیں پروردگار! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو، جنہوں نے ایمان لانے میں ہم پر سبقت کی ہے، بخش دے اور ہمارے دلوں میں مومنین کی نسبت حد و کینہ قرار نہ دے۔ پروردگار تو مہربان اور رحیم ہے۔

تفسیر

تین گروہ مہاجرین انصار اور تابعین اور ان کے نمایاں اوصاف

یہ آیتیں گزشتہ آیتوں کے مباحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو مال فی کے چھ مصارف کے بارے میں تھیں اور جو حقیقت میں تیسوں مسکینوں اور در ماندہ مسافروں کی تفسیر ہیں اور سب سے زیادہ ابن السبیل کی تفسیر ہیں کیونکہ مسلمان مہاجرین کی زیادہ تر تعداد انہی پر مشتمل تھی جو اپنے وطن اور شہر میں تو مسکین نہیں تھے لیکن ہجرت کی بنا پر تہی دست ہو گئے تھے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

”یہ اموال ان مہاجرین کے لیے ہیں جو اپنے گھروں سے باہر نکالے گئے ہیں“ للفقراء المهاجرین الذین اخرجوا من ديارهم واموالهم۔

”وہ خدا کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں اور وہ سچے ہیں۔“ (یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسوله اولئک هم الصادقون)۔ یہاں مہاجرین کے تین اہم اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو اخلاص پرانے

اور صدق پر منحصر ہیں۔ سب سے پہلے "ابتغائے فضل خدا و رضائے خدا" کو پیش کرتا ہے جو اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ان کی ہجرت دنیا اور ہوائے فتنہ کے لیے نہیں تھی بلکہ پروردگار کی خوشنودی اور اس سے حاصل ہونے والے ثواب کے لیے تھی۔ اس بنا پر فضل یہاں ثواب کے معنی میں ہے اور رضوان خوشنودی پروردگار عالم ہے جو تمنائے ثواب کا بلند ترین مرحلہ ہے، جیسا کہ متعدد آیات قرآنی میں بھی یہی معنی آئے ہیں۔ منجملہ دیگر آیات کے سورہ فتح کی آیت ۲۹ میں جہاں اصحاب پیغمبر خدا کی اس عبارت کے ساتھ توصیف کرتا ہے۔ (تراہم و رکعاً ساجداً یقتنون فضلاً من اللہ و رضواناً) تو ان کو ہمیشہ رکوع و سجود میں دیکھے گا جب کہ وہ خدا کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں۔ فضل کی تعبیر ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اپنے اعمال کو اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ اسے مستحق ثواب ہی نہیں سمجھتے بلکہ ثواب کروہ ایک انعام الہی شمار کرتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے فضل کی یہ تفسیر کی ہے کہ اس سے مراد دنیاوی رزق ہے۔ کیونکہ بعض دوسری آیات قرآنی میں یہی معانی آئے ہیں۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ مہاجرین کے اخلاص کے بیان کا مقام ہے۔ یہ معنی مناسب نہیں ہیں بلکہ مناسب وہی اجر خداوندی ہے۔ البتہ یہ احتمال بعید نہیں ہے کہ فضل سے جنت کی جسمانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہو اور رضوان معنوی اور روحانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہو جو کچھ بھی ہو وہ آخرت سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ دنیا سے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہمیشہ دین حق اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرتے ہیں اور اس راہ میں جہاد کرنے سے ایک لمحے کے لیے بھی دست بردار نہیں ہوتے۔ (توجہ رکھنی چاہیے کہ مینصرون کا جملہ فعل مضارع اور استمرار کی دلیل ہے) تو اس طرح وہ صرف زبانی دعویٰ نہیں کرتے بلکہ انہوں نے اپنے اعمال کو مستقل جہاد سے ثابت کیا ہے۔ تیسرے مرحلہ میں خداوند عالم ان کی سچائی کے عنوان کے تحت تعریف کرتا ہے جس کے وسیع مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان کی صداقت کو ہر چیز میں منکس کرتا ہے۔ وہ ایمان کے دعویٰ میں بھی سچے ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے دعویٰ میں بھی اور دین حق کی طرف داری کے سلسلہ میں بھی۔ بغیر اظہار کیے یہ بات واضح ہے کہ یہ صفات اصحاب پیغمبر میں ان آیات کے نزول کے زمانے میں تھیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان کے اندر کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے راستہ بدل لیا اور اس آیت کے عظیم اعزازات و انتخارات سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، ان لوگوں کی طرح جنہوں نے بصرہ میں جنگ جمل کی آگ اور شام میں صفین کی آگ بھڑکائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس غلیظہ برحق کے مقابلہ میں جس کی باتفاق مسلمین اطاعت واجب تھی، آلودہ جلال قتال ہوئے اور اس طرح انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کا خون ناحق بہایا۔ اور پھر انہی جیسے دوسرے افراد بھی انہی کے زمرہ میں ہیں۔ بعد والی آیت میں ان اموال کے ایک اور مصرف کو پیش کرنے کے ضمن میں گروہ انصار کی ایک بہت ہی جاذب توجہ، عمدہ اور بلیغ توصیف پیش کرتا ہے اور وہ بحث جو گزشتہ آیت میں مہاجرین سے متعلق تھی اس کی تکمیل کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"اور وہ لوگ جو دارالہجرہ میں (مدینہ میں) اور ایمان کے گھر میں مہاجرین سے پہلے سکونت پذیر تھے۔ (والذین تبوء الدار والایمان من قبلہم)۔ قابل توجہ یہ امر ہے کہ "تبوء" "لبوا" (بروزن دوا) کے مادہ سے اصل میں اجزلے مکان کی مساوات کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں مکان کو صاف ستھرا اور مرتب رکھنے کے لیے "لبوا" "آتا ہے۔ یہ تعبیر ایک لطیف کنایہ ہے اس اعتبار سے کہ انصار مدینہ اس سے پہلے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین اس شہر میں وارد ہوں ہجرت کے لیے راہ ہموار کر چکے تھے اور جیسا کہ تاریخ کچھ ہے وہ دو مرتبہ "عقبہ" (کتنے کے قریب ایک گھاٹی ہے) میں آئے اور پوشیدہ طور پر انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی اور مسلمانوں کی شکل میں مدینہ لوٹ گئے۔ یہاں تک کہ کتنے کے مسلمانوں میں سے ایک شخص مصعب ابن عمیر کو مبلغ کی حیثیت سے وہ مدینہ اپنے ہمراہ لے گئے تاکہ عوام کے ذہنوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے لیے آمادہ کریں۔ اس وجہ سے نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنے ظاہری گھروں کو

نہیں
دست
دل
بن کو خود
ہر ص
جائیں
ہو مین
تیبوں
پنے دن
ن دیار
ضادین
اص بناد

ہاجرین کی پذیرائی کے لیے آمادہ کیا بلکہ اپنے خاؤ دل کو اور شہر کے ماحول کو بھی جتنا ہو سکتا تھا مہاجرین کے استقبال کے لیے سازگار بنایا۔ "من قبلہ" کی تعبیر بتاتی ہے کہ یہ سب محنت کے مسلمانوں کی ہجرت سے پہلے ہو چکا تھا اور یہی چیز اسم ہے۔ اس تفسیر کے مطابق مدینہ کے انصاریوں کے متعلق ان اموال کے متعلقین میں سے تھے۔ یہ چیز اس سے تضاد نہیں رکھتی جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے گروہ انصار میں سے صرف دو یا تین افراد کو اموال بنی نظیر میں سے کچھ عنایت فرمایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انصاری مدینہ میں ان چند کے علاوہ مسکین و فقیر نہ ہوں جبکہ ان اموال کے استحقاق کی بنیادی شرط فقر ہے۔ مہاجرین کی صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی اگر وہ فقیر کے مصداق نہ بھی ثابت ہوتے تو ان سبیل ضرور تھے۔

اس کے بعد تین اور ایسے اوصاف جو انصار کے جذبات و احساسات کو بیان کرتے ہیں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"وہ لوگ اس طرح ہیں جو ہر اس مسلمان کو، جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئے، دوست رکھتے ہیں۔ (یحبون من ہاجر الیہم)۔ اور اس سلسلہ میں ان کی نظر میں تمام مسلمان برابر ہیں بلکہ ان کے نزدیک ایمان و ہجرت اہم سلسلہ ہے۔ یہ دوست رکھنا ان کی ایک مستقل خصوصیت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے سینہ میں اس کے بارے میں جو مہاجرین کو دیا گیا ہے، کسی قسم کی احتیاج محسوس نہیں کرتے۔ (ولا یجدون فی صدورہم حاجۃ مما اولقوا)۔ نہ ان اموال غنیمت پر ان کی آنکھ ہے جو انہیں دیے گئے ہیں اور نہ وہ ان سے حسد کرتے ہیں، حتیٰ کہ جو چیزیں مہاجرین کو عطا ہوئی ہیں ان کے متعلق اپنے دل میں کوئی احتیاج محسوس نہیں کرتے۔ یہ چیز انصار کی انتہائی عظمت اور بلند نظری پر دلالت کرتی ہے تیسرے مرحلہ میں مزید فرماتا ہے :

"وہ مہاجرین کو خود پر مقدم سمجھتے ہیں اور انہیں ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود بہت زیادہ فقر میں مبتلا ہیں۔ (و یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصة)۔"

اس صورت حال کے پیش نظر انصار کی تین نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک محبت دوسرے بلند نظری اور تیسرے ایثار۔ مفسرین نے اس آیت کی شان نزول میں متعدد داستانیں بیان کی ہیں۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نظیر کے یہودیوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے دن انصار سے فرمایا :

"اگر پسند کرو تو اپنے مال اور گھر مہاجرین میں تقسیم کر دو اور ان اموال غنیمت میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ اور اگر چاہو تو تمہارے اموال اور گھر تمہارے ہی رہیں اور ان اموال میں سے تمہیں کوئی چیز نہ دی جائے۔" اس پر انصار نے کہا :

"ہم اپنے اموال اور گھر بھی مہاجرین میں تقسیم کر دیتے ہیں اور اموال غنیمت میں سے بھی کچھ نہیں لیتے۔ ہم مہاجرین کو اپنا اور ترجیح دیتے ہیں۔" اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ان کے اس اعلیٰ جذبہ کی تعریف کی گئی۔

ل "خصاصة" بمعنی بے حقانیت کے مادہ سے (بروزن اساس) ان مشکافوں کے معنی میں ہے جو گھر کی دیوار میں پڑ جاتے ہیں چونکہ فقر و فاقہ انسان کی زندگی میں شکاف پیدا کر دیتا ہے۔ لہذا اسے خصاصة کہا گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک شخص خدمت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آیا اور عرض کیا: ”میں بھوکا ہوں“

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا:

”میرے گھر سے اس کے لیے کھانا لے آئیں“ لیکن آپ کے گھر میں کھانا نہیں تھا اس پر آپ نے فرمایا: ”کون شخص ہے جو آج رات اس شخص کو ہمان رکھے؟“

انصار میں سے ایک شخص نے آمادگی ظاہر کی۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس کے گھر میں تھوڑی سی غذا کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور وہ بھی اس کے بچوں کے لیے تھی۔ اُس نے زور سے کہا کہ ہمان کے لیے کھانا لے آئے اور چراغ گل کر دے اور جس طرح ممکن ہو بچوں کو سلا دے۔ اُن کے بعد بیوی اور شوہر دونوں دسترخوان پر بیٹھ گئے اور بغیر اس کے کہ کھانے میں سے کچھ کھائیں وہ اپنا منہ پلاتے رہے۔ ہمان نے خیال کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ اُس نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ وہ دونوں میاں بیوی اس رات بھوکے سوئے۔ صبح کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور بغیر اس کے کہ وہ کچھ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مندرجہ بالا آیت کی رات فرمائی اور ان کے اشار کی تعریف کی۔ اُن روایات میں جو طرق اہل بیت سے پہنچی ہیں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کے چھوٹے چھوٹے بھائی اور جس نے بچوں کو بھوکا سلا دیا وہ بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا تھیں۔

توجہ کرنی چاہیے کہ ہو سکتا ہے پہلی داستان آیت کی شان نزول ہو۔ لیکن دوسری صورت حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے حکم کی تطبیق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اشار پر مبنی ہمانی کے بارے میں آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس وجہ سے انصار کے لیے میں آیات کا نزول حضرت علی علیہ السلام کے میزبان ہونے کے ساتھ منافات نہیں رکھتا۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ آیت احد کے جنگ جو غازیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں سے سات افراد بہت زیادہ پیاسے تھے اور زخمی بھی تھے۔ کوئی شخص ایک آدمی کو پیاس بجھانے کی مقدار کے برابر پانی لے کر آیا۔ وہ جس کے پاس لے کر گیا اس نے دوسرے کا حوالہ دیا اور اُسے اپنے اوپر ترجیح دی تاخیر سے پیاس کی حالت میں جان دے دی اور خدا نے ان کے اس اشار کی تعریف و توصیف کی۔

لیکن واضح رہے کہ یہ آیت بنی نظیر کے واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے جب کہ اپنے مفہوم کی عمومیت کی بنا پر یہ آیت مشابہ موارد پر لایا جاسکتا ہے۔ آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے مذکورہ اوصاف کریم کی بنا پر اور نتیجے کے بیان کے طور پر مزید فرماتا ہے:

”وہ لوگ جن کو خدا نے نجل اور حرص سے روکا وہی رست گار ہیں۔“ (و من یوق شح نفسه فاولئک هم المفلحون)۔
”بسیا کہ راغب مفردات میں لکھتا ہے ایسے نجل کے معنی ہیں جس میں حرص شامل ہو اور جو عادت بن چکا ہو۔“ ”یوق“ ”وقایۃ“
”ادہ سے اگرچہ فعل مجہول کی شکل میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا فاعل یہاں خدا ہے یعنی جس شخص کو خدا اس عیب سے محفوظ رکھے وہ کامیاب ہے۔“
ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک صحابی سے فرمایا:

(انتدیری ما الشحیح)

"کیا تم جانتے ہو کہ شیخ کون ہے؟"

اُس نے جواب میں عرض کیا: هو البخیل۔

تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اشح اشد من البخل۔ ان البخیل یبخل بما فی یدہ والشح یشح بما فی

ایدی الناس وعلی ما فی یدہ حتی لا یری فی ایدی الناس شیئاً الا تمخى ان یکون

له بالحلال والحرام ولا یقنع بما رزقه الله عزوجل"

شیخ بخل سے زیادہ سخت ہے۔ بخل وہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہو اس کے متعلق بخل کرے لیکن شح وہ ہے جو اس کے پاس سے بھی بخل کرتا ہو جو لوگوں کے پاس ہو اور جو کچھ اس کے اپنے پاس ہو اس میں بھی۔ یہاں تک کہ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے وہ آرزو کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ آجائے چاہے حلال طریقہ سے ہو چاہے حرام سے اور جو رزق اسے خدا نے دیا ہے اس پر کبھی قناعت نہیں کرتا۔ ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"لا یجتمع الشح والایمان فی قلب رجل مسلم ولا یجتمع غبار فسیل الله ودخان

جهنم فی جوف رجل مسلم"

"بخل و حرص و ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے جس طرح راہ جہاد کا گرد و غبار اور جہنم کا دھواں

ایک مرد مسلمان کے اندر جمع نہیں ہو سکتے۔"

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا آیت سے ابھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بخل و حرص ترک کرنا انسان کو فلاح و کامیابی تک پہنچاتا ہے جب کہ اس عیب سے آلودگی سادت انسانی کے قصر کو ڈھا دیتی ہے اور اسے دیران کر دیتی ہے۔ آخری زیر بحث آیت مسلمانوں کے تیسرے گروہ کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جو قرآن مجید کے الہام و ہدایت کی بنا پر ہمارے درمیان تابعین کے نام سے معروف ہیں۔ وہ مہاجرین و انصار کے بعد جن کے متعلق گزشتہ آیات میں گفتگو آئی تھی مسلمانوں کے تیسرے عظیم گروہ کو تشکیل دیتے ہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

"اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے ہیں وہ کہتے ہیں پروردگار! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جنہوں نے ایمان میں ہم پر سبقت حاصل کیا بخش دے اور ہمارے دونوں میں مومنین کی نسبت حسد و کینہ قرار نہ دے۔"

پروردگار! "تو مہربان و رحیم ہے۔" (والذین جاءوا من بعدہم یقولون ربنا اغفلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین امنوا ربنا انک رؤوف رحیم)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس جملہ کا مفہوم ان لوگوں میں محدود کر دیا جو اسلام کی کامیابی اور فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کے ساتھ آنے والے لیکن اس محدودیت کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے تمام مسلمان اس میں شامل ہیں۔ (والذین جاءوا) کا جملہ بظاہر عطف ہے "للفقراء المهاجرین" پر اور اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اموال فی مہاجرین و انصار کے مساکین کے لیے نہیں ہیں بلکہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمان بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک مستقل جملہ ہے (اس طرح سے والذین جاءوا مبعث اور

قول خبر ہے۔ لیکن گزشتہ آیات سے اس کی ہم آہنگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ قابل توجہ یہ ہے کہ یہاں بھی ہمیں کے تین اوصاف بیان کیے گئے ہیں پہلی صفت یہ کہ وہ اپنی اصلاح، طلب آمرزش اور بارگاہِ خدا میں توبہ کی فکر میں رہتے ہیں۔ دوسری صفت یہ کہ ایمان کی طرف سبقت کرنے والے کو بڑے بھائی کی طرح دیکھتے ہیں جو ہر لحاظ سے قابل احترام ہوتے ہیں اور ان کے لیے بھی بارگاہِ خدا پرکشش و مغفرت کی استعداد کرتے ہیں۔ تیسری صفت یہ کہ ان کی کوشش ہے کہ ہر قسم کا کینہ و دشمنی اور حسد اپنے دل سے باہر نکال دیں اس راہ میں خداوندِ رؤف و رحیم سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اپنی شخصیت کی تعمیر، ایمان کی طرف سبقت کرنے والوں کا احترام کینہ و حسد سے دوری ان کی خصوصیات ہیں۔ "غل" (بروزن سل) جیسا کہ پہلے بھی ہم نے عرض کیا ہے اصل میں کسی چیز کے پوشیدہ طور پر ان کے معنی میں ہے۔ اسی لیے درختوں کے درمیان جاری رہنے والے پانی کو "غل" کہتے ہیں اور چونکہ حسد، عداوت اور دشمنی پوشیدہ طور پر انسان کے اندر نمود کرتے ہیں۔ اس لیے اسے "غل" کہا جاتا ہے اس بنا پر غل صرف حسد کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں ت سے عیوب اور قبیح عادات شامل ہیں۔ "انخوان" (بھائی) کی تعبیر اور آیت کے آخر میں خداوندِ رؤف و رحیم سے مدد طلب کرنا اور محبت و مہربانی اور اخوت کا ترجمان ہے جسے سارے اسلامی معاشرہ پر فرما دیا ہونا چاہیے۔ اور جو شخص کسی نیکی کو چاہتا ہے وہ صرف اپنے لیے نہ بلکہ تمام کوششیں اجتماعی شکل میں سب کے لیے انجام پانی چاہئیں اور ہر قسم کا کینہ، بغض، عداوت، دشمنی، بغل جرح اور حسد سینوں سے دھو دینا چاہیے۔

ایک نکتہ : صحابہ قرآن و تاریخ کی میزان میں

یہاں بعض مفسرین ان اوصاف کی طرف توجہ کیے بغیر جو مہاجرین و انصار اور تابعین میں سے ہر ایک کے لیے مندرجہ بالا آیت میں آئے ہیں رکھتے ہیں کہ تمام صحابہ کو بغیر کسی استثنائے پاک و منترہ شمار کریں اور وہ غلط کام جو بعض اوقات خود زمانہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یا بعد ان کے بعد ان میں سے بعض سے سرزد ہوئے ہیں ان سے چشم پوشی کی جائے اور جو شخص بھی مہاجرین و انصار و تابعین کی صف میں قرار پایا ہے، ان کو بند کر کے اسے مقدس و معترم سمجھیں۔ حالانکہ مندرجہ بالا آیت ان افراد کو دندان شکن جواب دیتی ہے اور سچے مہاجرین و انصار و تابعین کے ضوابط و روایات ایک مبنی کے ساتھ معین کرتی ہے۔ مہاجرین میں پروردگارِ عالم اخلاص جہاد اور صدق بتاتا ہے۔ اور انصار میں مہاجرین کی بہ نسبت ایشیاء اور ہر قسم کے بغل و جرح سے پرہیز کی نشان دہی کرتا ہے اور تابعین میں شخصی تعمیر، ایمان میں سبقت کرنے والوں کا احترام ہر قسم کے کینہ و حسد سے پرہیز جیسی صفات کو بیان کرتا ہے۔ ان حالات میں ہم ان افراد کو کس طرح محترم شمار کریں جو جنگ جمل، بدر، یمامہ اور انہوں نے اپنے امام و رہبر کے خلاف تلوار کھینچی۔ انہوں نے نہ تو اخوت اسلامی کی رعایت کی نہ اپنے سینوں کو غل، حسد اور بغل سے پاک کیا اور نہ حضرت علی علیہ السلام کی سبقت ایمانی کا احترام کیا۔ ہم کس طرح ان پر ہر قسم کی تنقید کو گوارا نہیں اور آنکھیں بند کر کے ان کے اور ان کی باتوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ اس بنا پر خطِ ایمان کی طرف سبقت کرنے والوں کے احترام کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے ایمان کے معاملے کو پیغمبر کے زمانے کے حوالے سے اور ان شدید طوفانوں میں جو آپ کے بعد اسلامی معاشرہ کو لاحق ہوئے ان کے حوالے سے باریک بینی اور دقت نظر کے ساتھ زیر مطالعہ رکھیں گے اور ان معیاروں کی روشنی میں قرآن کی آیات سے ہمیں معلوم ہوئے ہیں ان کے بارے میں فیصلہ کریں گے اور اپنا تعلق ان کے ساتھ مستحکم رکھیں گے۔ عہدِ دبیران پر قائم رہے ہیں اور ان سے جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اپنا رابطہ آپ سے توڑ لیا ہم رشتہ توڑ لیں گے۔ یہ ہے صحیح اور حکم قرآن و عقل سے ہم آہنگ منطق۔

س کے بارے میں
کرتا ہے کہ اس
ناعت میں گرا

جب کہ اس
رو کے بالے
یہ بعد جن کے

بقت حاصل کیا

بال ایمان ولا

لیے لیکن اس

ہر عطف سے

یہ کہ اس کے

تد اور

- ۱۱۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَتُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لِيْنْ اُخْرِجُوْهُمْ لَنُخْرِجَنَّ
مَعَكُمْ وَلَا نَطِيْعُ فَيَكُمُ اَحَدًا اَبَدًا ۚ وَّ اِنْ قُوْلْتُمْ
لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اَنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝
- ۱۲۔ لِيْنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلِيْنْ قُوْلُوْا
لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلِيْنْ نَّصُرُوْهُمْ لَيُوْلَنَّ الْاَدْبَارُ ثُمَّ
لَا يَنْصُرُوْنَ ۝
- ۱۳۔ لَا اَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِىْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝
- ۱۴۔ لَا يِقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِىْ قُرَى مُحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ
وَّرَآءِ جُدُرٍ ۚ بِاسْهُوْبَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسِبُهُمْ
جَمِيْعًا وَقُلُوْبُهُمْ شَتٰى ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا
يَعْتَلُوْنَ ۝

ترجمہ

- ۱۱۔ کیا تُو نے منافقین کو نہیں دیکھا جو اہل کتاب میں سے اپنے کافر بھائیوں سے کہتے تھے جس وقت تمہیں (وطن سے) باہر کریں تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے اور تمہارے معاملہ میں کسی کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔
- ۱۲۔ اگر انہیں باہر نکال دیں تو یہ ان کے ساتھ باہر نہیں جائیں گے اور اگر ان سے جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر مدد کریں بھی تو میدان سے فرار کریں گے پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔
- ۱۳۔ تمہاری وحشت ان کے دلوں میں خدا کے خوف سے زیادہ ہے یہ اس بنا پر کہ وہ نادان گروہ ہے۔
- ۱۴۔ وہ کبھی بھی تمہارے ساتھ مجموعی صورت میں جنگ نہیں کریں گے مگر مضبوط قلعوں کے اندر سے یا دیواروں کے پیچھے سے۔ ان کی جنگ آپس میں شدید ہے۔ (لیکن تمہارے مقابلہ میں کمزور ہیں) ان کے ظاہر کی طرف تو دیکھتا ہے تو انہیں متحد پاتا ہے۔ جب کہ ان کے دل پراگندہ ہیں۔ یہ اس بنا پر ہے کہ وہ بے عقل قوم ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا

رَجُلٍ

نُؤَيِّلُكُمْ

۱۰

وَيَتْلُوا

تَمِثُّ

۷

يٰۤاَيُّهَا

يٰۤاَيُّهَا

يٰۤاَيُّهَا

يٰۤاَيُّهَا

يٰۤاَيُّهَا

يٰۤاَيُّهَا

شان نزول

مندرجہ بالا آیت کے لیے بعض مفسرین نے ایک شان نزول بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ منافقین مدینہ کے ایک گروہ عبداللہ بن ابی وغیرہ نے پرشیدہ طور پر کسی کو بنی نظیر کے یہودیوں کے پاس بھیجا اور کہا کہ تم آرام سے بیٹھے رہو۔ اپنے گھروں سے باہر نہ نکلو۔ اپنے قلعوں کو مستحکم کرلو۔ ہمارے پاس دو ہزار افراد ہیں جو آخر دم تک تمہاری مدد کے لیے تیار ہیں۔ بنی قریظہ اور تمہارے علیف قبیلہ غطفان کے لوگ بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔ یہی وہ محرک تھا جس نے بنی نظیر کے یہودیوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت پر ابھارا لیکن اسی دوران بنی نظیر کے ایک سردار جس کا نام سلام تھا اس نے جی ابنِ اخطب سے، جو بنی نظیر کے لاسخہ عمل کا نگران خاص تھا، کہا تو عبداللہ بن ابی کا اعتبار نہ کرو وہ چاہتا ہے کہ تجھے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ پر ابھارے اور خود اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور تجھے مصیبتوں کے حوالے کر دے۔ جی نے کہا: ”ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دشمنی اور اس سے جنگ کرنے کے علاوہ اور کسی چیز کو نہیں جانتے۔“ سلام نے اس کے جواب میں کہا کہ خدا کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمیں آخر کار اس سرزمین سے نکلنا پڑے گا اور ہمارا مال و دولت، شرف و بزرگی یہ سب برباد ہوں گے۔ ہمارے بچے قیدی بنائے جائیں گے اور ہمارے جوان قتل کر دیے جائیں گے۔ مندرجہ بالا آیات اس واقعہ کو بیان کرتی ہیں:

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ آیات بنو نظیر کے واقعہ سے پہلے نازل ہوئیں اور اس کے بعد کے حوادث کو بیان کرتی ہیں۔ اور اس وجہ سے انہیں قرآن کے اخبارِ غیب میں شمار کرتے ہیں۔ آیات کا لب و لہجہ جو فعل مضارع کی شکل میں ہے۔ اگرچہ اس نظریہ کی تائید کرتا ہے لیکن گزشتہ آیات سے ان آیات کا جوڑ یہ بتا رہا ہے کہ یہ بنو نظیر کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ کیونکہ گزشتہ آیات بنو نظیر کی شکست کے واقعہ اور ان کی جلا وطنی کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ فعل مضارع کا استعمال حکایتِ حال کے طور پر ہے۔ (غور فرمائیے)۔

تفسیر

یہودیوں کی فتنہ انگیزی اور اس میں منافقین کی شمولیت

گزشتہ آیات میں یہود بنی نظیر کے واقعہ کو بیان کرنے اور مومنین کے تین گروہ یعنی ہماجرین، انصار اور تابعین کے حالات کی ہر ایک خصوصیت کو تشریح کے ساتھ پیش کرنے کے بعد پروردگار عالم زیر بحث آیات میں ایک اور گروہ یعنی منافقین اور ان کی اس واقعہ سے متعلق کارکردگی کو پیش کر رہا ہے تاکہ تمام افراد کے حالات کی کیفیت ایک دوسرے کے موازنہ کے ساتھ واضح کر دے۔ اور یہ قرآن کا طریق کار ہے کہ وہ مختلف گروہوں کے تعارف کے لیے انہیں ایک دوسرے کے مقابل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پہلے رُومے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”کیا تو نے منافقین کو نہیں دیکھا جو اپنے بھائی اہل کتاب کفار سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں تمہارے وطن سے نکالا گیا تو ہم بھی تمہارا

اور تمہارے بارے میں ہم کسی کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر تم سے جنگ ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ (الفرقان ۱۲)
 لَنْ نَاقُولَ لِقَوْلِهِمْ لَاحِقًا اِنْ هُمْ اِلَّا كُفْرًا مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَنْ اُخْرِجَهُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ وَلَا نَجْعَلُ فِيْكُمْ حُدُودًا وَاِنْ قُوْلُهُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ۔ اس طرح اس گروہ منافقین نے طائفہ یہود سے تین باتوں کا وعدہ کیا۔ جب کہ وہ ہر بات پر جھوٹے تھے۔ پہلا یہ کہ اگر انہوں نے اس سرزمین سے تمہیں نکالا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے بعد ان کی جگہ کو دیکھیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی حکم کسی شخص کی طرف سے تمہارے خلاف صادر ہو، نہ صرف اب بلکہ کبھی بھی تو ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ تیسرے یہ کہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو ہم تمہارے دوش بدوش جنگ کریں گے اور تمہاری مدد کے سلسلہ میں کسی تردد کا شکار نہیں ہوں گے۔ جی ہاں یہ قول و قرار تھے جو منافقین نے اس واقعہ سے پہلے یہود سے کیے تھے لیکن بعد کے واقعات نے بتایا کہ یہ سب رٹ تھا۔ اسی بنا پر قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

”خدا گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔“ (وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اَنَّهُمْ كَاذِبُونَ)۔ کیا لرزا دینے والا انداز کلام ہے جو ان واقعات کی تاکیدوں کے ساتھ ہے۔ خدا کا لفظ گواہ کو جملہ اسمیہ کی شکل میں لانا پھر ”ان“ اور ”لام“ کی تاکید یہ سب باتیں ہیں کہ جھوٹ اور نفاق ایک دوسرے سے اس طرح ملے جلے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان جدائی ممکن نہیں ہے۔ منافق ہمیشہ جھوٹے اور زیادہ تر جھوٹے منافق ہوتے ہیں۔ ”اخوانہم“ (بھائی) کی تعبیر بتاتی ہے کہ منافقین اور کفار کے درمیان بہت نزدیکی رابطہ ہے جیسا کہ آیت میں مومنین کے درمیان رابطہ انخوت پر زور دیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مومنین اپنی انخوت کے بارے میں سچے تھے اس لیے کسی قسم کے ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے اس کے برعکس منافقین آپس میں کسی قسم کی وفاداری اور ہمدردی نہیں رکھتے اور سخت ترین بات میں اپنے بھائیوں کی ہمدردی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ یہ مومنین اور کافروں کی انخوت میں فرق ہے۔ (وَلَا نَطِيعُ فِيْكُمْ حُدُودًا) ”ہم تمہارے معاملے میں کسی کی اطاعت نہیں کریں گے“ کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ ہم تمہارے بارے میں محمد ﷺ و آلہ وسلم کی وصیتوں، نصیحتوں اور تنبیہوں کو اور خطرات کے اشاروں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیں گے۔ اس کے بعد ان کی دروغ گوئی سے متعلق مزید وضاحت کے لیے اضافہ کرتا ہے۔

”اگر یہودیوں کو نکال دیں تو یہ منافقین ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔“ (لَنْ اُخْرِجُوْا وَلَا يَخْرُجُوْنَ مَعَكُمْ)۔ اور اگر ان کے ساتھ جنگ ہو تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔ (وَلَنْ قُوْلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَكُمْ)۔ اور بالفرض اگر اپنے قول پر عمل کریں اور ان کی مدد کے لیے آمادہ ہو بھی جائیں تو جلد ہی میدان سے فرار کر جائیں گے۔ (وَلَنْ نَّصْرُوْهُمْ وَلَنْ اَلْدَارُ)۔ ”اور اس کے بعد ان کی مدد نہیں کرے گی۔“ (شعرا لا ينصرون)۔ ان آیات کا قاطع لب و لہجہ ہر منافق کو لرزہ بر اندام کر دیتا ہے۔ خصوصاً یہ کہ آیت اگرچہ ایک خاص گروہ کے لیے نازل ہوئی ہے لیکن طے شدہ طور پر اسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ منافقین کے تمام دشمنان اسلام سے رابطے، ایک دوسرے سے قربت کا راز اور ان وعدوں کے سلسلہ میں جو وہ ایک دوسرے سے کرتے ہیں یہ ایک اصلی کلتی ہے حالانکہ وہ تمام وعدے بے بنیاد ہوتے ہیں۔ اگر آپ حال نہ صرف گزشتہ تاریخ اسلام میں نظر آتی ہے بلکہ آج بھی، اسلامی ممالک میں، منافقین کی دشمنان اسلام سے ساز باز کے سلسلہ میں زندہ نمونے نظر آتے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہ طے شدہ ہے کہ اگر سچے مومنین اپنی اسلامی ذمہ داریاں نبھائیں اور اپنا فرض ادا کریں تو ان کے مقابلہ میں کامیابی سے ہم کنار ہوں گے اور ان کے منصوبے نقش بر آب ثابت ہوں گے۔

یہ کہ ایک
 سے باہر
 طیف قبیلہ
 ت پر اصرار
 اس تھا کہ
 مارے او
 ے علاوہ او
 بڑے کا
 ے جائیں گے
 اور اس
 کتاب
 ے واقعہ او
 ہر ایک
 ے متعلق
 ان کا
 پیغمبر
 ہی تمہارے

بہرہ دانی آیت میں اس شکست کے اسباب کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے :

”تم ارا خوف ان کے دلوں میں خدا کے خوف سے زیادہ ہے۔“ (لانتوا شد رهبة في صدورهم من الله)۔
 چونکہ وہ خدا سے نہیں ڈرتے لہذا ہر چیز سے وحشت و خوف رکھتے ہیں۔ خصوصاً اے مومنو! تم جیسے سخت دشمن سے۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ ایک نادان گروہ ہے۔“ (ذالك بانهم قوم لا يفقهون)۔ ”رہبہ“ اصل میں اس خوف کے معنوں میں ہے جس کے ساتھ اضطراب و احتیاط ہو۔ اور حقیقت میں یہ ایسا گمراہ اور جڑیں رکھنے والا خوف اور وحشت ہے جس کے اثرات کردار میں عکس ہوئے ہوں۔ اگرچہ مندرجہ بالا آیت یہودی بنی نظیر اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کی شکست کے عوامل کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کا فہم مضمون ایک حکیم کئی و عمومی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کے دل میں کبھی دو خوف جمع نہیں ہو سکتے۔ ”خوف خدا اور ماسوا اللہ کا خوف“ اس لیے کہ تمام چیزیں حکم خدا کی تابع ہیں اور جو شخص خدا سے ڈرے اور اس کی قدرت سے آگاہ ہو وہ اس کے غیر سے کبھی خائف نہیں ہو سکتا۔ ان سب بد بختیوں کا سرچشمہ ہجرت۔ نادانی اور حقیقت توحید سے بے خبر ہونا ہے۔ اگر اس زمانے کے مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان مومن اور موحد ہوں تو وہ نہ صرف موجودہ دنیا کی فوجی اور صنعتی طاقتوں سے خائف نہ ہوں بلکہ مذکورہ طاقتیں ان سے ڈریں۔ جیسا کہ ہم اس کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ طاقتیں باوجود ان ترقی یافتہ وسائل کے اور ان مہمک ہتھیاروں کے ایک پھوٹی سی لیکن قربانی دینے کی صلاحیت رکھنے والی قوم سے خوف زدہ ہیں۔ اسی مضمون کی ایک نظیر سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۱ میں بھی آئی ہے۔ (سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب بما اشركوا بالله ما لم ينزل به سلطانا وما هو الا نار وبش مشوى الظالمين) ”عنقریب ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے“ اس لیے کہ انہوں نے بغیر کسی دلیل کے کچھ چیزوں کو خدا کا شریک قرار دیا ہے۔ ان کے رہنے کی جگہ آگ ہے اور ظالموں کی قرار گاہ کیا ہی بڑی اس کے بعد اس اندرونی خوف کی واضح نشانی کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

”وہ سولے محکم قلعوں میں رہ کر یا پس دیوار ہو کر تم سے کبھی منظم ہو کر جنگ نہیں کر سکیں گے۔ وہ تمہارے سامنے آنے سے گھبراتے ہیں۔“ (لا يقاتلونكم جميعا الا في قري محصنة او من وراء جدر)۔ ”قري“ جمع ہے قریہ کی جو آبادی کے معنی میں ہے، عام اس کے کہ شہر ہو یا گاؤں۔ کبھی ایک ہی جگہ جمع شدہ انسانوں کے بارے میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ ”محصنة“ کا مادہ ”حصن“ (بروزن ہم) قلعہ کے معنی میں ہے اس بنا پر ”قري محصنة“ ان آبادیوں کو کہا جاتا ہے جو جڑوں اور قلعوں کے ذریعہ یا خندق کھود کر یا اور دوسری رکاوٹیں کھڑی کرنے کی وجہ سے دشمن کی یلغار سے محفوظ ہوں۔ ”جدر“ جمع ہے ”جدار“ کی جو دیوار کے معنی میں ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی بلندی کے ہیں۔ جی ہاں چونکہ وہ ایمان اور توکل علی اللہ کی بناہ گاہ سے باہر ہیں لہذا سولے دیواروں اور قلعوں کی پناہ کے مومنین سے جنگ کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

”لیکن یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ کمزور، ناتواں اور فزون جنگ سے ناواقف افراد ہیں۔ جب جنگ خود ان کے مابین واقع ہو کر نہایت شدید ہوتی ہے۔“ (بأسهم بينهم شديد)۔ لیکن تمہارے مقابلہ میں صورت حال بالکل بدل جاتی ہے اور خوف و وحشت اور ایک عجیب اضطراب ان پر مسلط ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک بنیادی حقیقت ہے کہ تمام بے ایمان اقوام کی جب آپس میں جنگ ہو اور اس کے مقابلہ میں جب مسلمانوں سے مقابلہ ہو تو مذکورہ صورت حال پیش آتی ہے۔ اس کے نمونے ہم نے موجودہ زمانے میں بار بار دیکھے ہیں۔ جب خدا کی معرفت نہ رکھنے والے افراد ایک دوسرے سے لڑتے ہیں تو اس طرح ایک دوسرے کی سرکوبی کرتے ہیں کہ ان کی جنگ جوں کی توڑ کسی قسم کا

تمف

شہر باقی
اور قلعہ
مقابلہ

ایک
شہریت کا
بے خبر
کا نتیجہ
سرچشمہ
نہیں کھا
اس لیے
مومنین کا
توحید اور
ہوتی ہے

شبہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب ان کا مقابلہ مومنین اور شہادت فی سبیل اللہ کا شوق رکھنے والوں سے ہوتا ہے تو وہ فوراً ہتھیاروں، محکمہ مورچوں اور قلعوں کی پناہ لے لیتے ہیں اور اضطراب انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ اگر مسلمان واقعی اسلامی اقدار اختیار کریں تو وہ دشمنوں کے مقابلہ میں از سر نو افضل و برتر ثابت ہوں۔

اسی کیفیت کو جاری رکھتے ہوئے ان کی شکست اور ناکامی کے ایک اور سبب کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے :

”تو ان کے ظاہر کی طرف دیکھے تو انہیں متفق و متحد تصور کرے گا حالانکہ ان کے دل پر گندہ ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک ایسی قوم میں جو عقل سے محروم ہیں“۔ (تحسبہم جمیعاً و قلوبہم شتى ذالک بانہم قیوم لا یعقلون)۔ شتی جمع، مشیت کی یعنی متفرق قرآن تحصیل مسائل میں فی الواقعی بہت ہی دقیق اور الہام بخش ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ تفرقہ اور اندرونی لفاق جہالت، بے خبری اور نادانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ شرک کا سبب جہالت ہے اور پرگندگی و انتشار کا سبب شرک ہے اور انتشار کا نتیجہ شکست ہے۔ اس کے برعکس علم جو ہے وہ عقیدہ توحید، عملی اتفاق اور ہم آہنگی کو وجود میں لاتا ہے اور بجائے خود کامیابیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس طرح بے ایمان افراد کا ظاہری اجتماع، ان کے آپس کے معاہدے اور فوجی و اقتصادی وحدت سے ہمیں کبھی دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ اس لیے کہ ان باہمی معاہدوں اور نعروں کے پیچھے وہ دل ہوتے ہیں جو انتشار کا شکار ہوں۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے وہ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مادی مفاد کا محافظ ہوتا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ مادی منافقتوں میں ہمیشہ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جب کہ مومنین کی وحدت اور ان کا اجتماع ایسے اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے جس میں تضاد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کی وحدت کا اصول اصل ایمان، توحید اور الہی اقدار پر مبنی ہوتا ہے، لہذا جہاں کہیں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑے تو مندرجہ بالا آیات کے مطابق اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ حقیقت ایمانی سے محروم ہوتے ہیں جب تک اس کی طرف واپس نہیں لوٹیں گے ان کے حالات بہتر نہیں ہوں گے۔

اللہ

سے۔ یہ اس

میں ہے جس

میں شکست

ن اس کا

سوا اللہ کا

لف نہیں ہو

لمان، مومن

بتی انھوں

والی قوم

ما اشركوا

ل دیں گے

گاہ کیا ہی

گھبراتے ہیں

عام اس

ن جسم قلعہ

سری کا

بنیادی

جنگ کے

میں واقع ہوا

دشمن اور

راس کے

میں جب

میں کسی

١٥- كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهُمْ
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

١٦- كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ
قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝

١٧- فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَذَلِكَ
جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝

١٨- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ
وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

١٩- وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝

٢٠- لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ
هُمُ الْفَائِزُونَ ۝

ترجمہ

۱۵۔ یہودیوں کے اس گروہ کا کام ان لوگوں کی طرح ہے جو ان سے کچھ پہلے تھے۔ انہوں نے اپنے کام کا تلخ مزہ چکھا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۱۶۔ ان کا کام مثل شیطان کے ہے جس نے انسان سے کہا کافر ہو جا۔ (تاکہ تیری مشکلات حل ہو جائیں)۔ لیکن جب وہ کافر ہو گیا تو اس نے کہا میں تجھ سے بیزار ہوں۔ میں اس خدا سے جو عالمین کا پروردگار ہے ڈرتا ہوں۔

۱۷۔ انجام ان کا یہ ہوا کہ وہ دونوں جہنم کی آگ میں ہیں۔ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ ستم گردوں کی سزا ہے۔

۱۸۔ اے ایمان لانے والو! خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو۔ اور ہر انسان کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے اپنے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے اور خدا سے ڈرو اس لیے کہ خدا جس کام کو تم انجام دیتے ہو اس سے آگاہ ہے۔

۱۹۔ اور ان لوگوں کی طرح جنہوں نے خدا کو فراموش کر دیا اور خدا نے بھی انہیں خود فراموشی کا شکار کیا نہ ہو جاؤ۔ اور وہ فاسق و گنہگار ہیں۔

۲۰۔ ہرگز اصحابِ دوزخ اور اصحابِ بہشت یکساں نہیں ہیں صرف اصحابِ جنت ہی کامیاب ہیں۔

تفسیر

شیطان کی بوسیدہ رسیوں کے ساتھ کنوئیں میں نہ جاؤ

یہ آیات اسی طرح یہودی بنی نظیر اور منافقین کی داستان کے بارے میں بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان دونوں گروہوں

کی حیثیتوں کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ شخص کرتی ہیں۔ خداوند عالم پہلے فرماتا ہے،

”بنو نظیر کے یہودیوں کی داستان ایسے لوگوں کی داستان کی مانند ہے جو ماضی قریب میں ان سے پہلے تھے۔ وہی جنہوں نے اس دنیا میں اپنے کام کا تلخ انجام دیکھا تھا اور قیامت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ (کمثل الذین من قبلہم قریباً ذاقوا وبال امرہم ولہم عذاب الیم)۔

رہی یہ بات کہ وہ کون سا گروہ تھا جس کی بنو نظیر کے واقعہ سے پہلے عبرت ناک سرگزشت تھی تو وہ اس طرح ہے کہ ان دو واقعات کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں تھا۔ ایک جماعت تو انہی مشرکین مکہ کی تھی جنہوں نے جنگ بدر میں شکست کا تلخ مزہ اپنے پورے وجود کے ساتھ چکھا تھا اور مجاہدین اسلام کی ضربوں نے انہیں تہ تیغ کر دیا تھا۔ بنو نظیر کا واقعہ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے جنگ اُحد کے بعد پیش آیا اور واقعہ بدر اُحد سے ایک سال پہلے ہوا اس وجہ سے ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی خاص فاصلہ نہیں تھا۔ بہت سے مفسرین اسے یہودی بنی قینقاع کے واقعہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو بدر کے واقعہ کے بعد ہوا اور یہود کے اس گروہ کے مدینہ سے نکالے جانے پر ختم ہوا۔ یہ تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ یہ یہودی بنی نظیر کے ساتھ زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔ یہودی بنی قینقاع بھی یہودی بنی نظیر کی مانند دولت مند، جنگ جُور اور مغرور افراد تھے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو اپنی قوت و طاقت کی بنا پر دھمکیاں دیتے تھے نکات کے زیر عنوان ہم انشاء اللہ اس کی تشریح پیش کریں گے۔ انہیں آخر کار سوائے بدبختی و بدبری اور آخرت کے عذاب الیم کے اور کچھ ملا۔ ”وبال“ کے معنی تلخ اور مخوس انجام کے ہیں اور اصل میں ”وابل“ شدید بارش کے معنوں میں ہے۔ اس لیے کہ شدید بارشیں عام طور پر خطرناک ہوتی ہیں اور انسان ان کے تلخ نتائج سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کے پیچھے خطرناک سیلاب ہوتے ہیں۔

اس کے بعد منافقین کے متعلق ایک تشبیہ پیش کرتے ہوئے خداوند عالم فرماتا ہے،

”ان کی داستان شیطان کی داستان جیسی ہے جس نے انسان سے کہا کافر ہو جا تا کہ میں تیری مشکلات کو حل کروں لیکن جب وہ کافر ہو گیا تو اس نے کہا میں تجھ سے بیزار ہوں، میں اس خدا سے جو عالمین کا پروردگار ہے ڈرتا ہوں“ (کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بری منک انی اخاف اللہ رب العالمین)۔

یہ بات کہ اس آیت میں انسان سے کون مراد ہے کیا مطلق طور پر انسان ہیں جو شیطان کے زیر اثر آجاتے ہیں، اس کے جھوٹے دعوؤں سے دھوکہ کھاتے ہیں اور راہ کفر اختیار کرتے ہیں اور شیطان آخر کار انہیں تنہا چھوڑ کر ان سے بیزاری اختیار کرتا ہے یا پھر اس سے مراد کوئی خاص انسان ہے مثلاً ابوجہل اور اس کے پیروکار جو جنگ بدر میں شیطان کے فریب دینے والے وعدوں سے سرگرم پیکار ہوئے اور آخر کار انہوں نے شکست کا تلخ مزہ چکھا، جیسا کہ سورہ انفال کی آیت ۴۸ میں ہم پڑھتے ہیں: (واذین لہم الشیطان اعمالہم وقال لاغالب لکم الیوم من الناس والی جالک فلیاتروا الفتنان نکص علی عقبیہ وقال انی بری منکم انی اری ما لاترون انی اخاف اللہ واللہ شدید العقاب) اور یاد کرو اس وقت کو

یہ جملہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے: مثلہم کمثل الذین من قبلہم۔

اگرچہ کمثل کی تعبیر اس آیت میں اور اس سے قبل والی آیت میں ایک دوسرے سے مشابہ ہے اسی بنا پر بعض مفسرین دونوں کو ایک ہی گروہ پر ناظر سمجھتے ہیں لیکن مترائن اچھی طرح گواہی دیتے ہیں کہ پہلی آیت بنو نظیر کی کیفیت کی طرف ناظر ہے اور دوسری منافقین کی کیفیت کی طرف۔ بہر حال یہ عبارت بھی مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے: مثلہم کمثل الشیطن ...

جب شیطان
والا ہوں لیکن جب
تم نہیں دیکھ رہے
یا پھر
میں شیطان نے
زیادہ مناسبت
شیطان اظہار و
بہت سے ایسے
وہ اپنے دوستوں
کڑے ہوتے
اور ان کے کافر
”ان کا
الناس خالدا
یہ ایک
سے دوچار ہونا۔
کفار کرتا ہے
کے بنی نظیر
”لے اے
والہا الذین
اس کے
خدا سے
ان بنی نظیر اور خو
کے کہتے، تاکہ
ان بنی نظیر
عاقبتہما
”ما“
نظر آتا ہے

شیطان نے مشرکین کے اعمال کو ان کی نگاہ میں وقیع بنایا اور کہا کہ آج تم پر کوئی شخص غالب نہیں آئے گا اور میں تمہارا ہمسایہ اور پناہ دینے والا ہوں لیکن جس وقت مجاہدین اسلام اور ان کے حامی فرشتوں کو دیکھا تو پیچھے ہٹ گیا اور کہا میں تم سے بیزار ہوں میں ایسی چیز دیکھ رہا ہوں جسے میں دیکھ رہے ہیں خدا سے ڈرتا ہوں اور خدا شدید العذاب ہے۔

یا پھر یہ کہ انسان سے مراد "برصیصا" بنی اسرائیل کا عابد ہے جس نے شیطان سے دھوکہ کھایا اور کافر ہو گیا اور پھر حساس لمحات میں شیطان نے اس سے بیزاری اختیار کی اور اس سے الگ ہو گیا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔ پہلی تفسیر آیت کے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور دوسری اور تیسری تفسیر ہو سکتا ہے، اس کے وسیع مفہوم کے ایک مصداق کا بیان ہو۔ بہر حال وہ عذاب جس سے انسان انہار وحشت کرے گا بظاہر عذاب دنیا ہے۔ اس بنا پر اس کا خوف واقعی اور بچتہ ہے۔ کسی قسم کی شوخی اور مزاح نہیں ہے۔ اس سے ایسے لوگ ہیں جو قریب کی سزا سے ڈرتے ہیں لیکن کافی مدت بعد کی سزا سے خائف نہیں ہوتے۔ جی ہاں منافقین کی یہی حالت ہے۔ اپنے دوستوں کو جھوٹے وعدوں کا سہارا دے کر اور مکر و فریب سے کام لے کر میدان جنگ میں بھیج دیتے ہیں۔ پھر انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے ہوتے ہیں اس لیے کہ نفاق میں وفاداری نہیں ہوتی۔ بعد والی آیت میں ان دونوں گروہوں یعنی شیطان اور اس کے پیروکار "اور منافقین ان کے کافر دوست" کے انجام کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ان کا انجام یہ ہوا کہ وہ دونوں جہنم کی آگ میں ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے ظالموں کی سزا: (فکان عاقبتہما انہما النار خالدین فیہا وذلک جزاؤ الظالمین)۔"

یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ کفر و نفاق اختیار کرنے اور شیطان اور اس کے ساتھیوں کے شریک کار بننے کا انجام شکست و ناکامی ہے۔ عذاب دنیا و آخرت اس پر مستزاد ہے جب کہ مومنین اور ان کے دوستوں کا مستقل طور پر شریک کار بننا کامیابی سے ناکر کرتا ہے اور دونوں جہان میں رحمت خدا جیسی عظیم نعمت سے انسان کو سرفراز کرتا ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں خداوند عالم مومنین کو خطا کرنے سے منع کرتا ہے اور شیطان کے منحوس اور دردناک واقعہ سے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے ایمان لانے والو خدا کی مخالفت سے ڈرو اور ہر انسان کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے قیامت کے دن کے لیے کیا چیز آگے بھیجی ہے۔ اے اللہ الذین امنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد"۔ اس کے بعد دوبارہ تاکید کے لیے فرماتا ہے:

"خدا سے ڈرو اس لیے کہ خدا اس کام سے جسے تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔" (واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون)۔ تقویٰ اور خوف خدا سبب بنتے ہیں کہ انسان روز قیامت کے لیے اپنے اعمال کو پاک و پاکیزہ کرے۔ تقویٰ کے حکم کی تیزوار، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، تاکید کے لیے ہے کیونکہ تمام نیک اعمال بجا لانے اور گناہوں سے پرہیز کرنے کا سبب یہی تقویٰ اور خدا کا خوف ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ تقویٰ کا پہلا حکم تو اچھے اعمال انجام دینے کا محرک ہے اور دوسرا حکم ان اعمال میں خلوص کی کیفیت

عاقبتہما کان کی خبر ہے اور منصوب ہے اور انہما فی النار اسم کان کی جگہ ہے اور خالدین عہما کا حال ہے۔

یہ کہ "ما" ما قدمت لغد میں موصول ہے یا استئناسیہ مفسرین نے دو احتمال تجویز کیے ہیں اور یہ آریہ شریف میں دونوں کی گنجائش ہے۔ استفہاسیہ زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

تفسیر نمونہ

بھولو بھلو

واضح جی

گزشتہ آیا

کے ساتھ

فنیہ

سے روکے

فاسق ہیں

جو دونوں

کا شکار

معرفت

ایک دو

جمع کر

نہیں

بکہ دنیا

آپ

سے

آپ

سے

آپ

سے

آپ

سے

آپ

سے

پیدا کرنے کے بارے میں ہے۔ یا یہ کہ پہلے حکم کی نظر اچھے کام انجام دینے کی طرف ہے۔ (ما قدمت لغد کے جملے کے قرینے اور دوسرا گناہوں اور معاصی سے پرہیز کی طرف اشارہ ہے۔ یا یہ کہ پہلا حکم گناہوں سے توبہ کرنے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا آئندہ کے تقویٰ کے لیے ہے لیکن آیات میں ان تفاسیر کے لیے کوئی قرینہ کلام موجود نہیں ہے۔ لہذا تاکید والی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ "غدا" کی تعبیر قیامت کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ عمر دنیا کی سرعت رفتار کی طرف توجہ کرنے سے یہ چیز محسوس ہو جاتی ہے کہ قیامت بہت جلد آئے گی اور نکرہ کی صورت میں اس کا ذکر اس کی اہمیت کی بنا پر ہے۔ "نفس" (ایک شخص کی تعبیر ہو سکتا ہے، کہ ایک فرد کے معنی میں ہو یعنی انسان اپنے کل کی فکر کرے اور بغیر اس کے کہ دوسروں سے توقع رکھے کہ وہ اس کے لیے کوئی کام انجام دیں گے وہ جب تک اس دنیا میں جو کچھ بھی سکتا ہے اُسے بھیجے۔ یہ تفسیر بھی اوپر والی تعبیر کے بارے میں کی گئی ہے اور یہ ان افراد کی قلت کی طرف اشارہ ہے جو قیامت کی فکر کرتے ہیں بالکل اس طرح جیسے کہیں گے کہ میں ایک ہی شخص بل جائے جو اپنی نجات کی فکر میں ہو۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور یا ایہا الذین امنوا کا خطاب اور تقویٰ کے امر کی عمومیت کی دلیل ہے۔ اس کے بعد کی آیت تقویٰ اور معاد کی طرف توجہ کے امر کے بعد یاد خدا کی تاکید کرتے ہوئے ہے "ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا ہے اور خدا نے بھی انہیں خود فراموشی کا شکار بنا دیا ہے۔" (ولم یحکونوا کالذین نسوا اللہ فانساہو انفسہم)۔ اصولی طور پر تقویٰ کی اصل حقیقت اور بنیاد دو چیزیں ہیں :

ایک تو خدا کی یاد یعنی خدا کی دائمی مراقبت اور اس کے ہر جگہ اور ہر حال میں حاضر و ناظر ہونے کا یقین اور یہ احساس کہ خدا عادل ہے۔ دوسرے اعمال کی طرف توجہ کہ کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں ہے جو نامہ اعمال میں مندرج نہ ہو۔ اس بنا پر یہی دو باتیں، مبادا اور معاد کی طرف توجہ انبیاء اولیاء کے تربیتی لائحہ عمل کا عنوان قرار پاتی ہیں اور ان کی تاثیر فرد اور معاشرہ دونوں کی اصلاح اور تزکیہ کی مکمل طور پر نگرانی ہے۔ قابل توجہ بات ہے کہ قرآن یہاں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا کو بھلا دینا خود فراموشی کا سبب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ ایک طرف تو پروردگار کو بھول جانا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان مادی لذتوں اور حیوانی خواہشات میں ڈوب جائے اور اپنے مقصد خلقت کو بھلا دے اور اس کے نتیجے میں روز قیامت کے لیے نیک اعمال کا ذخیرہ کرنا ہے اس سے غافل ہو جائے۔ دوسری جانب خدا کو فراموش کرنا اس کی صفات پاک کو فراموش کرنے کے مترادف ہے، اس لیے کہ ہستی مطلق، علم بے پایاں اور غیر متناہی استغناء تو بھگتی کے ساتھ مخصوص ہے اُس کے علاوہ جو کچھ اس کی ذات پاک کا محتاج ہے۔ ان حقائق کو بھلا دینا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان خود کو مستقل غنی اور بے نیاز کہنے لگے اور اس طرح اپنی حقیقت اور انسانی واقعیت کو فراموش کر دے۔

اصولی طور پر انسان کی سب سے بڑی بد بختی اور مصیبت خود فراموشی ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی اس ذاتی قدر و قیمت، استعداد اور لیاقت کو جسے خدا نے اس کے وجود میں پوشیدہ رکھا ہے اور اسے باقی مخلوق سے ممتاز قرار دیا ہے، فراموشی کے سپرد کر دیتا ہے اور یہ اقدام اپنی انسانیت کو فراموش کر دینے کے مترادف ہے۔ اس قسم کا انسان ایک درندہ کی سطح تک گر جاتا ہے اور اس کا مقصد سوائے کھانے پینے، سونے جاگنے اور شہرت لانی کے اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ باتیں فسق و فجور کا بنیادی سبب ہیں بلکہ یہ فراموشی فسق کا اور اطاعت خدا کے حلقے سے نکل جانے کا بنیادی سبب ہے۔ اسی بنا پر آیت کے آخر میں فرماتا ہے :

"اس قسم کے فراموش کرنے والے انسان فاسق ہیں۔" (اولئک هم الفاسقون)۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ خدا کو

بھولو بلکہ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھول گئے ہیں اور خدا نے انہیں خود فراموشی کا شکار بنا دیا ہے۔ یہ موقع تحقیقت میں ایک واضح جی مصداق کی نشان دہی کرتا ہے جس میں لوگ خدا کو فراموش کرنے کا انجام دیکھ سکتے ہیں۔ یہ آیت بظاہر منافقین کے متعلق ہے جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا تھا یا یہودی بنی نظیر کے متعلق ہے یا دونوں کے متعلق ہے۔ اس مضمون کی ایک آیت سورہ توبہ کی آیت ۶۷ میں خصوصیت کے ساتھ منافقین کے بارے میں آچکی ہے جہاں پر درکار عالم فرماتا ہے:

(المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض يأمرون بالمنكر وينهون عن المعروف ويقبضون أيدى يهود نساء الله فليهو ان المنافقين هم الفاسقون) "منافق مرد اور عورتیں سب ایک ہی گروہ سے ہیں وہ بُری چیز کا حکم دیتے ہیں اور اچھی چیز سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ انفاق و خجش سے روکے رکھتے ہیں وہ خدا کو بھول چکے ہیں۔ خدا نے بھی انہیں فراموش کر دیا ہے۔ منافقین یقیناً ناسق ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہاں خدا کو فراموش کرنا اس کی رحمت کے منقطع ہونے کا سبب بیان ہوا ہے اور یہاں خود فراموشی کا سبب ہے۔" (غور کیجئے)۔

آخری زیر بحث میں ان دونوں گروہوں (مومنین، صاحب تقویٰ اور مبداء کی طرف متوجہ افراد اور خدا کو فراموش کرنے والے افراد جو خود فراموشی کا شکار ہوئے ہیں) کے موازنہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اصحاب دوزخ اور اصحاب بہشت یکساں نہیں ہیں۔" (لا یستوی اصحاب النار واصحاب الجنة)۔ اس دنیا میں اور اس کے بعد میں طرز فکر میں، افرادی و اجتماعی طرز زندگی میں، اس کے مقاصد میں، آخرت اور اس کے عذاب و ثواب میں ان دونوں گروہوں کا خط عمل ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ ایک یاد خدا، قیامت، بلند انسانی اقدار کے تصورات میں محاور زندگی جادوئی کے لیے ذخائر حسنات جمع کرنے میں مصروف ہے اور دوسرا مادی خواہشات میں غرق اور ہر نیکی کی فراموشی میں گرفتار اور ہر بڑا و بوس کا قیدی ہے۔ اس طرح انسان دورا ہے پر نظر آتا ہے، یا پہلے گروہ سے ملحق ہو جائے یا دوسرے سے وابستہ ہو جائے۔ درمیان میں تمیز کوئی راستہ نہیں ہے۔ آیت کے آخر میں ایک حکم قاطع کی شکل میں فرماتا ہے:

"صرف اصحاب جنت ہی کامیاب ہیں۔" (اصحاب الجنة هم الفائزون)۔ نہ صرف قیامت میں رست گار و کامیاب ہیں بلکہ دنیا میں بھی کامیابی، آرام و سکون اور نجات انہی کے لیے ہے اور شکست و نالائقی ان میں ان کا مقدر ہے جو خدا کو فراموش کرنے والے ہیں ایک اور حدیث رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمیں ملتی ہے جس میں آپ نے اصحاب جنت ایسے لوگوں کو قرار دیا جنہوں نے آپ کی اطاعت کی اور ولایت جناب امیر علیہ السلام کو قبول کیا۔ لہذا اصحاب النار وہ ہوئے جنہوں نے ولایت علی کو قبول نہیں کیا آپ سے جنگ کی اور نقض عہد کیا۔ یہ آیت کے مفہوم کا ایک واضح مصداق ہے اور اس کی عمومیت میں اس سے کوئی کمی نہیں آتی۔

چند نکات

۱۔ اہل نفاق کے ساتھ بے مقصد شرکت عمل جو کچھ مندرجہ بالا آیتوں میں منافقوں کی عہد شکنی اور اپنے دوستوں کو سخت لمحات میں تنہا چھوڑ دینے کے بارے میں آیا ہے، یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے متعلق لایستوی عمومیت کی دلیل ہے۔

جس کے نمونے ہم نے بار بار اپنی زندگی میں دیکھے ہیں۔ یہ لوگ گمراہ کرنے والے شیطان کی طرح ہر شخص کے دل میں دوسو سہ ڈالتے ہیں، جسے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کرتے ہیں، انہیں میدانِ حوادث میں بھیجتے ہیں اور انواع و اقسام کے گناہوں میں آلودہ کرتے ہیں لیکن بجز انی لحاظ نہیں وسط میدان میں چھوڑ کر اپنی جان کی حفاظت اور مفادِ ذات کے لیے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی سرگزشت ہے جو منافقین کے درجہ اور ان کے ساتھ عہدِ محبت استوار کرنے والے افراد ہیں۔ اس کا زندہ نمونہ ہمارے زمانہ میں وہ عہد و پیمان ہیں جو سپر طاقتیں (ہمارے زمانے کے شیاطین) ان ممالک کے سربراہوں سے کرتے ہیں جو ان سے وابستہ ہیں اور ہم نے بار بار دیکھا ہے کہ یہ وابستہ ممالک، جنہوں نے اپنی ساری بضاعت طبقِ اخلاص میں رکھ کر ان شیطان صفت حاسیوں کے سامنے پیش کر دی ہے، سخت حوادث میں مکمل طور پر تنہا رہ جاتے ہیں اور ان سے دھتکارے جاتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے جہاں ہم قرآن کے اس پیغام سے زیادہ شناسائی حاصل کر سکتے ہیں جو کہتا ہے: (کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بری منک انی اخاف اللہ رب العالمین) ”ان کا کام شیطان کی مانند ہے جس نے انسان سے کہا کافر ہو جا جب وہ کافر ہو گیا تو اس نے کہا میں تجھ سے بیزار ہوں میں اس خدا سے ڈرتا ہوں جو عالمین کا پروردگار ہے۔“

۲۔ برصیصا عابد کی حیرت انگیز داستان

بعض مفسرین اور اربابِ حدیث نے ان آیات کے ذیل میں ایک پُر معنی روایت بنی اسرائیل کے برصیصا عابد کے بارے میں پیش کی جو تمام افراد کے لیے درسِ عبرت ہو سکتی ہے یعنی وہ یہ داستان سن کر شیطان کے فریب سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ جو شخص ان کے ہرکامے میں آتا ہے وہ عذابِ الہی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس داستان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

بنی اسرائیل میں ایک نامی گرامی عابد تھا جس کا نام برصیصا تھا جس نے طویل عرصہ تک عبادتِ پروردگار کی تھی جس کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ جاں بلب مریضوں کو اس کے پاس لاتے تھے اور اس کی دعا کے نتیجے میں انہیں دوبارہ صحت و سلامتی میسر ہو جاتی تھی۔ ایک دن ایک معقول گھرانے کی عورت کو اُس کے بھائی اس کے پاس لائے اور طے پایا کہ کچھ عرصہ تک وہ عورت وہیں رہے تاکہ اُس کو شفا حاصل ہو۔ اب شیطان نے اس کے دل میں دوسو سہ ڈالنے کا پروگرام بنایا اور اس قدر اُس کو اپنے دام میں اسیر کیا کہ اس عابد نے اُس عورت سے بے نیاز ہو کر کچھ دنوں بعد یہ بات کھل گئی کہ وہ عورت حاملہ ہے (کیونکہ ہمیشہ ایک گناہ عظیم تر گناہوں کا سرچشمہ بنتا ہے)۔ اس نے عورت کو قتل کر دیا اور بیابان کے ایک گوشہ میں دفن کر دیا۔ اُس عورت کے بھائی اس واقعہ سے باخبر ہوئے کہ مرد عابد نے اس قسم کے ظلم عظیم کا اقدام کیا ہے۔ یہ خبر ملے شہر میں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ امیر شہر کے کانوں تک جا پہنچی۔ وہ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر چلا تا کہ حقیقتِ حال سے باخبر ہو۔ جس وقت عابد کا ظلم ثابت ہو گیا تو اُس کو اُس کی عبادت گاہ سے کھینچ کر باہر لے آئے۔ اقرارِ گناہ کے بعد حکم دیا گیا کہ اسے سولی پر چڑھا دیا جائے جس وقت وہ سولی پر چڑھایا جانے لگا تو شیطان اس کے سامنے نمودار ہوا اور کہا وہ نہیں تھا جس نے تجھے اس مصیبت میں پھنسایا۔ اب اگر جو کچھ میں کہوں مان لے تو میں تیری نجات کا سامان فراہم کرتا ہوں۔ عابد نے کہا میں کیا کروں۔ اس نے کہا میرے لیے تیرا صرف ایک سجدہ کافی ہے۔ عابد نے کہا جس حالت میں تو مجھے دیکھ رہا ہے اس میں سجدہ کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ شیطان نے کہا: اشارہ ہی کافی ہے۔ عابد نے گوشہ چشم یا ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس طرح شیطان کی بارگاہ میں سجدہ بجا لایا اور اسی وقت مر گیا اور دنیا سے کافر گیا۔

۳۔ جو کچھ آگے بھیجا چاہیے

مندرجہ بالا آیات میں اس مسئلہ پر زور دیا گیا تھا کہ انسان کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے قیامت کے لیے کون سا ذخیرہ اعمال جمع کیا ہے۔ (ولتظفر نفس ما قدمت لعد) درحقیقت میدان قیامت میں انسان کا سرمایہ اصلی وہ اعمال و افعال ہیں جو اس نے آگے بھیجے ہیں۔ دوسرا کوئی شخص اس فکر میں نہیں ہے کہ اس کے لیے اس کی موت کے بعد کوئی چیز بھیجے اور اگر بھیجے بھی تو اس کی زیادہ قدر و قیمت نہیں ہے۔ ایک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے سامنے آئی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

”راہ خدا میں انفاق کرو چاہے تین سیر کھجوریں ہوں یا اس سے بھی کم یا مٹھی بھر ہوں یا اس سے بھی کم۔ یہاں تک کہ آدھا خرابی کیوں نہ ہو اور اگر کسی کو یہ بھی نہ مل سکے تو پھر وہ پاکیزہ باتوں سے دلوں کو خوش کرے اس لیے کہ قیامت میں جب انسان بارگاہ خدا میں پیش ہوگا تو خدا پوچھے گا کیا میں نے تیرے متعلق ایسا اور ایسا نہیں کیا؟ کیا کان اور آنکھ تیرے اختیار میں نہیں دیے ہو کیا مال اور اولاد تجھ کو نہیں بخشے تھے؟ بندہ عرض کرے گا ہاں۔ تو اس وقت خداوند متعال کہے گا تو پھر دیکھ کہ تو نے اپنے آگے کے لیے کیا بھیجا ہے۔“

(فینظر قدمه وخلفه وعن يمينه وعن شماله فلا يجد شيئا يلقى به وجهه من النار)۔

وہ اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھے گا اسے کوئی چیز نہیں ملے گی جس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ جہنم کی آگ سے محفوظ رکھ سکے۔ ایک اور حدیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعض اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ قبیلہ مضر کا ایک گروہ وارد ہوا جن کی کمروں میں تلواریں لٹکی ہوئی تھیں۔ (وہ راہ خدا میں جہاد کے لیے آمادہ تھے)۔ لیکن ان کے کپڑے اچھے نہیں تھے۔ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاجت مندی اور بھوک کے آثار ان کے چہروں پر دیکھے تو آپ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آپ مسجد میں آئے، منبر پر تشریف لے گئے اور خدا کی حمد و ثنا بجالانے کے بعد ارشاد فرمایا :

”خدا نے یہ آیت قرآن مجید میں نازل فرمائی ہے۔“ یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ ولتظفر

نفس ما قدمت لعد...

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا :

”راہ خدا میں انفاق کرو اس سے پہلے کہ قوت و قدرت تم سے سلب ہو جائے اور راہ خدا میں صدقہ و قبل اس کے کہ اس میں کوئی مانع پیدا ہو جائے جن کے پاس دینار ہے وہ دینار سے جن کے پاس درہم ہے وہ درہم سے اور جو گندم و جو رکھتے ہیں وہ گندم و جو سے انفاق کریں اور کسی چیز کو کم تر خیال نہ کریں خواہ خرما کا آدھا دانہ ہی کیوں نہ ہو۔“

انصار میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک قبیلہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دمی تو آثار سرور و انبساط آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے چہرہ مبارک پر ہویا ہوئے، فرمانے لگے :

”جو شخص سنتِ حسنہ کی بنیاد رکھے اور لوگ اس پر عمل کریں تو اس کا اجر اور ان تمام لوگوں کا اجر جو اس پر عمل کرتے ہیں اس ابتدا کرنے والے شخص کو نصیب ہوگا بغیر اس کے کہ لوگوں کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو اور جو شخص بُری رسم کو جاری کرے اس کا گناہ اور ان تمام لوگوں کا گناہ جو اس پر عمل کرتے ہیں اس رسم قبیح جاری کرنے والے کے ذمہ ہوگا بغیر اس کے کہ دوسرے لوگوں کے گناہ میں کوئی کمی ہو۔“

لوگ کھڑے ہو گئے جس کے پاس دینار تھا وہ دینار لے آیا۔ جس کے پاس درہم تھا وہ درہم لے آیا۔ جس شخص کے پاس جو چیز حقیقیہ خدمتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لے آیا۔ اس طرح سے معقول قسم کی مدد، نقد اور بصورت اشیاء، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جمع ہو گئیں جسے آپ نے ان حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا۔

یہی مفہیم قرآن کی دوسری آیات میں بار بار آئے ہیں اور ان کی تاکید کی گئی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۰ میں ہم پڑھتے ہیں :

(واقيموا الصلوة واتوا الزكوة وما تقدموا لانفسكم من خير تجدوه عند الله ان الله بما تعملون بصير)

نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور جس کا بخیر کو اپنے لیے تم آگے بھیجتے ہو اسے خدا کے ہاں پاؤ گے خدا تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

۲۱۔ لَوَ أَنزَلْنَاهُ الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۚ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝

۲۲۔ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ عِلْمُ الْغُيُوبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝

۲۳۔ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ ۚ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيَّمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

۲۴۔ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۚ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ترجمہ

۲۱۔ اگر اس قرآن کو ہم پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ وہ اس کے سامنے خشوع سے پیش آتا

اور خوفِ خدا سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کیلئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔

۲۲۔ خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ پوشیدہ و آشکار سے آگاہ ہے اور

وہ رحمن و رحیم ہے۔

یعنی وہ قدرت
مکین ہے

۲۳۔ خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ اصلی حاکم اور مالک وہی ہے ہر عیب سے منزہ ہے۔ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ مومنین کو امنیت بخشتا ہے۔ ہر چیز کا نگہبان ہے اسے شکست نہیں ہوتی۔ طاقتور ہے اپنے ہر ارادہ نافذ کے ساتھ اصلاح کرتا ہے۔ وہ بزرگی و عظمت کے لائق ہے اور اس سے منزہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔

۲۴۔ وہ خداوند خالق اور بے سابقہ پیدا کرنے والا ہے۔ وہ (بے نظیر) صورت کشی کرنے والا ہے اس کے لیے اچھے نام ہیں۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کرتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

تفسیر

اگر قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتے

گزشتہ آیتوں کے بعد جو مختلف طریقوں سے انسانوں کے دلوں میں نفوذ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں اور جنہوں نے ان کے تقدیر ساز مسائل زندہ شکل میں پیش کیے، ان آیات میں، جو سورہ حشر کی آخری آیات ہیں اور عام آیات قرآنی پر روشنی ڈالتی ہیں، اس حقیقت کو منکشف کیا گیا ہے کہ قرآن کا نفوذ اس قدر گہرا ہے کہ اگر یہ پہاڑوں پر نازل ہوتا تو انہیں ہلا کر رکھ دیتا۔ لیکن تعجب ہے اس سنگ دل انسان پر کہ وہ اسے سنتا تو ہے مگر اس پر لرزہ بھی طاری نہیں ہوتا۔ خداوند عالم پہلے فرماتا ہے:

”اگر قرآن کو ہم پہاڑ پر نازل کرتے تو تو شاہد کرتا کہ وہ اس کے سامنے خشوع کر رہا ہے اور خوف خدا سے اس میں شکاف پڑ گئے ہیں۔“ (لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعاً متصدعاً من خشية الله)۔ اور یہ ضرب الامثال جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں وہ اس لیے ہیں کہ لوگ ان میں غور و فکر کریں۔ (وتلك الامثال نضرب بها للناس لعلهم یتفکرون)۔ بہت سے مفسرین نے اس آیت کی تشبیہ کی شکل میں تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ پہاڑ باوجود اس سختی کے جو ان میں ہے اگر عقل و احساس بھی رکھتے اور یہ آیات انسانوں کے دلوں کی بجائے ان پر نازل ہوتیں تو وہ اس طرح لرزہ بر اندام ہو جاتے کہ ان میں شکاف پڑ جاتے لیکن سخت دل انسانوں کا ایک گروہ اسے سنتا ہے اور بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ اور اس جملہ کو (وتلك الامثال نضرب بها للناس) مذکورہ تفسیر پر دلیل قرار دیا ہے۔ بعض مفسرین نے اسے اس کے ظاہر پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ اس جہان کے تمام موجودات جن میں پہاڑ بھی شامل ہیں، اپنے اندر ایک قسم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں اور اگر یہ آیات پہاڑوں پر نازل ہوتیں تو وہ یقیناً ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ ان معانی پر سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۴

اگر وہ قرار دیتے
انہ الانھاس و
ہر کی طرح سند
مائی ہیں۔ کچھ
اٹ نیچے
”مثلاً“
اس تفسیر سے
کہ ان میں
ان میں نمایاں ہو
لیکن
انوں اور تہذیب
الطہارہ اوصاف
السان کی حق تعالیٰ
”خدا“
الہو عا
نہا کی معرفت
بہا کر راغب
کی اور علمی دا
ان لیے کہ
لرہ الغام
اور اس کے
کچھ اور تفوہ
اس پر جو
استے میں
اور اس میں
”مقتہ“
اس

اگر وہ قرار دیتے ہیں۔ ثم قست قلوبكم من بعد ذلك فهي كالحجارة او أشد قسوة وان من الحجارة لمانيتفجر منه الانهار وان منها لما يشفق فيخرج منه الماء وان منها لما يهبط من خشية الله (پھر تمہارے دل اس واقعہ کے پھر کی طرح سخت ہو گئے یا اس سے بھی زیادہ سخت کیونکہ کچھ پتھر ایسے ہیں جن میں شگاف پڑ جاتے ہیں اور ان میں سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن میں شگاف پڑ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی ٹپکنے لگتا ہے اور بعض خوف خدا کے اثر نیچے گر جاتے ہیں۔

”مثلاً“ کی تفسیر ہو سکتا ہے کہ توصیف کے معنی میں ہو جیسا کہ یہ لفظ قرآن مجید میں بار بار اس معنی میں آیا ہے اس بنا پر مذکورہ تعبیر اس تفسیر سے نہیں ٹھکرائی۔ قابل توجہ یہ بات ہے کہ پہلے فرماتا ہے کہ پہاڑ قرآن کے سامنے خاشع و خاضع ہو جاتے ہیں، پھر مزید فرماتا ہے کہ ان میں شگاف پڑ جاتے ہیں جو اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن ان میں بتدریج نفوذ کرتا اور ہر زمانے میں قرآن کی تاثیر کے نئے آثار ان میں نمایاں ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کی قوت جواب دے دیتی ہے اور یہ عاشق بے قرار کی طرح دالہ و شیدا ہو جاتے اور پھر شگافتہ ہو جاتے۔ لیکن بعد میں آنے والی آیات میں خدا کے اوصاف جلال و جمال میں سے ایک اہم حصہ کا تذکرہ ہے جس کی طرف توجہ کرنا تربیت نفس اور تہذیب قلوب کے لیے بڑا پُر تاثیر ہے۔ پروردگار عالم ان آیتوں میں سے تین آیات میں پندرہ صفتیں اور دوسرے الفاظ میں اٹھارہ اوصاف اپنی صفات عظیمہ میں سے بیان کرتا ہے اور ہر آیت توحید الہی اور اللہ کے مقدس نام کے بیان سے شروع ہوتی ہے اور انسان کی حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کے نورانی عالم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ فرماتا ہے :

”خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، جو غیب و شہود سے آگاہ ہے اور رحمن و رحیم ہے۔“ (هو الله الذي لا اله الا هو عالم الغيب والشهادة هو الرحمن الرحيم)۔ یہاں ہر چیز سے پہلے مسئلہ توحید جو تمام اوصاف جلال و جمال کی مروج ہے اس کی معرفت کو اس پر مبنی قرار دیتا ہے اور غیب و شہود کے بارے میں خدا کے علم و دانش پر انحصار کرتا ہے۔ ”شہادت و شہود“ اس کا راغب مفردات میں کہتا ہے : مشاہدہ کے ساتھ مشروط ہے چاہے دل کی آنکھ سے ہو چاہے ظاہری آنکھ سے۔ اسی بنا پر ان کا کسی اور علمی دائرہ کار جو ہے وہ عالم شہود ہے اور جو کچھ اس دائرہ سے باہر ہے وہ عالم غیب شمار ہوتا ہے لیکن یہ سب علم خدا کے لیے یکساں ہیں۔ اسی لیے کہ اُس کا وجود بے پایاں ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور کوئی جگہ بھی اس کے علم و حضور کی قلم رو سے باہر نہیں ہے۔ اسی لیے سورہ انعام کی آیت ۵۹ میں ہمیں ملتا ہے۔ (وعندہ مفاتيح الغيب لا يعلمها الا هو) ”غیب کی چابیاں صرف اس کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی شخص انہیں نہیں جانتا۔ اس شان کے خدا کے نام کی طرف توجہ سبب بنتی ہے کہ انسان اسے ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھے اور تقویٰ اختیار کرے۔ اس کے بعد اُس کی رحمت عام پر جو تمام مخلوقات کے شامل حال ہے لفظ رحمن کے حوالے سے اور اس کی رحمت خاص پر جو مومنین کے لیے مخصوص ہے لفظ رحیم کے حوالے سے انحصار ہوا ہے تاکہ وہ انسان کو اُمید دلائے اور اسے معرفت خدا اس طولانی راستے میں مدد دے جو اس کو درپیش ہے۔ اس مرحلہ کا طے کرنا پروردگار کے لطف و کرم کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ راستہ ایک طرح کا ظلمت والا ہے جس میں گمراہی کا خطرہ ہے۔ اس طرح صفت توحید کے علاوہ اس کی عظیم صفتوں میں سے اس آیت میں تین عظیم صفتیں بیان کی ہیں۔ فرماتا ہے :

”متصدع“ ”صدع“ کے مادہ سے سخت و حکم چیزوں میں شیشہ اور پتھر کی طرح شگاف پڑنے کے معنی میں ہے اور اگر درد سر کو صداع کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ گویا انسان کا سر پھٹ رہا ہے۔

”خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ (ہو اللہ الذی لا الہ الا هو)۔“ حاکم و مالک اصلی وہی ہے“ (الملک) ہر عیب سے پاک و منزہ ہے۔“ (القدوس) کسی پر کسی قسم کا ظلم و ستم روا نہیں رکھتا اور اس کی طرف سے سب سلامتی میں ہیں۔“ (السلام) اصولی طور پر اس کی دعوت فکر سلامتی کی طرف لے جاتی ہے۔“ واللہ یدعو الی دار السلام (یونس ۲۵) اور اُس کی ہدایت بھی سلامتی ہی کی طرف متوجہ ہے۔“ (یہدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبیل السلام) (مائہ ۱۶) اور جو قرآگاہ مومنین کے لیے ہے وہ سلامتی کا گھر ہے۔“ (لحمہ دار السلام عند ربہم) ”جنتیوں کا درود و تحیہ بھی سلام کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔“ (الآقیلا سلاماً) (واقعہ ۲۶)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

”وہ اپنے دوستوں کو تحفظ بخشتا ہے اور ایمان عطا فرماتا ہے۔“ (المومن)۔

”ہر چیز کا نگہبان ہے۔“ (المہمین)۔

”وہ ایسا صاحب قدرت ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہو گا۔“ (المغنین)۔ ”وہ اپنے نفوذ والے ارادہ کے ساتھ ہر چیز کی اصلاح کرتا ہے۔“ (الحجّاس) یہ لفظ جو مادہ جبر سے لیا گیا ہے کبھی قہر و غلبہ اور نفوذ ارادہ کے معنوں میں آتا ہے اور کبھی اصلاح کے معنوں میں۔ راغب دونوں معنوں کو آپس میں ملا کر کہتا ہے، جبر کی اصل کسی چیز کی غلبہ اور قوت سے اصلاح کرنا ہے۔ یہ لفظ جب خدا کے لیے استعمال ہو تو اس کی ایک عظیم صفت کو بیان کرتا ہے یعنی وہ ارادہ کے نفوذ کے ساتھ اور کمال قدرت کے ساتھ ہر فساد کی اصلاح کرتا ہے۔ لیکن جب یہی لفظ خدا کے غیر کے لیے استعمال ہو تو مذمت کا باعث ہوتا ہے اور بقول راغب ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنی کوتاہیوں کا ازالہ ایسے منصب کا دعویٰ کر کے کرے جس کا وہ اہل نہ ہو۔ یہ لفظ قرآن مجید میں دس مواقع پر استعمال ہوا ہے جس میں سے نو موقعوں پر ظالم اور گروہیں کاٹنے والے ضد افراد کے بارے میں ہے۔ صرف ایک موقع پر قادر مطلق کے لیے استعمال ہوا ہے اور وہ اسی زیر بحث آیت میں ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

ل بعض مفسرین نے سلام کو بیان ہر قسم کے عیب و نقص و آفت سے سلامتی کے معنی میں لیا ہے لیکن اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ معنی لفظ ”قدرت“ میں موجود ہیں جو پہلے آچکا ہے اس کے علاوہ سلام عام طور پر قرآن مجید میں دوسروں کو سلامتی بخشنے کے مسئلہ میں آیا ہے اور اصولی طور پر لفظ سلام جو ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت کہا جاتا ہے۔ وہ اظہار دوستی اور مہر مقابل سے روابط کی سلامتی کے بیان کے لیے ہے لہذا جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ مناسب نظر آتا ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں مومن کی صاحب ایمان کے معنی میں تفسیر کی ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ پہلا ہے جو خدا کی پاک ذات اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے وہ خود وہی ہے لیکن جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔

اس لفظ کے اصل کے بارے میں مفسرین اور ارباب لغت کے درمیان دو قول موجود ہیں۔ بعض اسے ”ہمین“ کے مادہ سے جانتے ہیں جس کے معنی نگہبان کے ہیں اور بعض ایمان کے مادہ سے، کہ اس کا ہمزہ ”ہا“ میں بدل گیا ہے اور سکون و اطمینان دینے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ دو قرآن مجید میں آیا ہے۔ ایک دفعہ خود قرآن کے بارے میں (مائہ ۴۸) اور ایک دفعہ خدا کی تعریف و توصیف میں زیر بحث آیت میں استعمال ہوا ہے۔ اور دونوں موارد میں وہی پہلے معنی مناسب ہیں۔ (لسان العرب، تفسیر قرآنی، روح المعانی) الباقی رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں ابراہیم سے نقل کرتا ہے کہ کلام عرب میں صرف پانچ نام ہیں جو اس وزن پر آتے ہیں۔ ”مہمین“ ”مسیطر“ ”مبیطر“ (طیب کا جانور) ”مبیطر“ وہ شخص جو اپنا راستہ کھولتا ہو اور آگے بڑھتا ہو۔ ”مخیمر“ ایک پہاڑ کا نام ہے۔

کرتا ہے
دوسرے
صفات
استعمال
ہوئی تھی

ظاہر ہے

میں ان ص

”

(المبار

و

بلندی کی

”

موجودات

والارض

کہتے ہو

”

دوسری نظا

ان تینوں آ

ترتیب یہ

۱۔

۲۔

۳۔

”

”

”وہ بزرگی اور عظمت کے لائق ہے اور کوئی چیز اس سے بڑا والا نہیں ہے۔“ (المتکبر) متکبر متکبر کے مادہ سے دو معانی پر دلالت کرتا ہے۔ ایک معنی مدوح ہیں جو خدا کے لیے استعمال ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ بزرگی، نیک کاموں اور بہت سی پسندیدہ صفات کا حامل ہونا۔ دوسرے معنی مذموم ہیں جو غیر خدا کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پھوٹے اور کم حیثیت افراد بزرگی اور عظمت کا دعویٰ کریں اور جن صفات کے وہ حامل نہیں ہیں ان کا دعویٰ کریں اور چونکہ بزرگی و عظمت صرف خدا کو زیبا ہے، لہذا یہ لفظ اپنے مدوح معنی میں صرف خدا کے لیے استعمال ہوتا ہے اور جب اس کے غیر کے لیے استعمال ہو تو مذموم معانی رکھتا ہے۔ آیت کے آخر میں دوبارہ مسئلہ توحید پر، جس سے ابتدا ہوئی تھی، زور دیتے ہوئے فرماتا ہے :

”خدا اس سے منزہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔“ (سبحان اللہ عما یشئکون)۔ جو وضاحت کی گئی ہے اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کوئی موجود ان صفات میں، جو یہاں بیان ہوئی ہیں، اس کا شریک اور اس کی شبیہ و نظیر نہیں ہو سکتا۔ آخری زیر بحث آیت میں ان صفات کی تکمیل کے لیے چھ اور اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

”وہ خدا ہے پیدا کرنے والا“ (هو الله الخالق)۔ ”وہ خدا جس نے مخلوقات کو بے کم و کاست اور بغیر کسی سابقہ نمونہ کے خلق کیا ہے۔“ (المبارئ)۔

وہ خالق و آفریدگار جس نے ہر چیز کو ایک مخصوص شکل و صورت بخشی ہے (المصور) اور پھر چونکہ خدا کے اوصاف لامحدود ہیں بلکہ وہ اس کی رفعت و بلندی کی طرح لامتناہی ہیں لہذا مزید فرماتا ہے :

”اس کے لیے اچھے نام ہیں“ (له الاسماء الحسنی)۔ اسی وجہ سے وہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے مبرا و منزہ ہے اور وہ تمام موجودات جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسے ہر عیب و نقص سے پاک شمار کرتے ہیں۔ (یسبح له ما فی السماوات والارض)۔ آخر کار تاکید مزید کے لیے نظام آفرینش پر اس کی صفتوں میں سے دو صفتوں کی طرف، جن میں سے ایک پہلے آچکی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

”وہ عزیز و حکیم ہے“ (وهو العزيز الحكيم)۔ پہلی صفت ہر چیز پر کمال قدرت رکھنے اور ہر مانع پر غالب ہونے کی نشانی ہے۔ دوسری نظام آفرینش، امر خلقت اور تدبیر کے معاملہ میں دقیق اور باریک بینی سے منظم لائحہ عمل کے متعلق علم و آگہی کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح ان تینوں آیتوں کے مجموعہ میں مسئلہ توحید کے علاوہ، جس کی دو مرتبہ تکرار ہوئی ہے، خدا کے اوصاف میں سے سترہ صفتیں آئی ہیں اور ان کی ترتیب یہ ہے :-

- ۱۔ عالم الغیب والشہادہ -
- ۲۔ رحمن
- ۳۔ رحیم

۴۔ ”بارئ“ مادہ ”بر“ (بروزن قفل) اصل میں صحت یابی اور ناخوشگوار امور سے رہائی کے معنی میں ہے لہذا باری اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو کسی بیشی کے بغیر مکمل اور موزوں طور پر ایسا کرے۔ بعض نے اسے ”بزی“ (بروزن نفی) کے مادہ سے کٹری کو تراشنے کے معنی میں لیا ہے جو اسے نغزل بنانے کے مقصد کے لیے انجام دیا جاتا ہے۔ بعض اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ باری وہ شخص ہے جو کسی چیز کو بغیر سابقہ نمونہ کے ایسا کرے۔

نہ ہر عیب
السلام
آیت بھی سلامتی
ہے وہ سلامتی
سُلاماً سلاماً

ملاح کرتا ہے
ب دونوں
اس کی ایک
مدا کے غیر
سب کا دعویٰ
والے مفید
زیر فرماتا ہے
نفس میں
سلام جو
نما جو کچھ

اس کے
کے معنی
لفظ مدح
ن استعمال
ت کے
طریق

۲۔ ملک

۵۔ قدوس

۶۔ سلام

۷۔ مؤمن

۸۔ مہین

۹۔ عزیز

۱۰۔ جبار

۱۱۔ متکبر

۱۲۔ خالق

۱۳۔ باری

۱۴۔ مصور

۱۵۔ حکیم

۱۶۔ اسمائے حسنیٰ کا مالک

۱۷۔ عالم کے تمام موجودات جس کی تسبیح کرتے ہیں۔

صفت توحید کے شامل ہونے سے یہ صفات اٹھارہ ہو جاتی ہیں۔ (توجہ کیجئے کہ توحید بھی دو مرتبہ اور عزیز بھی دو مرتبہ بیان ہوا ہے)۔ ان تین آیات میں ان تمام اوصاف ذات میں سے بالکل عام صفت علم اور اوصاف فعل میں سے بالکل عام صفت رحمت کا ذکر ہے جو تمام افعال کی اصل ہے۔ دوسری آیت میں اس کی حاکمیت اور اس کے کوائف کے بارے میں گفتگو ہے۔ اور قدوس و سلام و مؤمن و جبار و متکبر جیسی صفات کا اُن کے اُن معانی کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں، ذکر ہے۔ یہ سب خدا کی حاکمیت مطلقہ کی خصوصیات ہیں آخری آیت میں مسئلہ خلقت اور جو چیزیں اس سے متعلق ہیں مثلاً تنظیم، تشکیل، اور قدرت و حکمت کے بارے میں بحث ہے۔ اس طرح یہ آیات معرفت خدا کی راہ طے کرنے والوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو منزل بہ منزل آگے لے جاتی ہیں۔ اس کی ذات پاک سے ابتداء کرتی ہیں اور پھر عالم خلقت کی طرف لے آتی ہیں اور پھر اسی "سیرابی اللہ" میں مخلوق سے خالق کی طرف لے جاتی ہیں۔ دل کو خدا کے اسماء و صفات کا مظہر اور انوار ربانی کا مرکز قرار دیتے ہوئے ان معارف و انوار کے سلسلہ میں اس کی اصلاح و تربیت کرتی ہیں اور تعوی کے شکوہ اس کی شاخ وجود پر ظاہر کر کے اُسے خدا کے قُرب و جوار کے قابل بناتی ہیں تاکہ وہ عام ذرات عالم کے ساتھ ہم آواز ہو کر تسبیح کرتے ہوئے سبوح قدوس کی نغمہ سرائی کرے۔ اس لیے تعجب کا مقام نہیں کہ روایات اسلامی میں ان آیتوں کو حد سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جس کی طرف انشاء اللہ نکات کی بحث میں اشارہ ہو گا۔

۱۔ قرآن انکار

۲۔ آیتیں ہیں اسلام کے سپرد کائنات ہی نہیں اگر یہ

۳۔ ضرور قلب

۴۔ اس سور

۵۔ اس سور

۶۔ اس سور

۷۔ اس سور

۸۔ اس سور

۹۔ اس سور

۱۰۔ اس سور

۱۱۔ اس سور

۱۲۔ اس سور

۱۳۔ اس سور

۱۴۔ اس سور

۱۵۔ اس سور

۱۶۔ اس سور

۱۷۔ اس سور

۱۸۔ اس سور

۱۹۔ اس سور

۲۰۔ اس سور

چند نکات

قرآن کا حد سے زیادہ نفوذ

انکار اور دلوں میں قرآن کی تاثیر، ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اسلام کی طویل تاریخ میں اس حقیقت کے بہت سے شواہد ملتے ہیں اور یہ عملی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ سخت ترین دل چند آیات قرآنی سننے کے بعد اس طرح نرم ہو جاتے تھے کہ فوراً اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتے۔ صرف بہت دھرم اور کچ فہم افراد اس اثر سے مستثنیٰ تھے۔ وہ ایسے افراد تھے جن کے وجود میں حصول ہدایت کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اسی لیے ہم نے اوپر والی آیات میں پڑھا ہے کہ خدا فرماتا ہے :

اگر یہ قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ خاضع ہوتے اور بھٹ جاتے۔ یہ سب اس خدائی کلام کی قوتِ جاذبہ کی نشانی ہے جسے ہم بھی ہر قلب سے تلاوت کے موقع پر محسوس کرتے ہیں۔

سورہ حشر کی آخری آیات کی عظمت

اس سورہ کی آخری آیات، جو اسماء و صفاتِ الہی کے اہم حصہ پر مشتمل ہیں، حد سے زیادہ الہام بخش اور با عظمت آیات ہیں اور انسانوں کے لیے ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہیں کیونکہ خدا کہتا ہے :

اگر قربِ خدا طلب کرتے ہو اور عظمتِ کمال کے خواہاں ہو تو ان صفات کا ایک شعلہ اپنے وجود میں زندہ کر لو۔ بعض روایات میں خدا کا اسمِ اعظم سورہ حشر کی آخری آیات میں ہے :

ہمیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ملتا ہے :

(من قرأ آخر الحشر غفر له ما تقدم من ذنبه وما تأخر)

”جو شخص سورہ حشر کے آخر کو پڑھے تو اس کے گزشتہ اور آئندہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔“

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ :

(من قرأ لو انزلنا هذا القرآن الى اخرها فمات من ليلته مات شهيداً)

”جو شخص لو انزلنا هذا القرآن کی آیتوں کو آخر تک پڑھے اور اسی رات مر جائے تو وہ شہید مرنے والا ہے۔“

ایک صحابی کہتا ہے : میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدا کے اسمِ اعظم کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

(عليك بالخير الحشر واكثر قرأته)

”تو سورہ حشر کے آخری حصہ کو پڑھ اور زیادہ سے زیادہ پڑھ۔ میں نے دوبارہ یہی سوال کیا تو آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ یہی جواب دیا:

یہاں تک کہ ایک حدیث میں آیا ہے:

(انها شفاء من كل داء الا السام والسم الموت)

”یہ آیات سوائے موت کے ہر بیماری کی دوا ہیں۔“

خلاصہ یہ کہ اس سلسلہ میں شیعہ اور اہل سنت کی کتب میں بہت زیادہ روایات ہیں جو سب ان آیات کی عظمت اور ان کے نفس مضمون میں غور و فکر اور تدبر و تفکر پر زور دیتی ہیں۔ قابل توجہ یہ کہ یہ سورہ جس طرح خدا کی تسبیح اور عزیز و حکیم کے نام سے شروع ہوتا ہے اسی طرح عزیز و حکیم کے نام پر ختم بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سورہ کا مقصد خدا کی حقیقی معرفت اس کی تسبیح اور اس کے مقدس اسماء و صفات سے آگاہی ہے۔ اسمائے حسنی کے بارے میں جن کی طرف مذکورہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ ایک تفصیلی بحث سورہ اعراف کی آیت ۱۸ میں گزر چکی ہے۔

”خداوند! تجھے اپنے اسمائے حسنی اور صفات مقدسہ کی عظمت کی قسم ہمارے دلوں کو قرآن مجید کے سامنے خاضع و خاشع قرار دے۔“

”پروردگارا! شیطان کا دائم فریب سخت ہے اگر تیرا لطف و کرم مددگار نہ ہو تو ہمارا اس سے بچنا مشکل ہے ہمیں اپنے لطف و کرم کی پناہ میں شیاطین کے دوسوں سے محفوظ رکھ۔“

”بارالہ! ایثار و تقویٰ کی روح، ہر قسم کے نجل، کینہ اور حسد سے دور رکھ کر ہمیں عطا فرما اور ہم کو خود پسندی و خودخواہی سے محفوظ رکھ۔ آمین یا رب العالمین۔“

سورہ حشر کا اختتام
جلد ۲۳ کا اختتام
آخر شعبان ۱۴۰۶ھ
۲۰/۲/۱۳۶۵ شمسی

اختتام ترجمہ بتاريخ ۸ ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق ۵ جولائی ۱۹۸۷ء بروز اتوار
بوقت آٹھ بج کر دس منٹ صبح بر مکان حقیر قم مقدس جمہوری اسلامی ایران۔
الحمد لله اولاً و آخراً و صلی اللہ علی محمد وآلہ سرمداً ابداً

سُورَةُ مَائِدَةٍ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۳ آیات ہیں

ان کے نفس مضمون
جسے اسی طرح
صفات سے
نہ کی آیت ۱۸

زاتوار

یلان

۱

آغاز

اول ماہ مبارک رمضان ۱۴۰۶ھ

بمطابق ۱۳۶۵، ۲۰۲۱، ۱۳۶۵ ش

سورۃ ممتحنہ کے مضامین

حقیقت میں اس سورہ کے دو حصے ہیں :-
 پہلے حصے میں: ”حُبِّ فِي اللَّهِ“ اور ”لُبْضِ فِي اللَّهِ“ کے مسئلہ اور مشرکین سے دوستی کرنے سے ممانعت کا بیان ہے،
 مسلمانوں کو خدا کے عظیم پیغمبر سے ہدایت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں کچھ اور خصوصیات کا بیان ہے۔
 یہ مضمون جس طرح سورۃ کی ابتداء میں آیا ہے اسی طرح سورۃ کے اختتام پر بھی اس کی تکرار اور تائید ہوئی ہے۔
 دوسرے حصے میں: مہاجر عورتوں، ان کی آزمائش اور امتحان اور اسی سے مربوط کچھ احکام سے بحث کی گئی ہے۔
 سورہ کے لیے ”صحتِ حنہ“ کے نام کا انتخاب بھی اسی امتحان کے مسئلہ کی وجہ سے ہے جو آیت ۱۰ میں آیا ہے۔
 اس سورہ کے لیے ایک اور نام بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ سورہ مودت ہے کہ جو اس سورۃ کی پہلی آیت میں مشرکین سے دوستی کرنے سے منع کرنے کی وجہ سے ہے۔

سورۃ ممتحنہ کی تلاوت کی فضیلت

رسول خداؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے :-

من قرء سورة الممتحنة كان المؤمنون والمؤمنات له

شفعاء يوم القيامة۔

”جو شخص سورۃ ممتحنہ کی تلاوت کرے گا، تمام مومنین و مومنات قیامت کے

دن اس کے شفیع ہوں گے۔“

لے بعض نے اس کو ممتحنہ (حار کی فتح کے ساتھ) پڑھا ہے۔ مہاجر عورتیں کے لحاظ سے جن کا امتحان لیا جاتا تھا اور بعض نے ممتحنہ (حار کی زیر کے ساتھ) پڑھا ہے۔

ہے، کیونکہ یہ سورۃ خود امتحان کا ایک ذریعہ ہے۔

ایک اور حدیث میں امام علی بن الحسین سے آیا ہے :

من قرء سورة الممتحنة في فرائضه ونوافله امتحن الله
قلبه للإيمان ونور له بصره ولا يصيبه فقر أبداً، ولا
جنون في بدنه، ولا في ولده.

جو شخص سورۃ ممتحنہ کو واجب اور مستحب نمازوں میں پڑھے گا، خدا اس کے
دل کو ایمان کے لیے خالص اور آمادہ کر دے گا۔ اور اُسے نور بصیرت عطا
کرے گا اور ہرگز اُسے فقر و فاقہ دامن گیر نہ ہوگا اور وہ خود اور اس کی
اولاد جنون میں گرفتار نہ ہوگی۔

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ یہ تمام فضیلتیں اور اعزاز اس شخص کے لیے ہیں جو اس سورہ کی آیات پر ”حب فی اللہ“ و ”بغض فی اللہ“
اور راہِ خدا میں جہاد کرنے کے سلسلہ میں اس کے مضمون پر کاربند ہونے کے لیے توجہ دے گا اور صرف بے رُوح تلاوت اور علم و عمل کے
بغیر پڑھنے پر اکتفا نہیں کرے گا۔

نعت کا بیان ہے
نہ کا بیان ہے
ہے۔
سٹ کی گئی ہے۔
ہے۔
میں شکرین سے نواز

دعا کی توجہ کے ساتھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝

② أَنْ يَتَقَفُّوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ۝

③ لَنْ نَنْفَعَكُمْ أَرْحَامَكُمْ وَلَا أَوْلَادَكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

ترجمہ

① رحمن ورحیم خدا کے نام سے
اے ایمان لانے والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے لیے
② مجتہد کا اظہار کرتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے وہ اس سے کافر ہو گئے ہیں۔ وہ

رسول خدا ﷺ کو اور تمہیں اس وجہ سے تمہارے شہر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار خدا پر ایمان لائے ہو۔ اگر تم نے میری راہ میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہجرت کی ہے تو تم ان سے دوستی کا رشتہ قائم نہ کرو، تم مخفی طور پر ان سے دوستی کا رابطہ قائم کر رہے ہو حالانکہ جو کچھ تم یہاں آشکارا کرتے ہو میں اس سے اچھی طرح آگاہ ہوں، اور تم میں سے جو بھی یہ کام کرے وہ راہِ راست سے گمراہ ہو گیا ہے۔

① اگر وہ تم پر مسلط ہو جائیں تو وہ تم سے دشمنی ہی کریں گے اور تمہارے ساتھ اپنے ہاتھ اور زبان سے بدی ہی کریں گے اور تمہیں کفر کی طرف پلٹانے کی کوشش کریں گے۔

② تمہارے عزیز و اقربا اور تمہاری اولاد تمہیں ہرگز کوئی نفع نہیں دیں گے۔ وہ قیامت کے دن تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

شانِ رسول

اکثر مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ آیات (یا پہلی آیت) ”حاطب بن ابی بلتعہ“ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں (البتہ مختصر سے فرق کے ساتھ) مرحوم طبری نے جو کچھ مجمع البیان میں ذکر کیا ہے ہم اُسے ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک عورت جس کا نام ”سارہ“ تھا اور وہ مکہ کے کسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی، مکہ سے مدینہ میں پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ پیغمبر نے اُس سے فرمایا: کیا تو مسلمان ہو کر آئی ہے؟ اُس نے عرض کیا: نہیں! آپ نے فرمایا: کیا تو ہجرت کے عنوان سے آئی ہے؟ اُس نے کہا: نہیں!

آپ نے فرمایا: پھر تو کیوں آئی ہے؟ اُس نے عرض کیا: آپ ہماری اصل اور عشیرہ و قبیلہ تھے۔ میرے سارے کے سارے سرپرست چل دیے ہیں اور میں سخت محتاج ہو گئی ہوں میں اس لیے آپ کے پاس آئی ہوں تاکہ آپ مجھے کچھ عطا کریں اور لباس اور سواری سے نوازیں۔

آپ نے فرمایا: مکہ کے جوان کہاں چلے گئے؟ (یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عورت گانے والی تھی اور جوانوں کے لیے گانے گایا کرتی تھی)۔

اُس نے کہا: جنگ بدر کے بعد کسی نے مجھ سے گانے کی خواہش نہیں کی۔ (اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ بدر کی ضربِ مشرکین مکہ پر کتنی سخت تھی)۔

آنحضرتؐ نے اولاد عبد المطلب کو حکم دیا تو انھوں نے اُسے لباس، سواری اور زادِ راہ دیا، یہ اس موقع کی بات ہے جب آپ فتح مکہ کے لیے تیاری کر رہے تھے۔

اس موقع پر حاطب بن ابی بلتعہ (ایک مشہور مسلمان جو جنگ بدر و بیعت رضواں میں شریک تھا) سارہ کے پاس آیا اُس نے ایک خط لکھ کر اُسے دیا اور کہا: یہ اہل مکہ کو دے دینا۔ اُس نے دس دینار اور بقولے دس درہم اُسے دیے اور ایک مہینی کپڑا بھی اُسے دیا۔

”حاطب“ نے اہل مکہ کو خط میں یہ لکھا تھا کہ رسولِ خداؐ تمہاری طرف آنے کی تیاری کر رہے ہیں، لہذا تم اپنے دفاع کے لیے تیار رہو۔ سارہ نے خط لیا اور مدینہ سے مکہ کی طرف چل پڑی۔

جبریلؑ نے اس واقعہ کی اطلاع پیغمبرؐ کو پہنچائی۔ رسولِ خداؐ نے علی و عمار و عمر و زبیر و طلحہ و مقداد و ابو مرثد کو حکم دیا کہ وہ سوار ہو کر مکہ کی طرف جائیں۔ اُن سے یہ بھی فرمایا کہ تمہیں راستہ کے درمیان ایک منزل پر ایک عورت ”سارہ“ نامی ملے گی، جو مشرکین مکہ کے لیے ”حاطب“ کا ایک خط لے کر جا رہی ہے تم اُس سے وہ خط لے لو۔

وہ وہاں سے چل پڑے اور اسی جگہ اس تک جا پہنچے جہاں رسولِ خداؐ نے فرمایا تھا۔ اُس نے قسم کھائی کہ اُس کے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ انھوں نے اُس کے سامان سفر کی تلاشی لی، لیکن انھیں کوئی چیز نہیں ملی، اور سب نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ لیکن علیؑ نے فرمایا: نہ تو ہمارے پیغمبرؐ نے جھوٹ کہا ہے، اور نہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں، آپؐ نے تلوارِ سونت لی اور فرمایا: خط نکالو ورنہ خدا کی قسم! میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔ ”سارہ“ نے جب مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ لیا تو خط جو اُس نے اپنے گیسٹوں میں چھپایا ہوا تھا باہر نکالا اور وہ لوگ اس خط کو لے کر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

آنحضرتؐ نے کسی کو بھیج کر ”حاطب“ کو بلوایا اور فرمایا: یہ خط پہچانتے ہو؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں! آپؐ نے فرمایا: تم نے یہ کام کس لیے کیا ہے؟

اُس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! خدا کی قسم جس دن سے میں نے اسلام قبول کیا ہے، ایک لمحہ کے لیے کافر نہیں ہوا اور کبھی بھی آپؐ سے خیانت نہیں کی ہے۔ جب سے میں مشرکین سے جدا ہوا ہوں کبھی ان کی دعوت قبول نہیں کی، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سبھی مہاجرین کے کچھ کچھ لوگ مکہ میں ہیں جو مشرکین کے مقابلے میں ان کے گھر والوں کی حمایت کرتے ہیں۔ مگر میں اُن کے درمیان اجنبی ہوں اور میرے گھر والے ان کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ میں نے چاہا کہ اس طرح سے اپنا ایک حق اُن کی گردن پر رکھ دوں تاکہ وہ میرے گھر والوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ آخر کار خدا انہیں شکست دے گا اور میرا خط انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

پیغمبرؐ نے اس کا عذر قبول کر لیا، لیکن عمر بن خطابؓ نے کھڑے ہو کر کہا: یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: یہ بدر کے غازیوں میں سے ہے اور خدا ان پر ایک خاص نظرِ کرم رکھتا ہے۔ (اس موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور ان میں مسلمانوں کو مشرکین اور دشمنانِ خدا سے ہر قسم کی دوستی ترک کرنے کے سلسلے میں اہم

درس دیے گئے ہیں

تفسیر

خدا سے دوستی کرنے کا انجام

جیسا کہ ہم شان نزول کے ذریعے جان چکے ہیں ایک مسلمان سے ایک حرکت صادر ہوئی جو اگرچہ جاسوسی کے ارادہ سے نہیں تھی لیکن دشمنان اسلام سے اظہارِ محبت شمار ہوتی تھی۔ لہذا اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو یہ تنبیہ کی گئی کہ آئندہ اس قسم کے کاموں سے پرہیز کریں۔

پہلے فرماتا ہے: اے ایمان لائے والو! تم میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ (یا ایہا الذین امنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء)۔

یعنی وہ صرف خدا ہی کے دشمن نہیں بلکہ وہ تم سے بھی دشمنی رکھتے ہیں۔ لہذا ان حالات میں تم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ کس طرح بڑھاتے ہو؟

اس کے بعد فرید کہتا ہے: تم ان کے لیے محبت کا اظہار کرتے ہو، حالانکہ وہ اس حق (اسلام و حرکان) سے جو تمہارے لیے آیا ہے کافر ہو گئے ہیں۔ وہ رسول خدا کو اور تمہیں، تمہارے شہر و دیار سے اس وجہ سے باہر نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار خدا پر ایمان لائے ہو۔ (تلقون الیہم بالمودۃ وقد کفروا بسا جاء کم من الحق یخرجون الرسول وایاکم ان تؤمنوا باللہ ربکم)۔

وہ عقیدہ میں بھی تمہارے مخالف ہیں اور عملی طور پر جنگ کے لیے کھڑے ہیں۔ اس کام کو جو تمہارے لیے عظیم ترین اعزاز و افتخار ہے۔ یعنی پروردگار پر ایمان، اسے انہوں نے تمہارے لیے بہت ہی بڑا گناہ شمار کیا ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے تمہیں تمہارے شہر و دیار سے نکالا ہے۔ ان حالات میں کیا اس بات کی گنجائش ہے کہ تم ان کے لیے محبت کا اظہار کرو اور سپاہ اسلام کے قومی ہاتھوں سے ہونے والے عذابِ الہی کے خچل سے ان کی نجات کے لیے کوشش کرو؟

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے اضافہ کرتا ہے: اگر تم نے راہِ جہاد میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی کے حصول کے لیے ہجرت کی ہے تو تم ان سے دوستی کا رشتہ قائم نہ کرو (ان کستم خرجتم جہاداً فی سبیلی وابتغاء مرضاتی)۔

لے ”مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۲۶۹ (تھوڑی سی تخفیف کے ساتھ) اس شان نزول کو بخاری نے اپنی صحیح (جلد ۶ ص ۱۸۵، ۱۸۶) میں، فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اور اسی طرح تفسیر ”روح المعانی“ و ”روح البیان“ و ”فی ظلال“ و ”قرطبی“ و ”مراغبی“ وغیرہ نے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

لے ”تلقون الیہم بالمودۃ“ کے جملہ کو ”لا تتخذوا“ کی ضمیر سے حالِ بھلاستینافہ سمجھتے ہیں۔ (کشاف جلد ۳ ص ۵۱۲) اور ”بالمودۃ“ کی باء کو زائدہ اور تاکید کے لیے، جیسے (ولا تلقوا بایدکم الی التہلکۃ) ہے یا سببیہ ”بے حذف مفعول کے ساتھ اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ ”تلقوا الیہم اخبار رسول اللہ بسبب المودۃ الی بینکم و بینہم“ (دہی مدرک)

لے مفسرین کی ایک جماعت یہ نظریہ رکھتی ہے کہ اس جملہ شرطیہ کی جزاء محذوف ہے کہ جس کا گذشتہ جملہ سے استفادہ ہوتا ہے۔ یہ تقدیر میں اس طرح ہے: (بقیہ اگلے صفحہ)

اگر واقعتاً تم خدا کی دوستی کا دم بھرتے ہو، اسی کی خاطر تم نے اپنے شر اور گھروں سے ہجرت کی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ سے خدا کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ بات دشمنانِ خدا کی دوستی کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے اضافہ کرتا ہے: ”تم مخفی طور پر ان سے دوستی کا رابطہ قائم کر رہے ہو، حالانکہ جو کچھ تم پہناؤ آشکارا کرتے ہو میں اس سے ابھی طرح آگاہ ہوں۔ (تسترون الیہم بالمودۃ وانا اعلیٰ بما اخفیتم وما اعلیٰتم)۔“

اس بناء پر خدا کے غیب و شہود کا عالم ہوتے ہوئے اخفاء کاری کا کیا فائدہ ہے۔

اس آیت کے آخر میں قاطع تنذیر کے عنوان سے فرماتا ہے: ”تم میں سے جو شخص بھی اس قسم کا کام کرے گا وہ سید راستے سے منحرف اور گمراہ ہو جائے گا۔ (ومن یفعلہ منکم فقد ضلّ سواء السبیل)۔“

وہ خدا کی معرفت کے راستے سے بھی ہٹ گیا، کیونکہ اُس نے یہ گمان کر لیا کہ کوئی چیز خدا سے مخفی رہ جاتی ہے۔ وہ ایمان اخلاص اور تقویٰ کی راہ سے بھی ہٹ گیا۔ جبھی تو خدا کے دشمنوں سے دوستی کی بنیاد رکھی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کی جڑوں پر بھی کلہاڑی ماری ہے کہ اپنے دشمن کو اپنے اسرار سے باخبر کر دیا ہے۔ یہ وہ بدترین انحراف ہے جو مومن آدمی کو سرِ حشر ایمان تک پہنچنے کے بعد عارض ہو سکتا ہے۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں مزید تاکید و توضیح کے لیے فرماتا ہے: ”تم ان کے ساتھ دوستی کیوں کرتے ہو؟ حالانکہ اگر وہ تم پر مسلط ہو جائیں تو وہ تم سے دشمنی ہی کریں گے اور تمہارے ساتھ اپنے ہاتھ اور زبان سے بدی ہی کریں گے۔ (ان یشفقوکم یکونوا لکم اعداء ویبسطوا الیکم ایدیہم والسننہم بالسوء)۔“

تم ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے اتنے پکے دشمن ہیں کہ اگر وہ تم پر مسلط ہو جائیں تو وہ کسی بھی کام میں کوئی فرد گناہت نہ کریں گے اور تمہیں اپنے ہاتھ اور زبان سے ہر قسم کا آزار اور تکلیف پہنچائیں گے۔ کیا ایسے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنا مناسب ہے؟

سب سے بُری بات یہ ہے کہ ”وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام سے کفر کی طرف پلٹا دیں“ اور اپنے سب سے بُرے افتخار، یعنی گوہرِ ایمان کو کھو بیٹھو۔ (وودوا لکھو کفرون)۔

(بقیہ حاشیہ) ”ان کنتم خرجتم جہاداً فی سبیلی وابتغاء مرضاتی لا تتولوا اعدائی۔“

لے یہ ایک جملہ استینافیہ ہے اور ”ما اسرتم“ کے بجائے ”ما اخفیتم“ کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ اس سے زیادہ مُبالغہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اخفاء پہناں کاری سے زیادہ عمیق مرحلہ ہے۔ (تفسیر فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں)

لے ”یشفقوکم“ ”شفقت اور ثقافت“ کے مادہ سے، کسی چیز کی تشخیص اور اس کے انجام دینے میں مہارت کے معنی میں ہے۔ اس لیے فرہنگ و تمدن یا کسی چیز پر مہارت تسلط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اور یہ واقعی ایک دردناک ترین ضرب ہے جو وہ تم پر لگانا چاہتے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں ”حاطب بن ابی بلتعہ“ جیسے افراد کو جواب دیتا ہے۔ جب پیغمبر نے اُس سے فرمایا تھا کہ تُو نے مسلمانوں کے اسرارِ مشرکین مکہ کے پاس کیوں پہنچائے؟ تو اُس نے یہ جواب دیا تھا: میرے عزیز و اقارب مکہ میں ہیں کہ جو کفار کے ہاتھوں میں گرفتار ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ انہیں آسیب پہنچائیں گے۔ اس لیے میں لے چاہا کہ اس طریقے سے اُن کی حفاظت کروں۔ خدا فرماتا ہے: تمہارے عزیز و اقرباء اور تمہاری اولاد ہرگز تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ (لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم)۔

کیونکہ اگر اولاد اور عزیز و اقارب بے ایمان ہوں تو وہ نہ اس دنیا کے لیے عزت و آبرو اور سرمایہ ہوں گے، نہ ہی آخرت میں ذریعہ نجات۔ پس مومن اُن کے لیے ایسے کام کیوں کریں جو خدا کے غضب اور اُس کے اولیاء سے منقطع ہونے کا موجب ہوں۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”خدا قیامت کے دن تمہارے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دے گا۔“ (یوم القیامت یفصل بینکم)۔ لے

اہل ایمان جنت کی طرف اور اہل کفر و دوزخ کی طرف جائیں گے۔ یہ حقیقت میں اس بات کے لیے ایک دلیل ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے۔ یعنی وہاں تم ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ گے اور تمام رشتے کُلّی طور پر منقطع ہو جائیں گے تو پھر وہ تمہیں کون سا نفع پہنچائیں گے؟

یہ آیت حقیقت میں اسی بات سے مشابہ ہے جو سورۃ عبس کی آیہ ۲۴ تا ۳۶ میں بیان ہوئی کہ جس میں فرماتا ہے: یوم یفر المرء من اخیه وامه وابیہ وصاحبته وبنیہ: ”وہ دن دور نہیں جس میں انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور اولاد سے فرار کرے گا۔“

آیت کے آخر میں ایک دفعہ پھر سب کو خبردار کرتا ہے کہ ”جو کچھ تم کرتے ہو خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔“ (واللہ بما تعملون بصیر)۔

وہ تمہاری نیتوں سے آگاہ ہے اور اُن سے اعمال سے بھی جو تم پوشیدہ طور پر انجام دیتے ہو۔ اگر کچھ موارد میں وہ تمہارے اسرار کو ”حاطب بن ابی بلتعہ“ کی طرح فاش نہیں کرتا تو وہ کچھ مصالح کی بناء پر ہے نہ یہ کہ وہ واقف اور آگاہ نہیں ہے۔

حقیقت میں خدا کا غیب و شہود اور ظاہر و پوشیدہ علم، انسان کی تربیت کے لیے ایک مُؤثر ذریعہ ہے کہ وہ ہر حالت میں خود کو اس کی بارگاہ کے سامنے سمجھے اور سارے جہان کو خدا کے حضور میں حاضر جانے۔ وہ اپنی گرفتار و رفتار حتیٰ کہ اپنی نیت کا بھی خیال رکھے۔ یہی چیز ہے جو ہم کہتے ہیں کہ خدا کی مکمل معرفت تقویٰ کے ظہور کا سرچشمہ ہے۔

لے بہت سے مفسرین نے ”یوم القیامت“ کو مفصل کا متعلق سمجھا ہے۔ لیکن بعض اسے ”لن تنفعکم“ کے متعلق سمجھتے ہیں۔ تاہم دونوں کا نتیجہ قریب قریب ایک ہی ہے۔ اگرچہ پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض ”یفصل“ کی تفسیر جدائی ڈالنے کے معنی میں نہیں کرتے بلکہ فصل کو قضاوت اور فیصلہ کرنے کے معنی میں جانتے ہیں۔ لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

دشمنی

سوا۔

طلب

منیر

بازگشت

۵

ہمار۔

۱

رکعت

ہے

لفظ

گواہ

کے

پر قوم

ساتھیوا

تفسیر

ابراہیم

- ④ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءُؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَسْتَ تَغْفِرُ لَكَ وَمَا أَمَلْتُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝
- ⑤ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَاعْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝
- ⑥ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۖ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝

ترجمہ

- ④ تمہارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی ایک اچھا نمونہ ہے۔ جب انھوں نے اپنی مُشرک قوم سے کہا: ہم تم سے اور جی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو، ان سے بھی بنیاد ہیں۔ ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کی

دشمنی ہو چکی ہے اور یہ حالت اُس وقت تک جاری رہے گی حتیٰ کہ تم خدا سے یگانہ پر ایمان لاؤ سوائے اس بات کے جس کا ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا) سے وعدہ کیا تھا کہ میں تیرے لیے طلب بخشش کروں گا، لیکن اس کے باوجود میں خدا کے مقابلہ میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، پروردگار! ہم نے تجھ پر ہی توکل کیا ہے، تیری ہی طرف لوٹے ہیں اور سب کی بازگشت تیری ہی طرف ہے۔

پروردگار! ہمیں کافروں کے لیے گمراہی کا سبب قرار نہ دے اور ہمیں بخش دے، اے ہمارے پروردگار! بے شک تو عزیز و حکیم ہے۔

ان کی زندگی میں تمہارے لیے ایک اچھا نمونہ تھا، ان کے لیے جو خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو شخص رُگردانی کرے گا تو وہ خود اپنے آپ کو ہی ضرر پہنچائے گا، کیونکہ خدا تو بے نیاز ہے اور ہر قسم کی تعریف و تائش کے قابل ہے۔

ابراہیم تم سب کے لیے نمونہ ہیں

چونکہ قرآن مجید بہت سے موارد میں اپنی تعلیمات کی تکمیل کے لیے ایسے اہم نمونے جو جہان انسانیت میں موجود ہیں، گواہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس لیے زیر بحث آیات میں بھی دشمنانِ خدا سے دوستی کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرنے کے بعد، ابراہیمؑ اور اُن کے طریقہ کار کے بارے میں ایک ایسے عظیم پیشوا کے عنوان سے جو تمام اقوام کے لیے اور خاص طور پر قوم عرب کے لیے احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”تمہارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے“ (قد كانت لكم اسوة حسنة في ابراهيم والذين معه)۔

مفسرین نے اس جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیے ہیں، لیکن ظاہر یہ ہے کہ ”اسوة حسنة“ ”کان“ کا اسم اور ”لکم“ اس کی خبر ہے۔ اور ابراہیمؑ ”اسوة حسنة“ کا متعلق ہے۔ ضمنی طور پر اس بات کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ ”اسوة“ تاسی اور پیروی کے معنی میں کبھی تو اچھے (باقی اگلے صفحہ پر)

ابراہیم پیغمبروں کے بزرگ تھے۔ ان کی زندگی سراسر خدا کی عبودیت، جہاد فی سبیل اللہ اور اس کی پاک ذات کے عشق کے لیے ایک سبق تھی۔ وہ ابراہیمؑ کو امت اسلامی ان کی بابرکت دعا کا نتیجہ ہے اور ان کے رکھے ہوئے نام پر فخر کرتی ہے، وہ تمہارے لیے اس سلسلہ میں ایک اچھا نمونہ بن سکتے ہیں۔

”والذین معہ“ (جو لوگ ابراہیمؑ کے ساتھ تھے) کی تفسیر سے مراد وہ مومنین ہیں جو اس راہ میں ان کے پیرو اور ساتھی رہے۔ اگرچہ وہ قلیل تعداد میں تھے۔ باقی رہا یہ احتمال کہ اس سے مراد وہ پیغمبر ہیں جو آپ کے ساتھ ہم آواز تھے یا ان کے زمانے کے پیغمبر، جیسا کہ بعض نے احتمال دیا ہے۔ تاہم یہ بہت بعید نظر آتا ہے خصوصاً جبکہ مناسب یہ ہے کہ قرآن یہاں پیغمبر اسلام کو ابراہیمؑ کے ساتھ اور مسلمانوں کو ان کے اصحاب و انصار سے تشبیہ دے۔ یہ تواریخ میں بھی آیا ہے کہ بابل میں ایک گروہ ایسا تھا جو ابراہیمؑ کے معجزات دیکھنے کے بعد ان پر ایمان لے آیا تھا اور شام کی طرف ہجرت میں وہ آپ کے ساتھ تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیمؑ کے کچھ وفادار یار و انصار بھی تھے۔

اس کے بعد اس معنی کی وضاحت کے لیے مزید کہا ہے: ”جب انھوں نے اپنی مشرک اور بت پرست قوم سے کہا: ہم تم سے اور جن غیر اللہ کی تم پرستش کرتے ہو، ان سے بھی بیزار ہیں۔“ (اذ قالوا القومھم انا برؤا منکم ومما تعبداون من دون اللہ)۔

ہم نہ تو تمہیں اور نہ ہی تمہارے دین و مذہب کو قبول کرتے ہیں ہم تم سے اور تمہارے بے قدر و قیمت بتوں سے بھی نفرت کرتے ہیں۔

دوبارہ مزید تاکید کے لیے فرمایا: ہم نے تم سے کفر اختیار کر لیا۔ (کفرنا بکم)۔

البتہ یہ کفر وہی برأت و بیزاری ہے کہ جس کی طرف بعض روایات میں کفر کی پانچ اقسام کے شمار میں اشارہ ہوا ہے۔ پھر تیسری مرتبہ مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: ”ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کی دشمنی ہم چکی ہے۔“ (وبدا بیننا و بینکم العداۃ والبغضاء ابداً)۔

اور یہ وضع و کیفیت اسی طرح جاری رہے گی۔ یہاں تک کہ تم خدا کے یگانہ پر ایمان لاؤ۔ (حتیٰ تؤمنوا باللہ وحدہ)۔

اس طرح سے انھوں نے کسی بھی طرح کی لگی لپٹی کے بغیر دو ٹوک طریقے سے دشمنانِ خدا سے جدائی اور بیزاری کا اعلان کر دیا اور صراحت کے ساتھ کہا کہ جدائی کسی قیمت پر بھی واپسی اور تجدیدِ نظر کے قابل نہیں ہے۔ یہ ابد تک جاری رہے گی مگر یہ کہ وہ اپنی راہ بدل لیں اور کفر کو چھوڑ کر ایمان کی طرف آجائیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶) کاموں کے لیے اور کبھی بُرے کاموں کے لیے آتا ہے۔ اسی لیے اوپر والی آیات میں ”حسنۃ“ کے ساتھ مُقید ہوا ہے

لے کال ابن اثیر جلد ۱ ص ۱۰۰

لے ”براء“ ”بری“ کی جن ہے، جیسے ”ظرفاء“ و ”ظریف“

لیکن چونکہ یہ کلی اور عمومی قانون ابراہیم کی زندگی میں ایک استثناء رکھتا تھا جو بعض مشرکین کی ہدایت کے لیے صورت پذیر ہوا تھا، لہذا اس کے بعد فرماتا ہے: انھوں نے کافروں سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کر لیا اور ان سے کوئی بھی محبت آمیز بات نہیں کی: ”سوائے اس بات کے جو ابراہیم نے اپنے باپ (چچا آذر) سے کی تھی کہ میں خدا سے تمہارے لیے طلب مغفرت کروں گا، لیکن اس کے باوجود میں خدا کے مقابلے میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں اور بخشش تو صرف اُسی کے ہاتھ میں ہے“ (الا قول ابراہیم لابیہ لاستغفرن لك وما املك لك من الله من شیء)۔

حقیقت میں یہ ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کا بُت پرستوں سے ہر قسم کے ارتباط کو منقطع کرنے کے مسئلہ سے ایک ایسا استثناء ہے جو ایک خاص مصالحت اور حالات کی وجہ سے تھا، کیونکہ قرآن بتلاتے ہیں کہ ابراہیم نے احتمالاً اپنے چچا آذر میں ایمان کے لیے آمادگی مشاہدہ کی ہوئی تھی، لیکن آذر اس مسئلہ سے پریشان تھا کہ اگر اس نے توحید کی راہ اختیار تو اُس کی بُت پرستی کے دور کا کیا بنے گا؟ لہذا ابراہیم نے اُس سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں بارگاہِ خدا میں تیرے لیے استغفار کروں گا اور اس وعدہ پر آپ نے عمل بھی کیا۔ لیکن آذر ایمان نہ لایا۔ جب ابراہیم پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے اور ہرگز ایمان نہیں لائے گا تو پھر اُس کے لیے استغفار نہیں کیا اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔

چونکہ مسلمان ابراہیم اور آذر کے اس واقعہ سے اجمالی طور پر باخبر تھے، لہذا ممکن تھا کہ یہی مطلب ”عاطب بن ابی بلتعہ“ جیسے لوگوں کے لیے کفار سے راز و نیاز قائم رکھنے کا پہانہ بن جائے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ یہ استثناء خاص حالات میں صورت پذیر ہوا۔ اور آذر کے ایمان لے آنے کا ایک ذریعہ تھا نہ کہ دنیوی مقاصد کے لیے تھا۔ اسی لیے سورہ توبہ کی آیت ۱۱۲ میں فرماتا ہے: وما کان استغفار ابراہیم لابیہ الا عن موعده وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انه عدو لله تبرأ منه ان ابراہیم لاواہ حلیم: ابراہیم کا اپنے باپ (چچا آذر) کے لیے استغفار صرف اس وعدہ کی بناء پر تھا جو انھوں نے اُس سے کر لیا تھا، تاکہ اسے ایمان کی طرف کھینچ لائیں، لیکن جب اُن پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اُس سے بیزاری اختیار کر لی، بے شک ابراہیم مہربان اور بردبار تھے۔ لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے اسے ”ابراہیم“ کے اسوہ سے استثناء سمجھا اور کہا ہے کہ سوائے ان کے اپنے چچا آذر کے لیے استغفار کرنے کے ہر چیز میں اُن کی اقتداء اور پیروی کرنا چاہیے۔

یہ مطلب اگرچہ چند ایک مفسرین کے کلام میں ہی آیا ہے، پھر بھی یہ بات بُت ہی بعید دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ اول تو وہ ہر چیز میں یہاں تک کہ اس عمل میں بھی اسوہ تھے، کیونکہ اگر وہی ”آذر“ والے حالات بعض مشرکین میں پیدا ہو جاتے تو انھیں ایمان کی طرف کھینچ لانے کے لیے ان سے اظہارِ محبت کرنا اچھا کام ہوتا۔ دوسرے ابراہیم ایک معصوم پیغمبر اور عظیم مجاہدِ انبیاء میں سے تھے۔ اور ان کے تمام اعمال ہی نمونہ تھے، لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس مسئلہ کا

استثنا کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم اور اُن کے پیروکار پوری قوت کے ساتھ بت پرستوں کے مخالفت تھے، لہذا ہمیں اس سبق کو اپنا دستور العمل بنانا چاہیے۔ آذر کے واقعہ میں کچھ خاص حالات تھے اور اگر وہ ہمارے لیے بھی پیدا ہو جائیں تو وہ ہمارے لیے بھی پیروی کے لائق ہیں۔ لے۔

چونکہ دشمنانِ خدا کے ساتھ ایسی صراحت اور قاطعیت کے ساتھ مبارزہ، خصوصاً اُس زمانہ میں جبکہ وہ قدرتِ ظاہری رکھتے تھے، خدا کی ذات پر توکل کیے بغیر ممکن نہیں ہے، لہذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: پروردگارا! ہم نے تجھ پر توکل کیا ہے، تیری طرف رُخ کیا ہے اور انجام کار سب کا آخری اور اصلی رجوع تیری ہی طرف ہوتا ہے۔ (ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر)۔

حقیقت میں اُنھوں نے اس عبارت میں تین مطالب خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیے ہیں: اول: اُس کی ذات پر توکل، دوسرے اُس کی طرف توبہ و بازگشت اور تیسرے اس حقیقت کی طرف توجہ کہ تمام چیزوں کا آخری اور اصلی رجوع اُسی کی طرف ہوتا ہے، اور یہ ایک دوسرے کے علت و معلول ہیں۔ معاد اور آخری بازگشت پر ایمان لانا توبہ کا سبب بنتا ہے، اور توبہ روحِ توکل کو انسان میں زندہ کرتی ہے۔ لے۔

بعد والی آیت میں ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں کی ایک اور درخواست کی طرف جو اس سلسلے میں حساس اور جاذب ہے اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”پروردگارا! ہمیں کافروں کی گمراہی کا سبب نہ بنانا۔“ (ربنا لا تجعلنا فتنة للذین کفروا)۔

یہ تعبیر ممکن ہے ایسے اعمال کی طرف اشارہ ہو جو بعض بے خبر لوگوں سے سرزد ہو جاتے ہوں جیسا کہ ”حاطب بن ابی بلتعہ“ کا عمل تھا۔ یعنی وہ لوگ ایسا کام کر بیٹھتے ہیں جو گمراہوں کی تقویت کا سبب بن جاتا ہے حالانکہ ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔

یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمیں ان کے چٹکل میں گرفتار نہ کرنا اور ان کے مقابلے میں مغلوب نہ کر دینا اور کہیں وہ یہ نہ کہنے لگ جائیں کہ اگر یہ حق پر ہوتے تو ہرگز شکست نہ کھاتے۔ اور یہی بات اُن کی گمراہی کا سبب بن جائے گی۔

لے۔ مذکورہ بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں استثناء منقول ہے اور ”مستثنیٰ منہ“ ایک محذوف جملہ ہے کہ جس پر آیت کا متن دلالت کرتا ہے۔ تقدیر میں اس طرح ہے: ان ابراہیم و قومہ متبعوا منهم ولم یکن لهم قول یدل علی المحبة الا قول ابراہیم... لیکن دوسری تفسیر کے مطابق استثناء منقطع ہو جائے گا اور یہ خود اس پر دوسرا اعتراض ہے۔

لے۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے، اس سے واضح ہو گیا کہ یہ جملہ ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کا ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ ایک منقول جملہ ہے جو مسلمانوں کی تعلیم کے عنوان سے ان آیات کے وسط میں نازل ہوا ہے لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

یعنی اگر وہ اپنی شکست اور کافروں کے تسلط سے ڈرتے ہیں تو خود اپنی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ دین حق پر ہر
ان کی اعتراض نہ ہو اور مشرکین کی ظاہری کامیابی ان کی حقانیت کی دلیل نہ سمجھی جائے۔ گویا ایک مومنین واقعی کا طریقہ یہی ہے کہ وہ
کوچہ چاہتا ہے خدا کے لیے چاہتا ہے، وہ سب سے کٹ کر خدا کا ہو گیا ہے اور تمام کام اسی کی رضا کے لیے کرتا ہے۔
سوی تو کر دیم روی و دل بہ تو بستیم

از ہمہ باز آدمیم با تو نستیم !!

ہر چہ نہ پیوند یار بود بریدیم

ہر چہ نہ پیمان دوست بود گستیم

ہم نے تیری طرف رخ کیا ہے اور تجھ سے ہی دل لگایا ہے۔

ہم سب کو چھوڑ کر تیرے ساتھ ہو بیٹھے ہیں۔

جس کا تعلق محبوب سے نہ ہو اس سے ہم کٹ گئے ہیں۔

جو دوست کا عہد و پیمان نہیں تھا ہم نے اس کو توڑ دیا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”پروردگارا! اگر ہم سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو ہمیں بخش دینا۔“ (و اغفر لنا ربنا)۔

تو عزیز و حکیم ہے: (اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ)۔

تیری قدرت شکست ناپذیر ہے اور تیری حکمت ہر چیز میں نافذ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگر
ان زندگی میں تیرے دشمنوں کی طرف تامل، محبت اور دوستی کی نشانی موجود ہو تو ہماری اس لغزش کو بخش دے۔ نیز یہ تمام مسلمانوں
کے لیے ایک درس ہے کہ وہ بھی اس کو دستور العمل بنائیں اور اگر کوئی طاعب ان میں پیدا ہو جائے تو وہ استغفار کریں اور خدا
رہنمایت پلٹ آئیں۔

❖ ❖ ❖

پھر آخری زیر بحث آیت میں دوبارہ اسی مطلب کو بیان کرتا ہے جو پہلی آیت میں بیان کیا گیا تھا فرماتا ہے: ان کی زندگی
مسلمانوں کے لیے ایک اچھا نمونہ تھے ان لوگوں کے لیے جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ

سَمَۃٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَذَكَرُوا الْحَقَّ حِينَ نَزَّلْنَا الْبُكْرَةَ ۚ وَكَانُوا قَوْمًا عَابِدِينَ ۚ)

نہ صرف بُت پرستوں اور کُفر کے طریقہ سے ان کی برأت اور بیزاری بلکہ بارگاہِ خدا میں ان کی دعائیں اور تقاضے بھی۔

کے کچھ نمونے گزشتہ آیات میں گزر چکے ہیں، تمام مسلمانوں کے لیے دستور العمل ہیں۔

یہ دستور العمل اور نمونہ وہی لوگ قبول کرتے ہیں جنہوں نے خدا کے ساتھ دل لگایا۔ مبدء و معاد پر ایمان نے ان کے

کلمہ نے یہ کہا ہے کہ اوپر والی آیت میں ”لَمَن“، ”لَكُمْ“ کا بدل ہے۔ در تفسیر فخر رازی و روح المعانی زیر بحث آیات کے

دل کو روشن کر دیا اور وہ طریق حق پر چل پڑے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس تاسی اور پیروی کا نفع سب سے پہلے خود مسلمانوں کو ہی پہنچتا ہے۔ اسی لیے آخر میں مذکور ہے: ”جو شخص روگردانی کرے گا اور دشمنانِ خدا سے دوستی کی بنیاد ڈالے گا، وہ خود اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائے گا اور خدا کو اس کی کوئی حاجت نہیں ہے کیونکہ وہ سب سے بے نیاز اور ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے۔“ (ومن يتول فان الله هو الغني الحميد)۔

کیونکہ دشمنانِ خدا کے ساتھ دوستی کرنا انھیں تقویت پہنچاتا ہے، اور ان کی قوت خود تمھاری شکست کا باعث ہے۔ اگر وہ تم پر مسلط ہو گئے تو پھر وہ کسی چھوٹے بڑے پر رحم نہیں کریں گے۔

چند نکات

۱: ابدی نمونہ

عملی نمونے ہمیشہ مؤثر ترین نمونے ہوتے ہیں، چونکہ عمل ہی انسان کے قول پر اس کے ایمان کی گہرائی کا ترجمان ہوتا ہے، اور جو بات دل سے نکلتی ہے لازمی طور پر دل پر اثر کرتی ہے۔

ہمیشہ عظیم نمونے اور دستور العمل ہی انسانوں کی زندگی میں ان کی تربیت کا مؤثر ذریعہ رہے ہیں۔ اسی بناء پر پیغمبرؐ اور ائمہ معصومینؑ ہدایت کی اہم ترین شاخ کی اپنے عمل سے نشان دہی کیا کرتے تھے۔ بناء بریں جب ”سنت“ کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ”سنت“ معصوم کے ”قول“ و ”فعل“ و ”تقریر“ کو کہا جاتا ہے۔ یعنی معصوم پیشواؤں کا قول و فعل و سکوت سب حجت اور رہنما ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام پیغمبروں اور ائمہ میں عصمت شرط ہے تاکہ وہ تمام امور میں نمونہ بن سکیں۔

قرآن نے بھی اس اہم مسئلہ پر مہر تصدیق ثبت کی اور تمام امور میں مومنین کے لیے نمونوں اور اسوہ ہائے حسنہ کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں سے زیر بحث آیات میں ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں دو مرتبہ گفتگو کی ہے۔ نیز سورہٴ اعزاب میں خود ذاتِ پیغمبرؐ کا مسلمانوں کے لیے نمونہ اور اسوہ کے عنوان سے تعارف کرایا ہے۔

(اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ ”اسوہ“ مصدری معنی رکھتا ہے جو اتباع کرنے اور عملی پیروی کے معنی میں ہے۔ اگرچہ

اس قول کی بناء پر جملہ ”من يتول“ جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے۔ وہ تقدیر میں اس طرح ہے: من يتول فقد اخطأ نفسه وذهب عما يعود نفعه الیه جو روگردانی کرے اُس نے اپنے حصہ سے خطا کی اور اُس چیز سے نفع

ہو گیا ہے، جس کا نفع اس کی طرف لوٹتا ہے۔

اسی کے روزمرہ کے استعمالات میں اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جس کی اتباع اور پیروی کرنی چاہیے۔
 خطروں سے بھری ہوئی جنگِ احزاب میں جبکہ مسلمان سخت ترین آزمائش میں مبتلا تھے، اور ہمت توڑ دینے والے
 حادثے نے قوی ترین افراد کو بھی لرزہ بر اندام کر دیا تھا، خدا نے تعالے اس طوفان کے درمیان استقامت، پامردی، ایمان،
 راسخ اور اطمینانِ قلب کے نمونہ کے طور پر اپنے پیغمبرؐ کا تعارف کراتا ہے۔ البتہ یہ امر صرف میدانِ احزاب میں ہی منحصر
 نہیں تھا بلکہ پیغمبرؐ ہر جگہ مسلمانوں کے لیے ایک عظیم نمونہ شمار ہوتے تھے۔

”گوخُوا دَعَا النَّاسِ بِأَعْمَالِكُمْ وَلَا تَكُونُوا دَعَاةَ بِالسَّنْتِكُمْ“
 ”لوگوں کو اپنے عمل سے خدا کی طرف دعوت کرو نہ کہ اپنی زبان سے۔“

یہ شعار اور نعرہ جو امام جعفر صادقؑ کی حدیث سے لیا گیا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ تمام سچے مسلمانوں کو بھی
 اسی جگہ پر دوسروں کے لیے نمونہ بننا چاہیے، اگر یہ کام ہو جاتا تو اسلام عالمگیر ہو جاتا۔

خدا سب سے بے نیاز ہے۔

قرآنِ مجید میں بارہا اس نکتے کا بیان ہوا ہے کہ اگر خدا تمہیں کچھ ایسے احکام دیتا ہے جو بعض اوقات مشکل اور شاق
 لگاتے ہیں، تو اس بات کو نہ بھولیں کہ ان کے تمام منافع تمہاری طرف ہی لوٹتے ہیں۔ کیونکہ خدا کی ہستی کے سبکراں سمندر
 کی گئی کمی نہیں ہے کہ وہ تم سے مدد لے، اس کے علاوہ تمہارے پاس کچھ ہے ہی نہیں کہ تم اُس کو مدد دو، بلکہ جو کچھ
 تمہارے پاس ہے وہ اُسی کا ہے۔

حدیثِ قدسی میں آیا ہے :

”میرے بندو! تم مجھے ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور نہ ہی کوئی نفع دے سکتے ہو۔ اے میرے
 بندو! اگر اولین و آخرین اور جن و انس پاکیزہ ترین دل رکھتے ہوں تو بھی میرے ملک میں ذرہ برابر اضافہ
 نہیں کر سکتے۔ اگر اولین و آخرین اور جن و انس ناپاک ترین دل رکھتے ہوں تو میرے ملک میں کوئی کمی نہیں
 کر سکتے۔“

”اے میرے بندو! اگر اولین و آخرین اور جن و انسان کسی میدان میں جمع ہو جائیں، جو کچھ وہ چاہیں
 مجھ سے طلب کریں اور میں وہ سب کچھ اُن کو دے دوں تو بھی میرے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی،
 اور وہ سب کچھ اس رطوبت کے مانند ہوگا جو ایک رسی سمندر سے حاصل کرتی ہے۔“

”اے میرے بندو! میں تمہارے اعمال کا ذخیرہ کرتا ہوں اور پھر میں اُنہیں تمہاری طرف لوٹا دوں گا،
 اب اگر کوئی اچھی چیز حاصل کرے تو وہ خدا کا شکر کرے اور جو اس کے سوا دیکھے تو وہ اپنے سوا کسی اور

کی ملامت نہ کرے۔ لے

”حب فی اللہ و بغض فی اللہ“ بنیادی اصل ہے۔

مذہب کا رشتہ وہ اہم ترین رشتہ ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتا ہے اور دوسرا ہر رشتہ اسی کے زیر اثر ہے۔

یہ وہ بات ہے جس پر قرآن نے بارہا تاکید کی ہے، اگر یہ رشتہ، دوستی، عزیزداری اور منافع شخصی روابط کے زیر اثر ہو جائے تو ارکان مذہب متزلزل ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ اصل قدر و قیمت ایمان و تقویٰ کی ہے، لہذا یہ یکے کے بغیر ممکن ہے کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ رابطہ قائم کریں جن میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔

امام جعفر صادق کی ایک حدیث میں آیا ہے :

”مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَابْغَضَ لِلَّهِ، وَاعْطَى لِلَّهِ جَلَّ وَعَزَّ
فَهُوَ مِمَّنْ كَمَلَ إِيمَانُهُ“

”جو شخص خدا کے لیے دوست رکھتا ہے، خدا کے لیے دشمن رکھتا ہے اور
خدا کے لیے عطا و بخشش کرتا ہے تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا ایمان کامل ہو
گیا ہے“

ایک اور حدیث میں انہی حضرت سے آیا ہے :

”مَنْ أَوْثَقَ عَرَى الْإِيمَانِ أَنْ تَحِبَّ فِي اللَّهِ، وَتَبْغُضَ فِي اللَّهِ
وَتَعْطَى فِي اللَّهِ، وَتَمْنَعَ فِي اللَّهِ“

”ایمان کو محکم ترین کرنے والی چیزوں میں سے یہ ہے کہ تو خدا کے لیے دوستی
رکھے، خدا کے لیے ہی دشمنی رکھے۔ خدا کے لیے ہی دے اور خدا کے لیے ہی روکے۔“

اس سلسلے میں احادیث بہت زیادہ ہیں، مزید آگاہی کے لیے اصول کافی جلد دوم باب الحب فی اللہ کی طرف رجوع کریں۔ مرجع کلینی نے اس باب میں، اس سلسلے کی سولہ احادیث نقل کی ہیں۔

علاوہ انہیں ”حب فی اللہ اور بغض فی اللہ“ کی مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۳ سورہ مجادلہ کی آیت ۲۲ کے ذیل میں ہمارے بیان سے رجوع کریں۔

- عَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مِنْهُمْ مَوَدَّةً ۖ وَاللَّهُ قَدِيرٌ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝
- لَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝
- إِنَّمَا يَنْهَاكُمْ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوهُمْ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

ترجمہ

- ۴) اُمید ہے کہ خدا تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان (اسلام کے ذریعے) رشتہ محبت قائم کرے گا، اور خدا قادر، بخشنے والا اور مہربان ہے۔
- ۸) خدا نے تمہیں ان لوگوں سے جنہوں نے امر دین میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے شہر اور دیار سے باہر نہیں نکالا، نیکی کرنے اور عدالت کی رعایت کرنے سے منع نہیں کیا، کیونکہ خدا عدالت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
- ۹) خدا تو تمہیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے امر دین میں تم سے جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے باہر نکالا یا تمہارے باہر نکالنے میں مدد کی ہے اور جو شخص ان سے دوستی کرے گا وہی تو ظالم و شتمن ہے۔

تفسیر

اُن کفار سے دوستی جو برسرِ پیکار نہیں ہیں

ان آیات میں ان مباحث کو جاری رکھا گیا ہے جو گزشتہ آیات میں ”حُبِّ فی اللہ“ اور ”لُبْضِ فی اللہ“ اور مشرکین سے قطع تعلق کرنے کے سلسلہ میں آئے تھے۔ چونکہ یہ قطع تعلق مسلمانوں کی ایک جماعت کے لیے قربت داری میں ایک قسم کا غلا پیدا کرتا تھا، اس کے باوجود سچے مومنین اور صحابہٴ رسول نے اس راہ میں ثابت قدمی دکھائی تھی، لہذا خدا ان کی جزاء کے لیے اور اس کمی کو دور کرنے کے لیے انہیں بشارت دیتا ہے کہ ”تم غم نہ کھاؤ۔ یہ حالت ہمیشہ اسی طرح نہیں رہے گی“ فرماتا ہے :

”اُمید ہے کہ خدا تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان (اسلام قبول کرنے کے ذریعے) دوستی کا رشتہ قائم کر دے گا۔“ (عسی اللہ ان یجعل بینکم و بین الذین عادیتہم منہم مودۃ)۔

انجام کار یہ وعدہ پورا ہو گیا، ہجرت کا آٹھواں سال آیا اور مکہ فتح ہو گیا۔ اہل مکہ یدخلون فی دین اللہ افواجا کے مصداق گروہ درگروہ مسلمان ہو گئے، دشمنی و عناد کے سیاہ بادل ان کی زندگی کے آسمان سے چھٹ گئے اور آفتاب ایمان و محبت و دوستی کی گرمجوشی کے ساتھ چمکنے لگا۔

بعض مفسرین اس مجملہ کو ”ام حبیبہ“ دختر ابوسفیان کے ساتھ پیغمبر کے ازدواج کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جو مسلمان ہو چکی تھی اور اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ہمراہ مہاجرین حبشہ کے ساتھ حبشہ گئی تھی۔ اُس کا شوہر وہاں عیسائی ہو گیا تو پیغمبر اسلام نے کسی کو نجاشی کے پاس بھیجا اور ام حبیبہ کو اپنی ازدواج میں داخل کر لیا۔ چونکہ عربوں میں دامادی کا رشتہ عداوت اور دشمنیوں کی کمی کا باعث بنتا تھا، لہذا اس مسئلہ نے ابوسفیان اور اہل مکہ پر اثر ڈالا۔

لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔ زیر بحث آیات فتح مکہ کے قریب نازل ہوئیں، کیونکہ ”عاطب بن ابی بلتعہ“ کا مشرکین کو کوخط لکھنے سے متصد یہ تھا کہ وہ انہیں اس واقعہ کی اطلاع دے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالب اور ان کے ساتھی اس واقعہ سے پہلے (فتح خیبر کے قریب) مدینہ کی طرف پلٹ آئے تھے۔ لہ

بہر حال اگر وہ لوگ جو مسلمانوں کے عزیز و رشتہ دار ہیں، ان کے مذہب سے جدا ہو جائیں تو انہیں اُن کے اسلام کی

۱۔ عبید اللہ بن جحش، عبید اللہ بن جحش کا بھائی ہے، افسوس ہے کہ عبید اللہ اسلام پر باقی نہ رہا اور حبشہ میں اُس نے دین عیسائیت اختیار کر لیا۔ اسی بنا پر ام حبیبہ اس سے الگ ہو گئی۔ لیکن عبید اللہ کا بھائی عبید اللہ اسلام پر باقی رہا۔ وہ مجاہدین اُعدیوں سے تھا، اور اسی میدان میں اُس نے شہید شہادت نوش کیا۔
۲۔ اس واقعہ کا خلاصہ بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے۔ تاہم اس واقعہ کی تفصیل ”اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ“ جلد ۳ میں ۵۷۳ میں مطالعہ فرمائیے۔

لٹنے سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، وہی ہے جو دلوں کو تبدیل کر سکتا ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی خطاؤں اور گناہوں کو بخشتا ہے، لہذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے ”خدا قادر و توانا اور غفور و رحیم ہے۔ (واللہ قدیس واللہ غفور رحیم)۔“

لفظ ”عسی“ عربی زبان میں ان موارد میں بولا جاتا ہے جہاں کسی چیز کے پورا ہونے کی اُمید ہو، چونکہ یہ معنی بعض اوقات جہالت یا عجز سے ملا ہوا ہوتا ہے لہذا بہت سے مفسرین نے قرآن مجید میں اس کی تفسیر خدا سے دوسروں کے اُمید رکھنے کے معنی میں کی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یہ لفظ خدا کے کلام میں اپنا وہی اصلی معنی رکھتا ہو۔ کیونکہ بعض اوقات کسی ہمت اور مقصد تک پہنچنے کے لیے کچھ شرائط اور حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے بعض شرائط حاصل نہ ہوں تو یہی تعبیر استعمال ہوگی۔ (غور کیجیے)

بعد الی آیات میں مشرکین سے دوستی کے رابطے ترک کرنے کے مسئلہ کی تشریح و توضیح ہے۔ فرماتا ہے: ”خدا تمہیں ان لوگوں سے نیکی کرنے اور عدالت کی رعایت کرنے کے بارے میں، جنہوں نے تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمہیں اپنے گھربار سے باہر نکالا ہے، منع نہیں کرتا۔“

(لَا يَنْهٰكُمْ اللّٰهُ عَنِ الذِّينِ لَمْ يِقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّينِ وَلَمْ يَخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبْرُوْهُمْ وَتَقْسُطُوْا اِلَيْهِمْ)۔

کیونکہ خدا عدالت اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ يَحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ)۔

خدا تو تمہیں صرف ان لوگوں کی دوستی سے منع کرتا ہے جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھر اور شہر سے باہر نکالا یا تمہیں باہر نکالنے میں مدد کی ہے۔ ہاں! خدا تمہیں ان سے ہر قسم کے تعلق اور دوستی سے منع کرتا ہے۔ (اِنَّمَا يَنْهٰكُمْ اللّٰهُ عَنِ الذِّينِ قَاتَلُوْكُمْ فِى الدِّينِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰى اَخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ)۔

”اور جو شخص انہیں دوست رکھے وہ ظالم و ستمگر ہے۔“ (وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ)۔ اس طرح سے غیر مسلم افراد و گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں کھڑا ہو گیا۔ ان کے سامنے تلوار بھینچ لی اور انہیں گھربار سے جبراً باہر نکال دیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی کو گفتار و عمل سے آشکارا کیا۔ اس صورت میں مسلمانوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس گروہ کے ساتھ ہر قسم کے میل جول اور تعلق کو ختم کر دیں اور ہر قسم کی دوستی اور محبت کا تعلق چھوڑ دیں۔ اس کا واضح مصداق مشرکین مکہ خصوصاً سرداران قریش تھے کہ جن میں سے ایک گروہ نے تو رسمی طور پر یہ کام کیا تھا اور دوسرے گروہ نے اس میں ان کی مدد کی تھی۔

لیکن ایک اور گروہ ایسا بھی تھا جو کفر و شرک کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا۔ نہ تو وہ عداوت و دشمنی رکھتے تھے، نہ ہی ان کے ساتھ جنگ کرتے تھے اور نہ ان کو ان کے گھربار اور شہر و دیار سے باہر نکالنے کا اقدام کرتے

بن سے قتل
یک قسم کا
ان کی جزاء
نہیں رہے

شہ قاتم کر

لہ افواخا
آفتاب

جو مسلمان
ن ہو گیا تو
رشتہ عداوت

کا مشرکین
ان کے

اسلام کی

بن پر ام حبیبہ
رش کیا۔

جلد ۱۳

تھے۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ایک گروہ نے تو مسلمانوں سے دشمنی نہ کرتے کا عہد کر رکھا تھا۔ پس اس گروہ سے نیکی کرنے اور اظہارِ محبت کرنے میں کوئی مانع نہیں تھا اور اگر اُن سے کوئی معاہدہ کیا جُڑا ہے تو اس کو وفا کرنا چاہیے اور ان سے عدالت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس گروہ کا مصداق قبیلہ ”غزاعہ“ تھا، جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ترکِ فحاشیت کا عہد و پیمان باندھا ہوا تھا۔ اس بناء پر بعض مفسرین کی اس توجہ کی گنجائش نہیں کہ جنہوں نے اس حکم کو منسوخ سمجھا اور اس کا نسخ سورہ توبہ کی آیہ ۵ کو بیان کیا ہے کہ جس میں کہتا ہے: ”فاذا اسلخ الاشهر الحرم فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم“ جب محترم مہینے ختم ہو جائیں تو پھر بُت پرستوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔“ کیونکہ سورہ توبہ کی یہ آیت صرف اُن مشرکین کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جنہوں نے عہد شکنی کی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف علی الاعلان اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بات کی گواہ اس کے بعد والی آیات ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے بارے میں ایک روایت کی ہے کہ ابو بکر کی مطلقہ بیوی اپنی بیٹی ”اسماء“ کے لیے مکہ سے کچھ دیے لائی تو ”اسماء“ نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ اپنی ماں کو بھی گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ تب اوپر والی آیت نازل ہوئی اور پیغمبر نے اُسے حکم دیا کہ اپنی ماں کو گھر میں آنے دے، اس کا ہدیہ بھی قبول کر لے اور اس کا اکرام و احترام کرے۔

یہ روایت بتاتی ہے کہ مکہ کے سارے لوگ اس آیت کے مشمول نہیں تھے، بلکہ مسلمانوں کے درمیان ایک ایسی اقلیت بھی موجود تھی جو مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی کوئی دشمنی اور فحاشیت نہیں رکھتے تھے۔

بہر حال ان آیات سے مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ رابطہ کی کیفیت کی ”ایک بنیادی اور کلی اصل“ کا پتہ چلتا ہے جو نہ صرف اس زمانہ کے لیے بلکہ آج کے اور آئندہ زمانے کے لیے بھی ثابت ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر ایسا گروہ، جمعیت اور ملک جو اُن سے دشمنی رکھتا ہو، اسلام اور مسلمانوں کے مخالف ہو یا دشمنانِ اسلام کی مدد کرتا ہو، اس کے خلاف سختی کے ساتھ مقابلے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ان سے ہر قسم کی دوستی کا رشتہ منقطع کر لیں۔ لیکن اگر وہ کافر ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غیر جانبدار ہوں یا ان کی طرف مائل ہوں تو پھر مسلمان ان کے ساتھ دوستانہ روابط رکھ سکتے ہیں، البتہ اس حد تک نہیں جو وہ مسلمان بھائیوں کے ساتھ رکھتے ہیں اور نہ ہی اس حد تک کہ وہ مسلمانوں میں نفوذ پیدا کر لیں۔

اگر کوئی گروہ یا کوئی حکومت گروہِ اول میں سے ہو اور وہ اپنی روش کو بدل دیں یا اس کے برعکس وہ دوسرے گروہ میں ہوں اور وہ اپنا راستہ بدل لیں تو پھر ان کی موجودہ وضع و کیفیت کو معیار قرار دیا جائے گا اور ان کے ساتھ اوپر والی آیات کے مطابق طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ دوستی کی اجازت ان مومنین کے بارے میں ہے جو اسلام کو قبول کر چکے تھے، لیکن وہ مکہ میں موجود تھے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ لیکن آیات کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ یہ تمام باتیں غیر مسلموں کے بارے میں جو رہی ہیں۔

روح البیان جلد ۹ ص ۴۸۱ یہ روایت صحیح بخاری اور دوسری بہت سی کتب تفسیر میں بھی کچھ اختلاف کے ساتھ آئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ ۖ
فَامْتَحِنُوهُنَّ ۚ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ
مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ
لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۚ وَاتُّوهُم مَّا أَنْفَقُوا ۚ وَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ
وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسَلُّوا مَّا أَنْفَقْتُمْ وَلَيْسَ لَكُم مَّا
أَنْفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝
وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقِبْتُهُ
فَاتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَا أَنْفَقُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ
الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ۝

ترجمہ

اے ایمان لانے والو! جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو تم ان کی
آزمائش کر لیا کرو۔ خدا تو ان کے ایمان سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ پھر جب تم انہیں مومنہ پاؤ
تو انہیں کفار کی طرف مت لوٹاؤ کہ نہ تو وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ ہی کفار ان کے لیے

اگر وہ سے نیکی
چاہتے اور ان

نڈھا ہوا تھا۔

ناسخ سورہ توبہ کی

رکین حیث

یہ آیت صرف

الاعلان اٹھ کر

فی بیٹی "اسما"

کی گھر میں داخل

نے دے، اس

درمیان ایک

کلی اصل کا

ہے کہ مسلمانوں

نہ ہوا دشمنان

رشتہ منقطع کر لیں

مائل ہوں تو پھر

بچتے ہیں اور نہ

دوسرے کردہ

اوپر والی آیات

کے میں دیکھیں

حلال ہیں۔ اور جو کچھ اُن کے شوہروں نے (اُن سے ازدواج کرنے میں) خرچ کیا ہے وہ انہیں دے دو۔ اب تمہارے لیے ان سے نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے جبکہ تم ان کا مہر انہیں ادا کر دو، اور تم بھی کافرہ بیویوں کو ہرگز اپنی زوجیت میں نہ رکھو (اور اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی کافرہ ہو جائے اور وہ کافروں کے شہر کی طرف بھاگ جائے) تو تم حق رکھتے ہو کہ جو حق مہر تم نے ادا کیا ہے اُس کا مطالبہ کرو جس طرح وہ حق رکھتے ہیں کہ جن عورتوں سے وہ جدا ہو گئے ہیں، ان کے حق مہر کا تم سے مطالبہ کریں، یہ خدا کا حکم ہے جو تمہارے درمیان حکم کرتا ہے۔ اور خدا اعلیٰ و جلیٰ ہے۔

(۱۱) اگر تمہاری بیویوں میں سے بعض تمہارے ہاتھ سے نکل جائیں (اور کفار کی طرف پلٹ جائیں) اور تم جنگ میں ان پر کامیابی حاصل کر لو اور مال غنیمت تمہارے ہاتھ آئے، تو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں، ان کو اتنا مہر دے دو جتنا انھوں نے دیا ہے اور اس خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو جس پر تم سب ایمان رکھتے ہو۔

شانِ نزول

مفسرین کی ایک جماعت نے ان آیات کے شانِ نزول میں اس طرح نقل کیا ہے کہ رسول خداؐ نے صلح حدیبیہ میں مشرکین مکہ سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ جو شخص اہل مکہ میں سے مسلمانوں کے ساتھ آئے وہ اسے واپس کر دیں گے۔ لیکن اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر مکہ کی طرف پلٹ جائے تو وہ اُسے واپس نہیں کرینگے۔ اسی دوران ایک عورت جس کا نام ”سبیہ“ تھا، اُس نے اسلام قبول کر لیا اور اسی سرزمین حدیبیہ میں مسلمانوں سے آ رہی۔ تب اس کا شوہر یتیم کی خدمت میں آیا اور کہا: یا محمد! میری بیوی مجھے پٹا دو، کیونکہ ہمارے معاہدہ کی ایک شق یہ بھی ہے اور ابھی اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی ہے۔ اس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور حکم دیا گیا کہ مہاجر عورتوں کا امتحان کر لیا کرو۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ ان کا امتحان یہ تھا کہ ان سے قسم لی جائے کہ ان کی ہجرت شوہر سے بغض نہ کینے یا نئی زمین سے لگاؤ یا کسی دنیاوی مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کی ہجرت صرف اسلام کی وجہ سے ہے۔

اس عورت نے قسم کھائی کہ ایسا ہی ہے تو اس موقع پر پیغمبرؐ نے وہ حق مہر جو اُس کے شوہر نے اس کو دیا تھا، اور تمام خرچہ جو اُس کے شوہر نے کیا تھا، اُس کے شوہر کو ادا کر کے فرمایا: ”قرارداد معاہدہ کی اس شق کے مطابق عورتوں کو نہیں صرف مردوں کو لوٹانا ہے۔“

تفسیر

مسلمانوں اور کفار کے نقصان کی تلافی

گزشتہ آیات میں ”لُبْضِ فِي اللَّهِ“ اور ”دُشْمَانِ نَدَا“ سے قطع تعلق کے بارے میں گفتگو تھی، لیکن زیر بحث آیات میں ”حَبِّ فِي اللَّهِ“ اور ان لوگوں سے — جو کفر سے جدا ہو کر ایمان کے ساتھ تعلق قائم کریں رشتہ جوڑنے کے بارے میں گفتگو ہے۔

پہلی آیت میں مہاجر عورتوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اس آیت میں مجموعی طور پر سات احکام وارد ہوئے ہیں جو زیادہ تر مہاجر عورتوں کے بارے میں ہیں اور ان کا ایک حصہ کافر عورتوں کے بارے میں بھی ہے۔
۱: پہلا حکم: ”مہاجر عورتوں“ کی آزمائش کے بارے میں ہے۔ ”رُوئے سَخْنِ مُؤْمِنِينَ“ کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے ایمان لانے والو! جب مومنہ عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو تم انہیں واپس نہ کیا کرو بلکہ ان کا امتحان کر لیا کرو۔ (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مِهَاجِرَاتٍ فَاِمْتَحِنُوهُنَّ)۔
انہیں مومنات کہنے کے باوجود امتحان کا حکم دینا اس بناء پر ہے کہ وہ ظاہری طور پر تو شہادتین کو زبان پر جاری کرتی تھیں اور اہل ایمان کے زمرہ میں تھیں، لیکن یہ امتحان اس لیے تھا تا کہ اطمینان ہو جائے کہ — یہ ظاہر باطن کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

باقی رہا امتحان کا طریقہ تو جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ وہ اسی طرح سے تھا کہ انہیں قسم دلاتے تھے کہ ان کی مہاجرت اسلام قبول کرنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے نہیں تھی۔ انہیں یہ قسم کھانی چاہیے کہ انہوں نے شوہر سے دشمنی یا کسی دوسرے مرد سے تعلق یا مدینہ کی سرزمین سے لگاؤ اور اسی طرح کی دوسری باتوں کے لیے ہجرت نہیں کی ہے۔
یہ احتمال بھی ہے کہ اسی سورۃ کی بارہویں آیت مہاجر عورتوں کے امتحان کی کیفیت کی تفسیر ہو، (جس کے مطابق انہیں چاہیے) کہ وہ پیغمبرؐ کی اس بات پر بیعت کریں کہ وہ راہِ شرک اختیار نہیں کریں گی، اور وہ چوری، منافیِ عفتِ اعمال،

اور والدی شانِ نزولِ نبوت سے تفسیروں میں آئی ہے۔ ہم نے اسے مجمع البیان سے کچھ تخیص کے ساتھ ادھر پیش کیا ہے۔ ”طبرسی“ نے اس حدیث کو ”ابن عباس“ سے نقل کیا ہے۔

اولاد کو قتل کرنے اور اس قسم کے اعمال کی ترکیب نہ ہوں گی اور رسولِ خداؐ کے فرمان کو کامل طور سے تسلیم کریں گی۔
البتہ ممکن ہے کہ کچھ افراد اس قسم اور بیعت میں بھی غلط بیانی سے کام لیں، لیکن اُس زمانہ میں بہت سے لوگوں
حتیٰ کہ مشرکین کا مسئلہ بیعت اور خدا کی قسم کے لیے مقید ہونا اس بات کا سبب بنا کہ بہت کم افراد جھوٹ بولیں۔ اس
طرح سے مذکورہ امتحان اگرچہ ہمیشہ اُن کے ایمانِ واقعی کی دلیل تو نہیں ہوتا تھا، لیکن عام طور پر اس واقعیت کو بیان کرنے
والا ہو سکتا تھا۔

لہذا بعد کے جملہ میں مزید کہتا ہے: ”خدا ان کے دل کی اندرونی کیفیت اور اُن کے ایمان کے متعلق سب سے
زیادہ آگاہ ہے۔“ (اللہ اعلم بایمانہن)۔

۲: اس کے بعد والے حکم میں فرماتا ہے: ”جب وہ اس امتحان میں پوری اتر جائیں اور تم نے واقعی انہیں مومنہ جان لیا
تو پھر انہیں کفار کی طرف نہ پلٹاؤ۔“ (فان علمتوهن مؤمنات فلا ترجعوهن الی الکفر)۔

یہ درست ہے کہ حدیبیہ میں زبردستی کے معاہدے کا ایک جز یہ تھا کہ وہ افراد جو مسلمان ہو کر مکہ سے مدینہ کی طرف
ہجرت کریں گے، انہیں مکہ کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن اس جز کا عورتوں پر اطلاق نہیں ہوتا تھا، لہذا پیغمبرؐ نے
انہیں ہرگز کفار کی طرف نہیں پلٹایا۔ یہ ایک ایسا کام تھا کہ اگر یہ انجام پا جاتا تو اس معاشرے میں عورتوں کے حد سے کمزور
ہونے کی وجہ سے ان کے لیے سخت خطرناک ہوتا۔

۳: تیسرے مرحلہ میں جو حقیقت میں گزشتہ حکم کی ایک دلیل ہے: ”مزید کہتا ہے:“ نہ تو یہ عورتیں کافروں پر حلال ہیں
اور نہ ہی وہ کافر مردان ایماذ عورتوں پر حلال ہیں۔“ (لاهن حل لہم ولا هم یحلون لہن)۔

یہ اسی طرح ہونا چاہیے، کیونکہ ایمان و کفر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور ازدواج کا مقدس پیمانہ مومن و کافر کے درمیان
رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ دونوں دو متضاد نظریات رکھتے ہیں جبکہ پیمانہ ازدواج کو بیوی اور شوہر کے درمیان
ایک قسم کی وحدت قائم کرنی چاہیے اور یہاں دونوں ایک دوسرے سے سازگار نہیں ہیں۔

البتہ ابتداء اسلام میں جبکہ ابھی اسلامی معاشرہ مستحکم نہیں ہوا تھا ایسے شوہر اور بیویاں تھیں کہ جن میں سے ایک کافر
اور دوسرا مسلمان ہوتا تھا۔ محمد پیغمبرؐ اس سے منع نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔ چنانچہ ظاہری
طور پر صلح حدیبیہ کے بعد مکمل طور پر جدائی کا حکم دیا گیا، اور زیر بحث آیت اس موضوع کی ایک دلیل ہے۔

۴: چونکہ عربوں میں معمول یہ تھا کہ وہ اپنی عورتوں کا حق مہر پہلے دے دیتے تھے۔ لہذا چوتھے حکم میں مزید کہتا ہے: ”ان
کے کافر شوہروں نے جو کچھ اس ازدواج میں خرچ کیا ہے وہ ان کو دے دو۔“ (وأتوهما ما انفقوا)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان کے شوہر کافر ہیں۔ لیکن چونکہ جدائی اور علیحدگی کا اقدام ایمان لانے کی بنا پر عورت کی طرف سے شروع
ہوا ہے۔ لہذا عدالت اسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ اس شوہر کے خسارے پورے کیے جائیں۔

کیا یہاں انفاق سے مراد صرف حق مہر ہے یا اس میں وہ تمام اخراجات شامل ہیں جو اُس نے اس سلسلہ میں کیے ہیں؟
اکثر مفسرین نے پہلے معنی کو اختیار کیا ہے اور آیت میں قدر مسلم بھی یہی ہے۔ اگرچہ ”الوافیون رازی“ کے مانند بعض مفسرین نے

اپنی تفسیر میں دوسرے فرائض بھی اس میں شامل کیے ہیں۔ لے
البتہ یہ حق مہر کا ادا کرنا ایسے مشرکین کے بارے میں تھا جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ یا دوسرے مواقع پر
ترکِ عصمت کا عہد کیا تھا۔

لیکن یہ مہر کس کو ادا کرنا چاہیے؟ ظاہر یہ ہے کہ یہ کام حکومتِ اسلامی اور بیت المال کے ذمہ ہے، کیونکہ ایسے
تمام امور جن کا اسلامی معاشرہ میں کوئی خاص شخص ذمہ دار نہیں وہ حکومت ہی کے ذمہ ہوتے ہیں اور زیر بحث آیت میں
جمع مخاطب کا صیغہ اسی معنی کا گواہ ہے۔ (جیسا کہ چور کی حد اور زانی کی حد والی آیات میں نظر آتا ہے)۔
۵: ایک اور حکم جو اوپر والے احکام کے بعد آیا، وہ یہ ہے کہ فرماتا ہے: ”اگر تم ان کے ساتھ نکاح کر لو تو تم پر کوئی
گناہ نہیں ہے جبکہ تم ان کا حق مہر ادا کر دو۔ (ولا جناح علیکم ان تنکحوھن اذا اتیتوھن
اجورھن)۔

کہیں تم یہ تصور نہ کر لو۔ چونکہ وہ سابقہ شوہر سے حق مہر پہلے ہی لے چکی ہیں اور اس کے بدلے میں بیت المال
سے اُس کے شوہر کو دے دیا گیا ہے اور تمہارا مفت میں کام ہو جائیگا۔ نہیں! ایسا نہیں ہے، عورت کی حرمت اور عزت
کا تقاضا یہی ہے کہ جدید ازدواج میں بھی مناسب حق مہر اس کو دیا جائے۔

توجہ رکھنا چاہیے کہ یہاں عورت اپنے کافر شوہر سے طلاق کے بغیر الگ ہو جائے گی لیکن عدت پوری کرنا پڑے گی۔
مشہور فقہیہ ”صاحبِ جواہر“ نے محقق کے کلام کی شرح کرتے ہوئے کہ جو انھوں نے شرائع میں بیان کیا کنا ہے کہ:
”اہل کتاب زوجہ و شوہر کے علاوہ، زوجہ و شوہر میں سے جو کوئی بھی اسلام قبول کر لے۔ اگر یہ دخول سے پہلے ہو تو عفت
بلا فاصلہ فسخ ہو جائے گا۔ اگر دخول کے بعد ہو تو پھر وہ عدت کے ساتھ وابستہ ہے۔“ فرماتے ہیں: ”ان احکام میں کسی
قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ روایات اور فقہاء کے فتوے اس بارے میں ہم آہنگ ہیں۔“ لے

۶: لیکن، اگر معاملہ اس کے برعکس ہو، یعنی شوہر اسلام قبول کر لے اور عورت کفر پر باقی رہے تو یہاں بھی زوجیت کا رابطہ
ٹوٹ جائے گا اور نکاح فسخ ہو جائے گا، جیسا کہ اسی آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے: ”کافر بیویوں کو اپنی زوجیت میں
نہ روکے رکھو۔“ (ولا تمسکوا بعصم الکوافر)۔

”عصم“، ”عصمت“ کی جمع ہے جو اصل میں منع کرنے کے معنی میں ہے، یہاں جیسا کہ مفسرین نے کہا اور تدریس
گواہی دیتے ہیں، نکاح اور زوجیت کے معنی میں ہے۔ (البتہ بعض نے یہ تصریح کی ہے کہ اس سے مراد نکاح دائمی ہے اور
عصمت کی تعبیر بھی اسی معنی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ نکاح دائمی عورت کو کسی بھی دوسرے شخص سے ازدواج
کرنے سے ہمیشہ کے لیے منع کرتا ہے۔

”کوافر“، ”کافرة“ کی جمع اور کافر عورتوں کے معنی میں ہے۔ کیا یہ حکم مشرک عورتوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے یا اہل کتاب مثل عیسائی اور یہودی عورتوں کے لیے بھی ہے؟ اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں اور ان کی تشریح و تفصیل کا فقہ کی کتابوں میں مطالعہ کرنا چاہیے۔ لیکن آیت کا ظاہر مطلق ہے اور تمام کافرہ عورتوں کے لیے ہے۔ نیز شان نزول اسے محدود نہیں کرتا۔ لیکن عدت کا مسئلہ یہاں بطریق اولیٰ برقرار ہے، کیونکہ اگر اس عورت سے بچہ پیدا ہو تو وہ مسلمان بچہ ہو گا کہ اس کا باپ مسلمان ہے۔

۴: آخری حکم جو آیت میں بیان ہوا ہے اس میں ان عورتوں کے حق مہر کے بارے میں گفتگو ہے جو اسلام سے علیحدگی اختیار کر کے اہل کفر سے جا ملیں، فرماتا ہے: ”اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی اسلام سے الگ ہو جائے تو تم حق رکھتے ہو کہ جو حق مہر تم نے ادا کیا ہے اس کا مطالبہ کرو، جیسا کہ وہ حق رکھتے ہیں کہ اپنی ان عورتوں کے مہر کا مطالبہ کریں۔ جو ان سے جدا ہو کر اسلام سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ (وَسَلُّوا مَا انفَقْتُمْ وَلَيْسَ لَكُمْ مَا انْفَقُوا)۔ اور یہ عدالت اور برابر حقوق کا تقاضا ہے۔

جو کچھ بیان ہو چکا، آیت کے آخر میں ان پر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یہ اللہ کے وہ احکام ہیں جن کا وہ تمہیں حکم دیتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔“ (ذَالِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ)۔ یہ ایسے احکام ہیں جن کا سرچشمہ علم الہی ہے، یہ حکمت کی آمیزش رکھتے ہیں، ان میں تمام افراد کے حقوق نظر میں رکھے گئے ہیں اور یہ اصل اسلامی عدالت و انصاف کے ساتھ کامل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ ان احکام کے اجراء کیلئے عظیم ترین ضمانت شہادت ہے دوسری اور آخری زیر بحث آیت میں اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے: ”اگر تمہاری بیویوں میں سے بعض تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہوں اور اسلام کو چھوڑ کر کفار سے جا ملی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں جنگ میں ان پر کامیابی حاصل ہو جائے اور کچھ مال غنیمت تمہارے ہاتھ لگ جائے تو ان افراد کو جو اپنی بیویاں ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں، جتنا مہر انھوں نے ادا کیا ہوا ہے اتنا غنائم میں سے انھیں دے دو۔ (وَأَنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِنَ الْأَنْفُسِ فَعَالِمٌ الْغَيْبِ فَاتُوا الذَّالِمِينَ ذَهَبْتَ أَزْوَاجَهُمْ مِثْلَ مَا انْفَقُوا)۔

گزشتہ آیت کے مطابق مسلمان اس قسم کی عورتوں کا حق مہر کفار سے لے سکتے تھے، جیسا کہ وہ حق رکھتے تھے کہ اپنی ان بیویوں کا حق مہر مسلمانوں سے لے لیں جو اسلام سے وابستہ ہو کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئی ہیں۔ لیکن بعض روایات کے مطابق اس عادلانہ حکم پر مسلمانوں کے عمل کے باوجود مشرکین مکہ نے اس سے جو گروہ دانی کی۔ لہذا ان افراد کے حق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یہ حکم دیا گیا کہ جب مال غنیمت ہاتھ آئے تو پہلے ان کا حق دیا جائے اور اس کے بعد باقی مال غنیمت کو تقسیم کیا جائے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اوپر والا حکم ایسی اقوام کے ساتھ مربوط ہو جن سے مسلمانوں کا کوئی عہد و پیمان نہیں تھا، لہذا طبعی طور پر وہ اس قسم کی عورتوں کا حق مہر مسلمانوں کو واپس دینے کے لیے تیار نہیں تھے، تاہم دونوں معافی کا جمع ہونا بھی ممکن ہے۔

”عاقبتہ“ ”معاقبۃ“ کے مادہ سے اصل میں ”عقب“ (بروزن کدر) ”پاؤں کی ایڑی“ کے معنی میں ہے، اسی مناسبت سے لفظ ”عقبی“ کسی کام کی جزا کے معنی میں اور ”عقبوبت“ کبھی غلط کام کی سزا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بعض اوقات

یہ لفظ "مُحَاقِبَہ" باری باری کام کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ وہ لوگ جو کسی کام کو باری باری انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بعد آ پہنچتا ہے۔ اس لیے اوپر والی آیت میں "عاقبتہم" مسلمانوں کے کفار پر غالب ہونے اور انھیں سزا دینے کے معنی میں ہے جو صغنی طور پر غنائم لینے سے تفسیر ہوا ہے اور "تناوب" (باری باری) کے معنی میں بھی ہے، کیونکہ ایک دن کفار کی باری ہے تو دوسرے دن مسلمانوں کی باری آ جاتی ہے اور یہ اُن پر غالب آ جاتے ہیں۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس جملہ سے مراد کام کا انتہا اور آخر کو پہنچنا ہے۔ یہاں کام کی انتہا سے مراد جنگی غنائم حاصل کرنا ہے، ان معانی میں سے جو کوئی معنی بھی ہو نتیجہ ایک ہی ہے صرف اس نتیجے تک پہنچنے کے راستے مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ (غور کیجئے)

آیت کے آخر میں تمام مسلمانوں کو تقویٰ کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: "جس خدا پر تم سب ایمان لائے ہو اس سے ڈرو اور اس کی مخالفت نہ کرو" (و اتقوا اللہ الذی انتم بے مؤمنون)۔

ممکن ہے یہاں تقوٰے کا حکم اس بناد پر ہو کہ عام طور پر حق مہر کی تشخیص میں بیوی اور شوہر کے قول پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے ثبوت کا طریقہ ان کے قول کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ لہذا اس بات کا امکان ہے کہ شیطانی دوسرے مقدار واقعی سے زیادہ کا دعوے کرنے کا سبب بن جائیں اسی لیے انھیں تقویٰ کی وصیت اور نصیحت کرتا ہے۔

تواریخ اور روایات میں آیا ہے کہ یہ اسلامی حکم صرف چھ عورتوں کو شامل ہوا جو اپنے مسلمان شوہروں سے جدا ہو کر کفار سے جا ملیں اور پیغمبر نے ان کا حق مہر جنگی غنائم سے اُن کے شوہروں کو دیا۔

ایک نکتہ

دشمنوں کے لیے بھی عدالت

اوپر والی آیت میں لطافت و ظرافت اور خاص نکتہ کی بات جو مذکورہ احکام میں استعمال ہوئی ہے یہ بتلاتی ہے کہ احکام اسلامی کی تشریح میں اصل عدالت پر کس قدر توجہ دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ طوفانی اور بحرانی مواقع پر بھی اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی شخص حتیٰ کہ کفار کو بھی نقصان نہ پہنچے۔

جبکہ دنیا کا معمول یہ ہے کہ بحرانی کیفیت میں سب یہی کہتے ہیں کہ حالات حد سے زیادہ سخت ہیں، لہذا ان کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اور حقدار کو حق دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ لہذا ہر قسم کی بے سروسامانی کو برداشت کرنا چاہیے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ سخت ترین حالات میں بھی یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو، اور نہ صرف دوست بلکہ اگر دشمن بھی کوئی حق رکھتا ہو تو اس کی بھی رعایت کرنا چاہیے۔

اس قسم کے اسلامی احکام، اعجاز کی ایک قسم اور پیغمبر کی دعوت کی حقانیت کی نشانی ہیں کہ جو اس قسم کے ماحول میں بھی جہاں نہ مال کا کوئی احترام تھا اور نہ ہی جان کی کوئی قدر و قیمت تھی، اسلام حقدار کو اس کا حق دینے میں اس حد تک کوشش کرتا ہے۔

(۱۲) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَاۤءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى
 اَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْۤا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ
 وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاتَيْنَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِيْنَهٗ
 بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِىْ
 مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهُ اِنَّ
 اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

اے پیغمبر! جب مومن عورتیں تیرے پاس آئیں اور تجھ سے ان شرائط پر بیعت کریں کہ
 وہ کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دیں گی۔ چوری نہیں کریں گی۔ زنا سے آلودہ نہ ہوں گی۔ اپنی
 اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے کوئی افتراء اور بہتان نہیں باندھیں
 گی، اور کسی شائستہ کام میں تیرے حکم کی مخالفت نہیں کریں گی تو تم ان سے بیعت لے لو اور ان
 کے لیے بارگاہِ خدا میں طلبِ بخشش کرو، بیشک خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

عورتوں کی بیعت کے شرائط

گزشتہ آیات کے بعد کہ جن میں ماہرین کے احکام کا بیان تھا، زیر بحث آیت میں پیغمبر سے عورتوں کی بیعت کرنے کے حکم کی تشریح کرتا ہے۔

جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے دن نازل ہوئی جبکہ پیغمبر نے کوہ صفا پر قیام فرمایا اور مردوں سے بیعت لی، بعد ازاں مکہ کی وہ عورتیں جو ایمان لے آئی تھیں بیعت کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور ان کی بیعت کی تفصیل بیان کی۔

روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اے پیغمبر! جب مومن عورتیں تیرے پاس آئیں اور ان شرائط پر تجھ سے بیعت کریں کہ وہ کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دیں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا سے آلودہ نہیں ہوں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے کوئی افتراء اور مہتان نہیں باندھیں گی اور کسی شائستہ حکم میں تیری نافرمانی نہیں کریں گی تو تم اُن سے بیعت لے لو اور ان کے لیے بخشش طلب کرو، بے شک خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔“ (یا ایہا النبی اذا جاءك المؤمنات يبایعنك علی ان لا یشرکن بالله شیئاً ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یأتین بیہتان یفتنینہ بین یدیهن وارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبایعھن واستغفرلھن اللہ ان اللہ غفور رحیم)۔

اس کے بعد پیغمبر نے اُن سے بیعت لی۔

بیعت کی کیفیت کے بارے میں بعض نے یہ لکھا ہے کہ پیغمبر نے پانی کا ایک برتن لانے کا حکم دیا اور اپنا ہاتھ پانی کے اُس برتن میں رکھ دیا۔ عورتیں اپنے ہاتھ برتن کے دوسری طرف رکھ دیتی تھیں۔ بعض نے کہا ہے پیغمبر لباس کے اوپر سے بیعت لیتے تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں عورتوں کی بیعت کرنے کے لیے چھ شرطیں بیان کی گئی ہیں اور ان کے لیے ان سب کو قبول کرنا ضروری ہے۔

۱: ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کو ترک کرنا۔ یہ شرط اسلام و ایمان کی بنیاد ہے۔

۲: چوری کو ترک کرنا اور شاید اس سے مراد زیادہ تر شوہر کا مال ہو، کیونکہ اُس زمانہ کی مالی بد حالی، مردوں کی سخت گیری اور تہذیب و تمدن کی سطح کا پست ہونا اس بات کا سبب ہوتا تھا کہ عورتیں اپنے شوہروں کے مال میں سے چوری کریں اور احتمالاً اپنے رشتہ داروں کو دے دیں۔ ”ہند“ کی داستان جو بعد میں آئے گی، وہ بھی اسی معنی کی گواہ ہے۔ بہر حال آیت کا مفہوم وسیع اور عام ہے۔

میں کہ

اپنی

باندھیں

اور ان

۳ : زمانہ سے آلودہ نہ ہونا۔ کیونکہ تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عفت کی راہ سے بہت زیادہ انحراف تھا۔
۴ : اولاد کو قتل نہ کرنا۔ یہ فعل دو صورتوں میں یعنی بعض اوقات "استطاع حمل" کی صورت میں اور کبھی "وٹاد" (لڑکیوں اور لڑکوں کو زندہ درگور کرنے) کی صورت میں انجام پاتا تھا۔

۵ : بہتان و افتراء کو ترک کرنا۔ بعض نے اس کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ وہ مشکوک بچوں کو راستے سے اٹھا لیتی تھیں، اور یہ دعویٰ کرتی تھیں کہ یہ بچے ان کے شوہر سے ہیں۔ (یہ امر شوہر کی طویل غیبت کے زمانہ میں زیادہ امکان فرماتا) بعض نے اسے شرم اور کام کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ وہ بھی زمانہ جاہلیت کے باقیات میں سے تھا وہ یہ تھا کہ ایک عورت اپنے آپ کو چند افراد کے اعتبار میں دے دیتی اور جب اس سے کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ ان میں سے جس کی طرف مائل ہوتی، بچے کو اس کی طرف منسوب کر دیتی تھی۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مسئلہ زمانہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس قسم کے کام کا اسلام میں جاری رہنا ممکن نہیں تھا یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے اور پہلی ہی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ آیت کے مفہوم کی وسعت ہرم کے افتراء اور بہتان کو شامل ہے۔

۶ : "بین ایدیہن و ارجلہن" (ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے) کی تعبیر ممکن ہے وہی سر راہ ملنے والے بچوں کی طرف اشارہ ہو چوڑے دودھ پلانے کے وقت جن میں ہوتے تھے۔ لہذا طبعاً وہ ان کے پاؤں اور ہاتھوں کے سامنے ہوتے تھے۔

۷ : پیغمبر کے اصلاحی احکام کی نافرمانی نہ کرنا۔ یہ حکم بھی وسعت رکھتا ہے اور پیغمبر کے تمام فرامین کو شامل ہے اگرچہ بعض نے اسے زمانہ جاہلیت کے بعض افعال مثلاً مردوں پر بلند آواز میں نوحہ کرنا، گریبان چاک کرنا اور منہ کو نوچنا وغیرہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ عورتوں کی بیعت کیوں ان شرائط کے ساتھ مشروط تھی؟ حالانکہ مردوں کی بیعت صرف اسلام اور جہاد پر تھی۔

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مردوں کے بارے میں اس معاشرے اور ماحول میں جو چیز سب سے زیادہ اہم تھی وہ ایمان اور جہاد ہی تھا۔ چونکہ عورتوں کے لیے جہاد مشروع نہیں تھا لہذا ان کے لیے دوسرے شرائط ذکر کرتے ہوئے کہ جن میں توحید کے بعد سب سے زیادہ اہم اُمور وہی تھے جن سے اس معاشرے کی عورتیں انحراف میں مبتلا تھیں۔

چند نکات

۱ : عورتوں کی بیعت کا ان کی اسلامی شخصیت کے ساتھ ربط

ہم سورہ فتح کی تفسیر کرتے ہوئے (آیت ۱۸ کے ذیل میں) بیعت، اس کے شرائط اور اسلام میں اس کی ضرورت

کے بارے میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں کہ جس کے دھرانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں جس بات کا بیان کرنا ضروری ہے، وہ عورتوں کے پیغمبر کی بیعت کرنے کا مسئلہ ہے، اور وہ بھی ایسی مفید اور اصلاحی شرائط کے ساتھ کہ جو اوپر والی آیت میں بیان ہوئے ہیں۔

بے خبر اور مفاد پرست لوگوں کے برخلاف جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام انسانی معاشرے کے نصف حصے یعنی عورتوں کے لیے کسی قدر قیمت کا قائل نہیں، اور اُس نے انہیں کسی حساب میں شمار نہیں کیا ہے، یہ مسئلہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام نے اسے خصوصیت کے ساتھ اہم ترین مسائل میں شمار کیا ہے۔ منجملہ ان کے مسئلہ بیعت ہے جو ایک مرتبہ صلح حدیبیہ میں (ہجرت کے چھٹے سال) اور ایک مرتبہ فتح مکہ میں انجام پایا تو عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش اس خدائی حمد و سپان میں داخل ہوئیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے مردوں کی نسبت زیادہ شرائط کو قبول کیا۔ ایسی شرائط کہ جو عورت کی انسانی حیثیت کو زندہ کرتی تھیں۔ نیز اس کو بے قدر و قیمت متاع میں تبدیل ہونے یا بوجس مردوں کی لطف اندوزی کا ذریعہ بننے سے نجات دیتے تھے۔

✽ ✽ ✽

۲: ابوسفیان کی بیوی ہند کی بیعت کا ماجرا

فتح مکہ کے واقعہ میں جن عورتوں نے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی ان میں سے ایک ابوسفیان کی بیوی ”ہند“ بھی تھی۔ یعنی وہ عورت جس کی طرف سے تاریخ اسلام بہت سے دردناک واقعات محفوظ رکھے ہوئے ہے، ان میں سے ایک میدان اُمد میں حمزہ سید الشہداء کی شہادت کا واقعہ ہے کہ جس کی کیفیت بہت ہی غم انگیز ہے۔ اگرچہ آخر کار وہ مجبور ہو گئی کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور ظاہراً مسلمان ہو جائے لیکن اس کی بیعت کا ماجرا بتاتا ہے کہ وہ حقیقت میں اپنے سابقہ عقاید کی اسی طرح وفادار تھی، لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ بنی اُمیہ کا خاندان اور ہند کی اولاد نے پیغمبر کے بعد اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کیا کہ جن کی سابقہ زمانہ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

بہر حال مفسرین نے اس طرح لکھا ہے کہ ہند نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا ہوا تھا وہ پیغمبر کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئی جب آپ کو ہمنام پر تشریف فرما تھے اور عورتوں کی ایک جماعت بھی ہند کے ساتھ تھی۔ جب پیغمبر نے یہ فرمایا کہ میں تم عورتوں سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دو گی۔ تو ہند نے اعتراض کیا اور کہا: ”آپ ہم سے ایسا عدلے رہے ہیں جو آپ نے مردوں سے نہیں لیا، دیکھو کہ اس دن مردوں سے صرف ایمان اور جہاد پر بیعت لی گئی تھی۔“

پیغمبر نے اس کی بات کی پرواہ کیے بغیر اپنی گفتگو کو جاری رکھا اور فرمایا: ”کہ تم چوری بھی نہیں کرو گی۔“

ہند نے کہا: ابوسفیان کجوس اور سخیل آدمی ہے میں نے اس کے مال میں سے کچھ چیزیں لی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ انھیں مجھ پر حلال کرے گا یا نہیں! ابوسفیان موجود تھا، اُس نے کہا: ”جو کچھ تو نے گزشتہ زمانہ میں میرے مال میں سے لے لیا ہے وہ سب میں نے حلال کیا۔ (لیکن آئندہ کے لیے پابندی کرنا۔)
اس موقع پر پیغمبر ہنسے اور ہند کو پہچان کر فرمایا: ”کیا تو ہند ہے؟“ اس نے کہا: ”جی ہاں یا رسول اللہ! کچلے امور کو بخش دیجئے خدا آپ کو بخشے۔“

پیغمبر نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا: ”اور تم زنا سے آلودہ نہیں ہوگی۔“
ہند نے تعجب کرتے ہوئے کہا: ”کیا آزاد عورت اس قسم کا عمل بھی انجام دیتی ہے؟“ حاضرین میں سے بعض لوگ جو زمانہ جاہلیت میں اس کی حالت سے واقف تھے اس کی اس بات پر ہنس پڑے۔ کیونکہ ہند کا سابقہ زمانہ کسی سے مخفی نہیں تھا۔

پھر پیغمبر نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ”اور تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگی۔“ ہند نے کہا: ”ہم نے تو انھیں بچپن میں پالا پوسا تھا، مگر جب وہ بڑے ہوئے تو آپ نے انھیں قتل کر دیا۔ اب آپ اور وہ خود بہتر جانتے ہیں۔“ (اس کی مراد اس کا بیٹا ”خطلہ“ تھا جو بدر کے دن علیؑ کے ہاتھوں مارا گیا تھا)
پیغمبر نے اس کی اس بات پر تبسم فرمایا۔ اور جب آپ اس بات پر پُچھے اور فرمایا: ”تم بہتان اور تمہمت کو روا نہیں رکھوگی۔“ تو ہند نے کہا: ”بہتان تیج ہے اور آپ ہمیں صلاح و درستی، نیکی اور مکام اخلاق کے سوا اور کسی چیز دعوت نہیں دیتے۔“

جب آپ نے یہ فرمایا: ”تم تمام اچھے کاموں میں میرے حکم کی اطاعت کروگی۔“ تو ہند نے کہا: ”ہم یہاں اس لیے نہیں بیٹھی ہیں کہ ہمارے دل میں آپ کی نافرمانی کا ارادہ ہو۔“ (حالانکہ مسئلہ طور پر معاملہ اس طرح نہیں تھا۔ لیکن تعلیمات اسلامی کے مطابق پیغمبر اس بات کے پابند تھے کہ ان کے بیانات کو قبول کر لیں) لے

۳: معروف میں اطاعت

ان عمدہ نکات میں سے جو اوپر والی آیات سے معلوم ہوتے ہیں ایک یہ ہے کہ پیغمبر کی اطاعت کو معروف کے ساتھ مقید کیا ہے، حالانکہ پیغمبر معصوم تھے اور کبھی بھی منکر اور بُری بات کا حکم نہیں دیتے تھے۔ لیکن ممکن ہے یہ تعبیر ان تمام احکام کے لیے ایک نمونہ کے عنوان سے ہو جو اسلامی سربراہوں سے صادر ہوتے ہیں۔ یعنی وہ احکام

صرف اسی صورت میں محترم اور قابلِ اہرام ہیں جبکہ وہ تعلیماتِ قرآن اور اصولِ شریعتِ اسلام کے ساتھ سازگار ہوں اور
”لا یعصینک فی معروف“ کے مصداق ہوں۔

وہ لوگ (حقیقت سے) کتنے دُور ہیں جو برسرِ اقتدار لوگوں کو واجبِ اطاعت سمجھتے ہیں، چاہے وہ کچھ بھی ہوں
اور کسی بھی شخص کی طرف سے ہوں۔ حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہ تو عقل کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی شریعت
اور قرآن کے حکم کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔

امیر المومنینؑ نے اپنے اس خط میں جو آپ نے مصر کے لوگوں کو ”مالکِ اشتر“ کی فرمانروائی (گورنری) کے بارے
میں لکھا تھا ان تمام اوصافِ بند کے باوجود جو آپ نے مالک کے بارے میں بیان فرمائے تھے آخر میں یہ لکھا تھا :

فاسمعوا لہ واطیعوا امرہ فیما طابق الحق

فانہ سیف من سیوف اللہ : ۱۰

”اُس کی بات کو سنا اور اس کے اس حکم کی جو حق کے مطابق ہو

اطاعت کرو، کیونکہ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔

❖ ❖ ❖

یالی ہیں۔ میں نہیں

نہ زمانہ میں میرے

رسول اللہ! پچھلے

اضرب میں سے بعض

ہند کا سابقہ زمانہ

ہند نے کہا: ہم

آپ اور وہ خود بہتر

اور تہمت کو روا

کے سوا اور کیا چیز

ما: ”ہم یہاں اس

نہیں تھا۔ لیکن

اعت کر معروف

نے۔ لیکن ممکن ہے

۔ یعنی وہ احکام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ
قَدْ يَفْسُدُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَفْسُدُ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ ۝

ترجمہ

”اے ایمان لائے والو! وہ قوم جس پر اللہ نے غضب کیا ہے اس سے دوستی نہ کرو۔ وہ آخرت سے اسی طرح مایوس ہو چکے ہیں جس طرح قبروں میں مدفون کفار مایوس ہیں۔“

تفسیر

اس مغمضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس سورہ کا آغاز، دشمنانِ خدا سے قطع تعلق کرنے کے مسئلہ سے ہوا ہے اور اب اسی چیز پر اس کا اختتام ہو رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سورہ کا اختتام اس کے آغاز کی طرف ایک بازگشت ہے، منہما ہے: ”اے ایمان لائے والو! وہ قوم جس پر خدا نے غضب کیا ہے اس سے دوستی نہ کرو۔“ (یا ایہا الذین آمنوا لا تتولوا قوماً غضب اللہ علیہم)۔

تمہیں ان سے دوستی نہیں کرنی چاہیے اور اپنے اسرار اور بھیدوں کو ان تک نہیں پہنچانا چاہیے۔ اس بارے میں کہ ”مغمضوب علیہم قوم“ کون لوگ ہیں، بعض تو صراحت اس کو یہودیوں سے متعلق سمجھتے ہیں، کیونکہ قرآن کی دوسری آیات میں انہیں اس عنوان کے ساتھ یاد کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۹۰ میں یہود کے بارے میں بیان ہوا ہے: ”فبأعداء و بغض علی غضب“ پس وہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہوئے۔

یہ تفسیر اس شانِ نزول سے بھی سازگار ہے جو مفسرین نے بیان کی ہے کیونکہ انہوں نے کہا کہ فقراءِ مسلمین کی ایک جماعت مسلمانوں کی خبریں یہودیوں کے پاس بلے جایا کرتی تھی اور یہودی اس کے بدلے میں انہیں اپنے درختوں کے پھل بطور ہدیہ کے دیا کرتے تھے۔ اس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انہیں اس کام سے منع کیا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس آیت کی تعبیرات ایک وسیع مضمون رکھتی ہیں جو تمام کفار و مشرکین کو شامل ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں غضب کی تعبیر ”یہود“ میں منحصر نہیں ہے بلکہ یہی تعبیر منافقین کے بارے میں بھی آئی ہے۔ (سورہ فتح ۶) اور

شانِ نزول بھی آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کرتا۔
 بناء بریں اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اس وسیع مطلب کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو اس سورۃ کی پہلی آیت میں دشمنانِ خدا سے دوستی نہ کرنے کے عنوان سے آیا ہے۔
 اس کے بعد ایک اور مطلب کو بیان کرتا ہے جو اس نبی کی دلیل کے طور پر بیان ہوا ہے۔ ”وہ آخرت میں نجات سے کلی طور پر مایوس ہیں جیسا کہ قبروں میں مدفون کفار مایوس ہیں۔ (قد یفسوا من الآخرة کما یفسون الکفار من اصحاب القبور)۔“

کیونکہ کفار میں سے جو مرچکے ہیں وہ عالمِ برزخ میں اپنے کاموں کے نتائج دیکھ رہے ہیں اور تلافی کے لیے واپسی کی کوئی راہ نہیں ہے، لہذا وہ کلی طور پر مایوس ہیں۔ یہ زندوں کا گروہ بھی گناہ سے اس قدر آلودہ ہے کہ ہرگز اپنی نجات کی امید نہیں رکھتا، اور یہ ٹھیک کفار کے مردوں کی طرح ہے۔

اس قسم کے لوگ یقیناً خطرناک اور ناقابلِ اعتماد افراد ہیں۔ نہ تو ان کے قول پر کوئی اعتماد ہے اور نہ ہی ان کی صداقت اور ارادے پر کوئی اعتبار ہے وہ حق تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہیں، اسی بنا پر ہر جرم و گناہ پر ہاتھ ڈالتے ہیں، ان حالات میں تم ان پر کس طرح اعتماد کرتے اور ان سے دوستی کرتے ہو؟

خداوند! ہمیں اپنے بے پایاں لطف و کرم سے ہرگز محروم و مایوس نہ کرنا۔
 پروردگار! ہمیں ایسی توفیق مرحمت فرما کہ ہم ہمیشہ تیرے دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن رہیں اور تیری دوستی کی راہ میں ثابت قدم رہیں۔

بارِ الہا! ہمیں اپنے اولیاء اور انبیاء کرام کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرما۔

آمین یا رب العالمین

۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

۲۵، ۲، ۱۳۶۵ ش

اختتام ترجمہ بروز جمعرات بوقت پوسنے چھ بجے صبح تاریخ ۱۲ ذیقعد ۱۴۰۶ھ مطابق ۹ جولائی

۱۹۸۷ء بر مکان حقیر کوئی جمعیہ محلی محل سلطان محمد شریف۔ قم مقدس۔ ایران

لیکن اس آیت کی تفسیر میں اور احتمال بھی دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آخرت کے ثواب سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح مشرکین اصحابِ قبور کے زندہ ہونے سے مایوس ہیں، لیکن جو تفسیر ہم نے اوپر بیان کی ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔ دو توجہ رہے کہ پہلی تفسیر کے مطابق ”من اصحاب القبور“ کفار کا وصف ہے اور آخری تفسیر کے مطابق ”میں سے متعلق ہے۔“

لَهُم
الْقُبُورُ

لرو۔ وہ

اب اسی چیز
، خدا
، امنوا لا

ہیں، کیونکہ
بارے میں

ہیں کی ایک
کے پھل

ہیں، کیونکہ

(۶)

سورۃ ص

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۳۱ آیات ہیں

تاریخ: اواخر
۵ رمضان المبارک ۱۳۰۶ھ

سورۃ صفت کے مضامین

- یہ سورہ درحقیقت دو بنیادی محروں کے گرد گھومتا ہے۔ اولاً اسلام کی تمام آسمانی ادیان پر برتری اور خدا کی طرف سے اس کی بقا و دوام کی ضمانت اور ثانیاً اس دین کی حفاظت اور ترقی کے لیے جہاد کا لازم ہونا۔ لیکن تفصیلی نظر سے اسے سات حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :-
- ۱ : سورۃ کا آغاز جو خداوند عزیز و حکیم کی تسبیح سے ہوا ہے اور بعد کے امور و محتاجی کو قبول کرنے کے لیے دلوں میں آمادگی پیدا کرتا ہے۔
 - ۲ : گفتار و کردار میں ہم آہنگی اور بلا عمل باتوں سے پرہیز کی دعوت۔
 - ۳ : عزم راسخ اور اتحاد کامل کے ساتھ جہاد کی دعوت۔
 - ۴ : بنی اسرائیل کی پیمان شکنی کی یاد آوری اور ظہور اسلام کے بارے میں مسیح کی بشارت۔
 - ۵ : دین اسلام کی تمام ادیان پر فتح مندی کی ضمانت۔
 - ۶ : جہاد کی طرف مؤثر دعوت اور مجاہدین راہ حق کی دنیاوی اور اخروی جزاؤں کا بیان۔
 - ۷ : حضرت عیسیٰؑ کے حواریین کی زندگی کے بارے میں ایک مختصر سا اشارہ اور ان سے ہدایت کا سبق حاصل کرنا۔
- لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس سورہ کا اصلی محور اسلام اور جہاد ہی ہے۔ سورہ کے لیے ”صفت“ کے نام کا انتخاب اس تعبیر کی بناء پر ہے جو اس سورہ کی چوتھی آیت میں آئی ہے لیکن بعض اوقات یہ سورہ ”عیسیٰ“ یا سورہ حواریین کے نام سے بھی موسوم ہوا ہے۔ مشہور قول ہے کہ یہ سارا سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور اس سورہ میں آیات جہاد کا ہونا بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مکہ میں جہاد کی تشریع قطعاً نہیں ہوئی تھی۔

سورۃ صفت کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر گرامی سے آیا ہے :

”من قرأ سورۃ عیسیٰ کان عیسیٰ مصلیاً علیہ مستغفراً لہ ما دام فی الدنیا و هو یومر القیامۃ رفیقہ“

”جو شخص سورۃ عیسیٰ (سورۃ صفت) کو پڑھے تو حضرت عیسیٰ اُس کے لیے دُعا کے رحمت کریں گے جب تک وہ دنیا میں زندہ ہے اس کے لیے استغفار کریں گے اور قیامت میں وہ ان کا رفیق اور ساتھی ہوگا۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر سے منقول ہے :

”مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الصَّفِّ وَأَوْمَنَ قِرَائَتِهَا فِي فَرَائِضِهِ وَنَوَافِلِهِ صَفَّهُ اللَّهُ مَعَ
مَلَائِكَتِهِ وَأَنْبِيَائِهِ الْمُرْسَلِينَ“
جو شخص سورۃ صف کو پڑھے یا واجب اور مستحب نمازوں میں اس کی مداومت کرے، خدا اُسے فرشتوں اور انبیاء
مُرسلین کی صف میں قرار دے گا۔

❖ ❖ ❖

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

① سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

② يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝

③ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝

④ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَهُم بُنْيَانٌ مَرْصُوعٌ ۝

ترجمہ

رحمن ورحیم خدا کے نام سے۔

① جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں، اور وہ صاحب قدرت اور حکیم و دانا ہے۔

② اے ایمان لانے والو! تم ایسی بات کیوں کرتے ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔

③ خدا کے ہاں یہ بات بہت ہی غضب کا موجب ہے کہ تم ایسی بات کرو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔

④ خدا ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر قتال کرتے ہیں جیسے وہ سیدہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

شانِ نزول

مفسرین نے آیہ لَسَوْفَ تَقُولُونَ مَالًا تَقْعَلُونَ کی شانِ نزول میں مثبت سی روایات بیان کی ہیں کہ جن میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ان میں کچھ یہ ہیں :

۱ : مومنین کی ایک جماعت یہ کہا کرتی تھی کہ (اس کے بعد) جب بھی ہم دشمن کے مقابل ہوں گے تو پُشت نہیں پھیریں گے اور فرار نہیں کریں گے۔ لیکن انھوں نے اپنے قول کو پورا نہ کیا، اور جنگِ اُحد کے دن بھاگ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ کی پیشانی زخمی ہو گئی اور آپ کے دو دندانِ مبارک بھی شہید ہو گئے۔

۲ : جس وقت خدا نے شہدائے بدر کا ثواب بیان کیا تو صحابہ کی ایک جماعت نے کہا : ”اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو ہم آئندہ کی جنگوں میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں گے، پھر وہ جب اُحد میں بھاگ کھڑے ہوئے تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں سرزنش کی۔

۳ : مسلمانوں کی ایک جماعت حکمِ جہاد کے نزول سے پہلے یہ کہا کرتی تھی : ”اے کاش! خدا ہمیں بہترین اعمال کی نشاندہی کرتا کہ ہم ان پر عمل کرتے۔“ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ خدا نے انھیں یہ خبر دی کہ ”افضل اعمال، ایمانِ خالص اور جہاد ہے۔“ لیکن یہ خبر انھیں اچھی نہ لگی اور لیت و لعل کرنے لگے تو یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں سرزنش کی۔ لے

تفسیر

فلا دی دیوار کی طرح جم کر لڑنے والے

اس سورۃ کی ابتدا بھی خدا کی تسبیح کے ساتھ ہے، اسی بناء پر مفسرین نے اس سورۃ کو بھی ”مہمبجات“ (دو سورتیں جو تسبیحِ خدا سے شروع ہوتی ہیں) میں شمار کیا ہے۔ فرماتا ہے : ”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔“ (سبح لله ما فی السموات وما فی الارض)۔ لے
اس کی تسبیح کیوں نہ کریں اور اُسے ہر عیب و نقص سے منزہ شمار کیوں نہ کریں، جبکہ ”وہ شکست ناپذیر قادر ہے، اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔“ (وهو العزيز الحکیم)۔

لے مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۸ قی مفسرین نے بھی کچھ فرق کے ساتھ ہی روایات بیان کی ہیں۔

لے عالم کے تمام موجودات کی تسبیح کی کیفیت کے سلسلہ میں ہم نے اس تفسیر میں بارہا گفتگو کی ہے ان میں سے سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ کے ذیل میں (تفسیر نمونہ جلد ۶) اور سورہ نور کی آیت ۴۱ کے ذیل میں (جلد ۸) کو ملاحظہ فرمائیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ سورہ، سورہ ایمان و توحید و معرفت ہے۔ موجودات کی عمومی قیاس کے مسئلہ کی طرف توجہ کہ جو زبان حال و قال سے صورت پذیر ہوتی ہے اور اس میں موثر شگفتہ انجیز نظام جو عزیز و حکیم خالق کے وجود پر بہترین دلیل ہے۔ یہ چیزیں ایمان کی بنیادوں کو دلوں کے اندر مستحکم بناتی اور فرمانِ جہاد کے لیے راستہ استوار کرتی ہیں۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد ان افراد سے جو اپنی کسی جوتی باتوں پر عمل نہیں کرتے، ملامت و سرزنش کے عنوان سے فرماتا ہے:

”اے ایمان لانے والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو، جس پر عمل نہیں کرتے؟“ (یا ایہا الذین امنوا لعل تقولون ما لا تفعلون) ۱۰

اگرچہ شانِ نزول کے مطابق یہ آیات جہاد کی باتوں اور پھر جنگِ اُمد کے دن فراہ کر جانے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ شانِ نزول آیات کے وسیع مفہام کو ہرگز محدود نہیں کرتی۔ لہذا ہر قسم کی ایسی گفتگو جس پر عمل نہ ہو، ملامت کے لائق ہے چاہے وہ میدانِ جہاد میں پامردی کے لحاظ سے ہو یا کسی اور مثبت اور تربیتی عمل سے متعلق ہو۔

بعض مفسرین نے ان آیات میں مخاطب کو ظاہری مومن اور باطنی منافق سمجھا ہے، حالانکہ خطاب ”یا ایہا الذین امنوا“ اور بعد والی آیات کی تفسیریں یہ بتاتی ہیں کہ خطاب حقیقی مومنین ہی سے ہے، لیکن ایسے مومنین جو ابھی تک کمالِ ایمان کی سرحد تک نہیں پہنچے اور ان کی گفتار و کردار ہم آہنگ نہیں ہوئے ہیں۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”یہ فعلِ خدا کے نزدیک عظیم غضب کا موجب ہے کہ تم ایسی باتیں کہو جن پر عمل نہیں کرتے (کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون) ۱۱

مجاہد عمومی میں بیٹھ کر دادِ سخن دیتے ہو لیکن جب میدانِ عمل کا وقت آتا ہے، تو پھر ہر شخص ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

سچے مومنین کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُن کی گفتار و کردار سو فیصد ہم آہنگ ہو۔ ہاں جس قدر انسان اس اصل سے دُور ہوتا ہے، اتنا ہی حقیقتِ ایمان سے دُور ہوتا ہے۔

”مقت“ اصل میں ”اس شخص کے لیے بغضِ شدید کے معنی میں ہے جس نے کوئی قبیح کام انجام دیا ہو۔ لہذا عرب جاہلی میں جو شخص اپنے باپ کی بیوی کو اپنے نکاح میں لے آتا تھا، اسے ”نکاحِ مقت“ کہتے تھے۔ ”کبر مقتاً“ کے جملہ میں لفظ ”مقت“ ”کبر“ کے ساتھ ملا ہوا ہے جو اور بھی شدت و شگینی اور عمل سے خالی گفتار کے بارے میں خدا کے عظیم

۱۰ ”لم اصل میں ”لما“ دلائلِ جاہدہ اور مادہ استہمامیہ سے مرکب تھا، اس کے بعد اس کا انت کثرتِ استعمال سے یا اخبار و استہمام میں فرق رکھنے کے لیے گر گیا ہے۔

۱۱ بعض مفسرین نے ”کبر“ کو افعالِ مدح و ذم میں سے سمجھا ہے (تفسیر روح البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں)، اور بعض نے اسے تعبیر کے معنی میں سمجھا ہے۔ (تفسیر کشاف)

غضب اور غصہ کی دلیل ہے۔

”علامہ طباطبائی“ المیزان میں فرماتے ہیں: ”اس بات میں کہ انسان کوئی ایسی بات کہے جسے انجام نہیں دے گا، اور اس بات میں کہ کسی ایسے کام کو انجام نہ دے جو وہ کہتا ہے، فرق ہے۔ پہلا عمل نفاق کی دلیل ہے، اور دوسرا غضب ارادہ کی دلیل ہے۔“

بہر حال اوپر والی آیت ہر قسم کے عہد و پیمان اور وعدہ سے تخلف، یہاں تک کہ بعض کے قول کے مطابق نذر کو بھی شامل ہے، اسی لیے مالک اشتر والے فرمان میں آیا ہے کہ امام علیؑ نے اُن سے فرمایا :-

”ایاک ان تعمدہم فتتبع موعداک بخلفک والخلف یوجب المقت عند اللہ والناس، قال اللہ تعالیٰ: کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون“

”اور یہ کہ تم لوگوں سے کوئی وعدہ کرو اور پھر اس وعدے سے تخلف کرو، اس بات سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا۔ کیونکہ یہ بات خدا کے ہاں اور لوگوں کے نزدیک بھی خشم عظیم کا موجب ہو گی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ”کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون“ لے

ایک اور حدیث امام صادق سے آئی ہے :

”عدة المؤمن اخاه نذر لا كفارة فيه فمن اخلت فيخلف الله بدا ولمقتہ تعرض، وذلك قوله: ”ياايها الذين امنوا لم تقولون ما لا تفعلون کبر مقتاً عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون“

”مومن کا اپنے بھائی سے وعدہ کرنا ایک قسم کی نذر ہے، اگرچہ اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ جو شخص وعدہ کے خلاف کرے گا اُس نے خدا کی مخالفت کی ہے اور خود کو اُس کے غضب کا مستحق بنا دیا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ”ياايها الذين امنوا لم تقولون ما لا تفعلون“ لے

✦ ✦ ✦

بعد والی آیت میں اصل مسئلہ کہ جو جہاد ہے، اسے سامنے لاتے ہوئے فرماتا ہے: ”خدا ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح سے جہاد کرتے ہیں، جیسے کہ سیدہ پلائی ہوئی دیوار ہو“ ”ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفًا کانہم بنیان مرصوص“ لے

المیزان جلد ۱۹ ص ۲۸۷

”نتج البلاغہ“ مکتوب ۵۳ (ص ۳۳۳ صبحی صالح)

أصول کافی جلد ۲ باب علف الوعد

لے ”صفًا“ یہاں حال کے عزمان سے منصوب ہے۔

لے ”نذر“

لے ”نذر“

اس بناء پر محض جنگ کرنا اہم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ جنگ ”فی سبیل اللہ“ ہو اور وہ بھی مکمل اتحاد، نظم و ضبط کے ساتھ۔ جیسے کہ فولادی دیوار ہو۔

”صف“ اصل میں مصدری معنی رکھتا ہے اور کبھی چیلنج کو سیدھے خط میں قرار دینے کے معنی میں ہے۔ لیکن یہاں اسم فاعل کے طور پر آیا ہے۔

”مخصوص“ ”رصاص“ کے مادہ سے سیدھے کے معنی میں ہے۔ چونکہ بعض عمارتوں کے استحکام اور مضبوطی کے لیے سیدھے لگلا کر عمارت کے مختلف حصوں میں اس طرح ڈالتے تھے کہ وہ حد سے زیادہ محکم اور یکجان ہو جاتی تھی۔ اس لیے ہر محکم اور مضبوط عمارت پر ”مخصوص“ کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہاں مراد یہ ہے کہ مجاہدین راہِ خدا میں دشمن کے مقابلے میں ایک دل، ایک جان، مستحکم اور استوار کھڑے ہوں۔ گویا کہ وہ سب آپس میں پیوستہ ہیں کہ جن کے درمیان کوئی شکاف و سوراخ نہیں ہے۔ اسی لیے تفسیر علی بن ابراہیم میں اس آیت کی توضیح میں یہ کہا ہے: ”یصطفون کالبنیان الذی لایزول“: ”مجاہدین راہِ خدا میں اس دیوار کی طرح صف بستہ ہوتے ہیں جو ہرگز نہیں ڈلتی“۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امیر المومنین علیؑ جب اپنے اصحاب کو جنگ کے لیے ”میدانِ صفین“ میں آمادہ کرنا چاہتے تھے تو آپ نے فرمایا:

”خُذَا تَعَزَّوَجَلَّ نَفْسُ بَنِيَانِ مَرَصُوصَ“ لہذا تم اپنی صفوں کو آہنی دیوار کی طرح مستحکم کر لو۔ جو زورہ پوش ہیں وہ آگے دیں اور جن کے پاس زورہ نہیں ہے وہ اُن کے پیچھے رہیں، دانتوں کو مضبوطی کے ساتھ بھینچ کر رکھو اور نیزوں کے آگے بیچ و خم میں رہو کیونکہ یہ چیز دشمن کے نیزہ کو رد کرنے کے لیے زیادہ مؤثر ہے۔ دشمن کے انہوہ کی طرف تیز نگاہ سے دیکھو تاکہ تمہارا دل زیادہ قوی اور تمہاری روح زیادہ سکون و آرام میں رہے، باتیں کم کرو کہ یہ چیز سستی اور کمزوری کو دور کرتی ہے اور تمہارے وقار کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ اپنے پرچم اور بھنڈوں کو خم نہ ہونے دو، اور انہیں ان کی جگہ سے نہ ہلاؤ۔ نیز دلیر اور بہادر افراد کے علاوہ خود کو کسی کے سپرد نہ کرو۔

❖ ❖ ❖

بست رکھنا
بن یقاتلون

چند نکات

۱: صفوں میں وحدت کی ضرورت

میدان جنگ میں نظم و ضبط اور صفوں کا سہلے ہوئے رہنا دشمنوں کے مقابلے میں کامیابی کے اہم عوامل میں سے ہے۔ نہ صرف فوجوں کی جنگ میں بلکہ سیاسی اور اقتصادی جنگ میں بھی وحدت کے بغیر کوئی کام نہیں بن سکتا۔ حقیقت میں قرآن دشمنوں کو ایسے تباہ کن سیلاب سے تشبیہ دیتا ہے کہ جسے فولادی بند کے ساتھ ہی روکا جا سکتا ہے۔ ”بنیان موصوف“ ایک عمدہ ترین تعبیر ہے جو اس سلسلے میں بیان کی گئی ہے۔ ایک دیوار یا عظیم بند میں سے ہر ایک کا ایک خاص اثر ہے۔ لیکن یہ نقش و اثر اسی صورت میں موثر ہوتا ہے جبکہ ان کے درمیان کسی قسم کا فاصلہ اور شکاف نہ ہو اور اس کے اجزاء اس طرح سے متحد ہوں کہ گویا وہ سب ایک ہی چیز ہیں۔ سب کے سب ایک ہاتھ اور ایک عظیم اور محکم مٹھی کی طرح ہوں جو دشمن کی سرکوبی کر کے اُسے ریزہ ریزہ کر دے۔

افسوس اسلام کی یہ عظیم تعلیم بھلا دی گئی ہے اور اتنا بڑا اسلامی معاشرہ نہ صرف یہ کہ ”بنیان موصوف“ کی صورت نہیں رکھتا بلکہ پرانہ صفوں میں تبدیل ہو چکا ہے کہ جو ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑی ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک کے سر میں ہوا اور دل میں ہوس بھری ہوئی ہے۔

اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ وحدت صفوف باتوں اور نعروں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے وحدت ہدف اور وحدت عقیدہ کی ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو خلوص نیت، معرفت واقعی، صحیح اسلامی تربیت اور قرآنی تہذیب و تمدن کے احیاء کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اگر خدا ان مجاہدین کو دوست رکھتا ہے جو بنیان موصوف کی طرح ہیں تو پھر وہ اُن پر آگندہ اور منتشر صفوں کو دشمن رکھتا ہے۔ جیسا کہ اب ہم خدا کے اس غضب کے آثار اس کئی سو ملین معاشرے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جن کا ایک نمونہ صیہونیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کا اسلامی سرزمین پر مسلط ہو جانا ہے۔ خدایا! ہمیں قرآن اور اس کی حیات بخش تعلیمات کی آگاہی، بیداری اور آشنائی مرحمت فرما۔

۲: گفتار بلا عمل

زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے۔ اگر ان دونوں کا راستہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائے تو یہ نفاق کی نشانی ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ایک منافق انسان کی فکر و روح سلامت نہیں ہوتی۔

بدترین بلائیں جو کسی معاشرے پر مسلط ہو سکتی ہیں اُن میں سے ایک سلب الطینت کی بلا ہے اور اس کا اہل مال و دولت کی گرفتاری سے جُدائی ہے۔ وہ لوگ باتیں تو کرتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے، وہ ہرگز ایک دوسرے پر اعتماد نہیں

کر سکتے اور مشکلات کے مقابلے میں ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ ان کے درمیان اخوت، برادری اور خلوص ہرگز کارفرما نہیں ہو سکتا، ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی اور کوئی بھی دشمن ان سے مرعوب نہیں ہوگا۔ جب شام کے لشکر کے غارت گروں نے عراق کی سرحد کو تاخت و تاراج کیا اور یہ خبر امام علیؑ کے کانوں تک پہنچی تو آپ کو سخت دکھ پہنچا۔ آپ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

”ایہا الناس المجتمعة ابدانہم المختلفة اہواؤہم، کلامکم یوہی الصم الصلاب، وفعلکم یطمع فیکم الاعداء، تقولون فی المجالس کیت وکیت، فاذا جاء القتال قلتہم حیدى حیاء!“

امام علیؑ اپنے خطبے میں جو آپ کے سوز دل کی حکایت بیان کرتا ہے، عراق کے لوگوں سے کہتے ہیں: ”اے وہ لوگو! جن کے بدن تو اکٹھے ہیں لیکن انکار و خواہشات مختلف و پراگندہ ہیں، تمہاری گرما گرم باتیں تو سخت پتھروں کو بھی توڑ دیتی ہیں، لیکن تمہارے کمزور اعمال دشمنوں کو طمع دلاتے ہیں۔ مجالس و محافل میں تو تم اس طرح اور اُس طرح کہتے ہو لیکن جنگ کے وقت ہاتھ دانتے کرتے ہو کہ اے جنگ ہم سے دور ہو جا۔“

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

”یعنی بالعلماء من صدق فعلہ قولہ، ومن لم یصدق فعلہ قولہ فلیس بعالم“

”عالم وہ ہے، جس کا عمل اس کے قول کی تصدیق کرے۔ جس کا عمل اُس کے قول کی تصدیق نہیں کرتا، وہ عالم نہیں ہے۔“

ایسی اقوام و ملل جو اہل قول تو ہیں لیکن اہل عمل نہیں ہیں، وہ اسی بناء پر ہمیشہ دشمنوں کے ٹپھل میں اسیر رہتے ہیں۔ ایک معاصر شاعر نے ان کی سرفروخت ایک خوبصورت داستان میں ببل اور شکاری باز کی زبانی پیش کرتے ہوئے اس کی تصویر کشی کی ہے:

دوش می گفت ببلے با باز

کز چہ حال تو خوشتر است از من

تو کہ زشتی و بدعبوس و مہیب

تو کہ لالی و گنگ و بستہ دہن

م نوال میں سے بن سکتا۔

تھ ہی رو کا جب یا غلیم بند ہیں یا کسی قسم کا ہے سب ایک

نورت نہیں ہے ہر ایک کے

کے لیے دہر بیت اور قرانی

کو دشمن دکھنا ہے ہیں کہ جی اور اس کی حیات

نشانی ہے ان

اس کا اصلی حال ہے پر اعتماد نہیں

مست و آزاد روی دستِ شہاں
 با دو صد ناز می گنئی مسکن
 من بدیں ناطقی و خوش خوانی
 با خوش اندامی و ظریفی تن
 قسم مسکن است و روزم شب
 بہرہ ام غصہ است و رنج و محن
 باز گفتا کہ راست می گوئی!
 لیک بر سرش بود بسی روشن
 داسب تو گفتن است و نا کردن
 خوشے من کردن است و نا گفتن

ترجمہ :

کل رات ایک ٹیل باز سے کہہ رہی تھی
 کہ تیری حالت مجھ سے کیوں بہتر ہے ؟
 حالانکہ تو قبیح منظر، ترش زو اور فہیب شکل ہے۔
 تو بے زبان گونگا ہے اور تیرا منہ بند ہے۔
 تو پھر بھی مست اور آزادی کے ساتھ بادشاہوں کے ہاتھوں پر
 سینکڑوں ناز اور تحریے کے ساتھ بیٹھا ہے۔
 لیکن میں اس نطق اور خوش خوانی کے باوجود
 اور خوش اندام اور عمدہ بدن کے ساتھ
 پیغمبر تو میرا مسکن ہے اور میرا روشن دن شب تاریک ہے۔
 میرے نصیب میں غم اور رنج و محن برداشت کرنا ہے۔
 باز نے کہا کہ تو سچ کہتی ہے
 لیکن اس کا راز تو بہت ہی واضح ہے
 تیرا طریقہ صرف باتیں بنانا ہے عمل کرنا نہیں
 اور میری عادت عمل کرنا ہے باتیں بنانا نہیں

تفسیر نمونہ

۵

تَعَدَّ
قُلُوبًا

۶

وَمَبْرَءٍ
جَاءَ

وَمَبْرَءٍ

۷

میکوں دہ

سے منہ

۸

اور

کا بھیجا ہو

ہوں۔ اور

لیکن جب

کھلا جاؤ

وَ اِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ يُقَوْمِ لِمَ تُوذُوْنِىْ وَ قَدْ
تَقْلَمُوْنَ اِىَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۚ فَلَمَّا زَاغُوا زَاغَ اللّٰهُ
قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝
وَ اِذْ قَالَ عِيسٰى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ اِلَيَّ
رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيِّ مِنَ التَّوْرَةِ
وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّآتِيْ مِنْ بَعْدِىْ اَسْمُهُ اَحْمَدُ ۚ فَلَمَّا
جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا : ”اے میری قوم تم مجھے تکلیف
کیوں دیتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ جب وہ حق
سے منحرف ہو گئے تو خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ اور خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا۔
اور اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا : اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف خدا
کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ میں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے بھیجی گئی، یعنی تورات کی تصدیق کرنے والا
ہوں۔ اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہے۔
لیکن جب وہ (احمد) معجزات اور واضح دلائل کے ساتھ ان کی طرف آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ایک
مکمل جادو ہے۔

تفسیر

میں احمد کے ظہور کی بشارت لے کر آیا ہوں۔

ان دو احکام کے بعد جو گزشتہ آیات میں ”گفتار و کردار کی ہم آہنگی“ اور ”وحدت صفوت“ کے بارے میں آئے تھے، اس میں ان معنی کی تکمیل کے لیے دو پیغمبروں موسیٰ اور عیسیٰ کی زندگی کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ افسوس ہے ”گفتار و عمل کی جدائی“ اور ”صفوت کے عدم نظم“ کے کئی واضح نمونے، ایسی منحوس سر نوشت کے ساتھ جو ان امور کے بعد ان میں پیدا ہوئی، ان دونوں کے پیروکاروں کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: ”اے میری قوم! تم مجھے کیوں تکلیف پہنچاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں“ (و اذ قال موسیٰ لقومہ یا قوم لم تؤذوننی وقد قلمون انی رسول اللہ الیکم)۔

یہ آزار و اذیت ممکن ہے ان تمام مخالفتوں اور بہانہ جویوں کی طرف اشارہ ہو جو بنی اسرائیل نے موسیٰ کی زندگی میں اس عظیم پیغمبر کے ساتھ کی تھیں، یا بیت المقدس کی مانند کسی ماجرے کی طرف اشارہ ہو کہ جس میں انھوں نے موسیٰ سے کہا ہم اس شہر میں داخل ہونے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی ہم ”عالمقہ“ کے ساتھ جنگ پر تیار ہیں جو ایک طاقتور اور جبار گروہ ہے۔ تم اور تمہارا پروردگار جاکر اس کو فتح کرو تو پھر ہم اس میں داخل ہوں گے“ (ما مدہ - ۲۳) اسی سبب سے وہ سالہا سال تک ”تیرہ“ میں گھومتے رہے اور جہاد کے حکم میں فضول، بیہودہ اور کمزور بہانے بنانے کا تلخ مزہ چکھتے رہے۔

لیکن اس چیز کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو سورہ احزاب کی آیت ۶۹ میں وارد ہوئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اذیت و آزار ان ناروا نسبتوں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے موسیٰ کی طرف دیں اور خدا نے موسیٰ کو ان سے مبرا قرار دیا تھا۔ اس آیت میں آیا ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا لا تکنوا کالذین اذوا موسیٰ فبدلہ اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیہا“

”اے ایمان لانے والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی اور خدا نے انھیں (بنی اسرائیل کی ناروا باتوں سے) بری قرار دیا۔

یہ نسبتیں بہت سی تھیں۔ کبھی تو وہ انھیں اپنے بھائی ہارون کو قتل کرنے کے ساتھ متہم کرتے۔ کبھی ”نعود باللہ“ ایک بدکار عورت کے ساتھ غیر شرعی روابط کی ستم لگاتے۔ (وہ سازش جو حیلہ باز قارون نے تیار کی تاکہ وہ نکاح سے مستثنیٰ رہے) کبھی ان پر جادو اور جینوں کا اتھام لگاتے تھے، یا انھیں چند ایک جہانی عیوب کے ساتھ متہم کرتے تھے کہ جن کی تفصیل سورہ احزاب کی مذکورہ آیت میں آچکی ہے۔ لے (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ گفتار
رکھتے ہو

نے بھی ا

لا یہد

را

را

انسان کی

دلوں کو

پہلے فق

کے بعد ا

ہے۔ ذ

!

کی طرف

تمہاری ط

ہوں۔ د

یندی

را

بوسول

را

اُن کی کتا

را

بعد میں ا

را

(حاشیہ سابقہ صفحہ)

لے ”ذاغوا“ ”وہ شہید

یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی پیغمبر پر ایمان لانے کا دعوے دار ہو اور پھر وہ اس کو ایسی ناروا نسبتیں دے؟ کیا یہ گفار کے کردار سے جدا ہونے کا واضح ترین نمونہ نہیں ہے؟ اسی لیے تو موسیٰؑ کہتے ہیں: ”باوجودیکہ تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں، پھر یہ ناروا باتیں کیوں کرتے ہو۔“

لیکن یہ عمل سزا کے بغیر نہ رہا جیسا کہ زیر بحث آیت کے آخر میں آیا ہے: ”جب وہ حق سے منحرف ہو گئے تو خدا نے بھی اُن کے دلوں کو منحرف کر دیا اور خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا“ (فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ)۔

اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہوگی کہ انسان خدائی ہدایت سے محروم اور اس کا دل حق سے منحرف ہو جائے؟ لہٰذا اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت و ضلالت اگرچہ خدا کی طرف سے ہے، لیکن اس کے اسباب اور عوامل خود انسان کی طرف سے ہوتے ہیں، کیونکہ ایک طرف تو فرماتا ہے: ”جس وقت وہ حق سے منحرف ہو گئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو منحرف کر دیا۔“ یعنی پہلا قدم انھوں نے اٹھایا ہے، دوسری طرف یہ کہتا ہے: ”خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔“ پہلے فسق و گناہ سرزد ہوتا ہے کہ جس سے انسان توفیق و ہدایت الہی کے سلب ہو جانے کا مستحق ہوتا ہے اور اس کے بعد اس عظیم محرومیت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی بحث سورہ زمر کی آیت ۳۶ کے ذیل میں آچکی ہے۔ (تفسیر نمونہ جلد ۱۱ کی طرف رجوع کریں)۔

بعد والی آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی رسالت اور اس کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی کاذب شکیب اور تکذیب کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریمؑ نے کہا: ”اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، جبکہ میں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے بھیجی گئی (یعنی تورات) کی تصدیق کرنے والا ہوں۔“ (وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ)۔

”اور میں اس رسول کی بشارت دینے والا بھی ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمدؑ ہے۔“ (وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ)۔

اس بناء پر میں وہ حلقہ اتصال ہوں جو اُمتِ موسیٰؑ اور ان کی کتاب کو آنے والے پیغمبر (پیغمبر اسلام) کی اُمت اور اُن کی کتاب سے ملائے والا ہوں۔

اس طرح حضرت عیسیٰؑ کا رسالت خداوندی کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں تھا اور وہ بھی ایک خاص زمانہ کے لیے تھا۔ بعد میں ان کی طرف الوہیت یا خدا کا بیٹا ہونے کے بارے میں جو افتراء باندھا گیا وہ سب جھوٹ اور بہتان ہے۔

اگرچہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ اس موعود نبی پر ایمان لے آیا، لیکن ان کی ایک بہت بڑی جمعیت نہایت سختی کے ساتھ اس کے مقابلہ میں کھڑی ہو گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس کے واضح معجزات کا بھی انکار کر دیا۔ اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”جب وہ (احمد) ان کے پاس معجزات اور واضح دلائل کے ساتھ آیا تو انھوں نے کہا: یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔“ (فلما جاء ہم بالبينات قالوا هذا سحر مبين)۔

تعب کی بات یہ ہے کہ گروہ یہود، مشرکین عرب کے پہلے اس پیغمبر کو پہچانے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس کے شوق دیدار کے لیے ترک وطن کیا اور ان کے کئی قبائل سرزمین مدینہ میں آکر آباد ہو گئے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بہت سے بت پرستوں نے تو اس پیغمبر موعود کو پہچان لیا اور اس پر ایمان لے آئے، لیکن اکثر یہودی ہٹ دھرمی، عناد اور انکار پر ڈٹے رہے۔

مفسرین کے ایک گروہ نے ”فلما جاء هو“ کی ضمیر کو جیسا کہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے، پیغمبر اسلام (احمد) کی طرف لٹایا ہے۔ لیکن بعض نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ کی طرف لوثتی ہے۔ یعنی عیسیٰ جب بنی اسرائیل کے لیے واضح معجزات لے کر آئے تو انھوں نے اس کا انکار کیا اور جادو قرار دیا۔ لیکن بعد والی آیات بتلاتی ہیں کہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے، کیونکہ ان آیات میں اسلام اور پیغمبر اسلام کا تذکرہ ہوا ہے۔

چند نکات

۱: بشارت اور تکمیل دین کا ربط

ظہور اسلام کے بارے میں عیسیٰؑ کے خبر دینے میں ”بشارت“ کی تعبیر گزشتہ ادیان کی نسبت اس دین کی تکمیل کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ آیات قرآنی کا مطالعہ اور اسلامی عقائد، احکام، قوانین اور مسائل اخلاقی و اجتماعی کے سلسلے میں قرآن کے معارف و تعلیمات کا اس کے ساتھ موازنہ کہ جو کتب عہدین (توریت و انجیل) میں آیا ہے، اس برتری کی واضح طور پر نشان دہی کرتا ہے۔

اگرچہ اوپر والی آیت میں اس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کہ یہ بشارت مسیحؑ کی آسمانی کتاب کے متن میں بھی ہے یا نہیں؟ لیکن قرآن کی دوسری آیات، خود انجیل میں اس کے ذکر کی گواہ ہیں۔ سورۃ اعراف آیت ۵۶ میں آیا ہے: ”الذین يتبعون الرسول المسمى الذي يجدونه مكتوباً عندهم في التوراة والانجيل“۔ وہ لوگ جو خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر آسمانی کی پیروی کرتے ہیں، وہی پیغمبر جس کی صفات کو وہ اپنے پاس توراة و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ بعض دوسری آیات۔

۲ : عہدین کی بشارتیں اور "فارقلیطا" کی تعبیر

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں یہود و نصاریٰ کے پاس جو کچھ تورات و انجیل کے نام سے موجود ہے، وہ خدا کے عظیم پیغمبروں یعنی موسیٰ و عیسیٰ پر نازل شدہ کتابیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان کتابوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو ان کے اصحاب یا ان کے بعد آنے والوں کے ذریعے تالیف ہوا ہے۔ ان کتابوں کا ایک اجمالی مطالعہ اس بات کا زندہ گواہ ہے اور خود عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی اس کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس میں بھی شک نہیں ہے کہ موسیٰ و عیسیٰ کی تعلیمات اور کتب آسمانی کے مضامین و مطالب کا کچھ حصہ ان کے پیروکاروں کے کلام کے ضمن میں منتقل ہو گیا ہے۔ اسی بناء پر جو کچھ عہد قدیم (توراة اور اس سے وابستہ کتابوں) اور عہد جدید (انجیل اور اس سے وابستہ کتابوں) میں آیا ہے، نہ تو اس سائے کے سارے کو قبول ہی کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ سب کا سب قابل انکار ہے۔ بلکہ یہ دونوں کتابیں ان دو عظیم پیغمبروں کی تعلیمات اور دوسرے لوگوں کے افکار و تصورات سے وجود میں آئی ہیں۔

بہر حال موجودہ کتب میں بہت سی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں کہ جس کی نشانیاں سوائے اسلام اور اس کے لانے والے کے اور کسی پر منطبق نہیں ہوتیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ پیشگوئیاں جو ان کتابوں میں نظر آتی اور پیغمبر اسلام کی ذات پر صادق آتی ہیں ان کے علاوہ انجیل "یوحنا" کے تین مواد میں لفظ "فارقلیطا" آیا ہے۔ اس کا فارسی نسخوں میں "تسلی دینے والا" کے ساتھ ترجمہ ہوا ہے۔ اب آپ انجیل یوحنا کی طرف رجوع کریں :

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا "تسلی دینے والا" دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا۔"

بعد والے باب میں آیا ہے :

"اور جب وہ "تسلی دینے والا" آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے آئے گی، وہ میرے بارے میں شہادت دے گی۔"

پھر اس کے بعد والے باب میں آیا ہے :

لیکن میں تم سے حرج کستا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے مفید ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ "تسلی دینے"

یہ تفسیر عربی انجیل چاپ لندن مبلع ولیم وٹس سال ۱۸۵۴ء میں آئی ہے۔

انجیل یوحنا باب ۱۵ جلد ۲۶

انجیل یوحنا باب ۱۶ جلد ۷

والا تمھارے پاس نہیں آئے گا، لیکن اگر میں چلا جاؤں تو اُسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ لے
اہم بات یہ ہے کہ سریانی اناجیل کے متن میں جو اصل یونانی سے لی گئی ہیں "تسلی دینے والے" کے بجائے
"پارقلیطا" آیا ہے۔ اور یونانی متن میں "پیرکلتوس" آیا ہے کہ جو یونانی لغت کے لحاظ سے "لائق تعریف شخص" کے
معنی میں ہے جو "محمد" و "احمد" کا معادل ہے۔

لیکن جب ارباب کلیسا (عیسائی پادریوں) نے یہ دیکھا کہ اس قسم کے ترجمہ کی نشر و اشاعت اُن کے گھر لے
ہوئے نظریات پر ضرب شدید لگائے گی تو "پیرکلتوس" کی بجائے "پاراکلتوس" لکھ دیا کہ جو تسلی دینے والے کے
معنی میں ہے۔ اس واضح تحریر کے ذریعے انھوں نے اس زندہ سند کو بدل کر رکھ دیا۔ اگرچہ اس تحریر
کے باوجود بھی مستقبل کے عظیم ظہور کی ایک واضح بشارت موجود ہے۔ لے

ایک مشہور عیسائی پادری جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، (فخر الاسلام مولف کتاب معروف انیس الاعلام) کی نامی
گواہی "فارقلیطا" کی تفسیر میں اُس کے عظیم استاد کے حوالے سے ہم تفسیر نمونہ کی جلد اول میں نقل کر چکے ہیں۔ وہ اس
بات کو واضح کرتی ہے کہ یہ "بشارتیں" "احمد" اور "محمد" نامی شخص کے بارے میں تھیں۔ لے

یہاں ہم آپ کو اس لفظ کے اس ترجمہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو اس سلسلے میں دائرۃ المعارف بزرگ نے فرانسیسی کیا ہے
محمد موسس دین اسلام، خدا کا بھیجا ہوا اور خاتم انبیاء ہے۔ لفظ محمد بہت زیادہ تعریف کیے گئے کے معنی میں ہے۔
اور مادہ حمد سے مشتق ہوا ہے جو تجلیل و تمجید کے معنی میں ہے۔ عجب اتفاق کے زیر اثر ایک اور نام ذکر ہوا کہ اس کا مادہ بھی
حمد ہی ہے۔ اور لفظ محمد کا مترادف اور ہم معنی ہے، یعنی احمد۔ یہاں احتمال قوی یہ ہے کہ عرب کے عیسائی اس لفظ کو فارقلیطا
کے بجائے استعمال کرتے تھے۔ احمد یعنی زیادہ تعریف کیا ہوا اور لفظ پیرکلتوس کا بہت عمدہ ترجمہ ہے کہ جس کی بجائے غلطی سے لفظ
پاراکلتوس رکھ دیا گیا ہے مسلمان مذہبی موفین نے یہ بارگوشہز کیا ہے کہ اس لفظ سے مراد پیغمبر اسلام کے ظہور کی بشارت ہے
اور قرآن مجید بھی سورۃ صفت کی حیرت انگیز آیت میں اس موضوع کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے۔ لے
خلاصہ یہ ہے کہ "فارقلیطا" کا معنی رُوح القدس یا تسلی دینے والا نہیں ہے، بلکہ یہ "احمد" کے معادل مفہوم رکھتا
ہے۔ (غور کیجئے)

۳: کیا پیغمبر اسلام کا نام احمد ہے؟

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا مشہور نام محمد ہے، جبکہ زیر بحث آیت میں "احمد" کے عنوان سے

لے انجیل یوحنا باب ۱۶ جلد ۷ لے الفرقان فی تفسیر القرآن جلد ۱۲ ص ۳۰۹، زیر بحث آیت کے ذیل میں وہاں اوپر والے جملوں کے متن کے ساتھ واضح طور پر سریانی متن کی آیت
لے تفسیر نمونہ جلد اول سورۃ بقرہ آیت ۴۱ کے ذیل میں۔

لے دائرۃ المعارف بزرگ فرانسیسی جلد ۲۳ ص ۴۱۷

سے ذکر ہوا ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے کس طرح ساڑ گار ہیں۔

اس سوال کے جواب میں ضروری ہے کہ ذیل کے نکات کی طرف توجہ کی جائے :-

الف تواریخ میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ بچپن سے ہی دو نام رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ بھی آپ کو دونوں ہی ناموں سے خطاب کیا کرتے تھے۔ آپ کا ایک نام ”محمد“ اور دوسرا ”احمد“ تھا۔ پہلا نام آپ کے جد امجد عبدالمطلب نے اور دوسرا نام آپ کی والدہ محترمہ جناب آمنہؓ نے انتخاب کیا تھا۔

یہ مضمون سیرۃ حلبیہ میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے :

ب جن لوگوں نے پیغمبر اسلامؐ کو بارہا اس نام کے ساتھ یاد کیا ہے ان میں سے ایک آپ کے چچا ابوطالب تھے۔ آج بھی وہ کتاب جو دیوان ابوطالب کے نام سے ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس میں بہت سے ایسے اشعار نظر آتے ہیں کہ جن میں پیغمبر گرامیؐ کو ”احمد“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے مثلاً :

امرادوا قتل احمد ظالموهم

ولیس بقتلهم فیہم نرعیہ

ان کے اوپر ظلم کرنے والے احمد کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے۔

لیکن اس کام کے لیے کوئی رہبر انھیں نہیں مل سکا۔

وان کان احمد قد جاؤهم

بحق ولم یأتهم بالکذب

احمد قطعی طور پر ایک دین حق لے کر ان کے پاس آیا ہے اور،

وہ ہرگز جھوٹا دین لے کر نہیں آیا۔ لے

دیوان ابوطالب کے علاوہ بھی جناب ابوطالب کے کچھ اشعار اس سلسلے میں نقل ہوئے ہیں :

لقد اکرم الله النبی محمداً

فاکرم خلق الله فی الناس احمد

خدا نے اپنے پیغمبر محمدؐ کو محترم و محترم قرار دیا ہے۔ اسی لیے لوگوں

کے نزدیک مخلوق خدا میں سب سے زیادہ گرامی احمدؐ ہے۔ لے

ج پیغمبر کے ہمصر مشہور شاعر حسان بن ثابتؓ کے اشعار میں بھی یہ تعبیر نظر آتی ہے :

مفجعة قد شفها فقد احمد

فظلت لالاء الرسول قد

وہ مصیبت زدہ جسے احمد کے فقدان نے کمزور کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ
رسول خدا کے عطایا و مواہب کو شمار کیا کرتا تھا۔

ابوطالب یا ان کے علاوہ دوسرے افراد کے وہ اشعار جن میں (محمد کے بجائے) احمد کا نام آیا ہے اس
قدر زیادہ ہیں کہ ان کو یہاں نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم اس بحث کو دو اور عمدہ اشعار کے ساتھ ختم کرتے ہیں
جو ابوطالب کے فرزند علیؑ نے کہے ہیں :-

إتأسرني بالصبرني نصر احمد
ووالله ما قلت الذي قلت جائزًا
سأسعي لوجه الله في نصر احمد

سببی الصبری المحمود طفلًا ویا فاعًا
کیا تو مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں احمدؑ کی مدد اور نصرت
میں صبر سے کام لوں۔

خدا کی قسم! میں نے جو کچھ کہا ہے وہ جزع و فزع اور بے صبری
کی بناء پر نہیں کہا۔

میں تو خدا کے لیے احمدؑ کی نصرت میں کوشش کرتا ہوں۔
وہی پیغمبر ہدایت جو بچپن اور جوانی میں ہمیشہ محمود اور قابل تعریف
تھا۔

د جو روایات مسئلہ معراج کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں ان میں یہ کثرت سے آیا ہے کہ خدا نے پیغمبر اسلامؐ کو شب
معراج بارہا "احمدؑ" کے نام سے خطاب کیا۔ شاید اسی وجہ سے یہ مشہور ہو گیا ہے کہ آنحضرتؐ کا نام آسمانوں میں
احمدؑ اور زمین میں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے بھی آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے دس نام تھے۔ ان میں سے پانچ نام قرآن
میں آئے ہیں۔ "محمدؐ" و "احمدؐ" و "عبد اللہؐ" و "یسؐ" و "نؐ"۔

ه جب پیغمبرؐ نے (سورہ صف) کی اوپر والی آیات کو مدینہ اور مکہ کے لوگوں کے سامنے پڑھا تو یقینی طور پر یہ اہل کتاب
کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ مگر مشرکین اور اہل کتاب میں سے کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ انجیل تو احمدؑ

۱۔ دیوان حسان بن ثابت ص ۵۹ تحقیق محمد عزت نصرائی

۲۔ النبیؐ جلد ۷ ص ۳۵۸

۳۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۱۳۔ تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۴ میں بھی اس سلسلے میں کئی روایات آئی ہیں کجی کے نقل کرنے سے طول ہو جائے گا۔

کے آنے کی بشارت دیتی ہے اور تمھارا نام محمد ہے۔ یہ سکوت خود اس ماحول میں اس نام کی شہرت کی دلیل ہے۔ اگر کوئی اعتراض ہوا ہوتا تو وہ ہمارے لیے بھی نقل ہوتا، کیونکہ دشمنوں کے اعتراضات تاریخ میں ثبت ہیں یہاں تک کہ ایسے موارد میں بھی جو بہت چھپنے والے ہیں۔

اس تمام بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ”احمد“ پیغمبر اسلام کے مشہور ناموں میں سے تھا۔ لہ

✦ ✦ ✦

آیا ہے اس
تم کرتے ہیں

بر اسلام کو شب
آسمانوں میں

پانچ نام قرآن

یہ اہل کتاب
تو احمد

کی بشارت

کس طرح

کرتا ہے

چ

دی جا رہی

ہا

سب سے

انہیں اس

آیہ

خدا

لیکن ہدایت

یہ

مقامات

و

سلامتی اور

۱۰

زیر بحث آ

ظالم ترین

بازگشت

کہ لوگوں

۱

میں فرما

چاہے

نور

نور

نور

نور

- ④ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَى إِلَى الْإِسْلَامِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○
- ⑤ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ○
- ⑥ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ○

ترجمہ

- ④ اُس شخص سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو گا جو خدا پر جھوٹ باندھے (اور تکذیب کرے) حالانکہ اُسے اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے، اور خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔
- ⑤ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں لیکن خدا اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو پسند نہ آئے۔
- ⑥ وہی تو ہے کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے چاہے مشرکوں کو برا ہی لگے۔

تفسیر

وہ نور خدا کو اپنی پھونکوں سے خاموش کرنا چاہتے ہیں

گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ مخالف اور ہٹ دھرم گروہ، پیغمبر اسلام کے بارے میں گزشتہ پیغمبر حضرت عیسیٰ

کی بشارت کے باوجود اور پیغمبر اسلام کی دعوت کے ”بیانات“، واضح دلائل اور معجزات کے ساتھ قوی ہونے کے باوجود کہیں طرح مقابلہ اور انکار کے لیے کھڑا ہو گیا۔ زیر بحث آیات میں ان لوگوں کے انجام کار اور ان کی سرفروشت کی تشبیح کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ”اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو خدا پر جھوٹ باندھے۔ جالانکہ اسے اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے۔“ ومن اظلم ممن افتری علی اللہ الکذب وهو یدعی الی الاسلام۔

ہاں! ایسا آدمی جو پیغمبر اسلام کی دعوت کو جھوٹ، ان کے معجزات کو جادو اور ان کے دین کو باطل شمار کرے، وہ سب سے بڑھ کر ظالم ہے۔ کیونکہ وہ راہ نجات و ہدایت کو اپنے لیے اور دیگر بندگان خدا کے لیے بھی روک دیتا ہے اور انہیں اس خدائی سرچشمہ فیض سے محروم کر دیتا ہے، جو ان کی سعادت ابدی کا ضامن ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”خدا ستمگر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔“ (واللہ لا یہدی القوم الظالمین)۔ خدا کا کام ہدایت کرنا ہے، اور اس کی ذات پاک نور اور معنوی روشنی ہے۔ ”اللہ نور السموات والارض“ لیکن ہدایت کے لیے استعداد کی ضرورت ہے اور یہ استعداد ان لوگوں میں موجود نہیں ہوتی جو حقیقت کے دشمن ہوتے ہیں۔ یہ آیت ایک مرتبہ پھر اس حقیقت پر زور دیتی ہے کہ ہدایت و ضلالت خدا کی طرف سے ہے، لیکن اس کے مقدمات خود انسان کی طرف سے شروع ہوتے ہیں، اور اسی بناء پر اس میں ہرگز جبر لازم نہیں آتا۔

”وہو یدعی الی الاسلام“ کا مجملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر کی دعوت انسانوں کی دنیا و آخرت کی سلامتی اور نجات کی ضامن ہے۔ اس حالت میں انسانے کیسے اپنی سعادت کی جڑ کاٹتا ہے؟

”من اظلم“ (کون سب سے بڑھ کر ظالم ہے) کی تعبیر قرآن میں پندرہ مرتبہ دہرائی گئی ہے اور ان میں سے زیر بحث آیت آخری ہے۔ اگرچہ ان کے موارد ظاہری طور پر مختلف ہیں اور ممکن ہے اسی بات سے یہ سوال پیدا ہو کہ کیا ظالم ترین لوگ ایک گروہ سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں؟ لیکن ان آیات میں غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سب کی بازگشت آیات النبی کی تکذیب اور لوگوں کو راہ حق سے روکنے پر ہے۔ اور واقعی اس سے بڑھ کر کوئی اور ظلم نہیں ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے راستے تک پہنچنے سے باز رکھیں جو ان کے تمام کاموں میں کامیابی کی راہ ہے۔

اس کے بعد یہ بتلانے کے لیے کہ دشمنان حق اس کے دین کو ختم کرنے پر قادر نہیں ہیں ایک عمدہ تشبیہ کے ضمن میں فرماتا ہے: ”وہ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنی چھونچوں سے بجھادیں، لیکن خدا اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا، چاہے یہ بات کافروں کو پسند نہ آئے“ (یریدون لیطفقوا نور اللہ بافواہم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون)۔

وہ اس شخص کی مانند ہیں جو آفتاب عالم تاب کے نور کو پھونک مار کر بجھانا چاہتا ہو۔ وہ ایسی چمگاڑیاں ہیں جو یہ ٹھان کرتی ہیں کہ اگر وہ سورج کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو رات کی تاریکی کے پردوں میں چھپالیں تو اس

ب و هو

ین

نور

ہرہ

یب کرے

ور کو مکمل

ہ تاکہ لے

ت عیسیٰ

وہ چشمہ نور کے مقابلہ میں کھڑی ہو سکتی ہیں۔

تاریخ اسلام قرآن کی اس عظیم پیشین گوئی کے پورا ہونے کی ایک زندہ سند ہے، کیونکہ ظہور اسلام کے پہلے دن ہی اس کی نابودی کے لیے سازشیں اور منصوبے بنائے جاتے رہے ہیں :
کبھی دشمنوں کے تسخر اور ایذا و آزار کے ذریعے۔

کبھی اقتصادی و اجتماعی مقاطعہ کے ذریعے۔

کبھی اُحد و اعزاب و خنین وغیرہ کے میدانوں میں مختلف جنگوں میں الجھانے کے ذریعے۔

کبھی منافقوں کی اندرونی سازشوں کے ذریعے۔

کبھی مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف پیدا کرنے کے ذریعے۔

کبھی صلیبی جنگوں کے ذریعے۔

کبھی عظیم اسلامی سلطنت کو چالیس سے زیادہ ملکوں میں تقسیم کرنے کے ذریعے۔

کبھی مذہبی قوانین کو بدل کر اور مسلمان جوانوں کو ان کی پرانی تہذیب و تمدن سے دور کرنے کے ذریعے۔

کبھی جوانوں میں فحشاء و منکر، فساد اخلاق اور انحراف عقیدہ کے وسائل کی نشر و اشاعت کے ذریعے۔

کبھی فوجی، سیاسی اور اقتصادی تسلط کے ذریعے۔

اور کبھی دوسرے طریقوں سے اسلام کو نابود کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

لیکن جس طرح خدا نے ارادہ کیا تھا، یہ نور الہی روز بروز پھیل رہا ہے اور ہر زمانے میں اسلام کا دامن پہلے سے

وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں کی جمیعت، صیہونیوں، صلیبیوں اور مشرق کے مائیں کی مشترکہ

کوششوں کے باوجود بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہاں! وہ ہمیشہ سے چاہتے تو یہی ہیں کہ خدا کے اس نور کو بجھادیں، لیکن

خدا کا ارادہ کچھ اور ہے۔ اور یہ قرآن کا ایک ابدی اور جادوئی معجزہ ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ مضمون قرآن مجید کی آیات میں دو مرتبہ آیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ایک مقام پر

”سیرمیدون ان یطفئوا“ آیا ہے۔ (توبہ - ۳۲)، لیکن یہاں ”سیرمیدون لیطفئوا“ ہے۔

راغب ”مفردات“ میں اس اختلاف اور فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پہلی آیت میں تو مقدمہ کے

بغیر خاموش کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن دوسری آیت میں مقدمات کے ذریعے سمجھانے کی طرف اشارہ ہے۔

یعنی چاہے وہ مقدمات فراہم کریں یا نہ کریں نور خدا کو خاموش کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

✽ ✽ ✽

آخری ذریعہ بحث آیت میں مزید تاکید کے لیے صراحت کرتے ہوئے کہتا ہے: ”وہی ہے کہ جس نے اپنے رسولؐ

کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرکین کو برا ہی لگے“

الذی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کہ المشرکون

”ادسل رسولہ بالہدای و دین الحق“ کی تعبیر اسلام کی کامیابی اور غلبہ کی رمز کے بیان کے طور پر ہے کیونکہ یہ غلبہ اور کامیابی ہدایت اور دین حق کی طبیعت میں رکھی ہوئی ہے۔ اسلام اور قرآن نور الہی ہیں، اور جہاں کہیں بھی نور ہو وہ اپنے آثار اور نشانیاں دکھا کر رہتا ہے اور یہ کامیابی کا سبب ہے۔ کافروں اور مشرکوں کی ناپسندیدگی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔

ایک خاص بات ہے کہ یہ آیت بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں تین مرتبہ آئی ہے۔ یعنی سورہ توبہ (آیت ۳۳، سورہ فتح (آیت ۳۸) اور اسی سورہ صفت میں بھی ہے۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ تکرار اور تاکید اس زمانہ میں تھی جب اسلام دنیا کے دیگر خطوں میں تو کیا ابھی جزیرہ عرب میں بھی اچھی طرح نہیں پھیلا تھا۔ لیکن قرآن نے اسی وقت تاکید کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کیا اور آئندہ کے واقعات نے اس عظیم پیشین گوئی کی صداقت کو سچ کر دکھایا اور انجام کار اسلام عقل و منطق اور عملی پیش رفت کے لحاظ سے بھی دوسرے ادیان و مذاہب پر غالب آگیا۔ اُس نے دشمنوں کو دنیا کے وسیع حصوں سے پیچھے دھکیل کر ان کی جگہ لے لی اور اس وقت بھی بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

لیکن اس پیش رفت کا اصلی مرحلہ ہمارے عقیدہ کے مطابق حضرت امام مہدی ارواحنا فداہ کے ظہور کے ساتھ پورا ہو گا اور یہ آیات بھی خود اس عظیم ظہور کی ایک دلیل ہیں۔

اس آیت کے مضمون کے بارے میں کہ اس سے مراد منطقی غلبہ ہے یا غلبہ قدرت اور اس کا ربط حضرت امام مہدی کے ظہور کے ساتھ کس طرح ہے ہم نے سورہ توبہ کی آیت ۳۳ کے ذیل میں ضروری بحث کی ہے۔ اے

❖ ❖ ❖

۱۰) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ۝

۱۱) تَوَمِّنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

۱۲) يَغْفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكَنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

۱۳) وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِيرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝

ترجمہ

۱۰) اے ایمان لانے والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کی طرف رہبری نہ کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے رہائی بخشتے۔

۱۱) خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے ہر چیز سے بہتر ہے اگر تم جانو۔

۱۲) اگر تم یہ کام کرو گے تو خدا تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور تمہیں اس جنت کے باغوں

میں

میں

اور ۱۳

قریب

تجربہ

کی دعوت

دل و دماغ

سے

عذاب

عذاب

بلکہ تجارت

کی حکایت

نیلے یہ

سب

تجارت

میں داخل کرے گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور بہشت جادوال کے مسکن میں تمہیں جگہ دے گا، اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔
 اور ایک دوسری نعمت تمہیں بخشے گا جسے تم دوست رکھتے ہو۔ اور خدا کی نصرت اور فتح قریب ہے اور مومنین کو بشارت دے دے۔

سود مند اور بے نظیر تجارت

جیسا کہ ہم اس سورۃ کے آغاز میں بیان کر چکے ہیں اس آیت کے اہم مقاصد میں سے ایک ایمان اور جہاد کی دعوت ہے۔ زیر بحث آیات میں بھی انہی دونوں باتوں کی تاکید ایک ایسی لطیف مثال سے کی گئی ہے جو انسان کے دل و جان میں حرکت الہی کے جذبے کو وجود میں لاتی ہے۔ وہ جذبہ جو تمام دنیوں پر دین اسلام کے غلبے کی شرط ہے۔ اس کی طرف گزشتہ آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ”اے ایمان لانے والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کی طرف رہبری نہ کروں جو تمہیں دروناک عذاب سے نجات دے؟“ **ذِیَالِیْہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدْلٰکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تَنْجِیْکُمْ مِنْ عَذَابِ الْیَمِّ**۔

اس کے باوجود کہ ”ایمان“ اور ”جہاد“ یقینی اور قطعی واجبات میں سے ہیں مگر یہاں انہیں حکم کی صورت میں نہیں بلکہ تجارت کی پیش کش کی صورت میں بیان کرتا ہے، وہ بھی ایسی تعبیروں کے ساتھ جو خدا کے بے پایاں لطف و کرم کی حکایت بیان کرتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ”عذاب الیم سے نجات“ انسان کی اہم ترین خواہشات میں سے ایک ہے۔ اس لیے یہ سوال کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں ایسی تجارت کی طرف رہنمائی کروں جو تمہیں عذاب الیم سے رہائی بخشنے، سب کے لیے جالب توجہ ہے۔

جب اس سوال کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف جذب کر لیا تو ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس سود مند تجارت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور وہ یہ ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور خدا کی راہ

میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ (تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاهدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم)۔ لے

اس میں شک نہیں کہ خدا کو اس سود مند تجارت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے نفع کا کلی تعلق صرف مومنین کے ساتھ ہے، اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”یہ تمہارے لیے ہر چیز سے بہتر ہے، اگر تم جاؤ۔“ (ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یا ایہذا الذین آمنوا کے قرنیہ سے مخاطب مومنین ہیں اور عین اس حالت میں انہیں ”ایمان“ اور ”جہاد“ کی دعوت دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ سطلی اور نام کا ایمان کافی نہیں، گہرے اور خالص ایمان کی ضرورت ہے کہ جو ایثار، فداکاری اور جہاد کا سرچشمہ بن سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا اور رسولؐ پر ایمان کا ذکر یہاں اس ایمان کی تشریح ہو جو گزشتہ آیت میں اجمالی طور پر آیا ہے۔

بہر حال پیغمبرؐ پر ایمان، خدا پر ایمان سے الگ نہیں ہے، جیسا کہ جان کے ساتھ جہاد، مال کے ساتھ جہاد سے جدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ تمام جنگیں مال و امکانات کی محتاج ہوتی ہیں جنہیں مالی امدادوں کے ذریعے پورا کیا جانا چاہیے۔ بعض لوگ دونوں طرح کے جہادوں پر قادر ہوتے ہیں اور بعض صرف میدان جنگ سے پیچھے رہ کر مالی جہاد پر ہی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ صرف جان ہی پیش کر سکتے ہیں اور اسے قربان کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔

بہر حال دونوں قسم کے جہادوں کو ہر صورت میں ایک دوسرے سے توام ہونا چاہیے تاکہ کامیابی حاصل ہو۔ اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مالی جہاد کو مقدم رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جانی جہاد سے زیادہ اہم ہے۔ بلکہ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اس کا مقدمہ شمار ہوتا ہے، کیونکہ جہاد کے آلات و اسلحہ مالی امدادوں کے ذریعے ہی فراہم ہوتے ہیں۔

یہاں تک اس عظیم اور بے نظیر تجارت کے تین ارکان مشخص ہوئے ہیں: ”غریاء خدا ہے۔“ ”بیچنے والے صاحب ایمان لوگ ہیں، اور ”متاع“ ان کی جانیں اور مال ہیں۔ اب چونکہ رکن کی نوبت آتی ہے جو اس بڑے سودے کی قیمت ہے۔

فرماتا ہے: ”جب تم ایسا کرو گے تو خدا تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں جنت کے باغوں میں جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور بہشت جاودانی کے پاکیزہ مسکنوں میں جگہ دے گا۔ اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔“ (الغفر لکم ذنوبکم و یدخلکم جنات تجری من تحتھا الانهار و مساکن طیبہ فی جنات عدن ذالک الفوز العظیم)۔ لے

لے تؤمنون باللہ کا جملہ ”جملہ استیثاف“ ہے جو تجارت کی تفسیر کرتا ہے اور بعض نے اسے غلط بیان سمجھا ہے۔ یہاں یہ جملہ خبریہ ”بمبنی امر“ کی صورت میں ہے۔ لے ینفس لکم کا جملہ ایک محذوف ”شرط“ کی جزاء کے طور پر آیا ہے کہ جس کا سابقہ جملہ سے استفادہ ہوتا ہے۔ تقدیر میں اس طرح ہے۔ ان تؤمنوا باللہ و یدخلکم جنات۔ (آخری) اور

اُفردی اجر کے مرحلہ میں پہلے گناہوں کی بخشش کی بات کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کو زیادہ تر فکر و پریشانی اپنے گناہوں سے ہوتی ہے۔ جب مغفرت اور بخشش یقینی ہو جائے تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تعبیر بتلاتی ہے کہ اس کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے پہلا ہدیہ خداوندی یہ ہے کہ وہ اُن کے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ کیا یہ صرف ”حق خدا“ کے بارے میں ہے یا ”حق الناس“ کو بھی شامل ہے؟ تو آیت کا مطلق ہونا عمومیت کی دلیل ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خدا نے حق الناس خود انہیں کے سپرد کیے ہوئے ہیں، لہذا بعض نے اس کی عمومیت میں شک کیا ہے۔

اس طرح سے اوپر والی آیات میں دو شاخیں تو ایمان کی ہیں، (خدا اور رسول پر ایمان) اور دو شاخیں جہاد کی ہیں (مال اور جان کے ساتھ جہاد) اور دو شاخیں اُفردی جزاؤں کی ہیں، (گناہوں کی بخشش اور بہشت جاودان میں دخول) اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے بعد والی آیت میں دنیا میں مواہب الہی کی بھی دو شاخیں آئی ہیں۔

❖ ❖ ❖

جہاں فرماتا ہے: ”اور دوسری وہ نعمت کہ تم دوست رکھتے ہو اور تمہیں جس سے بہت لگاؤ ہے اور وہ خدا کی مدد و نصرت اور نزدیک کی فتح ہے۔“ (و آخری تعجبونہا نصر من اللہ و فتح قریب)۔

کتنی سُو مند اور برکت والی تجارت ہے جو سراسر فتح و کامیابی اور نعمت و رحمت ہے اور اسی وجہ سے اس کو فخر عظیم اور بہت بڑی کامیابی قرار دیا ہے۔

اسی وجہ سے بعد میں مومنین کو اس عظیم تجارت کے بارے میں مہم و کبار کے ساتھ بشارت دیتا اور مزید کہتا ہے: ”اور مومنین کو بشارت دے دو“ (وبشیر المؤمنین)۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب لیلۃ عقبۃ (جس رات پیغمبر نے مکہ کے قریب مدینہ کے کچھ لوگوں سے مخفی طور پر ملاقات کی اور ان سے بیعت لی) رسول اللہ اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان عہد و پیمان ہوا تو عبد اللہ بن رواحہ نے عرض کیا: ”اس پیمان کے ضمن میں آپ اپنے لیے اور اپنے پروردگار کے لیے جو شرط چاہیں رکھ لیں۔“

پیغمبر نے فرمایا: ”میرے پروردگار کے لیے تو یہ شرط ہے کہ کسی طرح بھی کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہیں دو گے اور میرے لیے یہ شرط ہے کہ جس طرح تم اپنی جان و مال کا دفاع کرتے ہو اسی طرح میرا بھی دفاع کرو گے۔“

عبد اللہ نے کہا: ”اس کے مقابلے میں ہمیں کیا دیا جائے گا؟“

پیغمبر نے فرمایا: بہشت !

اگر مایہ صغیرا، رسولہ و تجاہد وافی سبیلہ... ینفعل لکم ذنوبکم... یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ ”آخر کا جواب ہو کہ جو تومنون اور تجاہدون کے بدلہ خبریہ سے معلوم ہوتا ہے۔“

”آخری“ ایک حمد و موصوفت کی صفت ہے۔ مثلاً نعمت یا خلعت، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ مصروف ”تجارت“ ہے لیکن یہ بعید نظر آتا ہے۔

عبداللہ نے کہا: ربح البیع لا نقبل ولا نستقبل۔ ”کتنا سود مند اور نفع بخش معاملہ ہے؟ نہ تو ہم اس معاملہ سے خود پھریں گے اور نہ ہم اس معاملہ سے پھر جانے کو قبول کریں گے نہ تو فسخ کریں گے اور نہ ہی فسخ کو مقبول کریں گے۔“

چند نکات

۱: فتح قریب کون سی ہے؟

ان آیات میں جس فتح کا وعدہ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کو منطقی پہلوؤں میں اور جنگ کے میدانوں میں بھی بارہا حاصل ہوئی ہے۔

لیکن اس بارے میں کہ ”فتح قریب“ سے مراد کون سی فتح ہے؟ مفسرین نے کئی احتمال دیئے ہیں، اور بہت سے مفسرین نے تو اس کی فتح مکہ کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ بعض نے ایران و روم کے شہروں کی فتح اور بعض نے تمام اسلامی فتوحات تفسیر کیا ہے جو مسلمانوں کے ایمان و جہاد کے بعد تھوڑے سے عرصے میں ہی حاصل ہو گئیں۔

چونکہ مخاطب صرف پیغمبر کے اصحاب و انصار ہی نہیں، بلکہ طویل تاریخ کے تمام مومنین اس خطاب کے مخاطب ہیں، لہذا ”نصر من اللہ و فتح قریب“ کا جملہ، ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے اور یہ ان سب کے لیے ایک بشارت ہے، اگرچہ پیغمبر کے زمانے میں اور ان آیات کے نزول کے وقت، اس کا واضح مصداق فتح مکہ ہی تھا۔

❖ ❖ ❖

۲: مساکن طیبہ کیا ہیں؟

جنت کی نعمتوں میں سے یہاں خصوصیت کے ساتھ پاکیزہ اور شاندار مساکن کا ذکر ہوا ہے۔ جو جنت کے ابدی اور جاودانی باغات میں ہوں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انسان کے آسائش و آرام کے بنیادی شرائط میں سے ایک یہی مسکن کا مسئلہ ہے وہ بھی ایسا پاک و پاکیزہ مسکن، جو ہر قسم کی ظاہری و باطنی آلودگی سے پاک ہو کہ جس میں انسان راحت و آرام کے ساتھ رہ سکے۔

راغب ”مفردات“ میں کہتا ہے: طیب کا معنی اصل میں ایک ایسی چیز ہے جس سے ظاہری اور باطنی حواس لذت حاصل کریں۔ یہ ایک جامع معنی ہے جو ایک مسکن کے تمام مناسب شرائط کو اپنے اندر

یہ ہوئے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں تین چیزیں آرام و سکون کا سبب شمار کی گئی ہیں :
رات کی تاریکی وجعل اللیل سکناً (انعام-۹۶)
سکونت کے لیے گھر واللہ جلکم من بیوتکم سکناً (نمل-۸۰)
مجتبت کرنے والی بیویاں ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا
الیہا (روم-۲۱)

۳ : دنیا اولیاء خدا کا تجارت خانہ ہے

نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ امام علیؑ نے ایک ایسے دعویٰ کرنے والے شخص سے، جو اصطلاح کے مطابق ”جانناز آب می کشید“ (جائے نماز کو بھی غسل دیتا تھا) اور مسلسل دنیا کی مذمت کیا کرتا تھا، فرمایا: تجھے غلطی لگی ہے، دنیا ان لوگوں کے لیے جو بیدار و آگاہ ہیں، بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے تشریح بیان فرمائی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ دنیا ”متجر اولیاء اللہ“ دوستانہ خدا کا تجارت خانہ ہے۔ یہ اس بناء پر اگر ایک جگہ دنیا کو ”مزرعۃ آخرت“ سے تشبیہ دی گئی ہے تو یہاں اسے تجارت خانہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ انسان نے جو سرمایہ خدا سے لیے ہیں، انہیں گراں ترین قیمت میں خود اسی کے ہاتھ بیچ دے اور ناجیز و حقیر مال و متاع کے بدلے میں اس سے عظیم ترین نعمت حاصل کر لے۔
اصولی طور پر تجارت کی تعبیر اور وہ بھی ایسی فائدہ مند تجارت، انسان کے اہم ترین محرکات کو تحریک دینے کے لیے ہے۔ وہ جالب منفعت اور دفع ضرر کے محرکات ہیں، کیونکہ یہ خدائی تجارت صرف سود مند ہی نہیں بلکہ ”عذاب الیم“ کو بھی دفع کرتی ہے۔

اسی مطلب کی نظیر سورۃ توبہ کی آیت ۱۱۱ میں بھی آئی ہے: ان اللہ اشتراى من المؤمنین انفسہم و اموالہم بان لہم الجنة : خدا مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے میں انہیں جنت عطا فرماتا ہے۔

ہم نے اس سلسلے میں سورۃ توبہ کی تفسیر میں بھی تشریح کی ہے۔ ۷

۱۲) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ
عِيسٰى ابْنُ مَرْيَمَ لِّلْحَوَارِیِّیْنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلٰی
اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاَمَنْتَ طَآئِفَةٌ
مِّنْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَكَفَرْتَ طَآئِفَةٌ ؕ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۳) اے ایمان لانے والو! خدا کے ناصر و مددگار ہو جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے
حواریوں سے کہا تھا۔ خدا کی طرف کون میرا یاور و مددگار بنے گا؟ تو حواریوں نے جواب دیا تھا ہم
خدا کے یاور و مددگار ہیں۔ اس موقع پر بنی اسرائیل کا ایک گروہ تو ایمان لے آیا اور ایک
گروہ کافر ہو گیا، ہم نے ان لوگوں کی جو ایمان لائے تھے، ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی،
اور انجام کار وہ ان پر غالب ہوئے۔

تفسیر

حواریوں کی طرح ہو جاؤ

سورۃ صفّ کی اس آخری آیت میں امر جہاد پر دوسری مرتبہ تاکید کی گئی ہے کہ جو اس سورۃ کا محور اصلی ہے۔ البتہ
اس مسئلے کو ایک دوسرے طریقے سے بیان کیا اور بہشت اور بہشت کی نعمتوں سے بھی زیادہ ایک اہم مطلب کو بیان

کرتے ہوئے فرماتا ہے :

”اے ایمان لانے والو! خدا کے ناصر و مددگار بن جاؤ“ (یا ایہا الذین امنوا کونوا انصار للہ)۔

ہاں! خدا کے مددگار، وہ خدا جو تمام قدرتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ وہ خدا جس کی قدرت بے پایاں اور شکست ناپذیر ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں اُس نے بندوں کو اپنی مدد کے لیے پکارا ہے۔ اور یہ ایک ایسا افتخار و اعزاز ہے کہ جس کی کوئی نظیر نہیں ہے، اگرچہ اس کا معنی مفہوم وہی پیغمبر اور اس کے دین کی مدد و نصرت ہے، لیکن اس میں ایک عجیب لطف و رحمت موجود ہے۔ اس کے بعد ایک تاریخی نمونہ کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ یہ راستہ نہ تو راہ نورد کے بغیر تھا اور نہ ہے۔ فرماتا ہے :

جیسا کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے حواریوں سے کہا تھا: ”خدا کی طرف میری مدد کرنے والا کون ہے؟“ (کما قال عیسیٰ ابن مریم للحواریین من انصاری الی اللہ)۔

اور حواریین نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا: ”ہم خدا کے انصار ہیں“ (قال الحواریون نحن انصار اللہ)۔

اور اسی راہ میں دشمنانِ خدا کے ساتھ مبارزہ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بنی اسرائیل کا ایک گروہ تو ایمان لے آیا (اور حواریوں کے ساتھ مل گیا) اور ایک گروہ کافر ہو گیا۔ (فامنت طائفة من بنی اسرائیل وکفرت طائفة)۔

اس موقع پر ہماری نصرت اور مدد ان کی کمک کے لیے آ پہنچی۔ ”ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے تھے دشمنوں کے مقابلے میں تقویت دی اور انجام کار وہ غالب آ گئے“ (فایتدنا الذین امنوا علیٰ عدوہم فاصبحوا ظاہرین)۔

تم بھی محمدؐ کے حواری ہو اور اس اعزاز کے ساتھ متغفر ہو کہ اللہ کے انصار ہو جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ کے حواری دشمنوں پر غالب آ گئے تھے، تم بھی کامیاب ہو جاؤ گے۔ تمہیں اس جہان میں اور دوسرے جہان میں بھی سربلندی اور افتخار نصیب ہو گا۔

یہ موضوع رسول اللہؐ کے انصار و اصحاب میں ہی منحصر نہیں تھا، بلکہ ہمیشہ ہی جبکہ حق کے طرفدار اہل باطل کے مقابلے میں مسلسل ٹکراتے رہیں تو وہ خدا کے یاور و انصار ہیں اور انجام کار انہیں بھی کامیابی نصیب ہوگی۔

رگ رگ است این آبِ شیریں و آبِ شور

بر حلائی می رود تا نفعِ صور!

یہ میٹھا اور کٹھوا پانی خون کی رگیں ہیں۔

سَالِ
إِلَى
لَا إِلَهَ إِلَّا
ذِينَ

نہ
تھا ہم
ایک
مدد کی

البتہ
بکربان

جو لوگوں کے اندر نفعِ صورت تک دوڑتا رہے گا۔

✦ ✦ ✦

ایک نکتہ

حواریین کون ہیں؟

قرآن مجید میں پانچ مرتبہ عیسیٰؑ کے حواریوں کے بارے میں ذکر آیا ہے، ان میں سے دو مرتبہ تو اسی سورہ میں ہے۔ یہ تعبیر حضرت عیسیٰؑ کے مخصوص بارہ اصحاب کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے نام موجودہ اناجیل (انجیل متی و لوقا باب ۶) میں ذکر ہوئے ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا۔ یہ لفظ مادہ ”حور“ سے دھولے اور سفید کرنے کے معنی میں ہے۔ چونکہ وہ پاک دل اور باصفا رُوح رکھتے تھے اور اپنی اور دوسروں کی رُوح و جان کو پاک و صاف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس لیے اس لفظ کا ان پر اطلاق ہوا ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان میں سے ہر ایک کو اپنی نمائندگی کے عنوان سے دُنیا کے مختلف علاقوں کی طرف بھیجا تھا۔ وہ مخلص اُتار کرنے والے مجاہد اور مبارزہ کرنے والے افراد تھے اور انھیں حضرت عیسیٰؑ سے بہت عشق اور محبت تھی۔

لیکن عیسائیوں کی روایات میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان میں سے ایک کو جس کا نام ”یھودای اخیڑیوٹی“ تھا، آخر کار حضرت عیسیٰؑ سے خیانت کی اور وہ مطرود و مردود قرار پایا۔

اس سلسلے میں سورہ آل عمران کے ذیل میں بہت سی وضاحتیں پیش کی جا چکی ہیں۔ لے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ جب عقبہ میں اہل مدینہ کی اُس جماعت سے ملے جو بیعت کے لیے آئی تھی تو آپؐ نے فرمایا:

”اُپنے میں سے بارہ افراد کو منتخب کر کے ان کا مجھ سے تعارف کراؤ تاکہ وہ اپنی قوم کے نمائندے ہوں جیسا کہ حواریین کی حضرت عیسیٰؑ ابن مریمؑ سے نسبت تھی۔ لے یہ بات ان بزرگواروں کے مقام و مرتبہ کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

✦ ✦ ✦

خدا او مندا ! ہمیں توفیق دے کہ ہم اس سودمند تجارت میں شرکت کریں کہ جسے تو نے اپنے اولیاء

کے لیے فراہم کیا ہے، تاکہ ہم بھی اس کی عظیم برکتوں سے بہرہ مند ہوں۔

پروردگار! اختلاف و پرگندگی نے مسلمانانِ عالم کی صفوں کو دشمنوں کے مقابلے میں متزلزل کر دیا ہے، تو انہیں ایسی آگاہی اور بیداری مرحمت فرما کہ ساری دنیا کے مسلمان ”بنیانِ مصوص“ دسیہ پلائی ہوئی دیوانہ کی طرح خوشخوار دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

باسمِ الہا! تیرا دین بے ناصر و مددگار نہیں رہ سکتا، یہ اعزاز و افتخار ہمیں نصیب فرما کہ ہم ان یاورانِ اسلام کے زمرہ میں داخل ہوں۔ آمین یا رب العالمین

❖ ❖ ❖

تو اسی سورہ
جیلِ داہمیل
لے اور منیہ
جان کو پاک

سے دُنیا
انہیں حضرت

ی اخرویٰ

یہ آئی

ہوں

اولیاء

سورہ صف کا اختتام
۱۰ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ ، ۲۰۳۰ ، ۱۳۶۵ ش
ترجمہ کا اختتام
۱۴ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ بمطابق ۱۱ جولائی ۱۹۸۷ء
برمکان حقیر قسم

سورۃ جُثَہ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی گیارہ آیات ہیں

شروع ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ - ۳۰/۲/۱۳۶۵ش

سُورَةُ جُمُعَةِ کے مضامین

- یہ سورہ حقیقت میں دو اصلی اور بنیادی محروں سرگردش کرتی ہے :
- ۱ : توحید ، صفاتِ خدا ، پیغمبرِ اسلام کی بعثت کا ہدف اور مسئلہ معاد کی طرف توجہ ۔
 - ۲ : نمازِ جمعہ کا اصلاحی نقشہ اور اس عظیم عبادت کی بعض خصوصیات ۔
- لیکن دوسرے لحاظ سے اس سورہ کے مطالب کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :
- ۱ : موجودات کی عمومی تسبیح ۔
 - ۲ : تعلیم و تربیت کے لحاظ سے پیغمبرِ اسلام کی بعثت کا ہدف ۔
 - ۳ : مومنین کو تنبیہ کہ وہ دینِ حق کے اصولوں سے منحرف نہ ہوں کہ جس طرح یہودی منحرف ہو گئے ہیں ۔
 - ۴ : موت کے عمومی قانون کی طرف اشارہ جو عالمِ بقا کی طرف ایک درپیم ہے ۔
 - ۵ : نمازِ جمعہ کا فرضیہ انجام دینے کے لیے تاکیدِ حکم ، اور اس میں شرکت کے لیے کاروبار کی تعطیل ۔
- * * *

سُورَةُ جُمُعَةِ کی تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں ۔ چاہے اسے مستقل طور پر پڑھا جائے یا یومیہ نمازوں کے ضمن میں پڑھا جائے ۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرمؐ سے مروی ہے :

”وَمَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْجُمُعَةِ اعْطِيَ عَشْرَ حَسَنَاتٍ بَعْدَ مَنْ
اَتَى الْجُمُعَةَ ، وَبَعْدَ مَنْ لَمْ يَأْتِهَا فِي امْصَارِ الْمُسْلِمِينَ
”جو شخص سورہ جمعہ کی تلاوت کرتے ، خدا اُسے بلاؤں میں سے ان لوگوں کی تعداد
سے جو نمازِ جمعہ میں شرکت کرتے ہیں اور ان لوگوں کی تعداد سے جو اس میں شرکت
نہیں کرتے ، دس گنا حسنہ بخشے گا“ ۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے :

”ہمارے شیعوں میں سے ہر مومن پر لازم ہے کہ شب جمعہ میں سورہ ”جمعہ“ اور سورہ ”الاعلیٰ“ پڑھے اور جمعہ کے ظہر میں، سورہ جمعہ اور منافقین پڑھے۔ جب وہ ایسا کرے گا تو گویا اُس نے رسول اللہؐ کا عمل انجام دیا اور خدا کے ہاں اس کا اجر و ثواب بہشت ہے۔“

خصوصیت کے ساتھ اس بات کی بہت تاکید ہوئی ہے کہ نماز جمعہ میں سورہ جمعہ اور منافقین پڑھیں۔ ان روایات میں سے بعض میں یہ آیا ہے کہ حتی الامکان اس کو ترک نہ کریں۔

باوجود اس کے کہ قرأت نماز میں سورہ توحید اور کافرون سے عدول جائز نہیں ہے، لیکن نماز جمعہ میں خصوصیت سے یہ استثناء ہوا ہے۔ یعنی ان دونوں سورتوں سے سورہ جمعہ اور منافقین کی طرف عدول جائز بلکہ مستحب شمار کیا گیا ہے۔

یہ سب امور قرآن مجید کی اس سورہ کی حد سے زیادہ اہمیت کا نشان ہیں۔

❖ ❖ ❖

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

① يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلَائِكَةُ
الْقُدُّوسُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

② هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَ
إِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝

③ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۚ وَهُوَ
الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

④ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

ترجمہ

رحمن ورحیم خدا کے نام سے

① آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اس خدا کی جو مالک

اور حاکم ہے اور ہر عیب و نقص سے مبرا اور عزیز و حکیم ہے۔

② وہی ہے کہ جس نے امتیں میں، خود انہیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا، تاکہ وہ

اس کی آیات کی ان پر تلاوت کرے ، انہیں پاک کرے اور کتاب و حکمت کی انہیں تعلیم دے ، اگرچہ وہ اس سے پہلے واضح گمراہی میں تھے ۔

③ اور وہ ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی رسول ہے جو ابھی ان سے ملحق نہیں ہوئے ، اور وہ عزیز و حکیم ہے ۔

④ یہ خدا کا فضل ہے ، وہ جسے چاہے (اور لائق دیکھے) اسے عطا کر دے ، اور خدا صاحب فضل عظیم ہے ۔

تفسیر

پیغمبر کی بعثت کا مقصد

یہ سورہ بھی خدا کی تسبیح و تقدیس سے شروع ہو رہا ہے اور اس کے صفات جمال و جلال کے ایک حصہ اور اس کے اسماء حسنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے ، جو حقیقت میں آئندہ کے مباحث کے لیے ایک مقدمہ ہے ۔ فرماتا ہے : ”آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں ، اور زبان حال و قال کے ساتھ اس کو تمام نقائص اور عیوب سے پاک شمار کرتے ہیں“ ﴿يَتَسَبَّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ ۔

”وہی خدا جو مالک و حاکم ہے ، اور ہر عیب و نقص سے مبرا ہے“ ﴿الْمَلِكُ الْقَدُّوسُ﴾ ۔

”وہ خدا جو عزیز و حکیم ہے“ ﴿الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ۔

اور اس طرح سے پہلے اس کی ”مَلَكِيَّتِ اور حاکمیت“ کی اور پھر ہر قسم کے ظلم و ستم اور نقص و عیب سے اس کے منزہ ہونے کی تاکید کرتا ہے ، کیونکہ ملوک اور بادشاہوں کے بے حساب مظالم کی طرف توجہ کرتے ہوئے لفظ ”مَلِكٌ“ سے غیر مقدس معانی کا گمان ہوتا ہے جو لفظ ”قَدُّوس“ سے پاک و پاکیزہ ہو جاتا ہے ۔

اور ایک طرف سے ”قدرت اور علم“ پر توجہ کرتا ہے ، جو حکومت کے دو اصلی رکن ہیں ، اور جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہو جائے گا کہ یہ صفات اس سورہ کے آنے والے مباحث کے ساتھ قریبی ربط رکھتے ہیں ، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مختلف آیات قرآنی میں ، حق تعالیٰ کے اوصاف کا انتخاب ، حساب و کتاب اور ایک

خاص قسم کے نظم و ربط کے ماتحت ہوتا ہے۔

موجودات عالم کی عمومی تیج کے بارے میں ہم پہلے ہی تفصیلی بحثیں کر چکے ہیں۔

✦ ✦ ✦

اس مختصر اور پرمعنی اشارہ کے بعد، جو مسئلہ توحید اور صفات خدا کی طرف ہوا ہے پیغمبر اسلام کی بعثت اور اس عظیم رسالت کے ہدف کو، جو خدا کے عزیز و حکیم اور قدوس ہونے کے ساتھ مربوط ہے، بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: ”وہی ہے کہ جس نے امیین میں انھیں میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا، تاکہ وہ ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرے۔“ (ہو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیہم آیاتہ)۔ اور اس تلاوت کے ذریعہ ”انھیں ہر قسم کے شرک، کفر، انحراف، فساد اور قرآنی سے پاک و پاکیزہ کر دے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔“ (و ینزیکہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ)۔

”اگرچہ وہ اس سے پہلے ضلال میں اور واضح گمراہی میں تھے۔“ (وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی بعثت کو ان خصوصیات کے ساتھ جن کی طریق اعجاز کے علاوہ اور کوئی تعبیر نہیں کی جاسکتی، عظمت خدا کی نشانی اور اس کے وجود کی دلیل قرار دیتے ہوئے کہتا ہے: ”خدا وہی ہے کہ جس نے اس شان کے پیغمبر کو مبعوث کیا اور آفرینش میں اس طرح کا شاہکار عالم وجود میں لایا ہے۔“

”امیین“ جمع ہے ”امی“ کی، جن کا معنی ہے ”بچہ“ جس نے کسی سے درس نہ پڑھا ہو۔ (جو ”ام“ (ماں) کے ساتھ منسوب ہے، یعنی ماں کی گود کے علاوہ اور کوئی مدرسہ نہ دیکھا ہو) اور بعض نے اسے ”اہل مکہ“ کے معنی میں سمجھا ہے، کیونکہ مکہ کو ”آم القری“ (آبادیوں کی ماں) کہتے تھے۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے، چونکہ نہ تو پیغمبر اسلام صرف اہل مکہ کے لیے مبعوث ہوئے اور نہ ہی سورہ جمعہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی یہودیوں اور دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں ”امت عرب“ کے معنی میں بھی تفسیر کی ہے، اور وہ سورہ آل عمران کی آیت ۵۷ کو اس معنی پر شاہد سمجھتے ہیں جو یہ کہتی ہے:

قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل: ”یہودیوں نے کہا کہ ہم امیین (غیر یہود) کے مقابلہ میں جہادہ نہیں ہیں۔“

اگر ہم اس تفسیر کو قبول بھی کر لیں تو بھی اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی اپنے آپ کو اہل کتاب اور پڑھے لکھے افراد سمجھتے تھے اور امت عرب کو ان پڑھ اور بے علم کہتے تھے۔ اس بناء پر پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فرماتا ہے: ”پیغمبر اسی گروہ اور اُن پڑھ طبقہ میں سے مبعوث ہوا ہے تاکہ اس کی رسالت کی عظمت کو واضح کرے اور یہ چیز اس کی حقانیت کی دلیل بنے۔ کیونکہ قرآن جیسی کتاب، ایسے عین و عظیم مطالب اور اسلام جیسی ثقافت کے ساتھ، محال ہے کہ یہ کسی بشر کی فکر کا ثمرہ ہو۔ وہ بشر بھی ایسا بشر کہ جس نے نہ تو خود کسی کے سامنے تعلیم کے لیے زانوئے ادب نہ کیا ہو اور نہ ہی علم و دانش کے ماحول میں اُس نے پرورش پائی ہو۔ یہ ایک ایسا نور ہے جو ظلمت کی سرزمین سے اٹھا ہے، اور ایک سرسبز باغ ہے جو شورزار سے نکلا ہے، اور یہ خود پیغمبر کی حقانیت کا ایک واضح معجزہ اور ایک روشن سند ہے۔

اوپر والی آیت میں اس بخت کے مقصد کا تین چیزوں میں خلاصہ کیا ہے، جن میں سے ایک تو ہمیدی پہلو رکھتی ہے، اور وہ آیاتِ الہی کی تلاوت ہے اور دوسرے دو جیسے، یعنی ”تہذیب و تزکیہ نفوس“ اور ”تعلیم کتاب و حکمت“ دو اصلی اور اہم مقاصد ہیں۔

ہاں! پیغمبر اسی لیے آئے ہیں کہ علم و دانش کے سلسلہ میں اور اخلاق و عمل کے بارے میں بھی انسان کی تربیت کریں تاکہ وہ ان دونوں پروں کے ذریعے آسمانِ سعادت کی بلندی پر پرواز کریں اور خدائی راستہ کو اختیار کر کے اس کے مقامِ قرب کو حاصل کریں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض آیاتِ قرآنی میں تو ”تزکیہ“، ”تعلیم“ پر مقدم ہے اور بعض میں ”تعلیم“، ”تزکیہ“ پر مقدم شمار ہوئی ہے۔ یعنی چار موارد میں سے تین میں تربیت، تعلیم پر مقدم ہے اور ایک مقام پر تعلیم تربیت پر مقدم ہے۔

یہ تعبیر جہاں سنائیے باقی ہے کہ یہ دونوں امور ایک دوسرے میں تاثیر متقابل رکھتے ہیں (یعنی اخلاقِ علم کی پیداوار ہے جیسا کہ علم اخلاق سے پیدا ہوتا ہے) وہاں تربیت کی اصالت کو بھی مشخص کرتی ہے، البتہ اس سے مراد حقیقی علوم ہیں نہ کہ اصطلاحی کہ جو علم کے لباس میں موجود ہیں۔

ممکن ہے کتاب و حکمت میں یہ فرق ہو کہ کتاب تو قرآن کی طرف اشارہ ہے اور حکمت، پیغمبر کے ارشاد کی طرف اشارہ ہے کہ جس کا نام شنت ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب تو اسلام کے اصل احکام کی طرف اشارہ ہو اور ”حکمت“ ان کے فلسفہ اور اسرار کی طرف راجع ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ”حکمت“ اصل میں بغرض اصلاح کسی کو منع کرنے اور روکنے کے معنی میں ہے اور گھوڑے کی لٹام کو اس وجہ سے حکمت کہتے ہیں کہ وہ اسے روک کر صحیح راستے پر ڈالتی ہے۔ اس بنا پر حکمت سے مراد عقلی دلائل ہیں۔ یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ کتاب و حکمت کا ایک دوسرے کے بعد ذکر ہو سکتا ہے کہ شاید یہ معرفت و شناخت کے دو سرچشموں یعنی ”وحی“ و ”عقل“ کی طرف اشارہ ہو یا دوسرے لفظوں میں احکام آسمانی اور تعلیماتِ اسلام کہ ان کا سرچشمہ وحی الہی ہے اور وہ عقلی لحاظ سے بھی قابلِ فہم اور لائقِ ادراک ہیں (مراد کلیات)

(احکام ہیں)

باقی رہا ”ضلال مبین“ (واضح گمراہی) جو آیت کے ذیل میں قوم عرب کے سابقہ حالات کے عنوان سے بیان ہوا ہے، زمانہ جاہلیت کی طرف ایک سرایت اور پرمعنی اشارہ ہے، جس میں گمراہی ان کے پورے معاشرے پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سے بدتر گمراہی اور کیا ہوگی کہ وہ اُنسے ”بتوں کی پوجا کرتے تھے، جنہیں وہ پتھر اور لکڑی سے اپنے ہاتھ سے تراش کر بناتے تھے اور اپنی مشکلات میں انہیں بے شعور موجودات کی پناہ لیتے تھے۔

اپنی بٹیوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ درگور کر دیتے تھے۔ یہ تو آسان تھا۔ لیکن اس عمل پر فخر و مباہات بھی کیا کرتے تھے کہ ہم نے اپنے ناموس کو بیگانوں کے ہاتھ میں نہیں جانے دیا۔

ان کے مراسم نماز و عبادت، خانہ کعبہ کے پاس تالیاں پیٹنا اور سیٹیاں بجانا تھے، یہاں تک کہ عورتیں مادر زاد بہن صورت میں خانہ خدا کے گرد طواف کرتیں اور اسے عبادت شمار کرتی تھیں۔

ہاں! پیغمبر اکرم تشریف لائے اور انہیں کتاب و حکمت کی برکت سے اس ضلال مبین اور واضح گمراہی سے نجات دلائی اور انہیں تعلیم و تربیت دی اور واقف اس قسم کے گمراہ معاشرے میں نفوذ پیدا کرنا عظمت اسلام کے دلیل اور ہمارے عظیم پیغمبر کا ایک آشکار معجزہ ہے۔

❖ ❖ ❖

لیکن چونکہ پیغمبر اسلام صرف اسی امتی قوم کے لیے مبعوث نہیں ہوئے تھے بلکہ آپ کی دعوت پورے عالم کے لیے تھی، اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”اور وہ ان دوسرے مومنین کے لیے بھی رسول ہے، جو ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہوئے۔“ (وآخرین منهم لما یلحقوا بھم)۔

وہ دوسری قومیں جنہوں نے اصحاب پیغمبر کے بعد عرصہ وجود میں قدم رکھا انہوں نے بھی پیغمبر کی تعلیم و تربیت کے مکتب میں پرورش پائی ہے اور وہ بھی قرآن اور سنت محمدی کے چشمہ زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔ ہاں! وہ بھی اس عظیم دعوت میں شامل ہیں۔

اس طرح سے اوپر والی آیت، عرب و عجم میں ان تمام اقوام کو شامل ہے جو صحابہ پیغمبر کے بعد وجود میں آئی ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب پیغمبر اکرم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو پیغمبر نے اپنا ہاتھ سلمان کے کاندھے پر رکھ کر فرمایا:

”لو کان الایمان فی الثریا لنالته رجال من ہؤلاء“

”اگر ایمان ثریا (ایک بہت دور سارہ ہے جو اس سلسلہ میں ضرب المثل ہے) میں

”آخرین“ ”امیین“ پر عطف ہے اور ”منہم“ کی ضمیر ”مومنین“ کی طرف لوٹتی ہے جو کلام کے اندر سے معلوم ہوتی ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ”یعلمہم“ کی ضمیر پر عطف ہو لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

بھی ہو تو اس گروہ (ایرانیوں) میں سے کچھ افراد اس کو وہاں سے بھی حاصل کر لیں گے۔“

چونکہ ان تمام امور کا سرچشمہ خدا کی قدرت و حکمت ہے، لہذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”وہ عزیز و حکیم ہے۔“ (وہو العزیز الحکیم)۔

اس کے بعد اس عظیم نعمت، یعنی پیغمبر گرامی اسلام کی بعثت اور ان کے ذریعے تعلیم و تربیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”یہ خدا کا فضل ہے، وہ جسے چاہے (اور لائق دیکھے اسے) عطا کر دے اور خدا فضل عظیم کا مالک ہے۔“ (ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم)۔

حقیقت میں یہ آیت سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۴ کے مانند ہی ہے جو یہ کہتی ہے: لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔ اور اس آیت کی تمام باتیں تقریباً زیر بحث آیات سے مشابہ ہیں۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ”ذلک فضل اللہ“ (یہ اللہ کا فضل ہے) اصل میں مقام نبوت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا یہ مقام جسے اس لائق دیکھتا ہے اُسے عطا فرماتا ہے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ دونوں تفاسیر کے درمیان جمع بھی ممکن ہے کہ پیغمبر کی رہبری بھی امت کے لیے اللہ کا فضل ہے اور مقام نبوت بھی پیغمبر کے لیے اللہ کا فضل ہے۔

یہ بات کئے بغیر ہی واضح ہے کہ ”من یشاء“ (جسے چاہے) کی تعبیر کا مفہوم یہ نہیں کہ خدا کسی خاص کتاب کے بغیر ہی اپنے فضل و رحمت سے کسی کو دے دیتا ہے بلکہ یہاں شہادتِ حکمت کے ساتھ توأم ہے جیسا کہ سورہ کی پہلی آیت میں خدا کی عزیز و حکیم سے توصیف بھی اسی مطلب کو واضح کرتی ہے۔

امیر المؤمنین علیؑ بھی اس فضل الہی کی تشریح میں نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

”فَانظُرُوا إِلَى مَوَاقِعِ نِعْمِ اللَّهِ عَلَيْهِمْ، حِينَ بَعَثَ إِلَيْهِمْ رَسُولًا، فَعَقَدَ بَهْلَتَهُ طَاعَتَهُمْ، وَجَمَعَ عَلَى دَعْوَتِهِ الْفَتْهَمَ، كَيْفَ نَشَرَتْ النِّعْمَةَ عَلَيْهِمْ جَنَاحَ كَرَامَتِهَا، وَاسَالَتْ لَهُمْ جُدَاوِلَ نَعِيمِهَا، وَالتَفَتَ الْمَلَأَةُ بِهِمْ فِي عَوَائِدِ بَرَكَاتِهَا فَاصْبَحُوا فِي نِعْمَتِهَا غَرَفَتَيْنِ، وَفِي

اس حدیث کو ”طبرسی“ نے ”معجم البیان“ میں، علامہ طباطبائی نے ”المیزان“ میں، سیوطی نے ”در المنثور“ میں، مخشری نے ”غنیات“ میں، قرطبی نے اپنی تفسیر میں، راغبی نے اپنی تفسیر میں اور سید قطب نے ”فی ظلال“ میں زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ یہ حدیث اصل میں صحیح بخاری سے لی گئی ہے۔

خضرة عیشہا فکمین“

”اس امت پر خدا کی نعمتوں کی طرف دیکھو! اس زمانے میں جب اپنے رسولؐ کو اُن کی طرف بھیجا تو اپنے دین کا انھیں مطیع بنا دیا اور اس کی دعوت کے ساتھ انھیں متحد کیا۔ دیکھو! اس عظیم نعمت نے اپنی کرامت کے پروہال کس طرح ان پر پھیلا دیئے، اور اپنی نعمتوں کی سنریں ان کی طرف جاری کیں اور دین حق نے اپنی تمام برکتوں کے ساتھ انھیں گھیر لیا۔ وہ اس کی نعمتوں کے درمیان غرق ہیں، اور خوش و خرم زندگی میں شادمان ہیں۔“

وہ عزیز و محترم
اشارہ کرتے
بل عظیم کا

ایک نکتہ

فضلِ خدا حساب سے ہوتا ہے

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امت کے فقراء کی ایک جماعت رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ”اے اللہ کے رسولؐ! دولت مندوں کے پاس تو خرچ کرنے کے لیے مال ہے اور ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کے پاس حج کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ان کے پاس غلاموں کو آزاد کرنے کے وسائل ہیں، ہمارے پاس نہیں ہیں۔“

پیغمبرؐ نے فرمایا: ”جو شخص سو مرتبہ ”تسبیح“ کہے وہ ایک غلام کے آزاد کرنے سے افضل ہے، اور جو شخص سو مرتبہ خدا کی تسبیح کرے وہ سو گھوڑے زین و لگام کے ساتھ جہاد کے لیے آمادہ کرنے سے افضل ہے اور جو سو مرتبہ لا الہ الا اللہ کہے، اس کا عمل تمام لوگوں کے اس دن کے عمل سے افضل ہے مگر یہ کہ کوئی اس سے زیادہ کہے۔“

من اللہ
وہ عظیم
تقریباً
کی طرف
یہ بھی امت
اکی حساب
نہ توام ہے

یہ بات انبیاء کے کانوں تک پہنچی تو وہ بھی یہ اذکار کرنے لگے۔ فقراء امت پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ”آپ کا ارشاد ان کے کانوں تک بھی پہنچ گیا ہے اور وہ بھی اس ذکر میں مشغول ہو گئے ہیں۔“

پیغمبرؐ نے فرمایا: ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء: یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے، دے دیتا ہے۔ دیکھو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تم جیسے لوگوں کے لیے ہے جو خرچ کرنے کا شوق تو رکھتے ہیں لیکن اس کا کوئی ذریعہ اپنے پاس نہیں رکھتے۔ لیکن دولت مندوں کے لیے فضل الہی کے حصول کا طریقہ، ان کا اپنے مالوں سے خرچ کرنا ہی ہے۔

یہ حدیث بھی اسی بات کی شاہد ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ فضل الہی حکیمانہ طریقہ سے ہوتا ہے۔

- ⑤ مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا
 ④ كَمَثَلِ الْجَارِ يَجْمَلُ أَسْفَارًا ۖ بئسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ
 ⑧ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ
 ⑥ قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِن زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ
 أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن
 كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۖ
 ④ وَلَا تَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمُ
 بِالظَّالِمِينَ ۖ
 ⑧ قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلْقِيكُمْ ثُمَّ
 تُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
 تَعْمَلُونَ ۖ

ترجمہ

- ⑤ جو لوگ تورات کے مکلف قرار دیئے گئے، پھر انھوں نے اس کا حق ادا نہ کیا،
 وہ اس گدھے کے مانند ہیں جو کتابوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے ہو۔ جس قوم نے آیات الہی
 کو جھٹلایا وہ بُری مثال رکھتے ہیں اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔

- ① کہہ دیجئے، اے یہودیو! اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے دوست ہو، تو پھر موت کی تمنا کرو، اگر تم سچ کہتے ہو، (تاکہ تم اپنے محبوب کی ملاقات کرو)
- ② لیکن وہ ان اعمال کی وجہ سے جو وہ آگے بھیج چکے ہیں ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ او خدا ظالموں کو ابھی طرح جانتا ہے۔
- ③ کہہ دیجئے کہ یہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، آخر کار تم سے ملاقات کر کے رہے گی۔ اس کے بعد تمہیں اس پنہاں و آشکار باتوں کی خبر رکھنے والے کی طرف پٹا دیا جائے گا اور وہ تمہیں ان باتوں سے آگاہ کرے گا جو تم کیا کرتے تھے۔

تفسیر

ایسا چوپایہ جس پر کتابیں لدی ہوں

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہودی یہ کہا کرتے تھے: اگر محمدؐ مبعوث ہوا ہے تو اس کی رسالت ہمارے لیے نہیں ہے۔ اس لیے پہلی زیر بحث آیت ان کے گوش گزار کر رہی ہے کہ اگر تم نے اپنی آسمانی کتاب کو غور سے پڑھا ہوتا اور اس پر عمل کیا ہوتا تو یہ بات نہ کرتے، کیونکہ اس میں پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کی بشارت آئی ہے۔ فرماتا ہے: ”وہ لوگ جن پر تورات نازل ہوئی اور وہ اس کے مکلف قرار دیئے گئے، لیکن انہوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا اور اس کی آیات پر عمل نہیں کیا، وہ اس گدھے کی مانند ہیں جو اپنی پشت پر کتابیں اٹھائے ہوئے ہو“ (مثل الذین حملوا التوراة ثم لم يحملوها کمثل الحمار يحمل اسفارا)۔ وہ کتاب سے سوائے اس کے بوجھ کے اور کسی چیز کا احساس نہیں کرتا اور اس کے لیے کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ پشت پر پتھر اور لکڑی اٹھائے ہوئے ہے، یا ایسی کتابیں جن میں آفریش کے دقیق ترین اسرار اور زندگی کے مفید ترین ضابطے درج ہیں۔

یہ خود پسند قوم جس نے صرف تورات کے نام یا اس کی تلاوت پر قناعت کی ہوئی ہے اور اس کے مضامین پر غور و خوض کر کے اس پر عمل نہیں کرتے، وہ اسی جانور کے مانند ہیں جو حماقت اور نادانی میں ضرب المثل اور مشہور خاص و عام ہے۔

سَلُّوْهَا
الَّذِيْنَ
نَ.
اَنْكُمْ
اِنْ
عَلِيْهَا

نَعْرِثُ
وَدَدُكُمْ

نہ کیا،
تہ الی

یہ بہترین مثال ہے جو عالم بے عمل کے لیے بیان کی جاسکتی ہے، جو علم کی مسئولیت کا بوجھ تو اپنے کاڈھے پر اٹھائے ہوئے ہے، لیکن اس کی برکات سے بہرہ اندوز نہیں ہوتا — اسی طرح سے وہ لوگ جو قرآن کے الفاظ سے تو سروکار رکھتے ہیں لیکن اس کے مطالب اور عملی تقاضوں سے بے خبر ہیں (اور مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگ بہت ہی زیادہ ہیں) وہ اسی آیت کے مصداق ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہودیوں نے اس سورہ کی پہلی آیات اور اس کے مانند دوسری آیات کو جو بخت پیغمبر کی نصرت کی گفتگو کرتی ہیں، سننے کے بعد کہا ہو کہ ہم بھی اہل کتاب ہیں، اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی بعثت کے ساتھ مفتخر ہیں۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: اس کا کیا فائدہ ہے تم نے تو تورات کے احکام کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے اور ان پر اپنے مسائل زندگی میں ہرگز عمل نہیں کیا۔

لیکن بہر حال یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ اس بات کو نظر میں رکھیں کہ یہودیوں جیسی سرنشت پیدا نہ ہو۔ یہ خدا کا عظیم فضل ہے، جو ان کے شامل حال ہوا ہے اور یہ قرآن جو ان پر نازل ہوا ہے اس لیے نہیں ہے کہ گھروں میں اس پر گرد پڑتی رہے، یا نظر بد اور آسیب کے لیے تعویذ کے طور پر حائل کر لیں، یا سفر کرنے کے موقع پر حوادث سے محفوظ رہنے کے لیے اس کے نیچے سے گزریں یا برکت اور نیک شگون کے لیے نئے گھر میں آئینہ اور بھاڑو کے ساتھ اُسے بھی بھجیں اور اس کو اس حد تک نیچے لے آئیں یا ان کی آخری ہمت یہ ہو کہ اس کی تجوید، خوبصورت قرأت و تلاوت، ترتیل اور حفظ کرنے کی سعی و کوشش کریں، لیکن ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کا معمولی سا انعکاس بھی نہ ہو اور عقیدہ و عمل میں اس کا کوئی اثر نظر نہ آئے۔

اس کے بعد اسی مثال کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: ”وہ قوم جس نے آیات الہی کی کذیب کی یقیناً وہ بُری مثال رکھتی ہے۔“ (بئس مثل القوم الذین کذبوا بآیات اللہ)۔

وہ لوگ ”بوجھ اٹھانے والے گدھے“ کے مشابہ کیوں نہ ہوں؟ حالانکہ انھوں نے نہ صرف عمل بلکہ زبان سے بھی آیات الہی کا انکار کیا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ میں اسی قوم یہود کے بارے میں آیا ہے: اَفَکَمَا جَاءَکُمْ رَسُولٌ مَّا لَا تُحِبُّوْنَ اَنْفُسَکُمْ اَسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِیْقًا کَذَبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ؟ کیا جب بھی کوئی پیغمبر تمہاری خواہش کے برخلاف آیا تو تم نے اس کے سامنے تحیر نہیں کیا پس ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا، اور ایک گروہ کو قتل کر ڈالا۔“

آیت کے آخر میں ایک مختصر اور پُر معنی جملہ میں فرماتا ہے: ”خدا تم کو قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔“ (واللہ لا یہدی القوم الظالمین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہدایت کرنا خدا کا کام ہے لیکن اس کے لیے ایک مُتقدّم اور تمہید کی ضرورت ہے، اور اس کا مُتقدّم جو حق طلبی اور حق جوئی کی روح ہے اسے انسانوں کی طرف سے فراہم ہونا چاہیے اور متمم اس مرحلہ سے ہمت دور ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہودی اپنے آپ کو برگزیدہ اور منتخب اُمت اور اصطلاح کے مطابق ”نافتہ ای بُدا بافتہ“ (یعنی سب سے الگ مخلوق) سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی تو وہ یہ دعویٰ کرتے کہ ”وہ خدا کے بیٹے ہیں اور کبھی اپنے آپ کو خدا کے مخصوص دوست بتلاتے، جیسا کہ سورۃ مائدہ کی آیت ۱۸ میں آیا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ: یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور اس کے خاص دوست ہیں (خواہ ان کی مراد مجازی اولاد ہی ہو۔)

قرآن ان بے دلیل بلند پروازیوں کے مقابلہ میں، وہ بھی ایسے گروہ کی طرف سے جو کتابِ الہی کے حامل ہونے کے باوجود اس پر عامل نہیں تھے، کہتا ہے: ”ان سے کہہ دیجئے، اے یہودیو! اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے دوست ہو، تو پھر موت کی تمنا کرو، اگر تم سچ کہتے ہو۔“ (قل یا ایہا الذین ہادوا ان زعمتم انکم اولیاء للہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین)۔ لے

کیونکہ دوست تو ہمیشہ دوست کی ملاقات کا مشتاق ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قیامت میں پروردگار کی معنوی ملاقات ہوگی۔ جب عالم دنیا کے حجاب ہنٹ جائیں گے اور شہوات اور ہوس رانیوں کے غبار چھٹ جائیں گے تو پردے اٹھ جائیں گے اور انسان چشم دل سے محبوب کا جمال دلآوارہ دیکھے گا اور اس کے قرب کی بساط پر قدم رکھے گا اور ”فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر“ (صاحب اقتدار شہنشاہ کے قرب میں صداقت کی جگہ میں) کا مصداق بن کر حریم دوست میں راہ پائے گا۔

اگر تم سچ کہتے ہو، اور اس کے دوست خاص ہو تو پھر دنیا کی زندگی کے ساتھ اس قدر کیوں چمٹے ہو گئے ہو؟ موت سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اس دعوے میں سچے نہیں ہو۔

قرآن نے اسی بات کو ایک دوسری تعبیر کے ساتھ سورۃ بقرہ کی آیت ۹۶ میں بھی بیان کیا ہے، جہاں کہتا ہے :

وَلتجدنهم احرص الناس على حياة ومن الذين اشرکوا يود احدهم لو يمسر الف سنة وما هو بمزحزجه من العذاب ان يعمر والله بصير بما يعملون : ”تم انھیں اس دُنیاوی زندگی کے لیے سب سے زیادہ حرصیں پاؤ گے۔ یہاں تک کہ مشرکین سے بھی زیادہ حرصیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس تک زندہ رہے، حالانکہ یہ طولانی زندگی اُسے عذابِ الہی سے نہیں بچھڑا سکے گی اور خدا اُن کے اعمال کو دیکھتا ہے۔“

اس کے بعد ان کے موت سے ڈرنے کی اصل وجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”وہ اپنے ان اعمال کی وجہ سے، جو انھوں نے آگے پیچھے ہوئے ہیں ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے۔“ (ولا یتمنونه ابداً)

بما قدمت ایدہم۔

”لیکن خدا ظالموں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے۔“ (واللہ علیہم بالظالمین)۔

حقیقت میں انسان کا موت سے خوف دو عواقل میں سے کسی ایک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یا تو وہ موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتا اور موت کو فنا و نیستی کا ایک ہیولا اور عدم کا ظلمت کدہ خیال کرتا ہے۔ یہ ایک طبعی اور فطری امر ہے کہ انسان نیستی اور عدم سے گریز کرے۔

اور یا وہ موت کے بعد والے عالم کا عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن وہ اپنے نامہ اعمال کو ایسا تاریک و سیاہ دیکھتا ہے کہ جس کی وجہ سے اس عظیم دادگاہ اور عدالت میں حاضر ہونے سے ڈرتا ہے۔

اور چونکہ یہودی معاد اور موت کے بعد کے جہان کا عقیدہ رکھتے تھے، لہذا طبعی طور پر ان کے موت سے ڈرنے کا عامل دوسری چیز تھی۔

”ظالمین“ کی تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو یہودیوں کے تمام ناروا اعمال، خدا کے عظیم پیغمبروں کو قتل کرنے سے لے کر ان کی طرف ناروا نسبتوں، لوگوں کے حقوق غضب کرنے، ان کے اموال ہتھیانے، سزاؤں غارت کرنے اور انواع و اقسام کے اخلاقی مفاسد سے آلودہ ہونے تک کو شامل ہے۔

لیکن مسئلہ طور پر یہ وحشت و اضطراب کسی مشکل کو حل نہیں کرتا۔ موت ایک ایسا اونٹ ہے جو تمام گھروں کے دروازے پر بیٹھا ہے۔ لہذا قرآن کہتا ہے: ”اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ یہ موت جس سے تم بھاگتے ہو آخر کار تم سے ملاقات کرے گی۔“ (قل ان الموت الذی تفرون منه فائدہ ملاقیکو)۔

اس کے بعد تمہیں اس کے پاس لے جایا جائے گا جو پنہاں و آشکار سے باخبر ہے۔ اور تم جو کچھ عمل کیا کرتے تھے وہ تمہیں اس کی خبر دے گا۔ (ثم تردون الی عالم الغیب والشہادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون)۔ موت کا قانون اس عالم کے قوانین میں سب سے زیادہ عام اور سب سے زیادہ وسیع ہے، خدا کے عظیم پیغمبر اور مقرب فرشتے سب مرجائیں گے اور خدا کی پاک ذات کے سوا اس جہان میں کوئی باقی نہیں رہے گا: کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام“ لہ

موت اور دادگاہ عدل الہی میں حاضر ہو کر حساب دینا بھی اس عالم کے مسئلہ قوانین میں سے ہے اور خدا بندوں کے تمام اعمال سے دقیقاً آگاہ بھی ہے۔

اس بناء پر اس خوف و دہشت کے ختم ہونے کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ اعمال کی پاکیزگی اور گناہ کی آنکھ سے دل کو پاک صاف کرنا ہے۔ کیونکہ جس کا حساب پاک صاف ہو اُسے محاسب سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس یہی ایک صورت ہے جس میں علی کی طرح کہا جاسکتا ہے:

”ہیہات بعد اللتیا واللتی واللہ لابن ابی طالب انس بالموت
من الطفل بشدی امہ“

”ہیہات! ان تمام جنگوں اور حوادث کے بعد، خدا کی قسم! ابوطالب کا بیٹا موت سے
اس سے بھی زیادہ انس اور لگاؤ رکھتا ہے جتنا انس بچے کو اپنی ماں کی پھاتی سے
ہوتا ہے۔“ لے

اور جب آپ کی پیشانی مبارک ’اشقی الآخرین‘ (ابن لجم) کی ضرب سے شکافہ ہوئی تو باواز بلند فرمایا: ”فنت
ورب الکعبہ“ کعبہ کے پروردگار کی قسم! میں کامیاب ہوا اور نجات پا گیا۔

❖ ❖ ❖

چند نکات

: عالم بے عمل

اس میں شک نہیں کہ تحصیل علم میں بہت زیادہ مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن یہ مشکلات چاہے جتنی بھی
ہوں، علم سے حاصل ہونے والی برکات کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ انسان کی بیچارگی اس دن
ہوگی جب وہ تحصیل علم کی زحمت کو تو برداشت کرے لیکن اس کی برکتوں کا اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو، وہ
ٹھیک اس چوپائے کی مانند ہوتا ہے، جو کتابوں کی ایک گانٹھ کا وزن تو اپنی پشت پر محسوس کرتا ہے لیکن
اس کے مطالب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔

بعض تعبیرات میں عالم بے عمل کو ”شجر بلا ثمر“ (بغیر پھل کے درخت) یا ”سحاب بلا مطر“ (بغیر بارش کے
بادل) یا اس شمع سے جو جلتی ہے اور اپنے اطراف کو روشن کرتی ہے لیکن خود ختم ہو جاتی ہے یا اس
چوپائے سے جسے خراس کے ساتھ جوت دیتے ہیں، وہ مسلسل زحمت اٹھاتا اور راتہ طے کرتا رہتا ہے،
لیکن چونکہ وہ اپنے ہی چکروں میں گھومتا ہے لہذا وہ کوئی راتہ طے نہیں کرتا اور کہیں بھی نہیں پہنچتا۔ اسی قسم
کی دوسری تشبیہیں دی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک عالم بے عمل کی منحوس سرفروشت کے کسی ایک گوشے
کو بیان کرتی ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس قسم کے علماء کی مذمت میں دل ہلا دینے والی تعبیریں آئی ہیں۔ منجملہ ان کے
حضرت رسولؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

”مَنْ اَزَادَ عِلْمًا وَلَمْ يَزِدْ هُدًى لَمْ يَزِدْ مِنْ اِلٰهِ

الْاٰبَعْدَا“

بلکہ توبہ البلانۃ خطبہ ۵

”جس شخص کا علم زیادہ ہو لیکن اس کی ہدایت میں اضافہ نہ ہو تو یہ علم اُسے خدا سے دوری کے سوا کچھ نہیں دیتا۔“^۱
دوسری جگہ امیر المومنین علیؑ سے منقول ہے :

”العلم مقرون بالعمل ، فمن علم عمل ، والعلم يهتف بالعمل فان اجابه والا ارتحل عنده۔“^۲

”علم عمل کے ساتھ توام ہے جو شخص جس چیز کو جانتا ہے اُسے اس پر عمل کرنا چاہیے۔ علم فریاد کرتا اور عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اگر وہ اُسے مثبت جواب نہ دے تو علم اس کے ہاں سے کوچ کر جاتا ہے۔“

اصولی طور پر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم بے عمل ”عالم“ کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ حضرت رسولؐ فرماتے ہیں :

”لا يكون المرء عالمًا حتى يكون بعلمه عاملاً“^۳

اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ عالم کی تمام ذمہ داریوں کے بوجھ کو اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے ہوتا ہے جبکہ علم کی خصوصیات سے بہرہ مند نہیں ہوتا، جیسا کہ امیر المومنین علیؑ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک خطبہ کے ضمن میں فرمایا :

”أيها الناس ! اذا علمتم فاعملوا بما علمتم لعلكم تتقون ، ان العالم العامل بغيره كالجاهل المائر الذي لا يستفيق عن جهله بل قد رأيت ان الحجة عليه اعظم والحسرة ادوم۔“^۴

”اے لوگو! جب تم کسی چیز کو جان لو تو اس پر عمل کرو تا کہ ہدایت پاؤ، کیونکہ وہ عالم جو اپنے علم کے برخلاف عمل کرتا ہے اس سرگرداں جاہل کی طرح ہے جو اپنی جہالت سے کبھی ہوش میں نہیں آتا۔ بلکہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس قسم کے عالم پر حجت بہت بھاری اُو اُس کے لیے حسرت دائمی ہے۔“

^۱ مجتہ البیضاء جلد ۱ ص ۱۲۵، ۱۲۶

^۲ ”منہج البلاغۃ“ کلمات قصار ، جلد ۱ ص ۳۶۶

^۳ مجتہ البیضاء جلد ۱ ص ۱۲۵، ۱۲۶

^۴ اصول کافی جلد ۱ باب استعمال العلم حدیث ۶

بلاشبک و شبہ اس قسم کے علماء اور دانشوروں کا وجود ایک معاشرے کے لیے بہت بڑی مصیبت ہے۔
جن لوگوں کا عالم و دانشور اس قسم کا ہو ان کی سرنوشت خطرناک ہے۔ بقول شاعر:
وراعی الشاة يحصى الذئب عنھا
فكيف اذا الرعاة لها ذئاب
”چرواہا بکریوں کو بھیڑیے سے بچاتا ہے۔
لیکن ان بکریوں کی حالت پر افسوس ہے کہ جن کے چرواہے ہی بھیڑیے بن جائیں۔“

شان اجاہ

۲ : میں موت سے کیوں ڈروں؟

نہیں ہے۔

عام طور پر اکثر لوگ موت سے ڈرتے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو موت کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دیتا ہے، اسے پورے نور سے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور رنگ برنگی گودڑی دے کر جادوئی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔

نے ہوئے

کہ آپ نے

لیکن آئیے دیکھتے ہیں کہ موت اور اس کی علامات، یہاں تک کہ اس کا نام بھی ایک گروہ کے لیے کیوں تکلیف دہ ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے اور اگر ایمان رکھتے بھی ہیں تو یہ ایمان ایک گہرے یقین کی صورت میں نہیں اور وہ ان کے افکار و حالات پر اچھی طرح سے متاثر نہیں ہوا ہے۔

فنا و نیستی سے انسان کی وحشت طبعی اور فطری ہے، انسان رات کی تاریکی تک سے ڈرتا ہے، کیونکہ ظلمت، نور کی نیستی ہے۔ انسان بعض اوقات مردہ سے بھی ڈرتا ہے کیونکہ وہ بھی فنا کے راستے پر گامزن ہے۔ لیکن اگر انسان اپنے تمام وجود کے ساتھ یہ باور کر لے: ”الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر“ ”دنیا مومن کا زندان اور کافر کے لیے بہشت ہے“

اگر انسان باور کر لے کہ یہ جسم خاکی اس کے طائر روح کے لیے ایک قفس ہے، جب یہ قفس ٹوٹ جائے گا تو وہ آزاد ہو جائے گا اور کوئے دوست کی فضا میں پرواز کرے گا۔

اگر وہ یہ باور کر لے کہ ”حجاب چہرہ جان می شود غبار تنش“ اُس کے بدن کا غبار جان کے چہرے کا حجاب ہے تو یقیناً وہ اس وقت کے انتظار میں ہو گا کہ جب اس چہرے سے پردہ ہٹ جائے گا۔

اگر انسان یہ باور کر لے کہ طائر روح عالم خاک سے نہیں باغ ملکوت سے ہے اور صرف دو تین دن کے لیے

اس کے بدن کو اُس کا قفس بنایا گیا ہے۔

”ہاں! اگر موت کے بارے میں انسان کا نظریہ اس طرح کا ہو تو وہ ہرگز موت سے نہیں ڈرے گا جبکہ وہ ارتقاء کی راہ طے کرنے کے لیے زندگی چاہتا ہے۔“

اسی لیے حدیث عاشورہ میں آیا ہے: امام حسین اور ان کے انصار پر دشمن کے محاصرہ کا گھیرا جتنا تنگ ہوتا اور دشمن کا دباؤ بڑھتا جاتا تھا، اُتنے ہی اُن کے چہرے زیادہ چمکتے اور کھلتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے اصحاب میں سے بوڑھے مُسکرا رہے تھے، جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کیوں مُسکرا رہے ہیں تو ان کا جواب تھا: ”ہم چند لمحہ کے بعد ہی شریعت شہادت نوش کر لیں گے اور پھر حور العین سے ہم آغوش ہوں گے۔“

موت کے خوف کا ایک اور سبب، دُنیا کے ساتھ حد سے زیادہ دل لگانا ہے، کیونکہ موت اس کے اور اس کی محبوب دُنیا کے درمیان جدائی ڈال دے گی۔ جبکہ وہ تمام امکانات و وسائل جو اُس نے عیش و نوش کی زندگی کے لیے فراہم کیے، تھے ان سے دل کو ہٹانا اس کے لیے طاقت فرما ہے۔

خوف کا تیسرا عامل نامہ اعمال کا نیکیوں سے خالی اور بُرائیوں اور سینئات سے پُر ہونا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ”میں موت کو کیوں پسند نہیں کرتا؟“

آپ نے فرمایا: کیا تیرے پاس کچھ دولت ہے؟

اس نے عرض کیا: جی ہاں!

آپ نے فرمایا: کیا تو نے اس میں سے کوئی چیز آگے بھی بھیجی ہے؟

اس نے عرض کیا: نہیں!

آپ نے فرمایا: یہی وجہ ہے کہ تو موت کو دوست نہیں رکھتا۔ کیونکہ تیرا نامہ اعمال حسرت سے خالی ہے۔

ایک دوسرا شخص ابوذر کے پاس آیا اور یہی سوال کیا کہ ہم موت سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

”لأنكم عمرتكم الدنيا، وخرتكم الآخرة، فتكروهن ان تنتقلوا من عمران الى خراب“۔ یہ اس بناء پر ہے کہ تم نے دُنیا کو آباد کر رکھا ہے اور آخرت کو ویران بنایا ہوا ہے، لہذا یہ بات طبعی اور فطری ہے کہ تم آباد جگہ کو چھوڑ کر ویران و برباد جگہ کی طرف جانا پسند نہیں کرتے۔“

❖ ❖ ❖

۹) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

۱۰) فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

۱۱) وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝

ترجمہ

۹) اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے اذان کہی جائے تو ذکرِ خدا کی طرف دوڑ کر آؤ اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

۱۰) اور جب نماز ختم ہو جائے تو تم آزاد ہو۔ زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کا فضل طلب کرو اور خدا کو بہت بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

۱۱) اور جب وہ کوئی تجارت یا کھیل تماشائی چیز کو دیکھتے ہیں تو اُدھر کو چل کھڑے ہوتے

جبکہ وہ

تنگ

نہ کر

ہیں تو

آغوش

س کے

نوش کی

پسند

مالی ہے

نے فرمایا:

بناء پر

وجہ

ہیں اور تجھے اپنی حالت میں کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، آپ کہہ دیجئے جو کچھ خدا کے پاس ہے، وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور خدا بہترین روزی دینے والا ہے۔

❖ ❖ ❖

شان نزول

ان آیات کے شان نزول میں خصوصاً ”واذا سراوا تجارۃ“ کے بارے میں مختلف روایات نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب ایک ہی مطلب کی خبر دیتی ہیں کہ : ایک سال مدینہ کے لوگ خشک سالی، قحط اور اجناس کے نرخ کی زیادتی میں گرفتار تھے تو وحیہ ایک قافلہ کے ساتھ شام سے یہاں آن پہنچا، وہ اپنے ساتھ غذائی اشیاء لے کر آیا تھا۔ اُس روز جمعہ کا دن تھا اور پیغمبر نماز جمعہ کے خطبہ میں مشغول تھے کہ انھوں نے معمول کے مطابق قافلہ کے ورود کے اعلان کے لیے طبل بجایا اور دوسرے آلات موسیقی بھی بجائے تو لوگ تیزی کے ساتھ بازار میں پہنچ گئے۔ اس موقع پر جو مسلمان مسجد میں نماز کے لیے جمع ہوئے ہوئے تھے، انھوں نے خطبہ سُننا چھوڑ دیا اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بازار کی طرف چل پڑے، صرف بارہ مرد اور ایک عورت مسجد میں باقی رہ گئے۔ دو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور جانے والوں کی سخت مذمت کی (پیغمبر نے فرمایا : اگر یہ چھوٹا سا گروہ بھی چلا جاتا تو ان سب پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوتی۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

ہفتہ کا عظیم ترین عبادی سیاسی اجتماع

گزشتہ آیات میں توحید، نبوت، معاد اور دُنیا پرست یہودیوں کی مذمت کے بارے میں مختصر مباحث آئے تھے، زیر بحث آیات ایک اہم ترین اسلامی فریضہ کے بارے میں ہیں جو ایمان کی بنیادوں کی تقویت کے لیے حد سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے اور ایک لحاظ سے سورۃ کا ہدف اصلی یہی ہے، یعنی نماز جمعہ، اور یہ آیات اس کے احکام کو بیان کرتی ہیں۔

سب سے پہلے تمام مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان کہی جائے تو ذکر خدا (خطبہ و نماز) کی طرف جلدی سے آؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو“ (یا ایہا الذین آمنوا اذا نودى للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا الى ذكر الله وذروا البيع ذالک خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔

”نودی“ ”نہدا“ کے مادہ سے پکارنے کے معنی میں ہے۔ اور یہاں اس سے مراد اذان ہے، کیونکہ اسلام میں نماز کے لیے اذان کے علاوہ اور کوئی ندا نہیں ہے جیسا کہ سورہ مدہ کی آیت ۵۸ میں آیا ہے: ”واذا نادیتم الى الصلوة اتخذوها هزواً ولعباً ذالک بانهم قوم لا یهتملون“ جب تم لوگوں کو نماز کے لیے پکارتے ہو (اور اذان کہتے ہو) تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور اسے کھیل تماشاً سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک بے عقل قوم ہیں۔

اس طرح سے جس وقت نماز جمعہ کی اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو لوگوں کا فرض ہے کہ وہ کاروبار کو چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑ کر آئیں کہ جو اہم ترین ذکر خدا ہے۔

ذالک خیر لکم کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس موقع پر کاروبار کو چھوڑ کر نماز جمعہ کو قائم کرنا مسلمانوں کے لیے بہت ہی نفع کی بات ہے، بشرطیکہ وہ اس بارے میں ٹھیک طور پر غور و فکر کریں، ورنہ خدا تو سب سے بے نیاز اور سب پر مہربان ہے۔

یہ جملہ نماز جمعہ کے فلسفہ اور فوائد کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے۔ اس کے بارے میں ہم انشاء اللہ نجات کی بحث میں گفتگو کریں گے۔

البتہ خرید و فروش کو ترک کرنا ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ہر مزاحم کام کو شامل ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ جمعہ کے دن کو جمعہ کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ تو اس کی وجہ اس دن لوگوں کا نماز جمعہ کے لیے جمع اور اکٹھا ہونا ہے، اس مسئلہ کی ایک مختصر سی تاریخ ہے جو نکات کی بحث میں آنے گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض اسلامی روایات میں روزانہ کی نماز کے بارے میں یہ آیا ہے: ”اذا اقيمت الصلوة فلا تأتوها و انتم تسعون و أتوها و انتم تمشون و علیکم السکينة“۔ جب نماز (دیومیہ) کھڑی ہو جائے تو نماز میں شرکت کے لیے دوڑو نہیں اور آرام کے ساتھ قدم اٹھاؤ۔ لیکن نماز جمعہ کے بارے میں اوپر والی آیت یہ کہتی ہے: فاسعوا (دوڑ کر آؤ) یہ نماز جمعہ کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے۔

ذکر اللہ سے مراد پہلے تو نماز ہی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ نماز جمعہ کے خطبات بھی کہ جن میں خدا ہی کا

ذکر ہوتا ہے حقیقت میں نماز جمعہ کا ایک حصہ ہیں، اس بناء پر ان خطبوں میں شرکت کے لیے بھی دوڑ کر آنا چاہیئے۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: ”جب نماز ختم ہو جائے تو پھر تم آزاد ہو، زمین میں چلو پھرو اور خدا کا فضل تلاش کرو اور خدا کو بہت بہت یاد کرو تاکہ تم نجات پاؤ“ (فاذا قضیت الصلوة فانقشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون)۔

اگرچہ ”ابتغوا من فضل اللہ“ (اللہ کا فضل طلب کرو) کا جملہ یا قرآن مجید میں اس سے مشابہ تعبیریں غالباً روزی طلب کرنے اور کسب و تجارت کے معنی میں آئی ہیں، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس جملہ کا مفہوم وسیع ہے اور کسب و کار اس کے مصداق میں سے ایک ہے، اسی لیے بعض نے عیادت مریض، زیارت مومن، یا تحصیل علم و دانش کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے، اگرچہ یہ ان میں بھی منحصر نہیں ہے۔

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ ”زمین میں پھیل جانے“ اور ”روزی طلب کرنے کا امر“ امر و جہی نہیں ہے، بلکہ اصطلاح کے مطابق یہ ”امر و جہد از حظر“ ونہی ہے اور جواز کی دلیل ہے، لیکن بعض نے اس تعبیر سے یہ مطلب لیا ہے کہ نماز جمعہ کے بعد روزی کی تحصیل و طلب ایک مطلوبیت اور برکت رکھتی ہے۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نماز جمعہ کے بعد بازار میں تشریف لے جاتے تھے۔

”واذکروا اللہ کثیرا“ کا جملہ ان تمام نعمتوں کے لیے جو خدا نے انسان کو دی ہیں، خدا کو یاد کرنے کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے یہاں ”ذکر“ کو ”فکر“ کے معنی سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ ”فکر ساعة خیر من عبادۃ سنۃ“ ایک ساعت غور و فکر کرنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ لے

اور بعض نے اس کو بازاروں میں معاملات کے وقت، خدا کی طرف توجہ اور اصول حق و عدالت سے انحراف نہ کرنے سے بھی تعبیر کیا ہے۔

لیکن واضح ہے کہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ان تمام مطالب کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ ذکر کی روح فکر ہے اور وہ ذکر جو فکر کے بغیر ہو لعلقہ زبانی سے زیادہ نہیں اور جو بات فلاح و نجات کا سبب ہے وہ وہی ذکر ہے جو تمام حالات میں غور و فکر کے ساتھ ہو۔

اصولی طور پر بار بار ”ذکر“ کرنے سے خدا کی یاد انسان کی جان کی گہرائیوں میں راسخ ہو جاتی ہے اور غفلت اور بے خبری کی جڑیں جل جاتی ہیں جو ہر قسم کے گناہ کا اصلی عامل ہوتی ہیں۔ پس یوں انسان فلاح و نجات کے راستے پر چلنے لگتا ہے اور ”لعلکم تفلحون“ کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے۔

❖ ❖ ❖

زیر بحث آخری آیت میں ان لوگوں کو جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو نماز جمعہ کے وقت چھوڑ دیا اور آنے والے قافلہ سے مال خریدنے کے لیے بازار کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے تھے، شدت کے ساتھ ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے:

”جب وہ کوئی تجارت یا کھیل ماش کی بات دیکھتے ہیں تو پراگندہ ہو جاتے ہیں اور آپ کو (نماز جمعہ کا خطبہ پڑھنے کے دوران) کھڑا ہوا چھوڑ کر چل دیتے ہیں“ (وإذا سראوا تجارة أو لهما أفضوا إليها وتركوا قائماً)۔

لیکن ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ لہو و لعب اور تجارت سے بہتر ہے اور خدا بہترین روزی دینے والا ہے۔ (قل ما عند الله خير من اللہ و من التجارة واللہ خیر الوانقین)۔

نماز جمعہ میں حاضر ہونے اور پیغمبر کے مواعظ و نصائح سننے سے جو خدائی اجر و ثواب اور برکتیں اور معنوی و روحانی تربیت تمہیں حاصل ہوتی ہے۔ ان سب برکات کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ تمہاری روزی منقطع ہو جائے گی تو تم غلطی پر ہو۔ خدا بہترین روزی دینے والا ہے۔

لہو کی تعبیر، طبل اور ان تمام دوسرے آلات لہو کی طرف اشارہ ہے جو وہ لوگ مدینہ میں کسی نئے قافلہ کے وارد ہونے کے وقت بجایا کرتے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کے آنے کی خبر اور اعلان بھی ہوتا تھا اور مال و متاع کو بیچنے کے لیے تشہیر بھی، جیسا کہ وہ منڈیاں اور بازار، جو مغربی طرز کے ہیں، ان میں بھی اس کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

”انفضوا“ کی تعبیر، پراگندہ ہونے، نماز جمعہ سے منصرف ہونے اور قافلہ کا رخ کرنے کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ شان نزول میں بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت ”وحیہ“ کا قافلہ مدینہ میں وارد ہوا (اس نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) تو اس نے طبل اور دوسرے آلات لہو کے ساتھ لوگوں کو بازار کی طرف بلایا۔ مدینہ کے لوگ، یہاں تک کہ وہ مسلمان بھی جو مسجد میں پیغمبر کا خطبہ جمعہ سن رہے تھے، اس کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور مسجد میں صرف تیرہ مرد اور ایک روایت کے مطابق اس سے بھی کم افراد باقی رہ گئے۔

”الیہا“ کی ضمیر تجارت کی طرف لوٹتی ہے، یعنی وہ مال تجارت کی طرف دوڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لہو و لعب ان کا اصلی ہفت نہیں تھا بلکہ وہ تو قافلہ کے وارد ہونے کے اعلان کی ایک تمہید تھی۔ یا مال تجارت کے پروپیگنڈہ میں زور پیدا کرنے کے لیے تھا۔

”قائماً“ کی تعبیر باقی ہے کہ پیغمبر کھڑے ہو کر نماز جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، جیسا کہ جابر بن سمرہ کی حدیث میں نقل ہوا کہ وہ کہتا ہے: ”میں نے پیغمبر کو خطبہ کی حالت میں کبھی بھی بیٹھ جوتے نہیں دیکھا اور جو شخص یہ کہے کہ آپ بیٹھ کر خطبہ پڑھتے تھے تو اسے جھوٹا سمجھو“۔

یہ روایت بھی آئی ہے: ”لوگوں نے عبد اللہ بن مسعود سے پوچھا: ”کیا پیغمبر کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے؟ عبد اللہ نے کہا: کیا تم نے نہیں سنا کہ خدا فرماتا ہے: و ترکوا قائماً اور وہ تجھے کھڑا ہوا ہی چھوڑ کر چل

دیئے۔

تفسیر ”در المنثور“ میں آیا ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے نماز جمعہ کا خطبہ بیٹھ کر دیا، وہ معاویہ تھا۔

✦ ✦ ✦

چند نکات

۱: اسلام میں پہلی نماز جمعہ

بعض اسلامی روایات میں آیا ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں نے پیغمبرؐ کی ہجرت سے پہلے باہم مل کر بات کی اور کہا کہ یہودی ہفتہ میں ایک دن (بروز ہفتہ) اجتماع کرتے ہیں اور عیسائی بھی اجتماع کے لیے (اتوار کا) ایک دن رکھتے ہیں۔ لہذا ہم بھی ایک دن مقرر کر لیتے ہیں تاکہ اس میں جمع ہو کر ذکر خدا کریں اور اس کا شکر بجالائیں۔ انھوں نے ہفتہ سے پہلے کا دن کہ جسے اُس زمانہ میں ”یوم العروہ“ کہتے تھے، اس مقصد کے لیے منتخب کیا اور (بزرگانِ مدینہ میں سے ایک شخص) اسعد بن زرارہ کے پاس گئے۔ اس نے ان کے ساتھ مل کر جماعت کی صورت میں نماز ادا کی اور انھیں وعظ و نصیحت کی۔ پس وہی دن ”روزِ جمعہ“ کے نام سے موسوم ہو گیا کیونکہ وہ مسلمانوں کے اجتماع کا دن تھا۔

”اسعد“ کے حکم پر ایک گوسفند ذبح کیا گیا اور سب نے دوپہر اور شام کا کھانا اسی گوسفند سے کھایا، کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔

یہ پہلا جمعہ تھا جو اسلام میں پڑھا گیا۔

لیکن وہ پہلا جمعہ جو حضرت رسولؐ نے اپنے اصحاب کے ساتھ پڑھا وہ اس وقت پڑھا گیا جب آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ جب آپؐ مدینہ میں وارد ہوئے تو اس دن پیر کا دن بارہ ربیع الاول اور ظہر کا وقت تھا۔ حضرت چار دن تک ”قبا“ میں رہے اور مسجد قبا کی بنیاد رکھی، پھر جمعہ کے دن مدینہ کی طرف روانہ ہوئے (قبا اور مدینہ کے درمیان فاصلہ بہت ہی کم ہے اور موجودہ وقت میں قبا مدینہ کا ایک داخلی محاذ ہے) اور نمازِ جمعہ کے وقت آپؐ محلہ ”بنی سالم“ میں پہنچے۔ وہاں نمازِ جمعہ ادا فرمائی اور یہ اسلام میں پہلا جمعہ تھا جو حضرت رسولؐ نے ادا کیا۔ جمعہ کی اس نماز میں آپؐ نے خطبہ بھی پڑھا، جو مدینہ میں آنحضرتؐ کا پہلا خطبہ تھا۔

۱۔ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۶ لے تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۲۲۲۔ اس روایت کو دوسرے مفسرین مثلاً ”آلوسی“ نے ”روح المعانی“ میں

اور قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ لے مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۶

ایک محدث نے ”عبد الرحمن بن کعب“ سے نقل کیا ہے کہ میرا باپ جب جمعہ کی اذان کی آواز سنتا، تو اسعد بن زرارہ کے لیے رحمت کی دعا کیا کرتا تھا۔ جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے ہمارے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔ میں نے کہا: اُس وقت کتنے افراد حاضر تھے؟ اس نے کہا: صرف چالیس نفر لے

۲: نماز جمعہ کی اہمیت

سب سے پہلے تو اس عظیم اسلامی فرضیہ کی اہمیت کی بہترین دلیل اسی سورہ کی آیات ہیں جو تمام مسلمانوں اور اہل ایمان کو یہ حکم دیتی ہیں کہ جمعہ کی اذان سننے ہی اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ ہر قسم کے کاروبار اور رکاوٹ ڈالنے والے کام چھوڑ دیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی سال لوگ غذائی اشیاء کی کمی میں گرفتار ہوں اور کوئی ایسا قافلہ آ جائے جو ان کی ضرورت کی چیزیں ساتھ لے کر آیا ہو تو وہ اس کی طرف نہ جائیں اور نماز جمعہ کے اعمال کو جاری رکھیں۔ اسلامی روایات میں بھی اس سلسلہ میں بہت سی تاکیدیں وارد ہوئی ہیں، ان میں سے ایک خطبہ ہے کہ جسے موافق و مخالف سب نے پیغمبر گرامی سے نقل کیا ہے۔ اس میں آیا ہے:

ان الله تعالى فرض عليكم الجمعة فمن تركها في حياي او بعد موت
استغنافا بها او جوعا لها فلا جمع الله شمله، ولا بارك له في امره الا ولا
صلوة له، الا ولا زكوة له، الا ولا حج له الا ولا صوم له، الا ولا بر له حتى يتوب.
”خدا نے نماز جمعہ تم پر واجب کی ہے۔ اگر کوئی شخص اسے میری زندگی میں یا میری وفات کے بعد
استغنافا یا انکار کے طور پر ترک کرے تو خدا اُسے پریشان حال کر دے گا اور اس کے کسی کام میں برکت
نہیں دے گا۔ جان لو کہ اُس کی نماز قبول نہیں ہے اس کی زکوٰۃ قبول نہیں ہے اور جان لو کہ اُس کے نیک
اعمال قبول نہیں ہیں جب تک کہ اپنے اس عمل سے توبہ نہ کرے۔“

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مروی ہے:

صلوة الجمعة فرضية، والاجتماع اليها فرضية مع الامام، فان ترك
رجل من غير علة ثلاث جمع فقد ترك ثلاث فرائض، ولا يدع ثلاث
فرائض من غير علة الا منافق:

”نماز جمعہ ایک فرضیہ ہے اور اس کا اجتماع امام (مضموم) کے ساتھ واجب ہے۔ جب کوئی
شخص تین جمعے بغیر کسی عذر کے ترک کر دے تو اس نے تین فرضیہ ترک کیے ہیں۔ اور تین فرائض بغیر
کسی علت کے ترک نہیں کرتا مگر منافق۔“

ایک اور حدیث میں حضرت رسولؐ سے منقول ہے :

”من اتى الجمعة ايمانا واحتسابا استأنف العمل“

”جو شخص از روئے ایمان خدا کے لیے نماز جمعہ میں شرکت کرے تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور وہ اپنے عمل کا سلسلہ نئے سرے سے شروع کرے گا۔“

اس سلسلے میں روایات بہت زیادہ ہیں، اور ان سب کا بیان کرنا باعث طوالت ہو گا۔ ہم یہاں ایک اور حدیث نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

ایک شخص حضرت رسولؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا : ”یا رسول اللہ! میں کئی مرتبہ حج کے لیے تیار ہوا ہوں لیکن مجھے توفیق حاصل نہ ہوئی۔ اس پر آپ نے فرمایا :

”عليك بالجمعة فانها حج المساكين“

”تو نماز جمعہ پڑھا کر کیونکہ مساکین کا حج یہی ہے۔“

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حج کے عظیم اسلامی اجتماع کے بہت سے برکات نماز جمعہ کے اجتماع میں موجود ہوتے ہیں۔

البتہ یہ بات مد نظر رہے کہ شدید مذمتیں نماز جمعہ کے ترک کرنے کے بارے میں آئی ہیں جن میں جمعہ کے ترک کرنے والوں کو منافقین کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ جب نماز جمعہ واجب عینی ہو۔ یعنی امام معصوم کے حضور اور ان کے مبطوٰۃ الید ہونے کا زمانہ ہو۔ لیکن چونکہ زمانہ غیبت میں یہ واجب تنخیری ہے (نماز جمعہ اور نماز ظہر کے درمیان اختیار ہے) اور بطور استخفاف و انکار بھی ترک نہ ہو تو پھر وہ انہ مذمتوں کا مشمول نہیں ہو گا۔ اگرچہ نماز جمعہ کی عظمت اور اس کی حد سے زیادہ اہمیت اس حالت میں بھی محفوظ ہے۔ (اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔)

۳ : نماز عبادی سیاسی جمعہ کا فلسفہ

نماز جمعہ ہر چیز سے پہلے ایک عظیم اجتماعی عبادت ہے اور عبادات کی عمومی تاثیر کہ جو روح و جان کو لطیف بنانا، دل کو گناہ کی آلودگیوں سے پاک کرنا اور دل سے معصیت کے زنگ کو اتارنا ہے وہ اس میں موجود ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ اس میں دو نچلے ہوتے ہیں جو انواع و اقسام کے مواعظ، پند و نصائح اور تقویٰ و پرہیزگاری کا حکم دینے پر مشتمل ہوتے ہیں۔

لیکن اجتماعی اور سیاسی لحاظ سے یہ ایک عظیم ہفتہ وار کانفرنس ہے، جو حج کی سالانہ کانفرنس کے بعد بزرگ ترین اسلامی کانفرنس ہے۔ اسی وجہ سے اس روایت میں جو پہلے ہم پیغمبر اکرمؐ سے پہلے نقل کر چکے ہیں، یوں آیا ہے کہ مجمع ان لوگوں کا حج ہے جو مراسم حج میں شرکت کی قدرت نہیں رکھتے۔

حقیقت میں اسلام میں عظیم اجتماعوں کو اہمیت دیتا ہے :

۱ : روزانہ کے اجتماعات جو نماز جماعت میں حاصل ہوتے ہیں۔

۲ : ہفتہ وار اجتماع جو نماز جمعہ کے اعمال سے حاصل ہوتا ہے۔

۳ : حج کا اجتماع جو خانہ خدا کے پاس ہر سال ایک مرتبہ انجام پاتا ہے۔

ان سب میں سے نماز جمعہ کا اثر بہت ہی اہم ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ نماز جمعہ کے خطبہ میں خطیب کا ایک موضوع اہم سیاسی اجتماعی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں ہوتا ہے۔ اس طرح سے اس عظیم اور پرشکوہ اجتماع سے ذیل کے برکات حاصل ہو سکتے ہیں :

ا : لوگوں کو معارف اسلامی اور اہم اجتماعی و سیاسی حالات و واقعات سے آگاہ کرنا۔

ب : مسلمانوں کی صفوں میں ایسی ہم آہنگی اور زیادہ سے زیادہ نظم و اتحاد پیدا کرنا جو دشمنوں کو وحشت میں ڈال دے اور انھیں لرزہ بر اندام کر دے۔

ج : مسلم عوام میں دینی روح اور نشاط معنوی کی تجدید۔

د : عام مشکلات کے حل کے لیے باہمی تعاون حاصل کرنا۔

اسی وجہ سے دشمنان اسلام ہمیشہ ایک ایسی جامع شرائط نماز جمعہ سے خوفزدہ رہتے تھے جس میں نصریت کے ساتھ احکام اسلامی کی رعایت کی جاتی ہو۔

اسی بناء پر نماز جمعہ حکومتوں کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک طاقتور ہتھیار رہی ہے۔ البتہ عادلانہ حکومتیں جیسے پیغمبر اکرمؐ کی حکومت، اس سے اسلام کے نفع کے لیے بہترین استفادہ کیا کرتے تھے اور حکومتائے جور، جیسے بنی امیہ کی حکومت، اس سے اپنی طاقت اور قدرت کی بنیادوں کو مضبوط و محکم کرنے کے لیے سوء استفادہ کیا کرتی تھیں۔

ہم طویل تاریخ میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہتا کہ وہ کسی حکومت کے خلاف قیام کرے تو سب سے پہلے وہ اس کی نماز جمعہ میں شرکت سے رک جایا کرتا تھا جیسا کہ واقعہ کربلا میں بیان ہوا ہے کہ شیعوں کا ایک گروہ ”سلیمان بن مردغزاعی“ کے گھر میں جمع ہوا اور انہوں نے کوفہ سے امام حسینؑ کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ جس کا مضمون یہ تھا :

کوفہ میں بنی امیہ کا گورنر نعمان بن بشیر گوشہ نشین ہو گیا ہے اور ہم اس کی نماز جمعہ میں شرکت نہیں کرتے۔

اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ہماری طرف آرہے ہیں تو ہم اُسے کوفہ سے نکال دیں گے۔ لے

صحیفہ سجادویہ میں امام علی بن الحسین علیہما السلام سے وارد ہوا ہے :

”اللّٰهُمَّ اِنْ هَذَا الْمَقَامُ لَخَلْفَانِكَ وَاصْفِيَاكَ وَمَوَاضِعِ اَمَانِكَ فِي الدَّرَجَةِ الرَّفِيعَةِ الَّتِي اخْتَصَصْتَهُمْ بِهَا قَدْ ابْتَزَوْهَا“

”خداوند! یہ مقام (نماز جمعہ اور عید قربان) تیرے خلفاء برگزیدہ ہستیوں اور بلند پایہ امینوں کے لیے مخصوص ہے اور تو نے اس کے لیے انہیں کو مخصوص کیا تھا۔ لیکن (بنی امیہ کے خلفاء جور) نے زبردستی اسے اولیاء حق سے لے لیا اور غضب کر لیا ہے۔“

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دشمنان اسلام ہفتہ بھر رات دن زہریلے پروپیگنڈے میں مصروف رہتے ہیں لیکن وہ سب کے سب نماز جمعہ کے ایک ہی خطبہ اور اس کے پرشکوہ اور حیات بخش اعمال سے بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے جسموں میں ایک نئی روح پھونک دی جاتی ہے اور ان کی رگوں میں ایک تازہ خون دوڑنے لگتا ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ شیعہ فقہ کے مطابق ہر طرف سے ایک فرسخ کے علاقہ میں ایک سے زیادہ نماز جمعہ جائز نہیں ہے تاکہ وہ لوگ جو نماز جمعہ کے انعقاد کی جگہ سے دو فرسخ (تقریباً گیارہ کلومیٹر) کے اندر رہتے ہیں، وہ اس نماز میں شرکت کریں۔ اس حکم سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عملی طور پر ہر چھوٹے اور بڑے شہر اور اس کے اطراف میں ایک سے زیادہ نماز جمعہ منعقد نہیں ہوگی۔ اس بناء پر یہی نماز جمعہ اس علاقے کا ایک عظیم ترین اجتماع ہوگا۔

لیکن انتہائی افوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ عبادی سیاسی مراسم جو اسلامی معاشروں میں ایک عظیم محرک کا باعث بن سکتے تھے، ان میں فاسد حکومتوں کے نفوذ کی وجہ سے بعض اسلامی ممالک میں یہ ایسے بے روح اور بے جان ہو گئے ہیں کہ عملی طور پر ان سے کوئی مثبت اثر حاصل نہیں ہوتا اور ان اجتماعات نے ایک رسمی سے عمل کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مگر واقعاً یہ ان عظیم سرمایوں میں سے ہے کہ جن کے ضائع ہونے پر رونا چاہیے۔

سال بھر کی اہم ترین نماز جمعہ وہ ہے جو عرفات کی طرف جانے سے پہلے مکہ میں انجام پاتی ہے۔ اس میں ساری دنیا سے آئے ہوئے خانہ خدا کے تمام حجاج شرکت کرتے ہیں جو کرۂ ارض کے مسلمانوں کے تمام طبقات کے واقعی نمائندے ہوتے ہیں۔ ایسی اہم اور حساس نماز کا خطبہ تیار کرنے کے لیے مناسب ہے کہ بہت سے علماء کئی کئی ہفتوں اور مہینوں تک مطالعہ اور تیاری کریں۔ پھر اس کا ماحصل اس حساس دن کے تاریخی خطبے میں تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کریں۔ یوں وہ یقینی طور پر اس کی برکت سے اسلامی معاشرے کو زیادہ سے زیادہ

آگاہی دیتے ہوئے اس کی بڑی بڑی مشکلات کو حل کر سکتے ہیں۔
لیکن ان دنوں یہ ایک انتہائی افسوس کی بات دکھائی دیتی ہے کہ حرم پاک میں اس جمعہ پر بہت ہی معمولی اور عام مسائل و مطالب پیش کیے جاتے ہیں جن سے تقریباً سبھی لوگ واقف ہوتے ہیں۔ لیکن وہاں اصولی مسائل کی بالکل کوئی خبر ہی نہیں ہوتی۔ کیا اس قسم کی عظیم فرصت اور عظیم سرمایوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے لیے گریہ نہیں کرنا چاہیے؟ اور اس کو بدلنے کے لیے قیام نہیں کرنا چاہیے؟

۴ : نماز جمعہ کے آداب اور خطبوں کے مطالب و مضامین

نماز جمعہ (ضروری شرائط کی موجودگی میں) بالغ اور صبیح و سالم مردوں پر واجب ہے جو نماز میں شرکت کی طاقت رکھتے ہیں۔ مسافروں اور بوڑھے لوگوں پر واجب نہیں ہے۔ اگرچہ مسافر کے لیے نماز جمعہ میں حاضر ہونا جائز ہے۔ اسی طرح سے عورتیں بھی نماز جمعہ میں شرکت کر سکتی ہیں اگرچہ وہ ان پر واجب نہیں ہے۔ وہ کم سے کم تعداد پانچ مرد ہے جس سے نماز جمعہ منعقد ہو سکتی ہے۔ نماز جمعہ دو رکعت ہے اور وہ نماز ظہر کی جگہ لے لیتی ہے۔ نیز دو خطبے جو نماز جمعہ سے پہلے پڑھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں دو رکعتوں کی جگہ محسوب ہوتے ہیں۔

نماز جمعہ صبح کی نماز کی طرح ہے اور مستحب ہے کہ اس میں حمد و سورہ کو بلند آواز میں پڑھا جائے۔ اس کے علاوہ مستحب ہے کہ پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورہ منافقین کی قرأت کی جائے۔ نماز جمعہ میں دو قنوت مستحب ہیں۔ ایک رکعت اول میں رکوع سے پہلے اور دوسرا دوسری رکعت میں رکوع کے بعد ہے۔

دو خطبوں کا پڑھنا نماز جمعہ سے پہلے واجب ہے جیسا کہ خطیب کا کھڑے ہو کر خطبہ دینا بھی واجب ہے۔ جو شخص خطبہ دیتا ہے حتمی طور پر نماز جمعہ کا امام دہی ہونا چاہیے۔

خطیب کو اپنی آواز اتنی بلند کرنا چاہیے کہ لوگ اس کی آواز کو سن لیں، تاکہ خطبہ کا مضمون سب کے کانوں تک پہنچ جائے۔

خطبہ کے دوران سامعین کو خاموش رہنا اور خطیب کی باتوں پر کان دھرنا چاہیے۔ نیز خطیب کے روبرو بیٹھنا چاہیے۔

خطیب کو مرد فصیح و بلیغ، اوضاع و احوال مسلمین سے آگاہ، اسلامی معاشرے کے مصالح سے باخبر، شجاع، صریح اللہجہ اور انظارِ حق میں قاطع ہونا چاہیے۔ اس کے اعمال و رفتار اس کے کلام کی تاثیر و نفوذ کا سبب ہونے چاہئیں اور اس کی زندگی لوگوں کو خدا کی یاد دلانے والی ہونی چاہیے۔

مناسب ہے کہ وہ پاکیزہ ترین لباس پہنے ہوئے ہو، اپنے بدن کو خوشبو لگائے، وقار اور سکینہ کے ساتھ قدم اٹھائے اور جب ممبر پر جائے لوگوں کو سلام کرے، پھر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے اور شمشیر یا کمان یا عصا پر ٹیک لگائے۔ پہلے وہ منبر پر بیٹھ جائے۔ یہاں تک کہ اذان مکمل ہو جائے۔ اذان ختم ہونے کے بعد اٹھے اور خطبہ شروع کرے۔

خطبہ کا مضمون پہلے خدا کی حمد اور پیغمبر پر درود ہے (احتیاط اس میں ہے کہ یہ حصہ عربی زبان میں ہو لیکن باقی حصہ سننے والوں کی زبان میں پڑھا جائے) پھر لوگوں کو خوفِ خدا اور تقویٰ کی وصیت و نصیحت کرے۔ قرآن مجید کی کوئی مختصر سی سورہ پڑھے اور اس امر کی دونوں خطبوں میں رعایت کرے۔ دوسرے خطبہ میں پیغمبر پر درود کے بعد آئمہ مسلمین کے لیے دعا کرے اور مومنین و مومنات کے لیے استغفار کرے۔

مناسب ہے کہ خطبہ کے ضمن میں ایسے اہم مسائل پیش کرے جو مسلمانوں کے دین اور دنیا کے ساتھ مربوط ہیں۔ اسلامی ممالک کے اندر اور باہر اس علاقے کے داخل و خارج میں جن باتوں کی مسلمانوں کو ضرورت و احتیاج ہے ان پر بحث کرے۔ وہ سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور دینی مسائل کو ترجیح کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کرے۔ لوگوں کو آگاہی بخشنے اور دشمنوں کی سازشوں سے باخبر کرے۔ بعدہ اسلامی معاشرے کی حفاظت اور مخالفین کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے مختصر اور طویل مدت منصوبے ان کے سامنے بیان کرے۔

خلاصہ یہ کہ خطیب کو بہت ہی ہوشیار، بیدار اور اسلامی مسائل کے بارے میں اہل فکر اور صاحب مطالعہ ہونا چاہیے۔ اسے جمعہ کے ان عظیم مراسم کی موقعیت و حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے اہداف و مقاصد کی کامیابی کے لیے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہیے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے آیا ہے:

”انما جعلت الخطبة يوم الجمعة لان الجمعة مشهود عام، فإراد ان
 یكون للامیر سبب الی موعظتهم وترغیبهم فی الطاعة، وترغیبهم
 من المعصية وتوقیفهم علی ما اراد من مصلحة دینهم ودنیاهم
 وینبذهم بما ورد علیهم من الافاق من الاهوال التي لهم فیها
 المضرة والمنفعة..... وانما جعلت خطبتین لیكون واحدة للثناء
 علی الله والتمجید والتقديس لله عزوجل والاخری للحوار والاعذار
 والانداس والدعاء ولما یرید ان یعلمهم من امره ونهیہ ما فیہ

۱۔ نماز جمعہ کے احکام کی خصوصیات و جزئیات اور اس کے خطبوں میں فقہاء کے فتاویٰ میں جزیئی اختلاف ہے۔ جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے وہ مختلف فتاویٰ کا خلاصہ ہے۔

الصلاح والفساد۔

جمعہ کے دن خطبہ اس لیے شروع کیا گیا ہے کہ نماز جمعہ ایک عمومی اجتماع ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے امیر کو یہ موقع فراہم کرے کہ وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے، اطاعت کی ترغیب دے، معصیت الہی سے ڈرائے اور انھیں اس چیز سے آگاہ کرے کہ جس میں ان کے دین و دنیا کی مصلحت اور بہتری ہے۔ نیز وہ اخبار و واقعات جو مختلف علاقوں سے اس تک پہنچے ہیں جو لوگوں کے لیے ان کے سود و زیاں میں موثر ہیں، انھیں ان کی اطلاع دے۔ اور دو خطبے اس لیے قرار دیئے گئے ہیں تاکہ ایک میں خدا کی حمد و ثنا اور تجید و تقدیس کرے اور دوسرے میں احتیاجات ضرورتیں، تنبیہیں اور دعائیں قرار دے اور ان کے سامنے اوامر و نواہی، اور ایسے احکام کا اعلان کرے جو اسلامی معاشرے کی اصلاح اور فساد کے ساتھ مربوط ہیں۔

❖ ❖ ❖

۵ : نماز جمعہ کے وجوب کی شرائط

اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ہر دوسرے امام جماعت کی طرح امام جمعہ کو بھی عادل ہونا چاہیے۔ لیکن بحث اس بات میں ہے کہ اس کے علاوہ بھی اس میں کچھ شرائط ہونی ضروری ہیں یا نہیں؟

ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ یہ نماز امام معصوم یا ان کے نمائندہ خاص کے فرائض میں سے ہے۔ دوسرے نقطوں میں یہ امام معصوم کے زمانہ حضور کے ساتھ مربوط ہے۔

مگر بہت سے محققین کا نظریہ ہے کہ یہ شرط نماز جمعہ کے وجوب عینی کی ہے۔ لیکن وجوب تنزیہی کے لیے یہ شرط ضروری نہیں ہے۔ لہذا زمانہ غیبت میں بھی نماز جمعہ کو قائم کیا جاسکتا ہے اور وہ نماز ظہر کی جانشین بن سکتی ہے۔ ہاں حق بھی یہی ہے۔ بلکہ جب اسلامی حکومت اپنی شرائط کے ساتھ امام کے نائب عام کی طرف سے تشکیل پائے تو احتیاط یہ ہے کہ امام جمعہ اس کی طرف سے منصوب ہو، اور مسلمان نماز جمعہ میں شرکت کریں۔

اس سلسلے میں اور نماز جمعہ سے مربوط دوسرے مسائل کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ یہاں ان سب امور کا بیان کرنا ایک تفسیری بحث کے احاطہ سے خارج ہے، لہذا انھیں فقہ اور حدیث کی کتابوں میں تلاش کرنا چاہیے۔

❖ ❖ ❖

خداوند! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم ان عظیم شاعر سے نفوس کی تربیت اور مسلمانوں کو دشمن کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔
پروردگارا! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے کہ ہم تیری ملاقات کے مشتاق ہوں اور موت سے ہرگز نہ ڈریں۔
بارِ الہا! نعمتِ ایمان اور انبیاءؑ کی تعلیم و تربیت کو ہم سے ہرگز سلب نہ کرنا۔

امین یا رب العالمین

❖ ❖ ❖

سورۃ جمعہ کا اختتام

۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۱۶ ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۹۸۷ء بروز پیر بر مکان حقیر، قم مقدس، ایران

سُورَةُ مُنافِقُونَ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۱ آیات ہیں۔

شروع ۱۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

سورہ منافقون کے مطالب

سورہ منافقون ایسے مطالب و مضامین سے بھرے ہوئے سوروں میں سے ہے جن کے مباحث کا اصلی محور ”منافقین“ سے مربوط حساس مسائل ہیں۔ لیکن اس سورہ کے ذیل میں کچھ آیات مختلف سلسلوں میں مسلمانوں کے پسند و نضاح کے عنوان سے بھی آئی ہیں۔

مجموعی طور پر اس کے مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

- ۱ : منافقین کی نشانیاں جو خود کئی حساس عنوانوں پر مشتمل ہیں۔
- ۲ : مومنین کو منافقین سے ہوشیار رہنے کی تلقین اور اس سلسلے میں ہمیشہ نگرانی کی ضرورت۔
- ۳ : مومنین کو تنبیہ کہ دنیا کی مادی نعمتیں انھیں ذکر خدا سے غافل نہ کر دیں۔
- ۴ : خدا کی راہ میں خرچ کرنے، موت کے آنے اور انسان کی جان میں حسرت کی آگ بھڑکنے سے پہلے، اموال سے فائدہ اٹھانے کی وصیت و نصیحت۔

اس کا نام ”سورہ منافقون“ رکھنے کی وجہ بھی خود بخود واضح ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ سورہ جمعہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے اس کے مطابق نماز جمعہ کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورہ منافقون پڑھی جائے تاکہ مسلمان ہر وقت ان عظیم عبادی و سیاسی مراسم میں منافقین کی سازشوں کو تازہ بہ تازہ معلوم کرتے رہیں اور ہمیشہ ان کی منحوس تحریکوں، تحریب کاریوں اور منصوبوں پر نظر رکھیں۔

سورہ منافقون کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی سے مروی ہے :

”من قرأ سورۃ المنافقون برء من النفاق“

”جو شخص سورہ منافقون کو پڑھے وہ ہر قسم کے نفاق سے پاک ہو جاتا ہے۔“

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے :

”ہمارے شیعوں میں سے ہر مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ شب جمعہ میں ”سورۃ جمعہ“ اور ”سورۃ اعلیٰ“ پڑھے اور جمعہ کے دن نماز پھر میں ”سورۃ جمعہ“ اور ”سورۃ منافقون“ پڑھے۔“

اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا :

”فاذا فعل ذلك فكانما يعمل بعمل رسول الله (ص) وكان جزاؤه وثوابه على الله الجنة۔“

”جب وہ ایسا کرے گا تو گویا اُس نے حضرت رسولؐ کے عمل کو انجام دیا اور اس کی جزا اور ثواب اللہ کے ہاں جنت ہے۔“

ہم نے ہر سورہ کے فضائل کے ذکر کے بعد بارہا یہ کہا ہے کہ یہ اہم فضائل و آثار، فکر و عمل سے خالی صرف تلاوت کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ مذکورہ بالا روایات بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ زندگی کا طریقہ اس کے مطابق بنائے بغیر اس سورۃ کا پڑھنا انسان میں سے رُوح نفاق کو ہرگز خارج نہیں کرتا۔

❖ ❖ ❖

احث کا اصل
میں مسلمانوں

پہلے، اموال سے

زنجیر کے آداب

مسلمان ہر وقت

سب سے سچائی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

① إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ
وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ ۖ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ
لَكَاذِبُونَ ۝

② اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ
اللَّهِ ۖ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

③ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ
فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ۝

④ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِنْ يَقُولُوا
تَسْمِعَ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَانَتْهُمْ خَشَبٌ مُسْنَدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ
كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۖ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۖ
قَاتِلْهُمْ اللَّهُ ۖ إِنَّهُ يُوَفِّكُونُ ۝

ترجمہ

رحمن ورحیم خدا کے نام سے۔

① جب منافقین تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ یقیناً تو اللہ کا
رسول ہے، خدا جانتا ہے کہ تو یقیناً اس کا رسول ہے۔ لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔

۱) انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔ بیشک وہ بہت ہی بُرے کام انجام دیتے ہیں۔

۲) یہ اس بناء پر ہے کہ وہ پہلے تو ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے۔ لہذا ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے اور وہ حقیقت کو درک نہیں کرتے۔

۳) جب تم انھیں دیکھتے ہو تو ان کا جسم اور حلیہ تمھیں تعجب میں ڈال دیتا ہے اور اگر وہ کوئی بات کرتے ہیں تو تو ان کی باتوں کو کان دھر کے سنتا ہے۔ حالانکہ وہ ایسی خشک لکڑیاں ہیں جنھیں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا ہو۔ جو آواز بھی کہیں سے بلند ہوتی ہے اُسے وہ اپنے برخلاف خیال کرتے ہیں۔ وہ تمھارے حقیقی دشمن ہیں۔ تم ان سے بچتے رہو، خدا انھیں ہلاک کرے، وہ حق سے کس طرح منحرف ہو جاتے ہیں؟

تفسیر

سرچشمہ نفاق اور منافقین کی نشانیاں

ان آیات کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے ایک مقدمہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلہ نفاق اور منافقین، اسلام میں پہلی مرتبہ اس وقت سامنے آیا جب پیغمبرؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور اسلام کی بنیاد پر قوی اور کامیابی آشکار ہو گئی۔ ورنہ مکہ میں تقریباً کوئی منافق موجود نہیں تھا کیونکہ دشمن اسلام کے برخلاف جو چاہتے تھے کھلم کھلا کہتے اور کرتے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔ انھیں منافقانہ طرز عمل کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

لیکن جب مدینہ میں اسلام کے نفوذ اور پھیلاؤ نے دشمنوں کو ضعیف و ناتواں بنا دیا تو اب مخالفت کا اظہار کھلے عام کرنا مشکل اور بعض اوقات ناممکن تھا۔ لہذا شکست خوردہ دشمنوں نے اپنی تخریبی سرگرمیاں جاری و ساری رکھنے کے لیے اپنے چہرے بدل لیے۔ وہ ظاہراً مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے، لیکن مخفیانہ طور پر اپنے بُرے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔

اصولی طور پر ہر انقلاب کی طبیعت و مزاج یہی ہے کہ نمایاں کامیابی کے بعد اُسے منافقین کا سامنا کرنا پڑتا

لِّلّٰہِ
فَتٰیۡنَ

بِیۡلِ

فُلُوۡہِمۡ

وَلَوۡا

بَوۡنَ

مَ

لِّلّٰہِ

ہُوۡلَہِ

ہے۔ کل کے سخت ترین دشمن آج کے با اثر افراد کی صورت میں ظاہری دوستوں کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ منافقین سے مربوط یہ تمام آیات مدینہ میں کیوں نازل ہوئیں اور مکہ میں کیوں نازل نہ ہوئیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ نفاق اور منافقین کا مسئلہ پیغمبر کے زمانہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا، بلکہ ہر معاشرہ اور خصوصاً انقلابی معاشرے، اس سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس مسئلہ کے بارے میں قرآن کی تحلیلوں، تجزیوں اور موشگافیوں کو ایک تاریخی مسئلہ کے عنوان سے نہیں ایک بالفعل نیاز و احتیاج کے عنوان سے مورد تحقیق و تدقیق قرار دیا جانا چاہیے۔ اس سے موجودہ وقت کے اسلامی معاشروں میں رُوح نفاق اور منافقین کے طریقوں سے مبارزہ کرنے کے لیے ہدایت حاصل کرنی چاہیے۔

نفاق کی نشانیاں جنہیں قرآن نے شرح و بسط سے بیان کیا ہے، وقت کے ساتھ ان کو بھی پہچانا چاہیے۔ اور ان نشانوں کے ذریعے منافقوں کے طور طریقوں اور منصوبوں کی شہ تک پہنچ جانا چاہیے۔

ایک دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ منافقین کا خطہ ہر معاشرے کے لیے ہر دشمن کے خطرے سے زیادہ ہے، کیونکہ ایک طرف تو ان کی شناخت عام طور پر آسان نہیں ہوتی اور دوسری طرف وہ داخلی دشمن ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ معاشرے کے سامنے ہانپنے میں اس طرح سے نفوذ کرتے ہیں کہ انہیں الگ کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ تیسری طرف سے ان کے باقی ارکان کے معاشرہ سے مختلف روابط ان سے مبارزہ کے کام کو دشوار بنا دیتے ہیں۔

چنانچہ اسی وجہ سے اسلام نے اپنی طویل تاریخ میں زیادہ تر منافقین ہی کے ہاتھوں چوٹ کھائی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اپنے سخت ترین حملے منافقین ہی پر کیے ہیں اور جس قدر ان کی سرکوبی کی ہے، اپنے کسی بھی دشمن کے لیے روا نہیں رکھی۔

اس مقدمہ پر توجہ کے ساتھ اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

پہلی بات جو قرآن یہاں منافقین کے بارے میں پیش کرتا ہے ان کا وہی جھوٹے ایمان کا اظہار ہے کہ جو نفاق کی اصل بنیاد ہے۔ فرماتا ہے: جس وقت منافقین تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے۔ (اذا جاءك المنافقون قالوا اشهد انك لرسول الله)۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ”خدا جانتا ہے کہ تو اس کا بھیجا ہوا ہے لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں: (والله يعلم انك لرسوله والله يشهد ان المنافقين لكاذبون)۔

اس سے نفاق کی پہلی نشانی واضح ہو جاتی ہے اور وہ ظاہر و باطن کا متفاوت ہونا ہے۔ یعنی وہ تاکید کے ساتھ زبان سے تو اظہار ایمان کرتے ہیں لیکن ان کے دل میں ایمان کی کوئی حق نہیں ہوتی۔ یہ دروغ گوئی اور یہ اندر اور باہر

لے یہاں ”ان“ مکتوب صورت میں ذکر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خبر کے اوپر لام تاکید آیا ہے اور اس صورت میں تقدیر میں مقدم ہے (ابیان فی غریب اعراب القرآن)

کی دورنگی ہی نفاق کے اصلی محور ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ صدق و کذب (سچ اور جھوٹ) دو قسم کے ہوتے ہیں :

۱: صدق و کذب خبری

۲: صدق و کذب ”مخبری“

پہلی قسم میں تو واقعہ کے موافق یا مخالفت ہونا معیار ہوتا ہے جبکہ دوسری قسم میں اعتقاد کی موافقت و مخالفت مدنظر ہوتی ہے۔ اس معنی میں کہ اگر انسان کوئی ایسی خبر دیتا ہے جو واقعہ کے مطابق ہے لیکن اس کے عقیدہ کے خلاف ہے تو اس کو ہم کذب ”مخبری“ کہتے ہیں اور اگر اس کے عقیدہ کے مطابق ہے تو صدق ہے۔

اس طرح سے منافقوں کا پیغمبر اسلام کی رسالت کی گواہی دینا خبر دینے کے لحاظ سے بالکل جھوٹ نہیں تھا بلکہ یہ ایک واقعیت تھی۔ لیکن کھنے والے اور منبر کے لحاظ سے چونکہ یہ ان کے عقیدہ کے برخلاف تھا، لہذا جھوٹ شمار ہوتا تھا۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ تو خدا کا پیغمبر تو ہے لیکن یہ منافق جھوٹ بولتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں منافقین یہ نہیں چاہتے تھے کہ پیغمبر کی رسالت کی خبر دیں۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ آنحضرت کی نبوت کے بارے میں اپنے اعتقاد کی خبر دیں۔ اور یقیناً اس خبر میں وہ جھوٹے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ انھوں نے اپنی گواہی میں انواع و اقسام کی تائیدیں استعمال کی ہیں۔ اور خدا تعالیٰ بھی قطیعت کے ساتھ، اسی لب و لہجہ میں ان کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسی قطیعت کے مقابلہ میں اسی قسم کی قطیعت ضروری ہے۔

یہاں اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ”منافق“ اصل میں ”نفق“ (بروزن نفخ) کے مادہ سے نفوذ و پیش روی کے معنی میں ہے۔ لیکن ”نفق“ (بروزن شفق) کھال اور اس نقب کے معنی میں ہے جو زیر زمین لگاتے اور اس سے پھپھنے یا بھاگنے کے لیے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لبض منسیرین نے کہا ہے کہ بہت سے جانور جیسے صحرائی بچوہے، لومڑی اور سوسمار اپنے رہنے کے لیے بلوں میں دو سوراخ بناتے ہیں، ایک ظاہری جس سے داخل اور خارج ہوتے ہیں اور دوسرا پوشیدہ۔ جب وہ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو مخفی راستے سے بھاگ جاتے ہیں اور اس پوشیدہ سوراخ کو ”نافقہ“ کہتے ہیں۔

اس طرح سے منافق شخص وہ ہے جس نے ایک پوشیدہ اور مخفی راستہ اپنے لیے رکھا ہوا ہوتا ہے تاکہ پوشیدہ اور اور مخفی طریقہ سے کام کرتے ہوئے معاشرے میں نفوذ کرے اور خطرے کے وقت دوسری راہ سے فرار ہو جائے۔

ۛ ۛ ۛ

بعد والی آیت میں ان کی دوسری نشانی بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: ”انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہوا ہے تاکہ وہ لوگوں کو خدا کی راہ سے باز رکھیں۔“ (اتخذوا ایمانہم جنۃ فصدوا عن سبیل اللہ)۔

”وہ بہت ہی بُرے کام انجام دیتے ہیں۔“ (انھم ساء ما کانوا یعملون)۔ کیونکہ ظاہر میں تو وہ ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور باطن میں کفر کرتے ہیں۔ یوں دین حق کی طرف لوگوں کی ہدایت کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ ہاں تو اس سے بدتر اور قبیح تر عمل اور کیا ہوگا۔ ”جنۃ“ ”جن“ (بروزن فن) کے مادہ سے۔ اصل میں کسی چیز کو حس سے پنہاں کرنے کے معنی میں ہے۔ نیز ”جن“ (بروزن بن) ایک نظر نہ آنے والا موجود ہے، لہذا اس لفظ کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ چونکہ ”ڈھال“ ان کو دشمن کے اسلحہ کی ضربوں سے چھپا کر رکھتی ہے، اس لیے عربی زبان میں اُسے ”جنۃ“ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ درختوں سے بھرے پُرے باغ کو ان کی زمین کے مستور ہونے کی بناء پر ”جنۃ“ کہتے ہیں۔

بہر حال یہ نفاق کی نشانیوں میں سے ایک ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے مقدس نام اور شدید قسموں کی آڑ میں چھپا لیتے ہیں تاکہ ان کا اصلی چہرہ دکھائی نہ دے۔ اس طرح وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے انھیں غفلت میں ڈال دیتے ہیں اور ”صد عن سبیل اللہ“ (لوگوں کو خدا کی راہ سے باز رکھتے ہیں)۔

صغنی طور پر یہ تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ منافق ہمیشہ مومنین کے ساتھ جنگ و جدال کی حالت میں ہیں۔ لہذا ان کی ظاہر داری اور چرب زبانی سے ہرگز دھوکا نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ ڈھال کا انتخاب جنگ کے میدانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہ شبیک ہے کہ بعض مواقع پر انسان کے لیے قسم کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا یا کم از کم قسم موردِ نظر موضوع کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔ لیکن وہ جھوٹی قسم نہیں ہے اور نہ ہی ہر چیز اور ہر کام کے لیے قسم کہ یہ منافقین کا شیوہ اور طریقہ ہے۔

سورۃ توبہ کی آیت ۴۲ میں آیا ہے یحلفون باللہ ما قالوا ولقد قالوا کلمۃ الکفر ”وہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے (پیغمبر کی پیٹھ پیچھے چھپنے والی باتیں) نہیں کیں۔ حالانکہ یقیناً انھوں نے کفر آمیز باتیں کی ہیں“

مفسرین نے ”صد و عن سبیل اللہ“ کے جملہ کے دو معانی بیان کیے ہیں۔ پہلا راہِ خدا سے اعراض کرنا اور دوسرا اوروں کو اس راہ سے باز رکھنا۔ اگرچہ زیر بحث آیت میں دونوں معانی کو جمع کرنا ممکن ہے۔ لیکن ان کے جھوٹی قسمیں کھانے کی طرف توجہ کرتے ہوئے دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان قسموں کا ہدف اور مقصد دوسروں کو غفلت میں رکھنا ہوتا ہے۔

وہ ایک جگہ ”مسجد ضرار“ بناتے ہیں، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اس سے تمہارا مقصد کیا ہے تو قسم کھا کر

کھتے ہیں کہ خیر کے سوا چار اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ (توبہ: ۱۰۷)

دوسرے مواقع پر ان جگہوں میں شریک ہوتے ہیں جن کا فاصلہ تھوڑا اور غنیمتوں کا احتمال زیادہ ہے۔ لیکن ممر کردہ تبوک جو مشکلات سے پُر ہے اس میں شرکت نہ کرنے کے لیے ہزار ہا بہانے اور عذر کرتے ہیں بلکہ قسم کھاتے ہیں کہ اگر ہم میں توانائی ہوتی تو تمہارے ساتھ ضرور چل پڑتے۔ (توبہ: ۲۲)

وہ نہ صرف لوگوں کے سامنے جھوٹی قسم کھاتے ہیں بلکہ جیسا کہ سورہ مجادلہ کی آیت ۱۸ میں آیا ہے۔ وہ عرصہ محشر میں بارگاہِ خداوندی میں بھی جھوٹی قسم سے متوسل ہوں گے۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ عمل ان کے وجود میں رُجح پس چکا ہے یہاں تک کہ وہ عرصہ محشر میں خدا کی بارگاہ میں بھی اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں اس قسم کے ناروا اعمال کی علتِ اصلی کو پیش کرتے ہوئے فرید کتا ہے: ”اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تو وہ ایمان لائے اور اس کے بعد کافر ہو گئے ہیں۔ اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور وہ حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔“ (ذالک بانہم امنوا ثم کفروا فطبع علی قلوبہم فہم لا یفقہون۔)

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس ایمان سے مراد یہاں ایمانِ ظاہری ہے جبکہ وہ باطن میں کافر ہی تھے۔

لیکن آیت کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ابتداء میں وہ حقیقتاً ایمان لے آئے تھے۔ لیکن ایمان کا ذائقہ چکھنے اور اسلام و قرآن کی حقانیت کی نشانیاں دیکھ لینے کے بعد انھوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی مگر ایسا کفر جو نفاق سے تو آم تھا نہ کہ آشکارا اور صراحت کے ساتھ۔ اور یہی بات اس چیز کا سبب بن گئی کہ خدا ان سے جس تشخیص سلب کرے اور وہ حقانیت کے ادراک سے محروم رہ جائیں۔ کیونکہ اگر انھوں نے ابتداء سے ہی حق کی تشخیص نہ کی ہوتی تو پھر وہ کچھ غدر رکھتے تھے۔ لیکن حق کو پہچان لینے اور ایمان لانے کے بعد اگر وہ اسے ٹھکرا دیں تو خدا اُن سے اپنی توفیق سلب کر لیتا ہے۔

حقیقت میں منافقین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جن کا ایمان پہلے سے ہی فالتی اور ظاہری تھا دوسرا گروہ وہ ہے جو ابتداء میں تو حقیقتاً ایمان لے آیا لیکن بعد میں اس نے امداد و نفاق کی راہ اختیار کر لی۔ زیر بحث آیت کا ظاہر دوسرے گروہ کی بات کرتا ہے۔

حقیقت میں یہ آیت سورہ توبہ کی آیت ۴ کے مشابہ ہے کہ جو کہتی ہے: وکفروا بعد اسلامہم ”وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے۔“

بہر حال یہ ان کی تیسری نشانی ہے کہ وہ واضح حقانیت کے ادراک سے عام طور محروم ہیں۔ یہ بات کئے بغیر واضح ہے کہ یہ چیز ہر گز جبر و اکراہ نہیں ہے، کیونکہ اس کے مقدمات کو انہوں نے خود فراہم کیا ہے۔

حال بنایا
سن

لی ہایت

ہے۔ نیز

ان کو

درختوں

میں بچپا

میں ڈال

ن میں

میدانوں

و نظر

م کہ یہ

کھنڈ

نے

اعراض

ان کے

در مقصد

لحا کہ

بعد والی آیت ان کی مزید نشانیاں بتاتے ہوئے کہتی ہے :

”جب تم انہیں دیکھو گے تو ان کا جیم اور صورت تمہیں تعجب میں ڈال دے گا۔“ (واذا رأيتم تعجبك اجسامهم)۔

ان کا ظاہر آراستہ اور ان کی شکل و صورت بڑی عمدہ نظر آتی ہے۔

علاوہ ازیں وہ ایسی شیریں اور پرکشش باتیں کرتے ہیں کہ ”جب وہ گفتگو شروع کرتے ہیں تو تم بھی ان کے باتوں کو کان دھر کے سنتے ہو۔“ (وان يقولوا سمع لقولهم)۔

جہاں پیغمبرؐ ظاہراً ان کی باتوں کی کشش سے متاثر ہو جائے وہاں دوسروں کا معاملہ تو اور بھی آگے جاتا ہے۔

یہ تو ظاہری لحاظ سے ہے، لیکن باطنی طور پر : ”وہ ایسی خشک لکڑیوں کے مانند ہیں جنہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔“ (كانهم خشب مسندة)۔

وہ ایسے جسم ہیں جن میں روح نہیں ہے۔ بے معنی شکلیں اور اندر سے خالی ہیکلیں ہیں۔ نہ خود سے کوئی استقلال رکھتے ہیں نہ باطن میں کوئی نور و صفائی، نہ کوئی محکم ارادہ ہے اور نہ ہی اس میں کچھ ایمان ہے۔ وہ ٹھیک خشک لکڑیوں کی طرح ہیں جنہیں دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا ہو۔

بعض مفسرین نے روایت کی ہے کہ منافقین کا سرغنہ ”عبداللہ بن ابی“ ایک موٹا تازہ، خوبصورت، فصیح و بلیغ اور چکنی چٹری باتیں بنانے والا آدمی تھا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حضرت رسولؐ کی مجلس میں داخل ہوتا تو اصحاب اس کے ظاہر سے تعجب کرتے اور اس کی باتیں کان دھر کے سنتے۔ لیکن وہ (اپنے غرور و نخوت کی بناء پر) دیوار کے پاس جا کر اس کا تکیہ بناتے اور مجلس کو اپنی ظاہری صورت اور باتوں سے متاثر کرتے۔ لے یہ آیت ان کی اس حالت کو بیان کر رہی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : ”وہ اس طرح اندر سے کھوکھلے، خدا پر توکل اور اپنے نفس پر اعتماد سے محروم ہیں کہ وہ ہر آواز کو چاہے وہ جہاں سے بھی بلند ہو، اپنے برخلاف سمجھتے ہیں۔“ (يعسوبون كل صيحة عليهم)۔ ایک عجیب قسم کا خوف اور دہشت ہمیشہ اُن کے دل و جان پر چھائی رہتی ہے۔ ایک بدظنی اور جاننا بدبینی کی حالت نے ان کی روح کو سترتا سرگھیر لے میں لیا ہوا ہے اور ”المانن خائف“ کے مطابق ہر چیز سے، یہاں تک کہ اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اور یہ ان کی نشانیوں میں سے ایک اور نشانی ہے۔

آیت کے آخر میں پیغمبرؐ کو خبردار کرتا ہے کہ ”یہ لوگ واقعی تمہارے دشمن ہیں، لہذا ان سے بچتے رہو (ہم

العدو فاحذر هو۔

اس کے بعد کتا ہے: ”خدا انہیں ہلاک کرے۔ وہ حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہیں؟“ (قاتلہم اللہ انی یؤفکون)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ تعبیر خبر کے طور پر نہیں ہے۔ بلکہ نفرین کی صورت میں ہے اور اس گروہ کی مذمت، سرزنش اور تحقیر کے طور پر ذکر ہوئی ہے، ان روزمرہ کی تعبیروں کی مانند جو افراد انسانی ایک دوسرے کے بارے میں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح قرآن خود لوگوں کی زبان میں ان سے بات چیت کرتا ہے۔ اسی طرح سے زیر بحث آیت میں منافقین کی مزید نشانیاں بھی بیان کی گئی ہیں، منجملہ ان کے: ظاہری فریب دینے والی وضع و کیفیت، اندر سے کھوکھلے پن کے ساتھ، اسی طرح ہر چیز اور ہر حادثہ و واقعہ کے بارے میں خوف، دہشت اور بدگمانی وغیرہ ہے۔

❖ ❖ ❖

www.sirat-e-mustafa.com

- ⑤ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّاْ رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝
- ⑥ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝
- ⑦ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَى مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّى يَنْفَضُوا ۖ وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۝
- ⑧ يَقُولُونَ لِمَنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لِيُخْرِجَنَا الْأَعْزُ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۖ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۖ

ترجمہ

- ⑤ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ (تم رسول ۴ کے پاس) آؤ تاکہ حضرت رسول تمہارے لیے استغفار کریں، تو وہ اپنے سروں کو (استہزاء، تکبر اور غرور سے) ہلانے لگتے ہیں اور تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری باتوں سے اعراض کرتے ہوئے تکبر کر رہے ہیں۔
- ⑥ تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، ان کے لیے کوئی فرق نہیں ہے۔ خدا انہیں ہرگز

نہیں بخشے گا۔ کیونکہ خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

④ وہ تو ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو رسول اللہ کے پاس ہیں کچھ خرچ نہ کرو تاکہ وہ سب کے سب پر اگندہ ہو جائیں اور (وہ اس بات سے غافل ہیں کہ) آسمانوں اور زمین کے خزانے خدا ہی کے لیے ہیں، لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔

⑤ وہ یہ کہتے ہیں اگر ہم مدینہ کی طرف لوٹ گئے تو عزت دار لوگ ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے حالانکہ عزت خدا اس کے رسول اور مومنین کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن منافق نہیں جانتے۔

شان نزول

تاریخ، حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں اوپر والی آیات کے لیے ایک مفصل شان نزول بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

غزوہ بنی المصطلق کے بعد (یہ جنگ ہجرت کے چھٹے سال سرزمینِ قدیم میں واقع ہوئی) مسلمانوں میں سے دو افراد کے درمیان جن میں سے ایک انصاریوں میں سے اور دوسرا مہاجرین میں سے تھا، کنوئیں سے پانی لینے کے وقت اختلاف ہو گیا ایک نے انصاریوں کو اور دوسرے نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ مہاجرین میں سے ایک شخص اپنے ساتھی کی مدد کے لیے آیا اور عبد اللہ بن ابی جو منافقین کے مشہور سرغنوں میں سے تھا وہ انصاری کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور تب اُن دونوں کے درمیان شدید توئیکار ہوئی۔ عبد اللہ بن ابی سخت غصہ میں آگیا جب کہ اس کی قوم کے کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ اُس نے کہا: ”ہم نے اس گروہِ مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی لیکن ہمارا معاملہ اس مرتبہ الشل کی مانند ہے جو کہتی ہے: ”مَنْ كَلَبِكَ يَا كَلَكُ“ (اپنے کتے کو موٹا کر دے تاکہ وہ تجھے کاٹ کھائے) وَاللّٰهُ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ۔ ”جدا کی قسم! اگر ہم مدینہ پلٹ گئے تو عزت دار ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے“ یہاں عزت داروں سے اس کی مراد وہ خود اور اس کے پیروکار تھے، اور ذلیلوں سے مراد مہاجرین تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھ والوں سے کہا: ”یہ اس کام کا نتیجہ ہے جو خود تم نے اپنے سروں پر تھوپ لیا ہے۔ تم نے انہیں اپنے شہر میں جگہ دی، اور اپنے مال ان میں تقسیم کیے۔ اگر تم اپنی بچی ہوئی غذا اس جیسوں کو (اس مد مقابل مہاجر کی طرف اشارہ ہے) نہ دیتے تو یہ تمہاری گردن پر سوار نہ ہوتے، تمہاری سرزمین سے چلے جاتے اور اپنے قبائل سے جا ملتے۔

اللہ
کبرون
تغفر
القوم

نَد
وَت

الاعز
ولكن

ے لیے
وگے کہ

ہرگز

اس موقع پر "زید بن ارقم" نے جو اس وقت ایک فوجی جوان تھا "عبداللہ بن ابی کی طرف منہ کر کے کہا: "خدا کی قسم! ذلیل اور کمینہ تو ہی ہے۔ محمد خدا کی عزت اور مسلمانوں کی محبت میں ہیں۔ خدا کی قسم! میں آج سے تجھے دوست نہیں رکھوں گا۔ عبداللہ نے چلا کر کہا: "اے لڑکے خاموش رہ، تو اپنے کھیل کود سے کام رکھ! زید بن ارقم حضرت رسول کی خدمت میں آیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔

پیغمبر نے کسی کو "عبداللہ" کے پاس بھیج کر اُسے بلایا اور فرمایا: "یہ کیا بات ہے جو مجھ سے بیان کی گئی ہے؟"

عبداللہ نے کہا: "اس خدا کی قسم ہے جس نے آپ پر آسمانی کتاب نازل کی ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور زید جھوٹ بولتا ہے۔"

انصار کے کچھ لوگ وہاں موجود تھے، انہوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! عبداللہ ہمارا بزرگ ہے، لہذا انصار کے بچوں میں سے ایک بچے کی بات اس کے برخلاف قبول نہ کیجئے۔ لہذا پیغمبر نے ان کا عذر قبول کر لیا تو اس موقع پر گروہ انصار نے "زید بن ارقم" کو ملامت اور سرزنش کی۔

پیغمبر نے کوہنہ کو توجہ کرنے کا حکم دے دیا۔ بزرگان انصار میں سے ایک شخص "اسید" نامی آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! آپ نے ایک نامناسب وقت میں کوہنہ کو دیا ہے۔" آپ نے فرمایا: "ہاں! کیا تو نے سنا نہیں ہے کہ تیرے ساتھی عبداللہ نے کیا کہا ہے؟ اُس نے یہ کہا ہے کہ جب وہ مدینہ پلٹ جائے گا تو عزت والے ذلیلوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔"

اسید نے کہا: "یا رسول اللہ! اگر آپ چاہیں تو اُسے مدینہ سے باہر نکال سکتے ہیں۔ خدا کی قسم آپ عزت دار ہیں اور وہ ذلیل ہے۔" پھر اُس نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! اس کے ساتھ نرمی کیجئے۔"

عبداللہ کی باتیں اس کے بیٹے کے کانوں تک پہنچیں تو وہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "میں نے سنا ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرے باپ کو قتل کر دیں، اگر ایسا معاملہ ہے تو خود مجھے حکم دیجیے کہ میں اس کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں لے آؤں، کیونکہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے ماں باپ کی نسبت مجھ سے زیادہ نیک رفتار نہیں ہے۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کوئی اور اُسے قتل کرے اور میں اس کے بعد اپنے باپ کے قاتل کو نہ دیکھ سکوں گا اور خدا نخواستہ میں اُسے قتل کر دوں اور اس قتل مومن کی پاداش میں جنت کے بجائے جہنم میں چلا جاؤں۔"

پیغمبر نے فرمایا: "تیرے باپ کے قتل کا مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے، تو اس کے ساتھ مدارا اور نیکی کرتا رہ۔"

اس کے بعد پیغمبر نے حکم دیا کہ سارا دن اور ساری رات لشکر چلتا رہے۔ دوسرے دن جب سورج نکل آیا تو آپ نے شہر نے حکم دیا۔ لشکر اس قدر تھک گیا تھا کہ زمین پر سر رکھتے ہی سب گہری نیند سو گئے اور پیغمبر

کا مقصد بھی یہی تھا کہ لوگ کل کا ماجرا اور عبد اللہ بن ابی کی بات کو بھول جائیں۔
آخر کار پیغمبر مدینہ میں وارد ہوئے۔ زید بن ارقم کہتے ہیں کہ میں شدت غم اور شرم کے مارے گھر کے اندر ہی رہا اور باہر نہ نکلا۔ اس موقع پر سورۃ منافقون نازل ہوئی کہ جس نے زید کی تصدیق اور عبد اللہ کی تکذیب کی۔ پیغمبر نے زید کا کان پکڑ کر فرمایا: ”اے جوان! خدا نے تیری بات کی تصدیق کر دی، بالکل اسی طرح سے جیسا کہ تو نے اپنے کانوں سے سنا اور دل میں محفوظ رکھا تھا، خدا نے اس چیز کے بارے میں جو تو نے کسی، قرآن کی آیات نازل کی ہیں۔“ اس موقع پر عبد اللہ بن ابی مدینہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جب اس نے چاہا کہ مدینہ میں داخل ہو جائے تو اس کے بیٹے نے آکر اس کا راستہ روک لیا۔ عبد اللہ نے کہا: ”وائے ہو تجھ پر۔ یہ کیا کر رہا ہے؟“ اس کے بیٹے نے کہا۔ ”خدا کی قسم! رسول خدا کی اجازت کے بغیر تو مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور آج تو سمجھ لے گا کہ عزیز کون ہے، اور ذلیل کون؟“

عبد اللہ نے اپنے بیٹے کی شکایت رسول خدا کی خدمت میں پہنچائی، تو پیغمبر نے اس کے بیٹے کو پیغام بھیجا کہ اپنے باپ کو مدینہ میں داخل ہونے دو۔ تب اس کے بیٹے نے کہا: ”اب رسول خدا کی اجازت ہو گئی ہے لہذا اب تمھارے داخل شہر ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔“ عبد اللہ شہر میں داخل ہوا لیکن کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ بیمار پڑ گیا اور پھر دنیا سے چل بسا اور شاید اُسے جان لیوا سہب دق ہو گیا تھا۔

جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اور عبد اللہ کا جھوٹ ظاہر ہو گیا تو بعض لوگوں نے اُس سے کہا: ”تیرے بارے میں شدید تر آیات نازل ہوئی ہیں تو پیغمبر کی خدمت میں جانا کہ وہ تیرے لیے استغفار کریں۔“ اس پر عبد اللہ نے اپنے سر کو ہلاتے ہوئے کہا:

”تم نے مجھ سے کہا ایمان لے آ تو میں ایمان لے آیا۔ تم نے کہا زکوٰۃ دے تو میں نے زکوٰۃ دی۔ اب اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہا کہ کو، محمدؐ کے لیے سجدہ کر! اس موقع پر آیت و اذا قیل لهم قتلوا نازل ہوئی ہے

❖ ❖ ❖

تفسیر

منافقین کی دیگر نشانیاں

ان آیات میں منافقین کے اعمال اور ان کی گونا گوں نشانیوں کا بیان اسی طرح سے جاری ہے۔ فرماتا ہے:

”جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اؤ تاکہ رسول خدا تمہارے لیے استغفار کریں تو وہ اپنے سروں کو استنزاء اور کبر و نخوت کے ساتھ ہلاتے ہیں۔ اور تو دیکھے گا کہ وہ تیری باتوں سے اعراض کرتے ہوئے متکبر رہے ہیں۔“ (واذا قيل لهم تسالوا يغفر لكم رسول الله لودا وروسهم ورايتهم يصدون و هم مستكبرون)۔

ہاں ! ان لغزشوں کے مقابلہ میں جو ان سے سرزد ہوتی ہیں اور ان کے پاس توبہ اور تلافی کی فرصت بھی ہوتی ہے ان کا کبر و غرور انہیں تلافی کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ اس کا واضح نمونہ عبد اللہ بن ابی تھا کہ جس کا عجیب و غریب ماجرا شان نزول میں بیان ہوا ہے۔

جس وقت اُس نے وہ قبیح اور ناروا بات پیغمبر اور مومن مہاجرین کے بارے میں کہی: ”جب ہم مدینہ کی طرف پلٹ کر جائیں گے تو عترت والے ذیلیوں کو باہر نکال دیں گے، اس پر قرآنی آیات نازل ہوئیں اور اس کی شدید مذمت ہوئی۔ لوگوں نے اُس سے کہا کہ وہ رسول خدا کے پاس آئے تاکہ حضور اس کے لیے بارگاہ خداوندی سے بخشش طلب کریں۔ مگر اُس نے ایک اور ناروا بات کی کہ جس کا ماحصل یہ تھا: ”تم نے کہا ایمان لے آ، میں ایمان لے آیا تم نے کہا زکوٰۃ دے، میں نے زکوٰۃ دی۔ اب بجز اس کے کوئی چیز باقی نہیں رہی کہ کو محمدؐ کے لیے سجدہ کر!“

یہ بات واضح ہے کہ روح اسلام حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور کبر و غرور ہمیشہ اس تسلیم میں رکاوٹ ہے۔ اسی بناء پر منافقین کی ایک نشانی، بلکہ اسی غرور خود خواہی اور خود کو برتر سمجھنے ہی کو نفاق کا ایک سبب شمار کیا جاسکتا ہے۔

”لووا“ ”لی“ کے مادہ سے اصل میں ”رسی کو بل دینے“ کے معنی میں ہے۔ اور اسی مناسبت سے منہ پھیرنے یا سر کو حرکت دینے اور ہلانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یصدون جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ”منع کرنا“ اور ”اعراض کرنا“ زیر بحث آیت میں دوسرا معنی اور گزشتہ آیت میں پہلا معنی مناسب ہے۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کے لیے اس سلسلہ میں فرید کتا ہے: ”بالفرض اگر وہ تیرے پاس آئیں اور تو ان کے لیے استغفار بھی کر لے تو ان میں بخشش کے اسباب موجود ہی نہیں ہیں۔ اس بناء پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تو ان کے لیے استغفار کرے یا نہ کرے، خدا انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔“ (سواء علیہم استغفرت لهم ام لم تستغفر لهم لن يغفر الله لهم)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ”خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا“ (ان الله لا يهدي القوم الفاسقين)۔ دوسرے لفظوں میں پیغمبر کی استغفار بخشش کے لیے علت تامہ نہیں، بلکہ مقتضی ہے۔ یہ صرف اسی صورت

میں اثر کرتی ہے جبکہ موافق اسباب اور ضروری قابلیت فراہم ہو۔ اگر وہ واقعتاً توبہ کر لیں، اپنی راہ کو بدل لیں، کبر و غرور کی سواری سے اتر آئیں اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں تو پیغمبر کی استغفار یقیناً مؤثر ہے۔ اس صورت کے علاوہ کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔

اسی معنی کے مشابہ سورہ توبہ کی آیت ۸۰ میں بھی آیا ہے جو منافقین کے ایک اور گروہ کے بارے میں کہتی ہے: **استغفرلہم اولا تستغفرلہم ان تستغفرلہم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لہم ذالک بافہم کفروا باللہ ورسولہ واللہ لایہدی القوم الفاسقین۔** ”چاہے تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرو گے تو بھی خدا ان کو نہیں بخشے گا۔ کیونکہ وہ خدا اور اس کے رسول کے منکر ہو گئے ہیں اور خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

یہ بات واضح ہے کہ ستر تکبیر کا عدد ہے۔ یعنی چاہے جتنی مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہ نکتہ بھی معلوم ہے کہ فاسق سے مراد ہر قسم کا گنہگار نہیں ہے۔ کیونکہ پیغمبر گناہگاروں کی نجات کے لیے ہی آئے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ گنہگار ہیں جو گناہوں پر اصرار کرتے ہیں، ہٹ دھرم ہیں اور حق کے مقابلے میں سرکش ہیں۔

اس کے بعد ان کی ایک بہت ہی بُری بات کی طرف، جو ان کے نفاق کی واضح ترین نشانی شمار ہوتی ہے، اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں ان افراد پر جو رسول خدا کے پاس ہیں کچھ خرچ نہ کرو اور اپنے مال اور امکانات کو ان کے اختیار میں نہ دو تاکہ وہ پرانگندہ ہو جائیں۔“ **(ہم الذین یقولون لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتیٰ ینفصوا)۔**

”وہ اس بات سے غافل ہیں کہ آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے خدا ہی کے لیے ہیں، لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔“ **(وللہ خزائن السماوات والارض ولکن المنافقین لا یفقیہون)۔**

یہ بدبخت نہیں جانتے کہ ہر شخص کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا دیا ہوا ہے اور تمام بندے اسی کے نوان سے روزی کھاتے ہیں۔ اگر ’انصار‘ مہاجرین کو پناہ دے سکتے ہیں اور انھیں اپنے مال میں حصہ دار اور شریک بنا سکتے ہیں تو یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے جو انھیں نصیب ہے۔ لہذا انھیں نہ صرف یہ کہ احسان نہیں جتانا چاہیے، بلکہ خدا کا اس عظیم توفیق پر شکر ادا کرنا چاہیے، لیکن جیسا کہ شان نزول میں بیان ہوا ہے منافقین کی منطق کچھ اور ہی تھی۔

اس کے بعد ان کی ایک اور نفرت انگیز بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: (يقولون لئن رجعنا الى المدينة ليخرجن الاعز منها الاذل)۔

یہ وہی گشتگو ہے جو عبداللہ بن ابی کے آلودہ دہن سے نکلی اور اس کی مراد یہ تھی کہ ہم مدینہ کے رہنے والے رسول اللہ اور مومن مہاجرین کو مدینہ سے باہر نکال دیں گے۔ مدینہ کی طرف لوٹنے سے مراد غزوہ ”بنی المصطلق“ سے لوٹنا تھا، اور اس کی طرف شان نزول میں تفصیل کے ساتھ اشارہ ہو چکا ہے۔

اگرچہ یہ بات صرف ایک ہی شخص نے کہی تھی لیکن چونکہ سب منافقین کا طرز عمل اور طریقہ کار یہی تھا، لہذا قرآن جمع کی صورت میں تعبیر کرتے ہوئے فرماتا ہے: (يقولون...) (وہ کہتے ہیں)

اس کے بعد قرآن انہیں دندان شکن جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: ”عزت تو خدا، رسول اور مومنین کے لیے مخصوص ہے لیکن منافقین نہیں جانتے“ (ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين ولكن المنافقين لا يعلمون)۔

یہ صرف مدینہ کے منافقین ہی نہیں تھے کہ جنہوں نے مومن مہاجرین کے مقابلہ میں یہ بات کہی، بلکہ اس سے پہلے سردارانِ قریش بھی مکہ میں یہی بات کہا کرتے تھے: اگر ہم مسلمانوں کے اس چھوٹے سے فقیر گروہ کا اقتصادی محاصرہ کر لیں یا انہیں مکہ سے باہر نکال دیں تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں بھی استعماری اور سامراجی حکومتیں اس خیال سے کہ آسمان وزمین کے خزانے ان کے پاس ہیں، یہ کہتی ہیں کہ وہ قویں جو ہمارے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتیں ان کا اقتصادی محاصرہ کرنا چاہیے تاکہ ان کی عقل ٹھکانے آجائے اور وہ سر تسلیم خم کر دیں۔

ان تاریخ کے اندھوں کو جن کا شیوہ کل بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے، اس بات کی خبر نہیں کہ خدا کے ایک ہی اشارہ پر ان کی تمام ثروت اور امکانات تباہ ہو جائیں گے اور ان کی عارضی اور ظاہری عزت قانون فنا کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگی۔

بہر حال یہ طرز فکر کہ اپنے آپ کو عزت دار سمجھنا اور دوسروں کو ذلیل اپنے آپ کو ولی نعمت شمار کرنا اور دوسروں کو محتاج، ایک منافقانہ طرز فکر ہے۔ یہ ایک طرف تو غرور و تکبر سے اور دوسری طرف خدا کے مقابلے میں استقلال کے گمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہ عبودیت کی حقیقت سے آشنا ہوتے اور خدا کی مالکیت کو ہر چیز پر مسلم سمجھتے تو ہرگز ان خطرناک غلیبوں کا شکار نہ ہوتے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں منافقین کے بارے میں ”لا يفقهون“ (نہیں سمجھتے) کی تعبیر آئی ہے اور یہاں ”لا يعلمون“ (نہیں جانتے) کی تعبیر آئی ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے تکرار سے پرہیز کے لیے ہو جو فصاحت کے خلاف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس بناء پر ہو کہ خدا کا تمام آسمانوں اور زمین کے خزانے کا مالک ہونا بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے جو بہت زیادہ وقت اور فہم و فراست کا محتاج ہے، جبکہ عزت کا، خدا پیغمبر اور مومنین کے ساتھ

مخصوص ہونا کسی پر مخفی نہیں ہے۔

چند نکات

۱: منافق کی دس نشانیاں

اوپر والی تمام آیات سے منافق کی متعدد نشانیوں کا پتہ چلتا ہے، ان کا یکجا طور پر دس نشانیوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے :

- ۱: صریح و آشکار جھوٹ (واللہ یشہد ان المنافقین لکاذبون)
 - ۲: لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا۔ (اتخذوا ایمانہم جنۃ)
 - ۳: دین کی شناخت کے بعد اُسے چھوڑ دینے کی بناء پر حقیقت اور واقعیت کو نہ سمجھ سکتا۔ (لا یفقیہون)
 - ۴: باطن کے خالی ہونے کے باوجود ظاہر میں آراستہ اور چکنی چٹری باتیں کرنا۔ (واذا سرأیتہم تعجبک اجسامہم)
 - ۵: معاشرے میں بے ہودگی اور حق سے عدم توجہ کی بناء پر لکڑی کے ایک خشک ٹکڑے کی مانند ہونا۔ (کانہم خشب مسندۃ)
 - ۶: خانہ ہونے کی بناء پر ہر حادثہ اور ہر چیز سے بدگمانی اور خوف و دہشت۔ (یحسبون کل صیحة علیہم)
 - ۷: حق کا مذاق اڑانا اور تمسخر کرنا۔ (لو وارسعوسہم)
 - ۸: فسق و گناہ۔ (ان اللہ لا یمدی القوم الفاسقین)
 - ۹: اپنے آپ کو ہر چیز کا مالک جاننا اور دوسروں کو اپنا محتاج سمجھنا۔ (ہم الذین یقولون لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتی ینفضوا)
 - ۱۰: اپنے آپ کو عزت دار اور دوسروں کو ذلیل سمجھنا۔ (لینخرجن الاعز منها الاذل)
- اس میں شک نہیں کہ منافق کی نشانیاں انہیں چیزوں میں نہیں ہیں بلکہ، قرآنی آیات، اسلامی روایات اور سنج البلاغہ سے ان کی اور بھی بہت سی نشانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کی معاشرت سے بھی ان کے دوسرے اوصاف اور خصوصیات کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سورۃ کی آیات میں جو کچھ آیا ہے وہ ان اوصاف کا ایک اہم اور قابل توجہ حصہ ہے۔
- سنج البلاغہ میں ایک خطبہ منافقین کی کیفیت کے لیے مخصوص ہے۔ اسی خطبہ کے ایک حصہ میں اس طرح آیا ہے :

”اے خدا کے بندو! میں تمہیں تقویٰ اور پرہیزگاری کی وصیت کرتا ہوں اور منافقین سے ڈراتا ہوں، کیونکہ وہ خود گمراہ اور گمراہ کرنے والے خطاکار اور غلط انداز ہیں۔“

”وہ ہر روز ایک نئے رنگ میں آتے ہیں اور مختلف قیافوں اور زبانون کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔“
”وہ ہر طریقہ سے تمہیں فریب دینے اور درہم برہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر کین گاہ میں تمہاری لگات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”وہ بد بطن اور خوش ظاہر ہیں اور ہمیشہ پوشیدہ طور پر لوگوں کو فریب دیتے اور غلط راہ پر چلتے ہیں۔“
”ان کی گفتگو بظاہر شفا بخش ہے لیکن ان کا کردار ایک علاج ناپذیر بیماری ہے۔ وہ لوگوں کی خوش حالی پر پرحد کرتے ہیں اور اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔“

”ہمیشہ امیدواروں کو مایوس کرتے ہیں اور ہر جگہ ناامیدی کی آیت پڑھتے ہیں۔“
”ہر راستے میں ان کا کوئی نہ کوئی کشتہ (مارا ہوا) ہے۔ ہر دل میں نفوذ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ رکھتے ہیں اور ہر مصیبت کے لیے بناوٹی آئسو بہاتے ہیں۔“

”ایک دوسرے کو مدح و ثنا کا قرضہ دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے اجرو پاداش کی توقع رکھتے ہیں۔“
”اپنے تقاضوں میں اصرار کرتے ہیں اور ملامت کرنے میں پردہ دری کرتے ہیں۔ جب کوئی حکم لگاتے ہیں تو حد سے تجاوز کرتے ہیں۔“

”انہوں نے ہر حق کے مقابلے میں ایک باطل گھڑ لیا ہے۔ اور ہر دلیل کے مقابلے میں ایک شبہ کھڑا کر دیا ہے۔ انہوں نے ہر زندہ کے لیے موت کا عامل، ہر در کے لیے ایک کلید اور ہر رات کے لیے ایک چراغ مہیا کیا ہے۔“

”وہ اپنی طمع کاری اور گرمی بازار کے لیے اور اپنے مال و اسباب کو گراں ترین قیمت پر بیچنے کے لیے دلوں میں یاس و ناامیدی کا بیج بوسے ہیں۔“

”اپنے باطل کو حق پر ظاہر کر کے دکھاتے ہیں اور تعریف و توصیف میں فریب کی راہ اختیار کرتے ہیں۔“
”اپنی خواہشات تک پہنچنے کی راہ کو آسان اور اپنے جال سے نکلنے کی راہ کو پُر پیچ و خم بنا کر دکھاتے ہیں وہ شیطان کا لشکر اور جہنم کی آگ کے شرارے ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے: ”اولئک حزب الشیطان الان حزب الشیطان ہم الخاسرون۔“ ”وہ شیطان کا گروہ ہیں، جان لو کہ شیطان کا گروہ خسارے میں ہے۔“
اس روشن خطبہ میں ان کے بہت سے اوصاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو گزشتہ مباحث کی تکمیل کرتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

۲ : منافقین کا خطرہ

جیسا کہ ہم نے اس بحث کے مقدمہ میں بیان کیا ہے منافقین ہر معاشرے کے خطرناک ترین افراد ہوتے ہیں کیونکہ: اولاً: وہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے تمام بھیدوں سے واقف ہوتے ہیں۔

ثانیاً: انھیں پہچانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اکثر اپنے آپ کو اس طرح دوست کے لباس میں پیش کرتے ہیں کہ انسان کو یقین ہی نہیں آتا کہ وہ منافق ہیں۔

ثالثاً: چونکہ ان کا اصلی چہرہ بہت سے لوگوں کے لیے پہچانا ہوا نہیں ہوتا، اس لیے ان سے براہ راست الجھنا اور صریح مبارزہ کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔

رابعاً: مومنین کے ساتھ ان کے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں (نسبی، سببی رشتے اور دوسرے تعلقات) اور انھیں رشتوں کی وجہ سے ان کے ساتھ مبارزہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

خامساً: وہ معاشرے کی بیٹھ میں خنجر گھونپتے ہیں اور ان کی ضربیں غفلت کی حالت میں چھنی ہیں۔ اسی قسم کی دوسری جہتوں سے بھی وہ معاشرہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں، لہذا اسی بناء پر ان کے شرک و دفع کرنے کے لیے دقیق و وسیع پروگرام مرتب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر نے فرمایا:

”انی لا اخاف علی امتی مؤمننا ولا مشرکنا اما المؤمن فیمنعہ بایمانہ، واما المشرک فیخزیہ اللہ بشرکہ، ولکنی اخاف علیکم کل منافق عالم اللسان، یمقل ما تعرفون ویفعل ما تنکرون“

”میں اپنی امت کے لیے نہ مومنین سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی مشرکین سے۔ مومن کو اس کا ایمان اُس کے شر پہنچانے سے مانع ہے اور مشرک کو خدا اُس کے شرک کی وجہ سے رسوا اور ذلیل کرتا ہے۔ لیکن میں تم میں اُس منافق سے ڈرتا ہوں کہ جس کی زبان سے علم ٹپکتا ہے (اور اس کے دل میں کفر و جہالت ہے) وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو تمھارے دل پذیر ہیں لیکن (مخفیانہ طور پر) ایسے اعمال انجام دیتا ہے جو قبیح اور بُرے ہیں۔“

منافقین کے بارے میں ہم نے جلد اول (سورۃ بقرہ کی آیات ۸ تا ۱۶ کے ذیل میں اور جلد ۴ (سورۃ توبہ آیت ۲۳ تا ۲۵ کے ذیل میں) اور جلد ۴ (سورۃ توبہ آیات ۶۰ تا ۸۵ کے ذیل میں) اور جلد ۹ (سورۃ احزاب آیات ۱۲ تا ۱۷ کے ذیل میں) تفصیلی بحث کی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہت کم گروہ ایسے ہیں جن کے بارے میں قرآن نے اتنی بحثیں کی ہوں اور ان سے کی

نشانیں، اعمال اور خطرات بیان کیے ہوں، قرآن کا اس سلسلہ میں اتنا وسیع بیان منافقین کے حد سے زیادہ خطرے کی دلیل ہے۔

۳ : منافق بے اخلاص اور ٹوٹنے والا ہے

زندگی میں بہت سے طوفان اُٹھتے ہیں اور تند و تیز لہریں اُبھرتی ہیں۔ مومنین ایمان و توکل کی قوت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے صحیح منصوبوں کے ذریعہ کبھی جنگ و گریز اور کبھی پلے در پلے حملے کر کے انہیں سر سے گزار کر کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن منافق ہٹ دھرمی کرتے ہوئے اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹوٹ کر بے بس ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے :

”مثل المؤمن كمثل الزرع لا تنزال الريح تميله ، ولا يزال المؤمن يصيبه البلاء ، ومثل المنافق كمثل شجرة الاسنہ لا تثمر حتى تستحصد“

مومن زراعت کی شاخوں کی طرح ہے، جنہیں ہوائیں گرا دیتی ہیں، لیکن وہ پھر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ سخت حادثات اور بلاؤں کو برداشت کرتی اور سر سے گزار دیتی ہیں۔ لیکن منافق صنوبر کے درخت کی مانند ہوتا ہے جو نرمی دکھاتے بغیر کھڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اُسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔“

۴ : عزت خدا اور اس کے دوستوں کے لیے مخصوص ہے۔

اگرچہ روزمرہ کی فارسی (اور اردو زبان میں) ”عزت“ آبرو، احترام اور گرانقدر ہونے کے معنی میں ہے، لیکن عربی زبان میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ”عزت“ شکست ناپذیر قدرت کے معنی میں ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات اور سورۃ فاطر کی آیت ۱۰ میں ”عزت“ کی صفت خدا میں منحصر شمار کی گئی ہے۔ اور وہ زیر بحث آیات میں یہ اضافہ کرتا ہے : ”اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔“ کیونکہ خدا کے اولیاء اور دوست اسی کی عزت کا پرتو رکھتے اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اسی درجہ سے اسلامی روایات میں اس مسئلہ پر تاکید ہوئی ہے کہ مومن کو اپنی ذات کے وسائل فراہم نہیں کرنے چاہئیں۔ خدا چاہتا ہے کہ مومن عزیز رہے تو پھر اُسے بھی اس عزت کی حفاظت کی کوشش کرنا چاہیے۔ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے اسی آیت (وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ) کی تفسیر میں آیا ہے :

”فَالْمُؤْمِنُ يَكُونُ عَزِيزًا وَلَا يَكُونُ ذَلِيلًا..... الْمُؤْمِنُ اعَزُّ مِنَ الْجَبَلِ
ان الجبل يستقل منه بالمعاول، والمؤمن لا يستقل من دينه شيء“

”مؤمن عزیز ہے اور وہ ذلیل نہیں ہوتا۔ مومن پہاڑ سے بھی زیادہ سخت اور مستحکم ہوتا ہے، کیونکہ پہاڑ میں تو کدال سے سوراخ کرنا ممکن ہے۔ لیکن مومن کے ایمان میں سے ہرگز کسی چیز کو ہلایا نہیں جاسکتا۔“
ایک اور حدیث میں امام صادقؑ ہی سے آیا ہے :

”لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَذِلَّ نَفْسَهُ قِيلَ لَهُ وَكَيْفَ يَذِلُّ نَفْسَهُ قَالَ
يَتَعَرَّضُ لِمَا لَا يَطِيقُ“

”مناسب نہیں ہے کہ مومن اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ سوال کیا گیا : وہ اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ فرمایا : ایسے کام کے پیچھے جاتے جو اس سے نہیں ہو سکتا۔“

ایک اور حدیث میں بھی اُنھی سے آیا ہے :

”إِنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى فَوْضَ إِلَى الْمُؤْمِنِ أَمْرَهُ كَلَمًا وَلَمْ
يَفُوضْ إِلَيْهِ أَنْ يَذِلَّ نَفْسَهُ أَلَمْ تَرَ قَوْلَ اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى هَيْهَنَا“ وَلِلّٰهِ
الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ“ وَالْمُؤْمِنُ يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ عَزِيزًا وَلَا يَكُونُ
ذَلِيلًا“

”خدا نے مومن کے تمام کام خود اس کے سپرد کر دیئے ہیں۔ لیکن خدا نے اس کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل و خوار کرے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ خدا نے اس سلسلہ میں یہ فرمایا ہے : عزت خدا، اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہی مخصوص ہے۔ لہذا مومن کے لیے یہی بات مناسب اور لائق ہے کہ وہ ہمیشہ عزیز رہے اور ذلیل و خوار نہ ہو۔“

اس سلسلہ میں ہم نے جلد ۱۰، سورۃ فاطر آیت ۱۰ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے :

۹) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝

۱۰) وَأَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۖ فَأَصَّدَّقَ ۚ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝
۱۱) وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

۹) اے ایمان لانے والو! تمہارے مال اور اولاد تمہیں یا دِخدا سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کریں گے وہ خسارے میں رہیں گے۔

۱۰) ہم نے تمہیں جو روزی دے رکھی ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آ پہنچے اور وہ یہ کہنے لگے۔ پروردگارا! تو نے میری موت میں تھوڑی سی تاخیر کیوں نہ کی تاکہ میں صدقہ دول اور صالحین میں سے ہو جاؤں۔

۱۱) جب کسی کی اجل آ پہنچتی ہے تو خدا ہرگز کسی کی موت کو تاخیر میں نہیں ڈالتا اور خدا

تمھارے ان اعمال سے جنہیں تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

مال اور اولاد تمہیں خدا کی راہ سے غافل نہ کر دیں

چونکہ نفاق کا ایک اہم عامل حُب دنیا اور مال و اولاد سے بہت زیادہ لگاؤ ہے، لہذا سورہ منافقون کی ان آخری آیات میں مومنین کو اس قسم کے اندھے لگاؤ سے باز رکھتے ہوئے کہتا ہے: ”اے ایمان لانے والو! تمھارے مال اور اولاد تمہیں یاد خدا سے غافل نہ کر دیں۔“ (یا ایہا الذین امنوا لا تلمھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ)۔

”اور جو ایسا کریں گے وہ خسارے میں رہیں گے۔“ (و من یفعل ذلک فناولک ہم الخاسرون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ اموال اور اولاد عطیاتِ خداوندی میں سے ہیں، لیکن اس حد تک کہ خدا کی راہ اور سعادت کے حصول کے لیے اُن سے مدد لی جائے۔ لیکن اگر ان کے ساتھ اتنا زیادہ لگاؤ ہو جائے کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان رکاوٹ بن جائیں تو پھر وہ سب سے بڑی بلا شمار ہوں گے، اور جیسا کہ منافقین کی داستان سے متعلق گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ان کے انحراف کا ایک عامل یہ حُب دنیا ہی تھا۔ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے اس مطلب کو انتہائی واضح صورت میں پیش کیا گیا ہے، جن میں آپ فرماتے ہیں کہ:

”ما ذنبان ضاریان فی غنم لیس لہما راع، لہذا فی اولہما و لہذا فی آخرہما باسرع فیہما من حب المال والشرط فی دین المؤمن۔“

”دو درندہ بھیڑیے بغیر چرواہے کے بھیڑوں کے گلہ میں ہوں جن میں سے ایک اُس کے آگے اور دوسرا پیچھے ہو، وہ اس قدر ضرر نہیں پہنچاتے جتنا مال پرستی اور جاہ طلبی مومن کے دین کو ضرر پہنچاتی ہے۔“ لے یہاں ذکرِ خدا سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔ بعض نے پانچ وقت کی نمازوں سے، بعض نے شکرِ نعمت، مصیبتوں پر صبر اور قضا پر راضی رہنے سے اور بعض نے حج و زکات اور تلاوتِ

قرآن سے اور بعض نے تمام فرائض سے تعبیر کی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ ذکر خدا ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ان سب کو اور ان کے علاوہ دوسرے امور کو بھی شامل ہے۔ اس بناء پر اوپر والے امور سے تفسیر کرنا، واضح مصادیق کے ذکر کی قسم سے ہے۔

”خاصرون“ (زیاں کاروں) کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ دنیا کی محبت انسان کو اس طرح سرگرم کر دیتی ہے کہ وہ اپنے وجود کے سرمایوں کو ناپائیدار لذتوں کی راہ میں اور بعض اوقات ادھام و خیالات کی راہ میں صرف کر دیتا ہے، وہ اس دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے، حالانکہ اس کے پاس عظیم سرمائے موجود تھے۔ لیکن اُس نے اپنی جادوئی زندگی کے لیے کچھ نہیں کیا۔

اس کے بعد مومنین کو اس شدید خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے راہ خدا میں انفاق کرنے کا حکم صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور جو روزی ہم نے تمہیں دی ہوئی ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کبھی کی موت آپہنچے، اور وہ یہ کہنے لگے: پرودگارا! تو نے میری موت میں تھوڑی سی مدت کے لیے تاخیر کیوں کی، تاکہ میں انفاق کروں اور صالحین میں سے ہو جاؤں۔“ (و انفقوا مما رزقناکم من قبل ان یأتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخیرتخی الی اجل قریب فاصدق و اکن من الصالحین)۔ اگرچہ بعض نے یہاں انفاق کی تفسیر ادائے زکوٰۃ میں تعجیل کے وجوب کے معنی میں کی ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ آیت کا مقصد ہر قسم کے واجب و مستحب انفاق کو شامل ہے جو آخرت میں انسان کی نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیت کے ذیل میں کہتا ہے: ”میں انفاق کروں اور صالحین میں سے ہو جاؤں۔“ یہ تعبیر انسان کے صالح ہونے میں، انفاق کی گہری اور عمیق تاثیر کو بیان کرتی ہے۔ اگرچہ بعض نے یہاں صالح ہونے کی تفسیر ”مراسم حج“ انجام دینے سے کی ہے۔ بعض روایات میں بھی یہ صراحت کے ساتھ آیا ہے، لیکن یہ بھی واضح مصداق کی قسم سے ہے۔

”من قبل ان یأتی احدکم الموت“ کا جملہ انسان کے آئندہ موت پر پہنچنے اور اس کی علامات کے ظاہر ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ یہ بات موت کے بعد نہیں کہے گا، بلکہ موت کی چوکھٹ پر کہے گا۔ مِمَّا رَزَقْنَاکُمْ (ہم نے جو روزی تمہیں دے رکھی ہے اس میں سے) کی تعبیر، اس بات کے علاوہ کہ یہ صرف مال میں منحصر نہیں بلکہ تمام مواہب اور نعمتوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، اس حقیقت کو بھی بیان کرتی ہے کہ یہ سب کچھ کسی دوسری جانب سے ملا ہے اور یہ امانت چند دن کے لیے ہمارے

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں ’اصدق‘ منصوب ہے اور ’اکن‘ مجزوم ہے۔ حالانکہ ان کا ایک دوسرے پر عطف ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ ’اکن‘ کا ’اصدق‘ کی جگہ پر عطف ہے۔ اور تقدیر میں اس طرح ہے: ان اخیرتخی اصدق و اکن من الصالحین۔

پاس ہے، اس بناء پر سچل کرنے کے کیا معنی؟

سہر حال بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس وقت جبکہ وہ برزخی آنکھ سے دیکھنے لگتے ہیں اور خود کو زندگی کے آخری لمحات میں قیامت کی چوکھٹ پر دیکھتے ہیں، غفلت کے پروے اور بے خبری کے حجاب ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں اموال اور سرمایوں کو چھوڑ کر جانا پڑے گا اور اب وہ اس میں سے اس طوفانی سفر کے لیے کوئی زادِ راہ بھی نہیں لے سکتے تو وہ پشیمان ہوتے ہیں اور حسرت کے آگ ان کی جان میں لگ جاتی ہے۔ پھر وہ زندگی کی طرف لوٹنے کا تقاضا کرتے ہیں، چاہے وہ لوٹنا کتنا ہی مختصر اور جلدی سے گذر جانے والا ہی کیوں نہ ہو تاکہ وہ تلافی کر سکیں۔ لیکن ان کی اس التجا کو ٹھکرا دیا جائے گا کیونکہ سنتِ الہی یہ ہے کہ موت کے راستے میں بازگشت نہیں ہوتی۔

اسی لیے آخری آیت میں پوری قاطعیت کے ساتھ فرماتا ہے: ”جب کسی کی اجل آپہنچتی ہے تو خدا ہرگز کسی کی موت کو تاخیر میں نہیں ڈالتا“ (ولن يؤخر الله نفسا اذا جاء اجلها)۔ یہاں تک کہ ایک لمحہ کے لیے بھی آگے یا پیچھے نہیں ہوگی، جیسا کہ قرآن کی کئی دوسری آیات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سورۃ اعراف کی آیت ۳۴ میں آیا ہے: ”فانذا جاء اجلهم لا يستأخرون ساعة ولا يستقدمون“ جب ان کی اجل آجائے گی تو وہ نہ تو ایک ساعت کے لیے تاخیر کر سکیں گے اور نہ ہی پیشقدمی ہو سکے گی۔

انجام کارِ آیت کو اس جملہ کے ساتھ ختم کرتا ہے: ”جو عمل بھی تم انجام دیتے ہو، خدا اس سے آگاہ ہے۔“ (والله خبير بما تعملون)۔

ان سب اعمال کو جزا و سزا کے لیے ثبت کر لیا گیا ہے اور تمہیں ان سب کا بدلہ ملے گا۔

پہنڈ نکات

۱: پریشانیوں پر غلبہ کی راہ

عالم بزرگ شیخ عبداللہ سوشتری جو مرحوم علامہ مجلسی کے معاصرین میں سے تھے، ان کے حالات میں آیا ہے کہ ان کا ایک بیٹا تھا جس سے وہ بہت ہی محبت کرتے تھے۔ یہ بیٹا سخت بیمار ہو گیا۔ اس کے والد مرحوم شیخ عبداللہ جب نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں آئے تو پریشان تھے۔ جب اسلامی دستور کے مطابق دوسری رکعت میں سورۃ منافقون پڑھی اور اس آیت پر پہنچے: یا ایہا الذین امنوا لا تلہکم اموالکم ولا

اولادکم عن ذکر اللہ۔ ”اے ایمان لانے والو! تمہارے مال اور اولاد تمہیں یاد خدا سے غافل نہ کر دیں۔“
تو اس آیت کی کئی بار تکرار کی۔ (نماز میں آیات قرآن کی تکرار جائز ہے۔) جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو بعض دوستوں نے اس تکرار کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا:

”جب میں اس آیت پر پہنچا تو مجھے اپنا بیٹا یاد آگیا۔ لہذا میں اس آیت کی تکرار کے ذریعہ اپنے نفس سے مبارزہ کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس طرح سے مبارزہ کیا کہ میں نے فرض کر لیا کہ میرا بیٹا مر گیا ہے اور اس کا جنازہ میرے سامنے ہے اور میں خدا سے غافل نہیں ہوں، چنانچہ اس کے بعد پھر میں نے آیت کی تکرار نہیں کی۔“^۱

۲ : نفاق - ”اعتقادی“ و ”عملی“

نفاق ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کی ظاہر و باطن کی دوگانگی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اس کا ظاہری مصداق تو اعتقادی نفاق ہے اور عام طور پر منافقین کے متعلق آیات اسی بارے میں ہیں۔ وہ ایسے لوگوں سے مربوط ہیں جو ظاہر میں تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن دل میں شرک و کفر کو چھپاتے رکھتے ہیں۔ لیکن نفاق عملی ان لوگوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جن کا باطنی اعتقاد تو اسلام ہے لیکن وہ اس قسم باطنی کے برخلاف اعمال انجام دیتے ہیں کہ جو اندر اور باہر کے چہرے کی دوگانگی کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً عہد شکنی، جھوٹ اور امانت میں خیانت کرنا۔ اسی لیے پیغمبر گرامیؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

”ثلاث من كن فيه كان منافقا وان صام وصلى وشرع الله ملة من اذا تممن خان واذا حدث كذب، واذا وعد، اخلف“^۲

”تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں بھی ہوں وہ منافق ہے چاہے وہ روزے رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور خود کو مسلمان سمجھتا ہو۔“

جو امانت میں خیانت کرتا ہو۔

جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

جب وعدہ کرے تو اس سے تحلف کرے۔^۳

ایک اور حدیث میں رسول خداؐ سے آیا ہے:

^۱ ”سفینۃ البحار“ جلد ۲ ص ۱۳۱ (داماد عہد)۔ اس عالم بردگوار نے جو مختلف علوم میں صاحب نظر اور صاحب اثر تھے، ۱۰ ماہ محرم کی چھیویں رات ۱۲۱۱ھ

صبح کے وقت نماز تہجد کے وقت وفات پائی۔ مرحوم سید داماد نے علم کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی نماز جنازہ پڑھی۔

^۲ ”سفینۃ البحار“ جلد ۲ ص ۶۰۵

”ما نراد خشوع الجسد علی ما فی القلب فهو عندنا نفاق“
 ”جو کچھ دل میں ہے اس سے بڑھ کر خضوع و خشوع کرنا ہمارے نزدیک نفاق ہے۔“
 ایک دوسری جگہ امام علی بن الحسین سے آیا ہے :
 ”ان المنافقین ینہی ولا ینتہی دیا مسر بنا لا یأتی۔“
 ”منافق نہی عن المنکر تو کرتا ہے، لیکن خود اسے ترک نہیں کرتا۔ وہ امر بالمعروف تو کرتا ہے لیکن خود اسے انجام نہیں دیتا۔“
 عملی نفاق کے شعبوں میں سے شرک و ریاکاری کا مسئلہ بھی ہے کہ جس کی طرف اسلامی روایات میں اشارہ ہوا ہے۔

خداوند! نفاق کا دامن بہت ہی وسیع و گشادہ ہے اور تیرے لطف و کرم کے بغیر اس سے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ تو اس پریچ و حسم راہ میں ہماری مدد فرما!
 پروردگار! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے جو دنیا سے نصرت ہوتے وقت حسرت کی آگ میں نہیں جلتے اور واپس لوٹنے کا تقاضا نہیں کرتے۔
 بارِ الہا! آسمانوں اور زمین کے خزانے تیری ہی ملکیت ہیں اور عزت تجھ سے اور تیرے اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہمیں ایمان کی برکت سے عزت والا بنا دے اور اپنے بے پایاں خزانوں میں سے ایک حصہ مرحمت فرما۔
 آمین یا رب العالمین!

سورۃ منافقون کا اختتام

۱۸ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ بروز منگل بوقت پونے چھ بجے صبح بتاریخ ۲۴ ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۸۶ء بر مکان سیٹھ نواز شعلی۔ ۸۱، اے مادل ٹاؤن لاہور

۱۔ اصول کافی جلد ۲ (باب صفت النفاق حدیث ۶)
 ۲۔ اصول کافی جلد ۲ (باب صفت النفاق حدیث ۳)

سُورَةُ تَعَاٰیٰنِ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۸ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز

۱۸ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

سورۃ تغابن کے مضامین و مطالب

اس بارے میں کہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے یا مکہ میں، مفسرین کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ اگرچہ اس کا مدنی ہونا مشہور ہے جبکہ بعض اس کو سارا مکی، بعض اس کی صرف تین آخری آیات کو مدنی اور باقی سورہ کو مکی جانتے ہیں۔

یقیناً اس سورہ کی آخری آیات کا لب و لہجہ مدنی سورتوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ لیکن اس کا درمیانی حصہ مکی سورتوں کے ساتھ زیادہ موافق ہے۔ بہر حال ہم اسے مجموعی طور پر اس کی شہرت کے مطابق مدنی قرار دیتے ہیں۔

”ابو عبد اللہ زنجانی“ اپنی نفیس کتاب ”تاریخ القرآن“ میں فہرست ”ابن ندیم“ سے نقل کرتا ہے کہ سورہ تغابن تیسواں سورہ ہے جو مدینہ میں نازل ہوا۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مدنی سورتیں کل اٹھائیس ہیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ ان آخری سورتوں میں سے ہے جو پیغمبر پر نازل ہوئیں۔ لہٰذا ہم مضامین و مطالب کے لحاظ سے اس سورہ کو چند حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

- ۱ : سورہ کا آغاز جو توحید اور خدا کی صفات و افعال سے بحث کرتا ہے۔
- ۲ : اس کے بعد یہ سورہ علم خدا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ اپنے پوشیدہ اور آشکار اعمال کے نگران رہیں اور گزشتہ اقوام کی سرنشت کو فراموش نہ کریں۔
- ۳ : سورہ کا تیسرا حصہ معاد کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ گویا کہ روز قیامت، روز ”تغابن“ یعنی ایک گروہ کے خسارے میں ہونے اور ایک گروہ کے بڑھ جانے کا دن ہے۔ (سورہ کا نام بھی اسی سے لیا گیا ہے)
- ۴ : ایک حصہ میں خدا اور پیغمبر کی اطاعت کا حکم دیتا اور اس طرح اصل نبوت کی بنیادوں کو استحکام بخشتا ہے۔
- ۵ : سورہ کا آخری حصہ لوگوں کو راہ خدا میں خرچ کرنے کا شوق دلاتا اور مال، اولاد اور بیویوں کے فریب میں آنے سے ڈراتا ہے۔ پھر سورہ کو خدا کے نام اور اس کی صفات پر ختم کرتا ہے، جیسا کہ آغاز کیا تھا۔

❖ ❖ ❖

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

رسول خدا کی ایک حدیث میں آیا ہے :

”من قرأ سورة التنابین دفع عنه موت الفجأة“

”جو شخص سورہ تنابین پڑھے گا اس سے ناگہانی موت دور ہو جائے گی۔“

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے :

”من قرأ سورة التنابین فی فریضتہ کانت شفیعۃ لہ یوم القیامۃ وشامد

عدل عند من یجیز شہادتہا شہ لا تفارقه حتی یدخل الجنة“

”جو شخص سورہ تنابین کو اپنی واجب نماز میں پڑھے گا وہ قیامت کے دن اس کی شفاعت کرے

گی اور اس ہستی کے سامنے ایک ایسی شاہد عادل ہوگی جس نے اس کی شفاعت کی اجازت دی ہے

پھر اس سے الگ نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔“

ظاہر ہے کہ اس تلاوت کو غور و فکر سے توأم ہونا چاہیے۔ ایسی فکر جو اس کے مضامین و مطالب کو عمل میں

منکس کرے تاکہ قاری پر یہ تمام آثار و برکات مرتب ہوں۔

❖ ❖ ❖

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

- ١ يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝
- ٢ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝
- ٣ خَلَقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُورَكُمْ ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝
- ٤ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسْرُونَ وَمَا تَعْلَمُونَ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝
- ٥ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبُؤُا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ فَنَادَوْا بِآلِ آمُرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝
- ٦ ذَلِكَ بِأَنَّهُ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرُ يَهُدُونَنَا فَكُفَرُوا وَتَوَلَّوْا وَاسْتَغْنَى اللَّهُ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝

ترجمہ شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ① جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ مالکیت اور حکومت بھی اسی کے لیے ہے اور حمد و ستائش بھی اسی کے لیے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔
- ② اسی نے تم کو پیدا کیا ہے (اور تمہیں آزادی اور اختیار دیا ہے) پس تم میں سے ایک گروہ تو کافر ہے اور ایک گروہ مومن اور خدا تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔
- ③ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تمہیں صورت عطا کی اور تمہاری بہترین صورت بنائی اور آخر میں سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔
- ④ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اُسے جانتا ہے اور جو کچھ تم پہناؤ یا آشکار کرتے ہو وہ اس سے باخبر ہے اور جو کچھ دل میں ہے خدا اس سے آگاہ ہے۔
- ⑤ کیا ان (کافر) لوگوں کی خبر جو تم سے پہلے تھے تم تک نہیں پہنچی کہ انہوں نے اپنے گناہوں کا مزہ کس طرح چکھا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔
- ⑥ یہ اس بناء پر ہوا کہ ان کے رسول واضح دلائل کے ساتھ ان کے پاس آئے تھے، لیکن انہوں نے (کبر و غرور کی بناء پر یہ) کہا: کیا افراد بشر ہمیں ہدایت کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح سے وہ کافر ہو گئے، اور انہوں نے دُور گردانی کی۔ اور خدا (ان کے ایمان اور اطاعت سے) بے نیاز تھا، اور خدا غنی اور لائق حمد و ستائش ہے۔

تفسیر

وہ دلوں میں چھپے ہوئے اسرار سے آگاہ ہے۔

اس سورہ کا بھی تسبیح خدا سے آغاز ہوتا ہے۔ وہ خدا جو کل جہان ہستی کا مالک اور اس پر حاکم ہے اور ہر چیز پر

قدرت رکھتا ہے فرماتا ہے: ”جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا کی تسبیح کرتا ہے۔“ (یسع للہ ما فی السماوات وما فی الارض)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: مالکیت اور حاکمیت اسی کے لیے ہے۔ (لہ الملک)۔
”اور (اسی بنا پر) تمام حمد و ستائش کی بازگشت اسی کی پاک ذات کی طرف ہے۔“ (ولہ الحمد)۔
”اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“ (وہو علی کل شیء قدير)۔

چونکہ ہم تمام موجودات عالم کی تسبیح عمومی کے بارے میں بارہا بیان کر چکے ہیں اور متعدد تفاسیر جو اس موضوع کے بارے میں بیان ہوئی ہیں انہیں ہم نقل کر چکے ہیں اس لیے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔
یہ تسبیح اور حمد حقیقت میں اس کے ہر چیز پر قادر ہونے اور ہر چیز کے اس کی مالکیت ہونے کا لازمہ ہے، کیونکہ اس کے تمام اوصاف جمال و جلال انہیں دو امور میں سمجھے جوتے ہیں۔

اس کے بعد امر خلقت و آفرینش کی طرف، جو قدرت کا لازمہ ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے۔“ (هو الذی خلقکم)۔

اور تمہیں آزادی اور اختیار کی نعمت عطا کی۔ اس لیے تم میں سے ایک گروہ مومن اور ایک گروہ کافر ہو گیا۔
(فمنکم کافر ومنکم مؤمن)۔

اس طرح سے خدائی امتحان اور آزمائش کا بازار گرم ہو گیا، اور اس اثناء میں ”جو عمل بھی تم انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھتا ہے۔“ (واللہ بما تعملون بصیر)۔

اس کے بعد مسئلہ ”خلقت“ کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اور خلقت و آفرینش کے ہدف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔“ (خلق السماوات والارض بالحق)۔

اس کی خلقت میں بھی حق اور ایک دقیق نظام ہے اور اس میں حکیمانہ ہدف اور حق پر مبنی مصلحتیں بھی ہیں۔ چنانچہ سورہ ص کی آیت ۲۷ میں بھی فرماتا ہے: ”وما خلقنا السماء والارض وما بینہما باطلاً ذالک ظن الذین کفروا:“ ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ یہ کافروں کا گمان ہے۔“

لے ”فان“ تعزیر کا ذکر یہاں اس لیے نہیں ہے کہ ایمان و کفر بھی اللہ کی مخلوق ہیں، بلکہ یہ اس بنا پر ہے کہ خلقت کے بعد اس نے انسان کو ابراہیم کی آزادی دی ہے، اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ کافر و مومن دو گروہ پیدا ہوئے۔

اس کے بعد انسان کی خلقت کو بیان کرتے ہوئے اور ہمیں سیرِ آفاقی سے سیرِ انفسی کی طرف دعوت دیتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”اس نے تجھیں صورتِ عطا کی اور تمھاری بہترین تصویر بنائی“ (وصورکم فاحسن صورکم)۔ اس انسان کو جس کا ظاہر آراستہ اور باطن پیراستہ ہے، ایک روشن عقل اور قوی شعور عطا کیا اور جو کچھ پورے عالم ہستی میں ہے اس کے نمونے اس کے وجود میں پیدا کیے، اس طرح سے کہ ”عالمِ کبیر“ اس ”جزمِ صغیر“ میں حائل ہو گیا۔

لیکن جیسا کہ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”انجام کار ہر چیز کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔“ (و الیہ المصیر)۔

ہاں! وہ انسان جو مجبوتہٴ عالمِ ہستی کا ایک جز ہے، خلقت کے لحاظ سے کل عالم کے باہر ہونے کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ پست ترین مراحل سے اس نے چلنا شروع کیا، اور غیر متناہی منزل کی طرف، جو حق تعالیٰ کا وجودِ بے پایاں اور خدا کا قُرب ہے، آگے بڑھ رہا ہے۔

”فاحسن صورکم“ (تمھاری بہترین صورت بنائی) کی تعبیر ظاہری صورت کو بھی شامل ہے اور باطنی صورت کو بھی، جسم کے لحاظ سے، بھی اور رُوح کے لحاظ سے بھی۔ پیچ تو یہ ہے کہ انسان کے جسم و جان پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے، کہ عالمِ ہستی کا خوبصورت ترین موجود یہی ہے۔ خدا نے اس موجود کی خلقت میں عجیب و غریب قدرتِ نمائی کی اور اسے ہر لحاظ سے کامل بنایا ہے۔

✦ ✦ ✦

چونکہ انسان کو ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لہذا اُسے ہمیشہ پروردگار کی نگرانی میں رہنا چاہیے۔ وہ پروردگار جو اس کے ظاہر و باطن سے باخبر ہے۔ اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”خدا اُسے بھی جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اس سے بھی باخبر ہے جسے تم پنہاں یا آشکارا کرتے ہو، وہ ان عقاید اور نیتوں سے بھی آگاہ ہے جو تمھارے سینوں کے اندر ہیں۔“ (یصلع ما فی السماوات والارض ویعلم ما ترون وما تعلنون واللہ علیہ بذات الصدور)۔

یہ آیت خدا کے بے پایاں علم کی تین مرحلوں میں تصویر کشی کرتی ہے:

اول: اس کا علم آسمانوں اور زمین کے تمام موجودات کے بارے میں۔

دوئم: اس کا علم انسانوں کے اعمال کے بارے میں چاہے وہ چھپا کر کرتے ہوں یا آشکارا کرتے ہوں۔

سوئم: خصوصیت کے ساتھ عقایدِ باطنی، نیتوں کی کیفیت کو اور جو کچھ انسان کے دل و جان پر حکم فرما رہا ہے، اسے بھی جانتا ہے۔

انسان میں خدا کے اس وسیع علم کی معرفت کا حد سے زیادہ تربیتی اثر ہوتا ہے۔ یہ اس کو خبردار کرتا ہے کہ تو چاہے جو کچھ بھی ہے اور جہاں کیس بھی ہے تیرا ہر عقیدہ، تیرے دل کی ہر نیت اور تیری رُوح و جان کے سارے

اخلاق حق تعالیٰ کے بے پایاں علم کی بارگاہ میں آشکار ہیں۔ منسلک طور پر اس حقیقت کی طرف توجہ انسان کی اصلاح و تربیت میں مدد سے زیادہ مؤثر ہے۔ یہ ایسی تعلیمات ہیں جو انسان کو مقصد خلقت اور قانون تکامل تک پہنچنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔

چونکہ وسائل تربیت اور انذار کے طریقوں میں سے ایک موثر ترین ذریعہ، گزشتہ اقوام اور امتوں کی سرفروشت کی طرف توجہ دلانا ہے، لہذا بعد والی آیت ان کی زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے انسان کو مخاطب کر کے کہتی ہے: ”کیا تم تک ان کافروں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے تھے۔ انھوں نے کس طرح اپنے گناہان کبیرہ کا تلخ ذائقہ چکھا اور ان کے لیے آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے“ (العریاء تکھنوا الذین کفروا من قبل فذاقوا وبال امرهم ولهم عذاب الیم)۔

تم شام اور دوسرے علاقوں کی طرف جاتے ہوئے ان کے عذابی اور ویران شہروں کے قریب سے گزرتے ہو اور ان کے کفر، ظلم اور گناہوں کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ ہاں! ان کی خبروں کو تم تاریخ میں پڑھتے ہو۔ وہی لوگ جن کی زندگی کا دفتر طوفان و سیلاب سے درہم برہم ہوا یا بجلیوں نے جن کی خرمین عمریں آگ لگا دی، یا ویران و تباہ کرنے والے زلزلوں نے انھیں زمین کے منہ کا لقمہ بنا دیا اور تیز آندھی نے ان کے بھاری بھر کم جسموں کو تشکوں کی طرح ہر طرف اڑا دیا۔ یہ تو ان کا دنیاوی عذاب تھا، لیکن آخرت میں بھی ایک دردناک عذاب ان کا منتظر ہے۔

بعد والی آیت اس دردناک سرفروشت کے منشا، اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: ”اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے انبیاء و رسل واضح دلائل اور معجزات کے ساتھ ان کی طرف آئے، لیکن وہ لوگ کبر و غرور کی وجہ سے یہ کہا کرتے تھے: ”کیا انسان ہماری ہدایت کریں گے؟ کیا یہ بات ممکن ہے؟“ (فلک باندہ کانت تأتیهم رسلهم بالبینات فخالوا بشری یصد ونا)۔

اس بیہودہ گفتگو کیساتھ وہ ان کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، ”یوں وہ کافر ہو گئے اور انھوں نے حق کو قبول کرنے سے روگردانی کی“ (فکفروا و قتلوا)۔

”حالانکہ خدا ان کے ایمان اور ان کی اطاعتوں سے بھی بے نیاز تھا“ (واستغنی اللہ)۔

اگر انھیں ایمان، اطاعت اور پرہیزگاری کے لیے مکلف فرمایا ہے تو وہ صرف ان کی منفعت یعنی اس جہان میں اور دوسرے جہان میں ان کی سعادت اور نجات کے لیے تھا۔

ہاں! ”خدا بے نیاز ہے اور ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے“ (واللہ عنی حمید)۔

اگر ساری کائنات کافر ہو جائے تو اس کے دامن کبریا ئی پر کوئی گرد نہیں بیٹھتی۔ اسی طرح اگر تمام مخلوقات مومن اور اس کی مطیع فرمان ہو جائے تو اس کے جلال میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم ہی ہیں جو اس قسم کے تربیتی، اصلاحی اور تکامل و ارتقاء کے اصول و قوانین کے محتاج ہیں۔

”وَاسْتَغْنَى اللَّهُ“ (خدا بے نیاز تھا) کی تعبیر، اس طرح مطلق ہے کہ ہر چیز سے، یہاں تک کہ انسانوں کے ایمان اور اطاعت سے بھی، اس کی بے نیازی کو بیان کرتی ہے تاکہ یہ تصور نہ آئے کہ یہ سب تاکیدیں اور اصرار اس بناء پر ہے کہ اس اطاعت کا فائدہ خدا کی طرف لوٹتا ہے۔ اس نے مخلوقات کو ہرگز اس لیے پیدا نہیں کیا کہ اُسے اُن سے کوئی فائدہ ہو، بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے بندوں پر جو دوسخا کرے۔

بعض نے ”وَاسْتَغْنَى اللَّهُ“ کے جملہ کے لیے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے کہ خدا نے اس قدر واضح آیات دلائل اور کافی وعظ و نصائح ان کے لیے بھیجے ہیں کہ اس کے علاوہ کچھ بھیجنے سے بے نیاز تھا۔

❖ ❖ ❖

www.sirat-e-mustaqim.com

زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبُّونَ بِمَا عَمِلْتُمْ ۖ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝

فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنزَلْنَا ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۖ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ سَالِحًا يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝

ترجمہ

کافروں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ انہیں ہرگز زندہ کر کے اٹھایا نہیں جائیگا۔ کہہ دیجئے۔ ہاں! مجھے اپنے پروردگار کی قسم ہے۔ تم سب کے سب قیامت میں (زندہ کر کے ضرور) اٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے اس کی وہ تمہیں

خبر دے گا اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔

- ۸ اب جبکہ یہ بات ہے تو خدا اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ اور یہ جان لو کہ خدا تمہارے ان اعمال سے آگاہ ہے جنہیں تم انجام دیتے ہو۔
- ۹ یہ اس وقت ہو گا جب وہ تم سب کو اس "اجتماع کے دن" جمع کرے گا۔ وہ تباہین کا دن ہو گا۔ (وہ دن جس میں لوگوں کو معلوم ہو گا کہ گھاٹے میں کون رہا ہے) اور جو شخص خدا پر ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دے تو وہ اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور وہ اس کو اس جنت کے باغوں میں وارد کرے گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔
- ۱۰ لیکن وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے، وہ دوزخ والے ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور ان کا انجام بہت ہی بُرا ہے۔

تفسیر

تباہین کا دن اور غیبتوں کا آشکار ہونا

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں خلقت کے با مقصد ہونے کے بارے میں آئے تھے ان آیات میں معاد اور قیامت کے مسئلہ کو پیش کرتا ہے جو انسان کے مقصد خلقت کی بحث کی ایک تکمیل ہے۔

پہلے منکرین قیامت کے دعوائے بے دلیل سے شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ "کافروں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ وہ ہرگز مبعوث نہیں ہوں گے" (ذعر الذین کہنوا ان لن یبعثوا)۔

"زعم" زعم کے مادہ سے (بروزن طعم) اس بات کے معنی میں ہے کہ جس کے جھوٹ ہونے کا احتمال یا یقین ہو کبھی باطل خیال کے معنی میں بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور زیر بحث آیت میں وہی پہلا معنی مراد ہے۔

اہل لغت کے بعض کلمات سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مادہ بطور سنن خبر دینے کے معنی میں

بھی آیا ہے۔

اگرچہ اس لفظ کے موارد استعمال اور مفسرین کے کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ جھوٹ کے مفہوم کی آمیزش رکھتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے یہ کہا ہے کہ ہر چیز کی ایک کنیت ہوتی ہے اور دروغ کی کنیت ”زعم“ ہے۔

بہر حال قرآن اس گفتگو کے بعد پیغمبر اسلام کو حکم دیتا ہے : ”کہہ دیجئے، ہاں ! مجھے میرے پروردگار کی قسم ہے، تم سب کے سب (زندہ کر کے) اٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد جو کچھ تم نے عمل کیا ہے تمہیں اس کی خبر دیں گے اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔“ (مثل بلی و ربی لتبعثن شمر لتنبؤن بما عملتم و ذالک علی اللہ یسیر)۔

حقیقت میں پہلے قاطع لب و لہجہ میں منکرین قیامت کے دعوائے بلا دلیل کی نفی کرتا ہے۔ ایک ایسے تاکیدی لب و لہجہ اور قسم کی آمیزش کے ساتھ جو کہنے والے یعنی پیغمبر کے اعتقاد و راسخ کی حکایت کرتا ہے۔ اس کے بعد ”و ذالک علی اللہ یسیر“ کے جملہ کے ساتھ اس پر استدلال کرتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ منکرین معاد کا اہم ترین شبہ اور اعتراض یہ تھا کہ بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیاں کیسے زندہ ہوں گی ؟ اور پر والی آیت کہتی ہے کہ جب کام خداوند قادر متعال کے ہاتھ میں ہے تو پھر کوئی مشکل نہیں ہے۔ چونکہ ابتداء میں تو وہ انھیں عدم سے وجود میں لایا ہے اور مردوں کو زندہ کرنا اس کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ بلکہ بعض کے نظریہ کے مطابق تو ”و ربی“ کی قسم ہی معاد کی دلیل کی طرف خود ایک لطیف اشارہ ہے۔ کیونکہ خدا کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی اس حرکت تکالی کو دنیا کی بے قدر و قیمت زندگی کی حدود میں ہی بانجھ نہ کر دے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک ہم معاد کے مسئلہ کو قبول نہ کریں تو خدا تعالیٰ کی ربوبیت کا انسان اور اس کی تربیت و تکامل کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں ہوگا۔

بعض مفسرین و ذالک علی اللہ یسیر کے جملہ کو خصوصیت سے قیامت میں خدا کے انسانوں کو ان کے اعمال کی خبر دینے سے مربوط سمجھتے ہیں جس کا ذکر قبل کے جملہ میں آیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ آیت کے پورے مضمون کی طرف لوٹتا ہے۔ (اصل قیامت اور اس کی فرع جو اعمال کی خبر دینے کا مسئلہ ہے، ایسی خبر جو حساب و جزا کے لیے ایک مقدمہ ہے۔)

بعد والی آیت میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے : ”اب جبکہ قیامت یقینی طور پر برپا ہوگی تو تم سب کے سب خدا اُس کے رسول اور اس نور پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے۔“ (فأمنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا)۔

”اور جان لو کہ خدا تمہارے ان اعمال سے آگاہ ہے جنہیں تم انجام دیتے ہو۔“ (واللہ بما تعملون خبیر)۔

اس طرح سے یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قیامت کے لیے ایمان اور عمل صالح کے طریق سے آمادہ کریں۔ تین اصولوں پر ایمان ”خدا، رسول اور قرآن“ جس میں دوسرے اصول بھی درج ہیں۔

قرآن کی ’نور‘ کے عنوان سے تعبیر، متعدد آیات میں آئی ہے، اور لفظ ’انزلنا‘ (ہم نے نازل کیا) کی تعبیر، اس پر ایک اور شاہد ہے۔ اگرچہ متعدد روایات میں جو اہل بیت کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں، زیر بحث آیت میں لفظ ’نور‘ وجود ’امام‘ سے تعبیر ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ تفسیر اس لحاظ سے ہو کہ وجود امام کتاب اللہ کا عملی تجسم شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض اوقات پیغمبر اور امام کو قرآن ناطق سے یاد کیا گیا ہے۔ ان روایات میں سے ایک میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے کہ آپؑ نے آئمہ علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:

”وہو الذین ینورون قلوب المؤمنین“

”اور وہ (آئمہ) وہی ہیں جو مومنین کے دلوں کو نور اور روشنی بخشتے ہیں۔“

بعد والی آیت قیامت کے دن کی توصیف کرتے ہوئے کہتی ہے: ”یہ بعثت ونشور اور حساب و جزاء

اس دن ہو گا جب وہ اجتماع کے دن تمہیں اکٹھا کرے گا“ (یوم یجمعکم لیوم الجمع)۔

قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ”یوم الجمع“ بھی ہے۔ جس کی طرف آیات قرآنی میں مختلف تعبیروں کے ساتھ بار بار اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے سورہ واقعہ کی آیت ۵۰، ۴۹ میں آیا ہے: قل ان الاولین والآخرین لمجموعون الیٰ صیقات یوم معلوم“ کہہ دیجئے۔ تمام اولین و آخرین ایک معین دن کی صیقات میں جمع ہوں گے۔“ اور اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ تمام انسانوں کی قیامت ایک ہی دن ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”وہ دن تغابن کا دن ہے“ (ذالک یوم التغابن)۔

وہ ایسا دن ہے کہ جس میں ”غابن“ (سبقت کرنے والا) اور ”مغبون“ (پہچانے والا) پہچانے جاتے گا۔ وہ دن جس میں یہ واضح ہو جائے گا کہ کون کون لوگ اپنی تجارت میں عالم دنیا میں غبن، زیان اور خسارے میں گرفتار ہوئے ہیں۔

وہ ایسا دن ہے کہ جس میں اہل جہنم جنت میں اپنی خالی جگہ کو دیکھیں گے اور افسوس کریں گے اور جنتی دوزخ میں اپنی خالی جگہ کو دیکھیں گے اور خوش ہوں گے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ہر انسان کیلئے ایک جگہ جنت میں اور ایک جگہ جہنم میں ہے۔ اگر وہ جنت میں چلا گیا تو اس کی جہنم والی جگہ دوزخیوں کے سپرد کر دی جائیگی۔ اور اگر وہ جہنم میں چلا گیا تو اس کی جنت والی جگہ ہشتیوں کو دے دی جائے گی۔ اور احتمال یہ ہے کہ اس مورد

میں آیات قرآنی میں ارث کی تعبیر اسی مطلب کے لیے آئی ہے۔
اس طرح سے قیامت کا ایک نام ”یوم التائبین“ غبنوں کے ظہور کا دن ہے۔ لے اس کے بعد اُس دن میں مومنین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

”جو شخص خدا پر ایمان لائے گا اور اعمال صالح انجام دے گا، خدا اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے انہیں ختم کر دے گا۔ وہ انہیں جنت کے ایسے باغوں میں وارد کرے گا جن کے درختوں کے پینچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔“ (وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ يَمْسَلْ صَالِحًا يَكْفُرْ عَنْهُ سَيِّئَاتُهُ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ)۔

اس طرح سے جب دو اصل شرطیں یعنی ایمان اور عمل صالح حاصل ہو جائیں گی تو یہ عظیم نعمتیں اسے حاصل ہوں گی:

گناہوں کی بخشش، جو فکر انسانی کو ہر چیز سے زیادہ اپنی طرف مشغول رکھتی ہے:
گناہ سے پاک ہونے کے بعد دائمی بہشت میں داخل ہونا اور فوز عظیم حاصل کرنا۔
اس بناء پر تمام چیزیں ایمان اور عمل صالح کے محور پر ہی گردش کرتی ہیں اور یہی اصلی سرمائے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوں گے جو اس دن یعنی ”یوم التائبین“ نہ صرف مغنوں نہیں ہوں گے بلکہ عظیم کامیابی پر فائز ہوں گے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”لیکن وہ لوگ جو کافر ہو گئے اور ہماری آیات کی تکذیب کی بیشک وہ اصحاب نار یعنی دوزخ والے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور ان کا انجام بہت ہی بُرا ہے۔“ (وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا بِئْسَ الْمَصِيرُ)۔

یہاں بھی دو چیزیں بدبختی کی عامل شمار ہوئی ہیں: ”کفر“ اور ”آیات الہی کی تکذیب“ جو ”ایمان“ اور ”عمل صالح“ کی ضد ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہاں بہشت جاودانی کے بارے میں اور یہاں ہمیشہ کے دوزخ کے بارے میں گفتگو ہے۔ وہاں فوز عظیم اور یہاں بُس المصیر اور مرگبار انجام ہے۔

ان دونوں آیات میں جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان جو فرق نظر آتا ہے، ایک تو یہ ہے کہ جنتیوں کے بارے میں ہر چیز سے پہلے گناہوں کی منفرت کا ذکر ہوا ہے کہ جو دوزخیوں کے بارے میں نہیں آیا۔ دوسرا یہ

لے ’تائبین‘ باب تفاعل سے ہے اور عام طور پر ایسے مواضع میں بولا جاتا ہے جو دو جانبہ ہوں۔ جیسے تعارض و تراخم وغیرہ اور قیامت کے بارے میں یہ معنی ممکن ہے اس طرح سے جو کہ مومنین کے گروہ اور کفار کے تعارض کا نتیجہ قیامت میں ظاہر ہوگا اور حقیقت میں قیامت کا دن تائبین کے ظہور کا دن ہوگا۔ اہل لغت کے بعض کلمات سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ باب تفاعل ہمیشہ اس معنی کے لیے نہیں آتا اور یہاں ظہور غبن کے معنی میں ہے۔

کہ وہاں جنت میں خلود یعنی ہمیشہ رہنا، لفظ ”ابدًا“ کے ساتھ ذکر ہوا ہے لیکن دوزخیوں کے بارے میں صرف خلود اور ہمیشہ رہنے کے مسئلہ پر اتفاق کی گئی ہے۔

تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ دوزخیوں کے درمیان ایسے کافر بھی ہوں گے جنہوں نے ایمان و کفر کے مسئلہ کو آپس میں ملا دیا ہے، پھر وہ اپنے ایمان کی بناء پر انجام کار عذاب سے رہائی پا جائیں یا یہ اس کی رحمت کے اس کے غضب پر غلبہ کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ دوسرے جملے میں ”ابدًا“ محذوف ہے کیونکہ یہ پہلے جملے میں آچکا ہے۔

✦ ✦ ✦

www.sirat-e-mustaqeem.com

- ۱۱ مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝
- ۱۲ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝
- ۱۳ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝

میں صرف

ایمان و اس کے

آپ کا

ترجمہ

- ۱۱ کوئی مصیبت رونما نہیں ہوتی مگر خدا کے اذن سے اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے تو خدا اس کے دل کو ہدایت کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے۔
- ۱۲ اور تم خدا کی اطاعت کرو اور پیغمبر کی اطاعت کرو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے تو ہمارے رسول پر تو واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔
- ۱۳ اللہ وہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں پس مومنین کو اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

تفسیر

تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں

پہلی زیر بحث آیت میں اس جہان کے دردناک مصائب اور حوادث کے بارے میں ایک اصل نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ اس جہان میں مصائب کا وجود کفار کے لیے ہمیشہ نفی عدالت کے بارے میں ایک دستاویز رہا ہے یا اس لحاظ سے کہ ایمان اور عمل صالح کی انجام دہی کی راہ میں ہمیشہ مشکلات موجود رہتی ہیں۔

جن کے مقابلہ میں مقادمت کے بغیر مومن کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح سے ان آیات کا رابطہ گذشتہ آیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ”کوئی مصیبت رونما نہیں ہوتی مگر خدا کے اذن سے“ (ما اصاب من مصیبة الا باذن الله)۔

اس میں شک نہیں کہ اس جہان کے تمام حوادث اذن خدا سے ہیں۔ کیونکہ ”توحید افعالی“ کے متقنی کے مطابق سارے عالم ہستی میں کوئی چیز حق تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر تحقق نہیں پاتی، لیکن چونکہ مصائب ہمیشہ سے ایک سوا سوا نشان کی صورت میں ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس پر توجہ ہوئی ہے۔

البتہ یہاں اذن سے مراد وہی خدا کا ارادہ تکوینی ہے نہ کہ ارادہ تشریفی۔

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے بہت سے مصائب ظالموں کے ظلم اور جابرین کے ارادہ سے رونما ہوتے ہیں، یا انسان خود ہی اپنی کوتاہی یا جہالت سے کوئی کام کر بیٹھے یا غلط کاری کی وجہ سے ان میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ تو کیا یہ سب کے سب اذن خدا سے ہوتے ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ تمام آیات جو مصائب کے سلسلہ میں قرآن مجید میں آئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصائب دو قسم کے ہیں:

۱: ایسے مصائب جو انسانی زندگی کی طبیعت میں اور مزاج میں رہے جسے ہونے میں اور انسان کے ارادہ

کا ان میں معمولی سا بھی دخل نہیں ہے۔ مثلاً موت اور کچھ دوسرے طبعی اور دردناک حوادث۔

۲: وہ مصائب جن میں انسان کا کسی نہ کسی طرح دخل ہے۔

قرآن پہلی قسم کے مصائب کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ سب اذن خدا سے رونما ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ خود تمہارے اعمال کی وجہ سے تمہیں دامگیر ہوتے ہیں۔ لے

اس بناء پر کوئی شخص یہ بہانہ نہیں بنا سکتا کہ چونکہ تمام مصائب خدا کی طرف سے ہیں، لہذا ظالموں کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرتے ہوئے ان سے مبارزہ کے لیے نہیں اٹھنا چاہیے۔ نیز انسان اس بہانے سے بیماریوں اور آفات سے مقابلہ کرنے اور فقر و جہالت سے مبارزہ کرنے سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

البتہ یہاں ایک اور نکتہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے مصائب کہ جن میں انسان کا کچھ عمل دخل ہے، ان کے اسباب کی تاثیر بھی خدا کی طرف سے اور اس کے اذن و فرمان سے ہے کہ اگر وہ ارادہ کرے تو ہر سبب بیرنگ اور بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں مومنین کو بشارت دیتا ہے۔ ”جو شخص خدا پر ایمان لے آئے خدا اس کے

دل کو ہدایت کرتا ہے (اس طرح سے کہ وہ مصائب کے مقابلے میں گھٹنے نہ ٹیکے، مایوس نہ ہو اور شور و
بیابانی نہ کرے) (ومن یؤمن باللہ یهد قلبہ)۔

یہ خدائی ہدایت جب انسان کے پاس آتی ہے تو وہ نعمتوں میں شاکر، مصیبتوں میں صابر اور قضائے
الہی کے مقابلے میں سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

البتہ ہدایت قلبی ایک وسیع معنی رکھتی ہے کہ ”صبر و شکر“، ”رضا و تسلیم“ اور ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ گناہ ان میں
سے ہر ایک اس کی شاخ ہے۔ ہاں یہ جو بعض مفسرین نے خصوصیت کے ساتھ ان میں سے کسی ایک موضوع کو
نقل کیا ہے، حقیقت میں وہ آیت کا پورا مفہوم نہیں بلکہ وہ واضح مصداق کا بیان ہے۔ آیت کے آخر میں فرماتا
ہے۔ ”خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔“ (واللہ بکل شیء علیم)۔

ممکن ہے اس تفسیر میں مصائب اور بلاؤں کے فلسفہ کی طرف اجمالی اشارہ ہو کہ خدا اپنے علم اور اپنی بے پایاں
آگاہی کی وجہ سے بندوں کی تربیت، بیدار باش کے اعمال اور ہر قسم کے غرور و غفلت سے ہزاروں کے
لیے کبھی کبھی ان کی زندگانی میں مصائب کو ایسا کر دیتا ہے تاکہ وہ سوئے نہ رہیں۔ دنیا میں اپنی حیثیت کو بھول نہ جائیں
اور ظفیان و سرکشی کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

چونکہ مبدء و معاد کی معرفت، جن کی گزشتہ آیات میں بنیاد رکھی گئی ہے، اس کا حتمی اثر، خدا اور پیغمبر کی عین
اطاعت کے لیے سعی و کوشش ہے، لہذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے۔ ”اور خدا کی اطاعت کرو اور پیغمبر کی اطاعت
کرو۔“ (واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول)۔

یہ بات واضح ہے کہ رسول خدا کی اطاعت بھی خدا کی اطاعت کا ہی ایک شعبہ ہے۔ کیونکہ رسول اپنی طرف سے
کوئی چیز نہیں کہتا، یہاں ’اطیعوا‘ کی تکرار اسی چیز کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے عرض میں نہیں ہیں
بلکہ ان میں سے ایک دوسری سے قوت حاصل کرتی ہے۔ اس سے قطع نظر خدا کی اطاعت، اصول و قوانین اور
تشریع الہی سے مربوط ہے۔ اس بناء پر ان میں سے ایک اصل ہے اور دوسری اس کی فرع ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: ”اگر تم روگردان ہو جاؤ اور اطاعت نہ کرو تو وہ تمہیں مجبور کرنے پر مامور نہیں ہے۔
کیونکہ ہمارے رسول کا وظیفہ اور ذمہ داری تو صرف واضح طور پر احکام پہنچا دینا ہے۔“ (فان قولیتہ فاما علی
رسولنا البلاغ المبین)۔

”فان قولیتہ“ جملہ شرطیہ ہے جس کی جزا مخدوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: فان قولیتہ فقد ادى وظیفته۔ یا۔ فان قولیتہ
لا یفسر کہ علی الایمان یا لا بأس علیہ وغیرہ۔ اگر تم روگردانی کرو تو وہ اپنی ذمہ داری پوری کر چکا ہے یا وہ تمہیں ایمان پر مجبور نہیں کرتا یا اس کے
لیے کوئی حرج نہیں ہے۔

ہاں وہ پیغام حق پہنچانے کا ذمہ دار ہے اور بس یہی اس کی ذمہ داری ہے۔ اس کے بعد تمہارا معاملہ خدا کے ساتھ ہے، یہ تعبیر ایک قسم کی نچتہ اور اجمالی تہدید ہے۔

بعد والی آیت میں توحید و ربوبیت کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو و جوب اطاعت کے لیے ایک دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرماتا ہے: ”اللہ وہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں“ (اللہ لا الہ الاہو)۔ پھر جب یہ بات ہے تو مومن کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ (وعلی اللہ فلیستوکل المؤمنون)۔

اس کے علاوہ کوئی بھی عبودیت کے لائق نہیں ہے، کیونکہ مالکیت، قدرت، علم اور غنی سب اسی کے لیے ہیں۔ دوسروں کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی طرف سے ہے۔ اسی وجہ سے انہیں اس کے علاوہ کسی غیر کے سامنے سر تسلیم و تعظیم خم نہیں کرنا چاہیے، ہر قسم کی شکل کے حل کے لیے اسی سے مدد مانگنی چاہیے اور صرف اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنِّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ
عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ وَإِنْ تَعَفَّوْا وَتَصَفَّحُوا
وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ
أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَأَسْمِعُوا وَاطِيعُوا وَأَنْفِقُوا
خَيْرًا لْأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمَفْلُحُونَ ۝

إِنْ تَقْرَضُوا لِلَّهِ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَنْفِرْكُمْ
وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ۝

عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ترجمہ

اے ایمان لانے والو! تمہاری ازواج اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں۔

ان سے بچ کے رہو، اور اگر معاف کر دو اور صرف نظر کر لو اور بخش دو (تو خدا تمہیں بخش

دے گا) کیونکہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

- ①۵ تمہارے اموال و اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں اور عظیم جزا خدا ہی کے پاس ہے۔
- ①۶ اس لیے جہاں تک ہو سکے تقویٰ اختیار کرو اور کان دھر کے سنو اور اطاعت کرو اور اتفاق کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور جو لوگ اپنے نخل سے بچ جائیں وہی رست گار و کامیاب ہیں۔
- ①۷ اگر تم خدا کو قرض حسد دو گے تو وہ اسے تمہارے لیے کئی گنا کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور خدا قدر دان اور بڑبار ہے۔
- ①۸ وہ پہناں و آشکار سے باخبر ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

شان نزول

ایک روایت میں امام باقرؑ سے آیا ہے کہ آپ نے آیت ”ان من ازدواجکم ..“ کے بارے میں فرمایا :

”اس سے مراد یہ ہے کہ جس وقت بعض مرد ہجرت کرنا چاہتے تو ان کا بیٹا اور بیوی ان کا دامن پکڑ لیتے اور کہتے تھے : ”تجھے خدا کی قسم کہ ہجرت نہ کر۔ کیونکہ اگر تو چلا گیا تو ہم تیرے بعد بے سرپرست رہ جائیں گے۔“ پھر بعض اس بات کو قبول کر لیتے اور وہ رہ جاتے تھے۔ لہذا اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انہیں اس قسم کی گزارشوں کو قبول کر لینے اور اس سلسلہ میں اولاد اور بیویوں کی اطاعت کرنے سے ڈرایا، لیکن کچھ ایسے افراد بھی تھے جو بالکل پردا نہ کرتے اور چلے جاتے تھے لیکن وہ اپنے گھر والوں سے یہ کہتے تھے : ”خدا کی قسم! اگر تم ہمارے ساتھ ہجرت نہیں کرو گے اور بعد میں (دارالہجرت) مدینہ میں ہمارے پاس آؤ گے تو ہم بالکل تمہاری پروا نہیں کریں گے۔ چنانچہ انہیں حکم دیا گیا کہ جس وقت ان کے گھر والے ان سے آئیں تو گزشتہ امور کو فراموش کر دیں اور وان تعفوا و تصفحوا و تعفروا فان اللہ غفور رحیم کا جملہ اسی معنی کو بیان کر رہا ہے۔ ملے

❖ ❖ ❖

تفسیر

تمہارے اموال و اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

چونکہ گزشتہ آیات میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم بلا کسی قید و شرط کے آیا تھا اور اس راستہ کے اہم موانع میں سے ایک اموال و ازواج و اولاد کے ساتھ زیادہ لگاؤ ہے۔ لہذا زیر بحث آیات میں مسلمانوں کو اس سلسلہ میں خبردار کرتے ہوئے پہلے کہتا ہے: ”اے ایمان لانے والو! تمہاری ازواج اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے بچ کے رہو“ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن مِّنْ أَمْرِ وَاجِبٍ لَّكُمْ وِأَوْلَادِكُمْ عَدُوٌّ لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ**۔

یقیناً اس عداوت کی نشانیاں کم نہیں ہیں، جب تم یہ چاہتے ہو کہ ہجرت جیسے کسی مثبت کام کو انجام دو تو وہ تمہارا دامن پکڑ لیتے ہیں اور اس فیضِ عظیم میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ نیز بعض اوقات تمہاری موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں تاکہ تمہاری دولت کے مالک بن جائیں اور اسی قسم کی دوسری باتیں بھی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ نہ تو تمام اولاد اور نہ ہی تمام بیویاں ایسی ہوتی ہیں۔ اسی لیے ”مِن“ تبیضیہ کے ذریعے اس معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان میں سے بعض ایسے ہیں لہذا تم ان سے بچ کے رہو۔ البتہ یہ دشمنی کبھی دوستی کے لباس میں اور خدمت کے لگان میں ہوتی ہے۔ کبھی سچ مچ بُری نیت اور عداوت و دشمنی کے ارادہ سے انجام پاتی ہے یا اپنے منافع کی غرض سے ہوتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جب انسان دورا ہے پر کھڑا ہوتا ہے جن میں سے ایک راستہ تو خدا کی طرف اور دوسرا بیوی اور اولاد کی طرف ہوتا ہے اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو پھر ضروری ہے کہ ارادہ و تصمیم کرتے وقت شک و تردد کو اپنے اندر راہ نہ دے، بلکہ حق تعالیٰ کی رضا کو ہر چیز پر مقدم شمار کرے، کیونکہ دنیا و آخرت کی نجات اسی میں ہے۔

اسی لیے سورہ توبہ آیت ۲۳ میں آیا ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَاخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَاُولَٰئِكَ هُم الظَّالِمُونَ**۔ ”اے ایمان لانے والو اگر تمہارے آبائے اجداد اور بھائی بندگان کو ایمان پر مقدم شمار کریں تو تم انہیں اپنا دوست نہ بناؤ، وہ ظالم و ستمگر ہیں۔ چونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ حکم آبائے اجداد، شوہروں اور ازواج کی طرف سے خشونت، انتقام جوئی اور افراط کا بہانہ بن جائے، لہذا اسی آیت کے ذیل میں بلا فاصلہ ان کے اعتدال میں رہنے کے لیے فرماتا ہے: ”اور اگر تم معاف کر دو۔“

صرف نظر کر لو اور بخش دو تو خدا بھی بخائیں اپنے عفو و رحمت کا مورد قرار دے گا۔ کیونکہ خدا عفو و رحیم ہے۔ (د) ان تعصوا و تصفحوا و تفسروا فان الله غفور رحيم۔

اس بناء پر اگر وہ اپنے عمل سے پشیمان ہو جائیں اور عذر خواہی کریں یا ہجرت کے بعد تم سے آملیں تو انھیں اپنے آپ سے دور نہ کرو، اور عفو و درگزر کو اختیار کرو جیسا کہ تم توقع رکھتے ہو کہ خدا بھی تمھارے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے۔

”بی بی عائشہ کی داستان انک کے متعلق سورہ نور کی تفسیر میں آیا ہے: جب مدینہ میں چرچا کرنے والوں کا کام اُونچا چلا گیا تو بعض مومنین کہ جن کے رشتہ دار یہ چرچا کرنے والوں میں سے تھے، انھوں نے یہ قسم کھالی، کہ انھیں کوئی مالی امداد نہیں دیں گے۔ تب اسی سورہ نور کی آیت ۲۲ نازل ہوئی: ”وہ لوگ جو مالی برتری اور زندگی میں وسعت رکھتے ہیں انھیں یہ قسم نہیں کھانی چاہیے کہ وہ اپنے عزیزوں، حاجت مندوں اور راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ کرنے سے باز رہیں۔ انھیں چاہیے کہ عفو و درگزر اور صرف نظر کریں۔“ الاتعصون ان یغفر الله لکم: ”کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تمھیں بخش دے۔“

اس بارے میں کہ ”عفو“ ”صفح“ اور ”غفران“ کے درمیان کیا فرق ہے؟ ان کے لغوی مفہوم کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بخش گناہ کے مراتب کے سلسلہ کو بیان کرتا ہے۔ کیونکہ ”عفو“ سزا سے صرف نظر کرنے کے معنی میں ہے، اور ”صفح“ اس سے بالاتر مرتبہ ہے، یعنی ہر قسم کی سرزنش کو ترک کرنا۔ اور ”غفران“ گناہ کی پردہ پوشی اور اسے فراموش کر دینے کے معنی میں ہے۔

اس طرح اہل ایمان کو اپنے اصول اعتقاد کی قطعی حفاظت کرتے ہوئے۔ اس اولاد اور بیوی کے سامنے جو انہیں راہِ خطا کی دعوت دیتے ہیں، سر تسلیم خم نہ کرتے ہوئے جتنا ہو سکے تمام مراحل میں محبت اور عفو و درگزر سے دریغ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ باتیں ان کی تربیت اور انھیں خدا کی اطاعت کی طرف لوٹانے کا ایک ذریعہ ہیں۔

بعد والی آیت میں ایک اور اصل کلمہ کی طرف یعنی اموال اور اولاد کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”تمھارے اموال اور اولاد تمھاری آزمائش کا ایک ذریعہ ہیں۔“ (انما اموالکم و اولادکم فتنة)۔ اگر تم اس آزمائش کے میدان میں کامیاب ہو جاؤ تو ”اللہ کے ہاں“ تمھارے لیے ”عظیم اجر و پاداش“ ہے۔ (والله عنده اجر عظیم)۔

گزشتہ آیت میں انسان کے لیے صرف ”بعض“ بیویوں اور اولاد کی عداوت کی گفتگو تھی، جو اُسے خدا کی اطاعت کے راستے سے منحرف کر کے گناہ اور بعض اوقات کفر کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں تمام اولاد اور اموال کی بات ہو رہی ہے کہ وہ انسان کی آزمائش کا ایک ذریعہ ہیں۔

درحقیقت خدا انسان کی تربیت کے لیے ہمیشہ اُسے امتحان کی گرم بھٹی میں ڈال دیتا ہے اور مختلف امور

کے ساتھ اس کو آزماتا ہے۔ لیکن یہ دونوں (اموال و اولاد) اس کے امتحان کے اہم ترین وسائل ہیں کیونکہ ایک طرف سے ایمان کی کشش اور دوسری طرف سے اولاد سے لگاؤ، انسان میں اس قسم کی قوی کشش پیدا کر دیتے ہیں، ایسے مواقع پر جب خدا کی رضا ان کی رضا سے جدا ہو جاتی ہے تو انسان سخت فشار اور دباؤ میں ہوتا ہے۔

”انسا“ کی تعبیر جو عام طور پر حصر کے لیے لائی جاتی ہے اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ دونوں موضوع دوسری ہر چیز سے زیادہ امتحان کا ذریعہ ہیں۔ اسی بناء پر امیر المومنینؑ نے فرمایا :-

لا یقولن احدکم ”اللہم افی اعوذ بک من الفتنة“ لانه لیس احد الا و هو مشتمل علی فتنة ، ولكن من استعاذ فلیستعذ من مضلات الفتن فان اللہ سبحانہ یقول : واعلموا انما اموالکم و اولادکم فتنة“

”تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ خداوند! میں تجھ سے امتحان و آزمائش سے پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ ہر شخص کے پاس آزمائش کا ذریعہ ہوتا ہے اور کم از کم اس کے پاس مال و اولاد ہوتے ہیں۔ اور اصولی طور پر دنیا کی زندگی کا مزاج، آزمائش اور امتحان کی کھالی ہے، لیکن جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا سے پناہ لے تو وہ گمراہ کرنے والے امتحانوں سے پناہ لے۔ کیونکہ خدا کتنا ہے : ”جان لو کہ تمہارے اموال و اولاد آزمائش کا ایک ذریعہ ہیں۔“ لہ

یہی مطلب تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ انفال کی آیت ۳۸ میں بھی نظر آتا ہے (جو کچھ امیر المومنین علیؑ کے کلام اور اوپر والی روایت کے ذیل میں بیان ہوا ہے، وہی تعبیر ہے جو سورہ انفال میں آئی ہے غور کیجئے۔)

اس موقع پر بہت سے مفسرین اور محدثین نے نقل کیا ہے کہ ایک دن رسول خداؐ منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ حسن و حسین علیہما السلام، جو ان دنوں بچے تھے، مسجد میں وارد ہوئے۔ انھوں نے سُرُجِ دِنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور چلتے چلتے کبھی پھسل کر گر جاتے تھے۔ جونہی رسول خداؐ کی نگاہ ان پر پڑی تو خطبہ چھوڑ دیا اور منبر سے اتر کر انھیں اپنی آنکھوں میں لے لیا، پھر ان کو منبر پر لے گئے اور اپنی گود میں بٹھا کر فرمایا : ”خدا نے عز و جل نے درست فرمایا کہ جو کتا ہے : ”انسا اموالکم و اولادکم فتنة“ جب میری نظر ان دونوں بچوں پر پڑی اور میں نے دیکھا کہ وہ چلتے چلتے پھسل جاتے ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اپنی گفتگو کو چھوڑ کر انھیں اٹھالیا۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے خطبہ کو جاری کیا۔“

لے نبع البلاء ، کلمات قصار جلد ۹۳

لے ”مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۰۱ (ذیر بحث آیت کے ذیل میں) اسی حدیث کو تفسیر قرطبی ، روح المعانی ، فی ظلال قرآن اور المیزان میں بھی

مختصر اختلاف کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ فتنہ اور آزمائش کبھی تو خیر کی اور کبھی شر کی آزمائش ہوتی ہے۔ یہاں ممکن ہے خیر کی آزمائش مراد ہو اس معنی میں کہ خدا چاہتا ہے اپنے پیغمبر کو آزمائے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ منبر پر خطبہ دیتے وقت ان دونوں شہزادوں کی حالت سے غافل ہو جائے جو جگہ گوشہ زہرا ہیں اور ان سے ہر ایک آئندہ بلند مقام پر فائز ہونے والا ہے۔ یا خطبہ کا جلال و شوکت، محبت و عاطفت کے اظہار میں مانع تو نہیں ہوتا۔ ورنہ مسئلہ طور پر پیغمبر بچوں کی محبت کی بناء پر ہرگز خدا کی یاد اور تبلیغ و ہدایت کی بھاری ذمہ داریوں کے انجام دینے سے غافل نہیں ہوتے تھے۔

بہر حال پیغمبر کا یہ عمل تمام مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ تھا کہ وہ علی اور فاطمہ کے ان دونوں شہزادوں کی قدردانیت اور حیثیت کو ہچانیں۔

اسی لیے ایک حدیث میں جو اہل سنت کے مشہور منابع میں نقل ہوئی ہے یہ آیا ہے کہ ”براء بن عازب“ (مشہور صحابی) یہ کہتا ہے :

”رأيت الحسن بن علي عاتق النبي صلى الله عليه وآله وهو يقول : اللهم اني احبه فاحبه“

”میں نے حسن بن علی کو پیغمبر کے دوش پر دیکھا جب کہ آپ فرما رہے تھے : خدایا میں اسے دوست رکھتا ہوں۔ تو بھی اسے دوست رکھ“۔

دوسری روایات میں آیا ہے کہ بعض اوقات حبیب آتے اور سجدہ کی حالت میں پیغمبر کے دوش پر سوار ہو جاتے اور حضرت انھیں نہ روکتے۔

چنانچہ یہ سب احادیث ان دو عظیم اماموں کے مقام کی عظمت کو بیان کرتی ہیں۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں نتیجہ کے عنوان سے فرماتا ہے : ”اب جبکہ ایسا ہے تو جتنا بھی تم سے ہو سکتا ہے ، تقوائے الہی اختیار کرو، اس کے فرامین کو سنو اور اطاعت کرو اور اس کی راہ میں انفاق کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے“ : (فاتقوا الله ما استطعتم واسمعوا واطيعوا وانفقوا خيرا لانفسكم)۔

پہلے گناہوں سے اجتناب کرنے کا حکم دیتا ہے (کیونکہ تقویٰ کی زیادہ تر نظر گناہ سے اجتناب کرنے کی طرف ہے) اس کے بعد اطاعت کرنے کا حکم اور سننے کا فرمان جو اطاعت کا مقدمہ ہے۔ پھر اطاعتوں میں سے خصوصیت کے ساتھ، مسئلہ انفاق پر تکیہ کرتا ہے جو خدا کی اہم ترین آزمائشوں میں سے ہے۔ انجام کار کہتا ہے کہ ان سب باتوں

کا فائدہ خود تمہیں کو ہے۔

بعض مفسرین نے خیرا کی تفسیر مال سے کی ہے جو مثبت کاموں کے انجام دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ جیسا کہ آیہ وصیت میں بھی اسی معنی میں آیا ہے: کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف: تم پر واجب ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے تو اگر وہ اپنی طرف سے یادگار کے طور پر خیر چھوڑ جائے تو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے شائستہ طور پر وصیت کر جائے۔ (البقرہ: ۱۸۰)

بہت سے مفسرین نے خیر کی ایک وسیع معنی میں بھی تفسیر کی ہے اور اسے 'انفاق' کی قید سے مقید نہیں سمجھا ہے بلکہ اسے آیت سے مربوط سمجھا اور انھوں نے اس بارے میں یہ کہا ہے: "اس سے مراد یہ ہے کہ ان تمام احکام کی اطاعت خود تمہارے ہی فائدے میں ہے۔ (یہ تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے) اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ طاقت کے مطابق تقویٰ کا حکم سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۲ سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔ جو یہ کہتی ہے: اتقوا اللہ حق تقاہ۔ جیسا کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کا حق ہے ویسا ہی خدا سے ڈرو۔ بلکہ یہ دونوں حکم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک جگہ کہتا ہے: "جتنی تم میں طاقت ہے اتنا تقویٰ اختیار کرو" اور دوسری جگہ کہتا ہے: "تقویٰ کا حق ادا کرو"۔ مسلم ہے کہ تقویٰ کا حق ادا کرنا، انسان کی قدرت اور توانائی کی مقدار پر منحصر ہے، کیونکہ تکلیف مالا یطاق کا کوئی معنی نہیں، اور ہدف و مقصد یہ ہے کہ انسان اس راستے میں اپنی آخری کوشش کو کام میں لائے۔

اس بناء پر جن لوگوں نے زیر بحث آیت کو آل عمران کی آیت کا نسخ سمجھا، وہ غلطی پر ہیں۔ اس آیت کے آخر میں مسئلہ انفاق پر تاکید کے عنوان سے فرماتا ہے: "جو لوگ اپنے بخل اور حرص سے بچ جائیں وہی رشکار و کامیاب ہیں۔" (ومن یوق شح نفسه فاولئک هم المفلحون)۔ "شح" بخل کے معنی میں ہے جو حرص سے توأم ہو، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دو صفات رذیلہ، انسان کی نجات کے سخت ترین مانع اور انفاق اور کار خیر کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ اگر انسان لطف الہی کا دامن تھام لے، اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کی طلب کرے، خود سازی اور تہذیب نفس کی کوشش کرے اور ان دونوں صفات رذیلہ سے نجات حاصل کر لے تو پھر اس نے اپنی سعادت کی ضمانت حاصل کر لی ہے۔

اگرچہ بعض روایات میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"من ادى الزکوة فقد وقى شح نفسه"

"جس شخص نے زکوٰۃ ادا کر دی اس نے بخل اور حرص سے رہائی پالی۔"

یہ پہلی تفسیر کی بناء پر "خیرا" (انفقوا) کا مفعول ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق ایک فعل متعدی خبر ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا۔ میکن خیرا لکم

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ شام سے صبح تک خانہ خدا کا طواف بجا لاتے اور یہ فرماتے رہتے تھے :

”اللهم قی شح نفسي“

”خداوند! مجھے میرے حرص و نجل سے بچا۔“

آپ کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا : میں آپ پر قربان جاؤں۔ آج رات میں نے اس دعا کے علاوہ اور کچھ نہیں سنا، کوئی اور دعا بھی کیجئے۔ آپ نے فرمایا :

”نفس کے نجل اور حرص سے بڑھ کر اور کون سی چیز زیادہ خطرناک ہے، جبکہ خدا فرماتا ہے :

”ومن یوت شح نفسه فاولئک هم المفلحون“ لہ

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اتفاق کرنے کی تشوین اور نفس کو نجل و شح سے روکنے کے لیے فرماتا ہے : ”اگر تم خدا کو قرض حسنہ دو گے تو وہ اسے کئی گنا کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور خدا قدر دان اور بردبار ہے۔“ (ان تقرضوا اللہ قرضًا حسنًا یضاعفه لکم ویغفر لکم واللہ شکور حلیم)۔

کتنی عجیب تمہیر ہے کہ جسے قرآن مجید میں ”اتفاق فی سبیل اللہ“ کے بارے میں بارہا دہرایا گیا ہے۔ وہ خدا جو ہمارے وجود کی اصل و فرع کا پیدا کرنے والا، تمام نعمتوں کا بخشنے والا اور تمام ملکیتوں کا مالک ہے، وہ ہم سے قرض طلب کرتا ہے پھر اس کے مقابلے میں ”اجر مضاعف“ اور بخشش کا وعدہ دیتا اور ہمارا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ اس سے بالاتر کسی لطف و محبت کا تصور ہو ہی نہیں سکتا اور اس سے بڑھ کر بزرگواری اور رحمت ممکن ہی نہیں ہے۔ ہم کیا ہیں اور ہمارے پاس کیا ہے کہ ہم اس کو قرض دیں ؟ اور سب سے انوکھی بات یہ کہ ہم یہ سب عظیم اجر و ثواب کیوں لیں گے۔

کیا یہ سب کچھ ایک طرف سے مسئلہ اتفاق کی اہمیت اور دوسری طرف سے خدا کا بندوں کے بارے میں لطف بے پایاں نہیں ہے ؟

”قرض“ اصل میں قطع کرنے اور کاٹنے کے معنی میں ہے۔ اور جب لفظ حسن کے ساتھ ہو تو مال کو اپنے سے جدا کرنے اور راہِ خیر میں دینے کے معنی میں ہے۔

”یضاعف“ ضعت (بروزن شعر) کے مادہ سے ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ یہ صرف دو گنا کے معنی میں نہیں بلکہ کئی گنا کے معنی بھی دیتا ہے۔ یہ لفظ اتفاق کے بارے میں سات سو گنا تک، بلکہ اس سے زیادہ کے لیے بھی قرآن میں آیا ہے۔ (البقرہ - ۲۶۱)

ضمینی طور پر لیغفر لکھ کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ اتفاق گناہ کی بخشش کے بہت سے عوامل میں سے ایک ہے۔

شکوک کی تعبیر کہ جو خدا کی ایک صفت ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ خدا اپنے بندوں کا عظیم اجر اور ثوابوں کے ذریعے شکر ادا کرتا ہے۔ نیز اس کا "علیم" ہونا گناہوں کی بخشش اور بندوں کو سزا دینے میں جلدی نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

نہاں تک کہ آخری آیت میں فرماتا ہے: "وہ پنہاں و آشکار سے آگاہ اور قادر و حکیم ہے: (عالم الغیب والشہادۃ العزیز الحکیم)۔"

وہ بندوں کے اعمال اور خصوصاً ان کے پنہاں و آشکار اتفاق سے باخبر ہے۔ اگر وہ ان سے قرض کا تقاضا کرتا ہے تو یہ احتیاج و نیاز اور عدم قدرت کی وجہ سے نہیں، بلکہ کمالِ لطف و محبت کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ ان کے اتفاق کے مقابلہ میں ان تمام اجر اور ثوابوں کا وعدہ دیتا ہے تو یہ بھی اس کی حکمت کا مقصد ہے۔ اس طرح خدا کے بیچگانہ اوصاف کہ جن کی طرف اس آیت اور اس سے پہلی آیت میں اشارہ ہوا ہے، یہ سب خدا کی راہ میں اتفاق کے مسئلہ کے ساتھ ایک قسم کا ربط رکھتے ہیں۔ لیکن خدا کی ان پانچ صفات کی طرف توجہ، اتفاق کی تشویق کے مسئلہ کے علاوہ انسان کو کلی طور پر پروردگار کی اطاعت اور گناہ سے رکنے میں زیادہ مستم بناتی ہے اور اس کو قوتِ قلب، ارادہ کی طاقت اور روحِ تقویٰ بخشی ہے۔

ایک نکتہ

ایک پر معنی حدیث

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی سے آیا ہے:

"ما من مولود یولد الا فی شبابیکہ رأسہ مکتوب خمس آیات من

سورۃ التغابن"

"کوئی نوزائیدہ متولد نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کے سر کے مشکوں (جالیوں) پر سورۃ

تغابن کی پانچ آیتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔"

ممکن ہے اس کورہ کی یہی آخری آیات مراد ہوں جو اموال اور اولاد کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان پانچ

آیات کا سر کی جالیوں پر لکھا جانا اس مسئلہ کے حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی ان آیات کا مضمون تمام اولادِ آدم کے لیے بغیر کسی استثناء کے مطلق ہے۔

”شبابیہ“ ”شاک“ (بروزن خفاش) کی جمع ہے۔ (شبک) جالی کے معنی میں ممکن ہے سر کی ان ہڈیوں کی طرف اشارہ ہو جن کے ٹکڑے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہوتے ہیں یا دماغ کی جالیوں کی طرف اشارہ ہو۔ بہر حال یہ انسان میں ان رو حیات و خصوصیات کے موجود ہونے کی دلیل ہے۔

خداوند! مال و اولاد اور بیویوں کی اس عظیم آزمائش میں ہماری مدد فرما۔
پروہر دگاسرا! ہمیں بخل، حرص اور شہ نفس سے دور رکھ! کیونکہ جسے تو ان سے دور رکھے گا وہی اہل نجات اور رستگار ہیں۔

باسمِ الہا! تو ہمیں قیامت کے دن میں جب گنہگار بندوں کا غبن اور نقصان ظاہر ہو جائے گا، اپنے لطف کے دامن میں اس تغابن سے بچائے رکھ۔ آمین یا رب العالمین۔

سورہ تغابن کا اختتام
۲۲، رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ

۲۸، ذیقعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۹۸۷ء

بروز ہفتہ صبح پونے پانچ بجے، ۸۱، ای

مادل ٹاؤن لاہور



ادارہ امامیہ قرأت کالج

سُر تَفْکِیْطِ تَصْحِیْح

یہ کتاب درستی کے لیے (تفسیر نمونہ جلد ۱۳) کے اس نسخہ کو حزن بھری پڑھائی کے تصدیق کرتا ہے کہ یہ کتاب درست ہے اور اسے یا فطری غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب
حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدیر/مینیجر

امامیہ قرأت کالج
اندرولہ سوچیدروازہ - لاہور

www.sirat-e-staqeem.net



اشاريه

تفسير نمونه ————— جلد ۱۳

ترتيب و ترتيبين ————— سيد شكيل حسين موسوي
سيد محمد حسين زيدي الباهروي

۶۴۳	مضامين:
۶۴۸	اصول و عقائد
۶۴۹	احكام
۶۸۰	اخلاقيات
"	اقوام گزشته
۶۹۵	شخصيات
۶۹۶	علماء و دانشور
۷۰۰	کتاب سماوي
۷۰۲	کتاب تاريخ و تفسير و سير
۷۱۱	لغات قرآن
۷۲۵	متفرق موضوعات
	مقامات

۱۳۷، ۱۱۵، ۱۰۴، ۹۱، ۷۸، ۵۳، ۴۰	رب
۲۴۸، ۲۴۳، ۲۳۶، ۲۲۹، ۲۲۵، ۱۷۰	
۲۶۳، ۲۶۱، ۲۵۹، ۲۵۷، ۲۵۶، ۲۵۳	
۲۴۸، ۲۳۰، ۲۱۳، ۲۰۷، ۲۰۶، ۲۰۵	
۶۵۱، ۵۱۸، ۵۱۲، ۴۹۲، ۳۸۱، ۳۵۱	
۵۴۹، ۵۱۲، ۴۱۲، ۲۰۸، ۱۵۷، ۷۸، ۳۰	رحمن
۶۴۵، ۶۱۶، ۵۳۸	
۳۵۱، ۲۱۲، ۱۵۷، ۷۸، ۴۸، ۳۰	رحیم
۵۴۷، ۵۱۲، ۵۰۱، ۴۷۹، ۴۳۸، ۴۰۴	
۶۶۱، ۶۱۶، ۵۸۳، ۵۴۹، ۵۳۸	
۴۷۹، ۳۵۱	رؤف
۵۰۱	سبحان
۵۰۱	سلام
۴۱۲	سمیع
۶۶۱	شکور
۴۲۱	شہید
۵۱۸، ۵۰۱، ۴۶۱، ۴۵۰، ۳۸۹، ۳۳۹	عزیز
۶۶۱، ۵۸۳، ۵۴۹	
۴۱۲	عفو
۶۵۷، ۶۴۵، ۵۳۱، ۴۲۱، ۳۴۵، ۳۳۹	علیم
۶۶۱، ۵۳۸، ۵۲۷، ۴۳۸، ۴۱۲، ۴۰۳	غفور
۶۴۵، ۵۱۸، ۴۸۱	غنی
۵۸۳، ۵۰۱	قدوس

أصول وعقائد

اسماء باری تعالیٰ

۶۵۷، ۵۰۱	الہ
۲۷۸، ۲۱۲، ۱۵۷، ۱۱۱، ۷۸، ۶۰، ۳۰	اللہ
۳۸۱، ۳۷۵، ۳۶۸، ۳۵۱، ۳۴۵، ۳۳۹	
۴۳۳، ۴۲۷، ۴۲۱، ۴۱۲، ۴۰۳، ۳۸۹	
۴۸۶، ۴۷۱، ۴۶۱، ۴۵۰، ۴۴۴، ۴۳۸	
۵۳۸، ۵۳۱، ۵۲۷، ۵۱۸، ۵۱۲، ۴۹۲	
۵۹۹، ۵۸۳، ۵۷۰، ۵۶۶، ۵۵۷، ۵۴۹	
۶۶۱، ۶۵۷، ۶۴۵، ۶۳۶، ۶۲۴، ۶۱۶	
۵۰۱	باری
۶۴۵، ۴۱۲، ۳۴۵	بصیر
۵۰۱	جبار
۵۴۹، ۵۳۱، ۵۱۸، ۵۰۱، ۴۶۱، ۳۳۹	حکیم
۶۶۱، ۵۸۳	
۶۶۱	حلیم
۶۴۵، ۵۱۸، ۴۸۱	حمید
۵۰۱	خالق
۴۹۲، ۴۳۸، ۴۳۳، ۴۱۲، ۳۵۲	نجیب
۲۶۸	ذوالجلال والاکرام

۲۱۴	خدا نے رحمان نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا، بیان کرنا سکھایا۔
۲۱۸	تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے۔
۲۲۹	ہم نے دو دریاؤں کو ایک دوسرے کے قریب قرار دیا۔
۲۳۶	رب ذوالجلال والا کرام کی ذات باقی رہ جائے گی جو لوگ زمین و آسمان میں ہیں، اسی سے سوال کرتے ہیں، وہ ہر روز نئی شان اور نئے کام میں ہے۔
۲۳۸، ۲۳۹	ہمت و قدرت ہو تو زمین و آسمانوں کی حدود سے نکل جاؤ۔
۲۴۳	ہم نے پیدا کیا تو پھر دوبارہ زندگی کی تصدیق کیوں نہیں کرتے۔
۳۰۵	نطفہ کو زندگی تم دیتے ہو یا ہم؟ موت کو مقدر کر دیا، ہم پر کوئی سبقت نہیں رکھتا۔
۳۰۵	تمہاری جگہ تم جیسا ہی گروہ لائیں گے، تمہیں ایک اور جہان کی زندگی ملے گی۔
۳۱۰ تا ۳۱۲	یہ جو کاشت کی ہے اسے تم اگاتے ہو یا ہم؟ ہم جب چاہیں اسے برباد کر دیں۔
۳۱۳	پانی پیتے ہو، اسے ہم برساتے ہیں یا تم؟ ہم چاہیں تو اسے تلخ کر دیں۔
۳۱۳ تا ۳۱۷	آگ جو روشن کرتے ہو اس کا درخت ہم نے اگایا ہے یا تم نے؟ رب کی تسبیح کرو۔

۶۳۵، ۵۲۷، ۴۷۱، ۳۳۹	قدیر
۴۵۰، ۳۸۹	قوی
۵۰۱	متکبر
۵۰۱	مصور
۵۰۱	ملک
۵۰۱	مومن
۵۰۱	مہین

توحید

۶۰	اللہ شرک سے پاک و منزہ ہے
۸۳	اسے اس ہستی نے تعلیم دی ہے جو عظیم قدرت رکھتی ہے، حد سے زیادہ توانائی اور ہر چیز پر تسلط ہے
۱۲۰	آسمانوں اور زمین میں سب کچھ اللہ کے لیے ہے
۱۲۰	تاکہ بدوں کو سزا اور نیکوں کو جزا دے، گناہوں سے بچنے والوں کو جانتا ہے، تمہیں زمین سے پیدا کیا، خود ستائی نہ کرو۔
۱۲۴	اللہ کا علم بے پایاں اور وسعت علمی بے انتہا ہے
۱۳۷ تا ۱۴۴	تمام امور تیرے رب کی طرف لوٹتے ہیں، وہی ہنسنا، رلاتا، مارتا، جلاتا، جوڑے پیدا کرتا، عالم ایجاد کرتا، ستارہ شعری کا رب ہے۔
۲۰۵	توحید و عدل کی اصل کا درمیانی نقطہ
۲۰۶	اللہ کا فرمان صرف ایک کلمہ 'کن' اور چشم زدن میں عمل ہونا۔

جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی
تسبیح کرتے ہیں۔ وہ عزیز و حکیم ہے۔ ۵۸۳، ۵۸۹، ۶۶۲
اللہ اس سے منزہ ہے جسے یہ اس کا شریک
قرار دیتے ہیں۔ ۵۰۵

وہ خالق ہے، رحمان و رحیم و عزیز و حکیم ہے۔
۵۰۶ سب موجودات اس کی تسبیح کرتے ہیں۔
زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تسبیح کرتی ہے
ملکیت و حکومت، حمد و تائیں اسی کے لیے
ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ ۶۴۶
اللہ اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لے
اؤ جسے ہم نے نازل کیا۔ ۶۵۲

عدل

میں کبھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کروں گا ۵۲۶
بلاشبک و شبہ اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی ۵۵۵
ہم نے قوم کو طوط کے شہروں سے مومنین کو پہلے
ہی نکال لیا۔ مومن کو کافر کی سزا میں کیوں
گرفتار کرتے۔ ۵۹۲
قوم کو طوط کو اللہ نے اپنی عدالت کا کرشمہ دکھایا ۱۹۲
ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جاتا ہے ۲۰۰
وزن کو عدل کی بنیاد پر قائم کرو۔ میزان کو کم نہ رکھو ۲۱۸، ۲۲۰
تم آج ہرگز اللہ کی عدالت، حکم اور صادر شدہ
سزائوں سے نہیں بچ سکتے۔ ۲۲۵

ستاروں کے محل طلوع و غروب کی قسم! یہ یقیناً
بہت اہم قسم ہے۔ ۳۱۹
زمین و آسمان کو چھ ادوار میں بنایا، انتظام سنبھالا،
ہر دم تمہارے ساتھ ہیں۔ ۳۴۶
آسمان و زمین کی ملکیت اسی کے لیے ہے ۳۴۸
رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا
ہے، دلوں کا حال جانتا ہے۔ ۳۴۹
آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ کے لیے ہے ۳۵۲
جہاد اور نیکی کرنے والوں سے احسان کا وعدہ کیا ہے ۳۵۳
کیا وقت نہیں آیا کہ مومنین کے دل اللہ کے ذکر
سے خشوع حاصل کریں۔ ۳۶۸

تمہیں آنے والی ہر مصیبت لوح محفوظ میں ثبت
ہے۔ اللہ کسی متکبر کو دوست نہیں رکھتا، جو نخل
کرے تو اللہ بے نیاز و لائق حمد ہے۔ ۳۸۳
ہم نے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا، میزان
آثاری اور لوہے کو نازل فرمایا جس میں قوت
اور منافع ہیں۔ ۳۸۹

ایمان والو! اللہ سے ڈرو کہ تمہیں بخش دے، وہ
غفور و رحیم ہے۔ ۴۰۴

ہم نے واضح آیات نازل فرمائی ہیں، کافروں کے
لیے عذاب ہے۔ ۴۲۱

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ اسے جانتا
ہے۔ جب وہ سرگوشی کریں تو وہ ان میں موجود ہوتا
ہے۔ ۴۲۲

- ہم نے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔ کون
 اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے؟ ۳۸۹
 ہم نے متواتر نبی بھیجے، نوح و ابراہیم کو بھیجا،
 پھر اور نبی بھیجے، پھر مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا۔ ۳۹۶
 اللہ وہ ہے جس نے امتین میں رسول بھیجا، جو
 ان پر آیات کی تلاوت، ان کا تزکیہ نفس کرتا
 اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ ۵۸۲
 یہ بعثت نبوی اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے
 دے، اللہ صاحب فضل عظیم ہے۔ ۵۸۴
 یہ منافق تمہارے پاس آکر کہتے ہیں کہ تم اللہ
 کے رسول ہو۔ یہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ ۶۱۷ تا ۶۲۳
 اللہ اس کے رسول اور اس نور پر ایمان
 لے آؤ جسے ہم نے نازل فرمایا۔ ۶۵۲

امامت

- بعض روایات میں میزان سے مراد وجود امام
 لیا گیا ہے۔ ۲۲۰
 نور سے مراد وہ امام معصوم ہے جس کی لوگ
 اقتدار کرتے ہیں۔ ۴۰۶
 امام جماعت کی طرح امام جمعہ کا عادل ہونا بھی
 شرط ہے لیکن بعض علماء کے نزدیک نماز جمعہ
 امام معصوم کے زمانہ حضور سے مربوط ہے۔ ۶۱۱

- مقام پروردگار سے عدالت الہی مراد ہے
 اصحاب یمن و شمال اور سابقین کا انجام
 عین عدالت ہے۔ ۳۳۲
 العدل بعد الجوار سے زمین کا عدالت و انصاف
 کے ذریعہ زندہ ہونا مراد ہے۔ ۳۷۲
 میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ عدالت کے ساتھ
 قیام کریں۔ ۳۸۹
 یہ داد گاہ الہی کے بعض مواقف ہیں
 دشمنوں سے بھی عدالت۔ مسلمان اور کافر عورتوں
 کے مہر و مصارف کا تبادلہ۔ ۵۳۷
 فضل الہی بھی اندر وئے حساب ہے، احادیث
 رسول کی روشنی میں اللہ کے فضل کی عطا۔ ۵۸۹
 تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں۔ کوئی
 مصیبت رونما نہیں ہوتی مگر اذن الہی سے۔
 (برہنائے عمل) اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۶۵۷

نبوت

- یہ پیغمبر پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک
 ڈرانے والا ہے۔ ۱۴۹
 اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، کیوں ایمان
 نہیں لاتے، حالانکہ رسول تمہیں دعوت ایمان
 دیتا ہے، وہ اپنے بندہ محمد پر آیات بقیات
 نازل فرماتا ہے۔ ۳۵۲

قیامت

جب قیامت واقع ہوگی تو کوئی اس کا انکار نہ کرے گا، گر وہ زیر و زبر ہوں گے، زمین لرزے گی، پہاڑ بکھر جائیں گے۔ ۲۷۹، ۲۷۸

تم تین گروہوں میں بٹ جاؤ گے ۲۷۹

وہ قیامت سے انکار پر اصرار کرتے تھے ۳۰۰

مگر اہوں کو قیامت میں کھانے کو زقوم اور پینے کو کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ ۳۰۲

ایک گروہ کو دوسرے کی جگہ لائیں گے، تمہیں دوسرے جہان کی زندگی بخشیں گے جسے تم نہیں جانتے۔ ۳۰۸ تا ۳۰۵

پانی برسا، مُردہ زمینوں کا زندہ ہونا قیامت کی دلیل ہے۔ ۳۱۴

سبز درخت سے آگ پیدا کرنا بھی قیامت کی نشانی ہے۔ ۳۱۵

اللہ قیامت میں سب کو اٹھائے گا اور ان کے اعمال سے باخبر کرے گا۔ ۴۲۲

قیامت کے دن انسان کا اصل سرمایہ اس کے نیک اعمال ہوں گے۔ ۴۹۹

تم ہرگز موت (حیات بعد الموت) کی تمنا نہ کرو گے۔ موت جس سے تم بھاگتے ہو تمہیں آپکڑے گی اور تم اللہ کی طرف پلٹے جاؤ گے، جہاں تمہارے افعال کی تمہیں خبر دی جائے گی۔ ۵۹۵، ۵۹۴

پروردگار کی قسم تم سب کے سب قیامت میں زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے۔ ۶۵۱

تمہیں صرف تمہارے اعمال ہی کی جزا ملے گی ۳۶

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔ ۱۱۵

اللہ ہی پر دوسرے عالم کا ایجاد کرنا واجب ہے قیامت نزدیک ہو گئی۔ اس کی شدت کو اللہ کے سوا کوئی برطرف نہیں کر سکتا، تعجب کرتے ہو، ہنستے ہو، روتے نہیں۔ ۱۴۹

قیامت کا ورود نئی زندگی کی ابتداء ہے ۱۵۷

وہ دن جس میں سب قبروں سے باہر نکلیں گے وحشت کی شدت سے ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں گی۔ ۱۶۷

قیامت کا دن بہت سخت کیوں ہے؟ ۱۶۸

مائیں اولاد کو بھول جائیں گی، حمل ساقط ہو جائیں گے قیامت ان کی وعدہ گاہ ہے، قیامت کا عذاب ہولناک ہے۔ ۱۹۵

اے جن و انس! ہم عنقریب تمہارا حساب کریں گے ۲۴۴

بغیر دھوئیں کی آگ اور تہ بہ تہ دھواں تم پر بھیجے گا آسمان پھٹ کر گپھلے ہوئے تیل کی طرح سُرخ ہو جائے گا۔ ۲۴۷

ان ہولناک حوادث کو کوئی بھی برداشت نہ کر سکے گا۔ ۲۴۷

جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہیں۔

۱۱۵

معجزہ

چاند شق ہو گیا
۱۶۰/۱۵۷
ناقہ صالح ایک معجزہ کے طور پر
۱۸۶
قرآنی پیش گوئیوں کا پورا ہونا بھی معجزہ ہے
۱۹۸

احکام

سجدہ

سب اس کے لیے سجدہ کرو
۱۵۳/۱۵۰

تبیح

پس اپنے پروردگار کی تسبیح کر
۳۱۳
اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اسے
پاک شمار کر۔
۳۳۱

قرض حسنہ

کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے تاکہ اللہ اس کے اجر میں اضافہ فرمائے۔

یہ اس وقت ہو گا جب وہ تمہیں اجتماع (تغابن) کے دن جمع کرے گا۔

۶۵۲

یقیناً مرنے کے بعد ایک دن اٹھائے جائیں گے، غبنوں ظاہر ہو گا۔

۶۵۶ تا ۶۵۲

جنت

مومن پر ہیزگار جنت کے باغوں میں ہوں گے، نعمات سے بہرہ ور اور خوش ہوں گے۔ ان کی

اولاد کو جنت میں ان سے ملحق کر دیں گے۔

۴۶ تا ۴۱

پر ہیزگار جنت کے باغوں میں ہیں

۲۰۰

جو اپنے پروردگار سے ڈرے اس کے لیے جنت میں دوباغ ہیں۔

۲۵۲

اہل جنت بہشت کی نعمات میں

۲۸۶

تمہارے گناہ بخش دے گا، جنت میں داخل کرے گا۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

۶۵۵ تا ۶۵۲

جہنم

جس دن جہنم کی آگ میں گرائے جائیں گے۔ اب آتش جہنم کا مزہ چکھو۔

۱۹۹

جو لوگ کافر ہو گئے، ہماری آیات کی تکذیب کی وہ دوزخ والے ہیں۔

۶۵۲

فرشتے

کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے تاکہ وہ اسے

۳۵۷

بڑھا کر واپس کرے۔

میں فضائل اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث

ہوا ہوں۔ (رسول پاک)

۴۰۷

ایک گروہ تو ایمان لایا

حزب اللہ، اطاعت خدا و رسول، فلاح و

۴۵۵

رستگاری، غلبہ و کامیابی۔

پیرا غل کر کے مہمان کو کھانا کھلایا، خود اور

۴۸۳

بچے بھوکے رہے۔

پانی ملا تو زخمی مجاہدین نے پیاس کی حالت میں

رہنے پر دوسروں کو ترجیح دی اور جان جان آفریں

۴۸۳

کے سپرد کر دی۔

عزت اللہ، اس کے رسول اور مومنین کے لیے

ہے۔ رسول، مومنین اور اللہ کے دوست اللہ

۶۳۲

ہی کے پر تو کے حامل ہیں۔

۶۳۰، ۶۳۹

علامہ شومستری کا واقعہ

اخلاقِ رفیلیہ

۳۶۳

منافقوں کی پیش رو تاریکی ہوگی

۳۶۵

منافقین و ضالین کی گمراہی اور کیفیات

جنہوں نے آیات الہی کو سنا مگر دل قسادت

۳۷۲ تا ۳۷۴

پر مائل رہے۔

۳۷۵

جو کافر ہو گئے وہ اصحابِ حجیم ہیں

مغفرت

اللہ کی مغفرت اور جنت تک پہنچنے کے لیے

۳۸۳

ایک دوسرے پر سبقت کرو۔

جہاد

سورہ صف اولاً اسلام کی برتری، پھر اسلام کی

حفاظت اور ترقی کے لیے لزوم جہاد کو بیان کرتی

۵۴۷

ہے۔

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت (جہاد)

کی طرف رہبری نہ کروں جو تمہیں عذاب سے

۵۷۱

نجات دے۔

حواریوں کی طرح ہو جاؤ، اپنے رسول کی نصرت

میں جہاد کرو، تم غالب ہو جاؤ گے۔

اخلاقیات

(اخلاقِ حسنہ)

نیک عمل

اس جہان میں کوئی چیز ختم نہیں ہوتی، ہر نیک و

۱۵۹

بڑائی باقی رہتی ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

لوطؑ

- قوم لوطؑ کے زیرِ بر شدہ شہروں کو زمین پر
دے مارا۔ ۱۲۵
- لوطؑ کی قوم نے انذار کو جھٹلایا۔ ہم نے ایسی
آندھی کے ذریعہ جو پتھروں کو اڑاتی تھی انہیں
تباہ کر دیا۔ ۱۸۹

نوحؑ

- ہم نے قوم نوحؑ کو ہلاک کیا کیونکہ وہ سب
ظالم تھے۔ ۱۲۵

شخصیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام

- کیا تم ابراہیمؑ کی کتب سے باخبر نہیں ہوئے
جس نے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں؟ ۱۲۸
- تمہارے لیے ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں
کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے۔ ۵۱۸
- بیشک ابراہیمؑ مہربان اور بُرہ بار تھا۔ ۵۲۱

ابن الکواء

- نام عبداللہ جناب امیر کا دشمن، بظاہر دوست
جناب امیرؑ سے ذاریات کے معنی دریافت کیے ۸۸

۳۹۶

مگر اکثر فاسقین سے تھے

نفاق، حق سے دشمنی، یاد خدا کی فراموشی

۲۵۵

بھوٹ اور فریب۔

مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو، جن پر اللہ
کا غضب نازل ہوا ان میں کفار و مشرکین کے

۵۴۵، ۵۴۴

علاوہ منافق بھی شامل ہیں۔

منافق بے اخلاص اور ٹوٹنے والا ہے، اگر کر

کھڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ٹوٹ کر بے بس

۶۳۳

ہو جاتا ہے۔

اقوام سابقہ

ثمود

- قوم ثمود کو بھی ہلاک کیا۔ ان میں کسی کو نہیں چھوڑا ۱۲۵
- قوم ثمود خوفِ خدا سے نہیں ڈری ۱۸۳
- ثمود کا دردناک انجام، ایک چیخ سے ہلاکت ۱۸۴ تا ۱۸۲

عاد

- کیا تمہیں پتہ نہیں کہ اللہ نے قوم عاد کو ہلاک کر دیا؟ ۱۲۵
- قوم عاد نے ہودؑ پیغمبر کی تکذیب کی، سرِ دتیر
وحشت ناک آندھی سے معذب ہوئی۔ ۱۴۸ تا ۱۴۶

فرعون

۱۹۴

آل فرعون کے لیے تحویل و تنبیہ الٰہی

ابن عمرؓ

قرآن پاک کو پاکیزہ افراد کے سوا کوئی نہ چھوئے۔
(حدیث) ۳۲۴

ابن ماسویہ

مامون الرشید کا طبیب خاص ۳۲۸

اسعد بن زرارہ

ہجرت سے قبل مدینہ میں نماز جمعہ کی بحکم رسول
اقتدار کی۔ ۶۰۴

اسید انصاری

عبداللہ ابن ابی سے مکالمہ میں زید بن ارقم
کی مدد کیا کرتے تھے۔ ۶۲۶، ۶۲۷

اُمّ حبیبہ (اُمّ المؤمنین)

مسلمان ہو کر اپنے شوہر عبید اللہ کے ساتھ حبشہ
کی طرف ہجرت کی۔ عبید اللہ کے عیسائی ہو
جانے پر رسول پاک سے عقد ہوا۔ ۵۲۸

اوس بن صامت

اپنی زوجہ خولہ سے ظہار کیا ۴۱۴

حضرت ابو بکرؓ

مفسرین کی ایک جماعت نے اتفاق کرنے والے
کا مصداق حضرت ابو بکرؓ کو سمجھا ہے۔ ۳۵۶

ابو ذر غفاری

جنتی بیوی شوہر سے کہے گی، میں نے تجھ سے
بہتر کوئی چیز نہیں پائی۔ ۳۶۰
ابو ذرؓ کی زیادہ تر عبادت غور و فکر کرنا اور عبرت
حاصل کرنا تھی۔ (امام جعفر صادقؑ) ۳۶۶

ابو سعید خدری

ہو سکتا ہے ایک قوم تمہارے بعد آئے جو تمہیں
پھوٹا تصور کرے۔ (حدیث) ۳۵۹
اے فاطمہ! فک تیری ملکیت ہے (حدیث) ۳۷۹

حضرت ابو طالبؓ

اپنے اشعار میں آنحضرتؐ کا اسم گرامی 'احمد'
نظم کیا ہے۔ ۵۶۳

ابن حزم

قرآن پاک کو پاکیزہ افراد کے سوا کوئی نہ چھوئے۔
(حدیث) ۳۲۴

بختیشوع

مامون رشید کا طبیب

۳۲۸

براء بن عاذبؓ

اللہ کو اسم اعظم سے پکارو، سورہ حدید کی آیات پڑھو۔ (جناب امیرؓ)

۳۵۰

میں نے حسن بن علیؓ کو پیغمبر کے دوش پر دیکھا جبکہ آپؐ فرما رہے تھے خدایا میں اُسے دوست رکھتا ہوں تو بھی اُسے دوست رکھ۔

۶۶۶

برصیصا

بنی اسرائیل کا ایک عابد جو شیطان کے بہکانے سے کافر ہو گیا۔

۴۹۵

جعفر بن ابی طالبؓ

آنحضرتؐ کے حکم سے ستر آدمیوں کے ساتھ تبلیغ کے لیے حبشہ گئے۔

۴۰۵

مہاجرین حبشہ کے قائد حضرت علیؓ کے بھائی

۵۲۸

حضرت امام جعفر صادقؑ

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ معراج میں سدرہ کے ہر پتہ کے سایہ میں ایک اُمت قرار پائی ہے۔

۹۳

وہ گناہ جو انسان کر بیٹھتا ہے، پھر ایک مدت زکا رہتا ہے، پھر اکودہ ہوتا، مگر یہ اس کا معمول نہیں۔

۱۲۲

لحمہ یہ ہے کہ انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے پھر اس سے استغفار کرے۔

۱۲۲

لحمہ کو انجام دینے والا وہ بندہ ہے جس سے کبھی کبھار گناہ سرزد ہو جاتا ہے، لیکن یہ اس کی عادت نہیں ہے۔

۱۲۳

بعض اوقات کچھ ضرورتوں کے پیش نظر اپنے فضائل بیان کرنا ضروری ہو جاتے ہیں۔

۲۲۷

جس وقت گفتگو اللہ تک پہنچ جائے تو چپ ہو جاؤ۔

۱۳۸

سقر جہنم کا ایک درہ متکبر لوگوں کے لیے ہے "تکذبان" کے بعد لابیسی..... کہنے

۲۰۱

والادن کو مرے یارات کو، شہید کا درجہ پائے گا۔

۲۱۱

رحمن اسم خاص ہے، عمومی صفت رکھتا ہے۔

۲۱۳

اس کی رحمت سب کے شامل حال ہے۔

۲۱۷

البیان وہی اسم اعظم ہے جس سے تمام چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔

۲۱۷

علیؓ وفا طمہ دو عمیق سمندر ہیں۔ حسن و حسینؑ لؤلؤ و مرجان ہیں۔

۲۳۵

اللہ قیامت میں تمام بندوں کو ایک ہی مقام پر جمع فرمائے گا، آسمان اول کے فرشتوں کو نزول کا حکم دے گا، وغیرہ۔

۲۳۶

سورہ مجادلہ پڑھنے والا قیامت میں حزب اللہ میں شمار ہوگا۔ ۴۱۱، ۴۱۰

بصورت استطاعت ظہار کا کفارہ اٹھارہ دن کے روزے کافی ہیں۔ ۴۲۰

ہر چیز اس پر واضح و آشکار ہے۔ ۴۲۶

جب تک اپنی جان، والدین، اولاد سے زیادہ اللہ کی محبت نہ ہو ایمان کامل نہیں ہوتا۔ ۴۴۶

ہر مومن کے دوکان ہیں۔ ایک میں وسواس خناس پھونک مارتا ہے اور دوسرے میں ملک۔ اللہ مومن کو فرشتے کے ذریعہ تقویت دیتا ہے۔ ۴۵۷

جو شخص سورہ رحمن و حشر کو غروب آفتاب کے وقت پڑھے ایک فرشتہ ننگی تلوار لے کر اس کے گھر کی حفاظت کرے گا۔ ۴۶۰

ابو ذرؓ کی زیادہ تر عبادت غور و فکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا تھی۔ ۴۶۶

شیخ وہ ہے جو اپنے مال کے علاوہ دوسرے کے مال کا بھی بخیل ہے۔ ۴۸۴

لوگوں کو اپنے عمل کے ذریعہ دعوت دینا کہ زبان کے ذریعہ۔ ۵۲۵

جو شخص اللہ کے لیے دوستی، دشمنی اور عطا و بخشش کرتا ہے اس کا ایمان کامل ہے۔ ۵۲۶

مومن کا اپنے بھائی سے وعدہ کرنا ایک نذر ہے جو وعدہ کی خلاف ورزی کرے گا اس نے اللہ کی مخالفت کی۔ ۵۵۲

جو اللہ کو حاضر ناظر جانتا ہے وہ خائف رہتا ہے، ہوائے نفس سے باز رہتا ہے۔ ۲۵۵

نیکی کا جواب نیکی سے دینا چاہیے۔ (طویل حدیث) ۲۶۱

نیکی کے بدلہ میں اس سے بہتر اور بالاتر نیکی کرنا چاہیے۔ ۲۶۲

اللہ فرماتا ہے، دو جنتیں ہیں، جنتوں کے دو درجے ہیں۔ ۲۶۵، ۲۶۴

اپنے بچوں کو انار کھلاؤ، جلدی جوان ہوں گے ۲۶۷

جو شب جمعہ سورہ واقعہ پڑھے، اللہ اسے دوست رکھے گا، مفلسی و آفات سے محفوظ رہے گا۔ ۲۷۶

امیر المؤمنینؓ کے رفقاء میں شمار ہوگا۔ ۲۷۶

ایک جماعت سے فرمایا کہ تم پہلے سابعون اور آخری سابعون ہو، ہماری ولایت اور جنت کی طرف سبقت کرنے والے ہو۔ ۲۸۴

اگر مقررین میں سے ہے تو اس کے لیے قبر میں روح و ریحان اور آخرت میں پُر نعمت بہشت ہے۔ ۳۳۲

اللہ نے کسی احتیاج کی بنا پر سوال نہیں کیا۔ اللہ کے حقوق اس کے نمائندہ اور ولی کے لیے ہیں۔ ۳۶۰

العدل بعد الجوار سے مراد زمین کا عدالت و انصاف کے ذریعہ زندہ ہونا ہے۔ ۳۷۱

مومن شہید ہے۔ واللّٰزین امنوا۔۔۔ والشہداء ۳۷۸ تا ۳۷۴

حضرت امام حسن عسکریؑ (امام یازدہم)

سعد بنس ایام پر آپ کے ارشادات ۱۸۱، ۱۸۰

حضرت امام حسینؑ (امام سوم)

اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کی ہر روز

۲۴۱

نئی شان اور نیا کام ہے۔

تم بہت بڑے لوگ ہو، اطاعتِ خدا و
رسول کا دعویٰ کرتے ہو اور اب آئے ہو
کہ اولاد پیغمبر کو قتل کرو۔

۲۴۸

خولہ

اوس بن صامت کی زوجہ، شوہر کے ظہار
کرنے کی رسول پاکؐ سے شکایت کی۔

۴۱۴

حضرت داؤد علیہ السلام

اللہ نے زمین بنانے کے لیے لوہے کو

۳۹۲، ۳۹۱

آپ کے لیے نرم کر دیا۔

زعلب یمانی

آیت ”قاب قوسین“ کے جناب امیر
سے معنی دریافت کیے

۸۸

ۛ

عالم وہ ہے جس کا عمل اس کے قول کی تصدیق کرے ۵۵۵

ہر مومن شبِ جمعہ میں سورہ جمعہ و اعلیٰ اور بروز جمعہ

ظہر میں سورہ جمعہ و منافقون پڑھے، یہ عمل رسولؐ ہے ۶۱۵

مناسب نہیں کہ مومن اپنے آپ کو ذلیل کرے ۶۳۵

سورہ تغابن قیامت میں پڑھنے والے کی شفیع ہوگی ۶۴۴

جس نے زکوٰۃ ادا کر دی اس نے بخل و حرص سے

نجات پالی۔ ۶۶۷

خداوند! مجھے حرص و بخل سے بچا ۶۶۸

حاطب ابن ابی بلتعہ

جس نے سارہ مغنیہ کے ہاتھ خطر روانہ کر کے

مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے راز بھیجے۔ ۵۱۴، ۵۱۳

حبیب بنجار

حبیب بنجار کا شمار سابقین الاولون میں ہے ۲۸۲

حسان بن ثابت

حسانؓ کے اشعار میں آپؐ کا اسم مبارک ’احمد‘

مذکور ہے۔ ۵۶۴، ۵۶۳

حضرت امام حسنؑ (امام دوم)

حمد ہے اللہ کی جس کی ابتداء و انتہا معلوم نہیں،

نہ اس کے ظاہر و باطن کا انداز ممکن ہے۔ ۳۴۳

زید بن ارقم

زید بن ارقم انصاری کا عبداللہ ابن ابی سے مکالمہ ۶۲۶، ۶۲۷

سارہ (مغنیہ)

مکی مغنیہ آنحضرتؐ کے پاس مالی امداد مانگنے آئی۔
حاطب بن بلتعہ کا ایک خط مشرکین مکہ کے نام
لے گئی۔

۵۱۳، ۵۱۴

سبیحہ

مسلمان ہو کر حدیبیہ ہی میں مسلمانوں سے آن ملی
اس کے شوہر نے آنحضرتؐ سے اس کی واپسی
کا مطالبہ کیا۔

۵۳۲

سعید بن جبیر

حجاج کے حکم سے آپ کے قتل پر ایک شخص
کارونا اور آپ کا آیت "ما اصاب من
مصیبة..... کا تلاوت فرمانا۔

۳۸۶

سلمان فارسی

آپؐ نے منافقین سے فرمایا کہ قرآن احسن القصص ہے ۳۶۹
یا علیؑ! آنحضرتؐ نے میری پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمایا
کہ علیؑ اور اس کی جماعت کامیاب ہیں۔

۴۵۵

سلیمان بن صرد

کوفہ کے شیعوں کا سرگروہ جس کے یہاں جمع ہو کر
شیعہ مشورہ کرتے تھے۔

۶۰۶

شیطان

انسان سے کہا کافر ہو جا۔ جب ہو گیا تو کہا
میں تجھ سے بیزار ہوں، پس دونوں جہنم کی
آگ میں ہیں۔

۴۹۳

حضرت صالحؑ

قوم ثمود کو تبلیغ کی۔ ثمود کا عبرت ناک انجام ۱۸۲ تا ۱۸۶

حضرت عائشہؓ (أم المؤمنین)

یہودیوں کا آنحضرتؐ کو السام علیک کہنا، آپؐ
کا ناراض ہونا۔ حضورؐ کا تلقین صبر کرنا۔

۴۶۸

عبداللہ ابن ابی

منافقین کا سرغنہ، نہایت وجہہ و لحیم و شمیم

۶۲۲

عبداللہ ابن جحش

اسلام لانے کے بعد جنگ احد میں شہادت پائی

۵۴۸

آیتِ نجویٰ کے مطابق صدقہ دینے کا عمل
حضرت علیؓ نے انجام دیا۔

۳۴۲

عبداللہ ابن مسعودؓ

آپؓ نے 'علم القرآن' تلاوت کیا تو
قریش نے آپؓ کو تھپڑ مارے۔ یہ پہلے شخص
تھے جس نے کفارِ قریش کے سامنے قرآن پڑھا۔ ۲۷۳
رہبانیت کے بارے میں حدیثِ رسولؐ بیان کی ۴۰۱

عبدالرحمن بن کعب

ایک محدث نے ان سے نقل کیا ہے کہ میرا
باپ جب اذان جمعہ سنتا تو اسعد بن زرارہ
کے لیے دعائے رحمت کرتا۔ ۶۰۵

عبید اللہ ابن جحش

ام حبیبہ بنت ابوسفیان کا شوہر جس نے
مسلمان ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کی، مگر
وہاں جا کر عیسائی ہو گیا۔ ۵۲۸

عثمان ابن عفانؓ

ان کے پاس بہت دولت تھی، انفاق کرتے تھے۔
عبداللہ بن سعد نے کہا کہ دولت ختم ہو جائے
گی۔ سواری کا اونٹ مع سامان مجھے دے دو
میں گناہ اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ ۱۲۹

عبداللہ ابن سعد

حضرت عثمانؓ کا ایک رشتہ دار، ان سے اونٹ
لے کر ان کے گناہ اپنے سر لینے کا اقرار کیا اور
اس پر گواہی کرائی۔ ۱۲۹

عبداللہ ابن عباسؓ

اللہ نیک اولاد کو جنت میں مومن والدین سے
ملحق کر دے گا۔ (رسولِ پاکؐ)
علیؓ اور ان کے پیروکارِ مقربین بارگاہ ہیں
آنحضرتؐ نے پیاس کی حالت میں دعا کی اور پانی برسا ۳۲۳
حدیثِ نجویٰ بیان کی۔ ۳۴۲

آنحضرتؐ نے 'وات ذی القربی' کے
نزول پر فدک کی جاگیر جنابِ فاطمہؓ کو دے دی۔ ۳۷۹
بنی نظیر پر کامیابی کے بعد آنحضرتؐ نے انصار
سے فرمایا کہ اپنے گھروں کو مہاجرین پر تقسیم کر دو
تو بنی نظیر کے مال سے حصہ لے لو۔ ۴۸۲

عبداللہ زنجانی

عبداللہ نے تاریخ القرآن میں ابن ندیم سے نقل
کیا ہے کہ اتھابن، تیسواں مدنی سورہ ہے۔

عبداللہ ابن عمرؓ

۳۴۳ اس کی اولیت کی ابتداء اور بقا کی انتہاء نہیں
سورہ حدید و حشر کی آخری آیات کی تلاوت و

۳۵۰ ثواب پر طویل حدیث۔

کبھی کام میں جلدی نہ کرو، پشیمان ہو گے، حق
۳۷۰ سے فاصلہ کی بنا پر قساوت قلبی ہوگی۔

جو اپنے بستر پر مرے، پیغمبر و اہل بیت کی
۳۸۰ معرفت رکھتا ہو، وہ شہید مرا۔

جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے اس پر غم نہ کرنا،
۳۸۷ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس پر فخر نہ کرنا۔

لو ہے کو نازل کرنے سے مراد اسے پیدا کرنا
ہے، منافع سے ہر قسم کا نفع مراد ہے جو لوہے
۳۹۱ سے ہوتا ہے۔

کسی چیز کی اصلاح بھی جہاد کے بغیر ممکن نہیں
۳۹۲ جن کی کوششیں زندگی میں گم ہو گئیں وہ سمجھتے
ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں، وہی گھائے میں
۴۰۲ ہیں۔

راہب جو پہاڑوں، بیابانوں میں خود کو قید
کیے ہوئے ہیں وہ اسے اچھا سمجھتے ہیں۔

۴۰۳ جہاں ہوائے نفس ہو وہاں دین نہیں ہوتا۔

۴۰۸ اللہ کے امناساری مخلوق پر تسلط رکھتے ہیں

۴۲۵ اللہ ہم پر احاطہ کیے ہوئے ہے

۴۲۶ جو زمانہ طالب علمی میں مرجائے اس کے اور
انبیاء کے درمیان ایک درجہ کا فاصلہ ہے۔

حضرت علی ابن ابی طالب (امام اول)

۳۳ عقیل سے کہا مجھے اس آگ کی طرف کھینچتے ہو

جسے اللہ نے اپنے غضب سے بھڑکایا۔
ہوائے نفس کی پیروی انسان کو راہ حق سے

روک دیتی ہے۔
۸۱، ۸۰ میں نے اللہ کو مصمم ارادوں میں ناکام رہنے اور

ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔
۱۱۲ اللہ نے خود ستائی سے منع کیا ہے ورنہ وہ فضائل

بیان کرتا جن سے مومنین کے دل نا آشنا ہیں۔
۱۲۶ اے اہل بصرہ! زیروزبر شدہ زمین کے رہنے

والو! اے عورت کے لشکر، اے اونٹ کی پیروی
کرنے والو۔

۱۴۷ دو مشرقوں اور دو مغربوں پر آپ کی حدیث ۲۲۷، ۲۲۸
حمد و ستائش اس اللہ کی جو نہیں مرتا، ہر روز نئی

شان، نیا موضوع ہے۔
۲۳۹ امیر المومنین کا سابقون الاولون میں شمار ہے

۲۸۲ "امنحن الخالقون" کی تلاوت پر فرمایا
"بل انت یارب" تا آخر۔

۳۱۷، ۳۱۸ محضر کا عمل مجتہم ہو کر سامنے آئے گا۔
(طویل حدیث) ۳۳۳، ۳۳۵

وہ اپنے تسلط و عظمت کی بنا پر غلبہ رکھتا ہے،
اپنے علم و معرفت کی وجہ سے اس کے باطن میں
۳۴۲ راہ رکھتا ہے۔

علم عمل کے ساتھ توام ہے، بے عمل سے علم چلا جاتا ہے۔ عالم بے عمل پر حجت بہت بھاری ہے، اس کے لیے دائمی حسرت ہے۔

(دو احادیث) ۵۹۶

جو کچھ دل میں ہے اس سے بڑھ کر شروع و خضوع کرنا ہمارے نزدیک نفاق ہے۔ ۶۴۱
کوئی اللہ سے یہ نہ کہے کہ میں تجھ سے امتحان و آزمائش سے پناہ چاہتا ہوں۔ اولاد و ازواج ذریعہ آزمائش ہیں۔ ۶۶۵

حضرت امام علی بن الحسین (امام چہارم)

قیامت خافضہ ہے۔ خدا کی قسم وہ دشمنانِ خدا کو جہنم میں گرا دے گی اور اولیاء اللہ کو بہشت میں لے جائے گی۔ ۲۸۱/۲۸۰

دربارِ یزید میں فرمایا، ہمارے لیے تو "ما اصاب من مصیبة" کی آیت اُتری ہے۔ ۳۸۵

جو سورۃ ممتحنہ کو واجب و مستحب نمازوں میں پڑھے گا، اللہ اس کے دل کو ایمان کے لیے خالص اور آمادہ کرے گا، نورِ بصیرت عطا ہوگا، فقر و فاقہ دور ہوگا، وہ اور اس کی اولاد جنوں میں گرفتار نہ ہوگی۔ ۵۱۱

تیری نیاز مندی و حاجت مندی گفتگو کی نرمی اور حسنِ سلوک سے ظاہر ہو۔ ۴۳۷

آیتِ نبویٰ پر نہ مجھ سے پہلے نہ میرے بعد کسی نے عمل کیا۔ ۴۴۱

قتلوں کے وقوع باطل آراء ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے۔ ۴۴۸

سعادت مند وہی ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔ ۴۶۷

مالکِ اشتر کے بارے میں اہلِ ایران مصر کے نام مکتوب کی عبارت۔ ۵۴۳

تم لوگوں سے وعدہ کرو اور پھر وعدہ سے تخلف کرو، اس سے پرہیز کرو کہ یہ موجبِ غضبِ خدا ہے۔ ۵۵۲

اپنی صفوں کو آہنی دیوار کی طرح مستحکم کر لو، دانتوں کو مضبوطی کے ساتھ بھینچ کر رکھو (صفین کے مجاہدوں) ۵۵۳

(اہلِ عراق سے) محفل میں ڈینگیں مارتے ہو اور میدانِ جنگ میں ہائے ڈائے کرتے ہو۔ ۵۵۵

میں تو اللہ کے لیے احمد کی نصرت میں کوشش کرتا ہوں۔ ۵۶۴

جو لوگ بیدار و آگاہ ہیں دنیا ان کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ دنیا دوستانِ خدا کی تجارت گاہ ہے۔ ۵۷۵

وہ اللہ کی نعمتوں میں غرق ہیں اور خوش و خرم زندگی میں شادمان ہیں۔ ۵۸۹

خدا کی قسم! البطل لب کا بیٹا موت سے اس سے زیادہ مانوس ہے جتنا بچہ ماں کے پستان سے ہوتا ہے۔ ۵۹۵

فضیل بن عیاض

ابتداء میں رہن تھے۔ 'تخشع قلوبہم' کی
آیت سن کر توجہ کی اور ایمان والوں میں داخل
ہو گئے۔ (امام جعفر صادقؑ کے موثق راوی) ۴۷۱، ۴۷۰

قتیبہ بن سعید

اپنے اونٹوں کے مالک کا صبر و ضبط (تمام اونٹ
مر جانے پر) بیان کیا۔ ۳۸۸

قدار بن سالف

قوم ثمود کا فرد جس نے ناقہ صالحؑ کی کونچیں
کاٹ دیں۔ ۱۸۷

مامون الرشید عباسی خلیفہ

مامون کی جانگنی کا واقعہ ۳۲۸

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سورہ طور کی تلاوت کرنے والے کو اللہ عذاب
سے مامون فرمائے گا۔ ۲۹، ۲۸

مومن جنت میں اولاد کے لیے اللہ سے درخواست
کے گا، نیک اولاد اس سے ملے گی جتنی چاہے گی۔ ۴۵، ۴۴

خداوند! یہ مقام (نماز جمعہ اور عید قربان) تیرے
خلفاء و برگزیدہ ہستیوں کے لیے مخصوص تھا۔

بنی امیہ نے زبردستی اولیائے حق سے لے لیا۔ ۶۰۸
منافق نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کرتا ہے لیکن
دونوں کے خلاف عمل کرتا ہے۔ ۶۴۱

حضرت امام علی ابن موسیٰ رضا (امام ہشتم)

الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ پر آپؑ کی حدیث ۲۱۷
میزان سے مراد وجود ایمان ہے ۶۶۵
قرآن کو طہارت کے بغیر مس نہ کرو ۳۲۳
مسلمانوں کے امیر کو جمعہ کا خطبہ موقع فراہم کرتا ہے
کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے۔ ۶۱۱

حضرت علیؑ ابن مریمؑ

وہ باتیں نہ کرو جو اللہ کے ذکر سے خالی ہوں ۳۷۱، ۳۷۰
میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، تورات
کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد آنے والے
رسول احمدؑ کی بشارت دیتا ہوں۔ ۵۵۷

حضرت فاطمہ الزہراءؑ

رسول پاکؐ کا عطیہ، جائیدادِ فدک، خلافتِ اول
میں بحیرہ آپ سے واپس لے لی گئی۔ ۴۷۸، ۴۷۷

- ۱۴۳ اگر تم اس چیز کو جانتے جسے میں جانتا ہوں تو تم روتے زیادہ اور ہنستے کم۔
- ۲۰۲ النہر الفضاء واسعة ليس بنهر جار (حدیث)
- ۲۰۵ میری اُمت کے دو گروہ 'جبری'، 'قدری' کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔
- ۲۱۱ جس نے سورہ رحمن کی تلاوت کی، اللہ اس پر رحم فرمائے گا۔
- ۲۳۹ اللہ گناہوں کو بخشا اور رنج و تکلیف کو برطرف کرتا ہے۔ ایک گروہ کو بلندی اور ایک کو پستی عطا فرماتا ہے۔
- ۲۶۴ دو جنتیں، ایک تمام چاندی اور دوسری سونے کی بنی ہوئی ہے۔
- ۲۶۲ ذوالجلال والاکرام کے واسطے سے دعا پر دو حدیثیں، قبولیت دعا۔
- ۲۶۶ سورہ واقعہ کا قاری غافلین میں نہیں، مجھے سورہ ہود، واقعہ، مراسلات اور عم نے بڑھا کر دیا ہے۔
- ۲۶۶ ہر شب سورہ واقعہ کا قاری مغفل نہ ہوگا (عبداللہ ابن مسعود)
- ۲۸۳، ۲۸۲ سابقون الاولون، پر طویل حدیث
- ۲۹۳ 'سدر منخضود' اس بیری سے کانٹے ختم کر کے عمدہ پھل لگا دیے۔

- ۲۹ جنت میں مخدوم کی خادم پر برتری ایسی ہوگی جیسی بدر کامل کی ستاروں پر۔
- ۷۲ یہ وہ کلمات ہیں جن کی اللہ نے مجھے تعلیم دی ہے
- ۷۲ یہ اس چیز کا کفارہ ہے جو مجلس میں واقع ہوتی ہے۔
- ۸۱، ۸۰ ہوائے نفس کی پیروی انسان کو راہ حق سے روک دیتی ہے۔
- ۸۲ میں نے دروازہ کھولا نہ بند کیا۔ یہ عمل مطابق وحی الہی تھا۔
- ۸۷ میں جب معراج پر گیا تو پروردگار کی ساحتِ قدس سے بھدر دو کمان یا اس سے بھی کم پر پہنچ گیا۔
- ۹۳ میں نے سدرہ کے ہر پتے پر ایک فرشتہ کو کھڑا دیکھا جو اللہ کی تسبیح و عبادت میں مصروف تھا۔
- ۱۰۳ تا ۹۹ آنحضرتؐ کے اللہ کے سوال و جواب (حدیثِ قدسی کے اقتباسات)
- ۱۰۴ جس کی تمنا رضائے خدا کا موجب ہو وہ نہ مرے گا جب تک تمنا پوری نہ ہو جائے۔
- ۱۱۸ خداوند! دنیا کو ہمارے لیے سب سے بڑی فکری مشغولیت اور ہمارے علم و آگہی کی انتہا قرار نہ دے۔
- ۱۳۵ ابوذر کا سوال: مولانا! کتنے پیغمبر آئے؟ رسول پاکؐ کے جوابات۔
- ۱۳۸ اللہ آسمان کو بارش کے ذریعہ رلاتا اور زمین کو نباتات کے ذریعہ ہنساتا ہے۔

- ۳۴۸ اللہ کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھنا افضل ایمان ہے
اللہ، فرشتوں اور رسولوں پر ایمان کی تفصیل
اور امتیاز۔ ۳۵۵، ۳۵۴
ایسا انفاق اللہ قبول نہیں فرماتا جس میں خیانت
کا دخل ہو۔ ۳۵۸
انفاق میں مسابقت پر حدیث (ابوسعید خدری) ۳۶۰، ۳۵۹
وقوع قیامت پر تلوار کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں
تاکہ خدا کے واحد کی عبادت ہو۔ میری روزی میرے
نیزے کے سایہ میں ہے۔ ۳۹۲
لوگوں کو تلوار کے علاوہ کوئی چیز سیدھا نہیں کر سکتی
۳۹۳
میری امت کی رہبانیت راہِ خدا میں جہاد کرنا ہے
۴۰۰
میری امت کی رہبانیت ہجرت، جہاد، نماز، روزہ
چچ اور عمرہ میں ہے۔ ۴۰۱
اگر شیاطین انسانی دلوں پر قبضہ نہ کرتے تو وہ
ملکوتِ سموات کو دیکھ سکتے۔ ۴۰۸
اوس بن صامت کو سورہ مجادلہ کی آیات سنائیں
اور ظہار کا کفارہ ادا کر دیا۔ ۴۱۵
دو افراتیسرے سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔
کیا تمہیں بخوبی سے منع نہیں کیا گیا۔
(بذریعہ ابوسعید خدری) ۴۳۱
اللہ نے ہمیں بہتر سلام کا حکم دیا ہے۔ ۴۳۲
عالم شہید سے اور شہید عابد سے ایک درجہ
بلند ہے۔ ۴۳۶

- جو بچہ شہر دار عورت سے پیدا ہوا وہی اس
گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۲۹۵، ۲۹۴
جو دنیا کو دیکھتا ہے اور آخرت پر ایمان رکھتا
ہے اور جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے مگر اس
کی تمام توجہ دنیا داری پر ہے، دونوں کا
معاملہ عجیب ہے۔ ۳۰۹
کوئی نہ کہے میں نے زراعت کی، زراعت حقیقی
اللہ ہے۔ ۳۱۱
حمد اس اللہ کی جس نے بیٹھے پانی سے سیراب
کیا اسے کڑوا نہ کیا۔ ۳۱۵
یہ آگ جو جلاتے ہیں جہنم کی آگ کے ستر
اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ ۳۱۶
تمہارے پاس جو فالتو پانی ہو اسے بند گالن
خدا کو استعمال کرنے سے نہ روکو۔ ۳۱۸
آنحضرتؐ کو پیاس لگی، دعا فرمائی، بارش ہوئی۔
کسی نے کہا تارے کی برکت سے ہوئی۔ ۳۲۳
پاکیزہ افراد کے سوا قرآن کو کوئی مس نہ کرے،
قرآن پوشیدہ کتاب میں ہے۔ ۳۲۴
سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ کا ذکر
رکوع و سجود میں۔ ۳۲۴
سورہ حدید کا قاری مومن ہے۔ حدید، صف،
جمع، تغابن کی فضیلت۔ ۳۲۹
تو ایسا اول ہے کہ اس سے پہلے کوئی چیز نہیں
ایسا آخر ہے کہ اس کے بعد کوئی چیز نہیں۔ ۳۲۴

جو سورہ ممتحنہ کی تلاوت کرے قیامت کے دن
تمام مومنین و مومنات اس کے شفیع ہوں گے۔ ۵۱۰
اللہ کی خاطر دشمنی و دوستی، بخل و بخشش
ایمان کو محکم کرتی ہے۔ ۵۲۶
سورہ صاف پڑھنے والے کے لیے حضرت عیسیٰ
استغفار و دعائے رحمت کریں گے۔ ۵۴۷
احمد نام کے ثبوت میں ابوطالب اور علی ابن
ابی طالب کے اشعار ۵۶۵/۵۶۳
واقعہ معراج میں آنحضرت کو احمد نام سے
خطاب کیا گیا۔ ۵۶۴
جو لوگ نماز جمعہ میں شریک ہوں انہیں شکر کلمے
نماز و عدم شکر کا دیکھنا سے دس گنا ثواب ملے گا۔ ۵۸۱
جس کا علم زیادہ ہو، لیکن اس کی ہدایت میں اضافہ
نہ ہو تو یہ علم اسے اللہ سے دوری کے سوا کچھ نہیں دیتا ۵۹۵
عالم بے عمل عالم تمام ذمہ داریاں اٹھانے کے
باوجود علم سے بہرہ مند نہیں ہوتا۔ ۵۹۶
جو شخص نماز جمعہ بطور استخفاف ترک کرے اس کا
ہر عمل نماز، زکوٰۃ ناقبول، اللہ اسے پریشان حال
کرے گا اور اس کی ہر شے سے برکت اٹھ جائے گی۔ ۶۰۵
جو شخص از روئے ایمان اللہ کے لیے نماز جمعہ میں
شرکت کرے اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ ۶۰۶
تو نماز جمعہ پڑھ ہی تیرا ج ہے۔ (ایک شخص
کو ہدایت) ۶۰۶

عالم کی عابد پر فضیلت، بدر کامل کی ستاروں
پر فضیلت کی طرح ہے۔ ۴۳۶
انبیاء، علماء، شہداء قیامت میں
مومن کی دوسرے مومن سے برائے خدا خوشنودی
بہترین عمل ہے۔ ۴۵۵
سورہ حشر کی تلاوت کے بے حساب فضائل
دشمنوں کو خوف و دہشت میں مبتلا کر کے اللہ نے
ایک ماہ کے فاصلہ سے میری مدد کی۔ ۴۶۳
بنی نضیر پر کامیابی کے بعد ان کی جائیداد کی تقسیم
ایک بھوکے سوالی کے لیے فریاد، کوئی ہے جو اسے
کھانا کھلائے۔ ۴۸۳
بخل، حرص اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں
ہو سکتے۔ ۴۸۴
روز قیامت کے لیے اتفاق کرو خواہ ایک خرم ہو۔
اللہ کا سوال، آگے کے لیے کیا بھیجا، راہ خدا میں
اتفاق کرو خواہ خرم کا آدھا دانا ہو۔ ۴۹۹
آنحضرت کی تحریک پر ہر شخص کچھ نہ کچھ لایا۔ ایک
معقول امداد جمع ہو گئی۔ ۵۰۰
سورہ حشر کی آخری آیات پڑھنے سے اگلے پچھلے
گناہ بخشے جائیں گے، پڑھنے والا مرے تو شہید
ہوگا۔ ۵۰۷
سورہ حشر کی آخری آیات موت کے سوا ہر مرض
کا علاج ہیں۔ ۵۰۸

- ۳۲۲ قرآن کو وضو کے بغیر مس نہ کرو
اصحابِ یمن ہمارے دوست اور ہمارے
شبیہ ہیں - ۳۲۳
مسجات کی تلاوت کرنے والا ظہورِ امام تک
زندہ رہے گا یا رسولِ پاک کا دوسرے جہان
میں ہم نشین ہوگا - ۳۳۸
اللہ مردہ زمین کو حضرت مہدیؑ کے ذریعہ زندہ
فرمائے گا - زمین کے مردہ ہونے سے مراد اس پر
کفر کا غلبہ ہونا ہے - ۳۴۱
صدیقین و شہداء پر آپ کی طویل حدیث ۳۸۰، ۳۴۹
تمام خوبیاں تلوار، تلوار کے نیچے اور تلوار کے
سایہ میں ہیں - ۳۹۳
اپنے دل کا جائزہ لو - اس میں اللہ والوں کی دوستی
اور اس کے نافرمانوں کی دشمنی ہے تو تم اچھے
آدمی ہو - ۴۵۶
جب انسان زنا کرتا ہے تو روح انسان اس
سے جدا ہو جاتی ہے - ۴۵۷
ہمارے لیے رسولِ خدا اور ذوی القربیٰ کا حصہ
ہے اور دوسرے حصوں میں بھی ہم لوگوں کے
شریک ہیں - ۴۷۲
سورہ صاف کو واجب و مستحب نمازوں میں
تلاوت کرنے والے کو اللہ انبیاء و مرسلین کی
صف میں قرار دے گا - ۵۲۸

- سورہ منافقون کی تلاوت کرنے والا ہر قسم کے
نفاق سے پاک ہو جائے گا - ۶۱۴
میں تم میں اس منافق سے ڈرتا ہوں جس کی
زبان سے علم ٹپکتا ہے - ۶۳۳
مومن زراعت کی طرح ہیں جنہیں ہوائیں گرا دیتی
ہیں مگر وہ پھر کھڑی ہو جاتی ہیں - ۶۳۴
اللہ نے مومن کے تمام کام خود اس کے سپرد
کر دیے ہیں، پس لازم ہے کہ وہ ہمیشہ عزیز
رہے، ذلیل و خوار نہ ہو - ۶۳۵
منافق امانت میں خیانت، جھوٹی بات اور
وعدہ خلافی کرتا ہے - ۶۴۰
سورہ تغابن پڑھنے والا ناگہانی موت سے
محفوظ رہے گا - ۶۴۳

حضرت امام محمد باقرؑ (امام پنجم)

- اللہ تعالیٰ سورہ طور کی تلاوت کرنے والے کے
لیے دنیا و آخرت کی بھلائیاں جمع فرمادے گا - ۲۹
تم میں کوئی اپنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے زیادہ
ہونے پر فخر نہ کرے - اللہ پر ہیزگاروں کو خوب
جانتا ہے - ۱۲۶
رسولِ پاکؐ کا پسندیدہ پھل، انار
ہم اللہ کا جلال اور اس کی کرامت ہیں
ہم سابقین بھی ہیں اور آخرین بھی
۲۷۰
۲۷۲
۲۸۴

آنحضرتؐ کے دس نام تھے جن میں پانچ قرآن میں موجود ہیں: محمدؐ، احمدؐ، عبداللہؐ، یحییٰؐ، نؐ۔

۵۶۴

نماز جمعہ ایک فریضہ ہے۔ امام معصومؑ کے ساتھ اجتماع واجب ہے۔ جب کوئی تین جمعہ ترک کر دے تو اس نے تین فریضے ترک کر دیئے۔ تین فرائض بغیر کسی عتلت کے ترک نہیں کرتا مگر منافق۔

۶-۵

اگے پیچھے دو بھیڑیے گلہ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا مال و اولاد کی محبت مومن کے دین کو نقصان پہنچاتی ہے۔

۶۳۷

وہ آئمہ وہی ہیں جو مومنین کے دلوں کو نور اور روشنی بخشتے ہیں۔

۶۵۴

معاذ بن جبل

قرآن کو پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی نہ چھوئے۔

۳۲۴

(حدیث رسولؐ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام

کیا وہ اس سے باخبر نہیں ہوا جو موسیٰؑ کی کتاب میں نازل ہوا۔

۱۲۸

پروردگار! میں تجھے کہاں پاؤں؟ فرمایا: جب تُو میرا ارادہ کرے تو میرے پاس پہنچ گیا۔

۳۴۸

کیا میرے لیے کسی سے محبت، کسی سے دشمنی کی ہے، حُبِّ فی اللہ و بُغْض فی اللہ؟

۴۵۶، ۴۵۵

مجھے کیوں اذیت دیتے ہو، حالانکہ میں تو تمہاری طرف بھیجا ہوا رسول ہوں۔

۵۵۷

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ (امام ہفتم)

ایہ انفاق امام کو ہدیہ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

۳۶۰

اللہ مردہ دلوں کو نور حکمت سے زندہ کرتا ہے۔
رہبانیت کے طور پر سفر کرنے یا گھر میں بیٹھ رہنے کو منع فرمایا۔

۴۰۰

مومن آل فرعون

۲۸۲

سابقون الاولون میں شمار ہے

نجاشی

حضرت جعفر ابن ابی طالبؑ کی تبلیغ سے ایمان لایا

۴۰۵

نعمان بن بشیر

۶۰۷

۶۰ھ میں کوفہ کا گورنر تھا

حضرت نوح علیہ السلام

اپنی قوم کو عذاب سے ڈرایا مگر اس نے ہدایت نہ پائی ۱۷۰
ہم نے نوحؑ و ابراہیمؑ کو بھیجا۔ ان کو ذریت میں نبوت و کتاب قرار دی۔

۳۹۵

علماء و دانشور

- آلوسی ۳۷۶، ۳۵۹
ابن ابی الحدید (مؤرخ) ۴۷۷
ابن اثیر (مؤرخ) ۳۹۹
ابن منظور (صاحب لسان العرب) ۲۴۶
ابن ندیم (سورہ واقعہ کی فضیلت بیان کی) ۲۷۵
ابو عبد اللہ زنجانی (مؤلف تاریخ القرآن) ۲۷۵
ابو الفتوح رازی (مفسر) ۵۴۲
برسوی (مفسر روح البیان) ۲۷۴
بیضاوی (مفسر) ۳۶۹، ۸۶
جلال الدین سیوطی (مفسر المنثور) ۸۱
حاکم نیشاپوری ۴۷۷
راغب (صاحب مفردات) ۵۱، ۴۹، ۴۲، ۳۳
۲۱۶، ۱۹۱، ۱۴۰، ۸۰، ۷۹، ۵۶، ۵۵
۲۸۷، ۲۸۳، ۲۶۱، ۲۵۱، ۲۴۶، ۲۲۶
۳۹۹، ۳۵۸، ۳۴۰، ۳۲۱، ۳۱۴، ۳۰۳
۵۶۸، ۵۰۴، ۵۰۳، ۴۸۳، ۴۷۳، ۴۴۷
۶۵۵، ۵۷۴
زمخشری (مفسر) ۵۸۸، ۱۳۲، ۱۲۹، ۸۶
سید قطب (مفسر فی ظلال القرآن) ۵۸۸، ۵۵۲، ۸۶
سیوطی (مفسر) ۴۳۳

ولید بن مغیرہ

- دین اسلام میں قربت حاصل کی، مشرکین کی سرزنش، ایک نے مال کے بدلہ گناہ اٹھانے کا اقرار کیا، طے شدہ مال سے کم دیا، اسلام سے پھرنا۔ مذمت۔ ۱۳۰
آیت سجدہ کی تلاوت پر مومن و کافر سب سجدہ میں گر گئے۔ اس نے ایک مٹھی مٹی اٹھا کر اسے پیشانی سے لگا لیا، جھک نہیں سکتا تھا۔ ۱۵۲

ویل دورانٹ

- ایک عیسائی مبلغ، رہبانیت پر بیان۔ چوتھی صدی میں راہبوں سے میل جول ہوا۔ دسویں صدی میں انتہا کو پہنچ گیا۔ ۳۰۱

ہابیل

- سابقون الاولون میں شمار ہوتے ہیں ۲۸۲

ہندہ بنت عتبہ بن ربیعہ

- آنحضرت کا شرائط بیعت بیان فرمانا اور ہندہ کے جوابات۔ ۵۴۲

میں چلا جاؤں تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا ۵۶۲
 سریانی اناجیل میں فارقلیط آیا ہے، یونانی
 اناجیل میں پیرکلتوش آیا ہے جو محمدؐ و احمدؑ
 کا معادل ہے۔ ۵۶۲

تورات

کتاب حزقیل: وہی جان جو گناہ کرے گی وہی
 مرے گی۔ بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائیگا۔ ۱۳۶
 تورات، سفر تثنیدہ۔ باپ اولاد کے بدلہ قتل
 نہیں کئے جائیں گے۔ اولاد بھی باپ کے
 بدلہ قتل نہیں کی جائے گی۔ ہر شخص اپنے
 گناہ کے سبب ہلاک ہوگا۔ ۱۳۶

وہ لوگ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی پیروی
 کرتے ہیں، وہی پیغمبر کہ جس کی صفات توریت
 میں پاتے ہیں۔ ۵۶۰

عہدین (تورات و انجیل) میں ایسی بہت
 سی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور
 کی بشارت دیتی ہیں۔ وہ نشانیاں پیغمبر اسلام
 پر ہی پوری اترتی ہیں۔ ۵۶۱

جو لوگ تورات کے مکلف قرار دیے گئے ہیں
 مگر انہوں نے اس کا حق ادا نہ کیا وہ گمراہی پر
 کتا ہیں لادنے کی مثال ہیں۔ ۵۹۰

طباطبائی (مفسر المیزان) ۵۸۸، ۵۵۲، ۸۶
 طبری (مفسر مجمع البیان) ۲۲۳، ۲۳۵، ۱۲۹، ۸۶، ۳۳
 ۵۸۸، ۴۴۱، ۴۳۹، ۴۳۳، ۳۵۹
 طوسی (مفسر مالی) ۴۱۸، ۸۷
 عبداللہ زنجانی (تاریخ القرآن) ۶۴۳
 فخر الدین رازی (مفسر) ۴۷۴، ۳۵۹، ۱۲۹، ۸۶
 فرید وجہی (صاحب دائرۃ المعارف) ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۱۵
 قرطبی (مفسر روح البیان) ۵۸۸، ۸۶
 مراغی (مفسر) ۵۸۸، ۸۶
 ملا صدرائے شیرازی (فلسفی) ۲۳۲، ۲۴۱
 ہشام بن حکم (دانشور) ۸۷

کتاب آسمانی

انجیل

انجیل یا اناجیل، یونانی لفظ، معنی 'بشارت'
 حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہونے والی کتاب کا نام ۲۰۳

انجیل یوحنا

وہ تمہیں دوسرا تسلی دینے والا دے گا جو اب تک
 تمہارے ساتھ رہے گا۔ ۵۶۱

سچائی کی روح جو میرے باپ کی طرف سے
 آئے گی وہ میرے بارے میں شہادت دے گی ۵۶۱

مبدأ و معاد، صالح، نوح اور لوط کے ذکر پر
مشتل ہے۔

۱۵۶/۱۵۵

ثواب تلاوت:

- ۱۵۶ قاری سورہ کے لیے بہت سے فضائل
ہم نے قرآن کو نصیحت اور انسان کو بیدار
کرنے کے لیے آسان کیا ہے۔ کیا کوئی ہے
جو نصیحت حاصل کرے؟
- ۱۸۸ سورہ کا آغاز و اختتام
- ۲۰۶

سورہ الرحمن کے مضامین

اللہ کی نعمات، رحمتیں، مومنین و مجرمین کا انجام،
جنت و دوزخ کا ذکر۔

۲۱۰، ۲۰۹

ثواب تلاوت:

- ۲۱۱ قاری سورہ شکر خدا کے باعث اللہ کے
رحم و کرم کا مستحق ہوگا۔
- ۲۱۳ رحمن نے قرآن کی تعلیم دی۔

سورہ واقعہ کے مضامین

قیامت پر خصوصی گفتگو، مضامین کے آٹھ حصے

۲۷۵ ثواب تلاوت:

تلاوت کی فضیلت پر ارشادات رسول و ائمہ

۲۷۶ 'انّہ لقرآن کریم، قرآن کریم محفوظ و مکنون
کتاب ہے، پاک لوگوں کے سوا اسے کوئی چھو نہیں
سکتا۔

۳۱۹ تا ۳۲۳

قرآن حکیم

سورہ طور کے مطالب

معاد، نیک و پاک لوگوں کی تقدیر پر مجرموں اور
بدی کرنے والوں سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔

۲۸

ثواب تلاوت:

- تلاوت کرے والے کو اللہ اپنے عذاب سے
مامون قرار دے گا۔ (رسول پاک)
- ۲۹۰، ۲۸ اللہ دنیا و آخرت کی بھلائی پڑھنے والے کے لیے
جمع فرمادے گا۔ (امام محمد باقر)

۲۹

سورہ نجم کے مطالب

سجدہ واجب کی ایک آیت کا نزول، نبوت و
معاد کے مسائل کی بحث اور ذکر معراج۔

۷۶، ۷۵

ثواب تلاوت:

- اللہ تعالیٰ پڑھنے والے کو ایمان لانے اور انکار
کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں عطا
فرمائے گا۔ (رسول پاک)

۷۶

شب و روز تلاوت کرنے والا شائستہ سمجھا
جائے گا۔ اللہ اسے بخش دے گا۔ (امام جعفر صادق)

۷۷، ۷۶

سورہ قمر کے مطالب

خصوصیات قرآن :

موضوعات و مضامین، عمیق معنی، پاکیزگی، تربیتی پہلو ۳۲۳

قرآن و طہارت :

پاک لوگوں کے سوا اسے کوئی مس نہیں کر سکتا۔ ۳۲۴

سورہ حدید کے مضامین

مدنی ہے۔ اجتماعی حکومتی و عملی احکام، انفاق در راہ خدا

توحید، نبوت، قیامت۔ ۳۲۷

ثواب تلاوت :

قاری کا توحید و رسالت پر مکمل ایمان ہوگا۔ ۳۲۸

جو کچھ گنوا دیا اس کا غم نہ کرو، جو اللہ نے دیا اس پر خوش ہونا۔ ۳۸۶

آیت ۲۸، ۲۹ کی شان نزول ۴۰۵

سورہ مجادلہ کے مضامین

فقہی احکام، اجتماعی نظام زندگی، غیر مسلموں

سے باہمی ربط۔ ۴۱۰

ثواب تلاوت :

قاری اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ذات میں کوئی

برائی نہ دیکھے گا۔ ۴۱۰، ۴۱۱

شان نزول :

خولہ اور اس کے شوہر اوس بن صامت کے خولہ

سے ظہار کرنے کا واقعہ۔ ۴۱۴

آیاتِ نبوی کی شان نزول : یہود و منافقین

کا سرگوشیاں کرنا، مسلمانوں کا پریشان ہونا۔ ۴۲۸

نفس حوائی المجلال کی شان نزول۔

آنحضرت کی خدمت میں چند بدری اصحاب

کا آنا، انہیں جگہ دینے کے لیے ساتھیوں کو

حکم دینا۔ ۴۳۲، ۴۳۳

آیاتِ نبوی رسول کی شان نزول : نبوی سے

برتری حاصل کرنا مقصود تھا۔ حکم ہوا کہ نبوی

سے پہلے صدقہ دو۔ ۴۳۹

سورہ حشر کے مضامین

بنی نضیر سے لڑائی، جلاوطن کر کے مدینہ کو

پاک کرنا، تسلیح الہی پر سورہ کا خاتمہ۔ ۴۵۹، ۴۶۰

ثواب تلاوت :

قاری کے لیے رسول پاک اور امام جعفر صادقؑ

کی احادیث میں ثواب کا ذکر۔ (شخصیات) ۴۶۲

شان نزول :

بنی نضیر کی عہد شکنی، رسول پاک کی ہلاکت کا

منصوبہ، بنو نضیر کی جلاوطنی۔ ۴۶۲، ۴۶۳

آیات 'فے' کی شان نزول : بنی نضیر کی جلاوطنی

کے بعد متروکہ اموال کی تقسیم، مسلمانوں کی خواہش

اور حکم خدا۔ ۴۷۲

آیات ۱۱ تا ۱۴ کی شان نزول : قرآن پہاڑوں پر

نازل ہوتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ ۴۸۸

نماز جمعہ اور خطبہ کے لیے دوڑ کر آنا، ختم نماز کے بعد ذکر خدا، تلاشِ فضل، بھاگنے والوں کی مذمت ۶۰۱ تا ۶۰۳

سُورۃ منافقون کے مضامین

منافقین کی نشانیاں، ہوشیار رہنا، قبل از موت راہِ خدا میں خرچ کرنا۔ ۶۱۴

ثوابِ تلاوت :

ہر قسم کے نفاق سے پاک ہو جائے (فرمانِ رسولؐ) ۶۱۴
شانِ نزول :

عبداللہ ابن ابی کا ایک انصاری کی مدد کو آنا

مہاجرین کو بُرا بھلا کہنا۔ زید بن ارقم واسید انصاری کی گفتگو۔ ۶۲۵ تا ۶۲۷

سُورۃ تغابن کے مضامین

توحید اللہ کی صفات و افعال پر بحث، تمییز حصہ معاد پر گفتگو۔ ۶۴۳

ثوابِ تلاوت :

قاری ناگہانی موت سے محفوظ رہے گا۔ ۶۴۴
اللہ اس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لے آؤ

جسے ہم نے نازل فرمایا۔ ۶۵۲

آخری آیات کی شانِ نزول پر امام محمد باقرؑ کی حدیث۔ ۶۶۲

پہاڑ خوفِ خدا سے کانپتے، خشوع و خضوع کرتے۔ ۵۰۳، ۵۰۲

آخری آیات : اسمائے حسنیٰ پر مشتمل پر عظمت

آیات کو اپنے وجود میں منعکس کر لو۔ ۵۰۷

سُورۃ ممتحنہ کے مضامین

حُب فی اللہ اور بُغض فی اللہ کا مسئلہ اور مشرکین

سے دوستی کی ممانعت۔ ۵۱۰

ثوابِ تلاوت :

قیامت میں تمام مومنین و مومنات قاری کے شفیع ہوں گے۔ ۵۱۰، ۵۱۱

سُورۃ صف کے مضامین

اسلام کی دیگر آسمانی ادیان پر برتری ۵۴۷

ثوابِ تلاوت :

قاری کے لیے حضرت عیسیٰؑ دعائے رحمت کریں گے ۵۴۷
شانِ نزول :

غزوہ اُحد سے بھاگنے والے ۵۵۰

سُورۃ جمعہ کے مضامین

توحید، صفاتِ خدا، ہدفِ بعثت، معاد، نماز جمعہ

کا اصلاحی نقشہ، کاروبار کی تعطیل۔ ۵۸۱

ثوابِ تلاوت :

سُورۃ جمعہ پر ارشادِ رسولؐ ۵۸۲

کُتُب تفسیر و تاریخ و سیر

۲۰۵

ابن ماجہ

۲۷۳

اسد الغابہ

۳۴۰، ۲۹۴، ۲۶۷، ۲۳۹، ۱۲۳، ۱۰۲

اصول کافی

۵۹۶، ۴۵۷، ۴۵۵، ۴۴۸، ۴۳۱، ۳۷۱

۶۳۷، ۶۳۵

الغدیر

۵۶۴، ۲۴۰

المنجد

۲۷۰، ۵۵

امالی

۸۷

اولین دانش گاہ

۳۰۶

بشار الانوار

۲۶۶، ۱۸۱ تا ۱۷۹، ۱۶۳، ۱۱۴، ۱۰۲

۶۰۷، ۴۰۰، ۳۹۰، ۳۷۱، ۳۷۰، ۲۶۷

۶۶۶

بخاری

۵۸۸، ۵۳۰، ۵۱۵، ۴۵۵، ۲۳۹، ۲۰۵

بلوغ الادب

۴۳۲

تاریخ ابن عساکر

۵۶۳

تاریخ القرآن

۶۴۳، ۲۷۵

تاریخ طبری

۱۱۰

تاریخ ویل دورانت

۴۰۲، ۴۰۱

تحف العقول

۱۸۱

تحفہ حکیم مومن

۲۳۱

ترمذی

۲۰۵

تفسیر الوفتوح رازی ۱۷۲، ۲۷۱، ۲۸۸، ۳۱۲،

۴۳۴، ۳۸۸، ۴۰۵، ۴۱۵، ۴۲۴، ۴۶۸

۵۰۴

تفسیر البیان

۴۴۱

تفسیر المیزان

۸۶، ۹۸، ۹۷، ۴۵۷، ۴۹۶، ۵۵۲،

۵۶۰، ۵۸۸، ۶۶۵

تفسیر انوار التنزیل

۲۶۹، ۸۶

تفسیر ربیعان

۲۷۲، ۲۷۷، ۳۳۳، ۴۵۶

تفسیر تبیان

۴۱۸

تفسیر خوارزمی

۴۱۹

تفسیر در المنثور (سیوطی) ۷۲، ۸۲، ۸۸، ۱۴۳، ۲۰۲،

۲۳۵، ۲۶۵، ۲۷۰، ۲۷۱، ۳۱۸، ۳۲۳،

۳۲۴، ۳۳۴، ۳۳۸، ۳۴۸، ۳۵۰،

۳۶۰، ۳۶۹، ۴۳۱، ۴۳۳، ۴۴۱،

۴۶۸، ۴۷۷، ۴۸۸، ۴۹۸، ۵۴۲،

۵۶۴، ۵۷۸، ۵۸۸، ۶۰۴، ۶۶۲،

تفسیر روح البیان

۴۹، ۷۵، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۱۳۰،

۱۳۵، ۱۳۶، ۲۶۲، ۳۰۹، ۳۱۱، ۳۳۴،

۳۴۸، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۸۶، ۳۸۸، ۴۴۱،

۴۴۲، ۴۷۸، ۴۹۸، ۵۱۵، ۵۲۶،

۵۴۰، ۶۱۹، ۶۶۹

تفسیر روح الجنان (رازی)

۴۹، ۵۳۵، ۵۴۲

٢٢٢، ٢١٨، ٢١١، ٢٠٣، ٢٤٤، ٢٤٧
 ٢٠١، ٢٨٠، ٢٤١، ٢٧٩، ٢٥٩، ٢٣٨
 ٢٣٣، ٢٣١، ٢٢٨، ٢١٤، ٢١٢، ٢٠٥
 ٢٧٢، ٢٧٠، ٢٥٣، ٢٣٩، ٢٣٧، ٢٣٣
 ٢٩٨، ٢٨٣، ٢٨٢، ٢٤٢، ٢٤٢، ٢٧٩
 ٥٢٣، ٥٢٢، ٥٢٢، ٥١٥، ٥١٠، ٥٠٤
 ٥٩٠، ٥٨٨، ٥٨٢، ٥٨١، ٥٥٠، ٥٢٢
 ٧٩٥، ٧٨٢، ٧١٢، ٧٠٢، ٧٠٣، ٧٠٠
 - ٧٩٤

تفسير مراغي
 ٣١٥، ٣٠٩، ٢٨٣، ٢٤٥، ٢٤٢، ٢٤٠
 ٢٢٩، ٢٩٢، ٣٥٥، ٣٣٢، ٣٢٣
 - ٥١٥، ٢٤٢

تفسير مفاتيح الغيب (فخر رازی)
 ١٣٧، ١٢٨، ٨٧
 ١٣٨، ١٢٧، ٩٣، ٨٨، ٨٤، ٢٣
 ٢٤٧، ٢٧١، ٢٥٥، ٢٢٨، ١٩٣، ١٤٩
 ٢٣٣، ٢٢٢، ٢١٨، ٢٩٢، ٢٨٣، ٢٨١
 ٢٤١، ٢٧٢، ٢٣٣، ٢٢٠، ٢٣٥، ٢٣٣
 ٢٢٥، ٢٠٤، ٢٠٧، ٢٩١، ٢٨٥، ٢٤٤
 ٢٧٢، ٢٢٨، ٢٣٧، ٢٢٢، ٢٣١، ٢٢٧
 ٥٢١، ٥٠٨، ٥٠٤، ٢٨٢، ٢٤٤، ٢٧٧
 ٧٥٢، ٧٣٥، ٥٨٢، ٥٨١، ٥٧٢، ٥٥٣
 - ٧٩٨، ٧٩٢

تفسير روح المعاني
 ٢٣٩، ٢٣٨، ٢٠٤، ٢٠٥، ١٤٣، ١٣٠
 ٣١٨، ٣١٥، ٢٠٩، ٢٠٣، ٢٩٥، ٢٤٤
 ٢٣٧، ٢٣٣، ٢٠٥، ٢٥٩، ٢٣٣، ٢٢٣
 ٧٠١، ٥٢٣، ٥١٥، ٥٠٢، ٢٤٢، ٢٣٩
 - ٧٩٥، ٧٠٥، ٧٠٢

تفسير صافي
 ٣٦٠، ٢٨٢، ٢٣٧، ٢٠١، ١٢٤
 ٧٧٢، ٢٧٢، ٢٨٥، ٢٢٠، ١٣٨، ٨٤
 ٢٤٤، ٢٧١
 تفسير في ظلال القرآن
 ٢٢١، ٢٣٣، ٢٥٥، ٨٧، ٥٩

تفسير قرطبي
 ٧٦٥، ٥٨٨، ٥٤٢، ٥٧٢، ٢٤٢
 ٢٠٥، ١٣٠، ٤٢، ٥٧، ٥٥، ٢٩
 ٢٢٣، ٢٣٣، ٢٢٣، ٢١٧، ٢٠٩

تفسير قمي
 ٢٧٠، ٢٣٧، ٢٣٣، ٢١٥، ٢٤٣
 ٧٦٥، ٧٠٢، ٥٨٨، ٥١٥، ٢٩٨، ٢٧٢
 ٢٢١، ٢٣٥

تفسير كبير (فخر رازی)
 ٢٢٥، ٢٥٩، ٢٩٢، ٢٢٠، ١٥٨
 ٥٠٢، ٢٤٢، ٢٧٨، ٢٢٢، ٢٢١
 - ٥٢٣، ٥١٥

تفسير کشاف (زنجبیری)
 ١٤٢، ١٣٢، ١٢٩، ٨٧، ٢٩
 - ٧٢٢، ٥٨٨

تفسير مجمع البيان (طبرسی)
 ١١٨، ٩٣، ٨٧، ٤٢، ٢٩، ٢٣
 ٢١٤، ١٥٨، ١٢٧، ١٣٥، ١٣٠، ١٢٩
 - ٢٧٥، ٢٧٢، ٢٧١، ٢٣٧، ٢٣٩، ٢٣٥

١	٢٣٣، ٢٣٢، ٢٣١، ٢١٥، ٢٩، ٢٦	مجمع البحرين
٢	٩٥٢، ٢٠٢، ٢٠١	
٣	٥٩٦	محنة البيضاء
٤	٣٢٩، ٣٢٨	مروج الذهب
٥	٩٦٦، ٩٣٣	مسلم
٦	٢٤٤	مسند احمد
٧	١، ٤٩، ٥٤، ٥٥، ٥١، ٢٩، ٢٢، ٣٣	مفردات
٨	١٢٠، ١٨٠، ١٩١، ٢١٦، ٢٢٦، ٢٢٩	
٩	٢٥١، ٢٩١، ٢٨٣، ٢٨٤، ٣٠٣، ٣١٢، ٣١٣	
١٠	٣٢١، ٣٢٠، ٣٥٥، ٣٩٩، ٢٦٦، ٢٤٣	
١١	٢٨٣، ٥٠٣، ٥٩٨، ٥٤٢، ٤٥٥	
١٢	٣١٨	من لا يحضره الفقيه
١٣	٣٩٩، ٢١٨	نهايه
١٤	٣٣، ٤٣، ٨١، ٨٩، ٩٠، ١١٢، ١٢٦	نهج البلاغه
١٥	٣٢٢، ٣٢٣، ٣٨٠، ٢٤٤، ٥٣٣، ٥٥٢	
١٦	٥٥٣، ٥٥٥، ٥٤٥، ٥٨٩، ٥٩٥، ٥٩٦	
١٧	٥٩٨، ٢١، ٢٣٢، ٢٦٥	
١٨	١٢٥، ٣٢٣، ٢١٨، ٢٢٠، ٢٣٤	وسائل الشيعة
١٩	٢٤٣، ٢٤٥، ٢٠٥، ٢٠٦، ٢١١	

٢٣٦	جوامع الجامع
٥٣٥	جواهر الكلام
٢٨١، ٢٤٦	خصال صدوق
٢٣٣، ٢٣٢، ٢٣١، ٢١٥، ١٢٣	دائرة المعارف
٢٠٢، ٢٠١	
١٨١	دهي مدرک
٥٦٣	ديوان البوطايب
٥٦٣، ٥٦٣	ديوان حسان بن ثابت
٢١٦	رازي آفرينش انسان
٢٣٩، ٢٤٣، ٢٥٤، ٥٩٤، ٢٣٣، ٢٣٠	سفينة البحار
٢٤٣	سيرت ابن هشام
٢٤٤	شرح ابن ابى الحديد
٢٠٨	صحيحه سجادية
٨٤	علل الشرائع
٣٩٢	فروع كافي
٥٢٠، ٢٢١	كمال ابن اثير
٢٦٦	كتاب خصال
٢٤٤	كتاب فذك
٣٤١	كمال الدين
٢٢٠، ٢١٤، ٢١٥، ٢٤٢	كنز العرفان
٢٤٤، ٢٠٣	كنز العمال
٢٩٩، ٢٤٠، ٢٢٦، ٥٥، ٢٦	لسان العرب
٥٠٢، ٢١٩، ٣٠٣	

لغات قرآن

(١)

آن: آني، كھولتا ہوا پانی

۲۳۳	اعلام: جمع علم (بروزن قلم) کی پہاڑ
۲۸۸	اعین: بڑی آنکھیں
۱۴۰	اغنی: مادہ غنی بے نیازی
	افنان: فنن (بروزن قلم) کی جمع، ترقازہ
۲۵۶	شاخیں، ٹہنیاں
۳۶۴	اقتباس: مادہ 'قبس' آگ کا شعلہ لینا
۲۵۱	اقدام: قدم کی جمع، پاؤں
۲۴۵	اقطار: قطر کی جمع، کسی چیز کے اطراف
۱۴۰	اقتی: مادہ 'قنیہ' (بروزن جوہر) مال و دولت
	اکمام: کم (بروزن جن) کی جمع، بہت سے
	معنی ہیں، بالخصوص غلات، چھپانے
۲۲۱	والی چیز
۲۸۷	اکواب: کوب کی جمع، پیالے
	الانسان: عالم نوع انسانی مراد ہے نہ کہ کوئی
۲۱۴	خاص مرد
۴۵	التناہم: مادہ 'الت' (بروزن شرط) کم کرنا
۴۸	امددناہم: مادہ 'امداد' ادا وافرانش و عطا
۲۲۱	انامہ: انسان یا جن یا دونوں، یا خالق مطلق
۱۶۶	انباء: خبریں، اُمم و اقوام سابقہ کی خبریں مراد ہیں
۱۷۲	انتصی: مدد طلب کرنا
	انزلنا: مادہ 'نزل'، مہمان کی تواضع کے لیے
۳۹۱	پیش کی جانے والی چیز
۴۳۵	انشروا: مادہ 'نشر' بلند زمین، اٹھنا، کھڑے ہونا

۲۸۷	اباریق: ابریق کی جمع۔ دستہ اور ٹوٹی والا برتن
	اتراہا: اتراب جمع ہے قرب کی (بروزن
۲۹۵	فہن: مثل و مانند، ہم سن
	احجاج: مادہ 'اج' (بروزن ج)۔ آگ
۳۱۵	بھڑکنا۔ جلانا
۵۷	احلام: جمع علم (بروزن نہم) کی عقل
۱۹۶	اخذ: پکڑنا، گرفت کرنا
۱۹۷	ادھی: مادہ 'ہو' ہا۔ عظیم مصیبت، حادثہ
	ارتبتم: مادہ 'ریب' شک، قرآن و قیامت
۳۶۵	پر شک کرنا۔
۱۷۲	ازدجد: زبر، دھتکارنا، دور کرنا، روکنا
	ازفة: ازف (بروزن نجف) تنگی وقت،
۱۵	(بہت قریب)
۲۵۷	استبرق: موٹا و ضخیم ریشم
۱۸۵	اشور: (بروزن قمر) خوش حالی
۲۰۱	اشیاع: شینہ، شبیہ، مانند و مثل، پیروکار
	اعتبروا: مادہ 'اعتبر' ایک چیز سے گزر کر دوسری
	کی طرف جانا۔
	مشتقات: عبرہ (اشکِ چشم، عبارت،
۴۶۶	تعبیر خواب وغیرہ۔
۱۷۷	اعجاز: جمع عجز کی۔ بچلایا بچھلا حصہ
	اعذاب: (بروزن اظہار)۔ آشکار و ظاہر کرنا،
۲۹۵	فیصیح و خوش بیان۔

تبوؤ، مادہ: بواؤ (بروزن دوا) اجزاء و
 مکان کی مساوات۔ ۴۸۱
 تماری: مادہ: تماری، صحابہ جو شک و تردید
 سے توام ہو۔ ۱۴۸
 تجادل: مادہ: جدل، رسی بٹنا، اصرار آمیز
 گفتگو ۴۱۶
 تحاور: مادہ: حور، (بروزن غور) طرفین کی گفتگو ۴۱۶
 تحوٹون: مادہ: حرث، (بروزن درس) کاشت کرنا۔ ۳۱۱
 تخشع: مادہ: خشوع، بزرگوں کے سامنے
 مودب ہونا۔ ۳۴۰
 تدلی: (بروزن تجلی) نزدیک ہونا ۸۵
 تربصم: مادہ: تربص، انتظار کرنا ۳۶۵
 تصلیہ: مادہ: صلی، (بروزن سعی) جلنا،
 آگ میں داخل ہونا۔ ۳۳۳
 تغابن: دو جانب ۶۵۵
 تفسحوا: مادہ: فسح، (بروزن قفل) وسیع
 مکان، وسعت دینا ۴۳۱
 تفکھون: مادہ: فاکہ، پھیل، فکاہت،
 مزاح، خوش طبعی ۳۱۲
 تقول: اپنی طرف سے گھڑی ہوئی گفتگو ۵۴
 تماروا: مادہ: تماری، شک کرنا، بھگڑنا ۱۹۲
 تنفذوا: مادہ: نفاذ، کسی چیز کو مکمل کرنے
 کے بعد عبور کرنا ۲۴۵

انظرونا: مادہ: نظر، نگاہ کرنا، سوچ، بچار،
 غور و خوض۔ ۳۶۴

اوجفتم: مادہ: ایجان، تیزی سے ہانکنا ۴۴۳

(ب)

باری: مادہ: بر، (بروزن قفل) صحت یابی۔

ناخوشگوار امور سے رہائی ۵۰۵

باس: شدت، قدرت ۳۹۱

براء: بری کی جمع ۵۲۰

بست: مادہ: بس، اٹے کو پانی سے نرم کرنا ۲۸۱

بسیمما: علامت و نشانی ۶۵۱

بضا عف: مادہ: ضعف، (بروزن شعر) کئی گنا کرنا۔ ۶۶۸

بطائن: بٹانہ کی جمع، استر ۲۵۸

بطش: (بروزن فرش) کسی چیز کو مضبوطی
 سے پکڑنا۔ ۱۹۲

بکرة: دن کا آغاز ۱۹۳

بیت المعمور: آسمانوں میں خانہ کعبہ کے عین
 اوپر واقع مکان، فرشتوں کی عبادت کے
 ساتھ معمور ہے۔ ۳۱

(ت)

تبارك: مادہ: برکت، اونٹ کا سینہ، مراد

ثابت قدم، پائدار ۲۴۱

تورون : مادہ 'دری' (بروزن نفی) چھپانا ۲۱۵

(ث)

ثقلان : مادہ 'ثقل' علم و شعور اور علم و آگہی

کا وزن - ۲۴۵

ثلثہ : پشیم کا ایک مجتمع ٹکڑا - جماعت کثیر ۲۹۶

(ج)

جبار : مادہ 'جبر' غلبہ و قوت سے کسی چیز کی اصلاح کرنا - ۵۰۴

جدار : جدار کی جمع، دیوار ۴۹۰

جذراء الزوفی : جزاء جو عمل کے عین مطابق ہو ۱۳۲

جنی : (بروزن بقا) پکا ہوا پھل جسے توڑنے کا وقت آجائے - ۲۵۸

جنات : جنت کی جمع - وسیع فضا ۲۰۲

جنتہ : مادہ 'جن' (بروزن فن) کسی چیز کو

حسن سے پہنا کرنا - ۶۲۰

جنت العاوی : یہ جنت آسمانی بہشت جاودانی

کے علاوہ ہے، اس کی وسعت تمام

زمینوں اور آسمانوں کے برابر ہے۔ یہ مخصوص

مقربین کی جگہ ہے - ۹۴

جوار : جاریہ کی جمع، چلنا پھرنے، متحرک ہونا، کشتی

کی صفت - ۲۳۲

(ح)

حاصب : تیز آندھی جس میں سنگریزے

اڑتے ہوں - ۱۹۱

حب : ہر قسم کا دان، کٹی ہوئی گھاس ۲۲۲

حسان : (بروزن زعفران) حساب اور

نظم و ترتیب - ۲۱۵

حشر : کسی جماعت کو میدان جنگ یا ایسی

ہی دوسری جگہ بھیجنا - ۴۶۴

حطام : مادہ 'حطم' (بروزن ختم) کسی چیز کا

ٹوٹنا - زیر زمین بوسیدہ نہ آگئے والا

بیج، کٹی ہوئی گھاس - ۱۶۱

حمیمہ : گرم چیز، گرم پانی، حمام اس کا

مشتق ہے - ۲۹۹

حنث : ہر قسم کا گناہ، حنث العظیم میں سب

گناہ شامل ہیں - ۳۰۰

حواری : مادہ 'حوڑ' دھونا، صاف کرنا، صاف

باطن - ۵۴۸

حور : 'حورا' حور کی جمع، سیاہ چشم، صاف و

شفاف، سفید رنگ خاتون ۲۴۰، ۴۳

حيوٹ : مادہ 'تحت' و حیات، سلامتی ۴۲۹

(خ)

خصاصہ، مادہ، خصاص، گھر کی دیواریں

پڑنے والے شگاف

۴۸۲

نحوض: (بروزنِ محض) باطل و غلط عادات

میں غرق رہنا۔

۳۷

خیام، نیمہ کی جمع، کپڑے کے علاوہ اینٹ، پتھر

اور لکڑی سے بنے ہوئے مکان کو بھی

کہتے ہیں۔

۲۷۰

خیل، گھوڑے

۴۷۳

(د)

داع: (بروزنِ جد) شدت سے دھکیلنا۔

خشونت سے ہانکنا۔

۳۸

دان، اصل، دانی، ہے، نزدیک

۲۵۸

دُبر، قبل کی ضد، پیٹھ، پشت

۱۹۷

دُسر، دسار کی جمع، دھتکار، کیل کا شدید

چوٹ سے لکڑی میں گھسنا

۱۷۳

دنی، قریب ہونا

۸۵

دھان: (بروزنِ کتاب) گھٹلا ہوا روغن،

سُرخ چمڑا۔

۲۵۰

(ذ)

ذواتا، ذات کا تثنیہ۔ صاحب، حامل

۲۵۶

(س)

رأیتم: یہاں روایت سے علم کے معنی

میں ہے۔

۳۰۶

رُجَّت: مادہ، رُج، (بروزنِ حج) حرکت کرنا

۲۸۱

رُفوف: درخت کے بڑے اور چوڑے پتے۔

رُنگ: رنگ خوبصورت پارچات

۲۷۰

رُق: مادہ، رقت، نازک، لطیف کاغذ،

باریک چمڑا۔

۳۲

رُکاب: مادہ، رُکوب، سواری کے اونٹ

۴۷۳

رُوح: (بروزنِ قول) تنفس

۳۳۱

رُہبانیت: مادہ، رُہبہ، خوف، خوفِ خدا

۲۷۹

رُیحان: خوشبودار گھاس، ہر قسم کی روزی

۲۳۱، ۲۲۲

(ن)

زَاغ: مادہ، زَاغ، دائیں بائیں لڑنا، انحراف

۹۴

زَاغوا: مادہ، زَاغ، صراطِ مستقیم سے انحراف

۵۵۹

زَبَر: زبور کی جمع، کتاب، لکھی ہوئی چیز،

اعمال نامہ۔

۲۰۲

زَعَم: مادہ، زَعَم، (بروزنِ طعم) وہ بات جس

کے جھوٹ ہونے کا احتمال یا یقین ہو۔

۶۵۲

زَقوم: بدبودار تلخ گھاس

۳۰۳

۲۹۱ شئی، مشیت کی جمع

شخ، بخل جس میں حرص شامل ہو۔ ۲۸۳، ۲۹۷

شواظ، بغیر پھوئیں والے آگ کے شعلے ۲۴۶

شہداء، مادہ 'شود'، شہید کی جمع، ایسا حضور

جس کے ساتھ مشاہدہ وابستہ ہو۔ ۳۷۶

(ص)

صف، کسی چیز کو خط مستقیم میں قرار دینا۔

۵۵۳ (یہاں اسم فاعل)

(ط)

۲۶۰ طرف، (بروزن حرف) پلک

۹۳ طغی، مادہ 'طغیان' حد سے تجاوز کرنا

۲۹۳ طلح، سبز رنگ کا خوشبودار درخت

طور، پہاڑ، الطور سے وہ پہاڑ مراد ہے جہاں

۳۱ موسیٰ کو وحی کی گئی تھی۔

طیبہ، طیب کے معنی ایسی چیز جس سے

۵۷۴ ظاہری و باطنی خواہش لذت حاصل کریں

(ع)

عاقبتہ، مادہ 'عاقبہ' (بروزن کدر)

۵۳۷ پاؤں کی ایڑی۔

۲۷۰ عبقری، بے نظیر و بے مثال شے

(س)

سامدون، مادہ 'سمود' (بروزن جمود) لہو و لعب

۱۵۱ غرور سے سراونچا کرنا

۵۱ سدرہ، (بروزن حرف) ہیری کا درخت

سُرر، مادہ 'سُرور' سرری کی جمع، سخت یا پلنگ ۲۸۷

سعی، تیزی سے راستہ طے کرنا ۱۳۱، ۱۳۲

سعدا (بروزن شتر) بھڑکتی ہوئی آگ

۱۸۴ سرری کی جمع۔

۲۰۰ جنون، ہیجان، اشتعال

سقر، (بروزن سفر) دھوپ کی شدت یا کسی

۲۰۰ وجہ سے جسم کا رنگ متغیر ہونا

۳۲ سقف مرفوع، آسمان

سلطان، زندہ، یقینی دلائل جو دشمن پر غلبہ کا

۱۰۶ سبب ہوتے ہیں۔

۲۹۹، ۵۳ سموم، مادہ 'سم'، زہر، مراد جلانے والی ہوا

۳۶۴ سور، دیوار، فصیل، شہر پناہ

سہزم، مادہ 'ہزم' (بروزن ہزم) دہم بہم کرنا ۱۹۷

(ش)

شاقوا، مادہ 'شقاق'، شگاف، دو چیزوں میں جدائی ۳۶۷

شبابیک، شابک (بروزن خفاش) شبک (حالی)

۶۷۰ کی جمع ہے۔

فخور، صیغہ مبالغہ، مادہ فخر، دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فخر کرنے والا۔ ۳۸۷

(ق)

قوی، قریب کی جمع۔ بستی ۴۹۰
قفینا، مادہ قفا، پشت، اسی سے قافیہ بنا ۳۹۶

(ک)

کاس، شراب سے بھرا ہوا پیالہ ۴۹
کاہن، اسرار غیبی کی خبر دینے والا ۵۵
کبتوا، مادہ کبت، (بروزن ثبت) ایسا مانع جو ذلیل بھی کرتا ہو۔ ۴۲۲
کریم، مادہ کرامت، فائدہ ۲۹۹
کسف، (بروزن فسق) کسی چیز کا ٹکڑا، جزو ۶۹
کفل، (بروزن طفل) وہ حصہ جو انسان کی حاجت کو پورا کر دے۔ ۴۰۶
کوافر، کافر کی جمع ۵۳۶
کید، (بروزن صید) چارہ جوئی ۶۶

(ل)

لیمم، (بروزن قلم) مادہ المام، گناہ سے قریب ہونا (بلا ارتکاب) ۱۲۱
لمرطمثین، مادہ طمٹ، ماہواری خون ۲۶۰

عرباء، عرب کی جمع، عروبہ (بروزن ضرورہ) صرف شوہر کو چاہنے والی خوش گفتار عورت۔ ۲۹۵

عسلی، کسی چیز کے پورا ہونے کی امید ۵۲۷
عصف، (بروزن اسب) پتوں اور گھاس کے اجزاء ۲۲۲
عصم، عصمت کی جمع، منع کرنا ۲۳۰
عقر، مادہ عقر، بنیاد، جڑ ۱۸۷
عیون، عین کی جمع۔ آنکھ ۱۷۳

(غ)

غابن، سبقت کرنے والا ۶۵۴
غدا، کل، یہاں مراد قیامت یا مستقبل قریب ۱۸۶، ۱۸۵
غرور، مادہ غر، (بروزن حر) کسی چیز کا ظاہر اثر ۳۷۸
غوی، غی، ایسی حالت جو اعتقادِ فاسد کے ساتھ ہو ۸۰

(ف)

فاکھین، مادہ فکھ، (بروزن نظر) پھیل، ہنسی، خوشی ۴۱
فتند، آزمائش، امتحان، سونا پگھلانے اور صاف کرنے والی کٹھالی۔ ۱۸۶
فتنہ، مادہ فتنہ، کئی معنی ہیں خصوصاً گمراہی ۳۶۵
شرک، بت پرستی
فخار، مادہ فخر، بہت زیادہ فخر کرنے والا، کوزہ، ٹھیکری۔ ۲۲۶

- ملہنون: مادہ، دھن، روغن، تیل، نرمی سے
۳۲۲ پیش آنا۔
۳۲۸ مدینین: مادہ، دین، مدین کی جمع، معنی جزا
مرج: (بروزن فلج) خلط ملط کرنا، پھینچنا،
۲۳۰ چھوڑنا
مرجان: ایک دریائی جانور جو درخت کی شاخ
کے مشابہ ہوتا ہے، عموماً سفید رنگ،
۲۶۰ مختلف رنگوں میں بھی ہوتا ہے۔
۲۰۵ مرجئہ: مادہ، ارجا، تاخیر میں ڈالنا
مرصوص: مادہ، رصاص، سیسہ، سیسہ پلائی
۵۵۳ ہوئی پنچہ عمارت
مرہ: لپٹی ہوئی رسی کے بل۔ قدرت، توانائی
۸۴ مادی و معنوی استحکام
۲۰۲ مستطر: مادہ، سطر، صف، صف بستہ
۳۳ مسحور: بھڑکنے والا، پُر، کناروں تک بھرا ہوا
مسکوب: مادہ، سکب، (بروزن کبک) مار
۲۹۴ مسکوب، آبخار
مشامہ: شوم سے مشتق ہے، بدبختی، ناراحتی،
۲۸۲ بے نوا گروہ۔
مشفقین: مادہ، شفق، خوف سے ملی ہوئی توجہ ۵۱
مصفوفہ: مادہ، صف، ساتھ ساتھ قطاروں
۴۲ میں بچکے ہوئے تخت۔
مصیطرون: مادہ، سطر، میطروہ شخص جو کسی
۶۴، ۶۳ کام پر غلبہ رکھتا ہو۔

- ۶۲۸ لہوا، مادہ، لی، رسی کو بل دینا، منہ پھیرنا، سر ملانا
۴۶۸ لینہ: مادہ، لون، اعلیٰ قسم کی کھجور کا درخت

(م)

- مارج: مادہ، مرج، (بروزن مرض) احتلاط و آمیزش،
۲۲۶ چراگاہ۔
۹۳ مادی: مقام ملاقات
متصدع: مادہ، صدع، سخت و محکم اشیائیں
شیشہ اور پتھر کی طرح شکاف پڑنا۔
۵۰۳ (صداع: درد سر)
مترفین: مترف۔ مادہ، ترف، (بروزن سبب)
۲۹۹ عیش و عشرت کے باعث نافرمانی
۶۵ مثقلہ: مادہ، اثقال، تھمیل، مشقت
۱۸۶ محتضر: مادہ، حضور، مقررہ وقت
محتظر: مادہ، حظ، (بروزن مغز) منع کرنا
۱۹۲ بھیڑ بکریوں کا باڑہ۔
۴۹۰ محصنہ: مادہ، حصن، قلعہ
۳۸۷ مختال: مادہ، خیال، متکبر
مخضود: مادہ، خضد، (بروزن مجد) کانٹوں
۲۹۳ کو کاٹنا۔
مخلدون: یہ تعبیر اس لیے ہے کہ تمام اہل
برشت جاودانی ہیں۔
۲۸۷ مدھامتان: مادہ، ادھیام، معنی دھم کی جڑ ہے۔
۲۶۵ سیاہی اور رات کی تاریکی۔

- ۳۶ مور: (بروزن قول) تیزی سے رواں دواں
 ۱۶۸ مہطعین: مادہ، اھطاع، گردن اٹھا کر دیکھنا
 ۵۰۴ مہیمن: مادہ، مہمن، نگہبان، سکون و اطمینان
 ۳۵۵ میراث: کسی معاہدہ والے انسان کو ملنے والا مال
 ۳۰۱ میقات: مادہ، وقت، مراد قیامت
 ۲۸۲ میمنہ: یمن سے مشفق، سعادت و خوش بختی

(ن)

- ۲۱۶ نجم: ستارہ، بغیر تنے کی گھاس
 نحاس و نحس: دھواں، سُرخ شعلوں اور
 ۲۴۶، ۱۹۷ دھویں سے بھر پور آگ
 ۱۶۶ نذر: نذیر کی جمع، ڈرانے والی چیز
 نزل: جن اشیاء سے مہمان کی پذیرائی کی
 ۳۰۴ جاتی ہے۔
 نشاء الآخری: نشاء آخرین اور تربیت،
 ۱۴۰ مراد قیامت۔
 ۲۶۵ نضاختان: مادہ، نضخ، پانی اُبل کر نکلتا
 ۱۶۷ نکس: مادہ، نکارہ، غیر معروف اور وحشت ناک چیز
 نواصی: مادہ، نضا، ناصیہ کی جمع، سر کے
 ۲۵۱ اگلے بال۔
 ۶۰۱ نودی: مادہ، ندا، پکارنا، اذان

- ۲۴۵ معشر: عُشر سے بنا ہے۔ دس، مراد گروہ
 ۲۸۷ معین: مادہ، معن، (بروزن صحن) جاری رہنا
 ۶۵۴ مغبون: ہار جانے والا
 ۳۱۲ مغرمون: مادہ، غرامت، زیادہ نقصان اٹھانا
 مقت: اس شخص کے لیے بغض شدید کے معنی میں
 ۵۵۱ ہے جس نے کوئی قبیح کام کیا ہو۔
 مقوین: مادہ، قوی، (بروزن کتاب) خشک و
 خالی بیان۔
 ۳۱۶

- منافع: مادہ، نفق، (بروزن نفخ) پیش روی،
 نفوذ: نفق، (بروزن شفق) کھال، نقب
 ۶۱۹ زیر زمین، نافقا، پوشیدہ سوراخ۔
 ۲۸۱ منبثا: پراگندہ و منتشر
 ۱۹۷ منتصر: مادہ، انتصار، انتقام لینا، کامیاب ہونا
 ۲۳۲ منشآت: منشا کی جمع۔ ایجاد کرنا
 ۳۲ منشور: پھیلا ہوا، درخشندہ
 ۲۹۴ منضود: مادہ، نضد، تہہ بہ تہہ کرنا
 منقعر: مادہ، قعر، گہرائی کا آخری نقطہ، مراد جڑیا
 ۱۷۷ بڑے اکھاڑ پھینکنا
 ۵۵ منون: مادہ، من، نقصان، قطع و برید کرنا
 منہمر: مادہ، ہمر، (بروزن صبر) شدت سے
 آنسو بہنا، پانی برنا، تھن سے آخری قطرہ
 ۱۷۲ تک دودھ لینا۔
 ۱۴۷ متوفکہ: زیر و زبر شدہ شہر، مراد شہر بصرہ

- ۳۶۳ یسعی، مادہ سعی، تیزی سے چلنا
یصدعون، مادہ صدع، (بروزنِ حباب)
۲۸۸ دروسر
۶۲۸ یصدون، منع کرنا، اعراض کرنا
یصعقون، مادہ صعق، واصعاق، صاعقہ
۷۰ مارڈالنا
۲۸۷ یطون، مادہ طوف، چکر لگانا
یوق، مادہ وقایہ، جس شخص کو اللہ عیب
سے محفوظ رکھے۔
۲۸۲ یولج، ایلانِ دلوج، داخل ہونا، نفوذ کرنا
۳۴۹ یوم تقابن، غبنوں کے ظہور کا دن، قیامت
کا ایک نام۔
۶۵۵ یہیج، مادہ ہیجان، گھاس کا خشک ہونا،
حرکت میں آنا۔
۳۷۸

متفرق موضوعات

آپ ہماری مکمل حفاظت میں ہیں

- اگر یہ عذاب کا کوئی پتھر آسمان سے گرتا دیکھیں تو
یقین نہ کریں، ان کے حال پر چھوڑیے، انہیں
یہاں بھی عذاب ہوگا۔ صبر سے کام لیجیے، حمد
تبیح کیجیے۔
۶۹، ۶۸

(۹)

- وازرہ، مادہ وزر، (بروزنِ قطر) پہاڑی پناہ گاہ
بجاری پتھر گناہ
۱۴۰ وبال، مادہ وبال، سخت بارش جس کے نقصان
سے انسان خائف ہو۔ وبال
۶۴۹ وردہ، ورد کے پھول، مُراد سرخ رنگ
۲۵۰ وکہ، خدا کے لیے
۲۳۲

(۵)

- ہباء، ہوا میں متعلق رہنے والا بہت باریک غبار
۲۸۱ ہشیع، مادہ ہشیم، کسی چیز کو توڑنا، پامال یا
کتری ہوئی گھاس۔
۱۸۷ ہیم، (بروزنِ میم) ہائم کی جمع۔ اُونٹوں کی
پیاس کی بیماری۔
۳۰۳

(ی)

- یاں، انی، نزدیک ہونا، کسی کے حضور حاضر ہونا
۳۷۰ یتنازعون، مادہ تنازع، کھینچنا، انی، ایک
دوسرے سے لینا۔
۴۸ یحادون، مادہ محادہ، (لوہے کے ساتھ) مسلح
ہو کر لڑنا۔
۴۲۲ یحموم، حمیم سے مانو، بہت گرم
۲۹۹

آدابِ مجلس

سلام کرنا، نوازدوں کو جگہ دینا، اہلِ فضیلت کا احترام کرنا۔

۲۳۷

آسمان کو بلند کیا، ہر چیز کے لیے میزان قرار دی

آسمان سے وحی، بارش اور دوسری نعمات کا نزول اور میزان وضع کی۔

۲۲۰، ۲۱۹

آیاتِ اسمِ اعظم

اللہ کی صفاتِ ذات اور صفاتِ اعمال چھ آیات میں بیان ہوئیں۔ اسمائے اعظم کی نشانیاں۔

۳۵۰

ابدی نمونے

عملِ مؤثر ترین نمونہ ہے، جو بات دل سے نکلتی ہے، دلوں پر لازمی اثر کرتی ہے۔

۵۲۳

ابراہیمؑ تم سب کے لیے نمونہ تھے

ابراہیمؑ نے اپنی مشرک قوم سے کہا کہ میں تم سے اور تمہارے خداؤں سے بیزار ہوں۔ ہمیشہ کی جدائی، یہاں تک کہ تم ایمان نہ لے آؤ۔

۵۲۰، ۵۱۹

اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ

یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اپنے بیوی بچوں کی تربیت کرو تاکہ وہ راہِ مستقیم اختیار کریں۔

۵۳۵

اس کے مانند کلام لے آئیں

اے رسول! نصیحت کرتے رہو، کموائے انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ اُن کی عقلیں ان کاموں کا حکم دیتی ہیں؛ سچے ہیں تو ایسا کلام لے آئیں۔

۵۳ تا ۵۹

اصحابِ الشمال

نامہ عمل بائیں ہاتھ میں، گرم ہوا، اُبلتا ہوا پانی، آگ، دھواں، دنیا میں مست و مغرور تھے، اگلے پچھلے سب جمع کر دیے جائیں گے۔

۳۰۱ تا ۲۹۸

اصحابِ المِثْمَنہ

بد بخت، بیچارہ اور بے نوا گروہ

۲۸۲

اصحابِ المِیْمَنہ

جن کے اعمال نائے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے

۲۸۲

اصحابِ الیمین

بیری و طلع کا سایہ، آبشار، بے شمار پھل، بہترین ساتھی (شوبہزہویاں)، ایک گروہ پہلی اُمتوں سے اور ایک آخری اُمت سے ہے۔

۲۹۲، ۲۹۱

دلیل ہے۔ مہینہ کا آخری بدھ، قابیل، ہابیل اور قوم عاد کی تباہی کے سبب نخص ہے۔ ۱۸۱ تا ۱۷۸

ایسا جانور جس پر کتا ہیں لدی ہوں

جو لوگ کتاب پڑھ کر اس پر عمل نہ کریں ان کی زندگی گدھے پر کتا ہیں لادنے کی مثال ہے ۵۹۱

بشارت اور تکمیل دین کا ربط

سورۃ اعراف کی آیت ۵۶ سے حضرت عیسیٰ کی بشارت واضح ہے۔ ۵۶۰

بشارت عیسیٰ

میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک آنے والے نبی کے ظہور کی بشارت دیتا ہوں۔ ۵۵۹، ۵۵۸

بعثت انبیاء کا مقصد

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا۔ ۳۸۹

بعثت پیغمبر اسلام کا مقصد

تلاوت آیات، تہذیب و تزکیہ نفس، کتاب و حکمت کی تعلیم ۵۸۲ تا ۵۸۹

بنیادی اصل

حُب فی اللہ و بغض فی اللہ ۵۲۶

اصحاب النار و اصحاب الجنة

یہ برابر نہیں ہیں، نہ اس دنیا میں نہ قیامت میں، نہ بعد از قیامت، اصحاب جنت ایک کامیاب گروہ ہے۔ ۴۹۷

اعمال نامہ

ہائے افسوس! یہ کیسا نامہ عمل ہے، چھوٹا بڑا کوئی کام ایسا نہیں جو اس میں درج نہ ہو۔ ۱۶۸

انفاق در راہ خدا

اللہ پر ایمان لانے اور راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی جزا انسان کی عظیم کامیابی ہے۔ ۳۵۴، ۳۵۲
جہاد کے لیے مدد کرنا، حاجت مندوں کی حاجت روائی، بعض انفاق قرض حسنہ شمار ہوا۔ مال کے بہترین حصے دس شرطیں۔ ۳۵۹، ۳۵۸

اہل نفاق کے اعمال میں بے مقصد شرکت

منافقین ہر کلتے ہیں، مدد کا وعدہ کرتے ہیں، مگر مشکل کے وقت الگ ہو جاتے ہیں۔ ۴۹۸، ۴۹۷

ایام نخص و سعد

قرآن کی رو سے شب قدر مبارک ہے۔ نخص پر نخاص

پانی اور آگ کس کی طرف سے ہیں

پانی ہم نے برسایا یا تم نے، آگ کا درخت
ہم نے اگایا یا تم نے! ۳۱۳

پریشانیوں پر غلبہ کی راہ

صبر، تذکر، علامہ شوستر کی واقعہ۔ ۶۴۰، ۶۳۹

پھلوں کی قدر و قیمت

کھجور، انگور اور سیڈ الفاکہ انار کے فوائد و
خصوصیات۔ ۲۶۶

تغابن، غبنوں کا آشکار ہونا

قیامت میں دوبارہ اٹھنا، جنت و دوزخ کے
مناظر، فیصلہ کا دن۔ ۶۵۶ تا ۶۵۲

تقدیر الہی اور اس کے ارادہ کی آزادی

ہمارے اعمال بھی اللہ کی مخلوق ہیں، لیکن اعمال
پر ہمیں اختیار و آزادی عطا فرمائی ہے۔ ۲۰۴

تقویٰ اور دور رس نگاہوں کا رابطہ

اگر ایمان لے آؤ، تقویٰ اختیار کرو اور گناہوں سے
بچو تو اللہ اسے حق و باطل میں امتیاز قرار دے گا۔ ۴۰۸، ۴۰۷

بغیر جنگ حاصل شدہ اموال کا حکم

جس کے لیے نہ گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ، اس
مال میں مجاہدین کا حصہ نہیں۔ یہ اللہ نے صرف
اپنے رسول کو دیا ہے۔ ۴۷۲ تا ۴۷۵

بہر طور ہمیشہ اس کی قدرت آشکار ہے

زمین و آسمان کو چھ ادوار میں بنایا، پھر ان کا
انتظام سنبھالا۔ ۳۴۶ تا ۳۴۹

بھڑکتے ہوئے سمندر کی قسم عذاب واقع ہو کر رہے گا

طور کی قسم، کتاب، بیت المعمور، بلند چھت
اور بھڑکتے سمندر کی قسم عذاب واقع ہو گا جس
میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ ۳۱ تا ۳۴

بیعت مستورات کا ان کی اسلامی

شخصیت کے ساتھ ربط

شرائط بیعت نے عورت کی انسانی حیثیت کو
بیدار کر دیا۔ ۵۳۸

بیعت مستورات کی شرائط

شرک، چوری، زنا، قتل، اولاد، بہتان و افتراء
اور مخالفت رسول نہ کرنا۔ ۵۴۱، ۵۴۰

جب جان حلق میں آجائے گی

جانکنی کی حالت میں تم زندگی کو واپس نہیں
لوٹا سکو گے، دیکھتے ہی رہ جاؤ گے، تمہاری
نسبت ہم اس سے زیادہ قریب ہیں۔ ۳۲۵، ۳۲۹

جنت کی بیویوں کا دوسری بار ذکر

مخصوص خوبیاں (خوش بیان، پاکیزہ، حُسن
صورت، حُسن سیرت، خیراتِ حسان) ۲۶۹

جنت کی بے شمار نعمات مقررین کے لیے

پاکیزہ شراب کے جام، پرندوں کا گوشت،
سورالعین بیویاں، نوجوان خادم، گفتگو میں
سلام ہی سلام۔ ۲۸۶

جو لوگ اللہ سے دشمنی کرتے ہیں

جو لوگ اللہ اور رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں وہ
ذلیل ہوں گے۔ ۳۲۱ تا ۳۲۴

چاند سورج کی حرکات

چاند، سورج کے ادوار کا انسانی زندگی پر اثر،
موسم، رات، دن، ماہ و سال وغیرہ ۲۱۶

تمام چیزیں تابع حکمت ہیں

ہم نے ہر چیز کو مقدار پر خلق فرمایا ہے۔ ۲۰۳

تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں

کوئی مصیبت رونما نہیں ہوتی مگر اللہ کے اذن
سے، اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۶۵۷

تمہاری جزا صرف تمہارے اعمال ہیں

آسمان کا شدت سے ہلنا، پہاڑ متحرک ہوں گے،
تکذیب کرنے والوں پر وائے۔ جو باطل میں مشغول
ہیں انہیں جہنم میں دھکیلا جائے گا، اعمال کی سزا
ملے گی۔ ۳۵ تا ۳۹

تمہارے مال و اولاد تمہیں یا دُخا سے غافل نہ کر دیں

ہم نے جو روزی تمہیں دی ہے اس میں سے
راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ۶۳۶ تا ۶۳۹

تمہارے مال و اولاد ذریعہ آزمائش ہیں

تمہاری اولاد و ازدواج و مال میں بعض تمہارے
دشمن ہیں جو ہجرت سے روکتے ہیں، یہ تمہاری
آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ ۶۶۳

چاند شق ہو گیا

خدا نے بزرگ و برتر کی قدرت، پیغمبرِ گرامی کا
عظیم معجزہ، تاریخی اعتبار سے شق ہونے
کے اسباب - ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۶۳

حُب فی اللہ، بغض فی اللہ کا اجر

اللہ کی راہ میں محبت اور اللہ کے لیے دشمنی کرنے
کے تین اجر اس دنیا میں اور دو قیامت میں
ملیں گے - ۲۵۶، ۲۵۷

حرکت جوہری

حرکت جوہری کے طرفداروں کا قرآن سے استدلال ۲۴۱، ۲۴۲

حزب اللہ اور حزب الشیطان کی نشانیاں

اللہ کے اطاعت گزاروں سے دوستی اور اس کے
نافرمانوں سے دشمنی - ۲۵۵، ۲۵۶

حزب اللہ کامیاب ہے

اللہ کے گروہ کی کامیابی، اقوامِ نوح، عاد، ثمود،
لوط کو برباد کرنے والے طوفان اور زلزلے، فتح
مکہ، اسلام کی کامیابی، عبداللہ ابن ابی کا واقعہ ۲۵۱، ۲۵۴

حواریوں کی طرح ہو جاؤ

رسول کی نصرت میں جہاد کرو، کامیاب وغالب
ہو گے جیسے عیسیٰ کے حواری تھے - ۵۷۴ تا ۵۷۶

حوارِ تین کون ہیں

حضرت عیسیٰ کے بارہ جان نثار ساتھی ۵۷۸

خدا سب سے بے نیاز ہے

علیم وخبیر و غنی وحمید ہے ۵۲۵

خدا کے حصہ کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہو

لات و عزریٰ و منات کیا خدا کی بیٹیاں ہیں؟
تم نے اپنے لیے بیٹے پسند کیے، تمہاری یہ
تقسیم غلط ہے۔ تم تو بیٹیوں کو زندہ درگور
کرتے ہو - ۱۰۵، ۱۰۶

خدا کا سلام کون سا ہے

'السلام علیکم' اسلام کا سلام ہے ۲۳۲

خدا کا پوشیدہ لشکر

اللہ والوں کو اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے، اس کے
لشکر پوشیدہ طور پر مدد کرتے ہیں۔ جنگ بدر
اور بنی نضیر کے واقعات - ۲۶۴

دنیاوی زندگی مختلف اسباب و علل کا مجموعہ ہے

ترآن پاک نے لہو و لعب، زینت و تفاخر و تکاثر
اور متاعِ قلیل کو اسبابِ زندگی بتایا ہے۔ ۳۸۰

دوسرا دیدار

دوبارہ مشاہدہ کیا، سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک
جنت المادویٰ۔ وہاں نور ہی نور تھا۔ اس نے
اپنے رب کی چند نشانیاں دیکھیں۔ ۹۲ تا ۹۵

دونوں جنتیں اللہ سے درمیوالوں کی منتظر ہیں

جو لوگ اللہ کے مراتب سے خائف ہیں، ان
کے لیے دوسری جنتیں ہیں، پاکیزہ میوے اور
آرام کی جگہ ہے۔ ۲۵۴ تا ۲۶۰

ذی الجلال والاكرام کے نکات

جو کچھ بھی ہے سب اسی کی طرف سے ہے۔ ۲۷۲

رہبانیت

ان کی اختراع ہے، ہم نے مقرر نہیں کی۔ وہ
خوشنودی خدا چاہتے تھے، حق کی اعانت نہیں
کی۔ دینِ مسیح میں خرابیاں کر دیں۔ ۳۹۷

خدا کی صفات میں اجتماعِ تضاد

اول و آخر، ظاہر و باطن، حی و لا یموت متضاد
صفات ہیں جو اللہ کی ذات میں موجود ہیں ۳۴۲

خدا اور رسولؐ کے دشمن

ذیل ترین افراد ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ
کے دشمن ہیں۔ ۳۵۰

خود ستائی نہ کرو، خدا تمہیں خوب پہچانتا ہے

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کے لیے
ہے تاکہ بدول کو سزا، نیکوں کو جزا دے جو کبائر
سے بچتے ہیں، اللہ جانتا ہے۔ خود ستائی نہ کرو،
اللہ علیم ہے۔ ۱۲۰ تا ۱۲۴

دشمن کے لیے بھی عدالت

مسلمان اور کافر عورتوں کے مہر کا تبادلہ ۵۳۷

دنیا متاعِ غرور کے سوا کچھ نہیں

جو لوگ اللہ اور رسولؐ پر ایمان لائے وہ صدیقین و
شہداء ہیں۔ دنیوی زندگی کھیل کود، تجمّل پرستی اور
تفاخر ہے۔ ۳۷۶ تا ۳۷۹

کیا وہ خود بخود پیدا ہو گئے؟ کیا غلبہ و تسلط رکھتے ہیں؟ کیا اسرار وحی کو مسکتے ہیں؟ خدا کی لڑکیاں! اور تمہارے لڑکے؟ اللہ شرک سے منزه ہے۔ ۶۱ تا ۶۴

سحر مستمر

کفار جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ سحر مستمر ہے۔ ۱۵۸ تا ۱۵۷

سمندر اور اس کے قیمتی ذخائر

دو سمندر پاس پاس ہیں، ان کے درمیان ایک حجاب ہے۔ ان سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں، کشتیاں چلتی ہیں۔ ۲۳۰

سمندر۔ اللہ کی نعمات کے مراکز

اذویات، موتی، مونگے، مچھلی، خوردنی اور استعمال کی دوسری بے شمار چیزیں۔ ۲۳۲

گلف سٹریم۔ بڑی تیزی سے سمندر میں جاری کچھ لہریں گرم پانی کی اور بعض سرد پانی کی۔ یہ آب و ہوا پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ۲۳۳

شفاعت بھی اُسی کے اذن سے ہوگی

عالم اسباب اس کے ارادہ کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ ہر موجود کے پاس جو کچھ ہے، اُسی کی برکت سے ہے، شفاعت بھی اُسی کے اذن سے ہوگی۔ ۱۱۱ تا ۱۱۴

موجودہ رہبانیت قرنِ اول میں نہ تھی۔ تیسری صدی عیسٰی اس کی ابتدا ہوئی جب عیسائیوں نے امرِ طور (نخنوار) سے شکست کھائی اور جنگلوں میں پناہ لی۔ ۴۰۰ رہبانیت کے باعث اجتماعی و اخلاقی فساد پیدا ہوئے۔ کاہلی، بے دینی اور اخلاقی انحطاط ہوا۔ ۴۰۱، ۴۰۲

زمین بطور ایک نعمت

زمین کا مدار ارضی و مدارِ محوری، دن رات کا ہونا اور موسمِ نعمات ہیں۔ ۲۲۱

زندگی ایک نظم و حساب

خود ہماری زندگی ایک عظیم نظم و حساب پر قائم ہے۔ ۲۲۲، ۲۲۳

زندگی کی عمدہ ضروریات لوہے سے متعلق ہیں

زراعت، صنعت، مسکن، حکومت سب میں لوہا ایک بنیادی ضرورت ہے۔ ۲۹۱، ۲۹۲

سب نمر و صدا اسی کی طرف سے ہے

آسمان کے درخشندہ ستارے اسی کے فرمان و ربوبیت سے چمکتے ہیں۔ ستارہ شعری کے عجائبات وغیرہ ۱۳۱ تا ۱۳۳

سچ بتاؤ تمہاری صحیح بات کون سی ہے

ان سے منہ موڑ لو جو راہِ خدا سے بھٹک گئے اللہ
انہیں اچھی طرح جانتا ہے۔ ۱۱۵ تا ۱۱۹

ظہار

جاہلیت کا عملِ قبیح، اوس بن صامت کا خولہ
سے ظہار، رسولِ پاکؐ کا فیصلہ اور کفارہ کی
ادائیگی۔ ظہار کے بعض احکام ۲۱۵ تا ۲۲۰
عالمِ بے عمل

حصولِ علم میں مشقت اٹھانا برکاتِ علم کے مقابلہ
میں پیچ ہے۔ جس عالم نے علم سے فائدہ نہ اٹھایا
اس کی گردھے پرکتا ہیں لادنے کی مثال ہے۔ ۵۹۵
عزت، اللہ اور اس کے دوستوں کیلئے ہے

عزت، اللہ کے لیے ہے۔ رسولؐ اور مومنین اس
کے دوست اور اس کے پرتو کے حامل ہیں۔ ۶۳۴

”عہدین“ کی بشارتیں

موجودہ تورات و انجیل میں ایسی بہت سی تعبیریں
نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی
ہیں۔ ۵۶۱ تا ۵۶۵

غفلت و بے خبری کب تک!

کیا وقت نہیں آیا کہ صاحبِ ایمان افراد کے دل
ذکرِ خدا سے خوف کھائیں؟ ۳۶۰، ۳۶۱

شیاطین کا گروہ

اللہ کے مخالف گروہ سے دوستی، اپنے کو چھپانا،
قسمیں کھانا، وہ بد اعمال ہیں جن کے لیے اللہ کا
غضب ہوگا۔ گروہِ شیاطین گھاٹے میں ہے ۲۲۶ تا ۲۲۸
شیطان کے بہکانے سے کنوئیں میں نہ گرو

یہ انسان کو کافر بنا کر تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ کہتا ہے تم
سے بیزار ہوں اور اللہ سے ڈرتا ہوں۔ واقعات
بنی نضیر و بنی قینقاع۔ ۲۹۳ تا ۲۹۶

صحابہ قرآن و تاریخ کی میزان میں

مہاجرین، انصار، تابعین کے جو اوصاف قرآن میں
آئے ہیں، تمام صحابہ کے کردار پر منطبق نہیں ہیں،
اس لیے سب مرتبہ میں برابر نہیں۔ ۳۸۵، ۳۸۶

صفوں میں وحدت کی ضرورت

صفوں کی درستگی کے لیے نہایت موزوں تعبیر،
بنیانِ مرصوص۔ ۵۵۲

ضال و مکذبین میدانِ محشر میں

گمراہو! یقیناً زقوم کے درخت سے کھاؤ گے،
کھولتا ہوا پانی پیاسے اونٹ کی طرح پیو گے،
یہ قیامت میں تمہاری پذیرائی ہے۔ ۳۰۲

طن و گمان کسی کو حق تک نہیں پہنچاتے
گمان کی پیروی، ہمارے ذکر سے انحراف، تم بھی

سخت ترین دل بھی قرآنی آیات سن کر نرم و
اثر پذیر ہو جاتے ہیں۔

۵۰۷

قرآن میں صدیقین کا ذکر

قرآن نے حضرت ابراہیمؑ و ادیسؑ و جناب مریمؑ
کو صدیق کہا ہے۔

۳۷۹

قیامت میں مجرمین کی بے مقصد مدد

مجرم قیامت کو بھی معاملات دنیا کی طرح خیال
کرتے ہوئے مدد کے طلب گار ہوں گے، مگر
کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا۔

۳۶۷، ۳۶۶

کافر جو تم سے برسرِ پیکار نہیں ہیں

جن لوگوں کا فروں نے تمہیں نقصان نہیں پہنچایا
ان سے نیکی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۵۲۸

کبارِ الاثم کیا ہیں

کبیرہ گناہوں کی تعریف، اقسام، اسلام کی
روایات میں کبارِ اثم کی تعداد مختلف بیان کی
گئی ہے۔

۱۲۵

گلِ یوسفِ ہونی شان

ایک غلام نے تفسیر کی۔ دن رات کا لانا، موت،
زندگی، غنی و فقیر۔

۲۳۱

غور و فکر کرنے والوں کی نشانیاں

غور و فکر سے حقائق آشکار ہو جاتے ہیں، اللہ کی
ممکنہ معرفت پر عبور ہو جاتا ہے۔

۳۴۰ تا ۳۴۲

فتحِ قریب کون سی ہے؟

ہر زمانہ میں ہے، اگرچہ مراد فتحِ مکہ ہے۔

۵۷۴

فدک کی غم انگیز داستان

رسولِ پاکؐ نے اراضیاتِ فدک جنابِ فاطمہؑ کو
ہبہ کر دی تھیں۔ آنحضرتؐ کے بعد یہ جائداد آپؐ
سے واپس لے لی گئی۔

۴۷۸، ۴۷۷

فضلِ خدا از روئے حساب ہے

احادیثِ رسولؐ کی روشنی میں اللہ کے فضل کی
از روئے عدل عطا۔

۵۸۹

فولادی دیوار کی طرح جم کر لڑنے والے

وہ بات کہنا جس پر عمل نہ کرو، موجبِ غضبِ
الہی ہے۔ سچے مومنوں کے گفتار و عمل میں
کبھی فرق نہیں ہوتا۔

۵۵۱، ۵۵۰

قرآن کا حد سے زیادہ نفوذ

علی وفا طمہ گھرے سمندر میں، حسن و حسین
 ۲۳۵ ٹولو و مرجان ہیں۔ (امام جعفر صادقؑ)

مساکن طیبہ کیا ہیں

قرآن میں رات، گھر، محبت کرنے والی بیویاں،
 تین چیزیں وجہ سکون بیان ہوئی ہیں۔ جنت
 ۵۷۵، ۵۷۴ میں یہ تینوں ہیں۔

مسلمانوں اور کفار کے نقصان کی تلافی

جر عورت مسلمان ہو کر آئے یا مسلمان کی کافر
 بیوی چلی جائے تو مہر و مصارف واپس لے لو
 ۵۳۳ یاد دے دو۔

معراج مسلمہ حقیقت ہے

واقعہ معراج کو تمام علمائے قبول کیا ہے، البتہ
 بعض نے اسے صرف روحانی اور خواب کی
 ۹۷ تا ۹۵ کیفیت سمجھا ہے۔

مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو

جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، ان میں کفار و
 مشرکین کے علاوہ منافقین بھی شامل ہیں۔ ۵۴۲ تا ۵۴۵

مقربین بارگاہ

گروہ السابقون المقربون

سبقت کرنے والے اور معنوی قربت رکھنے
 ۲۸۲ والے افراد۔

گفتار بلا عمل

زبان دل کی ترجمان ہے، اگر دونوں میں وحدت
 ۵۵۴ نہ ہو تو یہ نفاق ہے۔

گنہ گار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائینگے

سیاہ چہروں سے پہچانے جائیں گے، سر سے پاؤں
 ۲۵۲ تا ۲۴۹ تک جکڑے ہوئے جہنم میں جھونک دیے جائینگے۔

مجالس میں آنے والوں کا احترام

مجلس میں آنے والوں کو بیٹھنے کی جگہ دو، اللہ تمہارے
 ۲۳۵، ۲۳۴ لیے جنت کو وسیع کرے گا۔

مجرموں کو دوزخ میں کس طرح لے جائینگے

طوق و زنجیر میں جکڑ کر حقارت و ذلت کے ساتھ
 ۳۹، ۳۸ ہانکے جائیں گے۔

”مرج البحرين“ کی باطنی تفسیر

موت کا خوف

فنا کے بعد کی زندگی پر یقین نہ ہونا یا اعمالِ قبیحہ کی بنیاد پر خوف ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو موت رحمت ہی رحمت ہے۔

۵۹۸، ۵۹۷

مومنین اپنے نور سے استفادہ کریں گے

ایمان و عملِ صالح کے انوار مجسم ہو کر قیامت میں مومنین کی رہنمائی کریں گے۔ ہر مومن کے ایمان کا درجہ الگ ہوگا۔

۴۶۴ تا ۴۶۱

مہاجرین، انصار، تابعین کے نمایاں اوصاف

گھروں سے نکالے ہوئے مہاجر جو خدا و رسول کے مددگار ہیں، ان کی مدد کرنے والے انصار اور بعد میں آنے والے تابعین ہیں۔

۴۸۰ تا ۴۸۵

میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ

جو شخص ایسا کام کرے گا وہ راہِ راست سے ہٹ گیا۔

۵۱۶، ۵۱۵

نجوی

یہودی اللہ اور رسول کی مخالفت میں سرگوشی کرتے تھے، مومنین کو اس سے منع کیا۔

۴۲۹، ۴۳۰

قربِ مقامی جن کے لیے بہشت کی مادی و معنوی سببِ نعمات ہیں۔

۲۸۳

منافق بے اخلاص

ہٹ دھرمی کرتے ہوئے اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ ٹوٹ کر بے بس ہو جاتا ہے۔

۶۳۴

منافق کی دس نشانیاں

جھوٹ، قسین کھانا، باطنِ خالی، بے ہودگی، حق کا مذاق اڑانا، فسق و گناہ وغیرہ۔

۶۳۱

منافق سے خطرہ

معاشرہ میں شامل ہو کر ہر طرح کا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

۶۳۲

منافقین

اہل کتاب کافروں سے کہتے ہیں کہ جب تمہیں مسلمان جلاوطن کریں گے تو ہم تمہارے ساتھ ہوں گے، جنگ میں مدد کریں گے، لیکن یہ جھوٹے ہیں۔

۴۸۷

یہودیوں کی فتنہ انگیزی میں منافقین کی شرکت، آپس میں لڑیں تو جنگجو ثابت ہوں مسلمانوں کے مقابلہ میں وحشت سے قلعوں میں پناہ لیتے ہیں

۴۸۸ تا ۴۹۱

نماز جمعہ اسلام میں پہلی مرتبہ

ہجرت سے پہلے اسعد بن زرارہ کی اقتداء میں نماز یومِ عروبہ ہوئی۔ رسولِ پاکؐ کا مدینہ میں آنا، مسجدِ قبا کی بنیاد، نمازِ جمعہ نبیِ سالم میں ادا فرمائی، نماز کے بعد خطبہ دیا، نمازِ جمعہ کی اہمیت ۶۰۵، ۶۰۴

نمازِ جمعہ کا فلسفہ

ایک عظیم اجتماعی عبادت، دو خطبے، مواعظ، پسند و نصح اور پرہیزگاری کا حکم، ایک سیاسی کانفرنس۔ ۶۰۶

نمازِ جمعہ کے آداب اور خطبات کے مضامین و مطالب

نماز کی شرائط، طریقِ کار، خطبہ میں اللہ کی حمد و ثنا، درود، خوفِ خدا اور تقویٰ کی وضیعت ۶۱۰، ۶۰۹

نمازِ جمعہ کی شرائط و حجب

امامِ جماعت کی طرح، امامِ جمعہ کا عادل ہونا، بعض کے نزدیک نمازِ جمعہ امامِ معصوم کے زمانہ حضور کے ساتھ مربوط ہے۔ ۶۱۱

مومنین کو رنجیدہ کرنے والا نجوی شیطانی ہے،

علیحدہ ہو کر سرگوشی کرنا بداعتمادی پیدا کرتا ہے وغیرہ ۴۳۱

رسولِ پاکؐ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دیا

کرو۔ کیا ڈر گئے کہ فقیر ہو جاؤ گے؟ ۴۳۸ تا ۴۴۰

نجوی سے متعلق اہم نکات ۴۴۱ تا ۴۴۳

نعمتوں کی شناخت

نعماتِ دنیائے خالق کی معرفت حاصل کرنا

معرفتِ الہی کا زینہ ہے۔ ۴۴۳

نفاقِ اعتقادی و عملی

منافق کی تین نشانیاں، جھوٹا، خائن اور وعدہ خلاف

(ارشادِ رسولِ پاکؐ) ۶۴۰

نفاق کا سرچشمہ اور علامات

جھوٹی قمیص کھانا، چکنی چٹری باتیں بنانا، اپنے سایہ

تیمک سے خائف رہنا، کبر و نخوت ۶۱۷، ۶۲۸

نفع بخش و بے مثال تجارت

ایمان والو! جہادِ عذاب سے نجات دینے والا ہے۔

اللہ اور رسولؐ پر ایمان لے آؤ، راہِ الہی میں جان و

مال سے جہاد کرو، اللہ گناہ بخش دے گا، جنت

میں داخل فرمائے گا، پسندیدہ نعمت اور فتح

مبین عطا فرمائے گا۔ ۵۷۰ تا ۵۷۳

وہ گنہ گار افراد جنہوں نے آیات کو
سُن کر توبہ کی

کیا وقت نہیں آیا کہ ایماندار دل اللہ کے ذکر
سے خوف کھائیں اور ان افراد کی طرح نہ ہوں
جنہوں نے آیات کو سنا مگر ان کے دل قساوت
پر مائل رہے۔
۳۷۲ تا ۳۷۴

وہ ہر روز نئی چیز خلقت فرماتا ہے

حضرت ابو ذرؓ کو رخصت کرتے وقت حضرت
امام حسنؓ و حسینؓ کو جناب امیرؓ کی وصیتیں
۲۴۰

ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے

وہ شخص جس نے اسلام سے منہ پھیر لیا، یہ جان کر
کہ کوئی دوسرا کسی کے گناہوں کا بوجھ اٹھا سکتا
ہے، اور دیگر نکات کی بحث۔
۱۳۶۰ تا ۱۳۶۸

ہندہ کی بیعت

رسول اکرمؐ کا شرائط بیعت بیان فرمانا اور ہندہ
کے اعتراضات و جوابات
۵۴۲

یہ درس عبرت کے لیے کافی نہیں؟

نیکو کاروں اور بدکاروں کا انجام

اگر محتضر نیکو کار ہے تو اس وقت راحت و آرام
میں ہوگا۔ اگر گمراہ اور جھوٹا ہے تو دوزخ کے گرم
پانی سے تواضع ہوگی۔
۳۳۱ تا ۳۳۴

نیکی اور اس کی جزا

نیکی کا بدلہ اس سے بہتر نیکی سے کرو۔
(رسول پاکؐ و ائمہؑ)
۲۶۲ تا ۲۶۴

واقف اسرار القلوب

اس نے تمہاری بہترین صورت بنائی، زمین و
آسمان کی ہر شے سے واقف، تمہارے پنہاں و
آشکار سے باخبر۔
۶۴۸

وسیع و عریض جنت کی طرف سبقت کرو

اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا، تائب ہونا، گناہ
سے پاک ہونا شرائط کے ساتھ، مصائب
غافلوں کے لیے ہوشیار رہو کی آواز ہیں۔
۳۸۲ تا ۳۸۸

وہ اور نور خدا

اللہ پر چھوٹ باندھنا بڑا ظلم ہے، اسلام کی دعوت دی جا رہی
ہے، نور خدا چھوٹوں سے نہ بچھے گا۔ اللہ کا دین غالب ہوگا۔
۵۶۶ تا ۵۶۹

حجر

حجرِ دقومِ ثمود کی بستی، حجاز کے شمال میں واقع ہے۔

۱۸۴

دارالندوہ

سردار قریش قضی بن کلاب کا گھر جہاں مشورہ کے لیے عرب اکٹھے ہوتے تھے۔

۵۴

عالم برزخ

محضر کو جو حالات درپیش ہوں گے، روح و ریحان یا دردناک منزائیں، ان میں ایک حصہ کا قیامت اور دوسرے کا قبر و برزخ سے تعلق ہے۔

۳۳۵، ۳۳۳

عسقان

مکہ کے قریب ایک مقام

۳۵۹

قدید

سرزمینِ قدید میں جنگِ بنی مصطلق واقع ہوئی۔

۶۲۵

قشیرہ

وہ علاقہ جہاں بیدون کا چشمہ واقع ہے

۳۲۸

❖

عاد، ثمود اور قومِ لوط کی سنگین عذاب کے ساتھ تباہی اور قومِ نوح کی تباہی، وہ سب سے زیادہ ظالم تھے۔ تو اپنے پروردگار کی کون سی نعمت میں شکست دیکھتا ہے۔ ۱۴۵ تا ۱۴۸

یہود

بنی نضیر کی عہد شکنی، کعب بن اشرف کا قتل، جلاوطنی، مدینہ سے سازش کا خاتمہ ہوگا۔ ۴۶۴ تا ۴۶۹
موجودہ دور میں یہودیوں کی سازش، براہِ راست مقابلہ ہی سے سازش کا خاتمہ ہوگا۔ ۴۷۰

مقامات

بیدون

ایک چشمہ کا نام
جنت

۳۲۸

۲۰۰

پرہیزگار جنت کے باغوں میں
جو اپنے پروردگار سے ڈرے، اس کے لیے جنت کے دو باغ

۲۵۴

۲۸۶

اہل جنت بہشت کی راحتوں میں

جہنم

جس دن جہنم کی آگ میں گرائے جائیں گے۔ اب جہنم کی آگ کا مزہ چکھو۔

۱۹۹

مِصْبَاحُ الْقُرْآنِ ثَرْسٹ

ایک تعارف

قرآن آئینِ اسلام، فرد اور معاشرے کی بہترین سعادت کا حامل دستورِ الہی، مسلمانوں کا فخر اور معنی میں عظمت و صداقت کا معجزہ ہے۔ قرآن کے بغیر مسلمان اور اسلامی معاشرے کا کوئی تصور نہیں۔

قرآن کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے معلم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ پاک ہے۔ اپنے بعد امت کو نبی اسلام پر باقی رکھنے کے لیے بھی پیغمبرِ خدا نے رہنمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

”اِنِّی تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلِیْنِ کِتَابُ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَہْلِ بَیْتِیْ

مَا اَنْ تَمْسُکْتُمُ بِہِمَا فَلَیْنِ تَضَلُّوْا بَعْدَیْ“

ترجمہ: ”میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عزت اہل بیت۔ اگر تم ان دونوں کے دامن سے وابستہ رہے تو میرے بعد گمراہ نہیں ہو گے۔“

اسے بنیادی فکر کے پیش نظر ”مِصْبَاحُ الْقُرْآنِ ثَرْسٹ“ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اسی فکر کے تحت ”ثَرْسٹ“ نے اب تک جو کتب شائع کی ہیں، ان کی فہرست پیش خدمت ہے۔

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان